نورِ مبین

(صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم)

کے انوار
ابتدائے آفرینش سے مقامِ محمود تک
(سات ابواب میں)

مرتبہ
احقر العباد (ڈاکٹر) حامد حسن بلگرامی
(مؤلف فیوض القرآن)

فیروز سنز لمیٹڈ
لاہور ـــــ راولپنڈی ـــــ کراچی

بار اوّل رجب ۱۴۱۲ھ جنوری ۱۹۹۲ء

بار دوم ربیع الاوّل ۱۴۱۳ھ ستمبر ۱۹۹۲ء

بار سوم ربیع الاوّل ۱۴۱۴ھ اگست ۱۹۹۳ء

پہلا فیروز سنز ایڈیشن

یکم محرم الحرام ۱۴۱۶ھ - ۱۹۹۵ء

دوسرا فیروز سنز ایڈیشن

شعبان المعظم ۱۴۱۷ھ دسمبر ۱۹۹۶ء

کتابت حافظ محمد عبدالستار واحدی صاحب

مطبوعہ غزالی برادرز آفسٹ پرنٹنگ پروفیشنلز، کراچی

فیروز سنز لمیٹڈ

لاہور ــــ راولپنڈی ــــ کراچی

۶۳۰۱۱۹۶-۹۸ ۵۶۳۵۰۳ ۵۸۶۷۲۳۹

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرضِ ناشر

قبلۂ محترم سید حامد حسن بلگرامی مدظلہٗ سے ملاقات میری زندگی کی سعادتوں میں شامل ہے۔

یہ انہیں کا فیضان ہے کہ فیروزسنز کو قرآن حکیم کی خدمت کا ایک موقع ملا اور فیوض القرآن کی طباعت واشاعت کا موقع ہمیں نصیب ہوا۔

اب سرورِ کائنات حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ تاریخِ انسان میں اُن کے مرتبہ کی حکایت ایمان افروز "نورِ مبین" کے چوتھے ایڈیشن کی اشاعت فیروزسنز کے ذریعہ ہو رہی ہے۔

آج وقتِ عزیز کی ظلمتوں میں روشنی کا امکان ہے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکرِ گرامی اور اُن کی سنت کے اتباع کا ذریعہ ہی وہ امکان حقیقت بن سکتا ہے۔

فیروزسنز نے حرف ومعنی اور کاغذ کو تعمیرِ ملت کا وسیلہ ہی سمجھا ہے اور اس ادارے کے بانی نے جن مقاصد کا تعین کیا تھا ہم نے ان سے کبھی انحراف نہیں کیا۔

قارئین کرام سے درخواست ہے کہ وہ ہمیں دینی کتابوں کے بارے میں اپنے مشوروں سے نوازیں۔ ہم احادیثِ نبوی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے نئے تراجم کے بارے میں غور کر رہے ہیں۔ اس باب میں آپ اپنے تاثرات سے ہمیں آگاہ فرمائیں۔

ظہیر سلام

نورِ مبین

گذارشات اشاعت چہارم

اللہ رب العزت کا احسان ہے کہ نورِ مبین کا یہ چوتھا ایڈیشن منظرِ عام پر آرہا ہے اور اس بار اس کی طباعت و اشاعت کی سعادت محترم ظہیر سلام صاحب ناشر ڈائریکٹر فیروز سنز لمیٹڈ، حاصل کر رہے ہیں۔ یہ حسنِ اتفاق نہیں بلکہ مشیت الٰہی اور رضائے الٰہی کے عین مطابق ہوا کہ نورِ مبین کی اشاعت کا سہرا بھی بالآخر اسی ادارے کے سر ہوا جو فیوض القرآن کی اشاعت کی خوشگوار ذمے داری کو ذوق وشوق سے ادا کر رہا ہے۔ ساتھ ہی مولف کے استادِ محترم کے اس قول کی صداقت کا کہ "قرآن وہ ہے جو صاحبِ قرآن صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاتا ہے اور صاحبِ قرآن صلی اللہ علیہ وسلم وہ ہیں جو اللہ سے ملاتے ہیں۔" ایک ثبوت اس انداز سے بھی نمایاں ہو کہ نور اور نورٌ علیٰ نور سے قلوب کو منور کرنے والی ہستیوں کو یہ دونوں کتابیں ایک ہی ادارے سے حاصل ہو جائیں۔ اللہ رب العزت کی بارگاہ میں دست بدعا ہوں کہ وہ اپنے حبیب پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے صدقہ میں اس نذرانۂ عقیدت، اس عاجزانہ قلمی کاوش اور روحانی تڑپ کو اس معاشرہ میں زیادہ سے زیادہ اجاگر کرنے کا وسیلہ بنا دے تاکہ یہ نقش محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہمارا نقشِ ہدایت بن جائے۔

ہر چند حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے جمال و کمال کا یہ ایک ہلکا سا خاکہ ہے لیکن اس کا منتہائے نظر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کی وسعتوں رفعتوں کے ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت سے قلوب کو منور کرنا ہے۔ کیا عجب کہ بارگاہ ذوالجلال والاکرام میں ہماری یہ سعی قبول ہو اور وہ گذارشات جن کا ذکر تحدیثِ نعمت میں کیا گیا ہے، ملک و ملت کی شیرازہ بندی میں معاون ہوں۔

ہمیں امید ہے کہ انشاء اللہ ہمارے علم نواز حضرات اس کتاب نورِ مبین کے سات ابواب کو اپنے اپنے علوم کی روشنی میں روشن سے روشن تر انداز

سے آگے بڑھا کر نہ صرف سیرت نگاروں کی محدود زاویہ نگاہ کو محبت کی لامحدود بنیادوں پر استوار کریں گے بلکہ عالمِ اسلام کو اس کی کھوئی ہوئی عظمت و رفعت سے ہمکنار کرنے میں اپنا فرض ادا کریں گے۔ انشاء اللہ بارگاہ رب العزت سے امتِ مسلمہ کے قلوب کو وہ جذبہ روحانی پھر میسر آئے گا کہ کوئی طاغوتی طاقت اس کے سیلِ رواں کے لئے رکاوٹ نہ بن سکے۔ اس کی راہ حب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کچھ اور نہیں۔

ہم اپنے محترم بھائی حسن اختر صاحب اور ان کی ایسوسی ایشن کے شکرگزار ہیں کہ انہوں نے اس کتاب کے تین ایڈیشن تقریباً تین سال کی مدت میں شائع فرمائے اہلِ نظر نے اسے قدر کی نگاہوں سے دیکھا، صحافی حضرات نے پُر نور تبصرے فرمائے۔ اکثر اقتباسات خصوصی نمبروں میں شائع ہوئے، ایک شیدائی رسول صلی اللہ علیہ وسلم ادارہ نے "حسان ؓ ایوارڈ" سے بھی حوصلہ افزائی کی۔ لیکن اب بھی زیادہ سے زیادہ حضرات تک پہنچنے کی منزل باقی تھی۔ قدرت نے اس کے انتظام بھی فرما دیئے۔ الحمدُللہ

میں ایک بار پھر ان تمام حضرات کا مشکور ہوں جو کتاب کی تالیف سے لے کر اب تک اس کارِ خیر میں میرے معاون رہے۔ اللہ رب العزت ان کو اجرِ عظیم سے نوازے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہ لطف و کرم کے صدقہ میں یہ جامِ محبت تشنگانِ معرفت و محبت کے لئے خوب خوب عام ہو۔

محتاجِ کرم

حامد حسن بلگرامی

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

ھدیۂ اخلاص

ربیع الاوّل ۱۴۱۳ھ

اللہ ربّ العزت کا شکر کس زبان سے ادا کیا جائے کہ ایک سال میں نورِ مبین کے دو اڈیشن شائع ہوئے اور آج ربیع الاوّل کے مبارک ماہ میں یہ خصوصی اڈیشن حضورِ انور صلّی اللہ علیہ وسلّم کے حضور اُن کی امّت کے چند مخلصین کی جانب سے پیش کرنے کی سعادت حاصل کی جارہی ہے۔ اِن التجاؤں کے ساتھ کہ حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کا دامنِ رحمت امّت کے لئے دنیا میں کشادہ رہے اور آخرت میں حضور شافعِ محشر کی شفاعتِ عظمیٰ اور سائبانِ رحمت ہمارا نصیبہ ہو۔

جیسا ہم نے اپنے دوسرے اڈیشن کے دیباچہ میں عرض کیا تھا کہ یہ محض کتاب کی اشاعت نہیں بلکہ مؤلف کی روحانی تڑپ اور فکری روشنی کو امتِ مسلمہ تک پہونچانے کی کوشش ہے تاکہ اس سے وہ نتائج مرتب ہوں جن کا ذکر تحدیثِ نعمت میں کیا گیا ہے۔ لہٰذا ہم نے اپنا فرضِ منصبی سمجھا کہ ہم اسے صرف طالبانِ کتاب تک محدود نہ رکھیں بلکہ اُن مخلصین اور محبوبین تک اس کو پہونچانے کی کوشش کریں جن کی دُعائے نیم شبی ہمارے قلوب میں اللہ اور اُس کے رسول کی محبت اور تڑپ پیدا کرنے کی ضامن ہو، اور ہم جس حد تک ممکن ہو سکے نوجوانوں کو اس نعمتِ عظمیٰ کے قریب لانے کی کوشش کریں۔

ہمیں مسرت ہے کہ ہماری اس خصوصی پیش کش میں ہمارے چند احباب اور مخلص حضرات نے نہایت خندہ پیشانی وکشادہ قلبی سے ہمارے ساتھ تعاون فرمایا اور ہمارے لئے یہ ممکن ہوسکا کہ ہم یہ اڈیشن بطور ہدیۂ اخلاص پیش کرسکیں، اس سلسلہ میں ہم مالی تعاون کے لئے راؤ نسیم تحسین صاحب جناب محمد احسان اللہ صاحب، جناب انوار الحق قریشی صاحب، میاں مقبول احمد صاحب اور جناب شجاعت علی صاحب کے خاص طور سے مشکور ہیں۔

ہماری دعا ہے کہ بارگاہِ ربّ العزت میں ہماری یہ سعی مقبول ہو اور امتِ مسلمہ کو ایک رشتۂ اخوت ومحبّت میں منسلک کرنے کی اور حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کی محبت سے قلوب کو منوّر کرنے کی ضامن ہو۔

کیا عجب ہے کہ کسی کی نگاہِ لطف وکرم کے صدقہ میں یہ جامِ محبّت ہر سال ماہِ ربیع الاوّل میں تشنگانِ معرفت ومحبت کے لئے یوں ہی جاری رہے۔

'جب تلک بس چل سکے ساغر چلے'

حسن اختر

تاثرات: حضرت مولانا پیر محمد کرم شاہ صاحب ازہری°

"نورِ مبین" تجلیاتِ محمدیؐ کا ایک آئینہ خانہ

بسمِ اللّٰہِ الرّحمٰنِ الرّحیم

نحمدہٗ و نستعینہٗ۔ ونصلّی ونسلّم علیٰ سیّد الانبیاء

والمرسلین وعلیٰ آلہٖ وصحبہٖ اجمعین

حُسن کا ہر کوئی شیدائی ہے !
نگاہ بھی، عقل بھی اور دل بھی !
لیکن ہر ایک کی اپنی اپنی حد ہے اور اپنا اپنا ظرف !
نگاہ، رنگ و رُوپ کی جلوہ سامانیوں اور خد و خال کی رعنائیوں میں کھو کر رہ جاتی ہے عقل، حُسن کی حقیقت کے بحرِ بیکراں میں غوطہ زن رہتی ہے۔ قدم قدم پر بھنور، چاروں طرف سے یلغار کرنے والی شوخ و شنگ موجیں اسے اپنے میں مستغرق رکھتی ہیں۔

° مولف ضیاء القرآن، جسٹس شریعت کورٹ، سجادہ نشین بھیرہ شریف، مدیرِ اعلیٰ ضیائے حرم

لیکن جلوۂ جاناں کے رُوبرو دامن پھیلانے کی جرأت، پھر عمر بھر وقف انتظار رہنے کی ہمت، صرف قلبِ مسکین کو ہی ارزانی ہوتی ہے۔

ہجرِ حبیب ﷺ میں آنسوؤں کی لڑیاں پرونے والے، دردِ فراق سے ماہئ بے آب کی طرح تڑپنے والے، اپنی شب کی تنہائیوں کو آہوں سے آباد رکھنے والے، جب آئینۂ دل کو ہر قسم کے غبار اور کدورتوں سے صاف وشفّاف کر لیتے ہیں تو محبوب کا عکسِ جمیل قلبِ جمیل کی بے تابیوں کو دلاسہ دینے کے لئے تجلّی فرماتا ہے۔ اس وقت نقاب اُلٹ دیئے جاتے ہیں۔ مغائرت ختم ہو جاتی ہے، مسافتوں کی دُوریاں سمٹ جاتی ہیں۔

محبوبِ کریم کی بارگاہِ رحمت سے لطف واحسان کے موتی لٹائے جاتے ہیں۔ معرفت وحکمت کے سدا بہار پھولوں سے ان کا دامنِ طلب بھر دیا جاتا ہے۔ اور جب ان کا قلم صفحۂ قرطاس پر رقم طراز ہوتا ہے تو بارگاہِ حُسن سے مضامین کا القا ہونے لگتا ہے۔ اِس شرابِ طہور کی تقسیم کے لئے الفاظ کے جام وسبو بھی مخزنِ رحمت سے مہیا کئے جاتے ہیں۔

مضامین کی یہی ندرت ولطافت، کلمات کی یہی دلآویزی ورعنائی، عقیدت ومحبت کے اس گلدستہ کو دیگر صحائف کے انباروں سے ممتاز کر دیتی ہے۔

مخدومِ ملّت، محترم جناب ڈاکٹر حامد حسن بلگرامی مدّظلّہ، انہیں نادرۂ روزگار ہستیوں میں سے ایک منفرد ہستی ہیں جنہیں قدرت کی فیاضیاں پہلے دولتِ عشق ونیاز سے مالا مال کرتی ہیں پھر راہروانِ منزلِ تسلیم ورضا کی حوصلہ افزائی کے لئے انہیں اذنِ لب کشائی دیا جاتا ہے۔ ان

کی علمی تخلیقات علم وفن کی جملہ خوبیوں سے متّصف ہونے کے ساتھ ساتھ حُسن وجمال کی جملہ زیبائیوں کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہوتی ہیں۔ پڑھنے والا انہیں پڑھ کر دنگ رہ جاتا ہے۔ ان کو سمجھنے والے کے لئے بحرِ معرفت وعرفان کی اتھاہ گہرائیاں پایاب ہو جاتی ہیں۔ اور ان کو اپنے دل میں بسانے والے مسافروں کے لئے رکاوٹوں کے پہاڑ ریزہ ریزہ ہو جاتے ہیں۔

محترم ڈاکٹر بلگرامی صاحب نے کچھ عرصہ پہلے "فیوض القرآن" لکھ کر دل باختگانِ سرکارِ احمدیت کے قلوب واذہان کو منوّر کیا اور ان کی وارفتگیوں کو جذبۂ صادقہ سے ہمکنار کیا اور اب "نورِ مبین" کے دلکش اور بصیرت افروز عنوان سے سیرتِ محبوبِ ربّ العالمین صلّی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلّم کو ایک ایسا اچھوتا انداز دیا جو سیرت نویسی کے سلسلہ میں لاجواب اور بے مثال ہے۔ ہر سطر سے ادب ومحبّت کے چشمے پھوٹ رہے ہیں۔ ہر لفظ گوہرِ آبدار ہے جو مصطفوی علوم ومعارف کے بیش بہا خزانوں کا امین ہے۔

میں نے جب "نورِ مبین" کے چند مقامات کا مطالعہ کیا تو ایک عجیب قسم کی حیرت واستعجاب نے مجھے ششدر کر دیا۔ میں نے اپنے پہلو میں دھڑکنے والے دل سے پوچھا، بتا! ان افکارِ عالیہ کا منبع کہاں ہے؟ یہ الفاظ کے جام وسبو جن میں یہ شرابِ معرفت عاشقانِ باصفا کے جذبۂ سرفروشی کو نئی توانائیاں بخشنے کے لئے تقسیم کی جا رہی ہے کس

کارخانہ میں تیار ہوتے ہیں؟ وہ کون ہے جو خوفِ لومۃِ لائم سے بے نیاز ہوکر ساقی گری کی خدمت بڑی جرأت و بے باکی سے انجام دے رہا ہے؟

جواب ملا۔ یہ وہی مردِ بلند آہنگ ہے جس نے چند سال پہلے فیوض القرآن لکھ کر امتِ حبیبِ کبریا کے نوجوانوں کے لئے فہمِ قرآن کا دروازہ کھولا تھا۔ وہی آج دار فتگانِ حسنِ عنبر کے سامنے نورِ مبین لکھ کر جلوۂ جاناں صلّی اللہ علیہ وسلّم کو بے نقاب کر رہا ہے تاکہ وہ ہوا و ہوس کی اسیری سے رستگاری حاصل کر کے محبوبِ ربّ العٰلمین صلّی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلّم کی عقیدت و غلامی کا طوق زیبِ گلو کرنے کے لئے بے قرار ہو جائیں۔

دُعا جو : محمد کرم شاہ
۱۵ ربیع الثانی ۱۴۱۲ھ
۲۴ اکتوبر ۱۹۹۱ء

ارشادات

حضرت الشیخ العلامہ محمد عبد الرشید نعمانی صاحب مدظلہ
صاحبِ لغات القرآن وماتمس الیہ الحاجہ لمن یطالع سنن ابن ماجہ ○

نورِ مبین

سرورِ کائنات و فخرِ موجودات حضرت محمدِ مصطفیٰ، احمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکرِ گرامی اِس کائنات کا حسین ترین تذکرہ اور نغمۂ حیات افزا ہے۔ کسی انسان کی زندگی کے بارے میں اس قدر نہیں لکھا گیا جسقدر ہمارے رسول اور ہمارے نبی فداہ ابی و امیؐ کے بارے میں لکھا گیا ہے۔ آپؐ کی تمام عاداتِ مبارکہ، مشاغلِ شب و روز، معمولات، عبادات، محافل، غزوات اور معاملات کے ہر پہلو کو آپؐ کے صحابۂ کرام اور محدثینِ عالی مرتبت نے یوں محفوظ کر دیا کہ چودہ صدیوں سے زیادہ کی مدّت گزرنے کے باوجود آج کے بیشتر اہلِ ایمان کے سامنے آپؐ کی شخصیت و ذات و صفات کے کئی رُخ آئینے کی طرح موجود اور روشن، اور کتنے ہی رُخ آنے والے زمانے کے منتظر ہیں۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ انسان اور تاریخ کو اِس نمونہ اور اس اسوۂ کاملہ کی ضرورت ہے کہ اس کے اتباع کے بغیر ہم فلاح و کامگاری تک نہیں

○ قیامِ پاکستان سے پہلے رفیقِ ندوۃ المصنّفین، دہلی،
دکن کے علمی اداروں کے تحقیقی رفیق۔

سابق استاد و نگران تحقیقی مقالات جامعہ اسلامیہ بہاول پور

نگرانِ تحقیقاتِ علمیہ دار العلوم بنوریہ، کراچی،

پہنچ سکتے۔

حضرت ختم المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم سے ہمارے آبا و اجداد کی وابستگی کا ثمرہ یہ ہے کہ آج عربی کے بعد اردو زبان کے دامن میں تفاسیر، علوم قرآنی، سیرت و مطالعۂ احادیث کا جو سرمایہ موجود ہے وہ تمام دوسری زبانوں کے لئے باعثِ رشک ہے۔

انیسویں صدی کے اواخر سے اردو زبان میں سیرت نگاری کی طرف یوں توجہ دی گئی کہ آج ہم جدید اندازِ سیرت نگاری کو اردو کے امتیازات میں شامل کر سکتے ہیں۔ مولانا شبلی و علامہ سلیمان ندوی رحمہما اللہ کے نفسِ گرم اور اخلاص نے اردو کے اہلِ قلم کو ذکرِ رسولِ اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی دنیا کی شہرت دلادی ہے۔ اردو میں سیرتِ پاک پر جو کچھ لکھا گیا ہے وہ کمیت و کیفیت دونوں اعتبار سے قابلِ قدر ہے، اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اردو اہلِ قلم کی وابستگی کا ثبوت ہے۔

سیرت سے متعلق ادب میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ بات یہ ہے کہ جیسے جیسے وقت گذرتا جا رہا ہے رسولِ آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات اور شخصیت کے نئے نئے پہلو نظر اور فکر کے سامنے آرہے ہیں، اور یہ ایک فطری بات ہے کیونکہ سیدِ ہاشمی و مطلبی صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت روزِ جزا تک کے لئے ہے۔ وہی شفاعتِ کبریٰ اور مقامِ محمود کے امین ہیں۔

ہمارے محترم دوست سید حامد حسن بلگرامی کو رب العزت نے کتنے ہی انعامات سے نوازا ہے۔ وہ مغرب کی بڑی جامعات میں استاد رہے، اور سعودی عرب کے جامعہ ملک عبدالعزیز (مرکز تعلیماتِ اسلامی) میں پروفیسر اور مشیرِ تعلیمات رہے، پاکستان منصوبہ بندی کمیشن میں شعبۂ تعلیمات کے سربراہ رہے اور اسلامیہ یونیورسٹی بہاول پور کے وائس چانسلر رہے، لیکن اس فقیر کی رائے میں اُن کا سب سے بڑا اعزاز

حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اُنؐ کی تعلیمات سے فکری اور قلبی رشتہ اور اُنؐ کی غلامی کا شرف ہے۔ اعلےٰ تعلیم کے حصول سے زیادہ یہ بات اُن کی شخصیت کی تعمیر میں شریک رہی ہے کہ اہلِ دل بزرگوں سے اُنہوں نے فیض اُٹھایا۔

فیوض القرآن اور ندائے حرم کے بعد سیّد صاحب نے نورِ مبین مرتب فرمائی۔ سیرت پر اُن کی اِس کتاب کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ سے اُنہیں ذوقِ نظر کے ساتھ ساتھ محبّت کی سوغات بھی عطا کی گئی ہے۔

نورِ مبین میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہورِ قدسی سے پہلے کے مراحل کو بھی ذوق وشوق اور روایات کے اُجالے میں قلم بند کیا گیا ہے۔ اُس کے بعد آپؐ کی حیاتِ دُنیوی کو نقشِ محبّت کی طرح قلم بند کیا گیا ہے۔ کتاب کا بنیادی موضوع یہ ہے کہ صاحبِ خُلقِ عظیم صلی اللہ علیہ وسلم کا نور کس طرح صحابۂ کرام، تابعینِ عظام، صالحینِ امّت، فقہائے ملّت اور صوفیائے کرام کے وسیلے سے ہمارے عہد تک سفر کرتا رہا ہے اور سفر کرتا رہے گا۔ نورِ مبین اسلام کے عظیم فرزندوں سے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اکتسابِ نور کی حقیقت افروز اور ایمان افزا دستاویز ہے۔ نورِ مبین کی ورق گردانی کرتے ہوئے یہ خیال بار بار ذہن میں آیا کہ

تاقیامت کُھلا ہے بابِ سخن

سیّد حامد حسن بلگرامی کی تحریر میں علم کا عنصر، محبّت کی روشنی، اور سلیقۂ تحریر موجود ہے۔ وہ الفاظ کو محبّت وتعلقِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدد سے مسخّر اور روشن کرتے نظر آتے ہیں۔ اُن کی کتاب میں فکری گمراہیوں اور بالخصوص ناصبیت کا توڑ بھی نظر آتا ہے۔

اللہ تعالیٰ سے دُعا ہے کہ وہ سیّد بلگرامی کی اس کاوشِ علمی وقلبی کو قبول فرما کر دونوں دنیاؤں میں اجرِ حسن اور جزائے خیر سے سرفراز فرمائے۔

محمد عبدالرشید نعمانی

کلماتِ خیر

حضرت قبلہ محمد برکت علی صاحب مدظلہ ○ مہاجر الی اللہ و متوکل علی اللہ العظیم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۔ ماشاء اللہ لا قوۃ الا باللہ

اللھم صل وسلم وبارک علی سیدنا ومولانا وحبیبنا محمدؐ النبی الامی وعلی الہٖ واصحابہٖ وعترتہٖ بعدد کل معلوم لک وبعدد خلقک ورضیٰ نفسک وزنۃ عرشک ومداد کلماتک استغفر اللہ الذی لا الہ الا ھو الحی القیوم واتوب الیہ

سید حامد حسن بلگرامی ....

آپ کی مایۂ ناز تالیف "نورِ مبین" مدح و ستائش کی محتاج نہیں، میرے آقا روحی فداہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ طیبہ پہ یہ ایک عمدہ کاوش ہے اور یقیناً آپ کی سعیٔ مسلسل کا حاصل ماشاء اللہ

○

الانسان سری وانا سرہ

انسان عین الوجود

والسبب فی کل موجود

اور انسان ہی نورِ مبین کا مظہر

یا حی یا قیوم یا ذوالجلال والاکرام

بندہ آپ کا خیر خواہ دعا گو ہے آپ کے لئے صحت و عافیت کی دعا کی۔

۲۲ شوال المکرم ۱۴۱۲ھ

والسلام والاکرام (دستخط)

ابو انیس محمد برکت علی لودھیانوی عفی عنہ

المقام النجاف الصحاف المقبول المصطفین ○ دار الاحسان ○ فیصل آباد پاکستان

○ مؤلف۔ کتاب العمل بالسنۃ المعروف ترتیب شریف۔ جلد اول تا ششم (۲) اسما النبی الکریم۔ جلد اول تا پنجم (۳) مکشوفاتِ منازل احسان۔ المعروف بہ مقالاتِ حکمت تبلیغی رسائل (۱ تا ۱۰۰) وغیرہ۔

ارشاداتِ گرامی: محترمی قبلہ ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان صاحب مدّظلہٗ ٭

حامداً وّ مصلیاً

مخدوم و محترم ڈاکٹر حامد حسن بلگرامی صاحب کی تازہ تصنیف "نورِ مبین" ایک خاص مقصد کے لئے ہے۔ اور وہ صرف یہ ہے کہ موجودہ نسلیں جو فلسفہ یا سائنس سے متاثر ہیں وہ بالآخر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی تعلیمات کے آگے سرِ نیاز خم کرنے پر مجبور ہو جاتی ہیں، کیونکہ بقول مولانا آزاد سبحانی "ہر کامل اور ہر نبی مرسل کا کمال اس سرچشمۂ کمالات صلی اللہ علیہ وسلم کے بہاؤ کا ایک مولود ہے اور ہر بابرکت کی برکت اس سرچشمۂ برکات صلی اللہ علیہ وسلم کی روانی کی ایک نمود ہے۔" پوری کتاب مشاہدے اور حقیقت دونوں کو دعوت دیتی ہے اور دنیا کے سخت سے سخت مراحل میں صرف حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ کو اصل منزل قرار دیتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اس کتاب میں جتنے علوم اور جتنے نفوس کا ذکر کیا ہے وہ سب اسی منزل کے لئے رہنمائی کرتے ہیں۔ اُن کو سمجھنا اور اُن سے سیکھ کر عمل کرنا ہی صحیح زندگی ہے اور موجودہ دَور جس طمانیت کی تلاش میں ہے اُس کے لئے دلیلِ راہ صرف یہی زندگی ہے۔ بقول اقبالؒ

توُ فرمودی رہِ بطحا گرفتیم
وگرنہ جز توُ مارا منزلے نیست

کیسے مُبارک ہوں گے وہ لوگ جو اس منزل کی طرف جادہ پیما ہیں ___ اللہ تعالےٰ ڈاکٹر صاحب کو اجرِ عظیم عطا فرمائے اور اپنے مقبولین میں شمار فرمائے۔ آمین۔ ثم آمین۔

احقر (دستخط)

۱۱ رمضان المبارک ۱۴۱۲ھ (۱۷ مارچ ۱۹۹۲ء)

٭ ایم اے، ایل ایل بی، پی ایچ ڈی، ڈی لٹ۔ پروفیسر ایمریٹس سندھ یونیورسٹی، حیدر آباد۔

تاثرات

محترمی ڈاکٹر پروفیسر ابوالخیر کشفی صاحب ۔ جامعہ کراچی۔

نور کا دیکھنا مشکل سہی، مگر اتنا مشکل نہیں جتنا نور کا دکھانا، یہ اللہ تعالےٰ کا احسانِ عظیم ہے کہ اُس نے آپ کے قلم کی روشنائی کو بھی نور بنا دیا۔ ربِّ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اِس کاوش کو قبول فرمائے۔ اور شاید یہ کاوش نہیں، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی روح کا اظہار اور بے تابانہ پرواز ہے۔

(کشفی)

حضرت محترم کشفی صاحب نے نورِ مبین کا پہلا ہی مسوّدہ از اوّل تا آخر پڑھا، بعض مفید اضافے فرمائے جو کتاب میں شامل کر لئے گئے۔ البتہ کتاب کے بابِ ہفتم کے آخر میں جو کلمات ان کی زبانِ قلم پر آئے اُن کو یہاں جگہ دینا ہی مناسب سمجھا گیا۔ شکریہ کے ساتھ۔ (مؤلف)

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

قَدۡ جَآءَكُمۡ مِّنَ اللّٰهِ نُوۡرٌ وَّكِتٰبٌ مُّبِيۡنٌ (مائدہ-۱۵)

نورِ مبین

صلی اللہ علیہ وسلم

کے سات انوار

ابتدائے آفرینش سے مقامِ محمود تک

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ نُّوْرِ الْاَنْوَارِ وَسِرِّ الْاَسْرَارِ

مَهْبَطِ الْوَحْيِ وَالْاَسْرَارِ وَالْاَنْوَارِ وَاٰلِهٖ وَبَارِكْ وَسَلِّمْ

مرتبہ

از محتاجِ کرم

سید حامد حسن بلگرامی عفی اللہ عنہ

نورِ مُبینؐ

ترتیب

(اگر اس باب کا ذرا توجہ سے مطالعہ کر لیا
جائے تو ساتوں ابواب کی یکائی کھل جاتی ہے
اور لطف و فہم میں اضافہ ہوتا ہے۔ ناشر)

باب پنجم ۔ مدینہ منورہ میں تشریف آوری سے، الیٰ رفیق الاعلیٰ تک (مدنی زندگی)
(صفحہ ۲۸۹ - ۴۳۸)

یہ وہ دس سال کا مختصر لیکن عظیم دَور ہے، جس میں کلامِ ربّانی کی تکمیل ہوئی، قرآنِ حکیم مشعلِ راہ بنا، اور نورِ کتاب اور نورِ رسالت کی تجلّیات سے جزیرۂ عرب جگمگا اٹھا اور اس کی روشنی عالم میں عام ہونا شروع ہوئی۔ یہی دَور ہے کہ اہلِ ایمان کو اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ سے سرفرازی ملی، جہاں اہلِ ایمان کی مختصر جماعت ایک لاکھ چالیس ہزار تک پہونچی۔ اور یہ سب اسی نبیٔ برحق، خاتم رسلؐ کے مبارک ہاتھوں سے انجام پایا، جس کی راتیں المزمّل اور جس کے دن المدثّر کے ترجمان تھے۔ جس نے یہودیوں کی سازشوں، نصاریٰ کی گمراہیوں اور کفر کی طاقتوں کا عزم، علم، فراست، حکمت، شجاعت اور قدرت کے ساتھ مقابلہ کیا، اور ایک ایسا نظام، ایک ایسا ضابطۂ حیات انسانیت کو عطا فرمایا جو اقوامِ عالم کی کامیابیوں کا ضامن ہے۔ جس کی حیاتِ مبارکہ کا ہر لمحہ توحیدِ باری تعالیٰ کو عام فرمانے اور اس کی مخلوق سے محبّت میں گذرا، رحمتِ عالم بن کر قلوب میں، روح میں، مومن کے رگ و ریشہ میں اُن کی جان سے زیادہ عزیز بن کر ان کا نگرانِ حال بنا....... یہ سب کیسے ہوا؟ اُن کا طریقۂ کار کیا تھا؟ یہ ایک یکائی ہے جو فصلوں میں تقسیم نہیں ہوسکتی، جس کے اشارات کے لئے چند عنوان درجِ ذیل ہیں:۔

راستقبال، تعمیرِ مسجد، ترجیحات، تعلیم و تربیت۔ مواخاۃ و معاہدے، غزوات تفہیم و ارشادات، مباہلہ، طاغوتی قوتوں کا مقابلہ: علم سے، حلم سے اور راہِ خدا میں جان کی بازیاں لگاکر۔ صلح کو ترجیح دینا۔ صلحِ حدیبیہ، اس کے مثبت اثرات عرب کے اندر اور باہر۔ ازداجِ مطہراتؓ۔ وفود۔ فتوحات۔ فتحِ مکّہ، آزمائشیں اور تکمیلِ دین۔ ایک ابدی منشور۔ اصلاحِ حال کی نازک گھڑیاں، کامیابیاں۔ بظاہر جدائی، بباطن رفاقت یعنی وہ شمسِ نبوّت صلی اللہ علیہ وسلم جو غروب ہونے کے لئے طلوع ہی نہ ہوا تھا۔)

باب ششم ۔ حجابِ نورِ مصطفٰے سے لے کر تا قیامِ قیامت، نورِ مبین کی تنویرات و تجلّیات ۔

فیضانِ رسالت

باب ہفتم: قیامِ قیامت سے مقامِ محمود تک صلی اللہ علیہ وسلم

سائبانِ رحمت

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوۡلُ اللّٰہِ

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰٓی اٰلِہٖ وَصَحۡبِہٖ بَارِكۡ وَسَلِّمۡ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○
اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ○ۙ
الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○ۙ مٰلِكِ یَوْمِ
الدِّیْنِ ○ؕ اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاكَ
نَسْتَعِیْنُ ○ؕ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ ○ۙ
صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ ۙ۵
غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ
وَ لَا الضَّآلِّیْنَ ○ؑ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ط
وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ
وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِ الْاَوَّلِیْنَ وَالْاٰخِرِیْنَ ط O

دُعائے حرم

اَللّٰھُمَّ اِنِّیْٓ اَسْئَلُکَ بِسْمِکَ اِنِّیْٓ اَشْھَدُ اَنَّکَ اَنْتَ
اللّٰہُ اللّٰہُ اللّٰہُ اللّٰہُ
لَا اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِیْمِ۔ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ۔
یَا اَللّٰہُ یَا نُوْرُ یَا حَقُّ یَا مُبِیْنُ

اَکْسِنِیْ مِنْ نُوْرِکَ وَعَلِّمْنِیْ مِنْ عِلْمِکَ وَفَھِّمْنِیْ عَنْکَ
وَاسْمِعْنِیْ مِنْکَ وَالْبَصِّرْنِیْ بِکَ اِنَّکَ عَلٰی کُلِّ
شَیْءٍ قَدِیْرٌ۔ یَا سَمِیْعُ یَا عَلِیْمُ یَا حَلِیْمُ یَا عَلِیُّ
اِسْمَعْ دُعَآئِیْ بِخَصَائِصِ لُطْفِکَ اٰمِیْنَ اٰمِیْنَ اٰمِیْنَ
یَا رَبَّ الْعٰلَمِیْنَ۔

ترجمہ

"اے اللہ! (تیرے عظیم دربار مکہ معظمہ میں جس کا ذرّہ ذرّہ نور سے معمور ہے) میں تیرے اسم پاک (اللہ) کے وسیلہ سے سوال کرتا ہوں اور شہادت دیتا ہوں کہ تو ہی ہے اَللّٰہ اَللّٰہ اَللّٰہ اَللّٰہ۔ اس (اللہ) کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہی عرش عظیم کا رب ہے، اور کوئی الٰہ اس کے سوا نہیں کہ وہی الحیّ اور القیوم ہے۔

اے اللہ! اے نور! اے حق! اے مبین! اپنے نور کا لباس مجھے (بھی) پہنا دے۔ اور اپنا علم کچھ مجھے بھی سکھا دے۔ اور اپنی طرف سے سمجھ عطا فرما دے۔ اور اپنے سمع قبول سے مجھے نواز۔ اور اپنی معرفت سے سرفراز فرما۔ بیشک تو ہر چیز پر قادر ہے۔ اے سُننے والے! اے دانا! اے بُردبار! اے عظیم الشان! محض اپنے لطف وکرم سے میری دُعا سُن لے۔

آمین آمین آمین یا رب العٰلمین۔"

اے اللہ! اے مالک ومختار! اے خالق کون ومکاں! آج تیرے عظیم دربار میں، ایک عاجز بے نوا۔ نورِ بصیرت سے محروم تجھ سے تیرے حبیب سرورِ کائنات صلّی اللہ علیہ وسلّم کے انوار وتجلّیات فیضانِ رسالت سے قلب کو منوّر کرنے اور ان (صلّی اللہ علیہ وسلّم) کے انوارِ جمال، علم وعرفان کی بھیک

مانگنے حاضر ہوا ہے، جن کی شان میں تو نے فرمایا ــــ لَوْلَاكَ لَمَا أَظْهَرْتُ الرُّبُوبِيَّةَ ــــ اے رب العلمین! جن کو تو نے رؤف رحیم، رحمۃ للعلمین بنا کر مبعوث فرمایا، اور اے مالک الملک جن کی شفاعت عظمیٰ کو تو نے ہمارا آخری سہارا بنایا۔

اے رب کریم!

اس ذات مبارکہ مقدسہ منورہ کی وسعتوں رفعتوں سے اس عاجز کو بھی کچھ آگاہی عطا فرما اور ان کو عام کرنے کی سعادت سے سرفرازی بخش۔

اے ربّ کعبہ!

اے رب محمد صلی اللہ علیہ وسلم!

ہمارے قلوب کو

اُن (صلی اللہ علیہ وسلم)

کی سچی محبت سے منوّر فرما دے

جو

ہمارا سرمایۂ ایمان اور تیری رضا کی موجب ہے

اَللّٰھُمَّ

نَوِّرْ قَلْبِیْ بِنُوْرِ مَعْرِفَتِكَ

صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى خَيْرِ خَلْقِهٖ نُوْرِ عَرْشِهٖ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَصَحْبِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ۔

حامد حسن بلگرامی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
نحمدہٗ و نصلی علیٰ رسولہ الکریم

بلغ العلیٰ بکمالہ
کشف الدجیٰ بجمالہ
حسنت جمیع خصالہ
صلوا علیہ و آلہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

والصلوٰۃ والسلام علی سید الاولین والآخرین

نذرانۂ عقیدت

بآستانۂ حضور

سرورِ کائنات، خاتم النبیین، رحمۃٌ للعٰلمین، شفیع المذنبین، راحتِ قلوب المومنین،
حبیبِ ربّ العٰلمین، محبوب الطالبین، سراج السالکین، محب الفقراء والمساکین

سیدنا و شفیعنا وسندنا ومولانا

محمّد رّسول اللہ

صلّی اللہ علیہ وعلیٰ الہٖ وازواجہٖ واصحابہٖ وعترتہٖ وسلّم

منجانب

جملہ غلامانِ امتِ رسول الثقلین

بخلوصِ قلب وبچشم نم

از گدائے گدایانِ درِ آستانِ محمدؐ۔ طالبِ رحمت، محتاجِ شفاعت سید حامد حسن بلگرامی عفی اللہ عنہ

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ۝

یَا حَیُّ یَا قَیُّوۡمُ　　مَا شَآءَ اللّٰہُ　　لَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ

تحدیثِ نعمت

کُلَّ یَوۡمٍ ھُوَ فِیۡ شَاۡنٍ ۝

میرے معبود

تیری عظمت، تیری کبریائی، تیری شانِ کریمی کے صدقے کہ تو نے ایک عاجز و بے مایہ کو اپنے حبیب صلّی اللہ علیہ وسلّم کے انوارِ مبارکہ کی ایک ہلکی سی فہم اس کے ظرف سے بڑھ کر عطا فرمائی اور اس کا ایک ہلکا سا خاکہ نہایت نچلی سطح پر پیش کرنے کی سعادت بخشی۔ الحمدللہ علی ذالک۔

جانتا ہوں

کہ یہ جو کچھ تحریر میں آیا یہ بھی کسیؐ کی نظرِ کرم ہی کا صدقہ ہے کہ وہ رحمۃ للعٰلمین ہیں۔ ورنہ یہ آستانہ تو وہ آستانہ ہے کہ "نفس گم کردہ می آید جنیدؒ و بایزیدؒ اینجا"

اور پھر

یہ تو تجلّی ہائے ذاتِ مصطفےٰؐ ہیں جو ہر قرن میں ایک نئے انداز سے ظہور پذیر ہوتی رہیں اور اپنے رب کی رحمتِ بے پایاں کی ترجمان اور اس کے مقامِ اذن سے ہم عناں رہیں۔

شاید اس ایک بے مایہ کو اس عطا کی وجہ یہ ہو

کہ دورِ حاضر کا مسلمان جو اسباب پر انحصار کا پجاری بنتا جاتا ہے اور اس کی نظریں محدود سے محدود تر ہوتی جاتی ہیں، وہ سمجھ سکے کہ

رحمت محتاجِ اسباب نہیں، اسباب محتاجِ رحمت ہیں۔

اور اس کے حبیبؐ کا دامنِ رحمت، ہی دامنِ ذوالجلال والاکرام ہے، اور وہیؐ رحمۃ للعٰلمین ہیں، جہاں ہر حکمت مآلِ قدرت بن کر جلوہ نما ہے۔

البتّہ

ضرورت اس امر کی ہے

کہ ہم رحمت سے خوشہ چینی پر قانع نہ ہوں بلکہ اس رحمتِؐ عالم، اس رحمتِؐ عظمیٰ کی فراخی وکشادگی، اس کی مقصدیت اور اس سے وابستگی کو اپنا نصب العین بنائیں، اور انہیں رحمۃ للعٰلمینؐ کے دامنِ رحمت سے اس سے وابستگی کے انداز سیکھیں، جو کبھی صبر سے کبھی شکر سے، کبھی نورِ ایمان سے اور کبھی نورِ عرفان سے، کبھی قدرت سے، کبھی حکمت سے، لیکن بہرحال سعیٔ پیہم، علم وعمل اور خلوصِ نیت سے حاصل ہوتی ہے، کہ اللّٰہ ربّ العزّت کا وعدہ ہے کہ

وَالَّذِیْنَ جَاهَدُوْا فِیْنَا لَنَهْدِیَنَّهُمْ سُبُلَنَا ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِیْنَ ○

اور جو ہماری راہ میں (ہمارے لئے) کوشش کرتے ہیں ہم ضرور اپنا راستہ انہیں دکھا دیتے ہیں اور بلاشبہ اللّٰہ ان (لوگوں) کے ساتھ ہے جو (خلوصِ دل سے) نیک عمل کرتے ہیں۔ (عنکبوت ۲۹: آیت ۶۹)

یہ راہ

اِسی محسنِ انسانیت، محسنِ کائنات، اللہ کے حبیب، خاتم الرسلؐ کی راہ کے سوا کوئی اور راہ نہیں، جس کا باطن ایمان اور جس کا ظاہر اسلام ہے۔

اس دَور میں، جس کا مزاج اختلاف و افتراق بنتا جاتا ہے، ہمارے لئے ضروری ہے کہ ہم اللہ کو رسول سے، قرآن کو حدیثِ رسولؐ سے، رسولؐ کے آل کو صحابہ کرام سے، اور علماءِ راسخین کو انؐ کے اولیاء کرام سے الگ الگ کرنے کی سعیٔ لاحاصل میں اپنی صلاحیتیں اور وقت ضائع نہ کریں بلکہ خوب جان لیں کہ یہ سب کلمۂ طیبہ کے انوار ہیں جو نورِ مبین بن کر ظاہر ہوتے، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے آل واصحاب اور اُن کے علماءِ راسخین و اولیاء کرام اُنؐ ہی کے دینِ متین کے محافظ ہیں، جملہ محدثین و محققین سب ایک ہی شجرِ معرفتؐ کی ڈالیاں ہیں، سب ایک ہی نورِ مبینؐ کی تجلیات ہیں، سب انہیںؐ کے چشم و چراغ ہیں، سب ہی راہ نمائے حق ہیں۔ اللہ تو احد و صمد ہے، پاک ہے بے نیاز ہے، اس کی شانِ کریمی کا مظہر تو نورِ مبینؐ کی شانِ جمالی ہے۔

اگر اس عاجز کو اپنے نوجوانوں کے سامنے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ مقدسہ کے انوار کو اِن سات ابواب میں پیش کرنے میں کوئی کامیابی ہوئی تو یہ بھی فضلِ الٰہی ہے اور اس کے حبیبؐ کی بندہ نوازی، کہ اللہ تعالےٰ ہی ذُو الْفَضْلِ الْعَظِیم ہے اور جن کو اپنی رحمتِ خاص کے لئے مختص فرمالیا وہؐ اس کے نبیٔ آخرؐ ہیں۔

کیا عجب ہے

کہ اس وقت جب اسلام کی بیخ کنی کے لئے کفر کی تمام قوتیں متحد ہیں اور اہلِ کتاب کی جملہ سازشوں سے اس دینِ حق کا سامنا ہے ہمارے نوجوانوں کے ذہن میں یہ حقیقت راسخ ہو جائے کہ اصل طاقت، طاقتِ ایمانی ہے۔ ہم ضرور اپنی جسمانی اور ذہنی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کے لئے جملہ علوم، فکری و عملی کے حصول میں کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہ کریں، بلکہ ہمارا جذبۂ تحقیق دوسروں کے لئے راہ نما ہو۔ لیکن یہ نہ بھولیں کہ علم درحقیقت خود ایک نور ہے، جو حیات بخش ہے، جس کا فرضِ اوّلیں عدل، جس کی فہم حلم اور جس کا ظہور شجاعت و قدرت ہے، جس کی شان جمال ہے۔ اور ہم اپنے علم محسوسات کو اس معرفتِ علم اور اس نورِ علم سے جُدا نہ ہونے دیں، تاکہ ہماری فکر، فضائے ایمانی کی ان بلندیوں اور رفعتوں سے متعلق رہے جہاں کفر کی رسائی نہیں، جہاں حکمت ہی مآلِ قدرت بن جاتی ہے۔

وَمَن يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا

اسی حکمت کی طرف اشارہ ہے۔ جسے قرآنِ حکیم میں خیرِ کثیر سے تعبیر کیا گیا ہے اور جسے دامنِ مصطفےٰؐ سے ازازل تا ابد منسلک کر دیا گیا ہے۔

یہ بات محض چند عبادات، چند اقدار پر زور دینے سے، چند جماعتی پابندیوں سے حاصل نہیں ہوتی بلکہ اس کے لئے ضروری ہے کہ ہم رسالت کی عظمت، رحمۃ للعلمین کی وسعت، رحمت کے ظاہری و باطنی جلوے،

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی قدرتِ خفی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اندازِ رحمت، اپنوں کے ساتھ اور غیروں کے ساتھ بلکہ چرند و پرند کے ساتھ، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت الساینت کے ساتھ، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے انوارِ ہدایت کائنات کے ساتھ ہمیشہ پیشِ نظر رکھیں، اور اس کو کھُل کر بیان کرنے اور عام کرنے میں کسی کوتاہی سے کام نہ لیں، تاکہ ہماری نوجوان نسل اور دورِ حاضر کے مسلمان اپنے اس چشمۂ فیض و کرم سے بہرہ مند ہوں، وہ سید المرسلین رحمۃ للعالمین کی فہمِ رسالت سے آشنا ہوں، جو جملہ دینی و دنیوی، ذہنی اور روحانی بالیدگی کی رُوح ہے، جو فہمِ توحید و رسالت کی یکائی کی ضامن ہے۔

○

اللہ ربّ العزت کی بارگاہ میں دست بدعا ہوں

کہ اس عاجز کی بے بساطی، بے مائگی اور کوتاہیوں سے قطعِ نظر فرما کر محض اپنے لطف و کرم سے اس کی اس عاجزانہ سعی کو شرفِ قبولیت عطا فرماتے اور ہمیں افتراق اور فروعی اختلافات کی تاریک وادیوں سے نکال کر اس راہِ ہدایت پر گامزن فرما دے جو نورِ ایمان و نورِ عرفان سے منوّر ہے۔ جو ایثار و خلوص، اتحاد و اتفاق، اخوّت و محبّت، خیر خواہئ امّت اور خیر خواہئ الساینت کی راہ ہے۔ جو نیرِ نورِ مبین کی تجلّیات و انوار کی یافت کی ضامن ہے کہ

آپ صلّی اللہ علیہ وسلّم ہی

آفتابِ شرع، دریائے یقیں ؛ نورِ عالم، رحمۃ للعالمیں

خواجۂ کونین وسلطانِ ہمہ ؛ آفتابِ جان وایمانِ ہمہ

نورِ او مقصودِ مخلوقات بود

اصلِ معدومات وموجودات بود

(خواجہ فریدالدین عطارؒ)

اور ہم خوب جان لیں کہ

بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست ؛ اگر بہ او نہ رسیدی تمام بولہبیست

(اقبال)

خیر اندیش حامد بلگرامی

(۲ ربیع الاوّل ۱۴۱۲ھ)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تشکّر و امتنان

اس کتاب نورِ مبین
کی تالیف، تدوین، ترتیب، تنظیم، تشکیل و تکمیل، تشہیر و تبلیغ میں
جن جن بزرگ اصحاب کی تالیف و تصنیف سے
استفادہ کیا گیا ہے۔ نیز وہ حضرات جن کی فکری، قلمی، عملی، مالی اعانت حاصل ہوئی ہے
اور اس مقدّس تالیف میں جس نے جس طرح بھی
میری مدد کی ہے میں تہہ دل سے ان کے پُرخلوص تعاون پر اُن کا ممنون و مشکور ہوں
بالخصوص
اپنے محترم پروفیسر ڈاکٹر ابوالخیر کشفی صاحب کا
جنہوں نے اپنی علالت اور مشغولیتوں کے باوجود میرے مسودہ کو پوری توجہ سے
پڑھا، مفید مشوروں سے نوازا اور بعض حسین اضافے فرمائے.... اور......
اپنے بھائی وسیم الدین، بھائی ساجد زاہد اور محترم حسن اختر کا مشکور ہوں جنہوں
نے ہر قدم پر، مسودے کی صفائی سے اشاعت تک میری مدد فرمائی۔
اللہ ربّ العزّت کی بارگاہ میں
دست بدعا ہوں کہ اس تالیف کے ان تمام معاونین کو اپنے خصوصی فضل و کرم سے
نوازے، اپنی رحمتوں کے سایہ میں رکھے اور اپنے اجرِ عظیم سے سرفرازی بخشے۔
میری یہ خصوصی دُعا
اپنے بھائی ڈاکٹر عین الدین کے لئے بھی ہے جو میری ہر علمی و اخلاقی جدوجہد میں
فراخ دلی اور خلوصِ دل سے برسہا برس سے میرے معاون ہیں۔ اور اپنے بھائی
منظور احمد قریشی کے لئے بھی ہے جنہوں نے میری علالت کے دوران اور اس
دورِ حزن و غم میں میری دیکھ بھال کو اپنے جملہ مشاغل پر مقدّم رکھا۔

بحمد اللہ نورِ مبین کا یہ دوسرا ایڈیشن ہے۔ ہمیں افسوس ہے کہ ہم اپنے مخدوم محترم حضرت قبلہ پیر محمد کرم شاہ ازہری مدظلہ کے گراں قدر تاثرات کا شکریہ پہلے ایڈیشن میں ادا نہ کر سکے۔ ہمیں اُن کے ارشاداتِ گرامی اس وقت ملے جب کتاب اپنی اشاعت کی آخری منزلوں میں تھی لیکن یہ ہماری بڑی سعادت ہے کہ اُن کا پُر نور تبصرہ پہلے ایڈیشن میں شامل ہو سکا۔ ہم ان کی اس کرم نوازی کے شکر گذار ہیں، بالخصوص اس لئے بھی کہ نورِ مبین کا مطالعہ کرنے والوں کو پیر صاحب مدظلہ کے منفرد اندازِ بیان میں کتاب کے اُن رموز کی طرف توجہ کرنے کا موقع ملا جن کی جانب ایک صاحبِ قلب و نظر ہی رہنمائی فرما سکتا تھا۔

اس دوسرے ایڈیشن میں جن معزز ہستیوں کے ارشادات شامل کرنے کی سعادت حاصل کی جا رہی ہے اُن میں بھی فیوض القرآن کے تعلق سے ہمارے لئے اپنے پروفیسر غلام مصطفےٰ خان صاحب کے ارشاداتِ گرامی خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں، جو ترجمانِ حقیقت ہیں۔ انہوں نے جو کچھ اپنے خط میں اس عاجز کے متعلق لکھا اس کو تو میں اپنے لئے وسیلۂ نجات سمجھتا ہوں۔ البتہ حضرت محترم کے وہ ارشادات جو قوم و ملت کے نوجوانوں کے لئے ہیں وہ ہدیہ ناظرین ہیں۔

اِن محسنین کی فہرست میں سرِ فہرست حضرت قبلہ مخدومی و محترمی محمد برکت علی صاحب المہاجر اِلی اللہ متوکل علی اللہ العظیم کا اسمِ گرامی ہے، جن کے علمی کارنامے محتاجِ بیان نہیں اور جن کی روحانی رفعتیں منازلِ الفقر فخری کی طرف راہنما ہیں۔ آپ نے انتہائی گراں قدر لمحات میں سے کچھ وقت نکال کر جو چند سطریں تحریر فرمائیں وہ ہماری خوش نصیبی ہے۔ ہم حضرت کی اس عزت افزائی اور دُعا کے تہہ دل سے شکر گذار ہیں۔

الحمد للہ یہ دَورِ آخر بھی سلفِ صالحین کی سی بصیرت، محققانہ نظر، بزرگانہ شفقت، منکسر المزاجی، تواضع اور اخلاق کے اعلیٰ جواہر پاروں سے خالی نہیں۔ ہماری خوش قسمتی ہے کہ اِس دور کی ایک ایسی ہی بزرگ شخصیت، ایک جیّد عالم حضرت شیخ العلامہ محمد عبدالرشید نعمانی نے

نورِ مبین کے متعلق ایک جامع جائزہ سپردِ قلم فرمایا ہے حضرت مولانا نہ صرف ہمارے ملک کے مایہ ناز علماء میں سے ہیں بلکہ حضرت مولانا کی تصنیفات و تالیفات بلادِ اسلامیہ میں بالخصوص مصر اور عرب کی یونیورسٹیوں اور اہلِ قلم میں بڑی عزت و قدر کی نگاہوں سے دیکھی جاتی ہیں، اور ان کی معزز ہستی کو دنیائے اسلام کا عظیم سرمایہ سمجھا جاتا ہے۔ آپ کی تصانیف میں "لغات القرآن" اور "ماتمس الیہ الحاجہ لمن یطالع سنن ابن ماجہ" کے علاوہ "امام ابوحنیفہؒ کا مقام فن حدیث" اور "ابنِ ماجہؒ اور علمِ حدیث" اُن کی عالمانہ صلاحیتوں کا مرقع اور "یزید کی شخصیت اہل سنّت کی نظر میں" ان کی علمی و تحقیقی بصیرت پر شاہد ہیں۔

ان محسنین کے علاوہ اُن تمام حضرات کا بھی مشکور ہوں جنہوں نے خطوط یا ٹیلیفون کے ذریعہ یا خود تشریف لاکر میری ہمت افزائی فرمائی۔ میں صحافی حضرات کا بھی مشکور ہوں خصوصاً تبصرہ نگار روزنامہ جنگ جنہوں نے کتاب کو عوام سے متعارف کرایا۔ میں اپنے حلقہ احباب میں بالخصوص اپنے بھائی اور دوست ریاض الدین احمد (سیکرٹری جنرل دینی تعلیمی کونسل یو۔پی) کا دل سے شکر گذار ہوں کہ انہوں نے اپنی تعلیمی اور دینی خدمات کے دوران اپنی علالت کے زمانے میں اس کتاب پر تقریباً ۲۱ صفحات کا ایک دل افروز روحانی سفرنامہ قلمبند فرمایا، جو خود ایک کتاب بن گئی۔

میں ان سب حضرات کے لئے بارگاہِ رب العزت میں اس کے فضل و کرم کا طالب ہوں

جَزَاهُمُ اللّٰهُ اَحْسَنَ الْجَزَآء

والسّلام

حامد حسن بلگرامی

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ط

اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ ط
يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا O

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ بَحْرِ اَنْوَارِكَ وَمَعْدِنِ
اَسْرَارِكَ وَلِسَانِ حُجَّتِكَ وَعُرُوْسِ مَمْلَكَتِكَ وَاِمَامِ
حَضْرَتِكَ وَطِرَازِ مُلْكِكَ وَخَزَآئِنِ رَحْمَتِكَ وَطَرِيْقِ
شَرِيْعَتِكَ الْمُتَلَذِّذِ بِتَوْحِيْدِكَ اِنْسَانِ عَيْنِ الْوُجُوْدِ
وَالسَّبَبِ فِيْ كُلِّ مَوْجُوْدٍ عَيْنِ اَعْيَانِ خَلْقِكَ الْمُتَقَدِّمِ
مِنْ نُوْرِ ضِيَآئِكَ صَلٰوةً تَدُوْمُ بِدَوَامِكَ وَتَبْقٰى بِبَقَآئِكَ
لَا مُنْتَهٰى لَهَا دُوْنَ عِلْمِكَ صَلٰوةً تُرْضِيْكَ وَتُرْضِيْهِ وَتَرْضٰى بِهَا عَنَّا
يَا رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ O

(الہٰی رحمت نازل فرما ہمارے سردار حضرت محمدؐ پر جو سمندر ہیں تیرے انوار کے اور کان ہیں تیرے بھیدوں کے (یعنی تمام رموز اُن کی ذات اقدس میں پوشیدہ ہیں)، اور اظہار ہیں تیری روشن دلیل کے، اور دولہا ہیں تیری مملکت کے، پیشوا

تیری درگاہ کے اور آرائش تیری سلطنت کی۔ اور خزانے تیری رحمت کے، اور راہ تیرے دین کی، لذّت پانے والے تیری توحید سے، پتلی موجودات کی آنکھ کے (کہ آپؐ ہی کے نور سے کائنات دِکھتی اور دیکھتی ہے) اور سبب ہر موجود کے پیدا ہونے کے۔ اور آنکھ تیرے بزرگانِ خلقت کے (یعنی وہ جو) تیری تجلّیٔ ذات کے نور سے سب سے پہلے ظہور میں آئے۔ (اے اللہ اُن پر) ایسا درود بھیج کہ تیرے دوام کے ساتھ وہ بھی دائم رہے، اور اس کی کوئی انتہا، نہ ہو سوائے تیرے علم کے، ایسا درود کہ خوش کرے تجھ کو (کہ اس درود کو بھیج کر تو خود خوش ہو) اور خوش فرمائے اُن (صلّی اللہ علیہ وسلّم) کو اور اس کے سبب تو ہم سے بھی راضی ہو جائے، اے پروردگار تمام عالموں کے۔)

۱۰

اَللّٰهُمَّ صَلِّ وَسَلِّمْ عَلٰى حَبِيْبِكَ وَقَرِيْبِكَ وَلَبِيْبِكَ مَظْهَرِ رُبُوْبِيَّتِكَ وَمِثَالِ حَضْرَتِكَ وَتِمْثَالِ قُدْرَتِكَ رُوْحِ الْقُدُسِ مُعْطِي الْحَيَاةِ وَالْفَضِيْلَةِ بِاَمْرِكَ بِكَثِيْرِ الْعَوَالِمِ مُفِيْضِ نَوَاطِقِ النُّفُوْسِ صَاحِبِ الظَّفَرِ وَالتَّعَالِيْ شُمُوْسِ نُوْرِكَ

اے اللہ تو اپنی خاص رحمت اور سلامتی نازل فرما اپنے حبیب، مقرب اور دوست حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم پر جو تیری ربوبیت کے مظہر ہیں اور تیری ذاتِ پاک کی مثال اور تیری قدرت کے نمونہ ہیں، پاکیزہ روح ہیں، تیرے حکم سے حیات (ایمان) اور بلند مرتبوں کی فضیلت عطا کرنے والے ہیں اور انسانوں کو فیض پہونچانے والے ہیں، فتح و کامرانی والے ہیں، اور تیرے نور کے روشن آفتاب ہیں۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ؕ

ابتداء کلام

لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوۡلُ اللّٰہِ

صَلِّ عَلٰی نَبِیِّنَا صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ

حَامِدًا وَّمُصَلِّیًا

"اسلام دینِ فطرت ہے۔ اور زمانے کے لئے پیامِ امن لے کر آیا ہے، سارے زمانہ پر احسان بن کر آیا ہے، حقیقت بینی، جمیعت بندی اور فروغ کو شرفِ انسانیت گردانتا ہے۔ اسلام کی باطنی خوبیاں، یعنی روح و قلب پر حق کے انوار، باطنِ انسانیت سے ہم آہنگ ہیں۔ اس لئے باطنِ انسانیت میں تبدیلی لاکر یہ ارتقائی راہ ہموار ہوسکتی ہے۔ اب یہ کام کسی ایک فرد کی سعی سے نہیں ہوسکتا کہ زمانہ اِنسان کی جمعی کوششوں کا زمانہ ہے۔ فقر میں بھی اِس جمیعت بندی کی ضرورت ہے تاکہ صاحبانِ خدمت جو اس وقت حیات ہیں اور پسِ پردہ اُن کے مشن کو یک رخی حاصل ہو۔" (از ارشاداتِ حضرت محمد عبید اللہ خاں درّانی رح)

یہ ایک مردِ درویش، فقیرِ باہوش کی صدا ہے جس میں قرونِ اولیٰ کے صدہا برس کے مجاہدے، صداقتیں، زمانے کی بے شمار کروٹیں، حوادث کی لاتعداد موجیں مضمر ہیں اور فروغِ اسلام کی تمناؤں، کلمۂ حق کی وسعتوں، رفعتوں اور گہرائیوں کی طرف محبّانِ اسلام کو دعوتِ فکر و عمل دے رہی ہیں۔

سوال یہ ہے؟

کہ فرد و جماعت کی شیرازہ بندی ہو کیسے؟ خواہ یہ جماعت ہم جیسے عام انسانوں کی ہو، یا ذہن کی سطح پر اُن لوگوں کی ہو جو مختلف شعبۂ حیات میں اپنی اپنی کارکردگی،

فکر، تجسس و تحقیق کے اثر چھوڑتے جا رہے ہیں، یا اُن سے بھی اوپر کی سطح کی وہ برگزیدہ ہستیاں ہوں جنہیں اولوا الالباب کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے، جو خود بھی حیاتِ جاوداں کی بشارتوں سے فیض یاب ہیں اور دوسروں کو بھی اِن بشارتوں تک پہنچانے کے لئے کوشاں ہیں۔

جواب صرف ایک ہے

کہ وہ توحیدِ عملی جو بنیادِ اسلام ہے اور روحِ اسلام بھی، اُس پر قائم رہتے ہوئے مسلمان علماء، مفکّرین، محققین کی ہر جماعت اپنے اپنے فنون و علوم کو ترقی دیتے ہوئے اُن کی صداقتِ باطنی کی حفاظت کو بھی عینِ ایمان جانے۔ اور ہمارے اربابِ فکر و نظر جو ظاہر و باطن کی یکائی کی سمجھ رکھتے ہیں وہ بھی فروعی اختلافات سے بلند ہو جائیں۔ تاکہ اللہ اور اُس کے رسولؐ کی وحدت جو "توحیدِ عملی" کی رُوح ہے قلوب پر آشکارا ہو اور ہم میں وہ اخوّت اور محبّت پیدا ہو جو محض مقصدیت کی یکائی سے نصیب ہوتی ہے۔ اس کے لئے ہمیں کلمۂ طیّبہ کی ضَوفشانیوں سے قلوب کو منوّر کرنا ہوگا، اور اُس فکری اور عملی توحید کی طرف لوگوں کو دعوت دینا ہوگا جو انبیاء علیہم السلام کا مشن رہا اور جس کو جاری رکھنے کا حکم امّتِ مسلمہ پر عائد کیا گیا۔

گویا ہمارا یہ پیغام ہوگا

اے اُمّتِ مسلمہ کے چاند ستارو! اے بادلوں میں چھپے ہوئے تارو! آؤ اُس نورِ السمٰوٰت والارض کے نُور سے اپنے وجود کو منوّر کرلو جو تمہاری لازوال نورانیت کا ضامن ہے۔ تمہاری صدا "ربّنا اللہ" ہے تو پھر آفاق ہو یا نفس، اس کی وسعتوں اور گہرائیوں میں غور کیوں نہیں کرتے؟ آفاق کی وسعتوں میں کھو کر، نفس کی گہرائیوں میں ڈوب کر اس یکائی کو پالو جو ہر شئے میں اپنے وجود کا اثبات اپنی قدرت اور حکمت کے ساتھ کر رہی ہے۔ یہی یکائی وہ اکائی ہے جو ماضی

حال مستقبل سے ماوریٰ، اوّل اور آخر سے بے نیاز، اسم اور اشارہ سے بھی وریٰ الوریٰ ہے۔ یہی تھی جب کچھ نہ تھا، اور یہی ہے جب سب کچھ ہے۔
اِسی کی یافت مقصدِ حیات ہے، اِسی کا عرفان معرفتِ ذات ہے۔

البتّہ

اِس تک پہونچنے کی راہ اُس حقیقت سے نسبت و تعلّق کے سوا کچھ نہیں جو خود اس یکتائی کا شاہکار ہے، جو اُس کے نور کا ظہور، اس کا نبیؐ، اس کا رسولؐ ہے جو اُس کا حبیبؐ اور عبدہٗ بن کر آیا اور عالم کے لئے رحمت کا پیغام لایا۔

یہی نورِ اوّل تھا جو تخلیقِ کائنات کا موجب بنا، پھر کائنات کی ہر شئے کا وجود اسی کا رہینِ منّت ہوا۔ اور اُس کے ربّ نے اسی نقطۂ نوری سے کائنات کی ہر شئے کو اُس کے مقام، اس کی افادیت و صلاحیت سے آراستہ کیا اور اُسے وہ حمد کے آداب سکھائے جو اُس کی تسبیح قرار پائی۔ پھر اس نور کو مقامِ خودشناسی پر لاکر خلافت کی نعمت سے سرفرازی بخشی۔ غرض یہ کاروانِ نوری رواں دواں رہا، اور رہے گا۔ جس نے جس قدر اس نورِ مبینؐ کی حقیقت و عظمت کو سمجھا، اسی قدر وہ حقیقت الحقائق، قادرِ مطلق، بے نیازِ زمان و مکان، کی شانِ یکتائی، اُس کی احدیت و صمدیت کی فہم سے سرفرازی پانے کا اہل بنا۔

اگر ہم ذرا غور کریں تو یہ کاروانِ حیات کسی کے باطن کی تجلّیات ہی کا ظہور ہے۔ یہ سفر باطن سے ظاہر کی طرف جاری ہے۔ اور اب اُس باطن کی یافت اسی ظاہر میں ہوتا ہے، خواہ وہ خارجی دنیا میں ہو یا خود ہماری اپنی ذات میں۔

یہ حقیقتِ مطلقہ حجاب در حجاب ظاہر ہو رہی ہے اور اُس کا یہ ظہور خود اس کی اپنی تمنائے دید، اپنی معرفت کی تڑپ ہے۔ خود حجاب اُٹھا رہی ہے اور ایک نقطۂ فروغِ تجلّی کو نکتۂ ایمانی بنا کر اپنی یافت کے دریچے کھول رہی ہے۔ بس اِسی نقطۂ حق کو پانا ہے جو خود بھی حق ہے، ترجمانِ حق ہے اور آئینۂ حق ہے۔

واصلِ حق ہونا اسی نقطۂ حق سے واصل ہونے کا ثمرہ ہے۔

یہی اسلام ہے، یہی دینِ فطرت ہے۔ اسلام اس لئے کہ موجبِ تسلیم ورضا ہے اور سلامتی کا ضامن بھی، اور حصولِ مقصد کا وسیلہ بھی۔ اور فطرت اس لئے کہ فاطر السمٰوٰت والارض نے اسے اپنی فطرت کے سانچے میں ڈھالا ہے، اور عالم پر احسان فرما کر ایک نبیؐ کامل، ایک رسولؐ برحق، خاتم النبیین کی بعثت اپنی ہی فطرت پر فرما کر اسے عالم کے لئے رحمت وہدایت بنا دیا ہے۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بتائی اور دکھائی ہوئی راہِ ہدایت کو "اَلدِّین" قرار دیا ہے، اور اس سے خود بھی راضی ہو گیا۔

اب کائنات کا کوئی ذرّہ، پانی کا کوئی قطرہ، ہوا کا کوئی جھونکا، صحراؤں کی کوئی صدا، جمادات ونباتات سے لے کر آسمانوں اور زمین کی کوئی شئے ایسی نہیں رہی جو اس ہی کے نورِ مُبین کے وجود کی رہینِ منّت نہ ہو، اور جس نے خود اپنا وجود اس نورِ مُبین کے وجودِ مبارکہ سے بالواسطہ یا بلاواسطہ حاصل نہ کیا ہو۔ اَوَّلُ مَا خَلَقَ اللّٰہُ نُوْرِیْ، اسی نورِ مُبین کی طرف اشارہ ہے۔ یعنی نورِ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم جس سے ہر شئے کی تخلیق فرمائی گئی، ہر شئے کو وجود بخشی کے لئے یہی نور وسیلہ بنا، جس کو جو ملا اسی سے ملا۔ اور خود یہ نورِ مُبین اپنے ربّ کے فیضانِ نور کا ظہور ہوا کہ نور سے نور کے سوا اور کیا ظاہر ہوتا۔

اس نورِ مُبین صلی اللہ علیہ وسلم کا کلمۂ طیّبہ اسی "اَلدِّین" کا عنوان ہے اور اس کلمہ کی حقّانیت، رفعت ووسعت پر سورۂ اخلاص اور سورۂ کوثر کی مہر ثبت ہے؏

زندگی کا یہ آخری موڑ ہے۔ عمر کے بیاسی سال غفلت میں گذر چکے ہیں۔ ایک

؏ یعنی قل ھو اللہ احد کی چار آیات، سورۂ کوثر کی ۳ آیات، کلمہ طیّبہ کے سات الفاظ سے ہم عدد ہیں۔

سنگین دَور ہے اور ایک سنگلاخ زمین پر زندگی کے بقیہ دن گذارنا ہیں۔ فیوض القرآن کی خدمت سے ربّ العزت نے فراغت بخشی تو دل نے کہا کہ قرآن تو وہ ہے جو صاحبِ قرآن سے ملاتا ہے اور صاحبِ قرآن اللہ سے ملاتے ہیں۔ کمر بستہ ہوجا اور اپنی کم مائگی، بے علمی کے باوجود انؐ کے دامنِ رحمت سے وابستگی کے لئے ایک کوشش کرلے، کیا عجب ہے کہ کرم فرمائی ہو اور کچھ عطا ہو ہی جائے۔

اس خیال کے آنے کے بعد جب بھی کوشش کی تو ہر بار اپنی بے مائگی کا احساس قوی سے قوی تر ہوتا گیا اور اس نورِ مُبین کی معرفت کی جانب نظر اُٹھانے کی ہمت نہ پڑی۔ بالآخر ڈھائی سال قبل پھر جب دربارِ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کی حاضری کی سعادت ہوئی تو اس بار ایک بزرگ مردِ درویش، سرشارِ حُبّ رسولؐ کی جانب واضح اشارہ فرمادیا گیا، اس ہدایتِ باطنی کے ساتھ کہ "استحکامِ نسبت کا ذریعہ اب تیرے لئے یہی ہیں اور اخلاق کی آراستگی اب ان ہی قدموں میں ہوگی"۔ رمضان المبارک میں واپسی ہوئی اور عید کے بعد حضرت بابا محمدؐ عبید اللہ دُرّانی رحمۃ اللہ علیہ سے شرفِ قدم بوسی اور بیعت کی سعادت حاصل ہوئی۔ آپ نے از راہِ کرم ایک کاپی پر "بسم اللہ" خود اپنے دستِ مبارک سے، اپنے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے لکھی، جس میں تمنّا، دعاءِ حُبّ، خضوع خشوع سب ہی کی کیفیات شامل تھیں۔ اس دورِ آخر میں بھی فیضانِ نبوّت کی ترجمانی کی سعادت ان ہی اللہ والوں کو نصیب ہے جو خود طٰہٰ اور یٰسٓ کی خوشبوؤں میں ڈوبے ہوتے ہیں، اور شمعِ ہدایت بن کر بنجر قلوب کو نورِ ایمان، حُبّ رسولؐ کریم سے منوّر کرتے رہتے ہیں۔ اگر کچھ تحریر میں آگیا تو یہ بھی صدقہ ہوگا، دربارِ بےکس پناہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی حاضری کا اور ان ہی کے فیوض و برکات کا جو صلوٰا علیہ وآلہٖ

میں جگہ پاتے ہیں۔

○

جو کچھ پیش کیا جارہا ہے یہ کوئی نئی چیز نہیں، کلام اللہ، احادیثِ مبارکہ کے شیدائی ان حقائق سے خوب آگاہ ہیں، بزرگانِ دین کی تفاسیر، محدثین کی تحقیق، سیرتِ پاک کے ترجمان اپنے اپنے انداز سے ان کی طرف اشارہ فرماتے ہیں، صوفیاءِ عظام ذرا کھل کر بات کرتے ہیں اور حجاب در حجاب کی فہم سے نوازتے ہیں اور گدایانِ محبت کے قلوب کو اِن حقائق کا عرفان عطا کرتے ہیں۔

اس حقیقتِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم، اس نورِ مبین کا ایک اجمالی خاکہ، نہایت اختصار کے ساتھ پیش کرنے کی خواہش کچھ اس لئے بھی ہو رہی ہے کہ دورِ حاضر کا ذہن جہاں مادی وسائل سے بہرہ مند ہونے کے لئے شب و روز کوشاں ہے، وہاں اس روحانی زندگی کی یافت کے لئے اس کا مزاج نہایت سطحیت پسند اور کوتاہ نظری پر مبنی ہے۔ اس کی فکر کا مرکز ادراک اور محسوسات تک محدود ہو جاتا ہے اور وہ لامحدود کو محدود سے جاننا اور سمجھنا چاہتا ہے۔ یؤمنون بالغیب جو فطرتِ مومن ہے، اس سے تغافل شعاری، اسلام کو اپنی فکر و فہم کے پیمانہ سے جانچنا اور سمجھنا اور پھر اُسے اپنی ضروریات اور اپنی فکر تک محدود کرنا ایسی نادانی ہے جو ہم کو رحمت سے دور کرتی جاتی ہے اور ہدایت کی راہ کھوٹی کرتی جاتی ہے۔ پھر ایک بڑی بدنصیبی یہ بھی ہے کہ جو فتنے ہمارے درپے ہیں۔ ہم اُن سے بے خبر تو نہیں لیکن بے پروا ضرور ہیں۔ روحِ اسلام سے بے رُخی، رحمتِ عالم سے کنارہ کشی ہمارا شعار بنتا جاتا ہے۔ باایں ہمہ اللہ تعالیٰ کا یہ احسان ہے

کہ ایمان کی چنگاری جو اس خاکسترِ غفلت میں دبی ہوئی ہے ابھی بجھی نہیں۔ کیا عجب ہے کہ یہ پھر شمعِ فروزاں بن جائے۔ ضرورت صرف رحمت سے لو لگانے کی ہے۔ رحمت تو آج بھی بے تابِ کرم ہے۔

بات سمجھنے کی صرف یہ ہے اور ہمیں نہ بھولنا چاہیئے کہ کلمۂ توحید لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ایک کلمہ ہے، ایک یکائی ہے، ایک توحیدِ مطلقہ کا ترجمان ہے۔ جب تک ہم محمدؐ رسول اللہ کے فہم سے بہرہ مند نہیں ہوتے لا الٰہ الا اللہ کو سمجھ ہی نہیں سکتے۔ کلمہ کے اس اہم جزد کے سمجھنے میں جو بھی کوتاہی ہوگی وہ ہماری لا الٰہ الا اللہ کی فہم میں حارج ہوگی، اور اندیشہ یہ ہے کہ کہیں دیگر اہلِ کتاب کی طرح ہم بھی اللہ کی ذات و صفات کے صحیح عرفان سے محروم نہ ہو جائیں (نعوذ باللہ)۔

یاد رہے! ہمارا اللہ وہی ہے جس نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو چنا، رسول بنا کر مبعوث فرمایا تاکہ ہم اُس کی بندگی اس طرح کریں جس طرح اس کے رسولؐ نے تعلیم فرمائی اور ہم اللہ کے متعلق وہی عقائد رکھیں جو آپؐ نے اپنے ربّ کے متعلق فرمائے۔ دینِ اسلام آپؐ ہی کی تعلیمات، آپؐ ہی کے اخلاق، آپ ہی کی فطرتِ سلیمہ آپ ہی کے اُسوۂ حسنہ کا نام ہے۔ اسی لئے بعض بزرگوں نے یوں فرمایا ہے، کہ مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهٗ میں نفس سے نفسِ رسولؐ ہی مراد ہے۔ جو اس نکتۂ ایمانی اِس بائے بسم اللہ، اس صادؐ صلی اللہ علیہ وسلم کو جس قدر سمجھ سکا، اُسی قدر وہ ربّ العزت کی کبریائی قدرت و حکمت سے بہرہ مند ہوا۔ حق یہ ہے کہ جسے میم محمدؐ، میم احمدؐ کا عرفان نہ ہو وہ اللہ کی احدیتِ ذات اور حمدِ باری تعالےٰ کو کیسے سمجھ سکتا ہے۔ منشا یہ ہے کہ جس کے وجودِ مبارکہ کی رہینِ منّت کُل کائنات ہے۔ اور جو کچھ اس میں ہے اور جس نے جو پایا ہے وہ اِس نورِ مبینؐ کے وسیلہ سے پایا ہے۔ گویا وہی

خالق اور مخلوق کے درمیان برزخِ کبریٰ ہے، فہم، حمد، عرفانِ باری تعالیٰ، ہر اعتبار سے۔ تو پھر جب تک اس کی عظمت، اس کی شان، اُس کی محبت، اس کی یافت کی تمنا ہمارا مقصدِ حیات نہ بن جائے ہم اپنے رب کی بندگی کا حق ادا ہی کیسے کر سکتے ہیں۔ اور اس کو کیا سمجھ سکتے ہیں۔

اِس نااہل، عاجز مسکین کی یہ پیش کش اِس نورِ مبینؐ کے انوار، اس کی رفعتوں اور وسعتوں کی طرف توجہ مبذول کرنے کی محض ایک سعیٔ ناتمام ہے جو اُس کے بحرِ انوار کا ایک قطرہ بھی نہیں۔ بایں ہمہ یہ ایک نذرانۂ اخلاص ضرور ہے۔ کیا عجب ہے کہ بارگاہِ ربّ العزت میں شرفِ قبولیت سے سرفرازی پائے، اور ہمارے نوجوانوں کے قلوب میں آقائے دوجہاں صلی اللہ علیہ وسلم سے اُسی والہانہ محبت کا وسیلہ بنے جو مومن کا سرمایۂ ایمان ہے۔ شاید اُنکی محبت، فروغِ اسلام کی تڑپ ان فتنوں کا سدِّ باب کر سکے جو ہماری اجتماعی زندگی اور سیرت کو گھن کی طرح کھوکھلا کرتے جا رہے ہیں۔

یہ حرفِ آغاز ہے، حرفِ آخر نہیں۔ اور اس تمنا کے ساتھ کہ شاید اربابِ نظر و بصیرت میں کسی صاحبِ قلب کو اللہ ربّ العزت کی بارگاہ سے یہ توفیقِ ارزانی ہو کہ اِس خاکہ کو جو سات ابواب پر مشتمل ہے، ایک ایک جامع کتاب کی صورت میں پیش کر سکے اور یقیناً یہ بھی صدقہ ہوگا انہیںؐ کا جنہیں رحمتؐ للعالمین، منبعِ علم و حکم، حریصٌ علیکم فرمایا گیا۔
صلی اللہ علیہ وسلم

کتاب کے یہ سات ابواب جو کلمہ کے سات حروف، قرآن کی سات منازل سے ہم عدد ہیں، کچھ اِس طرح ہیں۔

ابواب

باب	عنوان	دور
اوّل	ظہورِ نورِ مبین صلّی اللہ علیہ وسلّم تا تخلیقِ آدم	دورِ خدا شناسی
دوم	تخلیقِ آدم سے ظہورِ قدسی تک	دورِ خود شناسی
سوم	ولادتِ مبارکہ سے قبل نبوّت تک (مکّی زندگی)	دورِ تفکّر
چہارم	سرفرازئ نبوّت سے ہجرت تک (مکّی زندگی)	دورِ تبلیغ (۱)
پنجم	ہجرت سے وصال تک (مدنی زندگی)	دورِ تبلیغ (۲) تکمیلِ ایمان و اسلام
ششم	وصال سے نفخِ صور تک	دورِ فیضانِ رسالت قلبی تمثیلی و روحانی
ہفتم	قیامِ قیامت سے مقامِ محمود تک	دورِ شفاعت و مقامِ محمد صلّی اللہ علیہ وسلّم

بارگاہِ ربّ العزت میں یہ عاجز دست بہ دعا ہے کہ اس نورِ مبین کی لاتناہی وسعتوں اور عظمتوں سے ہمارے قلوب کو منوّر فرما دے اور ہمارے دِلوں، میں حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کی وہی محبّت پیدا فرما دے جو ایمان بھی ہے، سرمایۂ ایمان بھی، تکمیلِ ایمان بھی، اور موجبِ رحمت بھی، موجب ہدایت بھی، اور موجب عرفانِ ذاتِ باری تعالیٰ بھی۔

محبّت ہی کے صدقے میں یہ سب انوار کھلتے ہیں
وجودِ عالمِ امکان، شعورِ شانِ یکتائی

تمہید بابِ اوّل

اَوَّلُ مَا خَلَقَ اللّٰہُ نُوْرِیْ

محمدؐ نورِ اُو کزؔ نورِ اُو شُد
وجودِ جملہ شئے کاں درعدم بُد

(محمد صلّی اللہ علیہ وسلّم کا نور اُسی (سبحانہٗ وتعالیٰ کی) ذات کے نور سے ہے اور پھر تمام اشیاء کا وجود نورِ محمدی سے ہوا ہے)

(جامیؒ)

باب اوّل

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ؕ

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ الَّذِیۡ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضَ وَ جَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَ النُّوۡرَ ؕ

(الانعام آیت ۱۔)

تمام تعریفیں (قولی، فعلی، حالی) اللہ ہی کے لئے ہیں، جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور تاریکیاں اور اُجالا بنایا (زمین و آسمان، نور و ظلمت، خیر و شر سب کا خالق وہی قادرِ مطلق ہے، وہی بندگی کے لائق ہے)۔

وہ ایسا خالق ہے

۱۔ یَہۡدِی اللّٰہُ لِنُوۡرِہٖ مَنۡ یَّشَآءُ (النور ۳۵)

اللہ جس کو چاہتا ہے اپنے نور کی راہ دکھاتا ہے۔

۲۔ وَمَنۡ لَّمۡ یَجۡعَلِ اللّٰہُ لَہٗ نُوۡرًا فَمَا لَہٗ مِنۡ نُّوۡرٍ (النور ۴۰)

اور جسے اللہ ہی نورِ (ہدایت) نہ دے اس کے لئے کہیں بھی روشنی نہیں (نہ دُنیا میں نہ آخرت میں)۔

"اسلام ہی دینِ فطرت ہے" مشرق کا مزاج فلسفہ کی موشگافیوں میں گم ہو جانا، اور مغرب کی فطرت صرف اپنے مشاہدہ پر بھروسہ کرنا ہے۔ اسلام اور اسلامی تعلیمات کا مزاج اِن دونوں سے ایک مناسبت رکھتے ہوئے بھی حقیقت پسندانہ ہے۔ ایک طرف مشاہدہ کو تحقیق و تجربہ کی دعوت دیتا ہے تو دوسری طرف ذہن رسا کو اَفَلَا تَتَفَکَّرُوۡن کی۔ اور اُس کے اِس نظریئے کا تعلق آفاق و انفس دونوں سے یکساں ہے۔ چنانچہ:

کائنات کے وجود میں آنے سے لے کر موت اور بعد الموت تک کوئی مسئلہ

ایسا نہیں جس پر اس نے حقیقت پسندانہ انداز سے روشنی نہ ڈالی ہو۔ بلکہ یہاں تک حق پسندی کو سراہا کہ یہ اس کا کھلا چیلنج ہے کہ تم اللہ کے کلام اور اس کی کائنات میں کوئی تضاد نہ پیش کر سکو گے۔ چنانچہ فلسفہ کے تمام مکاتب فکر نے اس کے سامنے ہتھیار ڈالے، اور دورِ حاضر کا ذہن بھی دن بدن ان حقائق سے قریب آرہا ہے۔ اب نہ کوئی دل سے آواگون کا قائل ہے، نہ بت پرستی کا، نہ تثلیث کا، اور نہ روح کے خدا ہونے کا، بلکہ آج روح اور حیات بعد الممات کی فہم کے لئے بھی سائنس کی تجربہ گاہوں سے لے کر علمی حلقوں میں بڑی مستعدی سے کام ہو رہا ہے۔

تخلیقِ کائنات کے متعلق بھی اسلامی نظریۂ فکر نہ گائے کے سینگوں پر زمین کے قائم ہونے کا قائل ہے نہ صرف ایک دھماکہ سے عالم کے وجود میں آنے کو اپنی تحقیق کا حرفِ آغاز سمجھتا ہے۔ اس کی ہدایت کا سرچشمہ کلامِ ربانی ہے۔ یہ اسلام کی فطرت شناسی اور ترجمانیٔ فطرت ہے جو ہر مکتبۂ فکر کو خود اپنی اپنی راہوں سے حق تک پہونچنے کی طرف راہ نمائی فرما رہی ہے۔ صرف شرط یہ ہے کہ تعصب سے بلند ہو کر کشادہ قلبی اور کشادہ نظری سے اس کی تعلیمات کا مطالعہ کیا جائے، اور حق پر پردے نہ ڈالے جائیں، حق تک پہونچنا، حق کو جاننا، یہی مقصدِ فکر و نظر ہو۔

یہ بات بھی واضح رہے کہ حق کی یافت کے لئے اپنے محدود علم ہی پر بھروسہ نہ کیا جائے اور لامحدود کو محدود تک محصور نہ کیا جائے۔ اس لئے ان حقائق پر جن پر بہ سہا برس کی شہادتیں لکھوکھا صادق القول افراد کی سیرت اور زندگی گواہی دے دیں، اُن پر کم از کم ذرا یوں ہی ایمان لا کر ان حقائق کو سمجھنے کے لئے اپنے کو آمادہ کیا جائے۔ کیا عجب ہے کہ یہ آغاز انجامِ کار سے قریب لانے کا موجب ہو، اور پھر موجبِ ہدایت بن جائے۔

اس باب میں آفرینشِ کائنات سے تخلیقِ آدم علیہ السلام تک ایک نورِ مبین کی اس وابستگی کا ذکر ہے جو موجبِ تخلیقِ کائنات بھی ہے اور حقیقت الحقائق، ربّ العزت، باری تعالیٰ کی معرفت کا وسیلہ بھی۔ ایک طرف اس کا رُخ وسعت، پھیلاؤ، زمان و مکان کے محدود عالم سے وابستہ ہے، گویا ایک سفر ہے جو باطن سے ظاہر کی جانب رواں دواں ہے اور دوسری طرف خود اس نور کا باطن، اللہ کی ذات و صفات کی لامحدود بلندیوں اور گہرائیوں پر شاہد ہے جو بصارت سے زیادہ بصیرت کا محتاج ہے، جس کا تعلق واردات سے ہے، جو مدرکات سے بُلند، احساسات سے بالاتر ہے، جو صرف قلب و روح کے لئے ایک نعمت بن کر جُویائے حق پر کُھلتا ہے، کہیں تجلیات بن کر کہیں انوار بن کر، اور کبھی طیر و سیر کا ضامن ہو کر۔

یہی نورِ مبین وہ نکتۂ ایمانی ہے جس پہ ایمان لا کر کائنات کی یکائی، اس کا نظم و ضبط، اُس کی تخلیق کا مقصد کُھلتا ہے، اور انسان اور انسانیت کا مقام سمجھ میں آتا ہے، اس کی خلافت اس کا مسجودِ ملائک ہونا اس کی لامتناہی تسخیر کا راز عیاں ہو جاتا ہے۔ انسان پر خود یہ حقیقت آشکارا ہو جاتی ہے کہ وہ کہاں سے آیا ہے، کیوں آیا ہے اور اُسے کہاں جانا ہے۔ اس پر یہ حقیقت بھی منکشف ہو جاتی ہے کہ پرواز کے لئے ایمان و عمل کے دونوں بازوؤں کی ضرورت کیوں ہوتی ہے۔ اور یہ دو دراصل ایک ہی یکائی، ایک ہی مقصد کی یافت کے لئے ہیں، یعنی توحیدِ باری تعالےٰ کے لئے۔ واضح رہے کہ صفات، ذات ہی سے ظہور میں آتے ہیں لیکن کوئی صفت اور سب صفات مل کر بھی ذات نہیں بنا کرتی، ہاں صفات متعلق بذات ضرور ہوتے ہیں۔

"نورِ مبین" کی اسی حقیقت کا عرفان انسانیت کو اُس کے تمام لوازمات کی تکمیل کے بعد ہی دیا گیا۔ جس میں سب سے اہم علم ہے، جو صفتِ باری تعالیٰ

ہے، جو حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق کے بعد اُنہیں ؑ بارگاہِ ربّ العزّت سے خصوصی طور پر عطا ہوا، کہ انسان حق و باطل میں فرق کر سکے۔ اور اس کے حصول میں لگا رہے یہاں تک کہ وہ خود فطرتِ کائنات کا راز داں ہو جائے۔ پہلے علماً پھر عملاً پھر نوراً۔ اور اسی عرفانِ حق کی تبلیغ اس کا مقصدِ حیات بنے۔

اس باب کا تعلق عالم کے اس دور سے ہے جب کچھ نہ تھا، ذاتِ احد کی تاریکیاں تھیں، نہ مدتیں تھیں نہ زمانہ تھا۔ نہ عرش تھا نہ فرش تھا۔ نہ زمین تھی نہ آسمان تھا، نہ سورج تھا نہ چاند تھا، نہ دریا تھے نہ پہاڑ تھا۔ نہ سمندر تھے نہ میدان تھا۔ ایک وہ تھا وہی وہ۔ وہی ایک یکتا یگانہ اَحَدٌ صَمَدٌ لَمْ یَلِدْ وَلَمْ یُوْلَدْ وَلَمْ یَکُنْ لَّہٗ کُفُوًا اَحَدٌ ○

اس باب میں اس حقیقت کے عرفان کی طرف توجہ خود خالقِ کائنات مبذول فرما رہا ہے جس کا عرفان باعثِ عرفانِ باری تعالیٰ ہے۔ حدیثِ قدسی ہے:
کُنْتُ کَنْزاً مَخْفِیاً فَاَحْبَبْتُ اَنْ اُعْرَفَ فَخَلَقْتُ الْخَلْقَ لِاُعْرَفَ (میں ایک چھپا ہوا خزانہ تھا جب میں نے چاہا کہ جانا جاؤں تو میں نے "خلق" کو پیدا کیا تاکہ پہچانا جاؤں)

دوسری حدیث میں یہ الفاظ ہیں۔

کُنْتُ کَنْزاً مَخْفِیاً فَاَرَدْتُ اَنْ اُظْهِرَ فَخَلَقْتُ الْخَلْقَ

(میں ایک چھپا ہوا خزانہ تھا جب میں نے ظاہر ہونے کا ارادہ کیا تو خلقت کو پیدا کیا۔ خلقت سے مُراد مردِ کامل ہی ہے اور وہ حضور اقدس صلّی اللہ علیہ وسلّم کی ذاتِ پاک ہے کیونکہ سب سے پہلے آنحضرت ؐ کا نور پیدا کیا گیا تھا۔

(حضرت صوفی برکت علی مقالاتِ حکمت جلد اوّل صفحہ ۱۴)

گویا

اللہ رب العزت کی یہ عرفان کی تڑپ، یہ اَحْبَبْتُ کی "ہوک" ایک آئینۂ نورِ ذاتِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم بن کر ظاہر ہوئی جسے حقیقتِ محمدیہ سے خطاب کیا گیا اور جملہ کائنات کی تخلیق اُسی نور سے کی گئی جیسا کہ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے "اَوَّلُ مَا خَلَقَ اللّٰہُ نُوْرِیْ وَالْخَلْقُ کُلُّھُمْ مِنْ نُوْرِیْ" یعنی اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے میرے نور کو وجود بخشا اور میرے ہی نور سے تمام موجودات کی تخلیق فرمائی۔ اور اس "نورِ مبین" کی کما حقہٗ معرفت کو اپنی معرفت قرار دیا، کہ وہ ذاتِ بے ہمتا جیسی تھی ویسی ہی ہے ایک، اکیلا، بلا ہمسر، لاشریک، لَمْ یَلِدْ وَلَمْ یُوْلَدْ، سب اُس کے محتاج، وہ بے پروا، بے نیاز۔ سُبْحَانَ مَا اَعْظَمَ شَانُہٗ۔ سُبْحَانَ مَا اَعْلٰی مُقَامُہٗ

گویا یہ تخلیق ایک مقصد کے ساتھ ایک ہستیٔ کامل کے لئے، ذاتِ باری تعالےٰ کے ارادۂ قدرت وحکمت کے تحت وجود میں لائی گئی۔ جس میں نہ اُس کو مادہ و رُوح کی محتاجی تھی نہ اظہار کے لئے غیر کی حاجت۔

اب یہی عظیم نقطۂ نوری جو تخلیق کا

بائے بسم اللہ اور ظہور کا "ص" صلی اللہ علیہ وسلم بنا۔ اپنی تمام رعنائیوں، کیف سامانیوں، تجلیوں اور صلاحیتوں کے ساتھ بتدریج ظہور میں آرہا ہے۔ اور کُنْ فَیَکُوْن ہنوز جاری ہے۔ پھر اس کُنْ کے جامے میں ارتقائی منازل کی رُوح اس طرح سمودی گئی کہ ہر شئے اپنے وقت پر ظاہر ہو۔ تخلیق سے لے کر نفخِ صور تک اور اس کے بعد بھی۔ اسی حقیقت کو قرآن نے یوں بیان فرمایا کہ ہم نے آسمانوں اور زمین کو چھ دن (چھ ایّام، چھ منازل) میں تخلیق کیا۔ اور میرا عرش پانی پر تھا۔ یعنی قدرتِ کاملہ ہر شئے کا احاطہ کئے ہوئے تھی، یا یہ کہ پانی گویا مقامِ امر سمجھو جس سے کائنات کی حیات بخشی کی ضمانت دی گئی۔

الغرض محبت کی یہ پھلواری "مقصودِ کائنات" صلی اللہ علیہ وسلم کی معرفت کا

آغاز بنی۔ اور خود اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کو ربّ العزت نے اس حقیقت عظمٰی سے آگاہی یوں بخشی "لولاک لما اظہرت الربوبیۃ" اے حبیبؐ اگر آپ نہ ہوتے تو ہم کچھ پیدا ہی نہ کرتے گویا آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا یہ نور، یہ

"نورِ مبین"

وجہِ تخلیقِ کائنات کے ساتھ اُس احد و صمد کی ہویّتِ مطلقہ کی معرفت کا ذریعہ بنا جو مالکِ کون و مکان ہے۔

یَا حَیُّ یا قَیُّومُ

علم الارض کے ماہرین کی تحقیق کچھ اس انداز سے ہے کہ یہ زمین جڑی ہوئی پانی پر تھی، اور لاکھوں اور کروڑوں سال میں یہ الگ ہوئی۔ یہی حال آسمانوں کا ہو رہا تھا کہ ایک دھوئیں کی شکل تھی اور پھر ارتقاء کی منازل سے گذر کر ان کا وجود اس صورت میں آیا جو آج ہمارے سامنے ہے۔ سائنس ایک علم ہے جس کا مقصد مشاہدات اور تجربات کی بنا پر حقیقت تک پہونچنا ہے۔ سائنس دان کسی حقیقت کا منکر نہیں ہوتا بلکہ وہ اس کی تلاش اپنے تجربات کی بنا پر کرنا چاہتا ہے، اور پھر جس قدر اُس کو علم ہو اُسی پر وہ اکتفا کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔ برخلاف اس کے ایک مؤمن اپنے خالق کی کمالِ قدرت پر ایمان کے ساتھ، اس کے رسولؐ کی صداقت کا گواہ ہوتا ہے اور اُس کی منزلِ تحقیق کا رُخ ان حقائق کی جانب ہوتا ہے، جو اسے وحی یا اس کے نبیِ کریم کی زبانِ اقدس سے ملے ہیں، اور نتیجہ میں اسے علم معتبر نصیب ہوتا ہے۔ اس کی نظریہ ارتقائے ظاہری ہی کی پابند نہیں بلکہ وہ اپنی بصیرت کو ارتقائے باطن کا بھی جویا بناتا ہے لہٰذا اس کے سامنے منزل کا تعین بھی اُس کا مقصد ہے اور منزل کی یافت بھی۔

چنانچہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کا حضورؐ سے آفرینشِ کائنات کے متعلق سوال فرمانا انؓ کی بصیرت پر شاہد ہے۔ انہوں نے تخلیق ظاہری اور ارتقائے

روحانی کے متعلق اس طرح سوال فرما کر نہ صرف محققین کے لئے تحقیق کے در کھولے، بلکہ مؤمنین کے لئے ایمان و معرفت کے دریچے کھول دیئے۔

حضرت جابرؓ نے عرض کیا

"میرے ماں باپ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر فدا ہوں مجھے خبر دیجئے کہ سب اشیائے سے پہلے اللہ تعالےٰ نے کون سی چیز پیدا کی؟"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"اے جابرؓ اللہ تعالیٰ نے تمام اشیاء سے پہلے تیرے نبیؐ کا نور اپنے نور سے تخلیق فرمایا، پھر وہ نور قدرتِ الٰہیہ سے جہاں اللہ تعالےٰ کو منظور ہوا سیر کرتا رہا۔ اُس وقت نہ لوح تھی، نہ قلم تھا، نہ بہشت تھی نہ دوزخ تھی، نہ فرشتے تھے، نہ آسمان تھا نہ زمین تھی، نہ سورج تھا نہ چاند تھا، نہ جنّ تھے نہ انسان تھا"

(گویا یہ وہ دور تھا کہ احدیتِ ذات کے انوار کے سوا کچھ نہ تھا)

حدیث شریف جاری ہے۔

"پھر جب اللہ تعالےٰ نے مخلوق کو پیدا کرنا چاہا تو اس نور (یعنی نورِ مبین صلی اللہ علیہ وسلم) کے چار حصّے کیے۔

(۱) ایک حصّے سے قلم (۲) دوسرے حصّے سے لوح

(۳) تیسرے حصّے سے عرش (۴) چوتھے حصّے کو چار جزو میں تقسیم فرمایا

(۱) پہلے سے عرش اُٹھانے والے فرشتوں کو پیدا کیا۔ (۲) دوسرے سے کرسی سے متعلق فرشتے۔

(۳) تیسرے سے باقی سب ملائک (۴) اور پھر چوتھے کو یوں تقسیم فرمایا۔

پہلے حصّہ سے آسمانوں کو (۲) دوسرے حصّہ سے زمینوں کو

تیسرے حصّہ سے جنّت و دوزخ کو۔ پھر چوتھے حصّہ کو چار حصّوں میں تقسیم کیا۔

پہلے حصّہ سے مؤمنوں کی آنکھوں کے نور کو پیدا کیا۔

دوسرے سے اُن کے دل کے نُور کو (جس سے مراد اللہ تعالیٰ کی معرفت ہے)
تیسرے حصّہ سے اُن کا نورِ اُنس پیدا کیا وہ توحید ہے

لا الٰہ الّا اللہ محمّدٌ رّسُولُ اللہ

(الانوار المحمدیہ من مواہب لدنیہ مصری صفحہ ۹۔ از امام قسطانی "مرحباً مبارکاً مکرماً")
مقالات حکمت حضرت صوفی برکت علی صاحب لودھیانوی صفحہ ۱۳۶-۱۳۷)

اِس تخلیق کے متعلق حضرت جابرؓ سے ایک اور حدیث اسی مضمون کی مروی ہے جس میں حضورؐ نے فرمایا:

"اے جابرؓ اللہ تعالیٰ نے ہر شئے سے پہلے تمہارے نبیؐ کے نور کو پیدا کیا اپنے نور سے، اور اُس وقت نہ لوح تھی، نہ قلم تھا، نہ جنّت تھی نہ دوزخ تھی نہ آسمان تھے، نہ فرشتے تھے، نہ زمین تھی نہ سورج نہ چاند نہ جنّ نہ انسان۔

(حجۃ اللہ علی العالمین صفحہ ۳۸
مقالاتِ حکمت صفحہ ۱۳۷ جلد اوّل)

اِس نورِ مبین کے ظہور اور حضرت آدم علیہ السلام کے وجود میں آنے کے درمیان کتنا زمانہ گذرا اس کا اندازہ بھی اُس حدیثِ مبارکہ سے لگایا جا سکتا ہے جو حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ حضورِ اقدس صلّی اللہ علیہ وسلّم نے جبرئیل علیہ السلام سے دریافت کیا کہ اے جبرئیل تمہاری عمر کتنی ہے جبرئیل علیہ السلام نے عرض کیا حضورؐ مجھے خبر نہیں اِتنا جانتا ہوں، چوتھے حجاب میں ایک ستارہ ستّر ہزار برس کے بعد چمکا کرتا تھا، میں نے اُسے ستّر ہزار بار چمکتے دیکھا ہے۔ حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم نے سُن کر فرمایا وَعِزَّۃِ رَبِّیْ اَنَا ذٰلِکَ الْکَوْکَبُ مجھے میرے ربّ کی قسم میں وہی تارا ہوں۔ (تفسیر روح البیان جلد اوّل۔ مقالات حکمت صفحہ ۱۳۹)

ہے ان احادیث سے زمانہ تخلیقِ عالم کے سارے مسائل حل ہو جاتے ہیں۔ اور تخلیق سے پہلے کے مسائل بھی۔ (محترم الوالخیر کشفی صاحب)

بقول محترم صوفی صاحب کے یہ پانچ ارب چار کروڑ برس کا زمانہ اِس نورِ مبین کا ابتدائی دور ہوا۔" واضح رہے کہ اس میں جبرئیل علیہ السلام کی عمر کی طرف نشاندہی کی گئی، جب وہ خود نورِ مبین ؐ سے تخلیق تھے۔ پھر خود اُن کی تخلیق سے قبل کا دَور جس کا ذکر گذشتہ حدیث میں کیا گیا جہاں زمان تھا نہ مکان، اس کے حدود کا تعین کیسے کیا جاسکتا ہے۔ وہاں تو نورِ مبین صرف ذاتِ باری تعالیٰ کی شانِ کبریائی، اُس کی قدرتِ خفی کی سیر وطیر و معرفت میں گم تھا، جہاں قدرت و حکمت کے چشمے بھی جُدا نہ ہوئے تھے، گویا اُسی کی احدیت و صمدیت کا دَور تھا۔

البتّہ

یہ اربوں کروڑوں سال کا دَور تھا جب کہ ہر شئے کو اس نورِ مبین سے وجود میں لایا جارہا تھا، ایک ترتیب و تنظیم کے ساتھ تھا، ایک مدّتِ مقرّرہ میں جو صرف علمِ الٰہی میں تھی، اور لوح و قلم و عرش و کُرسی، اُن کے حامل ملائکہ، اور جملہ ملائکہ کی تخلیق اسی نور سے کی جارہی تھی، یعنی جو بھی صفات عرش کُرسی، لوح و قلم کو عطا ہو رہے تھے وہ سب اس نورِ مبین کے صفات کا جزوی ظہور تھے۔ جس کے صفاتِ کمال کا ظہور ابھی ہونا باقی تھا۔

پھر اس نور سے ملائکہ سے لے کر کائنات کی ہر شئے یہاں تک کہ ہر جنّ و انس سب نے آپؐ ہی کے نورِ وجود سے وجود بخشی پائی۔ اور کائنات کی ہر شئے کو، خواہ وہ آسمان و زمین ہوں، دریا و پہاڑ ہوں یا جنّ و انس سب کو جو کچھ مل رہا تھا وہ اِس نورِ مبین کا فیضِ اقدس و فیضِ مقدّس تھا۔ اللہ تعالیٰ کی مشیّت میں جن اشیاء کو جن صلاحیتوں سے بہرہ ور کرنا ہوتا اُن کے لئے وہ صلاحیتیں اسی نورِ مبین سے ماخوذ ہوتیں۔ تاکہ کائنات کے ذرّے ذرّے سے لے کر آفتاب تک، اِنس سے لے کر مَلک تک سب اپنے مرکزِ وجود سے متعلق رہیں اور اپنی اپنی ذمّہ داریوں اور اپنے اپنے اندازِ حمد اُنؐ ہی کے مبارک نور

سے پاکر مشغولِ تسبیح رہیں۔ اور یہ بات اِس لئے تھی کہ وہ مقصودِ کائنات صلّی اللہ علیہ وسلّم کی اطاعت واتباع کو اپنا فرضِ عین سمجھیں، اور اگر وہ کسی وقت کسی کو فرضِ منصبی سے ہٹا کر اپنی جانب حاضری کا حکم دیں تو اُسے عینِ عبادت، عینِ اطاعت سمجھ کر اُن کا حکم بجالائیں۔ اور اس لئے بھی تاکہ نبئ کریم اللہ کے حبیب کی رفعتِ شان اُن پر نمایاں رہے۔ اور اُن کی یہ شانِ نبوّت ابتداء ہی سے اُن پر ظاہر رہے۔

○

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں قرآنِ حکیم کی چند آیات کی طرف بھی قارئین کی توجّہ مبذول کرائی جائے، بعض کا ذکر ہو چکا ہے۔ تخلیقِ کائنات کے متعلّق قرآنِ حکیم میں متعدّد آیات ہیں۔ اگرچہ وہ الگ الگ مقامات پر ہیں لیکن آج بھی قرآنِ حکیم اپنی صداقت کا اعتراف ہر اس ذی علم سے کرالیتا ہے جو تعصب کی عینک اُتار کر ان آیات کا مطالعہ اپنی موجودہ سائنس ہی کی روشنی میں کیوں نہ کرے۔ اس سلسلہ میں ناظرین کی توجّہ دورِ حاضر کے ایک فرانسیسی مفکّر Dr Maurice Bucaille کی کتاب The Bible, The Quran & Science کی طرف مبذول کرنا کافی ہوگا، جو خود ان آیاتِ قرآنی سے متاثر ہو کر ایمان کی دولت سے سرفراز ہوئے، اور اس کتاب کے تراجم انگریزی، عربی، فارسی، ترکی، اُردو اور دوسری زبانوں میں ہوئے، اس کا باب The Creation of the Heavens and the Earth یعنی زمین اور آسمان کی تخلیق خاص طور پر قابلِ ذکر ہے، جس میں فاضل مصنّف نے نہ صرف تخلیق کے متعلّق قرآنی اندازِ بیان کی طرف توجّہ دلائی بلکہ اُس کی تنظیم کی طرف جو اللہ ربّ العزّت کی مشیّت سے متعلّق ہے، اُس کی طرف بھی متوجّہ کیا ہے، جس میں خصوصیّت کے ساتھ سورۂ انبیاء ۲۱، آیت ۳۰

اَوَلَمْ يَرَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰهُمَا ؕ وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ ؕ اَفَلَا يُؤْمِنُوْنَ ۝

"کیا جو لوگ کافر ہیں انہوں نے اس بات پر نظر نہیں کی کہ (یہ) آسمان و زمین ملے جلے تھے (دونوں میں امتیاز نہ تھا) پھر ہم نے اُن کو جُدا جُدا کر دیا (دونوں کو جُدا جُدا خواص بخشے، ارض میں قبولیت کی صلاحیت دی، آسمانوں سے بارش ہوئی) اور ہر جاندار شئے کی تخلیق پانی سے کی، پھر یہ لوگ کیوں ایمان نہیں لاتے (کیوں ان کے قلوب کائنات کو دیکھ کر خالقِ کائنات کی طرف رجوع نہیں ہوتے، (لوگ اِس زمین ہی کو دیکھ لیں)"

وَجَعَلْنَا فِي الْأَرْضِ رَوَاسِيَ أَنْ تَمِيدَ بِهِمْ وَجَعَلْنَا فِيهَا فِجَاجًا سُبُلًا لَعَلَّهُمْ يَهْتَدُونَ

"اور ہم نے زمین پر بھاری پہاڑ اس لئے رکھ دیئے تاکہ وہ لوگوں کو لے کر ہلنے (اور جھکنے) نہ لگے (اس میں ایک ثبات و استحکام آجائے)
اور ہم نے اس میں کشادہ راستے بنائے تاکہ لوگ راہ پائیں۔"

قرآنِ حکیم میں ہمیشہ حقائق کا بیان اس انداز سے ہوتا ہے کہ لوگ ہدایت پائیں، خَلق سے خالق کی طرف رجوع ہوں اور اس کی توحیدِ مطلقہ، قدرت و حکمت پر ایمان لا کر فیض یاب ہوں۔

بااین ہمہ فاضل مصنف نے ان آیات کو ایک جگہ جمع کر کے تخلیقِ کائنات کے متعلق بھی اسلامی فکر اور قرآن کی حقانیت کو مفکرینِ عالم کے سامنے پیش کیا ہے اور زمین و آسمان کی پیدائش اور اس کی تخلیق میں غور و فکر کی جو دعوت قرآنِ حکیم دیتا ہے اس کی طرف متوجہ کیا ہے۔ کہیں قرآن میں سات آسمانوں کے طبق در طبق ایک کے اُوپر ایک پیدا کرنے کا ذکر آتا ہے، کہیں چاند اور سُورج کی تخلیق سے عالم کو روشن کرنے اور مؤمن کے لئے ظُلمت سے نُور کی طرف لانے پر توجہ مبذول کی گئی ہے۔ اور اس طرح زمین اور اس قسم کی دیگر تخلیق کی طرف اشارہ فرما کر محققین کے لئے تحقیق کے در کھولے گئے ہیں۔ پھر ان سب کا اللہ سے متعلق ہونا، اس کی مِلک، اس کی ملکوت پر بار بار زور دینا اس لئے ہے

کہ یہ ساری تحقیق محض ایک ذہنی کاوش بن کر نہ رہ جائے، بلکہ اس کا اصل مقصد یعنی معرفتِ الٰہی انسان کا مقصدِ حیات بنے۔ قرآن اس حقیقت کو مختلف انداز سے بار بار ظاہر فرماتا ہے، مثلاً اسی سورۂ انبیاء[۲۱] میں کی آیات ۱۶، ۱۷ میں اس حقیقت کو یوں واضح فرمایا گیا ہے۔ کہ انسان کو سمجھنا چاہیئے کہ اس تخلیق کا ایک مقصد ہے ہم نے آسمان وزمین کو اور جو کچھ اس میں ہے تفریحاً نہیں بنایا، اور اگر ہمیں کھلونا ہی بنانا ہوتا (اور) ہم کو یہی کرنا ہوتا تو اپنے پاس سے (اپنی ہی ذات و صفات کے مشاہدے کو اپنا مشغلہ) بنا لیتے۔ منشا یہ ہے کہ زمین و آسمان کی تخلیق کوئی کھیل نہیں، یہ تو آخرت کے لئے ایک آزمائش گاہ ہے۔

○

چونکہ ہمارے اس کتاب کا موضوع "نورِ مبین" کی معرفت ہے۔ اور یہ بات واضح کرنا ہے کہ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی انوار و تجلیات کو صرف اُنؐ کی حیاتِ مبارکہ (جسم و جسمانیت) ہی تک محدود سمجھنا حقیقت شناسی سے گریز ہوگا اور حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت، وقار، مقامِ رسالت اور پیام کی ابدیت سے محرومی کا موجب بن سکتا ہے۔ اس لئے یہاں مختصراً لفظِ نور کی تشریح، اور اس کی وسعتوں پر ایک اجمالی نظر ڈالنا بھی ضروری ہے تاکہ اس نور کی اصل غایت، وحدتِ فکر و عمل واضح ہو اور اس سرچشمۂ عرفان کی افادیت کے فیوض کے ساتھ ہمارے لئے اس نورِ حقؐ کی وسعتیں، رفعتیں، اس کی کارکردگی کی یکتائی، توحیدِ مطلقہ کی فہم میں ہماری معاون ہو۔

نُور

عام اصطلاح میں لفظ "نُور" روشنی کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے، لیکن نُور اس کو کہتے ہیں جو روشن ہو اور دوسروں کو روشن کرے۔

یعنی دکھے، دیکھے اور دکھلائے۔ بایں ہمہ ربّ العزّت
کی صفتِ خاص ہونے کی وجہ سے اس کی معنویت کا احاطہ ممکن نہیں۔ اللہ تعالیٰ
نے اپنی اِس صفتِ خاص سے سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآنِ حکیم
کو مختص فرمایا ہے۔

قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّ كِتٰبٌ مُّبِيْنٌ (مائدہ آیت ۱۵ آخری جزو)

بے شک اللہ کی طرف سے تمہارے پاس نور آچکا ہے (یعنی نبیٔ آخر الزّمان) اور
کتابِ روشن (یعنی قرآنِ پاک)۔ قرآنِ حکیم میں اس کا ذکر اس سلسلہ میں آتا ہے
کہ اِس نورِ مجسّم اور نورِ کتاب سے اپنی رضا پر چلنے والوں کو سلامتی اور نجات
کی راہوں پہ لے جاتا ہے اور گُم راہی کی تاریکیوں سے نکالتا ہے اور راہِ ہدایت
دکھاتا ہے۔

اور ایک دوسری آیت میں نور کا بیان یوں آتا ہے:

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمْ بُرْهَانٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ اَنْزَلْنَآ
اِلَيْكُمْ نُوْرًا مُّبِيْنًا ○ سورۂ نساء آیت ۱۷۴

(اے لوگو بے شک تمہارے پاس تمہارے ربّ کی طرف سے بُرہان آچکا
ہے اور ہم نے تم پر نور (یعنی قرآنِ حکیم) نازل فرمایا ہے)۔ یہاں مُفسّرین نے
برہان سے سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم اور نُور سے قرآنِ حکیم مراد
لیا ہے۔

گویا۔ اللہ تعالیٰ نور ہے۔ اور قرآنِ حکیم اور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم
کو بھی نور سے تعبیر فرمایا ہے، اِس فرق کے ساتھ کہ اللہ کا نور، نورِ ذاتی ہے۔
اور نورِ مبین سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم اور کتاب اللہ کا نور، نورِ صفاتی ہے۔
یا یوں کہیں کہ نورِ مُبین جملہ صفاتِ باری تعالیٰ کا مظہر ہے، مظہرِ حق ہے، اور
قرآنِ حکیم اُس کے کلام کا نور ہے۔ دونوں بُرہان ہیں اور دونوں حق ہیں۔

لیکن واضح رہے کہ یہ نورِ (صفاتی) خود قائم نہیں۔ نور، عرض ہے (جو دوسری چیز کے سبب سے قائم ہوا ہے) صفت ہے۔ اس لئے اللہ کے حکم سے کام کرے گا۔ بے شک اللہ اپنے رسولؐ، اس نورِ مجسّم ہی سے اپنے بندوں کو راہِ ہدایت دکھاتا ہے۔ دیکھو، غلو میں نہ آجانا، ذات و صفات کا فرق ہمیشہ ملحوظِ خاطر رہے۔ ایک بات اور بھی ذہن نشین رہے کہ اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ کے معنی یہ نہیں کہ آسمان و زمین پہلے سے موجود تھے اللہ تعالیٰ کے نور نے اُنہیں دکھا دیا۔ بلکہ مفہوم یہ ہے کہ جو کچھ زمین و آسمان میں ہے اور خود زمین و آسمان اُس کے وجود کا ظہور ہے اور اُن کی حرکت و سکون اس واجب الوجوب[1] کے تابع ہے۔ چونکہ اس کائنات کا یہ کارخانہ ایک حکمتِ کاملہ سے چلانا منظور تھا، اس کے پہلے ایک نقطۂ آغاز، ایک تخم، ایک بیج، ایک نقطۂ نوری، جو اِن تمام صلاحیتوں

---

[1] واجب الوجوب :- جو اپنے وجود و بقا کے لئے غیر کا محتاج نہ ہو۔ وہ ذاتِ حق ہے جو اپنے وجود و قیام و بقا کے لئے کسی کی محتاج نہیں۔

واجب الوجود :- اسے کہتے ہیں جس کا وجود اسکی ذات کا مقتضا ہو

(سِرّ دلبراں ، ذوقی صفحہ ۳۳۱)

وحدت الوجود و وحدت شہود :- لفظ وجود کا اطلاق صوفیاء کرام کی اصطلاح میں واجب تعالیٰ پر ہوتا ہے، اور اس سے اُن کی مُراد یہ ہوتی ہے کہ صرف ذاتِ حق ہی ہے جو اپنی ذات سے قائم ہے برعکس دیگر اشیاء کے جو ہستی مطلق سے قائم ہیں

(سِرّ دلبراں صفحہ ۳۳۳)

[2] خلق : پیدا کرنا اور ظاہر کرنا دونوں معنوں میں آتا ہے۔ یہاں ظہور مُراد ہے۔

کا حامل ہو، جن سے اس دنیا کو آراستہ کرنا تھا۔ اس نقطۂ نوری کو ظاہر فرمایا۔ یعنی اللہ تعالےٰ کو جو بھی صفات اور جو بھی صلاحیتیں جو کچھ بھی کسی کو دینا مقصود تھا وہ سب اسی نقطۂ نوری میں جمع اور مضمر تھیں۔ اس نور کا ظہور اس جامعیت کے ساتھ اس لئے بھی ضروری تھا کہ کُل کائنات اور اس کی ہر شئے کے ظہور کا موجب اسی نور کو ہونا تھا اور اسی کو شجرِ عرفان بننا تھا۔ اس لئے جو کچھ بھی کائنات میں پیدا ہوا، اور جو بھی اسباب و علل وجود میں آئے، اور جو بھی صلاحیتیں، خصوصیات، اشیاءِ عالم کو عطا ہوئیں، وہ سب اس نورِ مبین کے ذریعہ مخصوص انداز اور مخصوص قواعد و ضوابط کے ساتھ ظہور میں لائی گئیں۔ یہ نورِ مبین ہی شاہکارِ حق تھا اور ہے

بقول حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نور فرمایا گیا اور اس ایک لفظ میں تمام کمالات کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ثابت کر دیا گیا۔ سو جو خود نور ہے محتاجِ بیانِ کمالات نہیں ہو سکتا۔ یہ تو میں (مولانا اشرف علی تھانویؒ) نے کہا کہ تمام کمالات کا مرجع نور ہے۔ علاوہ دلیل کے اس پر تمام عقلاءِ محققین، صوفیہ کرام کا اتفاق ہے اور ان حضرات کا فیصلہ ہے کہ اَصْلُ الْکَمَالَاتِ الْوُجُوْدُ (تمام کمالات کی اصل وجود ہے) اور اس کے مقابل میں اَصْلُ النَّقَائِصِ الْعَدَمُ (تمام نقائص کی اصل عدم ہے) پھر یہ بھی کہا کہ وجود، نور ہے کیونکہ اس سے موجود کا ظہور ہوتا ہے اور عدم ظلمت ہے کیونکہ اس میں شئے مخفی اور مستور ہوتی ہے۔ پس جس قدر وجود کامل ہوگا اسی قدر اس میں شانِ نور قوی ہو گی"

"حق تعالیٰ کا وجود سب سے اکمل ہے، وہ شانِ نور میں اصل ہے (یعنی اُس کی صفتِ ذاتی ہے)، اس میں یہ شان دوسروں سے زیادہ قوی ہوئی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مظہرِ اتم ہیں صفات اللہ کے، اس لئے آپؐ کو نور

کہا گیا (یعنی تمام کمالات کے جامع)۔"

"باقی یہ سوال نہ کیا جائے کہ پھر بعض جگہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کمالات کیوں ظاہر کئے گئے اور بعض جگہ قرآن کو بھی نور کہا گیا ہے۔

جواب اس کا یہ ہے کہ ہر مقام کا مقتضیٰ جدا ہے کہیں مخاطب کسی مذاق کا ہے اور اس کے لئے ہندی کی چندی کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ لفظ نور سے حضورؐ کے تمام کمالات پر استدلال نہ کر سکتا تھا، اس لئے کمالات کی تفصیل کی گئی، اور رہا قرآن کو بعض جگہ نور کہنا تو اس کا منشا بھی وہی ہے کہ قرآن بھی حق تعالیٰ کی صفات کا مظہر ہے اس لئے وہ بھی نور ہے۔"

(رسالہ النور از حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ صفحہ ۳۲)

یہ عاجز اس کو یوں سمجھا ہے کہ قرآنِ حکیم "کلام" بھی اللہ کا نور لئے ہوئے، اور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے سینۂ اقدس پر اس کلام کا نزول ہوا، وہی نور اس نور کے بوجھ کا متحمل ہو سکتا تھا جو جامعِ کمالات ہو۔ اس لئے حضورؐ نورٌ علیٰ نور ہیں۔

حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے اس نکتہ کو خوب سمجھایا ہے۔

"حقیقت یہ ہے کہ ان (یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم) میں دونوں شانیں موجود ہیں۔ قرآن میں حضورؐ کی شان ہے یعنی نور کی اور حضورؐ میں قرآن کی شان ہے یعنی کتابِ مبین کی۔ (سبحان اللہ)

حضرت مولاناؒ مزید تشریح فرماتے ہیں شاید تم کہو کہ حضورؐ میں کتاب کی شان کیونکر ہے۔ میں کہتا ہوں حضرت علی (کرم اللہ وجہہ) تو انسان کے متعلق فرماتے ہیں

دَوَاءُكَ فِيكَ وَمَا تَشْعُرُ ۔۔۔ وَدَاءُ مِنْكَ وَمَا تُبْصِرُ

وَاَنْتَ الْكِتَابُ الْمُبِيْنُ الَّذِيْ ۔۔۔ بِاَحْرُفِهٖ يَظْهَرُ الْمُضْمَرُ

وَتَزْعُمُ اَنَّكَ جِرْمٌ صَغِيْرٌ ۔۔۔ وَفِيْكَ انْطَوَى الْعَالَمُ الْاَكْبَرُ

ترجمہ۔ "تیری دوا تجھ میں ہے تو سمجھتا نہیں، اور تیری بیماری بھی تجھی میں سے پیدا ہوتی ہے مگر تجھ کو بصیرت حاصل نہیں ہوتی۔ تو تو وہ کتاب مبین ہے، جس کے حروف سے اسرارِ پوشیدہ ظاہر ہوتے رہتے ہیں۔ تو خود کو حقیر لاشئے سمجھتا ہے، حالانکہ ایک زبردست عالم تجھ میں موجود ہے۔"

حضرت مولاناؒ فرماتے ہیں۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ تو ہر شخص کی نسبت فرماتے ہیں کہ تم کتابِ مبین ہو، کیونکہ انسان مظہرِ اتم ہے الٰہیات کا، ملکوت کا۔ اس میں ہر شئے کی نظیر موجود ہے۔ تو پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شانِ کمال کا کیا کہنا کہ "اکمل البشر و افضل البشر" ہیں، آپؐ میں اگر قرآنِ حکیم کی شان اور لوحِ محفوظ کی شان موجود ہے تو کیا اشکال ہے۔

(اقتباس از رسالہ النور از مولانا اشرف علی تھانویؒ صفحات ۲۳ تا ۲۵)

(سبحان اللہ)

○

اس نورِ مبین کے ایک دوسرے رُخ کا ذکر بھی احادیثِ مبارکہ میں آتا ہے۔ حدیثِ شریف یوں ہے۔

اَوَّلُ مَا خَلَقَ اللّٰہُ الْعَقْلُ

سب سے پہلے جو شئے اللہ تعالیٰ نے خلق فرمائی وہ عقل ہے (اس کی تطبیق علمائے کرام اور صوفیاءِ عظام نے یوں کی ہے، کہ عقل اور نور دونوں کا اطلاق درحقیقت ایک ہی وجودِ محمدیؐ پر ہوتا ہے۔ یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا نورِ مبارک جملہ اشیاء کے وجود کا اور ساتھ ہی ان کے وجود کے مطابق اُن کی جملہ صلاحیتوں کی عطا کا موجب ہے۔ گویا نورِ مبین موجودات کے ظہور کا بھی باعث ہے اور ان کی صلاحیتوں کا بھی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم ذاتِ باری تعالیٰ کے جملہ صفات کا مظہرِ اتم ہیں۔

آپؐ ہی عقلِ اوّل، عقلِ کامل ہیں۔ عقل گویا اس نور کا عملی رُخ ہے، اس کا اظہار قلم سے ہوتا ہے۔ اس لیئے اس نور کو عقل و قلم سے بھی تعبیر کیا گیا ہے۔

تخلیقِ کائنات صوفیاءِ کرام کی نظر میں

تخلیقِ کائنات کو صوفیاءِ کرام نے یوں سمجھایا ہے؛

"نورِ محمدی کو رُوح تصوّر کرو اور اسے ایک بیج سمجھو جس میں جملہ صلاحیتیں مضمر ہیں۔ اب اس بیج و تخم سے جملہ روحیں پھوٹیں اور نکلیں۔ جس درخت سے شاخیں پھوٹتی ہیں اس میں پھل بھی آتے ہیں۔ یہ صرف ایک مثال ہے۔ اس مناسبت سے روحِ محمدیؐ کو روحِ کُلّی بھی کہتے ہیں۔ اور رُوحِ محمدیؐ سے محض تمام روحیں ہی نہیں پھوٹیں بلکہ تمام مادّے اور اجسام بھی پھوٹے۔ چنانچہ تمام روحیں، تمام مادّے، تمام اجسام رُوحِ محمدیؐ ہی سے نکلے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہیئے کہ پورا عالم ہی روحِ محمدیؐ سے ظہور میں آیا ہے۔ اس سے یہ بات بھی روشن ہوگئی کہ روحِ محمدیؐ کو پورے عالم پر، اور عالم کی ہر چیز پر، پورا پورا فطری تصرّف حاصل ہے اور ان سے اس کا پورا پورا جبلّی تعلّق قائم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ظہوری حیاتِ محمدیؐ کے زمانے میں روحِ محمدیؐ عالم کی ہر چیز پر جو تصرّفی انداز چاہتی تھی کر ڈالتی تھی"۔

(اقتباس از رسالہ حضرت مولانا آزاد سبحانی)

صوفیائے کرام کے نزدیک بھی جب غایتِ تخلیق معرفتِ الٰہی ہے تو اس کی یافت کا واحد وسیلہ نورِ محمدی صلّی اللہ علیہ وسلّم ہی کی یافت ہے۔ ان میں ایک جماعت وحدتُ الوجود کی قائل ہے اور دوسری وحدت الشہود کی۔ ایک کے نزدیک کُل کائنات "ھو الکُل" ہے (وہی وہ ہے، اس کے سوا کچھ نہیں)۔ دوسرے کے نزدیک ھُوَ البادی (وہی پیدا کرنے والا ہے)۔ دورِ حاضر کے ایک جیّد صوفی حضرت قبلہ برکت علی شاہ لودھیانوی نے خوب تطبیق فرمائی ہے۔

آپ فرماتے ہیں۔"وحدت الوجود ایک منزل ہے جو اللہ کی طرف سے زمین پر اُتاری جاتی ہے۔ اور وحدت الشہود ایک حال ہے جو اللہ کی طرف سے بندے پر وارد ہوتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت پر یہ منزل اور یہ حال گنتی ہی کے چند لوگوں پر ظاہر ہوا، اور جس وضاحت سے انہوں نے اس کو بیان کیا دوسرے نہ کر سکے۔"

(مقالاتِ حکمت صفحہ ۱۵۸، اور ۱۵۹)

مراتبِ ستہ، وجودِ باری تعالیٰ پر مقتدر و مستند کتب موجود ہیں۔

مراتبِ ستہ

جن میں تین احدیت[1]، وحدت[2] و واحدیت[3] یا الوہیت بطون میں، اور تین جبروت[1]، ملکوت[2] و ناسوت[3] (یعنی رُوح، مثال اور جسم) شہود میں تفصیل سے بیان کئے جاتے ہیں۔ ہم اپنے قارئین کی توجہ ایک ایسے بزرگ صوفی کی کتاب کی جانب مبذول کرنے کی سعادت حاصل کریں گے جنہوں نے اِن منازلِ ستہ کے نزول کو ایک انوکھے انداز سے پیش کیا ہے۔ یہ بزرگ حضرت خواجہ خوب محمد چشتی ؒ ہیں اور اُن کی کتاب کا نام "امواجِ خوبی" ہے۔ آپ کی کتاب گجراتی مثنوی کے ساتھ شائع ہوئی، جس کا ترجمہ استادِ محترم حضرت قبلہ احمد عبد الصمد قادری چشتی ؒ نے ادارہ معرفتِ اسلامیہ سے شائع فرمایا ہے۔ اس کتاب میں فاضل مصنف نے تفصیلِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کو پانچ مراتب میں مبین اور مفصل انداز میں بیان کیا ہے، جنہیں وہ حضراتِ خمسہ کہتے ہیں۔ یہ پانچ مراتب ہیں اور انہیں کو امواجِ خوبی میں تفصیل سے پیش کیا گیا ہے۔ یہ پانچ مراتب اور ان کا اجمال یوں ہے:۔

(۱) حضرتِ وحدت (۲) حضرتِ الوہیت (۳) حضرتِ رُوح (۴) حضرتِ مثال (۵) حضرتِ جسم۔

(۱) حضرتِ وحدت، کہ اطلاقِ ذات کی یافت ہے وہ بمنزلِ تخم کے ہے،

یعنی ہیچ۔ اجمال ہے، جمع اور تفصیل ہے۔
(۲) حضرتِ الوہیت میں ذات، اسم وصفت، حکم واثر کی تفصیل کو سمجھایا ہے، کیونکہ یہ مراتب (وحدت والوہیت) غیب اور غیر مخلوق ہیں، لبقیہ تین مراتب شہود و مخلوق ہیں، یعنی
(۳) حضرتِ روح۔ اس میں جان کا راز ظاہر کیا گیا ہے۔
(۴) حضرتِ مثال۔ اس میں دِل کا راز افشاء کیا گیا ہے۔
(۵) حضرت جسم اِس میں ہیولا (یعنی منسوب بہ مادّہ) کا بیان کیا گیا ہے۔

حضرت خواجہ خوب محمد چشتی، مصنفِ کتاب فرماتے ہیں کہ پانچ مراتب اطلاقِ ذات سے جو جمعِ اوّل ہے مرتّب ہوئے۔ ان کی تفصیل کتاب میں ایک شجرِ مبارک کی طرح روشن کرنا چاہتا ہوں۔

حسرت تو یہ ہے کہ زبان میں سکت اور بیان میں قوت ایسی نہیں کہ وہ خیر البشر علیہ السلام کی صفت کما حقہٗ (جیسا کہ چاہیئے) بیان کرے یا ادا کرے۔ البتّہ مقدور بھر کوشش کی ہے۔ اور اپنی گجراتی مثنوی "خوب ترنگ" کے ترجمہ کا نام امواجِ خوبی رکھا کہ یہ تصنیف سیّد المرسلین صلّی اللہ علیہ وسلّم کی نعت میں ہے، اور "وَمَا اَرۡسَلۡنٰکَ اِلَّا رَحۡمَۃً لِّلۡعٰلَمِیۡنَ کی تفسیر ہے"۔

حضرت خوب محمد چشتیؒ رقم طراز ہیں:۔

"ہزار سال کی محنت و مشقّت میں اگر مرتبۂ رسالت خیال میں آجائے تو سمجھو کہ بغیر کسی مشقّت اور محنت کے تم نے اس کو پا لیا۔ یاد رکھو کہ تم اس وقت خدا والے ہو گے جب محمد صلّی اللہ علیہ وسلّم کو پہچان لو۔ مَنۡ عَرَفَ نَفۡسَہٗ سے مراد نفسِ محمدی صلّی اللہ علیہ وسلّم ہے۔ پروردگار کی عرفان یعنی پہچان، محمد صلّی اللہ علیہ وسلّم کی عرفان اور پہچان پر موقوف ہے" (امواجِ خوبی صفحہ ۸)

صوفیائے کرام اور محققین کو نورِ محمدیؐ کی کوئی جھلک برہا برس کی اتباع، محبّت

اور عالم گم شدگی میں زندگی بسر کرکے ہی میسر آئی ہے۔ یہ سعادت محض توفیقِ الٰہی سے ملتی ہے۔ میرے استاد محترمؒ (حضرت احمد عبدالصمد فاروقیؒ) نے خوب فرمایا تھا کہ دیکھو لفظ اللہ کے عدد ۶۶ ہیں اور حضورؐ کے اسم مبارک مُحَمَّدؐ کے عدد ۹۲ یعنی ۱۱ ہیں۔ اب اگر تم وجودِ باری تعالیٰ کے منازلِ ستّۃ کی یافت کے خواہاں ہو تو سمجھ لو کہ ہر منزل کی یافت کا وسیلہ حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کے سوا کچھ نہیں (کیونکہ ۶۶ گیارہ اور چھے کا مضروب ہے اور "۱۱" ہی محمدؐ کے عدد سے ہم عدد ہے)۔

○

مختصراً اور اجمالاً یہ کہا جا سکتا ہے کہ نورِ محمدیؐ جسے اس مرتبہ میں نورِ مبین سے تعبیر کیا گیا، تمام تخلیق کی بنیاد، تمام کمالات کی جامع حقیقت، جملہ صفاتِ الٰہی کا مظہرِ اتمّ، اور جملہ مخلوق کا مُربّی ہے۔ خواہ انسان ہو یا جنّ، فرشتے ہوں یا عرش و فرش، لوح ہو یا قلم سب کی تخلیق انہیںؐ کے نورِ مبین سے ہوئی۔ اور آپؐ کا نور اللہ جلّ شانہٗ کے نور کا ظہور ہے، اور ربّ العالمین کی رحمانیت اور رحیمیت کا پرتو۔

یہ بھی واضح ہوا کہ جب جملہ اشیاءِ کائنات آپؐ ہی کے نور سے وجود میں آئیں تو آپ کی تصرّفاتی عمل کی وہ سب پابند ہیں جن کا ذکر زیادہ شرح و بسط سے اپنے اپنے مقام پر آئے گا۔ اور یہ بھی معلوم ہوا کہ کائنات کی جملہ صلاحیتیں اور استعداد آپؐ ہی کے فیضانِ نور کے باعث ہیں۔ اس لئے بھی کائنات آپؐ کے امر کے تابع ہے۔

یہ باب روحِ محمدی اور حقیقتِ محمدی سے متعلّق ہے کہ انسان کی پیدائش سے قبل ہی یہ نورِ مبین ان تمام ارواح میں جاری و ساری تھا جو اپنے وقت پر اِس کے جستہ جستہ صفات کی ترجمان بننے والی تھیں۔ ان میں بھی جن کو نبوّت

کے مراتب پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے قبل فائز ہونا تھا، اور ان مبارک ہستیوں میں بھی جو آپؐ کے حجاب کے بعد امتِ محمدیؐ کے درخشاں ستارے بن کر آسمانِ ولایت پر چمکنے والے تھے۔ اس لیے صوفیائے کرام نے مراتب نزولی میں حقیقتِ محمدی، روحِ محمدی، ظہورِ محمدی کے مراتب کو اپنے اپنے اندازِ بیان سے بیان فرما کر نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ کی فہم کے دریچے کھولے ہیں۔ اور جنہوں نے جس قدر اس حقیقت کو سمجھا ہے اس قدر اس کی ترجمانی فرمائی۔

مثلاً۔ حضرت خوب محمد چشتیؒ کا یہ فرمانا کہ ہزار سال کی محنت اور مشقت کے بعد اگر ہر نبرہ رسالت خیال میں آجائے تو سمجھ لو کہ بغیر کسی محنت اور مشقت کے تم نے اس کو پایا۔ نورِ مبین کی عظمتِ شان پر دال ہے۔

یا۔ حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کا یہ فرمانا۔

"ہر دور میں محققین اور صوفیاء کرام اور علماء راسخین کا یہی ایمان رہا ہے کہ ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم جو دنیا میں تشریف لائے تو سراپا نور بن کر آئے کہ خود بھی منور ہیں اور دوسروں کی ظلمت کو نور میں مبدل فرماتے ہیں، بشرطیکہ وہ نور کے طالب ہوں" (رسالہ النور صفحہ ۳۱)

اسی حقیقت کا اعتراف ہے۔

اس حقیقت کو حضرت مولانا آزاد سبحانیؒ نے ذرا واضح الفاظ میں یوں فرمایا ہے، اور اسے ظہورِ کلی کہا ہے:۔

"روحِ محمدی چونکہ تمام روحوں، تمام جسموں، تمام مادوں کی، تمام معقولوں کی اصل اور بنیاد ہے۔ لہٰذا لازمی ہے کہ روحِ محمدی پوری کائنات میں، اور کائنات کی ہر ہستی، اور ہر ہستی کے ہر رگ و ریشہ میں ظہور فرما ہو۔ پس روحِ محمدی پوری کائنات اور کائنات کی ہر ہستئ اِمکانی میں ظہور فرما ہے، اور وہ ہر موجودِ مخلوقی میں جلوہ گر ہے، ٹھیک اسی طرح جس طرح ذاتِ الٰہی ہر موجود میں ظہور

فرما ہے، اور ہر ہستی میں جلوہ گر ہے۔ فرق یہ ہے کہ ذاتِ الٰہی کا ظہورِ کلی اور تجلاءِ عمومی استقلالی رنگ میں ہے، یعنی کسی غیر کے عطیہ اور کسی غیر کے سہارے، کسی غیر کی مدد کے بغیر ہے، اور کسی دوسرے کے ضمن میں نہیں۔ بلکہ از خود ہے درخود ہے اور الگ تھلگ ہے۔ لیکن روحِ محمدی کا ظہورِ کلی اور تجلّاءِ عمومی اللہ کے عطیہ سے، اللہ کے سہارے سے، اور اللہ کی مدد سے ہے، اللہ کے ضمن میں ہے، اور اس سے لپٹ کر رہی ہے، نہ کہ از خود و درخود ہے، اور نہ الگ تھلگ ہے۔

اس لئے اگر یہ کہا جائے کہ ہر نبیؑ کے وجود میں روحِ محمدی بطور ایک جزو کے نورِ محمدی کے نام سے جلوہ گر رہی اور ہر نبیؑ کی زندگی میں ایک مربّی اور محافظ کی شان سے سہارے اور آسرے کا کام دیتی ہے تو یہ بالکل صحیح کہا گیا۔

(مولانا آزاد سبحانی)

اور اگر یہ کہا گیا کہ روحِ محمدیؐ فضائے عالم میں اس وقت اپنی نبوت کا پھریرا اُڑا رہی تھی جب کہ خود آدمؑ کا وجود پانی اور مٹی کے خمیر میں لوٹ پوٹ رہا تھا تو بالکل بجا کہا گیا، اور اگر یہ کہا گیا کہ پوری مخلوق میرے نور سے ہے جیسا کہ میں اللہ کے نور سے ہوں، تو بالکل درست کہا گیا۔

(رسالہ مولانا آزاد سبحانی صفحہ ۱۲ تا ۱۴)

"البتہ نورِ محمدیؐ کے ظہورِ کلی اور تجلاءِ عمومی کا نظارہ سب کے لئے عام نہیں جیسا کہ ذاتِ الٰہی کے ظہورِ کلّی اور تجلاءِ عمومی کا منظر سب کے لئے روشن نہیں" یہ تو وہ سمجھتے ہیں جو عارفِ باطن کہلاتے ہیں، اور وابستہ نور ہوگئے ہیں۔ "چنانچہ مجددِ الفِ ثانی شیخ احمد سرہندیؒ نے خود اپنے متعلق فرمایا کہ میں اپنے نور کو ہر ذرہ میں جاری و ساری پاتا ہوں اور پوری کائنات کو

اپنی ذات سے اس وثوق کے ساتھ وابستہ دیکھتا ہوں کہ اگر میری ذات درمیان سے اُٹھ جاتے تو پوری کائنات ہو جائے۔

(از رسالہ آزاد سبحانی صفحہ ۱۴)

جہاں غلامانِ محمدؐ کو یہ توسّل حاصل ہو وہاں اس نورِ مبینؐ کی عظمتِ شان کو کون پاسکتا ہے۔ سبحان اللہ

چنانچہ اگلا باب اس نورِ محمدی کی اسی جلوہ گری سے متعلّق ہے، جس کا تعلّق انبیاء علیہم السلام کی حیاتِ مبارکہ اور تعلیمات سے ہے۔ وہؑ سب کے سب اپنے زمانے میں انہیںؐ کے پرتو حسن واخلاق کا مظہر بن کر تشریف لائے۔ یہ سب ہی آسمانِ نبوّت کے ستارے تھے جو اسی نورِ مبینؐ اسی طٰہٰ یٰسٓ سے روشنی لے رہے تھے۔ وہی نورِ مبینؐ انؑ کی اصل حقیقت تھا اور وہیؐ اُنؑ کا اصل سہارا کہ بلا اس سہارے کے نہ توحیدِ مطلقہ کی تعلیم ہی ممکن تھی، اور نہ ربّ العزّت کی احدیتِ ذات اور شانِ یکتائی کے عرفان سے قلوب کو منوّر کیا جاسکتا تھا۔

باب دوم

پیدائشِ حضرت آدم علیہ السلام سے
ظہورِ قدسی صلی اللہ علیہ وسلم تک

خلقتِ عالم برائے نوعِ بشر شد
خلقتِ نوعِ بشر برائے محمد ؐ صلی اللہ علیہ وسلم

جامیؒ

فصلِ اوّل — حضرت آدمؑ سے حضرت نوحؑ تک
فصلِ دوم — حضرت نوحؑ سے حضرت ابراہیمؑ تک
فصلِ سوم — سیّدنا حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ظہورِ قدسیؐ تک

حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا:

بُعِثْتُ مِنْ خَيْرِ قُرُوْنِ بَنِيْ آدَمَ قَرْنًا فَقَرْنًا
حَتّٰى كُنْتُ مِنَ الْقَرْنِ الَّذِيْ كُنْتُ فِيْهِ

"مجھ کو آدمؑ کے بہترین طبقوں میں قرن کے بعد قرن (یعنی ہر قرن میں) پیدا کیا گیا یہاں تک کہ میں اس قرن میں پیدا ہوا جس میں کہ میں ہوں۔"

صحیح بخاری شریف مترجم اردو، کتاب الانبیاء
جلد دوم صفحہ ۳۴۵ ۔ حدیث ۷۶۹

باب دوم

(فصل اوّل)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

۱۔ اَلرَّحْمٰنُ ۝ رحمٰن (وہی ہے)

۲۔ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ ۝ (جس) نے قرآن کی تعلیم (سرکارِ دو عالم) کو دی

۳۔ خَلَقَ الْاِنْسَانَ ۝ (اسی نے) انسان کو پیدا فرمایا

۴۔ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ ۝ (پھر) اسی نے اس کو بولنا (اور بات کرنا) سکھایا (تاکہ معارف وحقائق سمجھ سکے اور سمجھا سکے)

"نورِ مبین" صلّی اللہ علیہ وسلّم کے ارتقائے رُوحانی کا یہ وہ دَور ہے جہاں وہ اپنے نزول میں عروجِ انسانیت کی نشان دہی کر رہا ہے۔ یہی وہ نور ہے جو مقامِ احدیتِ باری تعالیٰ میں ظہور بن کر چمکا، اور مقامِ وحدت میں اپنے رب کے وجود، علم، نور، شہود کا آئینہ دار بنا، پھر مقامِ الوہیّت میں "امرِ ربّی" کا مظہر اور انوارِ ربّانی کا ترجمان بنا، اور موجبِ تخلیقِ کائنات ہونے کے باعث کائنات کے ذرّہ ذرّہ کو اللہ باری تعالیٰ کی حمد و ثنا سے معمور فرما دیا۔

گلشنِ ہستی آراستہ ہے اور اب شخصِ انسانی کو

جو خلاصۂ کائنات ہے، صورت بخشی جارہی ہے۔ یعنی نورِ وجودی کو ایک ایسی صورت عطا کی جارہی ہے جو عرفانِ ذاتِ باری تعالیٰ کا اہل، صفاتِ باری تعالیٰ کا ترجمان ہو، جو اس زمین پر اللہ تعالیٰ کا خلیفہ ہو، اور پوری ذمّہ داریوں کے ساتھ آفاق و انفس میں خالقِ کائنات کی قدرت و حکمت دکھانے کا ضامن ہو۔

چنانچہ سیدنا حضرت آدم علیہ السّلام

کی تخلیق اُن ہی اربعہ عناصر سے ہوئی جن کی تخلیق خود حضورؐ ہی کے نور سے ہوئی تھی۔ اِن اربعہ عناصر میں "مٹی" کو ترجیح دی جاتی ہے۔ آب، باد، آتش کی ثانوی حیثیت ہے تاکہ اس میں عاجزی انکساری، جاذبیّت، عیب پوشی، قوّت نُمو کے اہم اجزاء نمایاں رہیں۔ باری تعالیٰ اسے خود اپنی صورت پر پیدا فرماتا ہے۔

خَلَقَ آدَمَ عَلٰی صُوْرَتِہٖ

اللہ تعالیٰ نے آدمؑ کو اپنی صورت پر پیدا فرمایا۔ صورت سے مراد جسم و جسمانیت نہیں، اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ اس سے بلند و بالا ہے۔ بلکہ "علیٰ صورتہٖ" سے مُراد وہ انوارِ ربِّ جلیل ہیں جن سے اسے سرفرازی بخشی گئی۔

یہ بھی یاد رہے کہ اللہ جیسا تھا ویسا ہی ہے۔ وہ ذات ہر تمثیل و اشارہ سے ماوریٰ، اور اسباب سے بالاتر ہے۔ اس کو صرف حقیقت الحقائق سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ جو کچھ ظہور میں نظر آتا ہے وہ اس کا حکم ہے۔ جو کچھ وجود میں آیا وہ ایک نورِ مبینؐ ہے جو صورتوں، نسبتوں، اضافتوں اور اعتبارات کی شکل لیتا، ہر شئے میں کارفرما ہے۔

پھر اس عاجزِ مسکین کا دل چاہتا ہے کہ یوں کہے کہ اللہ ربّ العزّت

نے حضرت آدم علیہ السلام کو اس صورت پر پیدا فرمایا جو اس نے اس "نورِ مبینؐ" کے لئے مختص فرمائی، جہاں اس نورؐ کو صورتِ بشری میں ظاہر ہونا تھا، اور بشریت کے حدود کو قائم رکھتے ہوئے اس کی شانِ رسالت کو ظاہر فرمانا تھا۔

اس لئے حضرتِ آدم علیہ السّلام سے لے کر حضرت عیسیٰ علیہ السّلام تک جتنے انبیاء علیہم السّلام آئیں گے وہ اِنہیں صلّی اللہ علیہ وسلّم کی ذات وصفات کے ترجمان، اِنہیںؐ کی فطرتِ طیبہ کے مظاہر، انؐ ہی کی کتابِ فطرت کے صحیفے ہوں گے، اِنہیںؐ کی سیرتِ پاک کا پَرتو ہوں گے۔

یہی نہیں بلکہ

حضرت آدمؑ کی پیشانی میں اس نورِ مبین کو ودیعت فرما کر اُسے آنے والے ان انبیاءؑ کا سہارا بنا دیا جائے گا، اور ان انبیاءؑ کا دَور محض ان انبیاءؑ کی تاریخ نہ ہوگی بلکہ خود اس نورِ مبینؐ کے انوار وتجلّیات، ومساعیٔ جمیلہ کی رُوئیداد ہوگی، اور وہ تمام افراد جن سے دنیا کو آباد کیا جائے گا، اُن کو بھی یہی پیکرِ بشریت عطا ہوں گے، ناسمجھ ان پیغمبروںؑ کو بھی اپنا جیسا انسان سمجھیں گے اور اُنؑ کی نبوت سے رُوگردانی کریں گے۔ اور سمجھ دار اُنہیںؑ اللہ کا رسول مان کر اپنی عاقبت سنوار لیں گے۔

انبیاء علیہم السّلام ایک کثیر تعداد میں جو ایک لاکھ چوبیس ہزار بتائی جاتی ہے، تشریف لاتے ہیں۔ گو یہ سبؑ ہی پرتوِ نورِ محمّدی صلّی اللہ علیہ وسلّم تھے، ہم انؑ میں سے چند کا یہاں اجمالاً ذکر کرنے کی سعادت حاصل کر رہے ہیں۔ یہ اس لئے بھی ضروری ہے کہ حضورِ اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کی روحِ مبارک اُس جہان میں انبیاء علیہم السّلام کی پیدائش سے قبل تمام نبیوں کی روحوں کی تربیت فرمانے والی اور اُنؑ پر علومِ الٰہیہ کو پہونچانے والی تھی۔ جس طرح دنیا میں تشریف آوری کے وقت تمام بنیؑ آدم علیہ السّلام کی طرف مبعوث اور

مرسَل ہیں۔" لہٰذا اُس جہان میں حضورِ اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم بالفعل خارج میں نبی و رسول تھے نہ کہ صرف علمِ الٰہی میں"

(مدارجِ نبوّت جلد دوم صفحہ ۲)

اور اس لئے بھی کہ اس نورِ مُبین کو پیشانیٔ آدمؑ میں جگہ دی گئی، اور اسی کی برکت سے آدم علیہ السلام کو تمام مخلوقات کے اسماء تعلیم فرمائے گئے اور اُنہیںؑ مسجودِ ملائک بننے کا شرف حاصل ہوا۔

اور اسی لئے بھی

یہی نورِ مبین پیشانیٔ آدمؑ یا پُشتِ آدمؑ سے مختلف انبیاء علیہم السّلام کی ذات میں منتقل ہوتا گیا۔ اور ان کی نبوّت میں بھی اُنؐ کا سہارا بنا۔

لہٰذا یہ کہنا حق ہوگا کہ تمام انبیاء علیہم السّلام کی تعلیمات، اخلاق و انوار اُسی نورِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلّم کے پرتو تھے، جو ہر دَور میں وقت کے اقتضا کے مطابق ظہور میں آئے۔ اور اس نورِ محمدیؐ کے جلوے بنے [1]

○

کہاں ترتیب تھی کوئی کہاں کوئی سلیقہ تھا
یہ نظمِ دوجہاں قائم ہوا ہے اُنؐ کے آنے سے

(مسرور کیفی)

---

[1] "اقبال کے الفاظ میں تمام انبیاء کرام مدارجِ محمدیؐ کے مرحلے ہیں۔"

(محترم ابوالخیر کشفی صاحب)

پہلا جلوہ

لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ آدَمُ صَفِیُّ اللّٰہِ

حضرت آدم علیہ السلام میں اِس نورِ پاک کا پہلا جلوہ نظر آتا ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق ہوتی ہے۔ تمام فرشتوں کو یہ حیرت ہے کہ ہم تسبیح و تقدیس کے لئے حاضر ہیں پھر آدمی کی کیا ضرورت، جو فتنہ و فساد کا موجب ہوگا۔ جواب دیا جاتا ہے کہ اِن اسرار کو ہم جانتے ہیں، تم نہیں جانتے۔ اور آدم علیہ السلام کی برتری اُن کی صفتِ علم سے ظاہر کی جاتی ہے، جو عطیہء ربانی تھا۔ فرشتے اپنی مجبوری ظاہر کرتے ہیں۔ اللہ رب العزت فرماتا ہے اَلَمْ اَقُلْ لَّکُمْ اِنِّیْٓ اَعْلَمُ غَیْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لا وَاَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا کُنْتُمْ تَکْتُمُوْنَ (البقرہ۔۳۳) کیا ہم نے تم سے نہ کہا تھا کہ زمین و آسمان کی (سب) پوشیدہ میں جانتا ہوں اور وہ بھی جانتا ہوں جو تم ظاہر کرتے ہو اور وہ بھی جانتا ہوں جو تم چھپاتے ہو۔ (دراصل آیتِ مبارکہ میں شیطان کو اس خطرے سے متنبہ کر دیا گیا جو وہ دل میں لئے بیٹھا تھا، بدبخت نے اس تنبیہ سے فائدہ نہ اُٹھایا اور امتحان کا وقت آ گیا)

حضرت آدمؑ کا قصہ یہاں دُہرانا منظور نہیں، بلکہ یہ پہلا انسان کوئی نااہل ناکارہ انسان نہ تھا، جو نہ خود شناس ہو نہ خُدا شناس، بلکہ وہ نوعِ بشر کا باپ تھا اور جملہ نوعِ بشر اُنہیںؑ کی اولاد ہے، جس میں خود ہمارے آقا حضور صلی اللہ علیہ وسلم شامل ہیں۔

یہ بھی واضح رہے کہ یہ وہ انسان نہیں جو گھاس پھوس سے بڑھ کر نباتات پھر حیوانات اور پھر صورتِ انسانی میں قوانینِ ارتقائے جسمانی کے مطابق ظاہر ہوا، بلکہ یہ وہ ہستی ہے جس کے لئے اللہ تعالیٰ نے جبرئیلِ امین کو حکم دیا کہ وہ

ہر خطّہ کی مٹّی جمع کریں، اور باری تعالیٰ نے خود اپنے دونوں ہاتھوں یعنی دستِ قدرت و دستِ حکمت سے اسے صورت عطا فرمائی۔ اور جب ڈھانچہ مکمّل ہوا تو نَفَخْتُ فِیْہِ مِنْ رُّوْحِی سے اُسے سرافرازی بخشی گئی۔ یعنی نورِ محمدیؐ کے فیضان سے اسے فیض یاب فرمایا گیا، اور آپؐ کے اخلاق، عادات، فطرت و تعلیمات کے وہ اجزاء جو اس ابتدائی دور کے لئے مناسب تھے اُن سے بہرہ ور کیا گیا۔ یہ بھی فیضانِ نورِ محمدیؐ تھا کہ جب حضرت آدم علیہ السّلام اُٹھ بیٹھے تو پہلا لفظ جو زبان پہ آیا تھا وہ تھا:

"اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ"

گویا یہ وہ لفظ تھا جس سے روحِ محمدی منوّر تھی اور جنؐ کے اسماءِ گرامی اسی حمد سے مشتق تھے۔

آسمانوں پہ احمدؐ زمین پہ محمّدؐ

اور یومِ حشر صاحبِ مقامِ محمود

صلّی اللہ علیہ وسلّم

اس نَفَخْتُ مِنْ رُّوْحِی

کا فیضان تھا کہ تمام فرشتوں کو حکم ہوا کہ اس کو سجدہ کرو۔ جسمِ مُردہ کو نہیں بلکہ حضرت آدمؑ کو، یعنی اس کو جہت بناؤ، یہ سجدہ بھی ہم ہی کو (اللہ ہی کو) ہوگا۔ سجدہ کا مقصد یہ بھی تھا کہ جملہ ملائکہ پر آدمؑ کی فضیلت آشکارا ہو جائے۔ چنانچہ جبرئیلِ امین سے لے کر حاملانِ عرش اور دیگر امور پر مستعدِ کار مَلک سب ہی سربسجود ہو گئے۔ نہیں سجدہ کیا تو شیطان نے جس کے دل میں کھوٹ تھی، اور سوال و جواب پر اُتر آیا، اور راندۂ بارگاہ ہوا۔ اس طرح خود انسان میں اس کا مَلک اُس کے تابع ہو گیا، نہیں تابع ہوا تو اس کا واہمہ جو صورتِ شیطان ہے۔

آدم علیہ السّلام کو نبوّت سے سرفرازی بخشی جاتی ہے
اور حضور سرورِ کائنات صلّی اللہ علیہ وسلّم کا ارشاد ہے کہ:

كُنْتُ نَبِيًّا وَإِنَّ آدَمَ لَمُنْجَدِلٌ فِي طِينَتِهٖ

میں اس وقت بھی نبی تھا کہ آدم اپنے خمیر میں تھے

یہ حدیثِ مبارکہ حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کی رسالت کی فہم وعظمت کی ترجمان ہے اور یہ بات ذہن نشین کرتی ہے۔

"ہر کامل اور ہر نبیِ مرسَل ؑ کا کمال اس سرچشمۂ کمالات صلّی اللہ علیہ وسلّم کے بہاؤ کا ایک مولود ہے، اور ہر بابرکت کی برکت اس سرچشمۂ برکات صلّی اللہ علیہ وسلّم کی روانی کی ایک نمود ہے۔" (آزاد سبحانی صفحہ ۲۳)

چنانچہ

جب ہم تعلیمات حضرت آدم علیہ السّلام پر قرآنِ حکیم کی روشنی میں ایک اجمالی نظر ڈالتے ہیں تو یہ حقیقت کھل کر سامنے آتی ہے کہ:

۱۔ فیضانِ نورِ مبین ؐ کا پہلا اثر یہ ہے کہ ہر انسان کے دل میں وجودِ باری تعالیٰ کا ایک احساس مضمر ہے جسے وہ کسی طرح الگ نہیں کرسکتا، خواہ وہ اُسے مانے یا نہ مانے۔

۲۔ اور اُن ؑ کی تعلیم کا لبّ لباب توحیدِ باری تعالیٰ کی فہم، رسالت کا مقصد اور مقام، اور آخرت کا برحق ہونا ہے۔ یعنی وہ عقائد ہیں جو اسلام کی بنیاد ہیں۔

۳۔ ان ؑ کی تعلیمات کی ابتداء تمیزِ خوش وناخوش اور خوفِ خدا سے ہوتی ہے، وہؑ یقیناً اس دورِ ابتدائی میں اپنی اولاد کو اپنی آنکھوں سے دیکھی ہوتی جنّت و دوزخ، ملائکہ، اور ربّ العزّت کی کبریائی اور قدرت کے بے شمار عجائبات سے باخبر کرتے ہوں گے۔ اور اس کھوئی ہوئی جنّت کو حاصل کرنے کی ترغیب فرماتے ہوں گے۔ جیسے "تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ

وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ" کی ابتدائی کڑی کہنا بے جا نہ ہوگا۔

۴۔ حضرت آدم علیہ السّلام کا عظیم عطیہ اپنی اولاد کے لئے ندامت توبہ، رجوع الی اللہ کی تعلیم تھی اور وہ عظیم دعا آج بھی ہماری عبادات کا اہم جزو ہے:
رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ
(اعراف ۲۳)

(دونوں التجا کرنے لگے کہ) "اے پروردگار ہم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا اور اگر تو ہمیں نہیں بخشے گا اور ہم پر رحم نہیں فرمائے گا تو ہم بڑے خسارے میں پڑ جائیں گے (تباہ ہو جائیں گے)"

حضرت آدم علیہ السّلام کے واقعات میں وہ میثاق بڑی اہمیت کا حامل ہے جو حضرت آدمؑ کی پشت سے تمام بنی نوعِ انسان کی ارواح کو نکال کر روزِ الست لیا گیا۔ اور جس کا ذکر سورۂ اعراف میں آتا ہے:

۱۷۲۔ وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِیْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّیَّتَهُمْ وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ ۚ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ؕ قَالُوْا بَلٰى ۚ شَهِدْنَا ۚ اَنْ تَقُوْلُوْا یَوْمَ الْقِیٰمَةِ اِنَّا كُنَّا عَنْ هٰذَا غٰفِلِیْنَ ۝

"اور جب آپ کے ربّ نے بنی آدم کی پشت در پشت اولاد کو نکالا اور خود اُن کے نفسوں پر گواہی دلوائی، فرمایا، کیا میں تمہارا ربّ نہیں ہوں۔ سب نے کہا کیوں نہیں (تو ہی ہمارا رب ہے) ہم اقرار کرتے ہیں (اور یہ عہد اس لئے تھا) کہ قیامت کے دن تم یہ نہ کہنے لگو کہ ہم کو اس کی خبر ہی نہ تھی"

۱۷۳۔ اَوْ تَقُوْلُوْٓا اِنَّمَآ اَشْرَكَ اٰبَآؤُنَا مِنْ قَبْلُ وَكُنَّا ذُرِّیَّةً مِّنْۢ بَعْدِهِمْ ۚ اَفَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ الْمُبْطِلُوْنَ ۝

"یا (یوں) کہنے لگو کہ شرک تو پہلے ہمارے باپ دادوں نے کیا تھا،

اور ہم اُن کی اولاد میں اُن کے بعد ہوئے۔ تو کیا جو کام گمُراہوں نے (ہم سے پہلے شروع) کیا اس پر تُو ہم کو ہلاک کرتا ہے (اس کا مواخذہ ہم سے کرتا ہے) "
اس میثاق کے سلسلہ میں مفسرین کا بیان ہے کہ جب اللہ رب العزت نے فرمایا

اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ کیا میں تمہارا رب نہیں

تو تمام رُوحوں میں جس نے سب سے پہلے "بَلٰی" فرمایا وہ یہی رُوحِ محمدؐی تھی جو تمام روحوں کی رہبری کی موجب بنی۔ اور آپؐ کے لفظ بَلٰی فرمانے پر پہلے انبیاءِ صالحین نے پھر جملہ خلقت نے بَلٰی کہا۔

گویا

یہاں بھی اس حقیقت کا اظہار ہو گیا کہ ہدایت و رحمت جن ؐ کی ذات سے وابستہ ہے اور جو ہر منزلِ حیات میں موجبِ خیر و رحمت ہے، وہ آپؐ ہی کی ذاتِ مبارکہ ہے جو خاتم النبییّن بن کر جلوہ گر ہو گی۔

یہاں یہ نکتہ بھی واضح ہو جاتا ہے

کہ خلافت فی الارض کا بوجھ بھی اس رُوحِ محمدؐی نے اُٹھایا اور جملہ انبیاء علیہم السّلام نے آپ ہی کی اعانت، آپ ہی کے باور پر باور کا نام ایمان جانا، اور جملہ انبیاءؑ کے متبعین بھی اُن کی شہادت میں اُن کے شریک ہوئے۔

بایں ہمہ ربّ العزت نے یہ ضروری سمجھا

کہ تمام انبیاءؑ سے بھی ایک عہد لیا جائے کہ اگر اُن کے زمانہ میں وہ رسول آئیں تو وہ اُن پر ایمان لائیں

چنانچہ اس میثاق کا ذکر

سورۂ آلِ عمران میں اِن الفاظ میں آتا ہے:

۸۱۔ وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّحِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ ؕ

قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ وَاَخَذْتُمْ عَلٰى ذٰلِكُمْ اِصْرِيْ ؕ قَالُوْٓا اَقْرَرْنَا ؕ قَالَ فَاشْهَدُوْا وَاَنَا مَعَكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ ۝

"اور (وہ وقت یاد کرو) جب اللہ تعالیٰ نے تمام پیغمبروں سے عہد لیا کہ جب تم کو کتاب و حکمت سے سرفراز کروں پھر تمہارے پاس پیغمبر آئے اس کتاب کی تصدیق کرنے والا جو تم کو دی گئی ہے تو تم اس پر ضرور ایمان لاؤ گے، اور لازماً اس کی مدد کرو گے۔ (پھر) فرمایا کیا تم سب پیغمبروں نے اقرار کیا، اور اس پر میرا عہد قبول کیا (یعنی تم خود اس نبی کو پاؤ تو اس کی تصدیق کرو، ورنہ اپنی اُمت کو تاکید کر جاؤ کہ بعد میں آنے والے اس پیغمبر کی تصدیق کریں۔ پیغمبروں کے میثاق میں ان کی امت شامل ہے۔ سب پیغمبروں نے) عرض کیا، ہم نے اقرار کیا (کہ ہم اپنے عہد پر ثابت قدم رہیں گے اور امت کو اس عہد پر ثابت قدم رہنے کی تاکید کریں گے) اللہ تعالیٰ نے فرمایا اس (عہد و پیمان) کے تم گواہ رہنا اور میں تمہارے ساتھ گواہوں میں ہوں۔"

۸۲۔ فَمَنْ تَوَلّٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝

پھر جو کوئی اس کے بعد روگردانی کرے (پھر جائے) تو وہی لوگ بے حکمے (فاسق و نافرمان) ہیں۔

ان بزرگ ہستیوں پر اللہ کی رحمت نازل ہو جو ایک مختصر جملہ میں اور چند سطور میں وہ حقائق بیان کر جاتے ہیں جن کے لئے ہم کتنا ہی کچھ لکھیں اس حقیقت کی ترجمانی سے قاصر رہتے ہیں۔

چنانچہ حضرت مولانا عبد الحق محدّث دہلوی رحؒ فَمَنْ تَوَلّٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ کا حوالہ دیتے ہوئے فرماتے ہیں۔

گویا

اس میثاق کی بنا پر اہلِ کتاب پر فرض ہو گیا تھا کہ وہ آپؐ پر ایمان لائیں۔

حضورؐ کی بعثت کے وقت تو سب انبیاء علیہم السلام گذر چکے تھے، لہٰذا متعیّن ہو گیا کہ میثاق امتوں پر ماخوذ ہے، اور اس کی تائید اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد بھی کر رہا ہے کہ "جو اس عہد سے روگردانی کرے وہی فاسق ہے" کیونکہ انبیاء علیہم السلام سے فسقِ عہد ممکن ہی نہ تھا، بایں ہمہ اگر:

"کلام کی بُنیاد فرض و تقدیر پہ ہے تو حق تعالیٰ کا یہ ارشاد کہ جو کوئی اس کے بعد رُدگردانی کرے تو وہی فاسقوں میں سے ہے، یہ بھی دُرست ہے، نیز جب نبیوںؑ کو حکم فرمایا اور اُن سے عہد لیا بر تقدیرِ حیات تو امتیوں پر اس کا وجوب بطریقِ اولیٰ ہوگا کہ وہ آپؐ پر ایمان لائیں اور آیت فَمَنْ تَوَلّٰی بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ کی نسبت امتیوں کے ساتھ ہے لہٰذا انبیاء علیہم السلام سے اخذِ میثاق اور ان پر تاکید و تقریر اور تشدید فرمانا مقصود میں زیادہ قوی اور داخل ہے۔

(مدارج النبوّت صفحہ ۱۴۹)

"امام سبکی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس آیت میں اشارہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم بر تقدیرِ حیاتِ انبیاء علیہم السلام اُن کے زمانہ میں اُن کی طرف مرسَل ہیں لہٰذا آپؐ کی نبوّت و رسالت عام ہے اور تمام مخلوق کے لئے آدم علیہ السلام کے زمانے سے قیامت تک شامل ہے اور تمام نبیؑ اور اُنؑ کی اُمتیں سب آپؐ کی امت ہیں۔ حضورِ انورؐ کا یہ ارشاد کہ تمام لوگوں کی جانب بھیجا گیا ہوں اور حق تعالیٰ کا یہ ارشاد وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ (اور نہیں بھیجا گیا آپؐ کو مگر تمام لوگوں کی طرف) تو یہ ارشادات آپؐ کے زمانۂ مبارک سے قیامت تک کے لوگوں کے ساتھ ہی مخصوص نہیں ہیں بلکہ اس میں وہ سب لوگ بھی شامل ہیں جو آپؐ سے پہلے گذر چکے ہیں، اور انبیاء علیہم السلام سے آپؐ کے لئے میثاق اس لئے فرمایا تاکہ

انہیں معلوم ہو جاتے کہ آپؐ اُن سب پر مقدّم و معظّم ہیں اور آپؐ اُن سب کے لئے نبی و رسول ہیں صلّی اللہ علیہ وسلّم۔ الہٰذا اے طالبانِ صادق انصاف سے غور و فکر کرو کہ نبی کریم صلّی اللہ علیہ وسلّم کی تعظیم و تکریم حق تعالےٰ کی جانب سے کتنی عظیم ہے۔ جب تم اسے جان لوگے تو معلوم ہو جائے گا کہ وہ سب محمد (صلّی اللہ علیہ وسلّم) کے نبی ہیں اور آپؐ نبی الانبیاء ہیں۔"

صلّی اللہ علیہ وسلّم۔ (مدارج النبوّت ۱۴۹-۱۵۰ جلد اوّل۔)

نورِ مبینؐ کا یہ خاکہ جو آپ کے پیشِ نظر ہے اُس نسبت کو ظاہر کرنے کی ایک عاجزانہ سعی ہے جو حضور سرورِ کائنات صلّی اللہ علیہ وسلّم کو جملہ انبیاء اور اُن کی اُمتّوں سے ہے، اور اپنی امت کے اُن تمام افراد سے جنہوں نے آپؐ کا زمانہ پایا یا آپؐ کے پردہ فرمانے کے بعد امتّی ہونے کا شرف حاصل کیا، سرورِ کائناتؐ کی یہ نسبت جس مخصوص انداز سے ہر دَور میں ہے اس کا ذکر آئندہ ابواب میں آئے گا، یہ وہی نورِ مبین کا پھیلاؤ ہے جو اَب کائنات کے وجود میں آنے کے بعد خود انسان اور انسانیت کے اندر ایک عظیم انداز سے جلوہ گر ہے اور اپنے ربّ کا شاہد، بشیر و نذیر بن کر لوگوں کے لئے فلاح کے دَر کھول رہا ہے اور علم و حکمت کی دعوت دے کر حق و حقّانیت اور ربوبیتِ باری تعالیٰ کی طرف آنے پر مجبور کر رہا ہے۔ اور خود نفوسِ انسانی میں ضمیر کی آواز بن کر ظلمت سے نور کی طرف لانے کے لئے بیتاب ہے۔ صلّی اللہ علیہ وسلّم

واضح رہے

کہ سیّدنا حضرت آدم علیہ السّلام کی تشریف آوری ایک طرف دنیا کی آبادی کی موجب بنی تو دوسری طرف مقاصدِ زندگی سے اولادِ آدم کو رُوشناس کرنے کا سبب ہوئی۔ اگر نبی کا کام خیر کی طرف دعوت تھا تو شرّ کی بنیادوں کے قیام سے شیطان بھی غافل نہ تھا۔ اولادِ آدمؑ میں ہابیل بھی پیدا ہوئے اور قابیل بھی اور اپنا اپنا ورثہ بنی نوعِ انسان کے لئے چھوڑ گئے۔ اس مشیّتِ ایزدی کے تحت کہ انسان اپنے مقصد کو سمجھ لے اور یقین کے ساتھ جان لے کہ گو دُنیا میں اللہ کی شانِ رحمانیت عام ہے لیکن اس کی شانِ رحیمی حشر میں نظر آئے گی اور اُن کا نصیبہ ہوگی جنہوں نے صحتِ عقیدہ اور حُسنِ عمل سے دنیا کی زندگی گذار لی، اور اللہ تعالیٰ کی رحمتِ لامتناہی سے فیض یاب ہوتے۔

قافلۂ ہستی رواں دواں ہوا اور فیضانِ رحمت کی ضیا باریاں نگرانِ حال ہیں۔ وہ نورِ پُرسرور جو پیشانیٔ آدم میں چمکا تھا اب وہی محسنِ انسانیت بن کر بنی نوعِ انسان کی جسمانی، قلبی اور رُوحانی ارتقاء کی ہر منزل میں ان کا معاون ہے۔ اسے فیضانِ نبوّت کہیئے یا رحمتِ باری تعالیٰ۔

فیضانِ نبوّت

کا یہ دَور تین حصّوں میں منقسم کیا جا سکتا ہے:

—— ایک حضرت آدمؑ سے حضرت نوحؑ تک۔

—— دوسرا حضرت نوحؑ سے حضرت سیّدنا ابراہیم علیہ السلام تک۔

—— اور تیسرا حضرت ابراہیم علیہ السّلام سے ظہورِ اقدس تک۔

اِن ادوار کے دو رُخ ہیں۔ ایک انسانیت کی ذہنی اور فکری زندگی سے متعلق ہے اور دوسرا انبیاء علیہم السّلام کی صداقتوں، قدرتوں، حکمتوں سے وابستہ ہے جو اپنے اپنے دور کے روشن چراغ تھے۔ نورِ ہدایت کے ضامن، اللہ کے برگزیدہ

پیغمبر، اور خود اس نورِ مبین کے انوار سے فیض یاب۔

حضرت آدم علیہ السّلام کے بعد کتبِ سیر میں دو نبیوں کا نام ملتا ہے۔ (۱) حضرت شیث علیہ السّلام (۲) دوسرے حضرت ادریس علیہ السّلام۔

حضرت شیث علیہ السّلام کے متعلق تو صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ حضرت آدم علیہ السّلام کے بیٹے اور پیغمبر تھے۔ آپؑ نے توحیدِ باری تعالیٰ کی طرف دعوت دی لیکن بہت کم لوگ آپ پر ایمان لائے اور انکارِ حق پر بضد رہے۔

دوسرے حضرت ادریس علیہ السّلام ہیں جن کے نام، نسب، زمانہ، سب کے متعلق اربابِ سیر میں اختلاف ہے۔ ایک جماعت انہیں حضرت نوح علیہ السّلام کا جدِّ امجد قرار دیتی ہے۔ اور دوسری ان کا زمانہ حضرت نوح علیہ السّلام کے بعد بتاتی ہے۔ ہم اس تاریخی اختلاف سے قطع نظر کر کے اُن کا ذکر حضرت نوح علیہ السّلام سے قبل ہی مناسب سمجھتے ہیں، جیسا کہ مفسّرین نے کیا ہے۔

حضرت ادریس علیہ السّلام

حضرت ادریس علیہ السّلام کا ذکر قرآنِ حکیم میں ان الفاظ میں آتا ہے:

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِدْرِيْسَ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا ۝ وَّرَفَعْنٰهُ مَكَانًا عَلِيًّا ۝

(مریم ۵۶-۵۷)

اور یاد کیجئے قرآن میں ادریسؑ کو، بے شک وہ سچے نبی تھے اور ہم نے اُن کا مقام بُلند کیا۔

ہمارے استادِ محترم حضرت عبدالصمد فاروقی چشتیؒ نے فرمایا کہ اُن کے زمانہ اور وقت سے قطع نظر کر کے اگر ہم حضرت ادریس علیہ السّلام کے اسمِ گرامی پر غور کریں تو ہمیں اُنؑ کے علم و عرفان کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔ ادریس، درس سے مشتق ہے۔ گویا ربّ العزت نے آپؑ کو انسانیت کو درسِ حکمت دینے کے لئے مبعوث فرمایا جس کی زمانہ کو ضرورت تھی اور آپؑ کو علوم و فنون میں برتری سے نوازا تھا، پھر آپ کو زندگی ہی میں آسمانوں پر مقام بلند عطا فرمایا گیا، جیسا کہ آپؑ کے آسمان پر جانے اور وہاں کے قیام کا واقعہ مفسّرینؒ نے لکھا ہے اور پھر حضور صلّی اللہ علیہ کا اُنؑ سے معراجِ مبارکہ میں چوتھے آسمان پر ملاقات کا ذکر فرمایا ہے۔

ہمارا مقصد یہاں حضرت ادریس علیہ السّلام کی ان خصوصیات سے ہے جن کا تعلق بنی نوعِ انسان کو علوم و فنون سے بہرہ ور کرنا تھا جو گویا اَلرَّحْمٰنُ ۝ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ ۝ خَلَقَ الْاِنْسَانَ ۝ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ ۝ (سورۂ رحمٰن) اور عَلَّمَ بِالْقَلَمِ کی تفسیریں ہیں۔

"صحیح ابن حبّان میں روایت ہے کہ حضرت ادریس پہلے شخص ہیں جنہوں

عہ ملاحظہ قصص القرآن جلد اوّل صفحہ ۹۱ واقعہ بحوالہ مفسر ابن جریر طبری

نے قلم کو استعمال کیا۔ ایک حدیث میں ہے کہ نبیِّ اکرم (صلّی اللہ علیہ وسلّم) سے کسی نے رمل کے خطوط کے متعلق سوال کیا تو آپ نے فرمایا، یہ علم ایک نبی کو دیا گیا تھا۔ پس اگر کسی شخص کے نقوش اس کے مطابق آجاتے ہیں تو نشانہ ٹھیک بیٹھ جاتا ہے ورنہ نہیں۔ (قصص القرآن سیوہاردی جلد اوّل صفحہ ۹۰)

علامہ جمال الدین قفطی نے تاریخِ حکماء میں حضرت ادریس علیہ السّلام کا ذکر کیا ہے اور ان کا شمار حکماء و فلاسفہ میں کیا ہے۔

چنانچہ قرآنِ حکیم کا حضرت ادریس علیہ السّلام کا ان بلند اور اعلیٰ الفاظ میں انبیاءِ سابقین کے ساتھ ذکر فرمانا اس لئے ہے کہ ہم صرف آپؑ کے ان حالات پر اکتفاء نہ کریں، جن کا انداز قصص کا ہے، بلکہ ہم اُنؑ کی سیرتِ طیبہ، انؑ کے اسوۂ حسنہ پر غور کریں اور دیکھیں کس طرح انہوں نے بنی نوعِ انسان کو اس کے ابتدائی دَور ہی میں ان علوم و فنون سے آشنا کیا جو اُن کی معاشی، معاشرتی اور اخلاقی زندگی کی بالیدگی میں معاون ہوئے۔

قدرت جب کسی شئے کو کسی کام کے لئے تخلیق فرماتی ہے تو اس کے لئے وہ اسباب فراہم فرما دیتی ہے جو اس کی ادائیگیِ فرائض کے لئے ضروری ہیں۔ کائنات انسان کے لئے تخلیق ہوئی اور وہ خود معرفتِ الٰہی کے لئے انتخاب کیا گیا تو ضروری تھا کہ رزقِ جسمانی کے ساتھ ذہن، قلب، رُوح کی بالیدگی کے جملہ اسباب سے بھی اُسے بہرہ ور کیا جائے۔ اس کے لئے انبیاء علیہم السّلام کا سلسلہ شروع ہوا، اور علم ہی کو برتری کا موجب قرار دیا گیا۔ اس علم کا سلسلہ حضرت آدم علیہ السّلام سے شروع ہوا، اور علم کی بُنیاد یعنی ذات و صفاتِ باری تعالےٰ سے اُنہیں اجمالاً آگاہی بخشی گئی۔ اب بڑھتی ہوئی آبادیوں کے ساتھ بڑھتی ہوئی

عـہ ملاحظہ قصص القرآن صفحہ ۹۱ ۔ واقعہ بحوالہ مفسر ابن جریر طبری

ضروریات کے لئے ضروری ہوا کہ معاشرت اور معیشت کے علوم بھی انبیاء علیہم السّلام ہی عام فرمائیں اور بالآخر اس علم کے جلوے اپنی پوری آب و تاب سے خود نبی آخر الزماںؐ کی ذاتِ مبارکہ میں جلوہ گر ہوں اور اُنؐ کی امّت کے لئے حصولِ علم بھی فرضِ عین ہو۔

یہ وہ دَور ہے کہ عُمریں ایک ہزار سال تک کی ہوتی تھیں اور انسانوں کے لئے اللہ کی زمین کشادہ تھی۔ حضرت ادریس علیہ السّلام کی پیدائش بابل میں ہوئی اور انہوں نے حضرت شیث بن آدم علیہ السّلام سے علم حاصل کیا، اور علمِ کلام کے مشہور عالم شہرستانی کہتے ہیں کہ اغثا دیمون جو اُنؑ کے اُستاد کا نام بتایا جاتا ہے، وہ در اصل حضرت شیث علیہ السّلام ہی کا نام تھا۔ جب سنِ شعور کو پہونچے تو نبوّت سے سرفرازی ملی، لیکن ان کو بھی حضرت شیث علیہ السّلام کی طرح تبلیغِ حق میں زیادہ کامیابی نہ ہوئی، منکرین اور مفسدین نے انؑ کی ایک نہ سُنی اور انؑ کی مخالفت پر کمر بستہ رہے، البتہ ایک مختصر جماعت ضرور مشرف باسلام ہوئی[1]

حضرت ادریس علیہ السلام کی مصر کی جانب ہجرت کا ذکر بھی مورّخ کرتے ہیں، جہاں پہونچ کر اُنؑ کے ساتھیوں کو نیل کی وادی نے بابل کے مناظر یاد دلا دیئے اور آپؑ کے رفقاء کی ایک جماعت نے وہیں قیام اختیار کر لیا۔ حضرت ادریس علیہ السّلام اپنے فرائضِ تبلیغ میں منہمک رہے۔ کہا جاتا ہے کہ انؑ کے زمانہ میں بہتّر زبانیں بولی جاتی تھیں، اور ان تمام زبانوں پر اللہ تعالیٰ نے انؑ کو قابو عطا فرما دیا تھا اور وہ ہر جماعت کو اس کی زبان میں تبلیغ فرمایا کرتے تھے۔

حضرت ادریس علیہ السّلام نے بنی نوعِ انسان کو جن تمدّنی اور معاشرتی

---

[1] قصص القرآن صفحہ ۹۴

آدابِ زندگی سے بہرہ مند کیا۔ ان کا ذکر مولانا سیوہاروی نے قصص قرآن میں کسی قدر تفصیل سے کیا ہے، چند اقتباسات درج ذیل ہیں:

"حضرت ادریس علیہ السلام نے امنِ دائمی کے پیغام کے علاوہ سیاستِ مدنی، شہری زندگی اور بود و ماند کے متمدن طریقوں کی بھی تعلیم و تلقین کی، اور اس کے لئے انہوںؑ نے ہر ایک فرقہ اور جماعت سے طلباءٔ جمع کئے اور ان کو مدنی سیاست اور اس کے اصول و قواعد سکھلائے جب یہ طلباء کامل اور ماہر بن کر اپنے قبائل کی طرف لوٹے تو انہوں نے شہر اور بستیاں آباد کیں، جن کو مدنی اصول پر بسایا، ان شہروں کی تعداد کم و بیش دو صد کے قریب تھی جس میں سب سے چھوٹا شہر "رہا" تھا، حضرت ادریسؑ نے ان طلباء کو دوسرے علوم کی بھی تعلیم دی جس میں حکمت اور علمِ نجوم جیسے علوم بھی شامل ہیں "حضرت ادریسؑ پہلی ہستی ہیں جنہوں نے علمِ حکمت و نجوم کی ابتداء کی، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے انؑ کو افلاک اور ان کی ترکیب، کواکب اور ان اجتماع و افتراق کے نقاط سے اور ان کے باہم کشش کے رموز و اسرار کی تعلیم دی اور ان کو علمِ عدد و حساب کا عالم بنایا اگر اس پیغمبرِ خدا کے ذریعہ ان علوم کا انکشاف نہ ہوتا تو انسانی طبائع کی وہاں تک رسائی مشکل تھی"۔ ؎

"انہوں نے مختلف گروہوں اور امتوں کے لئے ان کے مناسبِ حال قوانین و قواعد مقرر فرمائے۔ اور اقطاعِ عالم کو چار حصوں میں منقسم کیا، ہر ایک ربع کے لئے ایک حاکم مقرر کیا جو اس حصۂ زمین

؎ قصص قرآن جلد اول صفحہ ۹۶۔ اس اقتباس میں علمِ نجوم سے مراد فلکیات ہے۔

کی سیاست وملوکیت کا ذمہ دار قرار پایا، اور ان چاروں کے لئے ضروری قرار دیا کہ تمام قوانین سے مقدم شریعت کا وہ قانون رہے گا جس کی تعلیم وحیِ الٰہی کے ذریعہ دی گئی ہے

ان کی تعلیمات میں عقائد وایمان، توحید و رسالت و آخرت کے ساتھ مقررہ طریقِ عبادات، روزے، دشمنوں سے جہاد، زکوٰۃ، طہارت کے اصول بھی شامل ہیں خصوصیت کے ساتھ کتے اور سوئر سے اجتناب کرنا اور نشہ آور اشیاء سے پرہیز کرنا اُن کی تعلیم کا اہم جزو ہیں۔

چنانچہ حضرت ادریس علیہ السّلام ہی کے زمانے سے انسانیت کو معیشت تمدن، علوم کا ذوق اور ایک بیدار معاشرے کے آداب سے آگہی بخشی گئی۔ حضرت آدم علیہ السّلام کے زمانے کے رائج طریقۂ نذرِ الٰہی کو باقی رکھتے ہوئے اس کی اصلاح کی گئی۔ باغبانی، کاشت کاری کے طریقوں سے لوگوں کو آشنا کیا گیا۔ گویا حضرت آدم علیہ السّلام کی تشریف آوری کے بعد سب سے پہلے جو تعلیم اولادِ آدم کو نبیؑ کے ذریعہ دی گئی وہ ایک اچھا معاشرہ اور ایک خوشگوار زندگی کے آداب تھے۔

یہ بات بھی بڑی اہمیت کی حامل ہے کہ حضرت ادریسؑ نے اپنی امت کو خصوصیت کے ساتھ اپنے بعد آنے والے انبیاء علیہم السّلام کی سیرتِ پاک اور اندازِ اخلاق سے مطلع اور باخبر کیا اور بتایا کہ اُن کی خصوصیات یہ ہوں گی:

۱۔ وہ ہر ایک بُری بات سے بَری اور پاک ہوں گے۔
۲۔ قابلِ ستائش فضائل میں کامل ہوں گے۔

ہے قصص قرآن جلد اوّل صفحہ ۹۷۔

۳۔ زمین و آسمان کے احوال سے اور اُن امور سے جن میں کائنات کے لئے شفاء ہے یا مرض، وحیِ الٰہی کے ذریعہ اُن سے آگاہ ہوں گے۔

۴۔ اللہ تعالیٰ اُن کی دعا سُنے گا اور اُن کا نگرانِ حال ہوگا۔ ان کے مذہب کی دعوت کا خلاصہ اصلاحِ کائنات ہوگا۔[1]

حضرت ادریس علیہ السّلام کی تعلیمات اور نصائح اُن کی اس فطرت پر شاہد ہیں جو ایک معلّم اور مصلح کی ہوتی ہے۔ چنانچہ آپؑ کے نصائح میں ہے کہ

۱۔ اللہ تعالیٰ پر ایمان کے ساتھ ساتھ صبر فتح مندی کا باعث ہے۔

۲۔ حقیقی مسرّتیں اللہ تعالیٰ کے فرائض کی حفاظت میں پوشیدہ ہیں، اور دین کا کمال شریعت سے وابستہ ہے اور مروّت میں کمالِ دین کی تکمیل ہے۔

۳۔ سعادت مند وہ ہے جو اپنے نفس کی نگرانی کرے اور پروردگار کے سامنے انسان کے شفیع اس کے اپنے نیک اعمال ہیں۔

۴۔ جو علم میں کمال اور عملِ صالح کا خواہش مند ہو اس کو جہالت کے اسباب اور بدکاری کے قریب نہیں جانا چاہیئے۔

۵۔ دنیا کی بھلائی "حسرت" ہے اور بُرائی "ندامت"۔

۶۔ خدا کی یاد اور عملِ صالح میں خلوصِ نیت شرط ہے۔

۷۔ حکمت روح کی زندگی ہے۔

۸۔ نہ جھوٹی قسمیں کھاؤ، نہ اللہ تعالیٰ کے نام کو قسموں کیلئے تختۂ مشق بناؤ۔

۹۔ اللہ کے شکر گذار بندے بنو، اور حمدِ الٰہی میں اپنی زبان تر رکھو۔

۱۰۔ دوسروں کی خوشی اور عیش پر حسد نہ کرو، اس لئے کہ یہ سرور زندگی چند روزہ ہے۔ قناعت ہی میں فلاح ہے۔[2]

---

[1] قصص القرآن جلد اوّل، مولانا سیوہاری۔ صفحہ ۹۷

[2] اقتباس از قصص القرآن جلد اوّل صفحہ ۹۹ و ۱۰۰

حضرت ادریس علیہ السّلام کا زمانہ حضرت آدم علیہ السّلام کے لبعد ہی تصوّر کیا جائے یا حضرت نوح علیہ السّلام کے لبعد، اہم بات یہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السّلام کی پیدائش کی اصل غایت یہ تھی کہ انسانیت کو معرفتِ الٰہی سے فیض یاب کرنے کے ساتھ تہذیب و تمدّن، حسنِ معاشرہ کے وہ آداب عطا ہوں جو خلافت فی الارض کے لئے ضروری تھے۔ چنانچہ حضرت ادریس علیہ السّلام کا یہ دَور، حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کی فطرتِ مبارکہ کے چند اہم اجزاء کا ترجمان ہے۔ عمل میں نیّت کی اہمیّت، حمد میں ہمہ تن مشغولیت، علم و حکمت کی اہمیت، اس کے حصول میں جدّ و جہد، لوگوں کی خیر خواہی، برائی سے اجتناب، کیا یہ وہی اجزاءِ دینِ اسلام نہیں، جن کی ترجمانی حضرت ادریس علیہ السّلام کی زبان و عمل سے ہو رہی ہے، بلکہ اگر ہم یوں کہیں ———— کہ کیا یہ سب تعلیمات جو حضرت ادریس علیہ السلام اپنی جماعتوں کو دے رہے ہیں خود انؑ کی اپنی فطرتِ صالحہ کی ترجمان نہیں، وہ فطرت جو انہیںؑ نبیِّ محترم سیّد المرسلین خاتم النّبیینؐ صلّی اللہ علیہ وسلّم کے نورِ وجود سے ملی تھی۔ ؎

حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم نے جہاں اپنی تخلیق کے متعلق یہ فرمایا کہ اَوَّلُ مَا خَلَقَ اللّٰہُ نُوْرِی (جو چیز اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے پیدا فرمائی وہ میرا نور ہے)۔ اس کے ساتھ یوں بھی احادیث میں آتا ہے:

اَوَّلُ مَا خَلَقَ اللّٰہُ الْعَقْلَ اور اَوَّلُ مَا خَلَقَ اللّٰہُ الْقَلَمَ در اصل اِن احادیث میں "عقل" اور قلم (ترجمانِ علم) دونوں حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم ہی کی بنیادی خصوصیات ہیں جن سے آپ کو بدرجۂ اتم نوازا گیا اور انہیںؐ کا فیضان انبیاء علیہم السّلام میں نظر آیا۔

؎ یہ نکتہ آگے تدریجاً آیا ہے۔ (جناب ابوالخیر کشفی صاحب)

اس لئے اگر ہم حضرت ادریس علیہ السّلام کی زندگی، تعلیمات، اندازِ تبلیغ پر غور کریں تو ہم اس نتیجہ پر پہونچیں گے کہ یہ حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم ہی کی ذات وصفات کی جھلکیاں ہیں۔

اگر حضرت ادریس علیہ السّلام کا اسمِ مبارک اور اُن ؑ کی تعلیمات ان ؑ کے علم پر شاہد ہیں، تو یہ بات کہ انہوں نے سب سے پہلے قلم کو استعمال فرمایا، حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم سے اُن کی خصوصی نسبت کی شہادت و دلیل ہے اَوَّلُ مَا خَلَقَ اللّٰہُ الْقَلَمَ کے تحت۔ پھر حضرت ادریس علیہ السّلام کے قلب میں اس علم وعمل کی تڑپ، آسمانوں پہ اُٹھائے جانے کا عمل، یہ سب اِس نورِ پاک کا صدقہ تھا کہ ربّ العزت نے انہیں ؑ

وَرَفَعْنٰهُ مَكَانًا عَلِيًّا (مریم - ۵۷)

کی منزل تک پہنچایا۔ ان ؑ کا قلب علم وعرفان کی لذّتوں سے سرشار ہوا اور جسمانی طور پر بھی اُنہیں ؑ چوتھے آسمان پر قیام سے سرفرازی بخشی گئی گویا حضرت ادریس علیہ السّلام کی سیرت اور تعلیمات دونوں حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کی سیرتِ مبارکہ کی جھلکیاں اور حسنِ معاشرہ کے متعلق آپ ؐ کی تعلیمات کے اوّلین نقوش ہیں۔

○

آیئے اس فیضانِ نبوّت کے انوار کا مطالعہ سیّدنا نوح علیہ السّلام کی حیاتِ مبارکہ میں کریں کہ اُن کو نوح نجیّ اللہ کے لقب سے نوازا گیا۔ کہ اب نورِ مبین ؐ کا فیضِ نورانی آدم ؑ صفیّ اللہ سے نوح ؑ نجیّ اللہ تک پہنچ رہا ہے جسے اُس کی پہلی منزل کہنا چاہیئے۔

صلّوا علیہ و آلہ

باب دوم
فصل دوم

دوسرا جلوہ

حضرت نوح علیہ السّلام

لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ نُوْحٌ نَجِیُّ اللّٰہِ

حضرت نوح علیہ السّلام پہلے نبی ہیں جنہیں شریعت عطا ہوئی اور رسالت سے نوازا گیا۔ تخلیقِ حضرت آدم علیہ السّلام سے لے کر تخلیق نوح علیہ السّلام تک کتنا زمانہ گذرا اس کا صحیح اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ توریت کے مطابق یہ زمانہ ۱۰۵۶ سال ہے لیکن یہ سب محض ظن اور اندازے ہیں، تاریخ کے گذران کے پیمانے نہیں۔

حضرت نوح علیہ السّلام کو آدم ثانی کہتے ہیں کیونکہ حضرت نوح علیہ السّلام کی بعثت سے پہلے خدا کی مخلوق حضرت آدم علیہ السّلام کی دعوتِ توحید و رسالت سے یکسر ناآشنا ہو چکی تھی، اور بُت پرستی ان کا شعار ہو گیا تھا۔ اور ان کی راہِ ہدایت کے لئے آپؑ کو ایک شریعت کے ساتھ مبعوث کیا گیا تھا۔ قرآنِ حکیم میں کثرت سے حضرت نوح علیہ السلام کی تبلیغی جدّوجہد اور انؑ کی قوم کے مسلسل انکار کا ذکر آیا ہے، اور ہر جگہ حضرت نوح علیہ السّلام کا صبر و استقلال، عزم انؑ کے نورِ یقین پر شاہد ہے۔ یہ وہی نورِ یقین ہے جو ہمیشہ انبیاء علیہم السّلام کا نگرانِ حال و معاون رہا ہے، اور انبیاءؑ کے اس میثاق کی یادگار ہے جو سرورِ کائناتؐ کے متعلق انؑ سے عالم

ے صحیح مسلم، بابِ شفاعت، حدیثِ ابوہریرہؓ کی طرف اشارہ ہے۔ مولانا سیوہاروی صفحہ ۶۳

ارواح میں لیا گیا۔

یہ تاریخ کا عجب نکتہ ہے کہ جب بھی انبیاء نے دعوتِ ایمان پیش کی تو ہمیشہ ایک غریب مفلوک الحال اور کمزور طبقے نے اس پر لبیک کہا اور امراء و رؤساء نے ان ؑ کی تکذیب و تحقیر میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔ قرآن حکیم نے اس حقیقت کو، متعدد مقامات میں کہیں بیانیہ انداز میں اور کہیں مکالمہ کی صورت میں واضح کیا ہے۔ حضرت نوح علیہ السّلام نے ہر طرح اپنی قوم کو یقین دلایا کہ میں نہ تو تم سے کسی منفعت کا طالب ہوں نہ جاہ و منصب کا، میں تو اللہ کا رسول ہوں اور تم کو اللہ کی بندگی کی طرف دعوت دینے، اس کی اطاعت پر اللہ کی رحمتوں کا مژدہ سنانے، اور اس تکبّر و انکار پر تم کو اللہ کے دردناک عذاب سے ڈرانے آیا ہوں۔ اسی اللہ کی بندگی کرو، اسی سے ڈرو تاکہ وہ تمہارے گناہ بخش دے[ے] اور تم پر رحم فرمائے۔

چنانچہ ان ؑ کی قوم کے اندازِ تکبّر اور حضرت نوح علیہ السّلام کی دردمندانہ نصیحت کا ایک مرقّع سورۃ ھود کے تیسرے رکوع میں نظر آتا ہے، جن کی طرف توجّہ مبذول کرنا اسی لئے ضروری ہے کہ ہر نبی ؑ پر اس کی قوم کی جانب سے ایسے ہی اعتراضات ہوئے، اور ہر نبی ؑ نے اُن کا ایک سا جواب دیا۔ گویا بحیثیت نبی اُن ؑ کی تبلیغ و اخلاق میں کوئی فرق نہ تھا۔

اِس سلسلہ میں یہاں آیاتِ سورۂ ھود از ۲۵ تا ۳۱ کے ترجمہ پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

"اور ہم نے نوح کو اُن کی قوم کی طرف بھیجا (تو انہوں نے اُن سے کہا) میں تم کو کھول کر (واضح انداز سے) ڈر سنانے (اور یہ پیغام پہونچانے) آیا ہوں ـــــ کہ خدا کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو۔ مجھے تمہاری نسبت عذابِ الیم

ے حوالہ سورۂ نوح، سورۂ ھود

کا خوف ہے ــــ تو اُن کی قوم کے سرداروں نے جو کافر تھے کہنے لگے کہ ہم تم کو اپنا ہی جیسا ایک آدمی دیکھتے ہیں اور یہ بھی دیکھتے ہیں کہ تمہارے پیرو وہی لوگ ہوئے ہیں جو ہم میں ادنیٰ درجہ کے ہیں اور وہ بھی رائے ظاہر سے (نہ غور و تعمق سے) اور ہم تم میں اپنے اوپر کسی طرح کی فضیلت نہیں دیکھتے بلکہ تمہیں جھوٹا خیال کرتے ہیں ــــ انہوں نے (حضرت نوحؑ نے) کہا اے قوم دیکھو تو اگر میں اپنے پروردگار کی طرف سے دلیلِ (روشن) رکھتا ہوں اور اس نے مجھے اپنے یہاں سے رحمت بخشی ہو جس کی حقیقت تم سے پوشیدہ رکھی گئی ہے تو کیا ہم اس کے لئے تم کو مجبور کر سکتے ہیں اور تم ہو کہ اس سے ناخوش ہو رہے ہو ــــ اور اے قوم میں اس (نصیحت) کے بدلے تم سے مال و زر کا خواہاں نہیں ہوں اور میرا صلہ تو خدا کے ذمّہ ہے اور جو لوگ ایمان لائے ہیں اُن کو نکالنے والا بھی نہیں ہوں۔ وہ تو اپنے پروردگار سے ملنے والے ہیں لیکن میں دیکھتا ہوں کہ تم لوگ نادانی کر رہے ہو ــــ اور برادرانِ ملت اگر میں ان کو نکال دوں تو (عذاب) خدا سے بچانے کے لئے کون میری مدد کر سکتا ہے۔ بھلا تم غور کیوں نہیں کرتے ــــ اور نہ میں تم سے یہ کہتا ہوں کہ میرے پاس خُدا کے خزانے ہیں اور نہ یہ کہ میں غیب جانتا ہوں اور نہ یہ کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں اور نہ اُن لوگوں کی نسبت جن کو تم حقارت کی نظر سے دیکھتے ہو یہ کہتا ہوں خُدا اُن کو بھلائی (یعنی اعمال کی جزائے نیک) نہیں دے گا۔ جو اُن کے دلوں میں ہے اُسے خدا خوب جانتا ہے۔ اگر میں ایسا کہوں تو بے انصافوں میں ہوں ــــ

(ترجمہ از مولانا فتح محمد خان صاحب جالندھریؒ)

حضرت نوح علیہ السّلام کا سلسلۂ تبلیغ ۵۰ سال کی عمر سے اپنی آخر عمر ۹۵۰ سال تک جاری رہا اور جب اُنؑ کی قوم نے انؑ کی دعوتِ حق کو ہر طرح ردّ

کردیا بلکہ خود عذاب کے طالب ہوئے اور کہا:

"اے نوح تم نے ہم سے جھگڑا کیا اور بہت جھگڑا کر چکے (اب اس بحث کو ختم کرو) اور وہ چیز جس سے تم ہم کو ڈراتے ہو (یعنی عذابِ الٰہی) وہ ہم پر لے آؤ اگر تم سچے ہو۔" (ترجمہ ہود آیت ۳۲)

بالآخر اس نبیؑ کے دستِ دعا بارگاہِ رب العزت میں اُٹھے۔ اس کا ذکر سورہ نوح (۷۱) میں تفصیل کے ساتھ آتا ہے، اور آپؑ نے اپنی مساعئ جمیلہ کے باوجود حق کے مسلسل انکار سے ناامید ہو کر یوں دعا فرمائی۔

وَقَالَ نُوحٌ رَّبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْأَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِينَ دَيَّارًا ﴿۲۶﴾ إِنَّكَ إِنْ تَذَرْهُمْ يُضِلُّوا عِبَادَكَ وَلَا يَلِدُوا إِلَّا فَاجِرًا كَفَّارًا ﴿۲۷﴾ (سورۂ نوح)

اور نوح نے (بارگاہِ رب العزت میں ہاتھ اُٹھائے اور) کہا اے میرے رب اب رُوئے زمین پر کسی کافر کو بستا ہوا نہ چھوڑ اور اگر تُو نے چھوڑ دیا تو یہ تیرے بندوں کو بہکاتے ہی رہیں گے اور ان کی اولاد بھی بدکار و کافر ہوگی۔

ساتھ ہی اپنے اور اپنے مؤمن ساتھیوں کے لئے دعائے مغفرت فرمائی۔ دُعا قبول ہوئی۔

حضرت نوحؑ کو اہلِ نجات کے لئے کشتی بنانے کا حکم ہوا، کافروں کو تضحیک کا ایک نیا موقع ملا اور قانونِ قدرت کو مکافاتِ عمل کا۔ کشتی تیار ہوئی، زمین کی تہہ سے پانی کا چشمہ اُبلنا شروع ہوا، نوح علیہ السّلام کو حکم ہوا کہ وہ اپنے خاندان کے لوگ اور تمام جانداروں میں سے ہر ایک کا ایک ایک جوڑا کشتی میں سوار کرلیں۔ ساتھ ہی وہ مختصر جماعت جن کی تعداد تھوڑی سی تھی (چالیس سے زیادہ نہیں) وہ بھی اس کشتی میں سوار ہوئے۔ پانی نے جوش مارنا شروع کیا، کشتی محفوظ رہی حضرت

نوحؑ کا بیٹا جو ایمان نہ لایا تھا، حضرت نوحؑ نے شفقتِ پدری سے متاثر ہو کر اُس کو بھی کشتی پر بیٹھنے کے لئے بُلایا۔ لیکن اُس کو دُنیاوی سہاروں پر ناز تھا، پہاڑ کی بُلندی کو سیلاب سے بچ جانے کے لئے کافی سمجھا۔ حضرت نوحؑ کو علم تھا کہ آج کوئی چیز اللہ کے عذاب سے بچانے والی نہیں، پھر بھی جب لڑکا ڈوبنے لگا تو محبت کی تڑپ میں اپنے "اہل" ہونے کے تعلق سے دعائے نجات کی۔ جواب ملا کہ وہ تمہارے آل میں نہیں، اُس کے اعمال صالح نہیں۔ قدرت کو یہ بات بھی واضح کرنا منظور تھا نبی کی آل سے مراد ہمیشہ اس کے خاندان و جماعت اور حلقہ کے وہ لوگ ہوتے ہیں جو مؤمن ہوں، "ایمان باللہ" اور "تصدیق بر رسالت" جن کا شعار ہو۔

کشتی جُودی کی پہاڑی پر رُکی اور "خیر المنزلین" ربّ جلیل نے انہیں خیر و امن کے ساتھ پھر اپنی زمین پر بسایا۔ اور حضرت نوحؑ ابوالبشر ثانی اور آدمِ ثانی کے لقب سے موسوم ہوئے۔ قرآنِ حکیم میں بھی انہیںؑ کے بعد آنے والے انبیاءؑ علیہم السّلام کا خصوصی ذکر ہے۔ اور تاریخی طور پر بھی ہماری معلومات حضرت نوح علیہم السّلام سے قبل کی زیادہ معتبر نہیں، سوائے اُن باتوں کے جن کا قرآنِ کریم یا حدیثِ مُبارکہ میں ذکر آگیا ہے

طوفانِ نوحؑ۔ حضرت نوح علیہ السّلام سے قبل متعدّد طوفانوں کا ذکر ہے لیکن حضرت نوح علیہ السّلام کے زمانہ میں جو طوفان آیا، اور یہ واقعہ بقول ایک فرانسیسی مؤلف (موسیو ڈوبلے) تین ہزار تین سو اڑتیس ۳۳۳۸ برس قبل مسیح کا ہے، جو ایک تاریخی اندازہ ہے۔ اور اللہ ربّ العزت کی طرف سے پیغمبرؑ کو اس خطرے سے آگاہ کر دیا گیا تھا۔ (از مولانا ابوالکلام آزاد: انبیاء کرام)

یہاں جس سلسلے میں ہم ان انبیاءؑ علیہم السّلام کا ذکر کر رہے ہیں، یعنی فیضانِ نورِ محمدی، اس لئے عام واقعات سے قطعِ نظر کر کے، جو سِیَر کی کتابوں

میں بآسانی ملتے ہیں، ہم صرف ان امور کی طرف توجہ مبذول کرنے کی کوشش کریں گے جن کا تعلق ہمارے موضوع سے ہے۔

۱۔ زندگی کے ہر طوفان کا مقابلہ کرنے کے لئے اسباب کی فراہمی تقاضائے قدرت ہے، لیکن ان کی کامیابی کا راز اللہ رب العزت کی توفیق اور نصرت پر مبنی ہے، اس لئے ہر کام کی ابتدا کے لئے بسم اللہ کی عطا سے سرفرازی بخشی گئی، شاید یہی وہ راز ہو جس نے حضرت نوح علیہ السلام کو "نَجِیُّ اللہ" کے خطاب سے مختص ہونے کا شرف بخشا۔

۲۔ چنانچہ کشتی پر سوار ہونے سے پہلے حضرت نوحؑ نے اسی بسم اللہ کا سہارا لیا:

وَقَالَ ارْكَبُوْا فِيْهَا بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖىهَا وَمُرْسٰىهَا ط اِنَّ رَبِّيْ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (ھود، آیت ۴۱)

"اور انہوں نے اپنے ساتھیوں سے کہا کشتی پر بیٹھ جاؤ بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖىهَا وَمُرْسٰىهَا (پڑھ کر) حقیقت میں میرا پروردگار بڑا بخشنے والا بڑا رحیم ہے"

بعض محققین کا کہنا ہے کہ کشتیٔ نوحؑ کے جو ٹکڑے ملے ہیں اُن پر چند اللہ کے پیاروں کے نام کندہ تھے۔ اور ان ناموں کے ساتھ ساتھ حضورؐ کے وسیلے سے کشتیٔ نوحؑ کا بڑا قریب کا تعلق حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث مبارکہ سے قائم ہو جاتا ہے جس میں ارشاد ہوا کہ "میرے اہل بیت مثل کشتی کے ہیں، جو اس میں بیٹھ گیا اُس نے نجات پائی۔"

۳۔ یہ امر بھی دلچسپی سے خالی نہیں کہ اس پر بیٹھنے والوں کی تعداد، جیسا مولانا سیوہاروی نے لکھا ہے، چالیس تھی، چالیس کا عدد "م"، میم محمدی کے فیضان کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔

۴۔ اہل تصوف پانی کو امر سے متعلق کرتے ہیں۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

"ہم نے ہر شئے کو پانی سے پیدا کیا" یا "میرا عرش پانی پر تھا" یہاں پانی سے عالم اجسام میں پانی اور مقام رُوح میں "امر" مراد لیا گیا ہے۔ بتانا یہ ہے کہ ہم نے انسان کو اس مقام تک حضرت نوح علیہ السّلام ہی کے دَور میں پہونچا دیا کہ وہ تسخیرِ کائنات کا عمل شروع کر سکے اور اس کا "امر" بہ توفیقِ الٰہی اس کا معاون ہو۔ اسے بھی فیضانِ رسالت ہی سمجھنا چاہیئے۔

۵۔ کشتی جُودی کی پہاڑی پر رُکتی ہے اور سورۂ مؤمنون میں اس سلسلہ میں تین خیر کی طرف اشارے ملتے ہیں۔

پہلا خیر۔ خَیْرُ الْمُنْزِلِیْنَ ہے

(اے میرے رب اب تو مجھے نہایت مبارک مقام پہ اُتار، تو ہی بہترین اُتارنے والا ہے۔) [1]

پھر عام ہدایت ہے کہ اللہ سے مانگو کہ وہی

دوسرا خیر۔ خَیْرُ الرّٰزِقِیْنَ ہے

(بہت خوب رزق دینے والا ہے (جسمانی، ذہنی اور رُوحانی) [2]

اور تیسرا خیر۔ خَیْرُ الرّٰحِمِیْنَ ہے

(بہت خوب رحم فرمانے والا ہے، خوب خوب نوازنے والا ہے۔) [3]

جس پر سورت المومنون ختم ہوتی ہے (گویا "خیر البریّہ" سے وابستگی ہی زندگی کا مقصد ہے)

پہلے خیر کا ذکر خاص حضرت نوحؑ کے سلسلہ میں آتا ہے اور بقیہ دو کی طرف

---

[1] دعائے نوح۔ رَبِّ اَنْزِلْنِيْ مُنْزَلًا مُّبٰرَكًا وَّ اَنْتَ خَيْرُ الْمُنْزِلِيْنَ (مومنون ۲۹)

[2] مومنون آیت ۷۲

[3] مومنون آیت ۱۱۸

خصوصی توجہ قرآنِ حکیم میں شاید اس لئے دلائی گئی ہے تاکہ خیر کی وسعتیں پیشِ نظر رہیں کہ رزقِ جسمانی تو انسان کے آنے سے قبل بھی اس کے لئے مہیا کر دیا گیا تھا۔ لیکن رزقِ روحانی کے چشمے انبیاء علیہم السلام کے ذریعہ جاری ہوئے۔ خیر کی یہ ابتداء، یہ فراوانی سب صدقہ ہی تو ہے اس نورِ مبینؐ کا جو خیر البریّہ کے نام سے موسوم ہیں، اور جن کا دامنِ خیر ازل سے ابد تک کشادہ ہے۔

۶۔ دعوتِ حق کا یہ ابتدائی دور ہے۔ لوگوں کی جماعت کچھ ایسی بڑی نہ ہو گی لیکن جن اعلیٰ اخلاقی اور تبلیغی امور کی طرف توجہ مبذول کی جا رہی ہے وہ گویا درسِ تبلیغ اور اسوۂ انبیاء کا پہلا سبق ہے۔

(الف)۔ لوگوں کی عزت پیشے اور دولت سے نہیں، ایمان و عملِ صالح پر مبنی ہے۔

(ب)۔ دعوتِ حق میں صداقت، صاف گوئی اور حقیقت کا اظہار ضروری ہے، خواہ کسی کو بُرا ہی کیوں نہ لگے، لیکن صبر، استقلال اور تحمّل کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹے۔

(ج)۔ حق گو جماعت سے خواہ وہ غریب یا مسکین ہو کبھی بھی علیحدگی نہ اختیار کی جائے، اور جو لوگ سرکش ہوں خواہ وہ اہلِ دولت و ثروت ہی کیوں نہ ہوں ان سے کنارہ کشی اختیار کی جائے۔

(د)۔ گو تبلیغ کے لئے لوگوں سے قُرب کو بڑی اہمیت حاصل ہے، لیکن وہ قرب، جو ایمان میں حارج ہو اس قرب سے دُوری ہی عین ایمان ہے۔ تبلیغِ حق کے لئے لوگوں کو ہدایت کے مواقع دیئے جائیں۔ اگر وہ ہدایت نہ حاصل کریں تو نتائج اللہ کے سپرد کر دیئے جائیں، کیونکہ نبی کا کام تبلیغ ہے، ہدایت توفیقِ الٰہی سے ملتی ہے۔ طوفانِ نوحؑ سے یہ بات بھی واضح کر دی گئی ہے کہ بالآخر اہلِ ایمان کامیاب ہوں گے خواہ اُن کی تعداد کتنی ہی کم کیوں نہ ہو۔

رحمت محتاجِ اسباب نہیں ۔ اسباب محتاجِ رحمت ہیں
لہٰذا

ابتداء ہی سے اہلِ ایمان کو صحتِ عقیدہ کے ساتھ عملِ صالح کی ترغیب دی گئی اور یہ بات بھی واضح کر دی گئی کہ ہر کامیابی کے لئے امتحان شرط ہے۔ دیکھو اس امتحان میں ثابت قدم رہنا، صبر کا دامن ہاتھ سے چھوٹنے نہ پائے۔

(اقتباس از انبیائے کرام، مولانا ابوالکلام آزاد)

گویا اسی دَور سے حضورِ اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کی اخلاقی زندگی اور تعلیماتِ ربّانی کی ابتداء ہوتی ہے۔ جس کی "بسم اللہ" حضرت آدمؑ اور حضرت نوحؑ فرماتے ہیں اور جو بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے میم پر ختم ہوتی ہے، کہ آپ ہی خاتم النبیّین ہیں۔ اس اسوۂ انبیاءؑ کو دراصل اسوۂ رسولِ کریم صلّی اللہ علیہ وسلّم ہی سے تعبیر کرنا چاہیئے، اور انہیںؐ کا فیضانِ نور سمجھنا چاہیئے، جس سے ان انبیاء علیہ السّلام کا تعلّقِ ازلی ہے۔

و

حضرت ھود و حضرت صالح

علیہما السلام

حضرت نوح علیہ السلام کے بعد قرآن حکیم میں جن انبیاءؑ کا ذکر آتا ہے وہ حضرت ھودؑ اور حضرت صالحؑ ہیں۔ قرآنِ حکیم میں عاد کو "مِنْ بَعْدِ قَوْمِ نُوحٍ" کہہ کر قوم نوح کے خلفاء میں شمار کیا ہے۔

"عاد کا مرکزی مقام ارضِ احقاف ہے۔ یہ حضرموت کے شمال میں اِس طرح واقع ہے کہ اس کے مشرق میں عمان ہے۔ شمال میں ربع الخالی، مگر آج یہاں ریت کے ٹیلوں کے سوا کچھ نہیں اور بعض مؤرخین کہتے ہیں کہ ان کی آبادی عرب کے سب سے بہترین حصّہ حضرموت اور یمن میں خلیجِ فارس کے سواحل سے حدودِ عراق تک وسیع تھی اور یمن ان کا دارالحکومت تھا۔"

(قصص القرآن جلد اوّل صفحہ ۱۰۴)

ظاہر پرستی اور حقیقت سے بے رُخی شاید ہر دَور میں انسان کا مزاج رہا ہے، جس کی طرف اُس کا نفس اُس کو لگاتا رہا۔ اس ظاہر پرستی نے اُسے ہمیشہ دنیاوی عیش و آرام، دولت و ثروت، جاہ و حشم کی طرف رجوع رکھا۔

چنانچہ قومِ عاد، جس کی طرف حضرت ھود علیہ السلام مبعوث ہوئے، اس ظاہر پرستی اور آباء پرستی اور صنم پرستی میں لگی رہی اور حضرت نوحؑ کی قوم کی طرح اس کے معبود وہی باطل بُت، وُدّ، سُواع، یَغُوث، یعُوق اور نَسر

ہی تھے بلکہ اُن میں ایک نام صمود کا اِضافہ بھی کیا۔

جس طرح اہلِ دنیا کا مزاج ظاہر پرستی رہا، جملہ انبیاء علیہم السّلام کی فطرت حقیقت شناسی رہی۔ ظاہر سے باطن کی طرف، خَلق سے خالق کی طرف رجوع کرنا، اللہ تعالیٰ کی قدرت وحکمت کے مظاہر کی طرف لوگوں کی توجہ دلاکر اُنہیں اپنے خالق سے قریب لانے کے لئے وہ ہمیشہ مضطرب رہتے۔

حضرت ھود علیہ السّلام کا ذکر سورۂ ھودؔ میں تفصیل سے آتا ہے جس سے نہ صرف آپؑ کی تبلیغی جدّوجہد کا علم ہوتا ہے، بلکہ یہ بھی واضح ہوجاتا ہے کہ آپؑ کی قوم کو اپنی جسمانی قوّت وصولت، اپنے ملک کی سطوت وجبروت اور اپنے عالی شان محلوں پر کتنا غرور تھا اور وہ کسی واقعہ سے عبرت لینے کے لئے تیار ہی نہ تھے، ابھی طوفانِ نوحؑ کو کچھ زیادہ زمانہ نہیں گذرا تھا، اُنہوں نے قوم کی بداعمالیوں کے نتائج آنکھوں سے دیکھے تھے لیکن اُن کے نفس نے اُنہیں جس عیش وعشرت پہ لگا دیا تھا وہ اس سے باز نہ آتے تھے۔

حضرت ھود علیہ السّلام نے جس جاں سوزی، عرق ریزی، محبت وخلوص سے اُن کو اللہ تعالیٰ کی توحید اور اُس کی عبادت کی طرف دعوت دی اور جس دیدہ دلیری سے اُنؑ کی قوم نے اس کا انکار کیا، ——————،

اس کا قرآنِ حکیم میں ذکر مختلف مقامات پر آتا ہے، لیکن سورہ ھود کچھ اس انداز سے ہے کہ حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا کہ اس سورت نے مجھے بوڑھا کر دیا۔

---

[1] قرآنِ حکیم میں انبیائے کرام کے نام پر جو سورہ ہیں وہ بھی ذاتِ محمدیؐ سے اِن انبیاء کی ذات اور اِن کی انفرادی صفات کا رشتہ قائم کرتے ہیں۔ یوں ان انبیاء کا رفعِ ذکر بھی، ہمارے حضورؐ کے رفعِ ذکر کی ایک صورت ہے۔ (پروفیسر ابوالخیر کشفی)

حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ الفاظ اس روحانی تعلق کی طرف نشان دہی کر رہے ہیں جو حضورؐ کو جملہ انبیاءؑ سے اور اُن کی مساعیٔ جمیلہ سے رہا۔

حضرت ہود علیہ السلام اپنی قوم سے بار بار فرمانا کہ "اے میری قوم تم صرف اللہ ہی کی عبادت کرو، اُس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں تم بتوں کو خدا کا کیوں شریک کرتے ہو، یہ تو تمہارا اللہ پر محض بہتان باندھنا ہے۔[1] پھر یہ فرمانا کہ "میں اپنی تبلیغ و نصیحت پر تم سے کوئی معاوضہ نہیں چاہتا، میرا اجر تو اُسی کے ذمہ ہے جس نے مجھے پیدا فرمایا" اُن کی یہ دردمندی کہ کہیں تمہاری نافرمانی کسی عذاب کا موجب نہ بن جائے[2] یہ اسی محبت کی بازگشت ہے جو ہر نبیؑ کو اپنی قوم کے لئے روزِ الست عطا ہوئی اور ان منکرین کا متکبرانہ انداز کہ تمؑ ہمارے پاس اللہ کی کوئی سند لے کر نہیں آئے اور محض تمہارے کہنے سے ہم اپنے معبودوں کو چھوڑنے والے نہیں اور نہ ہم تمؑ پر ایمان لانے والے ہیں، تمؑ تو (نعوذ باللہ) آسیب زدہ ہو، اُن کی یہ فطری کج بحثی، اُن کے نفس کی دیدہ دلیری پر شاہد ہے۔ بالآخر عذاب الٰہی آیا، قرآن حکیم خبر دیتا ہے کہ اس دُنیا میں بھی لعنت اُن کے پیچھے لگی رہی اور قیامت کے دن بھی لگی رہے گی، دنیا کی لعنت تو دیکھ لی کہ اس قوم عاد کے کھنڈرات اُن کے کفرانِ نعمت اور بربادی کے شاہد ہیں اور قیامت کے دن بھی یہ رحمتِ الٰہی سے دور ہوں گے۔ قرآن فرماتا ہے خوب سُن لو اور یاد رکھو کہ قومِ عاد پر پھٹکار ہے، وہ رحمت سے دُور

---

[1] ھود۔ آیت ۵۰۔

[2] اقتباس سورہ ھود پانچواں رکوع۔ بقیہ کے لئے ملاحظہ ہو اعراف رکوع ۹۔

پھینک دیئے گئے۔ ؎

دیکھیئے حضرت ہود علیہ السّلام کی یہ تعلیمات، محض تعلیمات نبوی ؑ کی یکسانیت نہیں بلکہ مزاجِ نبوّت کی یکسانیت ہے۔ وہ مزاج، وہ فطرت، وہ نور جو اُنہیں ؑ روزِ ازل نبیِّ کریم صلّی اللہ علیہ وسلّم ہی کے نور سے ملا، اور جسے ہر بے راہ روی سے محفوظ و مامون بنا کر معصومیت کے انداز سے اللہ تعالےٰ نے دامنِ رحمت ؐ کا پرتو بنا کر اُنہیں ؑ اپنے زمانہ میں مبعوث فرمایا۔

یہ تعلیمات کے اجزاء ہوں یا فطرتِ نبی ؑ کے، دونوں نتیجہ ہیں، فیضانِ نورِ محمدی صلّی اللہ علیہ وسلّم کا۔ دونوں دراصل اُنہیں صلّی اللہ علیہ وسلّم کی سیرتِ مبارکہ کی تجلّیات ہیں۔ انبیاء علیہم السّلام کی یہ جماعت روزِ روشن کی طرح یہ بات واضح کر رہی ہے کہ تابعِ امر کیسے ہوتے ہیں، ان کی سیرت کتنی معصوم، کیسی بے لوث، کتنی بے غرض، کس قدر جذبۂ خیر خواہی سے سرشار ہوتی ہے، وہ کس قدر رحمتِ الہٰی کے پرتو ہوتے ہیں اور اُن کا رشتۂ محبّت، رحمتِ عالم صلّی اللہ علیہ وسلّم سے کس قدر مستحکم، منوّر اور باصفا ہوتا ہے۔

صلّوا علیہ وآلہٖ

؎ اقتباس از سورۂ ھود آیات ۵۰ تا ۶۰

حضرت صالح علیہ السّلام

حضرت صالح علیہ السّلام جیسا کہ خود اُن ؑ کے نام سے ظاہر ہے اصلاحِ حال کی صلاحیتوں سے مزیّن تھے۔ آپ ؑ قوم ثمود کی طرف بھیجے گئے۔ یہ قوم حجاز و شام کے درمیان وادئ قُریٰ کے جو میدان نظر آتے ہیں اُن میں آباد تھی۔

قرآنِ حکیم میں ان کا ذکر متعدّد مقام پہ آتا ہے خصوصاً سورۂ ھود اور سورۂ اعراف میں۔ قرآن میں آتا ہے: (ترجمہ)

(اے قوم ثمود) ہمارے اُس احسان کو یاد کرو جب اللہ تعالیٰ نے عاد کے بعد تم کو اُن کا جانشین مقرّر فرمایا۔ اور تم کو زمین میں آباد کیا اور تم نرم زمین میں مکان بناتے ہو۔ اور پہاڑوں کو کاٹ کر اپنے لئے عالی شان عمارتیں تعمیر کرتے ہو۔ یہ نعمتیں اللہ ہی نے تم کو عطا کیں، پھر تم کو کیا ہوا کہ تم اُس کی نعمتوں کا شکر ادا نہیں کرتے اور زمین میں فساد پھیلاتے رہتے ہو۔

(اعراف آیات ۷۴-۷۵)

اِس قوم ثمود کا تکبّر اس قدر بڑھ گیا تھا کہ وہ ایمان لانے والے غریب اور بے سہارا لوگوں کی ہر طرح دِل آزاری کرتے، بلکہ خود حضرت صالح علیہ السلام کی طرف سے اُن کو بدظن کرنے کی کوشش کرتے۔ اِن متکبّرین کے سوالات اور تمسخر کے جواب میں اہلِ ایمان بس یہی کہتے، ہم تو اُن ؑ پر ایمان لاچکے

ہیں، ہم تو اُن ؑ کو، اُن ؑ کے دین کو سچا سمجھتے ہیں۔ ہم سے یہ سوال کیا کرتے ہو، ہمارا ایمان، ہمارا عمل خود ہی تمہارے سوالوں کا جواب دے رہا ہے۔

دراصل اس صاحبِ ثروت طبقے کو اپنے محلوں، اپنے سرسبز و شاداب باغوں اور شیریں نہروں پر اس قدر ناز تھا کہ اُن کی آنکھوں پر پردے پڑ گئے تھے اور وہ اپنے کو عقلِ کُل سمجھے بیٹھے تھے۔

بعض وقت انسان اپنی بڑائی جتانے اور اپنی ضد پر قائم رہنے کے سلسلہ میں کسی ایسے امر کی توہین کا مرتکب ہو جاتا ہے جو اس کے لئے غضبِ الٰہی کا محرک بن جاتا ہے۔ ثمود کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ حضرت صالح ؑ اپنی قوم کو اللہ کی عبادت اور اس کی فرماں برداری کی طرف بُلاتے اور کہتے، اللہ کی عبادت کرو، اس کے سوا کوئی تمہارا معبود نہیں، اس نے تم کو مٹی سے پیدا کر کے مٹی ہی، یعنی زمین سے، تمہاری زیست کے لئے غذا پیدا کی اور اسی میں تم کو بسایا اور پروان چڑھایا۔ پس اُسی سے تم اپنے گناہ بخشواؤ اور راہِ ہدایت پر آجاؤ۔ (حوالہ ھود آیات ۶۰-۶۱)

ان کا متکبّرانہ جواب یہی ہوتا کہ اے صالح ؑ ہم کو تم ؑ سے بڑی اُمیدیں وابستہ تھیں۔ تم ؑ ہم میں ہونہار معلوم ہوتے تھے۔ ہمیں اُمید تھی کہ تم ؑ ہمارے باپ دادا کا نام روشن کرو گے لیکن تم ؑ تو اُن کا دین مٹانے پر تُلے ہوئے ہو، اور ہمیں اُن چیزوں کی پرستش سے منع کرتے ہو جو وہ ہمیشہ پُوجتے رہے۔

حضرت صالح ؑ نے ہر ہر طرح اُن کو سمجھانے کی کوشش کی لیکن وہ اپنی ضد پر قائم رہے، بلکہ اُن ؑ کی صداقت کا ثبوت یہ چاہا کہ اگر تم ؑ سچے ہو تو ایک اُونٹنی پتھروں سے نکال دو۔ خالقِ کائنات ہر چیز پر قادر ہے، وہ اپنے پیغمبروں اور صالحین کی لاج رکھتا ہے۔ اُونٹنی معجزانہ انداز سے سامنے آگئی۔ حضرت صالح ؑ نے فرمایا دیکھو اب اسے ایذا نہ پہونچانا، ورنہ

یہی نافرمانی تمہاری ہلاکت کا موجب ہوگی، یہ بھی ہدایت فرمائی کہ نہر کے پانی پر اللہ تعالیٰ نے تمہارے اور اس کے درمیان باری مقرّر فرما دی ہے، ایک دن اِس نہر سے تم پانی لوگے ایک دن اِس سے وہ پیئے گی۔ دیکھو اس میں فرق نہ آئے۔

قرآنِ حکیم میں اسے نَاقَۃُ اللّٰہِ کا لقب دیا گیا، اور اسے اللہ کی ایک نشانی قرار دیا گیا۔ وہ نافرمان دیر تک یہ طریقۂ کار برداشت نہ کر سکے آخر اس کے قتل کے مرتکب ہوئے اور عذابِ الہٰی میں گرفتار ہوئے۔

پہلے تین دن ان پر علاماتِ عذاب ظاہر ہوئے، اُن کے چہرے زرد سُرخ اور تاریک ہوئے، آخر وقتِ مقرّرہ پر ایک ہولناک آواز نے اُن کو آپکڑا اور ہر شخص اُسی حالت میں ہلاک ہوا جس میں وہ تھا۔ آج بھی اُن کی بستیاں کھنڈر بنی، ہمیں درسِ عبرت دے رہی ہیں۔

ایک طرف قوم ثمود کے نافرمان ہلاک ہوئے، اور دوسری جانب حضرت صالحؑ اور اُنؑ کے پیرو اہلِ ایمان کو خداوندِ کریم نے اس عذاب سے محفوظ رکھا۔ اور حضرت صالحؑ نے ان ہلاک شدہ لوگوں سے کچھ اِس انداز سے خطاب کیا جس طرح بدر میں کفّار کی لاشوں کو ایک گڑھے میں ڈال کر حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم نے اُن سے سوال کیا تھا۔ بالآخر حضرت صالحؑ نے فرمایا

"یٰقَوْمِ لَقَدْ اَبْلَغْتُکُمْ رِسَالَۃَ رَبِّیْ وَنَصَحْتُ لَکُمْ وَلٰکِنْ لَّا تُحِبُّوْنَ النّٰصِحِیْنَ (اعراف آیت ۷۹)	اے قوم بلاشبہ میں نے اپنے پروردگار کا یہ پیغام تم تک پہونچایا اور تم کو نصیحت کی لیکن تم تو نصیحت کرنے والوں کو دوست ہی نہیں رکھتے۔

حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم نے تو بدر کے کافر سرداروں کے نام لے لیکر یوں فرمایا تھا۔
اے فلاں ابن فلاں ابن فلاں ابن فلاں۔ کیا تم کو اللہ اور اُس کے رسولؐ کی اطاعت پسند آئی ؟ بے شک ہم نے وہ سب کچھ پالیا جو ہمارے ربّ نے ہم سے وعدہ کیا تھا۔ پس کیا تم نے بھی وہ پایا جو تمہارے ربّ نے تم سے وعدہ کیا تھا۔" (الحدیث۔ بخاری شریف ترجمہ)
حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے سوال کیا، کیا وہ سنتے ہیں۔ حضورؐ نے فرمایا کہ تم سے زیادہ، مگر جواب سے عاجز ہیں۔

کہاں صالحؑ کا زمانہ اور کہاں بدر کا واقعہ۔ غور کیجئے کہ انبیاء علیہم السّلام کی فطرت کی اس قدر مناسبت کہاں سے آئی۔ ماننا پڑتا ہے کہ وہ سب ایک ہی تخمِ نبوّت کے شجر، اس کے برگ و بار تھے۔ وہی خوشبو، وہی مہک، جو اُنہیںؑ اس نورِ مبینؐ سے روزِ تخلیق ملی تھی، اور اُسی کو عام کرنا ان کا فرضِ منصبی تھا۔

" لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ "

و

لہ اس سے کارِ نبوّت کی وحدت سامنے آتی ہے، اس کا یہ مفہوم نہیں کہ تمام انبیائے کرام علیہم السّلام ہم رُتبہ ہیں۔ حضرت آدمؑ، حضرت نوحؑ، حضرت ابراہیمؑ کی شانِ آشکار ہے، اور یہ سب شانیں شانِ محمدی میں جمع ہو گئیں، چونکہ اُسی سرچشمۂ نور سے اُن کا تعلق تھا۔

(پروفیسر ابوالخیر کشفی صاحب)

حضرت ابراہیم علیہ السّلام

لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ اِبْرٰهِيْمُ خَلِيْلُ اللّٰهِ

اَللّٰهُمَّ صَلِّ وَسَلِّمْ وَ بَارِكْ عَلٰى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى آلِ مُحَمَّدٍ
كَمَا صَلَّيْتَ وَسَلَّمْتَ وَ بَارَكْتَ عَلٰى اِبْرٰهِيْمَ وَعَلٰى آلِ اِبْرٰهِيْمَ
اِنَّكَ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ

نورِ مبین صلّی اللہ علیہ وسلّم مقامِ تجلّی سے مقامِ خلّت کی طرف رواں دواں ہے اور آسمانِ نبوّت پر اس طرح درخشاں ہے کہ اُس کی تجلّیات اور انوار سے ایک نئے دور کا آغاز ہوتا ہے۔

یہ مقامِ ابراہیمی ہے، مقامِ خلّت ہے

ہر چند اسلام کی ابتداء حضرت آدم علیہ السّلام سے ہے اور حضرت نوح علیہ السّلام کو آدمِ ثانی کہا گیا لیکن اب جس دور کا آغاز ہو رہا ہے اسے دراصل اسلام کی بنیاد اور فروغ کی ابتداء کہنا چاہیئے، اور ایسی ابتداء جس کے نقوش وقت کے ساتھ گہرے اور نمایاں ہوتے جاتے ہیں۔ جہاں سے ایمان کی جڑوں کا استحکام اور شجرِ اسلام کا فروغ کُل عالم کو متاثر کرتا جا رہا ہے۔

حضرت نوح علیہ السّلام کے دور میں لوگوں کے علم و ادراک میں اضافہ ہوا، علم و ہنر نے فروغ پایا، آپؑ کی اولاد دُنیا کے مختلف حصّوں میں پھیلی؛ گویا روئے

زمین انہیں کی اولاد میں تقسیم ہوئی۔ فلسطین، شام، السیریا، فارس، حجاز، سام کے بیٹوں کے حصے میں آئے۔ اسپین، فرانس، یونان، بلغاریہ، ترکی، ارمینیا کے علاقہ حضرت نوحؑ کے بیٹے یافث کی اولاد کو ملے۔ اور افریقہ، ناجیریا وغیرہ کا علاقہ نوح کے بیٹے حام کی اولاد کا مسکن بنے۔ یہ سعادت سام کی اولاد کو نصیب ہوئی کہ انبیاء علیہم السلام کا سلسلہ اسی خاندان میں قائم رہا اور توحید کی ضیائباریاں یہیں سے عام رہیں۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام اسی شجرِ طیبہ کی پُربہار اور بہار آفریں شاخ ہیں۔

ابراہیمؑ بن تارخ بن ناحور بن سروج رعو بن فالح بن عامر بن شالح
بن ارفکشاذ (ارفخشد) بن سام بن نوحؑ
ارفخشد کے معنی "چراغ کی روشنی" کے ہیں

جو فروزاں ہوا۔ فروزاں رہا اور فروزاں ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دور سے ہمارے آقائے دوجہاں سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم تک گویا ایک ہی دور ہے۔ جس کی ابتداء حضرت ابراہیمؑ اور اُن کے بڑے بیٹے حضرت اسماعیلؑ کے مبارک ہاتھوں سے خانۂ کعبہ کی تعمیر سے شروع ہوئی اور سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی ذریت میں حضرت اسحاق علیہ السلام سے لے کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک آسمانِ نبوت کے وہ درخشاں ستارے چمکے جو تجلیاتِ نورِ مبین سے سرفراز، اور اُسی نورِ مبینؐ کے انوارِ ذات وصفات کے ترجمان تھے۔

ـہ احوالِ انبیاء، مؤلفہ طیب علی، صفحہ ۲۱

(شجروں میں اہم ترین ناموں کے اندراج کی روایت بھی موجود ہے۔ کئی درمیانی کڑیاں حذف ہو سکتی ہیں۔
واللہ اعلم بالصواب) (پروفیسر ابوالخیر کشفی صاحب)

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دور سے دینِ متین کو دینِ اسلام کہا جانا مقدّر ہوا۔ یہی وہ نبیؑ ہیں جن کی یادیں عبادت بنا دی گئیں، جن کے شعار کو شعار اللہؐ قرار دیا گیا اور اسلام کے اہم رکن حج کو خصوصیت کے ساتھ ان کی یادوں کا مرقع بنا دیا گیا۔

مسلمانوں کی اہم ترین عبادت نماز میں درودِ ابراہیمی کو اہم مقام عطا ہوا، تاکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اندازِ عبدیت اور اندازِ خلیلُ اللّٰہی کو حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کے اسمِ مبارک کے ساتھ شامل فرما کے ایک طرف مقامِ خلّت اور مقامِ حُبّ کا بنیادی اور قریبی تعلّق آشکارا کیا جائے تو دوسری طرف حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کے مقامِ ارفع و اعلیٰ کو جملہ انبیاءِ کرامؑ پر نمایاں طور پر واضح کیا جائے پھر تمام اقوامِ عالم کو خواہ وہ کسی نبیؑ کی امت میں ہوں اُن پر سرکارِ دو عالم صلّی اللہ علیہ وسلّم کی نبوّت اور ختمِ نبوّت کی حجّت قائم کر دی جائے۔ یہ بھی آشکارا ہو جائے کہ جو کچھ سب میں ہے وہ سب ایک ہستیٔ مبارکہ میں ہے۔ جو کچھ ذات و صفات کے جلوے حضرت اسحٰق علیہ السّلام سے حضرت عیسیٰ علیہ السّلام تک ظاہر ہوئے وہ سب یہی فیضانِ نورِ محمدیؐ تھا، اسی نور کی شعاعیں تھیں، اور اب جو آئے گا وہ مکمل انسانیت کے لئے النّبیُّ الخاتم بن کر آئے گا۔ (سبحان اللہ)

حضرت ابراہیم علیہ السّلام سے قبل کا دَورِ اوّل دراصل کائنات کی تخلیق، ارتقاء تکمیل کا دور تھا۔ دوسرا، انسان کی برتری، کائنات پر اُس کی فضیلت اور تسلّط اور انسان کی فطرت میں توحیدِ باری تعالیٰ کو راسخ کر دینے کا دَور تھا۔ لیکن اب جو دورِ ابراہیمی آتا ہے وہ اقوامِ عالم کو ان کے بنیادی فریضے سے رُوشناس کرنے کا دَور ہے۔ خود انسان پر اُس کی عظمت و رفعت کو ثابت کر دینے کا دَور ہے۔ تاکہ اُسے نہ صرف اپنی عظمتوں اور رفعتوں سے

آگاہی ہو بلکہ وہ اپنے رب کی عظمت، کبریائی، جلال و جمال، قدرت و حکمت کو سمجھے اور ایک رُخ ہو کر اپنے رب کے حضور سر بسجود رہے۔ اس پر مقام بندگی کھلے اور وہ دیکھ لے کہ مومن کی شان کیا ہوتی ہے۔ ظاہری اسباب اس کے لئے کتنے بودے اور وہ کس قدر ماحول سے بلند و بالا ہوتا ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام تقریباً ساڑھے تین ہزار سال قبل مسیح دنیا میں تشریف لائے۔ آپؑ کی پیدائش توریت کے مطابق عراق کے قصبہ آزر میں ہوئی۔ توریت میں آپ کے والد کا نام تارخ اور قرآنِ حکیم میں آپؑ کے "اَبْ" کو آزر بتایا ہے، مفسرین اور محققین نے اس کی تفہیم قرآنِ عظیم اور احادیثِ مبارکہ کی روشنی میں یوں کی ہے کہ آپؑ کے والد کا تارخ اور چچا کا نام آزر تھا، اور چونکہ آپؑ کی تربیت آپؑ کے چچا نے فرمائی اور آپؑ کو اپنے بیٹے کی طرح پالا، اِس لئے قرآنِ حکیم میں آزر کو باپ کہہ کر پکارا، جیسا کہ نبی کریمؐ کا ارشاد ہے۔ اَلْعَمُّ صنو ابیہ (چچا باپ کی طرح ہے) (قصص القرآن صفحہ ۱۵۲)

علامہ جلال الدین سیوطی اور صاحبِ قاموس کی بھی یہی تحقیق ہے۔ پھر کتاب و سنّت سے بھی ثابت ہے کہ حضورؐ کے آباء میں حضرت آدمؑ تک کوئی بُت پرست نہ تھا۔ قرآنِ حکیم میں ہے تَقَلُّبَكَ فِي السّٰجِدِيْنَ (الشعرآء۔ آیت ۲۱۹)۔

اور ایک حدیث میں ہے کہ "میں پاک اصلاب سے پاک ارحام کی طرف منتقل ہوتا آیا ہوں"۔ یہ بات یہاں اس لئے واضح کرنا ضروری ہوا کہ نورِ مبینؐ کے انوار کو سمجھنے میں کوئی حجاب نہ آئے۔

غرض حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جس معاشرے میں آنکھیں کھولیں وہاں بُت پرستی، کواکب پرستی اور مظاہر پرستی عام تھی۔ خود آپؑ کی پرورش

جس گھر میں ہو رہی تھی، وہاں انجیل کے مطابق بھی اُنؑ کے "الو" تجاری کا پیشہ کرتے اور اپنی قوم کے مختلف قبائل کے لئے لکڑی کے بُت بناتے اور فروخت کرتے۔ وہؑ اپنی آنکھوں سے دیکھتے کہ خود آزر اپنے ہاتھوں سے بُت تراشتے اور جو صورت اُن کو دینا چاہتے بنا دیتے، وہی لوگوں کو فروخت کرتے اور لوگ اُنہیں کو خدا سمجھتے۔ آپؑ کی فطرتِ سلیم پر یہ بات روشن تھی کہ جو چیز کسی کو نفع یا نقصان نہ پہونچا سکے وہ خُدا کیسے ہو سکتی ہے۔ چنانچہ آپؑ آزر سے مباحثہ فرماتے۔ قرآنِ حکیم میں اس کا ذکر آتا ہے، کبھی فرماتے اے باپ یہ مجسّمے کیا ہیں جنہیں آپ لئے بیٹھے ہیں۔ وہ جواب دیتے کہ ہم نے باپ دادا کو یوں ہی ان کی پوجا کرتے پایا۔ آپؑ فرماتے کہ تمہارے باپ دادا مکمل گمراہی پر تھے۔ آپؑ تلقین فرماتے کہ تمہارا پروردگار زمین اور آسمانوں کا خالق ہے جس نے ان سب کو پیدا کیا اور میں تو اس بات پر پورا ایمان رکھتا ہوں (سورۂ انبیاء ۵)

کبھی آزر سے یوں مخاطب ہوتے کہ "بابا آپ ایسی چیز کی کیوں پرستش کرتے ہیں جو نہ تو سُنتی ہے نہ دیکھتی ہے، نہ کسی طرح آپ کے کام آسکتی ہے۔" پھر اُن کو ہدایت فرماتے کہ جو علم کی روشنی مجھے ملی ہے اُسے قبول فرمالیجئے اور اللہ کی بندگی کیجئے۔ (سورۂ مریم ۴۲-۴۳)

آخر جب اُنؑ کے چچا نے اور اُنؑ کی قوم نے اُن کی تلقین کو قبول نہ کیا تو آپؑ نے خود اُن سے اپنی بیزاری کا اظہار اِن الفاظ میں فرمایا:

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ لِاَبِيْهِ وَقَوْمِهٖٓ اِنَّنِيْ بَرَآءٌ مِّمَّا تَعْبُدُوْنَ ۝ (الزخرف ۲۶)

(اور جب ابراہیمؑ نے اپنے باپ اور اپنی قوم کے لوگوں سے کہا کہ جن چیزوں کو تم پوجتے ہو، میں اُن سے بیزار ہوں۔)

حضرت ابراہیم علیہ السّلام کی فطرتِ سلیم اور قلبِ مُنیب کو بے شمار آزمائشوں سے گزرنا پڑا۔ قرآنِ حکیم خود اس کی گواہی دے رہا ہے۔

وَاِذِ ابْتَلٰٓی اِبْرٰھٖمَ رَبُّہٗ بِکَلِمٰتٍ فَاَتَمَّھُنَّ ؕ قَالَ اِنِّیْ جَاعِلُکَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ؕ (اور جب پروردگار نے حضرت ابراہیمؑ کی چند باتوں میں آزمائش کی تو وہ اُن میں پورے اُترے، خداوند کریم نے فرمایا کہ میں تم کو لوگوں کا پیشوا بناؤں گا۔ البقرہ ۱۲۴)

ان آزمائشوں سے ہر مومن بچہّ آگاہ ہے۔ ان کے اعادہ کی ضرورت نہیں۔ بات سمجھنے کی یہ ہے کہ جن آزمائشوں میں کامیابی کے بعد اُن کی ذرّیت ہی کو امامت کے لئے اللہ ربّ العزّت نے مختص فرما لیا وہ کس نبیِ مکرّم کے فیضانِ نور کا ثمرہ تھا۔

حضرت ابراہیم علیہ السّلام کا وجود ہی یکسر پیکرِ اسلام تھا، اُنؑ کی تعلیمات اُن کی عملی زندگی اُن کا اخلاص، اُن کا صبر و شکر، اُن کا اللہ تعالیٰ کی ذات پر کامل اعتماد، سب ہی ایک اسوۂ حسنہ میں ڈھلا ہوا تھا، جو رہتی دنیا کے لئے پیغامِ امن تھا اور توکّل علی اللہ کی ایک اعلیٰ مثال۔

یہی وجہ ہے کہ مظاہرِ عالم کے نہ چاند اور ستارے اُن کے ستونِ توحید کو متزلزل کر سکے، نہ سورج کی ضوفشانی انہیں متاثر کر سکی، اور نہ آتشِ نمرود انؑ کے قلب کی حرارتِ ایمانی کا مقابلہ کر سکی۔ اُنؑ کی زبان پر تو یہی رہا:

اِنِّیْ وَجَّھْتُ وَجْھِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ ۝ (انعام ۷۹)

(میں نے سب سے یکسو ہو کر اپنے تئیں اس ذات کی طرف متوجہ کیا جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور میں مشرکوں میں سے نہیں ہوں)

حضرت مولانا ابوالکلام آزاد بجا طور پر یہ سوال کرتے ہیں۔ سوال[1]

---

[1] انبیائے کرام صفحہ ۶۳-۶۴

"وہ کون سی چیز تھی جس نے تمام اُن چیزوں سے ہٹا کر جو آنکھوں سے دیکھی اور کانوں سے سُنی جاتی ہیں اُن کے دل میں ایک ان دیکھے محبوب کے عشق کی لگن لگا دی اور ایک اَن سُنے نغمہ کی تلاش میں اُن کے سامعہ کو آوارہ کر دیا؟ اُن کے سامنے تو بتوں کی قطاریں تھیں جن کو اُن کی آنکھیں دیکھتی تھیں، پھر وہ کون تھا جو اُن کے اندر بیٹھا ہوا خدائے قدوس کو دیکھ رہا تھا اور اس قدرتی جوش اور قوت کے ساتھ جو کسی بلندی سے گرنے والے آبشار یا کسی زمین سے اُبلتے ہوئے چشمہ میں ہوتا ہے، اُن کی زبان سے فاطر السّمٰوٰت والارض کی شہادت دے رہا تھا۔"

اَلَّذِی خَلَقَنِی فَھُوَ یَھْدِیْنِ (۲۶: ۷۸) (میرا رب وہی ہے) جس نے مجھے پیدا فرمایا اور میرے لئے ہدایت کی راہیں کھول دیں۔ پھر اسی سورۃ الشعراء میں یہی نغمۂ توحید جاری ہے۔

اور دعا پر ختم ہوتی ہے۔

"اور مجھے وہی کھلاتا اور پلاتا ہے اور جب میں بیمار پڑتا ہوں تو وہی شفا بخشتا ہے، اور وہ جو مجھے مارے گا اور پھر زندہ کرے گا اور جس سے میں امید رکھتا ہوں کہ قیامت کے دن میرے گناہ بخشے گا۔

"پھر دست بدعا ہوتے ہیں: "اے میرے پروردگار مجھے علم و دانش عطا فرما اور نیکوکاروں میں شامل کر اور آنے والے لوگوں میں میرا ذکر جاری رکھ اور اپنی نعمتوں والی بہشت کے وارثوں میں شامل فرما....."

جواب۔ حضرت مولانا ابوالکلام آزاد اس سوال کا جواب خود یوں دیتے ہیں:

"دراصل یہ روحِ الٰہی اور روحِ اعظم وہی "حقیقتِ اسلامیہ" تھی جس نے ان کے وجود کو آنے والی امتوں کے لئے اسوۂ حسنہ بنا دیا تھا۔ اور

جس کی وصیت انہوںؑ نے اسحٰقؑ اور اسمٰعیل علیہما السّلام کو کی۔ پھر انہوں نے یعقوبؑ کو اور اس کے بعد نسلاً بعد نسلٍ سلسلۂ ابراہیمی میں منتقل ہوتی گئی۔ جس کا ذکر سورۃ البقرہ میں آتا ہے۔

(یہی اسلام تھا) جس کی وصیت حضرت ابراہیمؑ نے اپنی اولاد کو کی، اور پھر حضرت یعقوبؑ نے بھی (اپنے فرزندوں سے یہی کہا) کہ بیٹا تمہارے لئے اللہ نے اس دینِ اسلام کو پسند فرمایا ہے۔ (اب تم زندگی بھر اس کی تعلیم دینا) اور مرنا تو مسلمان ہی مرنا! ترجمہ ۲ : ۱۳۲)

"یہی وہ روحِ اعظم تھی جو آدم کے کالبد میں پھونکی گئی۔

نَفَخْتُ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِیْ "(آدم میں میں نے اپنی روح پھونک دی)

آپ نے ملاحظہ فرمایا: یہ حقیقتِ محمدی، یہ نفختُ من روحی، جسے مولانا آزاد "روحِ الٰہی، روحِ اعظم" سے تعبیر فرما رہے ہیں یہ کیا تھی۔ یہ وہی نُور تھا جس کی ابتداء نورِ محمدی صلّی اللہ علیہ وسلّم سے ہوئی۔ جس سے کائنات ہی نہیں، لوح، قلم، عرش کرسی اور انبیاء علیہم السّلام کی تخلیق ہوئی۔ یہی وہ نورِ مبین تھا جو فطرتِ ابراہیمی بن کر ظاہر ہوا، یہی نورِ مبین کا فیضان تھا جو اسوۂ حسنہ بن کر نمایاں ہوا۔ یہی نورِ مبین کی تجلیات تھیں جو نسلاً بعد نسلٍ مسلسل حضرت ابراہیم علیہ السّلام کی ذرّیت میں ایک نبی سے دوسرے نبی میں منتقل ہوتی رہیں۔ دراصل ان انبیاء علیہم السّلام کے قلوب و روح میں یہی تجلیاتِ روحِ محمدی جاگزیں رہیں، جس نے ہر نبی کو اسلام کی ارتقائی منزلوں میں کسی خاص نعمت کسی خاص کیفیت سے نوازا اور انؑ کا ذکر آنے والوں میں باقی رکھا گیا۔ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِی الْمُحْسِنِیْنَ حضرت ابراہیم علیہ السّلام اور دیگر انبیاء کرام کے بارے میں بھی قرآنِ حکیم میں اس انعام الٰہی کا ذکر بڑے اہتمام سے آیا ہے۔ (الصّٰفّٰت ع ۳-۴)

اس سورہ میں حضرت ابراہیم علیہ السّلام کے بعد اُن کی ذرّیّت کو اسی لفظ محسن سے یاد کیا جاتا ہے، حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السّلام کو

سَلٰمٌ عَلٰی مُوْسٰی وَ هٰرُوْنَ ○ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ (۳۷:۱۲۱)

اور اسی سلامتی کے وعدوں کے ساتھ الیاس، لوط، یونس علیہم السّلام اور دوسرے رسولوں اور نبیوں کا ذکر ہے۔ جو سب بھی اللہ کے مومن بندے، نبوّت کے لئے منتخب، اور کرم وفیض سے سرفراز تھے۔ جنہوں نے اپنے قول وفعل اور قلبی لگاؤ کے ساتھ اللہ تعالےٰ کی وحدانیت کو عام کرنے میں زندگی کے لمحات گذارے اور اپنی امّت کے قلوب میں حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کی محبّت کا بیج بو گئے، تاکہ وہ حضورؐ کی عظمت وشان سے غافل نہ ہوں، جو سرچشمۂ حیات ہیں۔ اس طرح انہوںؑ نے اللہ کے حقوق کی ادائگی کے ساتھ نبوّت اور فیضانِ نبوّت دونوں کے شکر گذار رہ کر مُحسنین کی صف میں جگہ پائی۔

○

آیئے قرآنِ حکیم کی روشنی میں حضرت ابراہیم علیہ السّلام کے اِس اسوۂ حسنہ پر ایک اجمالی نظر ڈالیں، جو اُن کی فطرت، اُن کی ذہنی کیفیت اور اُن کے قلبی ذوق ولگن پر شاہد ہے۔

قرآنِ حکیم میں یہ ذکر پہلے پارے سے لے کر آخر تک پھیلا ہوا ہے۔ اور ہر جگہ ایک نئے انداز سے اس مبلّغِ اعظم کی جدوجہد، ایثار، قربانی اور فریفتگی کا ذکر ہے۔

شروع ہی کے پارے میں حضرت ابراہیم علیہ السّلام کے ایمان وایقان کا وہ منظر پیش کیا جا رہا ہے جب حضرت ابراہیم علیہ السّلام خانۂ کعبہ کی بنیادیں اپنے چہیتے بیٹے اسمٰعیلؑ کے ساتھ اُٹھا رہے ہیں، اور دل کی گہرائیوں سے

سے دعا کر رہے ہیں کہ اے اللہ تو ہماری اس سعی کو قبول فرما لے، بے شک تو ہی التجاؤں کا سننے والا ہے۔ یہی نہیں بلکہ یہ بھی دعا ہے کہ اے اللہ تو ہم کو اپنا حکم بردار بنا اور ہماری اولاد میں بھی ایک جماعت فرماں برداروں کی پیدا فرما دے۔ ہم کو حج کے طریقے (شرائط حصول، شرائط قبول) سکھا اور ہم کو معاف فرما، بے شک تو ہی توبہ قبول فرمانے والا ہے۔

پھر وہ عظیم دعا فرماتے ہیں جو مقام خلّت پر فائز نبی ہی کر سکتا تھا:

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِیْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِكَ وَیُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَیُزَكِّیْهِمْ ؕ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ﴿۱۲۹﴾

اے ہمارے ربّ انہیں (گدایانِ محبّت) میں سے ایک رسول خود ان ہی میں کا مبعوث فرما جو ان کو تیری آیتیں پڑھ کر سنائے (تیرے تحفے دے) اور ان کو کتاب سکھائے (کتاب کی تعلیم دے اور) دانائے راز بنائے (اسرار کی باتیں بتلائے) اور ان (کے قلوب) کو (غیر اللہ سے) پاک کر دے، بے شک تو بڑی حکمت والا ہے۔ (ترجمہ از فیوض القرآن)

دعائیں جاری رہیں اور خوب خوب قبولیت سے نوازی گئیں، ایسی قبولیت جس کا ذکر آئندہ ابواب میں آئے گا۔

بنیاد رکھنے والے کی سب سے بڑی خوبی اس کی نیت و اخلاص ہوتا ہے۔ یہ وہی خلوص ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے الفاظ اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ میں ظاہر ہوا اور ہر مومن کا جزوِ ایمان بن گیا۔ اسی کی تشریح بخاری شریف کی پہلی حدیث مبارکہ ہے اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ تاکہ مومن خوب جان لے کہ عمل کا دار و مدار نیت پر ہے، اعمال کے خالص ہونے کی بنیاد خلوص نیت ہی ہے

اور اس کی بالیدگی کا دار و مدار ذوق و شوق کے ساتھ عمل پیرا ہونے پر ہے۔

انبیاءؑ کا عمل تبلیغِ دین ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السّلام کی خلوصِ نیّت ہی کا ثمرہ ہے کہ دینِ اسلام کی اصل ابتداء آپؑ ہی کے دور سے ہوئی اور آپؑ ہی کے بیشتر اندازِ عبدیت کو اسلام کی بنیاد قرار دیا گیا۔ حضرت ابراہیم علیہ السّلام کی حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کے ساتھ خصوصی نسبت یہاں بھی نمایاں ہے۔ آپؑ نے بھی تبلیغِ دین کا آغاز پہلے اپنے گھر والوں سے کیا اور اپنی قوم کو دعوتِ توحید دی۔ پھر نمرود کا مقابلہ نہایت عزم، ایمان و ایقان سے کیا۔ آپؑ نے اپنی عام تبلیغ میں بھی نہایت بردباری، تحمّل اور حکمت سے کام لے کر بُت پرستی کی کمزوریوں، نقائصِ جہلیّت کو لوگوں پر آشکارا فرمایا۔ قرآن حکیم میں ان کا ذکر آلِ عمران، الانعام، ھود، سورۂ ابراہیم، سورۂ انبیاء وغیرہ میں وضاحت سے آیا ہے، کہیں مکالمہ کی صورت میں، کہیں بتوں کو پاش پاش کرنے کی شکل میں، کہیں نمرود سے مباحثہ میں۔ ہر جگہ ربّ العزّت کا وہ فضل و کرم انؑ کا معاون اور نگرانِ حال رہا، جو انؑ کا واحد سہارا تھا، کہیں آگ گلزار ہوئی، کہیں لوگوں کو ہدایت ملی، کہیں ہوس پرستوں کے بازو شل ہوئے، ان نوازشات کی ایک اہم کڑی رہتی دنیا تک وادیٔ غیر ذی زرع کی آبادی تھی اور آپ کی وہ اہم ترین دعا مقامِ حُب پر فائز نبی سرورِ کائنات صلّی اللہ علیہ وسلّم اور آپؑ کی امّت کے لئے تھی جو بارگاہِ ربّ العزّت میں قبول ہوئی۔

سیّدنا ابراہیم علیہ السّلام کی حیاتِ مبارکہ میں سے چند اہم دعاؤں کے اندازِ قبولیت کا ذکر تازگیٔ ایمان کے لئے ضروری ہے۔ اس کی ایک لازوال مثال تو سیّدنا ابراہیم علیہ السّلام کا وہ سفر ہے جو آپؑ کی مصر سے واپسی سے متعلق ہے۔ ہمارے پیشِ نظر ان واقعات کی تفصیل نہیں، لیکن فرعونِ مصر

نے جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بی بی سارہ کی وجہ سے جن کرامات کو دیکھا تو ان سے یہ یقین ہو گیا کہ یہ مقبول اور برگزیدہ خاندان ہے اور اپنے اس جذبہ کو محض سارہ کے اعزاز اور مال و دولت سے نوازنے تک محدود نہ رکھا بلکہ اپنی بیٹی ہاجرہ کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زوجیت میں دے دیا اور کہا "میری بیٹی کا اس بزرگ گھر میں لونڈی ہو کر رہنا دوسرے گھروں میں ملکہ ہونے سے بہتر ہے۔" (ارض القرآن جلد دوم)

چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اس وادئ بے آب و گیاہ میں وارد ہونے کے بعد حضرت ہاجرہ کے بطن سے ایک لڑکا پیدا ہوتا ہے۔ جس کی مولودگی حضرت سارہ پر شاق گذرتی ہے۔ بالآخر حضرت ابراہیم علیہ السلام اللہ رب العزت کے حکم کے تحت، اس کو لے کر نکلتے ہیں۔ اس طرح کہ آپؑ حضرت ہاجرہ اور شیر خوار بچہ سیدنا اسمٰعیل کو ایک درخت کے نیچے ایک بلند مقام پر وہاں جاتے ہیں جہاں آج خانۂ کعبہ ہے اور جہاں زمزم جاری ہوا۔ یہ ایک ویران اور غیر آباد مقام تھا، جہاں پانی کا بھی نام و نشان نہ تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام ایک مشکیزہ پانی اور ایک تھیلی کھجور چھوڑ کر بی بی بچے کو اللہ کے سپرد کرتے ہیں۔ صابر بی بی پوچھتی ہے کہ کیا یہ اللہ کا حکم ہے۔ اثبات میں جواب سننے پر برجستہ کہتی ہے کہ "اگر یہ اللہ کا حکم ہے تو بلاشبہ وہ ہم کو ضائع اور برباد نہیں کرے گا۔"

حضرت ابراہیم علیہ السلام یقیناً بظاہر ہاجرہ کو بے سہارا چھوڑ گئے لیکن بہ باطن انہیں اللہ کی معیت میں دیا، جو ان کا بہترین سہارا تھا۔

پھر ان سے جدا ہو کر ایک مقام پہ دعا کی جس کا ذکر قرآن حکیم میں آتا ہے۔ "اے ہم سب کے پروردگار (تو دیکھ رہا ہے کہ) ایک ایسے میدان میں جہاں کھیتی کا نام و نشان نہیں میں نے اپنی بعض اولاد تیرے محترم

گھر کے پاس لا بسائی ہے کہ نماز قائم رکھیں (تاکہ یہ محترم گھر عبادت گذارانِ توحید سے خالی نہ رہے) پس تو (اپنے فضل وکرم سے) ایسا کر کہ لوگوں کے دل ان کی طرف مائل ہو جائیں اور اُن کے لئے زمین کی پیداوار سے سامانِ رزق مہیا کر دے تاکہ تیرے شکر گزار ہوں۔ (ترجمہ سورہ ابراہیم آیت ۳۷)

دنیا نے دیکھ لیا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السّلام کی اس دعا کو شرفِ قبولیت سے اس انداز سے نوازا کہ ہر سال لاکھوں انسان اس خطّہ پاک کی زیارت خانۂ کعبہ کے طواف کے لئے حاضری دیتے ہیں اور اکثر حج وغیرہ کے مناسک سے سرفرازی پاتے ہیں اور اسی چاہِ زمزم کے پانی سے قلوب کو منوّر کرتے ہیں جو سیّدنا حضرت اسمٰعیلؑ کے معصوم قدموں کا فیضان ہے۔ اور بقول ہمارے بھائی ساجد صاحب" اس میں میرے آقا صلّی اللہ علیہ وسلّم کا لعابِ دہن ملا ہوا ہے"۔ سیّدنا حضرت ابراہیم علیہ السّلام کی وہ عظیم دعا جو حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کی بعثت سے متعلّق تھی جس کا ذکر پہلے آچکا ہے، خانۂ کعبہ کی تعمیر ہی کے وقت کی گئی۔ اور مکّہ معظمہ ہی کی سرزمین کو یہ سعادت نصیب ہوئی کہ اللہ کا آخری نبیؐ وہیں پیدا ہو، وہیں مبعوث ہو۔ یہی وہ سرزمین ہو جہاں سے بنجر قلوب کو حیاتِ ابدی کی بشارتیں ملیں۔ اور تبلیغِ دین جو انبیاءؑ کا ورثہ تھا حضورؐ کی امّت کو سونپا جائے۔

سُبْحَانَ اللّٰہِ وَبِحَمْدِہٖ

○

حضرت ابراہیم علیہ السّلام کے اسوۂ حسنہ کی بے شمار مثالیں ہیں لیکن آپؑ کے تسلیم ورضا کی وہ مثال جو ذبحِ عظیم کہلائی اپنی مثال آپ ہے۔ اس کی طرف

یہاں اشارہ کافی ہے۔ یہ آپؐ کا وہ رُویائے صادقہ تھا جس کو آپؐ نے حق کر دکھایا اور یہ وہ آزمائشِ صبر و رضا ہے جس میں دو عظیم ہستیوں کا امتحان بہ یک وقت ہو رہا ہے۔ ایک سیدنا ابراہیم علیہ السلام اور دوسرے آپ کے پیارے بیٹے سیدنا حضرت اسماعیل علیہ السّلام۔ ہر مومن کا قلب اس کی اہمیت و عظمت سے آگاہ اور ہر سال اس کی یادیں قربانی ہی سے تازہ کی جاتی ہیں، اور اُس کو مناسکِ حج میں جگہ دی گئی ہے۔ قرآنِ کریم میں اِس واقعہ کا ذکر سورۂ الصّٰفّٰت کی آیات ۱۰۰ تا ۱۰۹ میں آتا ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السّلام دعا فرماتے ہیں اے میرے پروردگار مجھے ایک نیک بیٹا عطا فرما دے۔ پس اللہ تعالیٰ نے اُنہیںؑ ایک بُردبار بیٹے کی بشارت دی (انہیں کا نام اسمٰعیل رکھا گیا)

پھر جب حضرت اسماعیلؑ اس عمر کو پہونچے کہ اُنؑ کے ساتھ دوڑ کر چل سکیں تو حضرت ابراہیم علیہ السّلام نے اُنؑ سے فرمایا: اے میرے بیٹے میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ میں تم کو ذبح کر رہا ہوں۔ تم بھی غور کر لو کہ تمہارا کیا خیال ہے، یعنی اس کے متعلق تم کیا سمجھتے ہو، تمہاری کیا رائے ہے۔ حضرت اسمٰعیلؑ بلاتردّد عرض کرتے ہیں: پھر دیر کیا ہے اے میرے باپ! جس بات کا آپ کو حکم دیا گیا وہ کر ڈالیئے (جہاں تک میرا تعلق ہے) انشاء اللہ آپ مجھے صبر کرنے والوں میں پائیں گے۔

پھر جب دونوںؑ نے حکم مان لیا اور حضرت ابراہیمؑ نے اُنہیں ماتھے کے بل لٹا دیا (اور چاہا کہ ذبح کریں تو نہ چھُری چلی نہ گلا کٹا)۔ جبرئیلِ امین بحکمِ الٰہی ایک مینڈھا جنّت سے لائے وہ اُنؑ کی جگہ ذبح پڑا تھا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَنَادَيْنٰهُ اَنْ يّٰۤاِبْرٰهِيْمُ ۙ اور ہم نے ندا دی اے ابراہیم (کیا خوب)
قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءْيَا ۚ اِنَّا كَذٰلِكَ تم نے اپنا خواب سچا کر دکھایا۔ بے شک

نَجْزِی الْمُحْسِنِیْنَ ۝ (الصّٰفّٰت) ہم اسی طرح نیکوکاروں کو بدلہ دیا کرتے ہیں
بے شک باپ کا بیٹے کو ذبح کرنے کے لئے تیار ہو جانا ایک بڑی صریح آزمائش تھی۔ اس پر حضرت ابراہیمؑ پورے اُترے۔

وَفَدَیْنٰہُ بِذِبْحٍ عَظِیْمٍ ۝ اور ہم نے ایک عظیم قربانی کو اس کا فدیہ بنا دیا۔ یہاں مینڈھا ذبح ہوا۔ اس کی یادیں امّتِ محمّدیہ میں قائم کی گئیں لیکن کیا دردمند قلوب اس واقعہ کے ساتھ کرب وبلا کے اس بے بس، پُرایمان، صبر ورضا کے پیکروں کی جانب متوجّہ نہیں ہو جاتے جہاں حضور سرورِ کائنات صلّی اللہ علیہ وسلّم کی آل، حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالےٰ عنہا کے لاڈلے حضرت امام حسین علیہ السّلام اپنے مختصر قافلہ کے ساتھ باطل کے مقابلہ میں صف آرا ہیں اور ایک ایک کر کے حق کی راہ میں قربان ہو رہے ہیں۔ وہاں نہ مینڈھا آتا ہے نہ جبرئیل کی اعانت قبول کی جاتی ہے۔ وہاں تو صرف رُخ اللہ کے جانب اور تصوّر

اَللّٰہُ مَحْمُوْدٌ فِیْ کُلِّ فِعَالِہٖ

پر قائم تھا۔ آج امّتِ محمدیہ اُن کی صبر آزما یادوں سے اپنا سال شروع کرتی ہے، اور سیّدنا ابراہیم علیہ السلام کی یادوں کے ساتھ اپنا سالِ ہجری ختم کرتی ہے۔ ایک مقامِ صبر کا مرقع ہے تو دوسرا شکر کا۔ اور یہی صبر و شکر اسلام کی تعلیمات کی روح ہے۔

یہ بات خاص طور پر ملحوظِ خاطر رہے کہ مقامِ خلّت میں امتحان ہوتا ہے اور مقامِ حبّ میں بھی۔ لیکن دوستی میں اس قدر امتحان لیا جاتا ہے کہ دوست کے قلب پر بالآخر گرانی نہ آئے، اور اللہ تعالیٰ اپنی دوستی کا ثبوت اُن کی دوستی سے زیادہ دے۔ لیکن مقامِ حبّ میں "میں اور تُو" کا فرق مٹ جاتا ہے۔ یہاں قربانی ہوتی ہے، جوانوں سے لے کر معصوم بچّہ تک کی۔ زمین وآسمان کانپ جاتے ہیں۔ اس کے ہر خون کے قطرے کو اسلام کی محبّت کا درخشاں

موتی بنا دیا جاتا ہے، جو چشم بھی اس غم میں پُرنم ہوئی وہ اِس سے فیضانِ رحمت کی حق دار قرار پاتی ہے۔ اور یہ ذبحِ عظیم گویا حضرت اسمٰعیل علیہ السّلام سے لے کر جملہ انبیاءؑ کی قربانیوں اور جملہ صحابۂ کرامؓ کی شہادتوں کی یادوں کو تازہ کرنے کا ذریعہ بن جاتی ہیں۔ یہاں ایک لطیف نکتہ بیان کرنے کو جی چاہتا ہے: دیکھیے! جب نورِ محمدیؐ پشتِ آدم سے پشتِ ابراہیمؑ میں آیا تو مقامِ خلّت کی آزمائش و قربانی سے سرفراز ہوا۔ اور جب یہ نور پیشانیٔ فاطمہ علیہا السلام میں چمکا تو شہادتِ امام حُسین علیہ السلام اور کاروانِ امام حسین علیہ السّلام اور جملہ شہداء اور راہِ سلوک کے مجاہدین کے لئے موجبِ صد افتخار بنا۔

بنا کردند خوش رسمے بہ خون و خاک غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

شاید یہی وجہ ہو کہ قرآنِ حکیم میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اسوۂ حسنہ کا ذکر دو بار اور حضور سرورِ کائناتؐ کے اسوۂ حسنہ کا ذکر ایک بار ہے۔ وجہ یہ ہے کہ پیشانیٔ ابراہیمی میں بھی تو وہی نورِ مبین تھا جس کے اسوۂ حسنہ کے فیضان کا ظہور سیدنا ابراہیم علیہ السّلام اور اُنؑ کے صُلب سے ظاہر ہونے والی جملہ انبیاءؑ کی جماعت میں ہوا۔ مختصر یہ کہ حضرت ابراہیم علیہ السّلام ایک نبی ہی نہیں بلکہ خود پیکرِ اسلام بن کر اسلام کے علمبردار بنے، اور ایک ذہنی اور روحانی انقلاب کا موجب بنے۔ بقول مولانا آزاد: "وجودِ ابراہیمی کا مقامِ "خلّت" کلمۂ طیبہ کا ایک بیج تھا جس سے اُمّتِ مسلمہ کا "شجرِ طیبہ" نکلا اور بلاشبہ اس کی اصل زمین میں ثابت ہیں اور ٹہنیاں فضا میں پھیل گئیں۔

؎ اسوہ: کا لفظ قرآنِ حکیم میں تین مقامات پر آتا ہے۔ اوّل سورۂ احزاب (آیت ۲۱) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت۔ پھر سورۂ ممتحنہ (آیات ۴-۶) میں دو بار حضرت ابراہیم علیہ السّلام کی نسبت۔

(اقتباس از انبیاء کرام صفحہ ۸۷-۸۸)

لیکن اگر آپ ذرا بنظرِ غور مطالعہ فرمائیں تو یہ حقیقت بھی آپ پر آشکارا ہو جائے گی کہ جس شجرِ طیّبہ کی شاخیں اولادِ ابراہیم علیہ السلام اور جس کا بیج نورِ سیدّنا ابراہیم علیہ السّلام تھا وہ نور، خود اسی نورِ مبینؐ کے فیضان کا تخم تھا جس سے عالمین کو قیام و قرار بخشا گیا، جس سے قلبِ آدم کو منوّر کیا گیا، جس سے خصوصی نسبت سیّدنا ابراہیم علیہ السّلام کو عطا ہوئی۔ کہ صراطِ مستقیم کا تعیّن از اوّل تا آخر ایک مستحکم انداز سے ہو جائے اور یہ امر بھی واضح ہو جائے کہ یہی فیضانِ نورِ مبینؐ تھا جو اپنی پوری وسعتوں کے ساتھ انبیاء علیہم السّلام میں آشکارا ہوتا رہا، اور جس کا تخمِ اوّل سیّدنا ابراہیم علیہ السّلام کے وجودِ مبارکہ کو عطا ہوا تاکہ سعادتِ بشری کے لئے آپ کی حیاتِ مبارکہ کو ایک بنیادی مقام حاصل رہے، جو اسلامی عقائد اور اعمال دونوں پر حاوی ہو۔ اور یہ بات بھی واضح ہو جائے کہ بنیادِ ایمان نورِ مبین صلّی اللہ علیہ وسلّم ہی ہیں۔

○

حضرت ابراہیم علیہ السّلام کے اسوۂ حسنہ اور اندازِ تبلیغ میں جو بات ہمیشہ یاد رکھنے کی ہے وہ یہ کہ آپؑ کے پیشِ نظر متّبعین کی کثرت نہیں بلکہ دینِ اسلام کی بنیادوں کو مستحکم فرمانا تھا۔ آپؑ کا فریضہ ایک بنیاد رکھنے والے کی طرح ایمان کے اجزاء کو قلب و روح کی گہرائیوں میں راسخ کرنا تھا۔ وہ بنیادیں جن پر اسلام کی عمارت تعمیر ہو، اور جس کی تکمیل حضور سرورِ کائنات صلّی اللہ علیہ وسلّم کے مُبارک ہاتھوں سے ہو۔ انؑ کی جملہ جدّوجہد کا منشاء انسان کے باطن کو نورِ ایمان سے منوّر کرنا تھا۔ انؑ کے پیشِ نظر آنے والی نسلوں کے لئے ایک وحدتِ فکر قائم فرمانا تھا جس کا باطن و ظاہر توحید ہو۔ اور اپنی ذرّیتِ انبیاءؑ

میں اس امانتِ توحید کو اس طرح چھوڑ جانا تھا کہ وہ سب کے سب اس کے پابند رہ کر ہمیشہ ایک اللہ کی طرف اپنی امتوں کو بلاتے رہیں، اُس کی معرفت کے جویا رہیں، اور اُن تمام بے دیکھی حقیقتوں پر ایمانِ کامل رکھیں جو جزوِ ایمان ہیں۔ گویا وہ علم بردارِ اسلام بن کر خود دنیا کو اسلام کا پرچم دینے آئے تھے۔

واضح رہے کہ یہ سفر باطن سے ظاہر کی طرف ہے اور اپنے ظاہری نام سے موسوم ہے، یعنی اسلام۔ لیکن دراصل یہ اسی ایمان کی بنیاد پر قائم تھا جو اسلام کہلایا، یہی وہ تخمِ ایمان تھا جو زمینِ خلقت میں بویا گیا اور امّتِ مسلمہ کے لئے وہ کلمۂ طیبہ بنا جس کی جڑیں زمین میں اور شاخیں آسمان پر پھیلیں اور دنیا و آخرت میں کامیابی و کامرانی کا ضامن ہوا۔ اس کا ذکر بڑے اہتمام کے ساتھ سورۂ فتح کی آخری آیت

(مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللّٰهِ ...... وَاَجْرًا عَظِيْمًا)

میں آتا ہے، جس کا ترجمہ یوں ہے۔

محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں، اور جو لوگ آپؐ کے ساتھ ہیں وہ کافروں کے مقابلہ میں سخت لیکن آپس میں رحمدل تم دیکھو گے کہ کبھی وہ رکوع میں کبھی سجود میں ہیں، غرض ہر طرح سے اللہ سے اُس کے فضل اور اُس کی رضامندی کے طالب ہیں، اُن کی علامت اُن کے چہروں پر نمایاں ہے جو سجدوں کا اثر ہے (اُن کے چہروں پر عبادت کے آثار، پیشانی پر سجدوں کے نشان، ولایت کا بار اُن کی جبین پر ہے، یہ تو الگ پہچانے جاتے ہیں) اِن صحابہؓ کی تعریف توریت میں اور اُن کے اوصاف انجیل میں آئے ہیں ——————

اُن کی مثال ایک کھیتی کے مانند ہے کہ پہلے اُس نے سُوئی

کی طرح ایک پتی نکالی، پھر اُس کو مضبوط بنایا، پھر وہ موٹی ہوئی، پھر بڑھ کر اپنے بل پر کھڑی ہو گئی اور یہ سر سبز لہلہاتی ہوئی کھیتی کاشت کاروں کو بھلی معلوم ہونے لگی۔ یہ اسلام کی کھیتی ہے جو لہلہا رہی ہے تاکہ کافروں کا جی جلے۔ یہ دنیا میں اُن کا انعام ہے جو اس کے لئے کوشاں رہے اور آخرت میں تو اللہ کا اُن سے جو ایمان لائے اور نیک عمل کئے مغفرت اور اجرِ عظیم کا وعدہ ہے"۔

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ کس طرح فیضانِ نورِ محمدی آہستہ آہستہ لیکن عزم استقلال اور ایک جامع مقصدیت کے ساتھ ایک منزلِ عرفانِ باری تعالیٰ کی طرف رواں دواں تھا۔ خود نبوت سے سرفراز لیکن عشقِ الٰہی میں خود رفتہ ناظرِ تخلیقِ کائنات رہا، پھر پیشانیٔ آدمؑ میں جگہ پا کر مسجودِ ملائک بنا، اور پیکرِ اسلام بن کر اسوۂ ابراہیمی میں ظاہر ہوا۔

اور پھر ارتقائے باطن وظاہر سے گذرتا ہوا، کہیں آتشِ نمرود، کہیں بیٹے کی قربانی کی تیاریاں، کہیں انبیاء علیہم السّلام کی شہادتیں، کہیں فرعون کے مظالم، کہیں عیسیٰ علیہ السّلام کی صلیب، اور ہر حال میں اعانتِ الٰہی کے کرشمے عام کرتا ہوا، جملہ انبیاء علیہم السّلام کے صبر و استقلال، عزم و مجاہدہ میں اُنؑ کا سہارا بنا رہا۔

اسلام کی بنیاد قربانیوں ہی پر ہے۔ اس کا دامن خون کی چھینٹوں سے رنگین ہے۔ با ایں ہمہ اس کے عروج پر خانۂ کعبہ کی دیواریں، اور اس کی لقا پر قرآنِ حکیم گواہ ہے۔ اور اُس کی اصل منزل توحیدِ باری تعالےٰ پر کلمۂ طیبہ لا الٰہ الاّ اللہ محمدٌ رسول اللہ تا قیامِ قیامت شاہد ہے اور رہے گا۔

یہاں اختصار کے ساتھ اُن اُمور کی طرف کچھ اشارہ کیا گیا جن کا ذکر

کسی قدر تفصیل سے آئندہ ابواب میں آئے گا، تاکہ کسی حال میں نورِ مبین صلّی اللہ علیہ وسلّم کی شانِ جلوہ گری مومن کی نظروں سے اوجھل نہ ہو کہ ہمارا مقصد ہر آئینۂ نبوّت میں تجلّیاتِ نورِ مبین صلّی اللہ علیہ وسلّم کو آشکارا کرنا ہے۔

حَسُنَتْ جَمِیْعُ خِصَالِہٖ
صَلُّوا عَلَیْہِ وَ اٰلِہٖ

و

نورِ مُبین کی تجلّیات۔ (تمہید)

حضرت ابراہیم علیہ السّلام سے لے کر حضرت عیسیٰ علیہ السّلام تک جلیل القدر انبیاء علیہم السّلام کا ایک سلسلہ ہے جو سب حضرت ابراہیمؑ کی ذرّیّت ہے اور یہ سلسلہ حضرت سرورِ کائنات صلّی اللہ علیہ وسلّم پر منتہیٰ ہوتا ہے۔ یہ سب انبیاءؑ کرام ایک ہی وحدتِ فکر کے ترجمان، ایک ہی عقیدۂ توحید کے علمبردار ہیں۔ سب ہی کو اپنی قوموں سے اُن کے انکار اور مسلسل ایذارسانی کا مقابلہ کرنا پڑا، اور سب اپنے عزم، صبر، تحمّل، استقلال کا مینارِ نور بنے رہے۔ سب ہی اسی قوم میں پیدا ہوئے جس کی ہدایت کے لئے وہ مبعوث ہوئے تھے اور سب کا پیغام اپنی قوم کو یہی تھا۔

۱۔ دیکھو! اللہ کی بندگی کرو۔ اس کی بندگی میں کسی کو شریک نہ کرو۔

۲۔ اللہ تعالیٰ کے یہاں تمہاری قدر تمہاری دولت و ثروت سے نہیں بلکہ تمہارے نیک اعمال سے ہے۔

۳۔ اس نے تم کو پیدا کیا، وہ رزق دیتا ہے، وہی مارتا ہے وہی جلاتا ہے۔ اس کی فرمانبرداری میں تمہارے لئے دنیا و آخرت میں فلاح ہے اور اُس کی نافرمانی تمہارے لئے موجبِ عذاب ہے۔

یہ امر بھی دلچسپی سے خالی نہیں کہ قوموں کے اندازِ انکار میں بھی ایک وحدتِ فکر تھی، سب ہی اللہ و رسولؑ کی فرمانبرداری سے کتراتے رہے۔ سب ہی نے اعلانِ رسالت کا مذاق اُڑایا، سب ہی نے اپنے انبیاءؑ کو اذیتیں پہونچائیں اور انؑ کی دعوتِ حق کو روکنے کے لئے ہر ممکن کوشش کی۔ اور اُنؑ کے دعویٔ حق پر جو ہر طرح ان کے دل و دماغ کو متاثر کرنے والا تھا اُن کا جواب یہی ہوتا کہ خود اس نبیؑ کو نکال دو، اسےؑ کو سنگسار کر دو۔

سب کے لئے اُن کے آباء واجداد کا طریقہ ہی قابلِ تقلید تھا اور موت کے بعد زندہ کیا جانا اُن کے لئے ایک بے معنی حقیقت رہی۔

البتہ ہدایت کے لئے بے تاب قلوب اُنؑ کی تعلیمات سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور اُن میں بالعموم کثرت غرباء اور نادار لوگوں کی تھی چنانچہ حضرت ابوالکلام آزاد نہایت خوبصورت اور پُرکیف انداز سے اس وحدتِ فکر کی طرف یوں توجہ مبذول فرماتے ہیں:۔

(دیکھو یہ مختلف انبیاء کرامؑ جو اپنے اپنے زمانے میں حضرت ابراہیم علیہ السلام سے قبل اور اُنؑ کے بعد تشریف لائے) "وہؑ کیسے وقتوں میں پیدا ہوئے، کن کن لوگوں میں پیدا ہوئے۔ اُنؑ کی کیا پکار تھی؟ اور اُن کی کیا نوعیت تھی؟ اُنؑ کی دلیلیں کیا تھیں، جن پر انہوںؑ نے زور دیا؟ اُنؑ کا طریقۂ کار کیا تھا جس پر وہؑ برابر کاربند رہے؟ انہوںؑ نے اپنے قدم جہاں ٹکائے وہ جگہ کون سی تھی اور سہارے کے لئے جس طرف ہاتھ بڑھایا تھا وہ کون تھے؟.......

پھر اُنؑ کی قوموں میں جو معاملات پیش آئے وہ کس قسم کے تھے، اور ان معاملات میں انؑ کا جو قول وفعل رہا وہ کس قسم کا تھا۔ تم دیکھو گے کہ ساری باتوں میں ہر رسولؑ دوسرے رسولؑ کی تصویر تھا، اور ہر دعوت دوسری دعوت کا عکس تھی۔ کسی بات میں تم ایک کو دوسرے سے جُدا نہیں کر سکتے۔

سبؑ ہی اِس حال میں پیدا ہوئے کہ دنیوی طاقتوں اور حکمرانیوں میں سے کچھ نہیں رکھتے تھے، سبؑ کا ظہور ایسے وقتوں میں ہوا جب خدا پرستی اور نیک عمل کی روشنی بجھ چکی تھی۔ سبؑ انہیں قوموں میں پیدا ہوئے جن قوموں کو انہیںؑ نے مخاطب کیا تھا۔ سبؑ کی زبانوں

سے ایک ہی پکار نکلی۔ سبؑ نے ایک ہی طرح لوگوں کو بُلایا۔ سبؑ نے کہا اللہ کی بندگی کرو، اُس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ سبؑ نے کہا ظلم اور بدعملی سے باز آجاؤ، اِس کا نتیجہ ہلاکت ہے۔ سبؑ نے کہا ہماری جدوجہد ادائے فرض ہے، مزدوری کی طلب نہیں۔ سبؑ نے کہا ہمارا دعویٰ اِس کے سوا کچھ نہیں کہ ایمان و نیک عمل کے نتائج کی بشارت دینے والے، اور انکار و بدعملی کے نتائج سے متنبہ کرنے والے ہیں۔ ماننا نہ ماننا تمہارا کام ہے........

پھر اُن قوموں کی طرف نظر اُٹھاؤ جن میں اِن تمام دعوتوں کا ظہور ہوا (تو تم دیکھو گے کہ) کس طرح یہاں بھی ہر قوم اپنے طرزِ عمل میں ٹھیک ٹھیک دوسری قوم کی شبیہ ہے، اور کس طرح گمراہی کا چہرہ ایک ہی طرح رہا ہے جس طرح ہدایت کا چہرہ ایک ہی طرح کا رہا ہے۔

سب نے اپنی باری میں وہی سب کیا جو اُن میں سے کسی ایک نے کیا تھا۔ سب نے دعوت سے انکار کیا، سب نے اُس کی ہنسی اُڑائی، سب نے دلیلوں سے مُنہ موڑا، سب نے روشنیوں سے آنکھیں بند کرلیں۔ سب سرکشی اور گھمنڈ کی چال چلے، سب نے جبر و تشدّد سے راہ روکنی چاہی۔ سب کے اِعراض و انکار کا مزاج ایک ہی طرح کا مزاج رہا اور پھر سب کو غرور و طغیان نے آخر وقت تک اس کی مہلت نہ دی کہ روشنی و تاریکی میں امتیاز کرتے۔"

(انبیاء کرام صفحہ ۱۵-۱۶)

دعوت کی یکسانیت تو دینِ فطرت کا جزو تھی۔ اللہ تعالیٰ نے اس کارخانۂ قدرت کو جن قوانین اور اصولوں پر مرتّب فرمایا، تمام ادیان انہیں کی طرف اقوام کو ہدایت کرنے کے لئے آئے تاکہ مخلوقِ خدا اللہ ربّ العزّت کی رحمت

سے نہ یہاں محروم رہے نہ وہاں۔ یہ سب انبیاء کرامؑ اسی دینِ اسلام کے ترجمان تھے جسے دینِ فطرت کہا جاتا ہے۔ اور جب لوگوں نے انؑ کا انکار کیا تو وعید میں بھی یکسانیت پیدا ہوئی۔ ایسا نہیں ہو سکتا کہ قانونِ قدرت کسی کے لئے بدل جائے۔ یہ سنّتِ الٰہی ہے جس میں تبدیلی نہیں ہوتی۔

جس طرح جملہ انبیاء کرامؑ ایک ہی "نورِ مبینؐ" کے انوار، آنؐ کے دینِ حق کے ترجمان، اُنؐ ہی کی سیرتِ مبارکہ کی جھلکیاں ہیں۔ اسی طرح یہ سب مُنکرین دینِ فطرت سے کتراتے اور آنؑ کے انکار کی وجہ سے اپنی اپنی بداعمالیوں میں مبتلا ہیں۔ یہاں بھی نتائج میں یکسانیت ہے، جیسے خیر میں تھی۔ لیکن یہ یکسانیت موجبِ فلاح نہیں موجبِ ہلاکت رہی۔ مومن ہر بار کامیاب ہوتے، مُنکرین کو ذلیل و خوار ہونا پڑتا، اور اصل فیصلہ اب بھی باقی ہے۔

قرآنِ حکیم اس حقیقت کو بار بار واضح کرتا ہے کہ جمال اہلِ نظر کے لئے ہے، اور جو اللہ سے آنکھیں چُراتے ہیں اُن کے لئے نور نہیں نار ہے۔ اُن کے دوست شیاطین ہیں۔ وَمَنْ يَّعْشُ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمٰنِ نُقَيِّضْ لَهٗ شَيْطٰنًا فَهُوَ لَهٗ قَرِيْنٌ (الزخرف آیت ۳۶)

اور جو خدائے رحمٰن سے آنکھیں بند کر لے (غفلت برتے) ہم اُس پر ایک شیطان مسلّط کر دیتے ہیں، پس وہ ہر وقت اُس کے ساتھ رہتا ہے۔ (۳۶)

اور بلاشبہ یہ (شیاطین) ان کو راہِ حق سے روکتے ہیں اور یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ ہم راہِ راست پر ہیں، (آیت ۳۷) اور آئندہ آیات میں آخرت کا ذکر شروع ہو جاتا ہے۔

چونکہ انبیاء علیہم السّلام کی تبلیغِ دین اور مُنکرین کا ذکر ہر بار آئے گا اِس لئے ابتدا ہی میں ان امور کی طرف توجّہ مبذول کرنا مناسب سمجھا گیا۔ تاکہ آئندہ اوراق میں توجّہ اُن امور پر مرکوز رہے جو کتاب کا اصل موضوع ہے یعنی

تجلیاتِ انوارِ محمدیؐ، جو انبیاء علیہم السّلام کے ذریعہ عام ہوئیں، جنؑ کی فطرت حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کی فطرت، جنؑ کا اخلاق حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کا پرتوِ اخلاق، اور جنؑ کی تعلیمات حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کی تعلیمات کا پیش خیمہ ہیں، اور جنؑ کی آمد و بعثت کو حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کی سیرتِ مقدسہ کے ابتدائی ابواب ہی کہنا مناسب ہوگا۔

آیئے اس سلسلۂ ابراہیمی میں اس پرتوِ جمالِ محمدی صلّی اللہ علیہ وسلّم سے اجمالاً آنکھوں کے لئے نور، اور قلب کے لئے سرور کی فراہمی کریں ۔

یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ تمام انبیاء علیہم السّلام کی صفات حضورِ انور صلّی اللہ علیہ وسلّم کے واسطے سے اللہ کی صفات ہیں، اور حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کی ذات وصفات بلاواسطہ اللہ تعالیٰ کی ذات کا مظہر اور پرتوِ صفات باری تعالیٰ ہیں

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ النَّبِیِّ الْاُمِّیِّ عَبْدِکَ وَرَسُوْلِکَ وَصَلِّ عَلٰی جَمِیْعِ اِخْوَانِہٖ مِنَ الْاَنْبِیَآءِ وَالْمُرْسَلِیْنَ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَبَارِکْ وَسَلِّمْ

○

حضرت اسحٰق و حضرت یعقوب و حضرت یوسف علیہم السلام

پرتوِ انوارِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کے ترجمانِ صفات حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بعد آن کے بیٹے حضرت اسحٰق علیہ السلام اور حضرت اسحٰق علیہ السلام کے بیٹے حضرت یعقوب علیہ السلام ہیں۔ قرآنِ حکیم حضرت اسحٰقؑ کی پیدائش کا ذکر حضرت لوطؑ کے واقعہ کے سلسلہ میں کرتا ہے۔ جب فرشتے اللہ کی طرف سے حضرت لوط علیہ السلام کی قوم کی طرف عذاب لے کر آئے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے یہاں حاضر ہوئے اور حضرت ابراہیمؑ کی بی بی سارہ کو جو اُس وقت وہاں تھیں، پہلے حضرت اسحٰق علیہ السلام کی اور اس کے بعد حضرت یعقوب علیہ السلام کی بشارت دی۔

(سورۂ ھود آیت ۷)

انہیں اپنی اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی عمر کے پیشِ نظر اِس بشارت پر حیرت ہوئی خود حضرت ابراہیم علیہ السلام کو تعجب ہوا لیکن جب فرشتوں نے اطمینان دلایا ہے کہ اُن کا پیغام حق ہے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے برجستہ فرمایا: وَمَنۡ يَّقۡنَطُ مِنۡ رَّحۡمَةِ رَبِّهٖۤ اِلَّا الضَّآ لُّوۡنَ (الحجر ۵۶)

اللہ کی رحمت سے ناامید سوائے گمراہوں کے کون ہوسکتا ہے۔ انبیاء علیہم السلام کی نظر ہمیشہ اللہ کی رحمت ہی پر رہی۔ "اسحٰق" کے معنی شگفتہ رُو کے ہیں۔ شاید اس لئے کہ انؑ کی پیدائش حضرت سارہ کی مسرت و شادمانی کا باعث بنی۔

حضرت یعقوبؑ جو حضرت اِسحٰقؑ کے بیٹے ہیں ایک اولوالعزم پیغمبر ہیں انؑ کی زندگی حضرت یوسف کی جدائی کے باعث ایک غم والم کی شمع بن کر حضرت یوسف علیہ السلام ہی کے حالات سے منسلک رہی اور ہر

ہر طرح صبر و عزیمت، استقامت، صلوٰۃِ دائمی کے انداز آشکارا کرتی رہی۔

قرآنِ حکیم میں حضرت یوسف علیہ السّلام کا ذکر جس تفصیل سے آتا ہے اس سے نہ صرف یوسف علیہ السّلام کی سیرتِ مقدّسہ، ان کے صبر، استقامت، فہمِ نبوّت و مقامِ نبوّت و مقصدیت کی بے لوث لگن کے انوار ظاہر ہوتے ہیں، بلکہ معاشرہ کی وہ برائیاں جو اُن کے دَور میں عام تھیں، بالخصوص نفس پرستی، بے حیائی، ظلم و تعدّی کے بھیانک مرقّع آنکھوں کے سامنے پھر جاتے ہیں، اور معلوم ہوتا ہے کہ مشیّتِ ایزدی کس طرح ان بُرائیوں کے باوجود اقوام کی زندگی کو صحیح رُخ دینے کے لئے مضطرب ہے۔ سورۂ یوسف کو قرآنِ حکیم نے احسن القصص فرمایا ہے۔ یہ وہ سورہ ہے جو دل میں اللہ کے عظمت و جلال پیدا کرنے کے ساتھ مومن کو فطرتِ انسانی کے مختلف گوشوں سے آگاہ کرتا ہے تاکہ وہ حتی الامکان ہوشمندی سے زندگی بسر کرے اور بہرحال اللہ پر بھروسہ رکھے اور اُس کی عبادت سے غافل نہ ہو اور جان لے کہ جب اللہ کسی پر کوئی فضل کرنا چاہتا ہے تو دُنیا کی ساری قوتیں مل کر بھی اس کو نہیں روک سکتیں۔ نہ بھائیوں کا حسد، نہ دشمنوں کی دشمنی، نہ زُلیخا کے ناپاک ارادے اور نہ زنداں کی کال کوٹھری، اللہ اُس کو ہر شئے سے محفوظ رکھتا ہے۔

حضرت یوسف علیہ السّلام کی زندگی پر نظر ڈالیں تو ایسا محسوس ہوگا کہ وہ صبر و استقلال، تحمّل اور حالات کا مقابلہ کرنے اور مشیّت کے ساتھ راضی برضا رہنے کی عظیم صلاحیتوں کے مالک تھے۔ سترہ سال کی عمر میں باپ کے آغوشِ محبت سے جُدا ہوتے ہیں، بھائی کنویں میں ڈالتے ہیں، چند سکّوں کے عوض فروخت کرتے ہیں، لیکن حضرت یوسفؑ کے دامنِ سکون میں کوئی چاک نظر نہیں آتا۔ غلام کی حیثیت سے بکتے ہیں اور غلامی بھی اسی عاجزانہ اور پُر اخلاق انداز سے بسر کرتے ہیں، عزیزِ مصر کی بی بی اُن کو

کے حسنِ ظاہری اور حسنِ اخلاق کی گرویدہ ہو جاتی ہے۔ آزمائش کا وقت آتا ہے، اور آزمائش بھی وہ آزمائش جہاں نفس پر قابو پانا سوائے اللہ تعالیٰ کی مدد کے ممکن ہی نہ ہو، وہاں بھی احساسِ امانت و خوفِ خدا کی دیوار اُن ؑ کے لئے موجبِ امن بن جاتی ہے، اور اُن ؑ کی زبان پر نفس کو اس ارتکابِ جرم سے دُور رکھنے کے لئے جو الفاظ زبان پر آئے وہ یہ ہیں مَعَاذَ اللّٰهِ اِنَّهٗ رَبِّیْٓ اَحْسَنَ مَثْوَایَ، (۲۳) اللہ ہی مجھے محفوظ رکھے تیرا شوہر میرا آقا ہے۔ اُس نے مجھ پر اعتماد کیا ہے پھر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اس امانت میں خیانت کروں" حضرت یوسف علیہ السلام اپنی پارسائی کے "جرم" میں اپنے لئے زنداں کو منتخب کرتے ہیں (تاکہ اس منظر سے دُور رہیں) وہاں بھی قید خانہ کے کارکن اور قیدی سب اُن ؑ کے حسنِ عمل سے اُن ؑ کے گرویدہ ہو جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے جس علم و اخلاق سے اُن ؑ کو نوازا تھا وہی ہر جگہ اُن ؑ کے کام آتا ہے، یعنی خوابوں کی تعبیر بتانا اور ہر حال میں دعوتِ حق دیتے رہنا۔ بالآخر رحمتِ الٰہی جوش میں آتی ہے اور کرم نوازیوں کی بارش ہوتی ہے۔ ہر وہ ہستی جو خاندانِ عزیز یا اُس کی بی بی کے گھر کے لوگوں سے متعلق تھی اُن ؑ کی معجزانہ صداقت پارسائی پر حضرت یوسف ؑ کی صداقتِ نفس کی گواہ بن جاتی ہے پھر ایک وقت وہ بھی آتا ہے کہ وہی جو حضرت یوسف ؑ کو بہلانے پھسلانے میں عزیزِ مصر کی بی بی کی معاون تھیں، خود اُن کی زبان پر یہ لفظ آتے ہیں: مَا هٰذَا بَشَرًا ۭ اِنْ هٰذَآ اِلَّا مَلَكٌ كَرِيْمٌ (۳۱) یعنی یہ تو اللہ کا فرشتہ ہے انسان نہیں۔ حضرت یوسف علیہ السلام کی یہ معصومیت یہ اخلاق کریمانہ اُن ؑ کی ابتدائی زندگی سے لے کر حضرت یعقوب علیہ السلام اور اپنے کنبہ کو مصر میں باوقار زندگی بسر کرنے کی دعوت تک ہر ہر قدم پر نمایاں رہا۔

صبر کا وہ کون سا پہلو ہے جو حضرت یوسف علیہ السلام کے اِس قصہ

میں کھل کر سامنے نہیں آتا اور آنے والی قوموں کے لئے ایک نشانِ منزل کا کام نہیں کرتا۔

(الف)۔ وہ صبر جو پیٹ اور شرمگاہ کی خواہش کے مقابلہ میں کیا، جس کو عفّت کہتے ہیں۔

(ب)۔ وہ صبر جو مصائب کے مقابلہ میں کیا گیا، جسے ضبطِ نفس سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

(ج)۔ وہ صبر جو دولت کی فراوانی کے باوجود حاسدوں کے حسد اور دشمنوں کی دشمنی پر نمایاں ہوتا ہے۔ جسے کشادہ دلی اور حوصلہ مندی کہتے ہیں۔

(د)۔ وہ صبر جو دوسروں کی کمزوریوں کو نظر انداز کرنے میں ظاہر ہوتا ہے۔ یا سے پردہ پوشی کہتے ہیں۔

دراصل ایسے ہی صبر کرنے والوں کے لئے اللہ کی بشارتیں ہیں اور یہی صبر اُن کے تقویٰ کی پہچان ہے۔

یہی حالت حضرت یوسف علیہ السّلام کی منزلِ شکر میں ہے، جہاں کسی وقت بھی انہوں نے خود اپنے لئے کوئی تمنّا نہ کی سوائے اس کے کہ اُن کی وہ خواہش مخلوقِ خدا کے لئے مفید اور فیض رساں ہو۔ چنانچہ عزیزِ مصر سے خزانوں پر قدرت کی درخواست اِس لئے کی کہ وہ حسنِ تدبیر کے ساتھ قوم کو اس مرحلہ سے گذاریں جو قحط کی صورت میں اُن کے سامنے تھا۔ بھائیوں کی بدسلوکی پر درگذر کرنا، اُن کی غلطی کو شیطان کی طرف منتقل کرنا، قیدیوں کے ساتھ حسنِ سلوک، لوگوں کے ساتھ محبّت و مروّت، قیدخانہ سے واپسی کے بعد بھی نہ لب پر کسی سے شکوہ نہ شکایت، باپ اور اہل خانہ کے ساتھ حسنِ سلوک، شاہانہ وقار کے ساتھ عاجزی، اور سب سے بڑھ کر اس سب کو اپنے رب کا کرم، اُس کا احسان، اُس کی عنایات سے تعبیر کرنا اُن ؑ کی شانِ پیغمبری پر شاہد ہیں۔

ان میں حضرت ابراہیمؑ کا ذوقِ حقیقت پسندی اور حسنِ تدبیر، حضرت یعقوب علیہ السلام کی طرح صبر کے ساتھ توحیدِ باری تعالیٰ کو قلوب میں راسخ کرنے کا عجیب ملکہ تھا۔ جس کے لئے صبر بھی ضروری تھا اور استقامت بھی، اور جس کو انہوںؑ نے ہمیشہ توفیقِ الٰہی سے تعبیر کیا۔

آپ نے غور کیا کہ اس سورہ کو احسنُ القصص کیوں کہا گیا۔ یقیناً اس وجہ سے کہ وہ پیغامِ حق اور تبلیغِ دین کی صداقت و صراحت، ہدایت رحمت کا ایک ایسا بے مثال واقعہ ہے جو آنے والی قوموں کے لئے نشانِ منزل بنے۔ اور اُس نبیؐ آخرالزماںؐ جس کے حسنِ جمال وکمال کی دید کے لئے لیل و نہار کروٹیں بدل رہے ہیں یہ اُس کا پیش خیمہ ہو۔

یہ داستانِ رحمت بھی ہے، داستانِ صبر بھی۔ داستانِ شکر بھی، داستانِ ہدایت بھی، جس میں حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلّم کی حیاتِ طیّبہ کے وہ گوشے ظاہر کئے گئے ہیں جو اربابِ نظر سے پوشیدہ نہیں۔ اور اُنہیں کا پرتوِ جمال ہیں۔

صلّوا علیہ و آلہٖ

۶

حضرت موسیٰ علیہ السلام

انبیاء علیہم السلام کی تاریخ کو ارتقائے اسلام سے تعبیر کیجئے یا اخلاقِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کے تذکرہ سے، ہم اسی نتیجہ پر پہونچیں گے کہ یہ ایک دوسرے سے جُدا نہیں۔ اُنؑ کا باطن پرتوِ نورِ محمدیؐ ہے۔ اُنؑ کی تعلیمات تعلیماتِ اسلامی کے اجزا ہیں۔ اسلامی تعلیمات کے تین جزو ہیں۔

۱۔صحتِ عقیدہ ۲۔حُسنِ معاشرہ ۳۔تہذیبِ نفس، جس میں جملہ عبادات شامل ہیں۔ بنیادی چیز صحتِ عقیدہ ہے، اور اس کا اظہار خود انسان کے اعمالِ صالح ہیں، خواہ ان کا تعلق اللہ تعالیٰ سے ہو یا اس کی مخلوق سے۔ انبیاء کرامؑ کی ابتدائی کوشش یہی ہوتی ہے کہ صحیح عقیدہ اذہان میں راسخ ہو، عام ذہنوں کو حق کی صداقت اور ہدایت کی راہ کی طرف متوجہ کیا جائے، اور خود اُنؑ کی زندگی ایک نمونہ بن کر اِن تینوں اجزاء کو نمایاں کرتی رہے، لیکن ان کا بیش تر زور صحتِ عقیدہ پر ہوتا ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت یوسف علیہ السلام کی زندگی اِسی طرزِ تبلیغ کی پردہ کشا ہے۔ بے شک ان انبیاءؑ کی زندگی میں قوموں کی خیر خواہی کی مثالیں ملتی ہیں۔ خصوصاً حضرت یوسف علیہ السلام کے آخری دور میں جب وہؑ قحط کا مقابلہ اپنے حُسنِ تدبیر سے کر رہے ہیں۔ لیکن ان انبیاءؑ کی زندگی میں اِس خیر خواہی کو صحتِ عقیدہ کے مقابلہ میں ثانوی حیثیت حاصل رہی۔ گو بظاہر یہ اہم نظر آتی ہے۔

لیکن اب ہم جس دَور میں داخل ہو رہے ہیں وہاں اندازِ فکر و اندازِ تبلیغ میں ایک نمایاں تبدیلی منظرِ عام پر آ رہی ہے۔ یہ تبدیلی صحتِ عقیدہ کے ساتھ اصلاحِ معاشرہ کی طرف ہے حضرت شعیب علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام

جو اس دور کی معروف شخصیتیں ہیں دونوں کی تعلیم کا رُخ اصلاحِ معاشرہ کی جانب ہے۔

حضرت شعیب علیہ السلام اصحابِ ایکہ کی طرف یعنی جنگل کے لوگوں کی طرف مبعوث ہوتے ہیں۔ اس لئے اُن کو چوری، ڈکیتی، ظلم و ستم سے باز رکھنے کی کوشش کریں، لوگوں کو لین دین کے طریقہ بتائیں، ناپ تول میں کمی زیادتی سے اجتناب کروائیں اور یہ سب کچھ اِس لئے کریں کہ اُن سے اُن کا رب راضی ہو، جس کے حضور اُنہیں حاضر ہونا ہے اور اُسی کی بندگی کریں۔

مدین کی جس لبستی میں حضرت شعیبؑ کا ظہور ہوا دراصل لبستی کا نام نہیں بلکہ ایک قبیلہ کا نام ہے، جو جزیرہ نُما سینا میں عرب سے متصل تھا۔ (انبیاء کرام صفحہ ۲۹۴)۔ یہاں تجارت کی منڈی قائم ہوگئی تھی اور دولت کمانے کے لئے لوگ لوٹ مار یا ڈکیتی سے خوش حالی کے اسباب پیدا کرتے یا بددیانتی و خیانت کو اپنا وطیرہ بنانے لگے۔ حضرت شعیب علیہ السلام کو اُن کی باتوں سے دُکھ ہوتا۔ اُن کو خوش حال دیکھ کر فرماتے (ھود ۸۴) میں تم کو خوش حال دیکھتا ہوں لیکن مجھے یہ خوف ہے کہ تم عذاب میں نہ گرفتار ہو جاؤ۔ قوم کا اندازِ انکار وہی تھا جو ہر قوم کا رہا۔ کہ تم کو جو کچھ کرنا ہے خود کرو، ہم کو کیوں روکتے ہو۔ وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھے کہ نبیؑ کا کام اخلاق کی آراستگی، رضائے الٰہی کے لئے جدوجہد ہوتا ہے۔ نہ کہ اُن کو خوش کرنا۔ چنانچہ مدین میں جہاں ایک طرف ہوس کی آزاد فضاؤں میں اس شر و فساد کی یہ صورت تھی اور دوسری جانب مصر میں جہاں حضرت یوسف علیہ السلام کے بعد بنی اسرائیل کی بڑی آبادی ہوگئی تھی وہاں فتنہ و شر انگیزی کا اور ہی عالم تھا۔

مصر کے سلاطین جو عزیزِ مصر کہلاتے تھے اب فرعونِ مصر کے نام سے مشہور ہوئے۔ وہی بنی اسرائیل جن کی قدر و منزلت عزیزِ مصر نے کی، اُن کو زمینیں

دیں، اب اُن ہی کی اولاد کو غلامی کی بدترین زنجیروں میں جکڑا جا رہا تھا۔ یہاں تک کہ جب فرعون کو اپنے کسی عالم کے ذریعہ یہ علم ہوا کہ بنی اسرائیل ہی میں ایک لڑکا پیدا ہوگا جو تیری حکومت کا تختہ اُلٹے گا، تو یہ حکم دے دیا کہ جہاں بھی کسی کے یہاں لڑکا پیدا ہو وہ مار دیا جائے۔ یہی نہیں بلکہ بنی اسرائیل کو ہر طرح کی ایذائیں پہونچانا اور اُن کو ذلیل کرنا وہاں کے مقامی باشندوں کی فطرتِ ثانیہ بن گئی تھی۔

اب جو دور حضرت موسیٰ علیہ السّلام کے دور سے شروع ہوتا ہے وہاں حضرت موسیٰؑ کی نبوّت کی ایک اہم غایت فرعون کے شر کا انسداد تھا، وہ عظیم شر جس کا ایک رُخ دعوائے خدائی تھا اور دوسرا مخلوق کی ایذا رسانی۔ گویا صحتِ عقیدہ کے ساتھ حسنِ معاشرہ کی اہمیت و ضرورت کو نمایاں کرنا تھا۔

حضرت موسیٰ علیہ السّلام کو جب نبوّت سے سرفرازی ہوتی ہے تو کلام اللہ میں حضرت موسیٰ علیہ السّلام کی دعوت کا صرف ایک ہی مقصد بتا کر رخصت کیا جاتا ہے۔ اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى (طٰہٰ ۲۴) (حکم ہوتا ہے، اے موسیٰؑ) تم فرعون کی طرف جاؤ، اُس نے بہت سر اُٹھایا ہے (بڑی نافرمانی اور ظلم پر اُتر آیا ہے) گویا حضرت موسیٰ علیہ السّلام کی پیدائش، معجزانہ طور پر اُنؑ کے صندوق کا فرعون کے محل کے قریب جا لگنا، فرعون کے محل میں اُنؑ کی پرورش ہونا، ایک اسرائیلی اور قبطی کا جھگڑا، حضرت موسیٰ علیہ السّلام کا مدین کا رُخ کرنا، اور حضرت شعیب علیہ السّلام کی ایک لڑکی سے شادی کا حضرت موسیٰ علیہ السّلام کی تربیت کا ذریعہ بننا، اہلِ خانہ کے ساتھ نکلنا، راستہ میں آگ دیکھنا اور ایک پاک میدان طویٰ میں پہونچ جانا، اللہ تعالیٰ سے لطفِ ہم کلامی سے شرف یاب ہونا، اُن کو عصائے موسوی اور یدِ بیضاء کے معجزوں سے سرفرازی بخشنا، سب کچھ اس لئے تھا کہ اب اُنؑ سے جو کام لینا تھا یہ تمام امور اس کے لئے ایک مستحکم کڑی بن جائیں۔

تربیت میں ان امور کا خیال رکھا گیا کہ وہؑ ذہنی طور پر اہلِ دولت سے متأثر

نہ ہوں، عالی شان محل اور شاہی رعب و دبدبہ اُنؑ کو متاثر نہ کر سکے، اس لئے اُنؑ کی تربیت بھی اُسی گھر میں ہوئی جہاں اُنؑ کو بالآخر معرکہ آرا ہونا تھا۔ جسمانی صلاحیتوں کو اعتدال پر لانے کے لئے ایک پیغمبر کی بیٹی سے شادی ہوتی ہے۔ وہ بھی اس انداز سے کہ کئی دن کے بھوکے پیاسے ایک مقام پر پہونچتے ہیں جہاں لوگوں کا ہجوم ہے۔ یہی خیال آتا ہے کہ یہاں بھی لوگوں میں جھگڑا ہو رہا ہوگا۔ لیکن وہاں جھگڑا نہیں، قوت والے اپنی قوت پر نازاں ہیں، کمزور اپنی بے کسی پر گریہ کناں۔ حضرت شعیبؑ کی لڑکیوں کو الگ کھڑا دیکھ کر وجہ پوچھتے ہیں، اور اُن کے گلّہ کو خود پانی پلاتے ہیں۔ یہ واقعہ جو ایک طرف اُنؑ کی قوت کا مظاہرہ ہے تو دوسری طرف اُنؑ کی امانت کی پاسداری کا مرقع، وسیلہ بنتا ہے حضرت شعیبؑ کے ساتھ آٹھ سال قیام کا۔ اس کی غرض وغایت حضرت موسیٰؑ کی ذہنی اور روحانی تربیت کے سوا کچھ نہیں۔ پھر اہلِ خانہ کے ساتھ نکلتے ہیں، سردی کی راتیں ہیں، بی بی ساتھ ہیں۔ راستہ میں ایک آگ نظر آتی ہے۔ خیال آتا ہے کہ انگارہ لے آئیں کہ الاؤ لگائیں اور تاپیں کہ گرمی آئے۔ قدرت کے کرشمے دیکھیے کہ

"پہلے تو بصارت کُھلی تھی کہ آگ دیکھی، اب اللہ تعالیٰ نے سماعت بھی کھول دی۔" یہ واقعہ سورہ طٰہٰ کی آیات ۱۳۔۴۲ میں بڑے پُر کیف انداز میں بیان ہوتا ہے:

حضرت موسیٰ علیہ السّلام ایک آواز سنتے ہیں "میں نے تم کو انتخاب کرلیا ہے تو جو حکم دیا جائے اُسے سنو۔ بے شک میں ہی اللہ ہوں۔ میرے سوا کوئی معبود نہیں، بس میری ہی عبادت کرو اور میری یاد کے لئے نماز قائم کرو۔ بے شک قیامت آنے والی ہے، میں اس کو پوشیدہ رکھنا چاہتا ہوں تاکہ اُس روز ہر شخص کو اس کی کوشش کا بدلہ ملے۔ بس دیکھو خیال رکھنا کہیں وہ شخص جو اس قیامت پر ایمان نہیں رکھتا تمہیں راہِ حق سے روک نہ دے۔ اگر ایسا ہوا تو تم

ہلاک ہو جاؤ گے۔" (یعنی ایمان دین کی بنیاد ہے، بنیاد جب متزلزل ہو جاتی ہے تو عمارت گر جاتی ہے، اس کی حفاظت ضروری ہے)

پھر احکام کے بعد دلجوئی ہوتی ہے۔ "موسیٰ تمہارے ہاتھ میں کیا ہے؟" موسیٰ علیہ السلام اپنی لاٹھی کی تعریفیں شروع کرتے ہیں۔ حکم ہوتا ہے "اسے پھینک دو" وہ دوڑتا ہوا سانپ بن جاتا ہے۔ موسیٰؑ خوف کھاتے ہیں۔ فرمایا جاتا ہے "ڈرو نہیں، اس کو پکڑ لو"۔ وہ پھر اپنی اصل صورت پر لاٹھی ہو جاتی ہے۔

پھر ارشاد ہوتا ہے: "موسیٰؑ اپنے بغل میں ہاتھ تو دباؤ۔ دیکھو وہ بغیر کسی بیماری کے چمکتا ہوا سفید نورانی ہو جائے گا" یہ دوسری نشانی ہے۔

اور تسلی دی جاتی ہے کہ "یہ سب اس لئے ہے کہ ہم اس سے بڑی نشانیاں تم کو دکھلائیں" اس کے بعد وہ آیت آتی ہے جو اوپر لکھی گئی:

اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى (طٰہٰ: ۲۴)

حضرت موسیٰؑ کو ایمان کے بنیادی حقائق سے آگاہ کرنے کے ساتھ گویا اپنا سفیر بنا کر فرعون کے پاس بھیجا جا رہا ہے۔ منصبِ نبوّت میں یہ ایک انقلاب خیز حقیقت ظہور میں آرہی ہے کہ اب ظلم پر صبر نہیں بلکہ اس کا مقابلہ کرنا ہے اور اللہ پر اعتماد و توکل کامیابی کا ضامن ہوگا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعون کے پاس آتے ہیں اور وہی مطالبہ کرتے ہیں جس کا اُنؑ کو بارگاہِ ربّ العزت سے حکم ہوا تھا۔ یہاں سے تبلیغ حق کے ایک نئے باب کا آغاز ہوتا ہے۔ ایک بظاہر کمزور انسان جس کے پاس ایک لاٹھی کے سوا کچھ نہیں، ایک جابر بادشاہ کے دربار میں آتا ہے، جس کے پاس دنیاوی طاقت کے جملہ سامان موجود ہیں، وزراء مصاحب سپہ سالار لشکر اور حکومت کا نشہ اور حکومت بھی وہ جابرانہ حکومت کہ اس کے کسی حکم پر کسی کو لب کشائی کی مجال نہیں۔

حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ کو جو اُن کے ساتھ ہیں اور وہی کہتے ہیں جو اللہ رب العزّت نے انہیںؑ تعلیم فرمایا تھا۔ یعنی

فَقُولَآ اِنَّا رَسُولُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۙ﴿۱۶﴾ اَنْ اَرْسِلْ مَعَنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۝

(الشعراء ۱۶-۱۷)

(پس (فرعون سے) کہیئے، ہم بلاشبہ جہانوں کے پروردگار کے رسول پیغام بر ہیں اور یہ پیغام لے کر آئے ہیں کہ تو بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ بھیج دے۔)

چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السّلام فرعون سے یہی مطالبات کرتے ہیں۔

دو باتیں ملحوظ رہیں۔(۱) ہم اللہ کے حکم سے تیرے پاس آئے ہیں، جس کی طاقت قدرت کا تو اندازہ بھی نہیں کر سکتا، اس لئے اپنے غرور اور ظالمانہ حرکتوں سے باز آ۔

(۲) یہ نہیں فرمایا کہ تو اس خدا پر ایمان لا بلکہ یوں حکم فرماتے ہیں کہ اس قادرِ مطلق رب کے حکم کو بجا لا۔ اور اس میں کوئی تردّد نہ کر۔

یہ مکالمہ قرآنِ حکیم میں مختلف جگہ مختلف انداز سے آتا ہے۔ جہاں حضرت موسیٰ علیہ السّلام کی فراست، اپنےؑ قول کی صداقت، فرعون سے مکالمہ میں اُنؑ کی برتری اور حاضر جوابی کے بڑے لطیف پہلو اُجاگر کئے گئے ہیں۔ کہیں فرعون کہتا ہے، اچھا آج تو میرے سامنے پیغمبر بن کر آیا ہے، وہ دن بھول گیا جب میرے گھر میں تو نے پرورش پائی، پلا بڑھا (شعراء ع۲)۔ کبھی اس قبطی کے خون کو یاد دلاتا ہے جس کا الزام حضرت موسیٰؑ کے سر تھا، اور جس کی سزا قتل ہی ہے (شعراء ع۲)۔ کبھی باری تعالیٰ کے وجود کے متعلق لوگوں کے دلوں میں شک پیدا کرتا ہے (مومن ع۴)۔ اور کبھی خود اپنا مقابلہ حضرت موسیٰؑ سے کرتے ہوئے اپنی جاہ و حشمت سے لوگوں کو متأثر کرتا ہے (زخرف ع۵)۔ لیکن اِن تمام امور میں حضرت موسیٰ علیہ السّلام اپنے رب کی عظمت کا بیان فرماتے ہیں (سورۂ شعراء ع۲۔ سورۂ طٰہٰ ع۳) جس نے انہیںؑ رسالت کے لئے انتخاب فرمایا۔

اور یوں ارشاد فرماتے ہیں کہ کیا یہ سب احسان تو اس لئے جتاتا ہے کہ اس کے بدلے میں تو تمام بنی اسرائیل کو غلام بنا کر رکھے (شعراء ع ۲)۔ اور اللہ رب العزت کی کبریائی اور اپنی صداقت کا فیصلہ اس بات پر چھوڑ دیا کہ بالآخر کامیاب کون ہوتا ہے۔ فرعون رسالت کی نشانی طلب کرتا ہے، آپؑ عصا ڈالتے ہیں وہ سانپ بن جاتا ہے۔ فرعون نے یہی سمجھا کہ یہ جادوگر ہیں۔

چنانچہ مقابلہ کے لئے ایک دن کا انتخاب ہوتا ہے، اور شہرِ مصر کے جادوگر اپنے پورے کروفر کے ساتھ جمع ہوتے ہیں (یونس ع ۸)۔ یہ جشن کا دن تھا جو مقرر ہوا کہ لوگ دن چڑھے جمع ہو جائیں (طٰہٰ ع ۳)۔ اب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو قدرت یہ موقع فراہم کر دیتی ہے کہ وہؑ لوگوں کے دل و دماغ کو مسخر کر لیں اور خود اُنؑ پر اللہ تعالیٰ کی کبریائی اور فرعون کی بے بسی نمایاں ہو جائے۔ یہ واقعہ تفصیل سے سورۂ اعراف (رکوع ۱۴) میں آتا ہے۔ اس کے علاوہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ذکر قرآنِ حکیم میں تمام انبیاءؑ سے زیادہ ہے۔ "قصص القرآن" میں ان کی تعداد ۳۹ سورت اور ۵۱۴ آیات کو ایک جدول کی صورت میں پیش کیا ہے۔ (جلد اوّل صفحہ ۳۶۸ تا ۳۷۰)

چنانچہ جشن کے دن لوگ میدان میں جمع ہو گئے، اور اُن کے سردار بڑے کرّوفر کے ساتھ آئے اور جملہ ساحرین حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اپنا جیسا ساحر سمجھ کر مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہوئے۔

"وہ موسیٰؑ سے بولے کہ پہلے تم اپنا عصا ڈالو کہ ہم۔ حضرت موسیٰؑ نے جواب دیا کہ تم ڈالو (منشاء یہ تھا کہ باطل کا قلع قمع لوگ خود آنکھوں سے دیکھ لیں۔) پس انہوں نے اپنی رسیاں زمین پر ڈال کر لوگوں کی نظر بندی کر دی، اور وہ سانپ معلوم ہونے لگیں اور انہوں نے اپنے خیال میں بہت بڑا جادو کر دکھایا۔"

ایک طرف باطل کی نظر فریبیاں، دوسری طرف اللہ پر ایمان و ایقان۔

ایک طرف باطل، ایک طرف حق۔ ایک سمت جادو، ایک سمت معجزہ۔
(سورہ اعراف رکوع ۱۴)

اس وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ رب العزت کو حکم ملتا ہے کہ وہؑ اپنا عصاء ڈال دیں۔ عبد پابندِ امر ہوتا ہے، انہوںؑ نے حکم پاتے ہی اپنا عصاء پھینک دیا اور منتظرِ کرم رہے۔ عصاء اژدھا بن گیا اور اُن تمام بناوٹی چیزوں کو دیکھتے دیکھتے نگل گیا۔

حق غالب رہا، باطل مغلوب ہوا۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہوئی کہ فرعون کی تمام رعایا جس کے دلوں پر فرعون کی شان وشوکت، قدرت وحکمت کا سکّہ بیٹھا ہوا تھا وہ اپنی قدر وقیمت کھو بیٹھا۔ یہی نہیں بلکہ جادوگر سجدہ میں گر پڑے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ جادو کسی شئے کی اصل ہیئت نہیں بدل سکتا اور نہ جادوگر اپنے جادو سے خائف ہوتا ہے۔ یہ تو یقیناً پیغمبر ہیں۔ موسیٰ علیہ السلام کا امرِ الٰہی میں عصاء پھینکنا، اُس کا اژدہا بن جانا، جادوگروں کا سربسجود ہو جانا اور ربِّ موسیٰ وہارون پر ایمان لانا، تمام حاضرین کے اذہان کو متأثر کرنے اور ایک نیا رُخ دینے کے لئے کافی تھا۔ البتہ فرعون جو اپنی طاقت کے نشہ میں چُور تھا وہ ایمان کیسے لاتا، وہ تو جادوگروں کو بھی سزا دینے پر تُل گیا۔ لیکن اُن کے دل ایمان کی لذّت سے آشنا ہو چکے تھے، اُن کا یہی جواب تھا کہ "کس کو کب اور کیسے موت آئے گی ہم نہیں جانتے ہیں، ہم تو بس یہ جانتے ہیں کہ ہم کو تو بالآخر اپنے رب کی طرف لوٹ کر جانا ہے" (وہ جیسے چاہے بُلا لے) (اعراف ۲۵)
یہی ذکر سورہ طٰہٰ کے تیسرے رکوع میں بھی بڑی تفصیل سے آتا ہے تاکہ مومنوں کے قلوب اپنے رب کی کبریائی اور قدرت سے تشفی پائیں۔

اس واقعہ نے فرعون کی حکومت کی بنیادیں ہلا دیں۔ چند لمحوں کے اندر اُس کی رعایا نے اُس کی بے بسی اپنی آنکھوں سے دیکھ لی۔ بنی اسرائیل کے دلوں

میں ایک اُمید کی کرن پیدا ہوئی لیکن جابر فرعون اور اُس کے ظلم ابھی اُنکے سامنے تھے۔

حضرت موسیٰ علیہ السّلام اپنی قوم بنی اسرائیل کو صبر کی تلقین کرتے ہیں اور اُن کی توجہ اس مالکِ حقیقی کی طرف مبذول کرتے ہیں جس کے قبضۂ قدرت میں سب کچھ ہے۔ اُدھر فرعون پہ بار بار اس نافرمانی کا وبال آتا، وہ صرف موسیٰ علیہ السّلام سے دعا کی درخواست کرتا اور بنی اسرائیل کو واپس کرنے کا وعدہ کرتا، لیکن جب عذاب گذر جاتا تو پھر مُکر جاتا۔ اُن پر سات ؎ ایسے عذاب آئے جنہوں نے قبطیوں کی زندگی تنگ کر دی: طوفان، قحط، میووں کا نقصان، ٹڈی، جوئیں، مینڈک اور پانی کا خون ہو جانا۔ قدرتِ الہٰی کی ایسی کُھلی نشانیاں تھیں کہ چاہیئے تو یہ تھا کہ وہ ایمان لے آتے لیکن اُن کے تکبّر نے اُن کو راہِ حق پر آنے نہ دیا۔ غرض ایک جانب بنی اسرائیل فرعون کے مظالم سے بے تاب، اُدھر فرعون کی قوم موسیٰ کے اِن معجزات سے عاجز۔ بالآخر یہاں سے اس انقلاب کا تیسرا دور شروع ہوتا ہے۔

امرِ الہٰی کے پابند نبیؑ کو حکم ہوتا ہے کہ تم راتوں رات بنی اسرائیل کو لے کر مصر سے نکلو اور اللہ کی قدرت اور اُس کی نُصرت کے نئے مظاہر دیکھو۔ موسیٰ علیہ السّلام نے وہی کیا جو حکم ہوا تھا۔ بنی اسرائیل کو لے کر بحرِ احمر کی طرف چل پڑے۔ اُدھر واقعہ نگاروں نے فرعون کو اس کی اطلاع دی، فرعون کی فوج ان کے تعاقب میں تیار ہوئی۔

اِدھر لاکھوں کی تعداد میں بنی اسرائیل جس میں مرد، عورت، بوڑھے، بچّے سب شامل تھے، جا رہے تھے۔ صبح ہونے کو تھی جب وہ بحرِ احمر کے کنارے پر پہنچے، لیکن دیکھا کہ فرعون کی فوج اُن کا تعاقب کر رہی ہے۔ حضرت موسیٰؑ

؎ اعراف رکوع ۱۶

نے تسلّی دی کہ خوف نہ کرو خدا کا وعدہ سچّا ہے، وہ نجات دے گا۔

حضرت موسیٰ علیہ السّلام کو حکم ہوتا ہے کہ سمندر پر اپنا عصاء ماریں۔ سمندر کا پانی دو پہاڑوں کی طرح اِدھر اُدھر قائم ہو جاتا ہے اور سمندر کی تہہ خشک ہو جاتی ہے، اور حضرت موسیٰ علیہ السّلام مع اپنے قافلے کے اُس پار ہو جاتے ہیں اور اسی راہ پر جب فرعون کی فوج ہوتی ہے وہ غرقِ آب ہوتی ہے۔ فرعون کو اس وقت ہوش آتا ہے، ربِّ موسیٰ و ہارون پر ایمان لاتا ہے لیکن اب وقت نکل چکا تھا۔ البتہ اس کا جسم ایک نشانِ عبرت بنا کر چھوڑ دیا جاتا ہے۔

(سورہ طٰہٰ رکوع ۴، سورہ الشعراء رکوع ۴، سورہ اعراف رکوع ۱۶، سورہ یونس رکوع ۹)

یہ دور موسیٰ علیہ السّلام کی قوم بنی اسرائیل کے لئے صبر کا دور تھا، اور اب اُن کو غلامی سے نجات ملتی ہے تو اُن کا کیا حال ہوتا ہے۔ کیا وہ شکر گذار بندے بنتے ہیں یا اُن کی نافرمانی، کج بحثی رہتی دنیا کے لئے ایک عذاب بن جاتی ہے؛

یہاں سے حضرت موسیٰ علیہ السّلام کی تبلیغ کا وہ اہم دور شروع ہو جاتا ہے جو صرف صاحبِ شریعت نبی ہی کو سونپا جاتا ہے۔ حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم سے قبل حضرت موسیٰ علیہ السّلام وہ واحد نبی ہیں جن کو ایک جامع شریعت عطا ہوئی اور چونکہ شریعت کے نفاذ کے لئے کسی قوم کے لئے آزادی ضروری ہے اس لئے ان ؑ کی قوم کو طویل غلامی سے نکال کر آزادی کی نعمت عطا ہوتی ہے، ان پر بے شمار فضل ہوتے ہیں لیکن انہوں نے ان انعاماتِ الٰہی کی قدر نہ کی اور وہ ایک ایسی ناشکر گذار قوم بن کر باقی رہے جس کا قرآنِ حکیم میں مغضوب کے لفظ سے ذکر کیا گیا اور جس کے شر سے آج بھی قومیں پناہ مانگتی ہیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السّلام کے صبر اور مساعیٔ جمیلہ کا یہ وہ اہم دور ہے جس میں اُن ؑ کی قیادتِ مبارکہ اور سرورِ کائنات صلّی اللہ علیہ وسلّم کی اجراءِ شریعت میں بڑی حد تک مماثلت ہے۔ اس فرق کے ساتھ کہ حضور سرورِ کائنات

صلّی اللہ علیہ وسلّم کی امّت کو خیر الامّت کہا گیا اور رہتی دنیا تک آپؐ ہی کے متبعین کو دینِ مبین کی نگہبانی کا کام سپرد ہوا۔

حضرت موسیٰ علیہ السّلام کی امّت رہتی دنیا تک لوگوں کے لئے ایک فتنہ و آزمائش بن گئی، اور جب بھی امّتِ محمّدیہ کو فتنہ و فساد سے متنبّہ کیا گیا تو انہیں بنی اسرائیل کے واقعات یاد دلا کر عبرت دلائی گئی۔ حضرت موسیٰ علیہ السّلام کے اِسی آخری اہم دَور میں وہ تمام واقعات نمودار ہوتے ہیں جو ایک قوم کی غلامانہ ذہنیت اور اُس کی نفس پرستی، حرص و ہوس، فتنہ و فساد کی داستان بن جاتے ہیں، اور جن کا وجود آج بھی تمام دنیا کے لئے آزمائش بنا ہوا ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السّلام کی پیغمبرانہ مساعی میں اُنؑ کے ضبط و تنظیم، اُنؑ کے صبر و استقلال کی بے شمار مثالیں ہیں۔ ان اہم واقعات میں حضرت موسیٰ علیہ السّلام کا اپنی قوم کے ساتھ ایک لق و دق میدان میں داخل ہونا، پھر سینا کے بُت کدہ میں لوگوں کو بُتوں کی پرستش کرتے دیکھ کر ان کے دلوں میں بھی وہی بُت پرستی کا جذبہ پیدا ہونا، حضرت موسیٰ علیہ السّلام کا سمجھانا اور پھر وادیٔ سینا میں جو "تیہ" کے نام سے مشہور ہے اللہ تعالیٰ کے بے شمار انعامات کا ذکر قرآنِ حکیم میں آتا ہے۔ اِنہیں انعامات سے تھا کہ جہاں پانی نہ تھا وہاں اِن کے لئے چشمے جاری ہوئے، جہاں رزق کی کوئی صورت نہ تھی وہاں ان کی قوم کو منّ و سلویٰ سے نوازا گیا، جہاں دھوپ ہی دھوپ تھی، تپش و تمازت کا سامنا تھا، وہاں قوم پر بادلوں نے سایہ کیا۔ لیکن کیا وہ حضرت موسیٰ علیہ السّلام کے شکر گذار ہوئے؟ کیا انہوں نے ربِ موسیٰ کی قدر جانی؟ نہیں۔ بلکہ اُن کی شر پسند طبیعت نافرمانی کے نئے بہانے تلاش کرتی رہی۔ قرآنِ حکیم میں متعدد مقامات پر اُن کا ذکر آتا ہے۔ لیکن امّتِ مسلمہ کو خصوصیت کے ساتھ اُن کے شر و فساد سے محفوظ رکھنے کے لئے بنی اسرائیل کی کیفیات کا بیان

شروع ہی میں البقر میں کیا جاتا ہے اور اُن کی فطرت سے مسلمانوں کو خبردار کیا جاتا ہے تاکہ وہ اُن کے شر سے بچیں اور کوئی بات اُن سے ایسی سرزد نہ ہو جو امّتِ محمدی کے شایانِ شان نہ ہو۔ (البقر رکوع ۵-۶-۷-۸-۹...)

اِن واقعات کا اعادہ یہاں منظور نہیں لیکن یہ بتانا ضروری ہے کہ ہر عمل کا ایک نتیجہ ہوتا ہے اور عملِ بد کے نتیجے میں خواہ کتنی ہی ڈھیل دے، بالآخر رسوائی، ناکامی و عذابِ الٰہی ہے۔

یہ وہ دَور ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السّلام ایک شریعت، ایک ضابطۂ حیات سے قوم میں ایک تنظیم لانا چاہتے ہیں اور اُن کا رُخ خود غرضیوں سے ہٹا کر رجوع اِلی اللہ کی جانب کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن قوم کی فطرت صدیوں کی غلامی کے باعث ایک اجتماعی زندگی کے فلاح و بہبود کے تصوّر سے محروم ہو چکی تھی، شرافتِ نفس کے وہ اجزاء جو صرف آزاد فضاؤں ہی میں بالیدگی پاتے ہیں، یہ اُن سے خالی تھی۔

یہاں قوم کا باطن ویران تھا، خارج کے ذریعہ اس کے باطن میں توحید کا بیج ڈالنا تھا تاکہ ظاہر سے باطن فیض یاب ہو۔ یہ ایک مشکل طریقۂ کار تھا لیکن ابتداء میں اس سنگلاخ زمین کو بہرحال توڑنا تھا۔ ؎

پھول کی پتّی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر
مردِ ناداں پر کلامِ نرم و نازک بے اثر (اقبالؔ)

شریعت کی یہ بظاہر سختی بھی محبت کے انداز لئے ہوئے ہوتی ہے تاکہ اگر قوم ایک ہی کام بار بار خلوصِ نیت سے کرتے رہنے کی عادی ہو جائے تو شاید تصوّرِ صالح اُن کی جزوِ فطرت بن جائے۔ لیکن اس قوم کا یہ حال تھا کہ اُدھر توجہ ہی کے لئے تیار نہ تھی۔ رحمتِ الٰہی ہنوز اس کی اصلاح کے لئے مضطرب تھی۔ اُن پر سختیاں کی گئیں، اس لئے نہیں کہ وہ ایمان نہیں لاتے بلکہ اس لئے کہ وہ ایمان لا چکے ہیں لیکن حقِ ایمان کی ادائگی نہیں کرتے۔ حضرت موسیٰؑ

کے دامنِ فیض و محبت سے وابستہ ہیں، ربِّ موسیٰ و ہارون کی کرم نوازیوں سے سرفراز ہیں، لیکن اللہ کے حکم اور نبیؑ کے فرمان کو تسلیم کرنے کے بجائے اپنے نفس کے بندے بنے ہوئے ہیں۔ گو بظاہر بُت پرست نہیں رہے لیکن دراصل بہ باطن اُن کے نفس اور نفس کے تقاضے ہی اُن کے خدا بن چکے ہیں چنانچہ پہاڑ کا سروں پر معلق کیا جانا، گوسالہ کی پرستش کرنے والوں کا سختی سے محاسبہ، سب اسی لئے تھا کہ ان پر اللہ کی قدرت و حکمت، نبیؑ کی صداقت اور خود اُن کی بہبودی کا وسیلہ اُن کے ہاتھ آجائے۔ یہ ظلم نہیں کرم تھا، سختی نہیں محبت تھی کہ دامنِ رحمت سے وابستگی نصیب ہو۔

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ نورِ نبوت حجاب در حجاب کس طرح سے اللہ جلّ شانہ کے جلال و عظمت کو آشکارا فرما رہا ہے، اور اس انداز سے کہ اگر قوم اللہ ربّ العزت کی رحمت، کرم اور نوازشات کو نہ بھولے تو نہ میدانِ تیہ کی تپش و گرمی ہی اس کو نقصان پہونچا سکتی ہے اور نہ ایک بے آب و گیاہ سرزمین اُس کے مجبور بندوں کو آب و دانہ سے محروم کر سکتی ہے۔

حقیقت یہ تھی کہ حضرت موسیٰ علیہ السّلام کا قلب اسی نورِ مبین کی تجلّیات سے سرفراز تھا جس کے پرتوِ رسالت میں انوارِ توحید آشکارا ہو نا تھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السّلام سختی سے اپنی قوم کو توحید کی جانب متوجہ کرنا چاہتے تھے اور اُسے مظاہر پرستی سے ہٹا کر ربّ العزت کے حضور سربسجود دیکھنا چاہتے تھے۔ انہیں اپنے نفس کی غلامی سے بھی آزاد کرنا چاہتے تھے۔ یہاں تک کہ بارہا اُن کی اس تمنّا نے جلالِ موسوی کی صورت اختیار کی۔ وہ جلال جس کے سامنے اقتدار و نمود کے چراغ ماند پڑ گئے جس کے سامنے عقل و دانش درماندہ ہو کر رہ گئی، جس نے پُرغرور ہستیوں کا سر نیچا کر دیا، اور یہ سب اس لئے تھا کہ وہ اللہ کے نبیؑ کی اس جلالتِ شان میں اس کے ربِّ ذوالجلال والاکرام کی وجہِ رحمت دیکھیں

اُس کی وہ رحمت جو ہر شئے کو محیط ہے اور اسی کی وہ رحمت جو رحمتِ عام بن کر آشکارا ہوئی اور اس سے وابستگی کو اپنے لئے ذریعہ نجات سمجھیں۔

اللہ رب العزت سے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے سب سے پہلے جو چیز مانگی وہ انشراحِ صدر تھا، وہی انشراحِ صدر جو اَلَمْ نَشْرَحْ میں ظاہر کیا گیا۔ آخر کیوں۔؟ اس لئے تاکہ معرفت الٰہی اور معرفت کی پانت کا ذریعہ اُن کا معاون حال ہو اور ظاہر و باطن کی وہ یکائی ان پر روشن ہو جائے جو مظاہر پرستی سے حق پرستی پر لانے میں معاون ہوتی ہے۔

انشراحِ صدر کے لئے نفس کی حقیقت سے آگاہی ضروری تھی چنانچہ پہلا ہی معجزہ جو نفس کی حقیقت کو سمجھانے کے لئے عطا ہوا وہ عصا تھا۔ بتایا گیا کہ اگر نفس کو قابو میں رکھا جائے تو یہ عصا ہے ورنہ اژدھا۔ اور دوسرا وہ تھا جو تاریکیوں کو دُور کرنے والا تھا یا نورِ مبین ؐ کی تجلی کی ایک جھلک موسیٰ علیہ السلام کو عطا ہوئی، جو ہر باطل کا قلع قمع کرنے کے لئے کافی تھا۔ منشاء یہ تھا کہ نفس پر ہر حال میں قابو رکھو اور یقین کے ساتھ جان لو کہ اللہ تعالیٰ کی رحمتِ کاملہ، جو نورِ مبین ؐ کی شانِ رحمۃً للعالمینی میں جلوہ گر ہے، تمہاری نگرانِ حال ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دوسری تمنا یَفْقَهُوا قَوْلِی تھا جس کے صلہ میں کلیم اللہ کو اندازِ تکلم، اندازِ تبلیغ، اندازِ حلم، اندازِ خود اعتمادی اور اندازِ استدلال کے وہ سب جواہر پارے عطا ہوئے جس کی تکمیل جامع کلم ؐ کے اندازِ کلام میں ظاہر ہونا تھے اور جن کی تجلیوں کا کچھ نہ کچھ حصہ ہر پیغمبر کو ملا ہے۔

یوں تو ہر نبی ؑ صبر و شکر کا ایک مینارِ نور تھا لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جن حالات میں اپنے صبر و شکر کا مظاہرہ کرنا پڑا وہ اپنی نوعیت سے ایک الگ باب ہے۔ پہلے تو آپ ؑ مصر کے دورانِ قیام، بنی اسرائیل کی غلامی، بے کسی اور فرعون کے مظالم پر صبر کے ساتھ بارگاہِ رب العزت میں دست بدعا

رہے ۔ پھر آزادفضاؤں میں اپنی جلالتِ شان کے باوجود قوم کی ہر ایذا رسانی، نافرمانی، بغض وحسد، فتنہ وفساد کو صبر سے برداشت کرتے رہے اور دعوتِ توحید میں ہمہ تن مصروف رہ کر اپنے رب کے حضور ان کے لئے ہدایت کے طالب رہے۔ البتہ یہ اُنؑ کی قوم کی بدنصیبی تھی کہ ایسے اولوالعزم نبیؑ کو پاکر اُن کی قدر نہ جانی اور مغضوب کہلائے (عیاذاً باللہ)

حقیقت یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کی بچپن کی زندگی سے وفات تک جن حالات سے گذرنا پڑا وہ اُنؑ کی جلالتِ شان پر شاہد ہیں اور جس قسم کی اذیتیں اور مصیبتیں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے برداشت فرمائیں ان کی مثال سوائے نبیؐ کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابراہیمؑ کے اور کہیں نہیں ملتی لیکن جو چیز حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم سے قریب لانے کی موجب ہے وہ اُنؑ کی شریعت ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا دورِ نبوت، نبوت کی تکمیل کی منزل نہیں، بلکہ جلالتِ کبریائی اور عظمتِ رسالت سے قلوب کو مسخر کرنے کا دور تھا عصا، یدِ بیضاء اور متعدد معجزات جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو عطا ہوئے وہ سب باطن کے حقائق روشن کرنے کے لئے تھے۔ اُنؑ کی شریعت بھی اسی حقیقت کی ترجمان تھی۔

انؑ پر یہ امر ضرور واضح کر دیا تھا کہ جو شریعت اُنؑ کو عطا ہوئی وہ شریعتِ محمدیؐ کی درمیانی کڑی ہے۔ جہاں ظاہر وباطن میں بظاہر فرق نظر آتا ہے لیکن یہ فرق حقیقی نہیں، اور یہ دوئی اس وقت تک باقی رہتی ہے جب تک علمِ کامل عطا نہ ہو، جو بنیادِ ایمان ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اس لئے حضرت خضرؑ کے پاس بھیجا جاتا ہے۔ اور عجیب واقعات جو اس سلسلہ میں رُونما ہوتے ہیں، مثلاً بھُنی ہوئی مچھلی کا

دریا میں چلا جانا، خضرؑ کا کشتی میں سوراخ کرنا، ایک بچہ کو قتل کر دینا۔ ایک دیوار کی تعمیر بلا اُجرت کرنا، ان کا ذکر قرآنِ حکیم میں آتا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السّلام کی حضرت خضرؑ سے ملاقات ہوتی ہے، وہی سب کچھ ہوتا ہے جو علومِ ظاہر و علومِ باطن کے بظاہر فرق کو نمایاں کرتا ہے۔ اور یہ فرق ہر اس شخص کے لئے باقی رہتا ہے جس کی رسائی عالمِ امر تک اللہ رب العزّت کے عطا کردہ اُس علم سے نہ ہو جسے علمِ لدنّی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

بقول حضرت رفیع الدین صاحب محدّث دہلوی کے حضرت موسیٰ علیہ السّلام کی شریعت کہ جس پر انسان چلے تو فلاح پائے اور خضر علیہ السّلام کی راہ وہ جس پر انسان کا چلنا ہی ممکن نہ ہو۔

یہ بھی روایات میں آتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السّلام شیطانِ لعین سے بھی ملے اور اس سے پوچھا کہ اے بدنصیب، تیرا یہ حال کیوں ہو گیا۔ اس نے جواب دیا کہ موسیٰؑ میں نے بس "میں" کہا تھا، تم یہ نہ کہنا۔ میری جملہ بدنصیبی کی وجہ یہی "میں" تھی، جو خود پرستی یعنی نفس پرستی، حرص و ہوس کی صورت میں نسلاً بعد نسلٍ شدّت پکڑتی گئی۔

اس طرح حضرت موسیٰ علیہ السّلام کو علمِ لدنّی کی حقیقت سے بھی آگاہی بخشی گئی اور شیطان کے ان وسوسوں کی حقیقت سے بھی جو ان کی قوم کے لئے وبال بننے والے تھے۔ مختصر یہ کہ وہ علوم جن کا تعلق اصلاحِ باطن سے تھا، شریعتِ موسوی میں ظاہر نہ کئے گئے تھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السّلام کی شریعت میں یقیناً عقیدۂ توحید و رسالت و آخرت کو قلوب میں راسخ کرنے کے اہم اجزاء موجود تھے لیکن جن کی عقدہ کشائی اسباب کو مسخّر کرنے میں مضمر تھی، جو نظرِ التفات بن کر قلوب کو مسخّر کرنے اور تزکیۂ نفس کی موجب ہوتی ہے۔ وہ قومِ موسیٰ کو عطا نہ ہوئی تھی۔ لیکن انہیں اس حقیقت سے خوب آگاہ

کر دیا گیا تھا کہ وہ ہستی جو موجبِ نجات ہو گی جو موجبِ تکمیل دین ہو گی جو پہلے قلوب کو مسخر کرے گی پھر دعوتِ ایمان دے گی، آنے والی ہے، آئے گی ضرور آئے گی۔ اُس ﷺ کی مدد کرنا، اُس ﷺ کی عظمت کرنا، یہی میرا پیغام ہے۔ تاکہ تمہارے دین کی تکمیل ہو۔

نورِ مُبین صلّی اللہ علیہ وسلّم کی تجلّیاں جستہ جستہ آشکارا ہو رہی ہیں۔ انبیاء علیہم السلام کے سیرت نگاروں نے اِن انبیاء ؑ کو اُن ؑ کے خصوصی امتیازات کے باعث تین حصّوں میں تقسیم کیا ہے۔

۱۔ بعض صاحبِ تخت و تاج و صاحبِ حکومت تھے یا وزارت و سرداری کے مالک تھے۔

۲۔ بعض کی زندگی ان کے برعکس راہبانہ و زاہدانہ تھی۔ اور دولت و ثروت سے یکسر نفور، فقیرانہ معیشت کے حامل تھے۔

۳۔ اور بعض نہ تو اپنی قوم میں حاکم و صاحبِ تخت و تاج تھے اور نہ خالص راہبانہ زندگی کے حامل بلکہ ایک طرف قوم کے ہادی و پیغمبر تھے اور دوسری طرف متوسط معیشت سے وابستہ"

(قصص القرآن بحوالہ صاحب المنار جلد دوم صفحہ ۳۲)

اور ہونا بھی ایسا ہی چاہیئے تھا کہ جس انسانِ کامل ﷺ کی تجلّیاتِ انوار کے جملہ انبیاءِ کرام ؑ ترجمان تھے وہ ذاتِ مبارکہ ﷺ روزِ ازل سے جامع الصّفات تھی اور جو ہر ایک کے لئے رہتی دنیا تک ہادی اور راہبر بن کر آنے والی تھی۔ جس کی رات کی زندگی کی ترجمانی المزمّل سے ہونے والی تھی کہ رات عاشقوں کے لئے بنی ہے، جلوۂ ذات کے انوار رات ہی کو آشکارا ہوتے ہیں اور جس کی دن کی زندگی المدثّر میں نمایاں ہونے کو تھی، جہاں اللہ کا محبوب ﷺ فرائض عبدیت میں منہمک کہیں تبلیغ، کہیں نصیحت، کہیں جہاد میں مشغول نظر آئے گا۔ یہ ذاتِ مبارکہ

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہوگی جن ؐ کی زندگی بادشاہوں سے لے کر فقرا تک سب کے لئے موجبِ اتباع ہوگی۔ جن کو رزم و بزم دونوں کے فرائض دونوں کی اعتیاطوں سے قوموں کو باخبر کرنا ہوگا، جن کو مرد عورت، چھوٹے بڑے، خادم آقا، پیشہ ور، تاجر، طالب علم، استاد، عسکری، میرِ لشکر سب کے لئے قواعد و ضوابط کی تدوین کرنا ہوگی۔ ضروری تھا کہ اِن اہم اجزائے حیات کی جھلکیاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پیش رُوہی پیش کر جائیں، اور وہ ابتدائی امور اقوام کے ذہن نشین ہو جائیں جن پر شخصیت کی تکمیل کا دار مدار ہوتا ہے۔

چنانچہ اس وقت جن انبیاء کرام ؑ کا ذکر ہوا اُن ؑ میں کوئی صاحبِ تخت و تاج نہ تھا۔ اب حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت کے علمبرداروں میں اس فکر کے ترجمان حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت سلیمان علیہ السلام خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ اور اُس تیسری فکر کے انبیاء علیہم السلام میں حضرت یحییٰ ؑ حضرت زکریا ؑ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔

۹

حضرت داؤد علیہ السّلام

لا الٰہ اِلّا اللہ داؤد خلیفۃ اللہ

حضرت داؤد علیہ السّلام کا ذکر قرآنِ حکیم میں سب سے پہلے حضرت شموئیل علیہ السّلام کے زمانہ کے اس واقعہ میں آتا ہے جب حق تعالےٰ سے بنی اسرائیل نے درخواست کی کہ راہِ خدا میں جہاد کے لئے اُن کے واسطے کسی حاکم کا تقرر عمل میں لایا جائے۔ پیغمبر نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے طالوت کو اس منصب پر فائز کیا اور وجہ یہ بتائی کہ اُن کو جسمانی طاقت اور علم و حکمت میں تم سب پر فضیلت حاصل ہے۔ جنگ کے لئے حُسنِ تدبیر بھی ضروری ہے اور جرأت و طاقت بھی۔ یہ واقعہ تفصیل سے سورہ البقرہ کے تینتیسویں رکوع میں آتا ہے۔ بنی اسرائیل کی فطرت یہاں بھی نمایاں ہے، انہوں نے طالوت کو بڑی ردّ و کد کے بعد حاکم تو تسلیم کر لیا لیکن عدول حکمی جو اُن کی فطرت میں رچ گئی تھی اُس سے باز نہ آئے۔

بنی اسرائیل کے اس لشکر میں ایک نوجوان بھی تھا، یہ حضرت داؤد علیہ السّلام تھے جو اپنے والد کے چھوٹے بیٹے تھے، اور شجاعت و بہادری میں کوئی خاص شہرت کے بھی مالک نہ تھے۔ لیکن جب حالتِ جنگ میں انہوں نے جالوت کی مبارز طلبی میں بنی اسرائیل کے پس و پیش کو دیکھا تو فوراً آگے بڑھے۔

جالوت نے نہایت حقارت آمیز لہجہ میں کہا کہ کیا تم ایک ناتجربہ کار لڑکے، میرا مقابلہ کر سکو گے؟ مگر داؤدؑ کے اصرار پر مقابلہ کے لئے تیار ہو گیا، اور اُس وقت اُس کو داؤدؑ کی بے پناہ شجاعت کا اندازہ ہوا، جس کے متعلق قرآن فرماتا ہے:

وَقَتَلَ دَاوُدُ جَالُوتَ وَ اٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ وَ الْحِكْمَةَ وَعَلَّمَهٗ مِمَّا يَشَآءُ ۭ (البقرہ۔ ۲۵۱)	اور داؤد نے جالوت کو قتل کر دیا۔ اور اللہ تعالیٰ نے داؤد کو سلطنت و حکمت عطا کی اور جو مناسب سمجھا اُسے سکھایا۔ (یعنی حکومت و سیاست کے وہ علوم جو حق کی حفاظت کرنے اور حق کو بلند کرنے کے معاون تھے، عطا ہوئے)

اس واقعہ کے بعد ہی سے لوگوں کے دلوں میں حضرت داؤد علیہ السلام کی محبت و عظمت کا سکہ بیٹھ گیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ خود طالوت کی موجودگی اور اُن کی موت کے بعد عنانِ حکومت حضرت داؤد علیہ السلام کے ہاتھ میں آگئی اور اس عرصہ میں آپؑ کو نبوت سے سرفرازی بخشی گئی۔ حضرت داؤد علیہ السلام کا یہ اعزاز بھی بڑی اہمیت کا حامل ہے کہ قرآنِ حکیم میں اُنؑ کو خلیفہ کے لقب سے نوازا گیا، جو حضرت آدم علیہ السلام کے لئے خاص ہے۔

يٰدَاوُدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِى الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ

(سورہ ص آیت ۲۶) اے داؤدؑ ہم نے تم کو زمین پر اپنا نائب بنایا پس تم لوگوں میں انصاف کے ساتھ حکومت کیا کرو

اور یہ وہ لقب ہے جو حضرت داؤد علیہ السلام کے صفات علم وقدرت دونوں کے ساتھ اِنؑ کے فرائضِ خلافت کی جانب نشان دہی کرتا ہے۔

قرآنِ حکیم میں انؑ کا ذکر یوں آتا ہے۔

۱۔ اور (اے رسولؐ) آپ ان (منکرینِ حق) کی باتوں پر صبر کیجئے اور ہمارے بندے داؤدؑ کو یاد کیجیے جو بڑی قوت والے تھے اور بے شک وہ اللہ کی طرف بہت رجوع کرنے والے تھے (ص آیت ۱۷)

(وہؑ قوتِ علم وعمل رکھتے تھے اور قوتِ نظم و نسق بھی، نبی بھی تھے اور بادشاہ بھی)

۲۔ اور ہم نے پہاڑوں کو اُنؑ کا تابعِ فرمان کیا تھا جو صبح و شام اُنؑ کے

ساتھ تسبیح کرتے تھے۔ (ص آیت ۱۸)

۳۔ اور پرندے اُن ؑ کے ساتھ جمع ہو کر (تسبیح کرتے) سب اُن کے تابع فرمان تھے (ص ۱۹)

۴۔ اور ہم نے اُن ؑ کی حکومت کو بڑا استحکام دیا تھا اور اُن ؑ کو حکومت اور قولِ فیصل کا سلیقہ سکھایا تھا (کہ سننے والا خود ان ؑ کے انصاف کا قائل ہو جائے) (ص ۲۰)

۵۔ وہ تقریر و خطابت کے فن میں بھی بڑی مہارت رکھتے تھے اور ان ؑ کی گفتگو فصاحت، لطافت اور شوکتِ بیان کا حسین نمونہ تھی۔

۶۔ قرآنِ حکیم میں حضرت داؤد علیہ السّلام کے عدل و انصاف کے ذکر کے ساتھ ان ؑ کے معمولات کا بھی ذکر آتا ہے (ص آیات ۲۱ تا ۲۴)

۷۔ حضرت داؤد علیہ السّلام کا لحنِ داؤدی ضرب المثل ہے۔ اور آپ ؑ کو اللہ تعالیٰ نے یہ قدرت بھی عطا فرمائی تھی کہ آپ ؑ کے ہاتھ میں لوہا موم ہو جاتا اور اس طرح آپ ؑ جنگ کے لئے بہترین زرہ تیار فرماتے۔

۸۔ زبور حضرت داؤد علیہ السّلام کے رُشد و ہدایت کے لئے عطا ہوئی، جس کی "اصل اور اساس" توریت ہی تھی۔

یہی وہ حمد کے نغمے ہیں جن میں چرند و پرند ان ؑ کے ہم نوا ہوئے اور پہاڑ ان ؑ کے حمد میں شریک ہوئے (سبحان اللہ)

یہ جملہ امور کیا آپ کی توجہ اس نبیِ برحق ؐ کی جانب مبذول نہیں کرتے جن کے علم و حکمت، فہم و تدبیر، قدرت و عطاءِ خاص کے یہ ابتدائی نقوش ہیں، کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم ہی وہ ہستی ہیں جن کا وجود موجبِ تخلیقِ کائنات ہوا، اور آپ ؐ ہی کے صفات و کمالات جستہ جستہ انبیاء علیہم السّلام میں آشکارا ہوتے رہے، پھر جن کی صداقت و محبت پر شجر حجر، چرند و پرند

تک شاہد رہے اور آپؐ کے حکم کے تابع۔

اور کیا یہ اس بات کا بین ثبوت نہیں کہ اسلام دینِ فطرت بن کر نہ صرف پند و نصائح کے لئے آیا بلکہ ہر شعبۂ حیات کو عبادت بنا دینا اس کا اصل مقصد رہا تاکہ دین زندگی سے الگ تصوّر نہ کیا جائے اور نہ خدا کی عبادت اس کی مخلوق کی خدمت سے محرومی کا موجب بنے کہ دونوں ہی سے بندہ بندگی کے آداب سیکھتا ہے۔

و

حضرت سلیمان علیہ السّلام

حضرت سلیمان علیہ السّلام، حضرت داؤد علیہ السّلام کے فرزندِ ارجمند ہیں۔ آپؑ کی ولادت ۱۰۳۵ ق م بتائی گئی ہے۔ آپؑ کی ذکاوت، فہم اور مقدمات کے فیصلے میں آپؑ کے صائب رائے ہونے کا قرآنِ حکیم میں سورۂ انبیاء کی آیات ۷۸ - ۷۹ میں ذکر آتا ہے۔ آپ کا زمانہ بنی اسرائیل کی تاریخ میں ایک درخشاں دَور ہے ـــــ اور بقول حضرت مولانا آزاد:

"گو ان یہودیوں کی حالت، اس شخص کی سی تھی، ایک طرف کھیت بوئے اور دوسری جانب رات کو بکری کو چھوڑ دے، تو اُسے سوائے خسارے کے کچھ نہ نصیب ہوگا، حضرت داؤدؑ نے انہیں فلسطین پر فتح مند کیا اور تمام ملک ساحلِ بحر تک اُن کے قبضے میں آگیا پھر بھی وہ اس میں نظم و اطاعت کی روح پیدا نہ کرسکے۔ البتہ حضرت سلیمان علیہ السّلام کے زمانہ میں ایک نیا انقلاب رُونما ہوا اور انہوں نے اپنی دانش اور حکمتِ نبوّت سے یہودیوں کی حالت کی کایا ہی پلٹ دی کہ ایک عظیم الشّان عبرانی حکومت قائم ہوئی"

(اقتباس انبیاء کرام صفحہ ۳۱۱)

حضرت سلیمان علیہ السّلام کی ذات میں پرتوِ نورِ مبینؐ کی وہی جھلک بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے جو کارِ حکومت میں بھی کارِ نبوّت کی شاہد ہے۔ یعنی اُن کے لئے

حکومت کا منشاء لوگوں پر حکم رانی نہیں بلکہ اُن ؑ کے لئے عدل و انصاف، سکون و حفاظت، ہدایت و شفقت کی فراہمی تھی۔ وہؑ دوسروں کو اپنے زیرِ نگیں لانا نہیں چاہتے تھے، بلکہ یہ چاہتے تھے کہ وہ اللہ کے فرمانبردار ہو جائیں۔ ملکۂ سبا کا پورا واقعہ اُن ؑ کے اس جذبۂ تبلیغ کے ساتھ اُن ؑ کی فراست، حکمت، اللہ کی قدرت پر کامل اعتماد اور اصل مقصد یعنی توحیدِ مطلقہ کو قلوب میں راسخ کرنے کا بیّن ثبوت ہے۔ اللہ ربّ العزّت نے اُن ؑ کو جن جن صلاحیتوں سے نوازا وہ سب اُسی ربّ العزّت کی کبریائی سے دلوں کو یادِ الٰہی سے معمور کرنے میں صرف ہوئیں، اور باوجود قوّت اور حکومتِ شاہانہ کے مزاج میں خوفِ خدا کی یہ کیفیت تھی کہ جب اُن ؑ کے لشکر کی روانگی کی اطلاع چیونٹیوں کو اُن کے سردار نے دی اور اُن سے کہا کہ تم اپنے سوراخوں میں گھس جاؤ کہیں سلیمان ؑ کا لشکر تمہیں پیس نہ ڈالے۔ اُس وقت ایک تبسّم کے ساتھ حضرت سلیمان ؑ کی زبان پر یہی دُعا تھی:

"اے میرے پروردگار تُو مجھے توفیق عطا فرما کہ میں تیری نعمتوں کا ہمیشہ شُکر گذار رہوں جو تُو نے مجھ پر اور میرے والدین پر فرمائیں، اور توفیق عطا فرما کہ ہمیشہ وہ کام کروں جو تجھے پسند ہو اور مجھے محض اپنی رحمت سے اپنے نیک بندوں میں شامل فرما" (ترجمہ النمل آیت ۱۹)

حضرت سلیمان علیہ السّلام کی زندگی اللہ تعالیٰ کی نعمتوں پر شکر گذاری اور ایسے کام کرنے کی جو موجبِ رضائے الٰہی ہوں انسانیت کے لئے ایک اعلیٰ نمونہ ہے۔ کیا یہ دعا آج بھی اُمّتِ مسلمہ کی زبان پر بار بار نہیں آتی۔ کیا وہ اس دُعا کو اپنے ہی نبی کریم کا پرتوِ شکر گذاری نہیں سمجھتے۔

حضرت سلیمان علیہ السّلام کی حیاتِ طیّبہ میں ان کے رب کی عنایات کے ساتھ حضرت سلیمان علیہ السّلام کے جذبۂ احسان مندی و شکر گذاری کے

متعدد واقعات ملتے ہیں جو بصیرت افروز ہیں، اور حکومت اور نبوّت کے اتصال باہمی کی ایک اعلیٰ مثال ہیں۔

۱۔ دیکھئے! اللہ تعالیٰ نے اُنہیںؑ منطق الطّیر کے معجزے سے سرفرازی بخشی، یعنی وہؑ چرند و پرند کی بولیاں سمجھ لیتے اور حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہما السّلام کے لئے اُن کی بولیاں ایک ناطق اِنسان کی آواز کی طرح اُنؑ پر واضح تھیں۔ جس کا ذکر سورۂ نمل کی آیت ۱۶ میں آتا ہے۔ لیکن انہوںؑ نے اس سے کیا کام لیا، سوائے اس کے کہ مخلوقِ خدا کی خیر خواہی، جس کی مثال ہدہد کا ملکۂ سبا کے دربار میں پہونچنا اور اُس کا ایمان لانا ہے۔

۲۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمانؑ کے لئے ہوا کو مسخّر فرما دیا تھا۔ جو شدید تُندو تیز ہونے کے باوجود اُنؑ کی نرم اور آہستہ روی کے باعث "راحت رساں" تھی۔ اور پھر اس ہوا میں اُنؑ کا تخت اس تیزی سے رواں ہوتا کہ مہینوں کا سفر دِنوں میں کرتا۔ اس کا ذکر بھی سورۂ ص آیت ۳۶ میں آتا ہے۔ لیکن اس طاقت و شوکت کا مَصرف کس لئے تھا، صِرف اس لئے کہ جنّ و اِنس بالخصوص شر پسند طبائع اُنؑ کے زیرِ فرمان رہیں، اور اپنی طاقت اور حکمت پر نازاں ہو کر یا حکومت کو کمزور اور مجبور سمجھ کر لوگوں کے لئے باعثِ اذیت نہ بنیں۔

۳۔ اللہ تعالیٰ نے اُنؑ کو اُجنّہ پر حکومت بخشی تھی جو ہر طرح کی خدمت کے لئے اُنؑ کے حضور مستعد رہتے۔ چنانچہ سورۂ ص آیت ۳۷ و ۳۸ میں اس کا ذکر آتا ہے۔

"اور تمام شیاطین کو ہم نے اُنؑ کا تابع فرمان بنا دیا اور ہر عمارت بنانے والا اور ہر غوطہ لگانے والا اُنؑ کے تابع تھا (تاکہ سمندر کی تہہ سے بیش قیمت اشیاء نکالیں) اور اسی طرح دوسرے بیڑیوں میں جکڑے ہوئے جنّوں کو بھی زِنبید میں ڈال دیا گیا تھا تاکہ دوسرے ان کے شر و فساد سے محفوظ رہیں۔"

بتانا یہ ہے کہ تمہارا حاکم اور حقیقی حاکم وہی ہے جو تم کو ظاہری اور پوشیدہ ہر آفت سے بچانے کی طاقت اور قدرت رکھتا ہو، یہ اللہ کا نبیؑ اُس کا ولی اور دوست ہی ہوسکتا ہے جو رات دن رعایا کی خیر خواہی میں گذارے، اپنی بادشاہی کو اپنی شان و شوکت کا ذریعہ تصور نہ کرے۔ جو لباسِ فقر میں شہنشاہی رعب داب سے مزیّن ہو۔

حضور سرورِ کائناتؐ کی ذاتِ مبارک تو تمام انبیاءؑ سے ارفع و اعلیٰ ہے، اُنؐ کے خادموں میں حضرت عمر فاروقؓ اور حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ اس کی اعلیٰ مثالیں ہیں۔

گویا حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی امت کے بادشاہوں اور سرداروں کو جس نصب العین سے آراستہ کرنا تھا، حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت سلیمان علیہ السلام کے تاریخی کارنامے اس کے پیش خیمہ ہیں۔ یہی وہ نورِ مبین کی جھلکیاں ہیں جو آہستہ آہستہ رُونما ہورہی تھیں، اور زمانہ خود آقائے دوجہاںؐ کا منتظر تھا۔

حضرت سلیمان علیہ السلام نے جنّوں سے کام لے کر عظیم الشان عمارتیں، ہیکلِ سلیمانی اور پُرشوکت قلعے تعمیر فرمائے، ایسے قلعے جو گارے اور چُونے سے بنے ہوئے نہیں بلکہ پگھلے ہوئے تانبے سے جن کی بنیادیں مستحکم کی گئی تھیں۔ ہیکلِ سلیمانی کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس کی تعمیر میں تیس ہزار آدمی تیرہ برس تک کام کرتے رہے، اور وہ جنات بھی جو آپؑ کے وصال کے بعد ایک سال تک کام میں لگے رہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام پر اللہ رب العزت کی عطا تھی کہ اُنؑ کو پگھلے ہوئے تانبے کے چشمے عطا ہوئے۔ اس کی دونوں صورتیں مفسّرین نے مراد لی ہیں۔ ایک یہ کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے لئے اللہ تعالیٰ تانبے کو پگھلا دیا تھا۔ یہ اُنؑ کا معجزہ تھا۔ اور یہ بھی مراد لیا ہے کہ حضرت سلیمانؑ

کو وہ فراست عطا ہوئی تھی جس سے وہؑ کام لے کر دھاتوں کو پگھلا لیتے، اس طرح معدنیات کی تسخیر کا عمل بھی حضرت سلیمان علیہ السّلام کے دور سے شروع ہونا ثابت ہوتا ہے۔

۴۔ یہ شوکتِ شاہی، یہ طاقت و قوّت، صرف امن و امان ہی کے لئے نہیں، بلکہ جہاد فی سبیل اللہ کے لئے بھی حضرت سلیمانؑ کو اللہ تعالیٰ کی ایک عطائے خاص تھی۔ جس کا اظہار مجاہد اولاد کی تمنّا میں ہو یا جہاد کے لئے گھوڑوں کو تیّار کرنے میں، لیکن ہر جگہ یہ بات پیش نظر رہے کہ جو بھی عمل ہو وہ اللہ کے لئے ہو۔ یہاں تک کہ اگر وہ بظاہر نفس کے لئے معلوم ہوتا ہے تب بھی وہ درحقیقت اللہ ہی کے لئے ہو۔ اور اس اخلاص میں فرق نہ آئے۔

۵۔ حضرت سلیمان علیہ السّلام کے زمانہ میں ملکۂ سبا کے واقعہ میں اِس حقیقت کا بھی انکشاف کیا جاتا ہے کہ یہاں نبوّت ایک عطاء خاص ہے جو صرف نبیؑ کے لئے ہے لیکن اس کے علاوہ جو کچھ نبیؑ کو بطور مبشّرات و کرامات عطا ہوتا ہے وہ اسؑ کے متّبعین کو بھی مل سکتا ہے بشرطیکہ وہ تابعِ نبیؑ اُسے اپنی طرف منسوب نہ کرے اور اُسے اپنے نبیؑ ہی کا فضل و کرم سمجھے، اور خوب سمجھ لے کہ یہ عطا بھی اس کے نبیؑ کی دعا کا نتیجہ ہے جو اس کے خلوصِ اتباع اور نبیؑ کی محبّت کے باعث اُسے حاصل ہوئی، یہ وہ راز ہے جو اکثر لوگ نہیں جانتے لیکن نبیؑ اور اُس کے متّبعین کے درمیان یہ راز راز نہیں۔ یہ بڑی اہم بات ہے۔ جس کا ذکر قرآنِ حکیم میں سورۂ نمل کے تیسرے رکوع میں تفصیل سے ملکۂ سبا کے تخت کو دربارِ حضرت سلیمانؑ میں حاضر کئے جانے کے سلسلہ میں آتا ہے:

جب جنّوں میں سے ایک طاقت ور (تیز طرار) جن نے کہا کہ میں اسے حاضر کئے دیتا ہوں قبل اس کے کہ آپ اپنی جگہ سے اُٹھیں (یعنی اجلاس ختم ہو) اور میں اس کام کے لئے قوی اور امین ہوں (نمل ۳۸)

لیکن آپؑ ہی کے دربار میں ایک شخص جس کے پاس علم کتاب تھا (یعنی جو نبیؑ کا سچا متبع تھا، خود صاحبِ کتاب نہ تھا، بلکہ اپنے نبیؑ کے فیض سے فیض یاب تھا) بولا کہ میں آپؑ کی آنکھ کے جھپکنے سے قبل ہی اُسے حاضر کر سکتا ہوں (اور حضرت سلیمان علیہ السّلام کا اِذن پاتے ہی اس کی تعمیل کی) اور جب حضرت سلیمانؑ نے اس تخت کو اپنے پاس رکھا ہوا دیکھا تو فرمایا: یہ میرے رب کا فضل ہے تاکہ وہ مجھے آزمائے کہ میں اُس کا شکر کرتا ہوں یا ناشکری کرتا ہوں، اور جو شکر ادا کرتا ہے وہ اپنے ہی فائدے کے لئے ادا کرتا ہے اور جو ناشکری کرتا ہے وہ خود اپنا نقصان کرتا ہے۔ میرا رب تو بے نیاز ہے۔ وہ انتہائی کرم کرنے والا ہے (اُسے کسی کی کیا حاجت)۔ (ترجمہ نمل آیت ۴۰)

دیکھئے! اسمِ اعظم اللہ ہی کا اسم ہے، اور اس کی عطا بھی اللہ ہی کے فضل سے ہے لیکن یہ صلہ ہوتا ہے نبیؑ کی نظرِ التفات کا۔ اس سے یہ امر بھی واضح ہو جاتا ہے کہ ناری کو جو قوت دی گئی ہے اور مومن کو جو قوت من جانب اللہ ملتی ہے اُن میں کتنا فرق ہے۔ اکثر بزرگوں نے یَا حَیُّ یَا قَیُّوْمُ اِسمِ اعظم بتایا ہے۔ مختلف احادیث سے مختلف اسماء الحسنیٰ یا آیاتِ قرآنی کی طرف اسمِ اعظم کا اشارہ پایا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے سب ہی اسم اسمِ اعظم ہیں۔ بات اتنی ہے کہ کس کو ملا اور کس نے دیا؟ جب تک اللہ، رسولؐ ہی نہ چاہیں یہ عطا نصیب نہیں ہوتی۔ بات یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جس کو جو اسم عطا فرما دیا وہ اُس کے لئے اسمِ اعظم بن جاتا ہے۔

یہاں بھی آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ عطا کے انداز جو حضرت سلیمان علیہ السّلام کو عطا ہوئے تھے، اور وہ عطا کے انداز جن کے یہ پیش خیمہ تھے اُن میں کتنا فرق ہے۔ صَلُّوا علیہ و آلہ۔ ان کی طرف یہاں صرف اشارہ کافی ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السّلام کے بعد دیگر انبیاءؑ کے ذکر کو نظر انداز کرتے ہوئے ہم حضور سرورِ کائنات صلّی اللہ علیہ وسلّم سے قبل اُس نبیؑ کے ذکر پر اس فصل کو ختم کریں گے جن کا وجود ہی اللہ تعالیٰ کی قدرت کی نشانی بنا، جس نے مقامِ روح کو خود پر تورِ روح بن کر آشکارا کیا، اور ابنِ مریم کہلائے ——— یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السّلام

○

سُبْحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ۝ وَسَلٰمٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ ۝ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝

(الصّٰفّٰت ۱۸۰ تا ۱۸۲)

و

حضرت عیسیٰ علیہ السّلام

لا الٰہ الّا اللہ عیسیٰ رُوحُ اللہِ

فیضانِ نورِ نبوّت کی کہکشاں کے ستارے ایک ایک کر کے جُدا ہو رہے ہیں، کاروانِ نورِ مبین کا وہ ستارہ جو طلوعِ صبح کے قریب نمودار ہو کر مژدۂ سحر دے رہا ہے۔ بنی اسرائیل کی مفلوج ذہنیت کو ایک نیا رُخ دینے کے لئے رحمتِ الٰہی کا ایک اور ظہور پیامِ محبّت دینے کے لئے عالمِ وجود کو منوّر کرنے آرہا ہے۔ یہ حضرت عیسیٰ علیہ السّلام ہیں جن کی پیدائش معجزہ، جن کا آسمان پر اُٹھایا جانا معجزہ، جن کے پھر دنیا میں تشریف لانے کی بشارت، معجزہ جو پیکرِ رحمت و محبّت بن کر آئے مسیحا ہی بن کے رہے اور تبلیغِ دین کے لئے دِلوں کی حکومت کو اپنا مقصدِ حیات بنایا۔

حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم نے حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کے متعلق فرمایا لَیْسَ بَیْنِیْ وَبَیْنَہٗ نَبِیّ۔ اور اللہ ربّ العزّت کی بارگاہ سے حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کو یہ سرفرازی نصیب ہوئی کہ یومِ میثاق انبیاءِ کرام سے لئے ہوئے وعدہ لَتُؤْمِنُنَّ بِہٖ وَلَتَنْصُرُنَّہٗ کو عملی جامہ پہنائیں۔ اور قیامت کے قریب حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کے اُمّتی اور آپؐ کے متّبعی ہو کر آپؐ کے دینِ متین کی معاونت کا عملی مظاہرہ کریں کہ انبیاءِ کرامؑ کی نمائندگی بھی ہو جائے اور حق کی ادائگی بھی۔

حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کی عظمت کی یہ مثال کیا کم ہے کہ حضرت آدمؑ کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السّلام پہلے نبی ہیں جنہیں امرِ کُن کا مظہر بنایا گیا، اور

بلا باپ کے پیدا ہونا آپ کی فضیلت کا موجب بنا۔ پھر قرآنِ حکیم میں حضرت مریم علیہا السّلام کے ذکر کو خصوصی انداز سے جگہ دے کر مقامِ حضرت عیسیٰؑ بن مریمؑ کو پاکیزہ قلب پر منکشف فرمایا گیا، اور حضرت مریم علیہا السّلام کو ہر بہتان سے بَری، بلند و بالا فرما کر عالمین میں فضیلت سے نوازا گیا۔ قرآنِ حکیم میں حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کی پیدائش کو نہایت وضاحت سے بیان کرنے کی ایک غایت یہ بھی ہے کہ یہ حقیقت لوگوں پہ بخوبی واضح ہو جائے کہ نبیؑ کی حیاتِ مبارکہ کا ہر لمحہ از ابتدا تا آخر سب ذکر کئے جانے، یاد کئے جانے اور اصلاحِ حال کا ذریعہ ہوا کرتا ہے۔ اور یہ امر بھی روشن ہو جائے کہ ہر نبیؑ اللہ کا بھیجا ہوا ہوتا ہے اور اس کے دربارِ خاص سے انعامات، فضائل، معجزات و انوار کا مظہر بن کر آتا ہے۔ وہ تو نبوت پہ سرفرازی کے بعد اپنے کام کا آغاز کرے گا لیکن دیکھو اللہ تعالیٰ کس کس طرح اس کی تخلیق کے وقت اور تخلیق کے بعد اپنی رحمتوں اور نوازشوں سے اس کو بہرہ مند کرتا ہے۔ تاکہ لوگ عَبْدُہٗ اور رَسُوْلُہٗ کی جامعیت کو پائیں اور عبد کو رسول سے الگ تصور نہ کریں۔ پہلے اپنے قلب کی گہرائیوں میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت و محبت کو جگہ دیں، پھر آپؐ کے فرمان کی تعمیل کو اپنے لئے سعادت اور موجبِ فلاح تصور کریں تاکہ عبادات کا اصل مقصد معرفتِ الٰہی اور عرفانِ حقائق ان کا نصیبہ ہو۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کوئی نئی شریعت لے کر نہیں آئے، وہی شریعتِ انبیاءؑ جو ایک خاص سانچے میں حضرت موسیٰ علیہ السّلام کے زمانے میں ڈھالی گئی تھی، وہی آپ کے دین کی بنیاد قرار پائی، اور آپؑ نے اپنی قوم میں اپنی مساعئ جمیلہ کا آغاز اسی سے کیا جس کو وہ بھلا چکی تھی۔ حضرت موسیٰ علیہ السّلام کی شریعت ہی وہ شریعت تھی جس میں ان رموز کو آشکارا کیا گیا تھا جو افراد و قوم کے عروج و زوال کا باعث بنتے ہیں۔ اللہ کو جاننے کے لئے مشاہدہ کی طرف

توجہ دلائی گئی تھی، بندہ کو بندگی کے لئے تاریخ کی طرف رجوع کیا گیا تھا۔ بنیادی عقائد و امور بتا کر استقامت کی تعلیم دی گئی تھی۔ اللہ اور اُس کے رسولؐ کی فرمانبرداری پر سختی سے عمل پیرا رہنے کی تاکید کی گئی تھی، یعنی اللہ و رسولؐ پر ایمان کے ساتھ آیاتِ ربانی کو ہر تحریف سے محفوظ رکھنا، حق کو باطل کے ساتھ نہ ملانا، نماز قائم کرنا، یادِ الٰہی سے غافل نہ رہنا، جو کہنا وہی کرنا، قول و فعل کے تضاد سے بچنا اور عزم، استقامت اور رجوع الی اللہ کو شعار بنانا۔

لیکن

یہ وہ قوم تھی جس نے نہ موسیٰ علیہ السّلام کے زمانے میں اُنؑ کے حکم پر کان دھرے اور نہ اُنؑ کے بعد اس شریعت کو اپنایا، بلکہ زمانہ کے ساتھ ان کی فریب کاریاں بڑھتی رہیں، اُن کی کج بحثی، کج روی، اُن کے شر و فساد، اُن کے بُغض و حسد، اُن کی حرص و ہوا، یہاں تک کہ پیغمبروں کو قتل کر دینا اور صالحین کو ہر طرح کی ایذا رسانی اُن کی فطرت بن گئی، جن کا ذکر گذشتہ فصل میں گذر چکا ہے۔ یقیناً حضرت موسیٰ علیہ السّلام کو بعض وقت سختی سے اُن کو ان امور پر تنبیہہ کرنا پڑتی تھی، لیکن اس محبت کے ساتھ کہ اللہ کے ہر عذاب سے انہیں بچاتے اور رحمت کی جانب متوجہ کرنے کی کوشش فرماتے۔ لیکن یہ سعادت قوم کی قسمت میں نہ تھی۔ حضرت عیسیٰ علیہ السّلام نے اب اللہ ربّ العزّت کے جلال کی جگہ اس کے جمال و اکرام کی طرف بنی اسرائیل کی توجہ مبذول کی۔ وہؑ بھی صاحبِ کتاب نبی تھے لیکن یہ وہ انجیل نہ تھی جو آج دنیا کے ہاتھوں میں ہے۔ وہ تو یہود ہی کے ہاتھوں مسخ ہو کر اپنی مدتِ حیات ختم کر چکی تھی اور اب جو چار کتابیں انجیل کے نام سے موسوم ہیں ؎ وہ تو حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کے آسمان پر

؎ اس مسخ شدہ انجیل میں بھی ایسے مقامات ہیں جن کی چمک، قرآنِ حکیم کے نور کا دیباچہ ہے۔ خاص طور پر سرکارِ دو عالمؐ کی تشریف آوری کے سلسلہ میں انجیل کی پیش گوئیاں اور بشارتیں (پروفیسر ابوالخیر کشفی صاحب)

اٹھائے جانے کے بعد اُن کے متبعین کی لکھی ہوئی ہیں، گویا ان کی ایک تاریخی حیثیت ہے، اور ان میں بھی وہی سب اختلافات ہیں جو کتبِ تاریخ میں ہوا کرتے ہیں، جس سے خالقِ ارض وسمٰوٰت کا کلام پاک ہوا کرتا ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا دَور وہ دَور تھا جہاں نہ صرف بنی اسرائیل بلکہ تمام متمدن قومیں انسانی رحم ومحبت کی روح سے یکسر ناآشنا تھیں۔ چنانچہ، بقول مولانا آزاد، بنی نوعِ انسان کے لئے جو نبی مبعوث ہوا یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام وہ ایک ایسی ہستی تھا جو سرتاپا رحمت ومحبت کا پیام تھا جس نے انسانی زندگی کے تمام گوشوں سے قطعِ نظر کرکے صرف اُس کی قلبی ومعنوی حالت کی اصلاح پر اپنی پیغمبرانہ ہمت مبذول فرمائی۔ چنانچہ اس برگزیدہ نبی نے "جسم کی جگہ روح پر، اذہان کی جگہ قلوب پر اور ظاہر کی جگہ باطن پر نوعِ انسانی کی توجہ مبذول فرمائی اور انسانیتِ اعلیٰ کا فراموش شدہ سبق یاد کرایا۔" (انبیائے کرام صفحہ ۳۲۸) یقیناً حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے انداز میں نرمی تھی اور بعض جگہ یہ نرمی اس حد تک تھی کہ فطرتِ انسانی اسے قبول کرنے کو تیار نہ تھی۔ مثلاً اگر کوئی تمہارے ایک گال پر طمانچہ مارے تو تم اُن کے سامنے دوسرا گال کر دو۔ لیکن ہمیں نہ بھولنا چاہیئے کہ ظلم کا مقابلہ کرنے کے لئے کسی توازنِ ذہنی سے پہلے قلوب کو نرم اور انجذابِ فیض کی صلاحیتوں سے آراستہ کرنا ضروری ہوتا ہے۔ یہاں اس کا منشاء صرف یہ تھا کہ تم غیظ وغضب، نفرت وانتقام کی جگہ عفو و درگذر کو اپناؤ۔ یہ ایک عظیم قوت ہے جو دشمن کو دوست بنا دیتی ہے۔ یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات گویا "ناگزیر حالتوں میں ایک ناگزیر" علاج تھا۔

واضح رہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام مقامِ روح پر فائز ہیں، اور مقامِ روح کا ترجمان ہی بتا سکتا ہے کہ عالمِ ارواح میں بیش قیمت اور گراں بہا کیا ہے، محبت یا نفرت، درگذر یا انتقام۔ اس حقیقت کو بھی وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جن کے قلوب اسفل سے کنارہ کش اور اعلیٰ سے محبت کے خوگر ہو جائیں۔ چنانچہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام

نے شریعتِ موسوی میں کسی قسم کی تبدیلی کئے بغیر اس میں محبت، رحم، عفو و درگذر کے اجزاء اس طرح سمونے کی سعی فرمائی کہ یہ اقدار باطن میں رچ جائیں اور ظاہر میں اپنی جگہ خود پیدا کریں۔

لیکن

ہوا کیا کہ یقیناً ایک مختصر جماعت ایسی پیدا ہوگئی کہ انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات کو اس محبت سے اپنایا کہ "حواری" کہلائے اور بعض نے لفظاً و حرفاً اس پر عمل پیرا ہونے کی بھی کوشش کی اور رہبانیت کو اپنا شعار بنایا۔ بایں ہمہ بالعموم ان ؑ کے متبعین حضرت عیسیٰ ؑ کی عظیم شخصیت کو سمجھنے سے قاصر رہے۔ کسی نے اُن ؑ کو اللہ کا بیٹا، کسی نے اُن ؑ کے ساتھ حضرت مریم اور روح القدس کو شامل کر کے اِن سب کو مقامِ الوہیت پر پہونچا دیا، اور عظیم شرک کے مرتکب ہوئے۔ اسی طرح یہود نے عُزیر کو اللہ کا بیٹا کہا، اور دونوں ایک دوسرے سے برسرِ پیکار ہو گئے، رحمت کی فضائیں گرد آلود ہو گئیں، عالم پر غبار ہی غبار چھانے لگا۔ افراط و تفریط سے اصلاح تو کیا ہوتی البتہ شر و فساد نے نئے انداز سے جنم لیا۔ خود عیسائیت کے بھی ٹکڑے ٹکڑے ہوئے اور یہودیت نے اپنا جال کچھ اس طرح عالم پر ڈالا کہ کوئی اس کے شر سے محفوظ نہ رہ سکا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نہ گھر تھا، نہ انہوں ؑ نے شادی کی، نہ کسی جسمانی راحت کے سامان کو اپنایا۔ ان ؑ کا کام تو گاؤں، گاؤں، قریہ قریہ اللہ کا پیغامِ توحید پہونچانا تھا۔ یہود بھلا اُن ؑ کی تبلیغِ دین کیونکر برداشت کر سکتے تھے۔ آخر انہوں نے یہ کہہ کر کہ یہ ؑ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خلاف سازش کرتے ہیں انہیں ؑ دار پر چڑھانے کی کوشش کی۔ چنانچہ ایک موقع پر جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنے چند شاگردوں کے ساتھ بند مکان میں موجود تھے یہود نے اس مکان کا محاصرہ کر لیا۔ اور اپنے خیال میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو گرفتار کر لیا۔ لیکن اللہ کا وعدہ

سچا ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے وعدہ تھا کہ "تیرے دشمن تجھے نقصان نہ پہونچا سکیں گے"۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے وہ کیا جو اللہ ہی کر سکتا تھا، جس کا ذکر سورۂ مائدہ کے رکوع ۵ میں آتا ہے۔ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو آسمان پر اُٹھا لیا۔ جس شخص کو یہود نے پکڑا تھا اُس کی صورت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی سی ہو گئی تھی۔ اُس نے بہت سمجھانا چاہا کہ میں عیسیٰ نہیں ہوں لیکن کسی نے ایک نہ مانی اور اُسے سولی دی گئی۔ لیکن یہ بات ان تمام لوگوں کے لئے پھر بھی باعثِ حیرت رہ گئی کہ وہ آدمی جو حضرت عیسیٰؑ کو گرفتار کرنے کے لئے گیا تھا وہ کہاں گیا۔ اگر یہ وہی شخص ہے تو پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کہاں گئے۔ ان ناسمجھوں کو کون سمجھائے اور کیسے ان کی سمجھ میں آئے کہ اللہ اپنے مقبول بندوں کا محافظ خود ہوتا ہے۔

اب حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنے رب کے پاس چوتھے آسمان پر تھے جہاں اُنہیں سرورِ کائنات سے شرفِ نیاز حاصل ہوا، جس کا ذکر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی معراجِ شریف کے حالات میں آتا ہے۔

اس طرح نورِ مبینؐ کا یہ سفر جو جسمِ آدمؑ میں آکر مسجودِ ملائکہ بنا تھا اور ایک طویل سفر کے بعد اپنے ظہور میں آنے سے قبل مقامِ رُوح پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے وجود کو منوّر فرماتا ہے اور انہیںؑ ایک پیکرِ رحمت و محبّت بناتا ہے۔ اور اس طرح نورِ رسالت کا یہ سفر مقامِ جسم و جسمانیت سے گذرتا ہوا مقامِ رُوح تک پہونچتا ہے کہ رُوح کا تعلق بھی عالمِ ظہور سے ہے۔ الغرض وقت آگیا کہ یہ نورِ پُرسرور، وہ نورِ ایمان، خودراحتِ جان، رحمتِ عام اور محسنِ انسانیت بن کر اللہ ربّ العزّت کے پیغام کا حرفِ آخر بنے۔ هُوَ الْأَوَّلُ وَالْآخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ کی یکتائی کو عالم میں آشکارا فرمادے۔ جو ایک طرف نبیوںؑ میں اوّل و آخر بن کر ھوالاوّل والآخر کی تفسیر ہو اور دوسری جانب شریعت میں ظاہر و باطن کی یکتائی کو نمایاں کرکے الظّاهر و الباطن کی یافت کی راہیں

کشادہ کر دے۔ اس طرح کہ وہ تمام شعاعیں جو اس نورِ مبین ؐ ہی کی تجلیات تھیں، اسی میں گم ہو کر ربّ کریم کی یکائی اور یکتائی، اسلام کی یکائی، نبوّت کی یکائی اور محبت کی یکائی اور انسانیت کی یکائی کا موجب ہوئیں۔

وقت آ گیا کہ وہؐ تشریف لائیں

جو اپنے ربّ کی شانِ ربوبیت کا مظہر اور اُس کے تمام عالموں کے لئے جس کا وہ خالق ہے رحمت بن کر آئیں، ایسی رحمت جو کبھی ختم نہ ہونے والی ہو، یہاں تک کہ اب حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کی بعثت کے بعد کوئی عالم محتاجِ نبوت نہ ہو۔

اور

انؐ کے متبعین بھی، حضور سرورِ کائنات صلّی اللہ علیہ وسلّم کے اتباع ہیں وہ جملہ خدمات انجام دیں جو انبیاءؑ کو سپرد ہوتی رہیں

صلّوا علیہ وآلہ

(الحمد للہ)

تتمہ باب اوّل و دوم

۷۸۶

لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ الْمَلِکُ الْحَقُّ الْمُبِیْنُ
مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ صَادِقُ الْوَعْدِ الْاَمِیْنُ

مہرِ تصدیق

حضرت عباسؓ ابن عبدالمطّلب کی وہ نعت
(جو انہوںؓ نے سرورِ کائنات صلّی اللہ علیہ وسلّم کی اجازت حاصل کرنے کے بعد پیش کی)
یعنی جو کچھ گذشتہ ابواب میں بیان ہوا، حضرت عباسؓ کے یہ اشعار ان پر صداقت کی مہر ثبت کر رہے ہیں
(سبحان اللہ)

شب جمعہ ۱۷ ربیع الثانی ۱۴۱۰ھ ۱۷ نومبر ۱۹۸۹ء

اس سے بڑھ کر خوش نصیبی اور کیا ہو گی کہ جب یہ الواب ختم ہوئے، جو حضرت آدم علیہ السلام سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک پر مشتمل ہیں، اور ان سے قبل تخلیقِ کائنات کی بحث تھی۔ اس وقت بیک وقت دو تحریریں سامنے آتی ہیں۔

۱۔ ایک مولانا اشرف علی تھانویؒ کی کتاب
نَشْرُ الطِّیْبِ فِیْ ذِکْرِ النَّبِیِّ الْحَبِیْبِ

۲۔ دوسرے، رسالہ سیارہ ڈائجسٹ، میں مولانا حسن مثنیٰ ندوی کا مضمون "جشنِ میلاد النبیؐ"

اور دونوں ایک حقیقت کا ذکر کرتے ہیں

"واقعہ یوں ہے کہ جب حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم غزوۂ تبوک سے مدینہ منورہ تشریف لائے تو حضرت عباسؓ نے عرض کیا "یا رسول اللہؐ مجھے اجازت دیجئے کہ میں کچھ آپؐ کی مدح کروں۔" (چونکہ حضور کی مدح خود طاعت ہے اس لئے) آپؐ نے ارشاد فرمایا کہو، اللہ تعالیٰ تمہارے منہ کو سالم رکھے (یعنی تمہارا بیان حقائق پر مبنی ہو، اس میں ہرگز کوئی غلطی نہ ہو)" اس کو مُہرِ تصدیق نہ کہوں تو کیا کہوں۔

حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے یہ اشعار آپؐ کے سامنے پڑھے:

۱۔ مِنْ قَبْلِهَا طِبْتَ فِي الظِّلَالِ وَفِي ۔۔۔ مُسْتَوْدَعٍ حَيْثُ يُخْصَفُ الْوَرَق

اس دنیا میں آنے سے پہلے آپؐ سایۂ خاص میں تھے اور اس منزلِ محفوظ میں، جہاں پتوں سے بدن ڈھانپے گئے تھے۔ (یعنی جنت میں)

(حضرت آدم علیہ السلام کے واقعہ کی طرف اشارہ ہے)

۲۔ ثُمَّ هَبَطْتَ الْبِلَادَ وَلَا بَشَرٌ ۔۔۔ أَنْتَ وَلَا مُضْغَةٌ وَلَا عَلَق

پھر آپؐ اس جنت سے اُترے اور بستیوں میں پہنچے، حالاں کہ ابھی آپؐ نہ تو بشر ہی تھے نہ مضغہ گوشت نہ لہو کی بوند۔

۳- بَلْ نُطْفَةٌ تَرْكَبُ السَّفِيْنَ وَقَدْ   اَلْجَمَ نَسْرًا وَاَهْلَهُ الْغَرَقُ

بلکہ وہ ماءِ مقطّر جو کشتیوں پر سوار تھا، اُس وقت جب پانی کی موجیں پہاڑ کی چوٹی کو چھو رہی تھیں اور باشندگانِ سرزمین ڈوب چکے تھے۔

۴- تُنْقَلُ مِنْ صَالِبٍ اِلٰی رَحِمٍ   اِذَا مَضٰی عَالَمٌ بَدَا طَبَقٌ

یہ ماءِ مقطّر صلب سے رحم کی طرف منتقل ہوتا رہا اور جب ایک عالم اسی طرح گزر چکا تب سطحِ زمین اُبھری اور وہ احوال پیدا ہوئے جن میں جماعتیں نمودار ہوئیں

۵- وَرَدْتَ نَارَ الْخَلِيْلِ مُكْتَتِمًا   فِیْ صُلْبِهٖ اَنْتَ كَيْفَ يَحْتَرِقُ

آپؐ آتشِ خلیل میں اُترے، چھپے ہوئے، اُن کے صلب میں آپؐ ہی تو تھے پھر آگ سے وہ بھلا کس طرح جلتے!

۶- حَتّٰى احْتَوٰى بَيْتُكَ الْمُهَيْمِنُ مِنْ   خِنْدِفَ عَلْيَاءَ تَحْتَهَا النُّطُقُ

یہاں تک کہ آپؐ کی حفاظت آپؐ کے اس محافظ گھرانے نے کی جو خندف جیسی بلند مرتبہ خاتون کا ہے۔ وہ بلند مرتبہ خاتون جس کا دامن قدموں میں لوٹتا تھا اس خاتون کی شان و شوکت یہ تھی۔ وہ قبیلۂ خندف تمام قبائل میں سب سے اعلیٰ و اشرف و افضل تھا۔

(خندف ام ملاکہ بن الیاس کا لقب ہے جو بہت اوپر کی پشت میں حضور اکرمؐ کی دادی تھیں)

۷

۸- فَنَحْنُ فِیْ ذٰلِكَ الضِّيَاءِ وَفِی النّـ   ـوْرِ سُبُلَ الرَّشَادِ نَخْتَرِقُ

تو اب ہم لوگ سب اُسی روشنی اور اُسی نور میں ہیں اور رشد و ہدایت و استقامت کی راہیں نکال رہے ہیں۔

یہ نعت وہ ہے جو حضور اکرمؐ کے سامنے پڑھی گئی اور "اُسد الغابہ" میں اس کا تذکرہ بھی ہے کہ اس پر حضورؐ نے کلمات تحسین فرمائے۔ حضور اکرمؐ کی طرف سے اگر اس کی تحسین ہوئی تو اس کے معنے یہ ہوئے کہ جو کچھ ان اشعار میں کہا گیا ہے ان کی بھی

اس نعت شریف کا ساتواں شعر باب سوم کے صفحۂ اول کی زینت ہے۔

تصدیق ہوگئی۔ ورنہ کسی پہلو سے بھی ان اشعار میں کوئی نقص ہوتا تو حضورؐ وہیں اس کی تصحیح فرما دیتے،، جس طرح کعبؓ ابن زبیر کے شعر میں "سُیُوف الھند" کی جگہ سُیُوف اللہ فرما دیا تھا۔

(اشعار از مولانا تھانویؒ، صفحہ ۵، ترجمہ از مولانا حسن مثنیٰ ندوی)

اور

حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے اور حضرت مولانا ذوالفقار علی الدیوبندی نے جس قصیدہ کو اپنی کتاب کا اساس بنایا ہے اُس کے ابتدائی اشعار یہ ہیں۔

۱۔ وَكُلُّ اٰیٍ اَتَی الرُّسُلُ الْكِرَامُ بِهَا ۔۔۔ فَاِنَّمَا اتَّصَلَتْ مِنْ نُوْرِهٖ بِهِمِ

اور ہر معجزہ جس کو رسولانِ کرام لائے سوائے اس کے نہیں کہ وہ معجزہ ان کو صرف بدولت حضورؐ پر نور پہنچا ہے۔

۲۔ فَاِنَّهٗ شَمْسُ فَضْلٍ هُمْ كَوَاكِبُهَا ۔۔۔ يُظْهِرْنَ اَنْوَارَهَا لِلنَّاسِ فِي الظُّلَمِ

وجہِ اتصال یہ ہے کہ آپؐ آفتابِ فضل و کمال ہیں اور انبیاء علیہم السّلام اس آفتاب کے اقمار و کواکب ہیں۔

۳۔ يَارَبِّ صَلِّ وَسَلِّمْ دَائِمًا اَبَدًا ۔۔۔ عَلٰى حَبِيْبِكَ خَيْرِ الْخَلْقِ كُلِّهِمِ

(از نشر الطّیب، مولانا اشرف علی تھانویؒ صفحہ ۱۲)

یہ دونوں شہادتیں جملہ انوارِ نبوّت و رسالت کے فیوض کے ساتھ خود نورِ مبینؐ کے وجودِ مبارکہ کے فیضان پر شاہد ہیں جن کا ذکر انبیاء علیہم السلام کے ذکر میں آیا۔

(سبحان اللہ و الحمد للہ علیٰ ذٰلك)

○

بسم اللہ بسم اللہ بسم اللہ

سُبحَانَ اللّٰہِ وَالحَمدُلِلّٰہِ وَلَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاللّٰہُ اَکبَرُ

تمہید

تصدیق بر کلامِ ربّانی
بر لسانِ شاہدِ وجود
(صلّی اللہ علیہ وسلّم)

○

جن ابواب پر اب ایک بندہ ناچیز بے مایہ داخلے کا متمنّی ہے وہاں داخلہ تو انہیںؐ کے حکم سے ملتا ہے اور مل سکتا ہے جو اس مملکتِ الہٰی کے تاجدار ہیں

وہؐ

جن کی بشارتیں انبیاء علیہم السّلام سناتے چلے آئے، وہ دعائے خلیلؑ اور نویدِ عیسیٰؑ

وہ احمدؐ (بمعنی محمودؐ) صلّی اللہ علیہ وسلّم

جن کے حالاتِ بابرکات، جن کی سیرتِ مقدسہ، جن کے احوالِ باصفا پر تیرہ سو سال سے

صحابہ کرامؓ سے لے کر اب تک اہلِ قلم اہلِ دل اہلِ چشمِ پُرنم

الفاظ سے لے کر آنسوؤں کے نذرانہ پیش کرتے چلے آرہے ہیں، اور یہ بزرگ ہستیاں

اپنے قول و فعل و حال سے

اُنؐ کے قدموں کی خاک ، اُن کے نعلین کی برکات

کے متمنّی، نثر، نظم، صلوٰۃ وسلام۔ ہر ہر طرح "لکَ روحی فدا" کے مرقع بنے ہوئے ہیں

ان منوّر قلوب کے بعد

ایک عاصی، ایک سیاہ قلب سیاہ رُو اس دربارِ اقدس میں کیسے داخل ہو

ہاں

ایک سہارا "لَا تَقْنَطُوْا مِن رَّحْمَۃِ اللّٰہ" دستگیری کر رہا ہے اور وہ بھی
کسی کی نظرِ التفات کا صدقہ ہی معلوم ہوتا ہے۔

ذرّہ ذرّہ نظر آنے لگا خورشیدِ فلک ؛ شاید آ گیا ہیں اب درِ جاناںؐ کے قریب

اب وہی دعا زبان پر ہے"........." (صلی اللہ علیہ وسلم)
۔آمین۔ یا ربّ العٰلمین۔

اور

کانوں میں سعدی علیہ الرحمہ کی رباعی گونج رہی ہے

بَلَغَ الْعُلیٰ بِکَمَالِہٖ کَشَفَ الدُّجیٰ بِجَمَالِہٖ
حَسُنَتْ جَمِیْعُ خِصَالِہٖ صَلُّوْا عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ

گویا

باب سوم۔ وہ باب ہے
جس میں کلمہ طیبہ لا الٰہ الا اللّٰہ "ایک کنزِ مخفی" کے ظہور میں آنے کا ذکر ہے
اور اس کا عنوان

"محمدؐ رسول اللّٰہ" (صلی اللہ علیہ وسلم)

جو کلمۂ طیبہ کا جزو ہی نہیں بلکہ تکملہ ہے، جہاں ھو الاوّل والآخر والظاھر والباطن کی
فہم سے قلوب کو آگاہی بخشی جا رہی ہے
صفاتِ باری تعالیٰ کے ساتھ ذاتِ باری تعالےٰ سے نقاب کشائی کی جا رہی ہے
شرط "نظر" ہے خواہ کسی کے لطف و کرم سے ہو

یا

خود اُن صلی اللہ علیہ وسلم کی توجۂ مبارکہ اس منزل کی یافت کا ذریعہ بن جائے
صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْکَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

تمہید باب سوم تا باب ہفتم

اے قلم پہلے وہ لکھ جو قلم نے لوحِ محفوظ پر لکھا، جس کو آدم علیہ السّلام سے لے کر حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کی نظروں نے پڑھا، یعنی

لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوۡلُ اللّٰہِ (صلّی اللہ علیہ وسلّم)

پھر

وہ **شہادت** دے جو کائنات بھر کی، اور کتبِ آسمانی سے لے کر قرآنِ حکیم تک میں سب سے عظیم شہادت قرار پائی

اور "شاہدِ وجود" (صلّی اللہ علیہ وسلّم)

ہی کی زبانِ مبارک سے اس شہادت کو عالم کے لئے بالعموم اور مومن کے لئے بالخصوص سرمایہ حیات لازوال قرار دیا گیا

○

شَہِدَ اللّٰہُ اَنَّہٗ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ وَالۡمَلٰٓئِکَۃُ وَاُولُوا الۡعِلۡمِ قَآئِمًۢا بِالۡقِسۡطِ ؕ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ الۡعَزِیۡزُ الۡحَکِیۡمُ ○ (سورہ آل عمران آیت ۱۸)

اللہ تعالیٰ نے (اس بات پر) گواہی دی (گویا آسمان وزمین میں منادی ہوئی) کہ کسی کی بندگی نہیں سوائے اُس کے (یعنی اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں) اور فرشتوں اور اہلِ علم نے بھی (اپنے اپنے مقام پر یہ گواہی دی کہ) اللہ ہی عدل قائم کرنے والا ہے، اُس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ زبردست حکمت والا ہے۔

پھر اسی سورہ میں "اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ" آیت ۱۹
کے جانفزا نغمہ سے رُوحِ مومن کو سرور بخشا گیا
کہ

دینِ متین "اسلام" کی روح یہی شہادت ہے اور تکمیلِ دین کا سہرا
سرتاج الانبیاء خاتم الرسل کے سر ہے
اے قلم
اس حمدِ باری تعالےٰ، ربِّ محمدؐ کے بعد
کچھ اُن آیات کو پیش کر جو کلامِ ربّانی سے حمدِ محمدؐ پہ دال ہیں
تاکہ اے قلم تیری کوتاہیاں معاف ہوں اور بارگاہِ ربّ العزت میں
یہ محبت کے پھول قبول ہوں

قَالَ اللّٰہُ تَعَالیٰ فِیْ شَانِ حَبِیْبِہٖ:
وَمَآ اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا رَحْمَۃً لِّلْعٰلَمِیْنَ ○

اے محبوبؐ (جہاں جہاں میری ربوبیّت ہے اور تمام عالم میرے ہی زیرِ نگیں ہے، میری ہی تخلیق ہے، سب میرے ہی محتاج ہیں، وہاں اب) ہم نے آپؐ کو تمام عالمین کے لئے رحمت ہی رحمت بنا کر بھیجا ہے۔ (اب کُل کائنات کو میری رحمت آپؐ ہی کے وسیلہ سے ملے گی، آپؐ ہی ہمارا پرتوِ رحمت ہیں)
(سورۂ انبیاء آیت ۱۰۷)

یہی نہیں
وَمَآ اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا کَآفَّۃً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّ نَذِیْرًا وَّلٰکِنَّ اَکْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ ○
(سورۂ سبا آیت ۲۸)

اور اے رسولؐ ہم نے آپؐ کو جملہ بنی نوعِ انسان کے لئے بھیجا ہے۔ (اُن کے نیک اعمال پر) اُن کو خوش خبری سنانے والا اور (اُن کے اعمالِ بد سے) اُن

کو ڈرانے والا) لیکن اکثر لوگ (آپؐ کی اس فطرتِ کریمانہ کو) نہیں سمجھتے۔
نکتہ یہ ہے کہ آپؐ اللہ کے رسول ہیں۔ جب تک فہم رسالت نہ ملے اللہ
کیسے ملے گا۔ آپ کی فطرتِ کریمانہ اسی راز کی ترجمان ہے۔

جو اس حقیقت سے آشنا نہیں وہ

نہیں جانتے کہ عالم انوار میں مومن کو جو روشنی لے آتی ہے وہ یہی نورِ رسالت ہے

يَآاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا ۙ (الاحزاب، ۴۵)

اے نبیؐ ہم نے آپؐ کو گواہ (بنا کر) خوشخبری سُنانے والا اور نصیحت کرنے والا بنا کر بھیجا ہے

وَّدَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا ۝ (الاحزاب، ۴۶)

اور آپ کو اللہ کے اذن سے اللہ کی طرف بُلانے والا اور ایک روشن چراغ (بنا کر)
مبعوث کیا ہے۔ آپ نورٌ علی نور ہیں۔ صلّی اللہ علیہ وسلّم)
عالم کو اب تک جو روشنی دیگر انبیاءؑ سے آپؐ سے قبل ملتی رہی
وہ بھی آپؐ ہی کے انوار کا پرتو تھا۔ اور آپؐ کے بعد آپؐ کے متّبعین
آپؐ کے امتیوں کے وسیلہ سے جو نور وانوار و ہدایات کی بارش ہوگی
وہ بھی آپؐ ہی کا فیضانِ رسالت ہوگا۔

مؤمنو! مسلمانو! گُنہ گارو! سُنو یہ نبی صلّی اللہ علیہ وسلّم کون ہیں۔ اللہ کی محبت اور
شفقت کا پیغام، خُلقِ عظیم کا پیکر، امت کے لئے سر تا پا رحمت، مسلمانوں کی تکلیف
آپؐ پر بار، اُن کے لئے اللہ سے خیر کے لئے ہر وقت دست بدعا، شفقت و
رحمتِ الٰہی کا پرتو،

رؤفٌ و رحیمٌ ہیں

لَقَدْ جَآءَکُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِکُمْ عَزِیْزٌ عَلَیْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِیْصٌ عَلَیْکُمْ بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ ○ (سورہ توبہ آیت ۱۲۸)

(اے مسلمانو!) بے شک تمہارے پاس تم ہی میں سے (اشرف ترین نفوس میں سے) ایک رسول آئے ہیں (تم اُن کے اخلاق، اطوار، دیانت، امانت سے واقف ہو، لیکن اس عبدہٗ ورسولہٗ کی قلبی کیفیت بھی جانتے ہو) جو تکلیف تم کو پہونچتی ہے (وہ تم سے زیادہ) اُن پر (اُن کے قلب اطہر پر) گراں گذرتی ہے (اور) تمہارے لئے (تو وہ رحمت وخیر کی) فراوانی کے طالب رہتے ہیں (اور) مؤمنوں کے حق میں تو نہایت شفیق ومہربان ہیں (یعنی آپؐ کی رسالت پر ایمان آپؐ پر نظر رکھنے والوں کے لئے رؤف رحیم ہیں، فیضانِ معرفت سے اُن کے قلوب منور سے منور تر کرتے جاتے ہیں) (فیوض القرآن)

اور

حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کے اخلاق کی بلندی کا تو یہ عالم ہے

وَاِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ ○

(اور یقیناً آپ کا اخلاق بہت عظیم الشان ہے)

سورہ القلم آیت ۴

یہی وہ اخلاق ہے جس کے متعلق حضرت عائشہ صدیقہؓ کی گواہی
خُلُقُهُ الْقُرْاٰن حضورؐ کے اخلاق کی ایک جامع تعریف ہے۔

اللہ ربّ العزت

نے تمام کائنات اور تمام انعامات سے انسان کو نوازنے کے بعد بھی کبھی انسانیت پر اپنا احسان نہیں جتایا۔ لیکن آپ صلّی اللہ علیہ وسلّم کی بعثت کے احسان سے مؤمنین کو نوازتا ہے اور دعائے ابراہیم کو اس انداز سے قبولیت کا شرف بخشتا ہے جو تصور سے بالاتر ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کی دعا تھی کہ علم وحکمت کی عطا

کے بعد تزکیہ کی منزل سے سرفرازی ہو، لیکن قبولیتِ دعا کا انداز یہ ہے:
لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۚ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ○ سورہ آل عمران آیت ۱۶۴

بے شک اللہ تعالیٰ نے ایمان والوں پر بڑا (ہی) احسان فرمایا کہ اُنہیں میں سے (اُنہیں کی شکل وصورت کا) ایک رسولؐ بھیجا جو اُن کو اُس کی آیتیں پڑھ پڑھ کر سُناتا ہے (پڑھتا ہے پڑھاتا ہے، سمجھتا ہے سمجھاتا ہے عمل کرتا ہے) اور اُن کو پاک کرتا ہے (عقل ونظر کی علم وعمل کی پاکی عطا فرماتا ہے) اور اُن کو کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے اور (رسولؐ کے آنے سے) پہلے یہ لوگ کھُلی گمراہی میں تھے (نہ صحیح علم تھا، نہ صحیح عمل، ایک ظلمت میں گھرے ہوئے تھے۔ اب اس رسولؐ برحق، اِس احسانِ مجسّم کی اتباع ومحبت ہی اللہ کا احسان ماننا ہے۔)

اور کوئی اِس احسان کا کیا شکر ادا کر سکتا ہے کہ آںؐ کا امتی بنایا جن ؐ پہ اللہ تعالےٰ خود درود وسلام بھیجتا ہے۔ ہاں، یہ بھی اُس کا فضل وکرم ہے کہ مومن کو ادائگیٔ احسان کا ایک مختصر جامع اور پُر فیض انداز بتا دیا کہ وہ بھی اللہ کے اس عملِ نورانی میں شریک ہو جائیں۔ اور آپؐ کے اسوۂ حسنہ پر عمل پیرا ہو کر عملاً درود بن جائیں۔

اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ ؕ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ○ (الاحزاب آیت ۵۶)

اللہ اور اُس کے فرشتے رسولؐ پر درود بھیجتے ہیں۔ اے ایمان والو تم بھی اُن پر درود بھیجا کرو اور خوب سلام بھیجا کرو (یعنی عبادت کے طور پر سلام بھیجو، دل سے ہو، لگن سے ہو)۔

اَللّٰھُمَّ

صَلِّ وَسَلِّمْ عَلٰی سَیِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدِنِ

النَّبِیِّ الرَّحْمَۃِ

اَوَّلًا وَّ اٰخِرًا ظَاھِرًا وَّ بَاطِنًا وَّ عَلٰی اٰلِہٖ وَ اَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ

اِلٰی یَوْمِ الدِّیْنِ

اے قلم! حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم

کی ذاتِ مبارکہ کے متعلق تیری زبان سے قرطاسِ صفحہ پر جو بھی نکلے وہ درود ہی بن جائے

جو تیری محبت کا آئینہ دار ہو

بے شک

وَمَا تَوْفِیْقِیْ اِلَّا بِاللّٰہِ

و

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی

حَبِیْبِکَ سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ نُوْرِ الْاَنْوَارِ سِرِّ الْاَسْرَارِ مَھْبِطِ الْوَحْیِ

وَالْاَسْرَارِ وَالْاَنْوَارِ وَاٰلِہٖ وَبَارِکْ وَسَلِّمْ

(الحمد للہ علیٰ ذالک)

ؤ

تمہید باب سوم

آمد آمد ہے شہِ لولاکؐ کی

سلام بحضور سیّد المرسلین صلّی اللہ علیہ وسلّم

سلامٌ علیک اے نبیِّ مکرّم — مکرّم ترا ز آدم و نسلِ آدم
سلامٌ علیک اے ز آبائے علوی — بصورت مؤخّر بمعنیٰ مقدّم
سلامٌ علیک ز آبائے فطرت — طفیلِ وجودِ تو ایجادِ عالم
سلامٌ علیک اے ز اسمائے حسنیٰ — جمالِ تو آئینۂ اسمِ اعظم
سلامٌ علیک اے بملکِ رسالت — ترا خاتم المرسلین نقشِ خاتم
سلامٌ علیک اے ثنا سا بصد سر — کہ روح الامین در یکے نیست محرم
ہزاراں تحیّت زِ حق بادِ فائض — بروحِ تو و آل و صحبِ تو ہر دم

(عبدالرحمٰن جامیؒ)

باب سوم

ظہورِ قدسی صلّی اللہ علیہ وسلّم سے قبلِ نبوّت تک

میلادِ مُبارک

وَاَنْتَ لَمَّا وُلِدْتَ اَشْرَقَتِ الْاَ
رْضُ وَضَاءَتْ بِنُوْرِکَ الْاُفُقُ

(اور آپ جب پیدا ہوئے تو چمک اُٹھی زمین اور روشن ہو گئے
آفاقِ سماوی آپؐ کے نور سے)
حضرت عباس رضی اللہ عنہ بن عبدالمطلب

○

فصلِ اوّل
۱۔ ظہورِ قدسی دورِ تعارف (معجزات)
۲۔ دورِ کفالت و تربیتِ ربّانی

فصلِ دوم
ازدواجی زندگی اور ایک نئے باب کا آغاز
انوار و تجلیات۔

بِسْمِ اللّٰہِ

وَصَلَّی اللّٰہُ عَلَی النَّبِیِّ الْاُمِّیِّ

وَاَحْسَنُ مِنْکَ لَمْ تَرَ قَطُّ عَیْنِیْ

اور آپؐ سے بڑھ کر تو میری آنکھ نے کبھی دیکھا ہی نہیں

وَاَجْمَلُ مِنْکَ لَمْ تَلِدِ النِّسَاءُ

اور آپؐ سے زیادہ جمیل عورتوں نے جنا ہی نہیں

خُلِقْتَ مُبَرَّاً مِّنْ کُلِّ عَیْبٍ

آپ تو ہر عیب سے مبرّا پیدا کیے گئے (اس طرح)

کَأَنَّکَ قَدْ خُلِقْتَ کَمَا تَشَآءُ

کہ گویا جس طرح آپؐ چاہتے ہیں اس طرح آپؐ کو پیدا کیا گیا

(حضرت حسّان رضی اللہ عنہ)

نورِ مبین پیکرِ بشریت میں

صلّی اللہ علیہ وسلّم

مصطفےٰ جانِ رحمت پہ لاکھوں سلام
شمعِ بزمِ ہدایت پہ لاکھوں سلام
(حضرت شاہ احمد رضا خاںؒ)

لو! وہ نورِ نبوّت جس کے فیضانِ کرم سے آسمانِ نبوّت پر ایک لاکھ چالیس ہزار انجم نمودار ہوئے،
اب ظاہر ہو رہا ہے اور صبحِ صادق کے انوار سے عالم منوّر ہونے کو ہے۔
اور اب یہی نورِ مبینؐ
شانِ نبوّت کی آخری تجلّی، ربِّ کریم کی رحمت کا پیکرِ رحمت بن کر دلوں کو مژدۂ بہار سنانے کو ہے
حضرت ابراہیم علیہ السّلام
کے بعد ایک طرف اس کا فیضانِ نبوّت کچھ اس طرح جاری وساری رہا کہ حضرت اسحٰق علیہ السّلام اور آپؑ کے بعد جس قدر انبیاءؑ بنی اسرائیل میں آئے وہؑ سب اس نورِ مبینؐ کے صفات کا ظہور تھے۔ آپؐ ہی کی انابت، استقامت، حلم، علم، جمال، کمال، صبر، شکوہ، زہد اور علوّ سے مرتبت کے پرتوِ نبوّت تھے۔
اور دوسری طرف یہ نورِ مبین خود حضرت اسمٰعیلؑ ذبیح اللہ سے حضرت عبداللہ ذبیح اللہ تک اپنا صُلبی سفر طے کرتا رہا۔ ابھی آپؐ شکمِ مادر ہی میں

تھے کہ آپؐ کے والدِ ماجد حضرت عبد اللہؓ کا انتقال ہوا کہ نبی آخر الزماںؐ کی یتیمی کی وہ پیش گوئی پوری ثابت ہو جو کتب سابقہ میں بیان کی گئی۔

یہ نورِ مجسّم، یہ درِ یتیمؐ ۱۲ ربیع الاوّل کو عام فیل کے ۴۰ یا ۵۵ دن بعد دوشنبہ کے دن صبحِ صادق کے وقت حضرت آمنہ کی آغوشِ مبارک میں عالم کے لئے رحمت بن کر جلوہ گر ہوا۔ صَلَّی اللّٰہُ عَلَی النَّبِیِّ الْاُمِّیِّ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَسَلَّمْ

آپ صلّی اللہ علیہ وسلّم کی تاریخِ پیدائش بعض نے ۹، بعض نے ۲، بعض نے ۱۷ ربیع الاوّل اپنے اپنے حساب سے نکالی ہے، لیکن اس پر سب کا اتفاق ہے کہ دن دوشنبہ کا تھا اور وقت صبحِ صادق کا۔ میلادِ مبارک آج بھی خواص و عوام میں ۱۲ ربیع الاوّل کو منایا جاتا ہے۔ اس حساب سے یہ ۲۰ اگست ۵۷۰ء ہوتی ہے۔ اور اہلِ عرب، اس حکومت سے قبل، اسی تاریخ کو حضورؐ کے دولت کدہ پر حاضری دیتے تھے اور نذرانۂ صلوٰۃ وسلام پیش کرتے تھے۔ مصر میں اسی روز بڑی شان سے جشنِ میلاد النبیؐ منایا جاتا، جس کا ذکر حضرت شیخ محمد رضا، سابق مدیر مکتبہ جامعہ قاہرہ، نے اپنی کتاب "محمدؐ رسول اللہ" میں تفصیل سے کیا ہے۔

ظہورِ قدسی اس طرح ہوتا ہے

کہ حضرت بی بی آمنہ فرماتی ہیں کہ جس وقت "محمد (صلّی اللہ علیہ وسلّم) متولّد ہوئے اُس وقت میں نے دیکھا کہ آپؐ سجدے میں ہیں اور دونوں انگشتہائے مسبحہ آسمان کی جانب اُٹھائے ہوئے ہیں اور تضرّع کے مانند گریہ کناں ہیں"

(مدارجِ نبوّت جلد دوم صفحہ ۲۶)

سیرت نگاروں نے تفصیل سے حضرت ہاجرہ کے بطن سے حضرت اسمٰعیل علیہ السّلام کی پیدائش کا بیان کیا ہے اور حضرت ابراہیم علیہ السّلام و حضرت ہاجرہ اور اُن کے پیارے بچّے کے عرب کی بے آب و گیاہ زمین

میں قیام کے واقعات لکھے ہیں۔ ساتھ ہی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے شجرۂ مبارکہ میں اس بات کو واضح کیا ہے کہ "آپؐ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی نسل سے ہیں، اس لئے کہ قریش بغیر کسی اختلافِ رائے کے عدنانی ہیں، اور عدنان کے اسمٰعیلی ہونے میں دو رائے کی گنجائش ہی نہیں۔"

(قصص القرآن جلد چہارم صفحہ ۲۵۵)

علماءِ انساب نے نسب نامہ کی تفصیل اس طرح بیان کی ہے:

محمدؐ بن عبداللہ بن عبدالمطلب بن ہاشم بن عبد مناف بن قصیٰ بن کلاب بن مرہ بن کعب بن لوی بن غالب بن فہر بن مالک بن نضر بن کنانہ بن خزیمہ بن مدرکہ بن الیاس بن مضر بن نزار بن معد بن عدنان۔

(قصص القرآن صفحہ ۲۵۵)

چنانچہ

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "اللہ تعالیٰ نے اسمٰعیل علیہ السلام کی نسل میں سے کنانہ کو ممتاز بنایا۔ اور کنانہ میں سے قریش کو عزت و عظمت بخشی اور قریش میں سے بنی ہاشم کو امتیاز عطا فرمایا اور بنی ہاشم میں سے مجھ کو منتخب فرمایا۔" اور ترمذی کی روایت میں ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں اسمٰعیل علیہ السلام کو منتخب فرمایا۔

(نشر طیب حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رح صفحہ ۱۹)

نیز

"مشکوٰۃ میں ترمذی سے حضرت عباسؓ سے مروی ہے کہ ارشاد فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ میں محمدؐ ہوں عبداللہ کا بیٹا ہوں اور عبدالمطلب کا پوتا۔ اللہ نے مجھے اور مخلوق کو پیدا کیا تو مجھے اچھے گروہ میں بنایا یعنی انسان بنایا۔ پھر انسان میں دو فرقے پیدا کئے عرب و عجم اور مجھے اچھے فرقے میں یعنی

عرب میں بنایا۔ پھر عرب میں کئی قبیلے بنائے اور مجھے سب سے اچھے قبیلے میں پیدا کیا یعنی قریش میں۔ پھر قریش میں کئی خاندان بنائے اور مجھ کو سب سے اچھے خاندان میں پیدا کیا یعنی بنی ہاشم میں۔ پس میں ذاتی طور پر سب سے اچھا ہوں اور خاندان میں بھی سب سے اچھا ہوں ۔"

یہ بھی فرمایا جس کا خلاصہ یہ ہے:۔

"کہ پاک نفوس سے پاک نفوس میں منتقل ہوتا رہا، اُن تمام برائیوں سے جو زمانۂ جاہلیت میں جاری تھیں میرے آباء و اُمہات اُن سے منزہ ہیں ۔"

طبرانی میں حضرت علیؑ سے مروی ہے

(نشر طیب، مولانا اشرف علی تھانویؒ صفحہ ۱۸)

و

غور طلب بات یہ ہے

کہ آفرینشِ عالم سے لے کر ظہورِ قدسی تک جو کچھ ہوا وہ اللہ رب العزت ہی کی قدرتِ کمالیہ کا مظہر تھا۔ اس نور سے عالم کو وجود میں لایا گیا۔ اس سے تخلیقِ آدمؑ اور مراتبِ انسانیت کی منزلیں طے ہوئیں۔ اس نور سے اللہ جل شانہٗ کے صفاتِ جلال وجمال کا اظہار ہوتا رہا۔ اور اس نور کی حفاظت پشتِ آدمؑ سے پیشانیٔ عبداللہ تک اس شان سے ہوتی رہی کہ زمانہ کتنا ہی بُرا کیوں نہ ہوا لیکن اس سے عظیم مرتبت شجرۂ طیبہ کی کوئی شاخ کوئی ڈالی گرد آلود نہ ہوئی۔ سب شرک کی نجاست سے پاک تھے۔ سب دینِ حق، دینِ ابراہیمؑ کی خوشبوؤں سے مہکتے رہے۔

تو کیا یہ ضروری نہ تھا

کہ اِس نورِ کامل کے بشری پیکر میں آنے کے وقت بھی وہ حقائق عام انسانوں کے سامنے لائے جائیں جو اس نورِ مبینؐ کی عظمت و رفعتِ شان کا سکّہ لوگوں

کے دلوں پر بٹھا دیں۔ ان میں وہ واقعات شامل ہیں جن کو محتاط سے محتاط علماء سے لے کر مستند سیرت نگاروں نے کشادہ قلبی سے نقل فرمایا ہے۔

ان میں وہ واقعات بھی آتے ہیں جن کا تعلق حضرت آمنہ بی بی کے بارِ امانت اُٹھانے کی مدت سے ہے۔

وہ واقعات بھی ہیں جن میں عثمانؓ بن ابی العاص اپنی والدہ سے روایت کرتے ہیں کہ ولادتِ شریف کے وقت میں نے دیکھا کہ ایک نور ظاہر ہوا جس نے گھر اور تمام در و دیوار کو نورانی کر دیا۔ میں نے دیکھا کہ آسمان کے ستارے زمین کے نزدیک آ گئے ہیں۔ میں نے خیال کیا کہ شاید وہ مجھ پر گر پڑیں گے، تمام گھر پُر نور ہو گیا۔

احادیثِ صحیحہ میں یوں بھی آتا ہے کہ سیدہ آمنہ فرماتی ہیں کہ میں نے شبِ ولادت میں دیکھا کہ ایک نور ظاہر ہوا جس سے شام کے محلات روشن ہو گئے اور میں نے اُن کو دیکھا۔

پھر ان نور و انوار کا ذکر متعدد واقعہ نگاروں نے اپنے اپنے انداز سے کیا ہے۔

اور جب ولادتِ مبارکہ ہوئی

"تو آپؐ پاک صاف پیدا ہوئے، ہر قسم کی آلائش سے پاک۔ آپؐ کا چہرۂ انور چودھویں رات کے چاند کی طرح چمک رہا تھا اور آپؐ کے جسمِ اطہر سے مُشک و عنبر کی لپٹیں آ رہی تھیں۔" اہلِ سیر کا مذہب ہے کہ حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم ختنہ شدہ و ناف بریدہ پیدا ہوئے۔

یہی نہیں بلکہ اہلِ کتاب پر بھی

آپ کی آمد سے ایک تہلکا مچ گیا۔ ایک یہودی جس نے حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کے دونوں شانوں کے درمیان ایک علامت دیکھی تو بے ہوش ہو کر زمین پر گر پڑا اور کہنے لگا خدا کی قسم بنی اسرائیل سے نبوت جاتی رہی۔

(اقتباسات از مدارج نبوت صفحہ ۲۶ تا ۶۳ جلد دوم)

اگر ہم ٹھنڈے دِل سے غور کریں

تو وہ سب واقعات بھی جو واقعہ نگاروں نے بیان کئے ہیں، ممکن ہے کہ اُن میں بعض واقعات حرفاً حرفاً اسی طرح ظہور پذیر نہ ہوئے ہوں، لیکن کیا تیرہ چودہ سو سال بعد تک ان کا اس طرح باقی رہنا خود اس بات کا ثبوت نہیں کہ اِن واقعات کا منشاٗ واقعات کی حرفاً حرفاً حفاظت نہیں بلکہ ان کے ذریعہ ربِّ جلیل کو اپنے حبیب ؐ کی شان و شوکت، آپؐ کی عظمت و رفعت کو نمایاں کرنا اور رہتی دنیا تک باقی رکھنا تھا۔ یہ بھی وضاحت منظور تھی کہ وہ نبیؐ برحق جو اللہ ربّ العزّت کا آخری نبی ہے، اس نبیؐ سے اُس ؑ کے ربّ کا واسطہ کس درجہ عظیم، کتنا مستحکم ہے اور اُن صلّی اللہ علیہ وسلّم سے اللہ کی محبت کتنی لامتناہی کتنی لاثانی ہے۔

یہ بھی آشکارا کرنا تھا کہ اس عالمِ رنگ و بُو میں "جو نبیؐ برحق آرہا ہے وہ باقی رہنے کے لئے، اور نہ جانے کے لئے آرہا ہے"۔ جسؐ کی اُمّت کے بزرگ علماءِ راسخین اور اولیاءِ کرام اسؐ کی نمائندگی تاقیامت کرتے رہیں گے اور وہؐ ہر آن اُن کا ہادی ور ہبر رہے گا۔

یہ بات بھی واضح کرنا تھی کہ آپؐ کی حیاتِ مبارکہ کا ہر لمحہ اور ہر فعل اسوۂ حسنہ میں داخل ہے۔ اور آپ کی حیاتِ مبارکہ ہی نہیں بلکہ آپؐ کی ذاتِ مقدّسہ کا ہر پہلو خواہ اس کا تعلق عمر شریف کے کسی بھی حصّے سے ہو، عالم کے لئے "لَکُمۡ فِی رَسُولِ اللّٰہِ اُسۡوَۃٌ حَسَنَۃٌ" کا ترجمان رہے گا! اور آپؐ کی ذاتِ مقدّسہ کی محبت ہی عینِ ایمان قرار پائے گی۔

اگر

جنّت سجائی گئی، اگر حوریں زمین پر اُتاری گئیں، اگر ہر ہر شجر حجر سے لے کر خود

کعبہ شریف سجدۂ تعظیم بجالایا، تو ایک طرف یہ خود ان اشیاء کا اپنے محسن کے لئے جذبۂ شکر گذاری کا اظہار تھا، تو دوسری طرف یہ بھی ظاہر کر دیا تھا کہ اب جو تشریف لائے ہیں وہ نبیؐ ایسے برحق ہیں جن سے خود زمانہ شرف و بزرگی حاصل کرے گا اور ہر شئے کی شرافت و بزرگی کا تعلق صرف اور صرف اس بات پر ہو گا کہ اُس کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کس قدر نسبت یا کس قدر استحکامِ نسبت حاصل ہے، اور کون کس قدر آپؐ کا گرویدہ و شیدائی ہے۔

تو

کیا تعجب ہے اور کیوں تعجب کیا جائے کہ اگر آپؐ کو آغوشِ حضرت آمنہ میں چھینک آئے تو فرشتے یَرْحَمُكَ اللّٰہ کہیں، اور اِس پر کیوں حیرت ہو کہ آپؐ کی ولادت سے قبل ہی حضرت آمنہ خواب میں دیکھیں کہ جو بچّہ پیدا ہو گا تم اُس کا نام محمدؐ رکھنا۔ دوشنبہ کی فضیلت پر کیوں حیرت ہو کہ اِس دن کا تعلق اُنؐ کی تشریف آوری کے سبب انسانیت کے لئے قائم ہوا۔ تعجب کیوں اگر ابولہب کو صرف اِس بات پہ کہ اُس نے حضورؐ کی ولادتِ مبارکہ کی خوشی میں ایک لونڈی آزاد کر دی تو دوشنبہ کو اُس پر جہنم کا عذاب ہلکا کر دیا جائے گا۔

تعجّب کی کوئی بات

اس لئے بھی نہیں کہ جس نورِ کامل کا ظہور ہو رہا ہے وہ منشاءِ تخلیقِ کائنات ہے۔ یہی نہیں بلکہ وہؐ برگزیدہ اللہ کے حبیبؐ ہیں، وہؐ صاحبِ کتاب ہیں جن پر نازل ہونے والی کتاب ہی تمام گذشتہ انبیاءؑ اور تعلیماتِ اسلامی کی مصدّقہ اور رہتی دنیا تک جس کی حفاظت کا وعدہ خود ربّ کریم نے اپنے ذمّہ لیا ہے۔

اگر

شبِ قدر میں پاک و بزرگ آنکھیں کائنات کی ہر شئے کو اللہ ربّ العزت

کے سامنے سربسجود ہوتے دیکھتی ہیں اور اس لَیلَۃُ القدر کی یادیں ہر ماہِ رمضان میں اِسی شان سے منائی جاتی ہیں۔

تو پھر

اگر اس ہستیٔ مبارکہ کے لئے جو مظہرِ حق ہے، کائنات کی ہر شئے اپنے اپنے انداز سے تعظیم بجالائے اور خود خانۂ کعبہ تعظیمی سجدے سے استقبال کرے تو تعجّب کیوں؟

اور پھر اگر

عوام اس دِن خوشیاں مناکر اپنی مسرّتوں کا اظہار کریں، آپؐ کی ولادتِ باسعادت کا ذکر کر کے ایک دوسرے کو مُبارک باد دیں، تو اس سے بڑھ کر عید اور کیا ہوگی۔

ایامِ رضاعت

کے دیگر واقعات جن میں سب سے زیادہ اہم حلیمہ سعدیہ کا دودھ پلانے اور ابتدائی پرورش کا ہے، حضورِ انورؐ کی عاداتِ شریفہ، فطرتِ طیّبہ، انوارِ خُلق کے کتنے نمونے صرف اسی دَور سے وابستہ ہیں۔ اور ربِّ کریم کی محبّت ولطف وکرم کے کتنے حقائق اس دَور سے متعلق ہیں۔ یہ نہ صرف ایمان افروز ہیں بلکہ دلوں کو موہ لینے اور حضور سرورِ کائنات صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم سے قلبی لگاؤ پیدا کر دینے کے لئے کافی ہیں۔ یہاں چند واقعات کا ذکر تبرّکاً حصولِ فیض کے لئے کرنا رُوح کی بالیدگی کا موجب ہوگا۔

یہ دَور، دَورِ تعارف ہے

اللّٰہ ربّ العزّت اپنے نبیِ برحقؐ کی فطرت کو خود آشکارا فرمارہا ہے۔ اور معجزانہ واقعات کے ذریعہ فطرتِ محمدیؐ کو واضح کیا گیا ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ

دیکھو آپؐ کی عدل گستری، آپؐ کی محبت، آپؐ کا پیامِ امن اور آپؐ کی تمام کی تمام صفاتِ خیر و کرم خود آپؐ کی فطرتِ مبارکہ، ذاتِ مقدسہ کے کس قدر جزو بنے ہوئے ہیں۔ ایمن تو لعد میں کہلائیں گے۔ ایمنؓ کا اندازِ شیر خواری یہ ہے کہ بی بی حلیمہ کی گود میں ہیں، آپ کو دودھ پلا رہی ہیں، تو حضورؐ صرف ایک جانب کا دودھ نوش فرماتے ہیں اور دوسری جانب کا اپنے رضاعی بھائی کے لئے چھوڑ دیتے ہیں۔ یہ مظہرِ عدل اِس لئے تھا کہ حضورؐ کی فطرت کے اہم جزو امانت و محبت جو آیتِ کریمہ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰہِ میں ہے اس "فِیْ" کے معنی آشکارا ہوتے رہیں، اور ہر دَور میں ایک نئی شان، ایک نئے انداز سے۔

عرب کے دستور کے مطابق بی بی حلیمہ سعدیہ، شدید قحط کے زمانہ میں بے سروسامانی کے حالت میں اپنے بچّہ اور شوہر کے ساتھ مکّہ مکرّمہ پہونچتی ہیں، کہ کسی بچّہ کو لے کر اُس کی پرورش کے فرائض انجام دیں۔ اُن کے قبیلے کی عورتیں دولت مندوں کے بچّوں کو لے کر خوش خوش واپس ہونے لگیں۔ اور بی بی حلیمہ نے بھی مناسب سمجھا کہ خالی ہاتھ لوٹنے سے تو بہتر ہے کہ چلو اس ایک یتیم بچّہ ہی کو لے لو۔

اُنہیں کیا معلوم تھا کہ یہ بچّہ کون ہے۔ کیا ہے۔ شہنشاہِ لولاک، شاہِ کونین۔ یہ تعارف اُن کا کیسے ہو؟ کون عام ذہن کے لوگوں پر آپؐ کی قدر و منزلت ظاہر فرماتے سوائے آپؐ کے ربّ جَلَّ شانہٗ کے۔

قبیلے واپس جا رہے ہیں۔ حلیمہ سعدیہ کے ساتھ اُن کے شوہر اور بچّہ کے ساتھ ایک ہستیٔ مبارکہ اور بھی ہے۔ گو سواری اب بھی وہی لاغر دراز گوش، وہی بے دودھ کی دُبلی پژمردہ اُونٹنی جس کو خود چلنا بھی دُوبھر تھا، لیکن واپسی پر فضا ہی بدل جاتی ہے۔ اُونٹنی کے تھن دودھ سے بھرے ہوئے تھے۔ دراز گوش جست لگاتا ہوا، گردن فخر سے تانے ہوئے چلنے لگا۔ ایک طرف بی بی حلیمہ

کا دل جذبۂ شکر گذاری سے معمور تھا، دوسری طرف دوسری عورتوں کو اس لاغر سواری کی تیز رفتاری پر تعجّب تھا۔ وہ بار بار پوچھتیں، اے بنتِ ذویب، کیا یہ وہی جانور ہے جس پر تم آئی تھیں، وہ تو سیدھا چل ہی نہ سکتا تھا۔ آپ کا جواب یہی ہوتا یہ سب مبارک بچّہ کی برکت ہے، اس کی تو بڑی شان ہے۔ تذکرہ نگاروں نے شہادت دی کہ اُس وقت خود دراز گوش کو یہ کہتے سُنا گیا۔

"اے سعد کی عورتو! تم پر تعجّب ہے اور تم نہیں جانتیں کہ میری پُشت پر کون ہے؟ میری پُشت پر سیّد المرسلین، خیر الاوّلین و الآخرین، حبیبِ ربّ العلمین ہیں، رحمۃٌ للعلمین ہیں۔"

کیا یہ آپؐ ہی کی رحمۃٌ للعلمینی کا کرشمہ نہ تھا کہ حلیمہ بی بی کو اس صلہ میں کہ آپؐ کو دودھ پلایا قدرت نے کیا کچھ نہیں دیا۔ اُن کے قحط زدہ علاقہ میں بھی یہ خیر و برکت ہوئی کہ اُن کے مویشی چراگاہوں سے دودھ بھرے تھنوں سے واپس آنے لگے۔" اور اللہ ربّ العزّت کی طرف سے ہر طرح کی خوش حالی اور فارغ البالی کا فیضان ہوتا رہا۔"

حقیقت یہ ہے کہ آپؐ کے ہر لمحہ کی نگہداشت آپؐ کا ربّ فرما رہا تھا اور یہ سب اُس کی قدرت و حکمت کا ظہور تھا اور اس میں آپ صلّی اللہ علیہ وسلّم کی عظمت کی شہادتیں عوام کے لئے آشکارا تھیں۔

میرے عزیزو! اگر تم درخت کے اَنَا اللّٰہ کہنے پر اللہ کی قدرت پر ایمان لائے تو آج پھر اُس دراز گوش کی قدرتِ تکلّم اور شہادت پر کیوں تعجب کر رہے ہو۔ کیا خود اُس میں یہ طاقت تھی کہ وہ لاغر سے تندرست ہو جاتی، بے زبان سے بازبان اور گویا بن جاتی؟ ہرگز نہیں۔ یہ قدرت تو اُس ربِّ کریم اُس خالقِ کائنات کی اور اُس العزیز الحکیم کی تھی جو در و دیوار سے، شجر و حجر سے اور محرومِ نطق حیوانوں سے یہ شہادت دلوا رہی تھی تاکہ اہلِ کتاب کو اپنی کتابوں

کی بشارتیں یاد آئیں اور کفار کے دل و دماغ ہدایت کی راہ پائیں ۔ سبب اسباب کے پابند انسانوں کے لئے بہ اندازِ شہادت ربّ العزت کی قدرت و حکمتِ کاملہ کی جانب سے اپنے عبدؐ اپنے رسولؐ کے لئے ہے ۔ اور کس معجزانہ انداز سے ہے ۔

یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ دورِ طفلی وہ دَور ہے جب اقوال، افعال و اعمال سے زیادہ صرف آپؐ کے احوال ہی سے آپؐ کے فطری رجحانات اور آپؐ کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے خصوصی تعلق کو ظاہر کیا جا سکتا ہے ۔ یہ سب لفظ "فِیْ" رَسُوْلِ اللّٰہِ کی ترجمانی ہو رہی ہے جس سے ہم غافل ہیں ۔

وقت آئے گا جب سرکارؐ کے اقوال و افعال ہی تفسیرِ قرآن ہوں گے، اور قرآن آپ کے اخلاق کا شاہد ہوگا ۔ لیکن ابھی تو وہ دَور ہے کہ یہ نورِ مبین صلی اللہ علیہ وسلم اپنی نورانی شعاعوں سے قلوب کو متاثر کر رہا ہے جس کی جھلکیاں ایّامِ رضاعت میں نظر آ رہی ہیں، کہیں اندازِ صبر سے، کہیں اندازِ شکر سے، کہیں شکنِ جبیں سے، کہیں تبسّمِ دل آفریں سے ۔

ؤ

یقیناً اس ذاتِ مقدسہؐ پر انوارِ الٰہی کی بارش ہوتی رہے گی ۔ یقیناً اُنؐ پر رحمتِ الٰہی سایہ فگن رہے گی ۔ لیکن یہ دَور تو وہ ہوگا کہ جو کچھ قلبِ رسولؐ کو ملے گا اُس کی اطلاع بھی کسی کو نہ ہو گی جب تک آپؐ خود ہی نہ بتائیں گے ۔ لیکن یہ دورِ طفلی تو وہ ہے جب اللہ تعالیٰ خود آپؐ کی ذاتِ مبارکہ کے انوار ظاہر فرما رہا ہے، تاکہ یہ ایّامِ طفلی بھی آپ کی معجزانہ زندگی پر شاہد رہیں اور دیکھنے والی آنکھیں آپؐ کی صداقت و امانت کو جھٹلا نہ سکیں، سوائے اس حال کے کہ اُن کے قلوب مُردہ ہو چکے ہوں ۔

ایک بات اور بھی یاد رکھنے کے لائق ہے کہ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ مبارکہ تمام عالم کے لئے اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے سراجاً منیراً بنا کر بھیجی گئی، اور آپؐ کی صفات کا کچھ اندازہ آپؐ کے اُن ناموں سے بھی کیا جا سکتا ہے جن سے قرآنِ حکیم میں آپؐ کو مخاطب کیا گیا۔ ان کا ذکر آگے آئے گا۔ یہاں تو ابھی کُفر کی تاریکیاں ہیں، اور یہ صبحِ روشن کی پہلی کرن نمودار ہو رہی ہے۔ جو لوگ اِس نورِ مبینؐ کے مخاطَب ہوں گے اُن میں کافر بھی ہوں گے، اہلِ کتاب بھی، کاہن بھی اور کچھ وہ لوگ بھی ہوں گے جو دل سے حقیقت کے جُویا اور جن کے قلوب اس نویدِ صُبح کے منتظر ہوں گے۔

کیا عجب ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان نیک رُوحوں پر عالمِ مثال کے کچھ حقائق کھول دیئے ہوں کہ جو وہ دیکھتے تھے، دوسرے نہ دیکھتے تھے اور یہ بھی ممکن ہے کہ بعض واقعات کو عوام پر منکشف فرما کر ہی ان کو اہلِ کتاب کا گواہ بنانا منشائے قدرتِ الٰہی ہو تاکہ اہلِ کتاب اپنی کتاب کی روشنی میں، کاہن اپنے محدود علم کی روشنی میں اور کُفّار حیرت زدہ ہو کر ذہنی طور پر اُن حقائق سے متأثر ہوں، اُنہیں دیکھیں اور سمجھیں کہ وہ جو کچھ دیکھ رہے ہیں حق ہے، جادو نہیں۔ ان میں بشارتوں کا بھی انداز تھا جو وقت آنے پر ظہور میں آئیں گی۔

۵

ایامِ رضاعت کے دو واقعات

خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ایک تو یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نشوونما عام بچوں سے مختلف تھی۔ اس میں زیادہ فروغ تھا کہ عمر شریف کے ڈیڑھ ہی سال میں آپؐ اتنے تندرست و توانا ہو گئے تھے کہ دوسرے ہم عمر لڑکوں سے ممتاز اور بڑے نظر آتے، اور دوسرے یہ کہ معجزانہ واقعات اُنؐ سے وابستہ رہے۔ ابتداء ہی میں جب زبان کُھلی تو بِسْمِ اللہ ہی زبانِ مبارک پر تھا

اور جس چیز پر ہاتھ رکھتے تو بِسْمِ اللّٰہ فرماتے۔

۱۔ حلیمہ سعدیہ فرماتی ہیں کہ جب آپؐ کی عمر دو سال کی تھی تو میں آپؐ کو اپنے سے دور نہیں ہونے دیتی تھی۔ ایک دِن آپ کی رضاعی بہن شیما آپؐ کو اپنے ساتھ لے گئی۔ دھوپ کی تپش سے پریشان ہوکر بی بی حلیمہ آپؐ کو ڈھونڈنے نکلیں اور اپنی بیٹی سے ناراض ہوئیں کہ وہ حضورؐ کو دھوپ میں لے کر کیوں نکل کھڑی ہوئی۔ شیما کا جواب تھا "ہم نے تو گرمی کی شدّت محسوس نہیں کی کیونکہ میں نے دیکھا کہ ابر کا ٹکڑا آپؐ پر سایہ کئے رہا۔ جہاں تشریف لے جاتے ابر ساتھ جاتا، یہاں تک کہ ہم یہاں پہونچ گئے۔"

(مدارج النبوّت صفحہ ۲۲)

دوسرا واقعہ جو اس سے بھی زیادہ اہم ہے وہ حضور صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم کے سینۂ مبارک کے چاک ہونے اور قلبِ اطہر کو غسل دینے سے متعلق ہے۔[۱]

۲۔ جب آپؐ کچھ بڑے ہوئے تو آپؐ نے بی بی حلیمہ سے فرمایا کہ آپ مجھے اپنے بھائیوں کے ساتھ بکریاں چرانے کیوں نہیں بھیجتیں۔ بی بی حلیمہ نے اپنے رواج کے مطابق آپ کو تیار فرمایا اور حفاظت کے لئے گلے میں ایک تختی ڈالی۔ حضور صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم نے اُسے توڑ کر پھینک دیا، اور فرمایا کہ میرا اللّٰہ میرا محافظ ہے۔ جب آدھا دِن گذر گیا تو حلیمہ بی بی کا لڑکا دوڑتا ہوا آیا کہ محمدؐ ہمارے ساتھ کھڑے تھے کہ اچانک ایک شخص نمودار ہوا اور اُنؐ کے قریب آکر انہیں ہمارے درمیان سے پہاڑ پر لے گیا، اور لِٹا کر اُنؐ کا شکمِ مبارک چاک کیا۔ حلیمہ سعدیہ جب گھبرائی ہوئی آئیں تو دیکھا کہ آپؐ آسمان کی جانب دیکھ رہے ہیں اور حلیمہ کو دیکھ کر تبسّم فرمایا۔ (سبحان اللّٰہ)

---

[۱] محمدؐ رسول اللّٰہ صفحہ ۳۸

احادیثِ مبارکہ میں اور کتبِ سِیَر میں اِس واقعہ کا ذکر آتا ہے۔ یہاں حضرت مولانا عبدالحق محدّث دہلویؒ کی کتاب مدارجِ نبوّت سے اقتباس نذرِ ناظرین ہے۔
آپ حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم فرماتے ہیں کہ: "میں اپنے رضاعی بھائیوں کے ساتھ وادی میں تھا کہ یکایک میری نظر تین شخصوں پر پڑی۔ ان میں سے ایک کے ہاتھ میں سونے کا طشت تھا جو برف سے بھرا تھا۔ اور ایک روایت میں ہے کہ ایک ہاتھ میں چاندی کا آفتابہ تھا اور دوسرے ہاتھ میں سبز زمرّد کی لگن جو برف سے لبریز تھی۔ پھر اُنہوں نے مجھے میرے ساتھیوں کے درمیان سے پکڑا، اور میرے سب ساتھی اپنے محلّے کی جانب بھاگ گئے۔ اس کے بعد ان تینوں نے مجھے زمین پر نرمی سے لٹایا اور ایک نے میرے سینے کو جوڑوں کے پاس سے ناف تک چیرا اور مجھے کسی قسم کا درد محسوس نہ ہوا۔ اس کے بعد پیٹ کی رگوں کو نکالا اور اُس برف سے اُسے خوب غسل دیا۔ پھر اُسے اپنی جگہ رکھ کر کھڑا ہو گیا۔ دوسرے شخص نے اُس سے کہا کہ تم ہٹ جاؤ۔ اس کے بعد اُس نے اپنے ہاتھ میرے جوف میں ڈال کر میرا دِل نکالا اور میں دیکھ رہا ہوں۔ پھر اُسے چیرا اور اُس سے ایک سیاہ لوتھڑا نکلا۔ پھر اس کو اُس چیز سے بھرا جو اُن کے پاس تھی..... اُس کے بعد میرے دل پر ایک انگشتری سے مُہر لگائی اور میرا دِل نور سے لبریز ہو گیا۔ اور وہ نور نبوّت و حکمت کا تھا پھر دل کو اپنی جگہ رکھ دیا تو میں اس مُہر کی سردی اور خوشی عرصہ تک محسوس کرتا رہا۔"

(صفحہ ۲۴ مدارج نبوّت جلد دوم)

صحابہؓ فرماتے ہیں کہ ہم رسولِ کریم صلّی اللہ علیہ وسلّم کے سینہ و شکمِ مبارک پر اس جوڑ کا نشان سیدھی لکیر کی مانند دیکھا کرتے تھے۔ علماءِ کرام فرماتے ہیں کہ غسلِ قلب، رسول اللہ علیہ وسلّم کے ساتھ خاص نہیں بلکہ تمام نبیوں کے لئے عام ہے۔ اُن علیہم السلام میں جو شیطان کا حصّہ ہوتا ہے وہ دُور کر دیا جاتا ہے۔ سبحان اللہ۔

یہ تو فیضانِ رسالت کی مزید تصدیق ہے کہ جہاں نورِ نبوّت ہو وہاں شیطنت کا دخل ہی ممکن نہیں۔

البتّہ

حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کے ساتھ یہ شقِّ صدر صرف حلیمہ سعدیہ کے بیان سے مخصوص نہیں بلکہ متعدّد بار ہوا۔ اس وقت جب کہ آپؐ چھ سال کے تھے۔ اور ایک روایت میں عمر کے دسویں سال اور ایک میں شبِ معراج میں۔

اس شقِ صدر کے بعد آپؐ کی واپسی بھی ایک معجزانہ انداز سے اپنی والدہ کے پاس ہوئی۔ ایّامِ رضاعت کے دو سال بعد ہی بی بی حلیمہ سعدیہ آپؐ کو لے کر آپؐ کی والدہ ماجدہ کے پاس حاضر ہوئیں، اس تمنّا کے ساتھ کہ یہ رحمت ابھی اُنہیں کے ساتھ رہے۔ حضرت آمنہؓ نے بھی یہ مناسب سمجھا کہ حضورؐ عرب کے خالص فطری ماحول میں کچھ دن اور قیام فرمائیں، اور آپ کو بی بی حلیمہ کے ساتھ واپس فرما دیا۔

اب یہ حال تھا کہ قدرت کے اس شاہکارؐ کے فیوض و برکات سے سب ہی متأثر ہوتے اور فیض بھی پاتے۔ اس اثنا میں جب بی بی حلیمہ کا گذر کسی یہود کی جماعت پر ہوتا، اور اُن سے حضورؐ کے حالات بیان فرماتیں تو اُن کا بی بی حلیمہ کو یہی مشورہ ہوتا کہ اس بچّہ کو مار ڈالو ورنہ تمہارے مذہب کو اس سے سخت نقصان پہونچے گا۔ (محمدؐ رسول اللہ صفحہ ۴۱)

اِدھر شقِ صدر کے واقعہ نے اُدھر یہود اور کاہنوں کی دشمنی کے خیال سے بی بی حلیمہ نے حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کو اُن کی والدہ ماجدہ کے پاس پہونچا دیا۔

جب آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کی عمر شریف چھ سال کی ہوئی تو بی بی آمنہ اُن کو لے کر مدینہ منورہ گئیں۔ سیرت نگاروں کا خیال ہے کہ یہ سفر اس لئے

کیا گیا کہ حضورؐ کو اپنے دادا عبدالمطلب کی ننھیال کے لوگوں سے ملا دیا جائے، جن کا تعلق قبیلہ بنی نجار سے تھا۔ مولانا شبلی نعمانی یہ فرماتے ہیں کہ سفر کی اس توجیہ سے یہ بات زیادہ قرینِ قیاس ہے کہ حضرت آمنہ نے یہ سفر اس لئے کیا کہ اپنے شوہر کی قبر کی زیارت فرمائیں۔ اور اس عاجز کے نزدیک یہ بات بھی قرینِ قیاس ہے کہ مالکِ قضا و قدر نے، جسے حضرت آمنہ کی مدّتِ حیات ختم ہونے کا علم تھا، اِن کے دل میں یہ تمنّا ڈالی ہو کہ اِس درِّ یتیمؐ کو اُس کے والدِ ماجد کی قبر دکھا دی جائے، تاکہ یہ یادیں اُنؐ کے ذہن نشین رہیں۔

بہرحال

جب آپ مدینہ سے واپس آ رہی تھیں تو مقامِ ابواء پر پہنچ کر بیمار ہوگئیں، وہیں انتقال ہوا اور وہیں تدفین عمل میں آئی۔ اس وقت ان کی عمر ۳۰ سال کی تھی۔ آپؐ کی دایہ امِّ ایمن جو آپؐ کے ہمراہ تھیں آپؐ کو لے کر مکّہ واپس آئیں۔

مورخین کا بیان ہے کہ حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم نے عروجِ اسلام کے بعد ایک ہزار مجاہدین کے ہمراہ اپنی والدہ ماجدہ کی قبر کی زیارت فرمائی۔ آپؐ آبدیدہ ہوئے اور صحابہ کرامؓ بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہے۔

ایامِ کفالت

ماں کی آغوشِ رحمت سے محرومی کے بعد اب آپؐ کی نگہداشت کی ذمّہ داری آپؐ کے دادا عبدالمطلب ہی کی تھی۔ جن کی بزرگی، فہم و فراست سے اہلِ عرب متأثر تھے۔ آپ کی عظمت کی ایک وجہ چاہِ زمزم کو از سرِ نو کھُدوا کر دُرست کرنا تھا، اور دوسری وجہ اُن کے بیٹے حضرت عبداللہ کے ذبیح اللہ ہونے سے متعلق ہے جو عبدالمطلب کو بہت پیارے تھے اور جن کی پیشانی میں نورِ محمدی جلوہ گر ہوا۔

حضور سرورِ کائنات صلّی اللہ علیہ وسلّم کا خیال عبدالمطلب کو اس لئے بھی رہتا کہ انہیں یہود دشمنی کا علم تھا اور وہ جانتے تھے کہ یہ لوگ اُن کے پوتے ؐ کی جان کے دشمن ہیں۔ اور خود حضور سرورِ کائنات صلّی اللہ علیہ وسلّم کی وہ صفات جو کم عمری ہی سے نمایاں تھیں، اس محبت و شفقت کا ایک سبب تھیں۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلّم بچپن ہی سے ایک عظیم مستقبل کے مالک تھے۔ آپؐ کی عظمت و ذکاوت کی علامتیں کم عمری ہی سے نمایاں ہونے لگی تھیں۔ آپؐ میں ایک خاص قسم کی کشش اور جاذبیت تھی جو آپؐ کو دوسرے بچّوں سے ممتاز کرتی، آپؐ جہاں بھی جاتے لوگوں کی نظروں میں محبوب اور ہم عصروں میں برتر اور ممتاز سمجھے جاتے۔ (از محمد رسول اللہ صفحہ ۴۷)

حضرت عبدالمطلب آپؐ کو اپنی آنکھوں سے اوجھل ہونے نہ دیتے تھے، جب کھانا کھاتے تو آپؐ کو اپنے ساتھ کھانا کھلاتے، آپؐ جو کام بھی کرتے اُسے دیکھ کر خوش ہوتے۔ اور اُٹھتے بیٹھتے جاگتے سوتے اُنؐ پر نظر رکھتے۔

اِس دو سال کے مختصر قیام میں بھی حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کی رحمتوں کا ظہور ہوتا رہا۔ آپ لوگوں کے دُکھ درد دُور کرنے میں مسرّت محسوس فرماتے۔ کسی کا اونٹ کھو جائے، کوئی چیز نہ ملتی ہو، کوئی پریشان ہو، آپؐ اُس کی مدد فرمانے کے لئے آگے بڑھتے اور اللہ کے کرم سے اُس کی پریشانی دور کرنے کا موجب بنتے ؐ۔ مکّہ کے قحط کے سال نزولِ باراں آپ ہی کی دُعا کا نتیجہ تھا۔

(سیرت احمد مجتبیٰؐ صفحہ ۸۸۔ شاہ مصباح الدین شکیل)۔

جناب عبدالمطلب کا آخری وقت آیا

تو اُمّ ایمن کو طلب کیا اور فرمایا دیکھو میرے اِس بیٹےؐ سے کبھی بے پروائی نہ برتنا کیونکہ اہلِ کتاب کہتے ہیں کہ یہ اِس اُمّت کا نبیؐ ہے۔ پھر حضرت ابوطالب کو بلایا اور اُن کے حقیقی بھائی عبداللہ کی یہ نشانی اُن کے سُپرد فرمائی۔

دورِ کفالت و تربیتِ ربّانی

اب دورِ کفالت کا آغاز ہوتا ہے۔ اور یہی دراصل اس پیکرِ نورانیؐ کی تربیتِ ربّانی کا دور ہے۔ اور پہلا سبق جو پڑھایا جا رہا ہے وہ اِسی کتاب "صبر" کا باب سوم تھا۔ والد کا انتقال تو پہلے ہی ہو چکا تھا۔ چھ سال کی عمر میں ماں کی آغوشِ محبت سے بھی جُدا ہو چکے تھے اور اب آٹھ سال کی عمر میں مشفق دادا نے بھی خدا حافظ کہا۔ اور یوں آپؐ حضرت ابوطالب کے گھر کا اُجالا بنے۔

حضرت ابوطالب آپؐ سے بے پناہ محبت فرماتے، بڑے کریم النفس تھے لیکن کثیر العیال اور تنگ دست تھے۔ اُن کے لئے خود اپنے بیٹوں کی پرورش آسان نہ تھی۔ اللہ نے اس نونہالؐ، اس برہانی وجودؐ کو اِن کی پرورش کے سلسلہ میں چچا کا معاوِن بنا دیا۔ بقول مولانا سیّد مناظر احسن گیلانی "شاید بہتوں کو علم نہیں ہے کہ مدتوں اُن کی یعنی ابوطالب کی گزران اُن قراریط (خاص وزن کا معمولی سکہ) پر ہوتی رہی جو بکریوں اور اُونٹوں کے چرانے کے صلہ میں اُن کا بھتیجا مکّہ والوں سے مزدوری پر لاتا تھا۔"

(النّبیّ الخاتم صفحہ ۳۲)

یہ افلاس و دولت تو اللہ کی طرف سے ہے، آزمائش بھی ہے اور عطا بھی۔ دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ اِن حالاتِ فراخی و تنگ دستی میں قلوب شاکر ہیں یا شاکی، محبت کیا رُخ لیتی ہے۔ آپؐ کے چچا کا یہ عالم تھا کہ آپؐ کا ہر طرح خیال رکھتے، اپنے بچوں پر ترجیح دیتے، آپ کی چچی بھی آپؐ سے بے حد پیار فرماتیں۔ یہ محبت بھی آپؐ کا بڑا سہارا تھی۔ حضرت ابوطالب آپؐ کے بغیر کھانا نہ کھاتے، آپؐ کا بستر اپنے داہنی پہلو میں بچھاتے، آپؐ کی شان

ہیں شعر کہتے، غرض وہ سب کچھ کرتے جو محبّت کا تقاضا تھا۔

لیکن

حضور سرورِ کائنات صلّی اللہ علیہ وسلّم کی تربیت دراصل قدرت کے ہاتھوں ہو رہی تھی۔ یہ تربیت اس پاک نفس کی تھی جس کا باطن اللہ ہی اللہ تھا، جس کو اُس کے ربّ نے اپنی احدیتِ ذات و احدیتِ صفاتِ (باری تعالےٰ) کو عام کرنے کے لئے مبعوث فرمایا تھا۔

حضرت ابوطالب اپنے بھتیجے کے متعلق فرماتے کہ بچّہ بڑا بابرکت ہے۔ جب کھانے پر بیٹھتا تو بِسْمِ اللہِ الْاَحَد کہتا اور جب فارغ ہوتا تو اَلْحَمْدُ لِلّٰہ کہتا۔ کبھی کسی نے اُسے جھوٹ بولتے نہ سُنا، نہ اُس نے کبھی کوئی جاہلانہ بات کی، نہ اُسے کبھی بے جا ہنستے ہوئے دیکھا گیا، کھیل کود سے کوئی ذوق نہ تھا۔ اور ہوتا بھی کیسے۔ وہ نورِ پُر سرور تو اپنے ربّ کی نگرانی میں تھا، خود اپنے ربِّ کریم کی صفات کا آئینہ بن رہا تھا، جمال کا ایک لاثانی پیکرِ نوری تھا۔

اللہ کی عطا کے بھی انداز نرالے ہیں

اور تربیت اور تحفظ کے قرینے بھی اس کے اپنے ہیں۔ آپؐ کو اپنا لقب "اُمّی" بہت پسند تھا۔ آپ کی حیاتِ مبارکہ از ابتداء تا انتہا اسی لفظ اُمّی کی ترجمان ہے۔ بچپن ہی میں ماں کی آغوشِ ناز اور دائی حلیمہ کی مادرانہ محبّت کے انداز آپ کی دلجوئی کا موجب رہے۔ جب ذرا ہوش سنبھالا تو مظلوم کی دادرسی کے انداز قدرت نے سکھانے کے لئے پیغمبرانہ سنّت، گلّہ بانی کی طرف مائل فرما دیا۔ اب جب اپنے پیارے چچا ابوطالب کے پاس آئے تو یہ طریقۂ تعلیم و تربیت اور واضح ہو گیا۔ عرب کی جاہلانہ اور ظالمانہ زندگی سے الگ کرنے کا طریقہ یہ عطا ہوا کہ شہر و شہریت سے جُدا کر کے آپؐ کو صحرا پہونچا دیا گیا، بجائے آدمیوں کے چرندے آپؐ کے ساتھی ٹھہرائے گئے۔ شغلِ تجارت میں مشغول ہونے

سے پہلے تقریباً ۲۲ سال تک آپؐ کا یہ نظامِ اوقات تھا کہ صبح ہوتی تو گھر گھر کی بکریوں اور اونٹوں کے گلّوں کے ساتھ بہت دور صحراء میں چلے جاتے۔ شب کو سب مویشی پہونچا دیتے۔ گھر پہونچے جو پایا کھایا" اور اپنے چچا کی بغل میں سو کر رات گذار دیتے۔ (سید مناظر احسن گیلانی)

تربیت کا یہ فطری انداز بتا رہا ہے کہ اُنؐ کے ربّ کو یہی منظور تھا کہ مناظرِ فطرت میں دینِ فطرت کے جلوے دیکھیں، آسمان کی رفعتوں سے رفعتِ خیال پیدا ہو، پانی اور چشموں سے قلبِ مبارک میں فراوانی ہو۔ بے زبانوں کی بے زبانی دیکھ کر مظلوم انسانیت سے محبّت اُبھرے۔ جنگل میں کانٹوں سے دامن بچا کر چلنے کے آدابِ زندگی آئیں، تقویٰ اُبھرے، جڑی بُوٹی پھول پتّی سب اپنے علوم اس نبیِ امّیؐ کے حوالہ کر دیں جن سے ان کو یہ صلاحیتیں ملی تھیں۔ کیسا پاکیزہ اور کیسا نرالا اندازِ تربیت تھا اس مدرسۂ ربّانی کا، جہاں ربِّ محمدؐ ہی معلّم، رسولؐ ہی طالب، اور آپؐ ہی کے نور سے منوّر کائنات، آپؐ کے ضبط و تحمّل، صبر و استقلال کی ایک کُھلی ہوئی کتابِ فطرت بنی ہوئی تھی۔ سبحان اللہ۔

مورّخین حضورؐ کے اس ابتدائی دَور کے حالات میں لکھتے ہیں کہ ایک بار مکّہ کے دیگر گلّہ بان بچوں کے کہنے پر کسی بارات پر تماشا دیکھنے کا خیال آیا۔ چراگاہ سے اس لئے ذرا جلدی تشریف لے آئے لیکن جب وہاں پہنچے جہاں یہ تماشے ہونے والے تھے کہ دن بھر کی تھکاوٹ نے تھپکیاں دے کر سُلا دیا اور جب آنکھ کُھلی تو تماشے ختم ہو چکے تھے اور سورج کی کرنیں پیامِ عمل دے رہی تھیں۔

اِس واقعہ میں بھی تربیت کا یہ پہلو مضمر ہے کہ ہر بچّہ جان لے کہ بچانے والا اور محفوظ رکھنے والا کوئی اور ہی ہے اور اُس کی یاد سے غافل نہ ہو۔

آپؐ کی عمرِ شریف تقریباً ۱۲ سال کی ہوگی کہ اپنے محبوب چچا کے ساتھ مُلکِ شام کی جانب سفر کیا اور بصرہ پہونچے جہاں ایک صومعہ تھا۔ جو ایک

عیسائی راہب بحیرٰی نامی کا مرکزِ عبادت تھا۔ لیکن دراصل وہ راہب نبیِ آخرالزّماں کے دیدار کا منتظر تھا۔ وہ آتے جاتے قافلوں کو دیکھتا اور کسی سے مخاطب نہ ہوتا۔ لیکن اس بار جب اس قافلہ کو دیکھا کہ اس پہ ایک بادل کا ٹکڑا سایہ کیے ہوئے ساتھ ساتھ ہے، تو راہب کو اُمیدیں بر ہوتی نظر آئیں۔ اُس نے قافلہ والوں کو مدعو کیا، تو پھر وہی دیکھا کہ حضورؐ کے ساتھ بادل کا ٹکڑا ابھی آپؐ کے ہمراہ ہے۔ جب قافلہ پہاڑ پر چڑھنے لگا تو راہب نے سُنا کہ پہاڑ کا ہر شجر و حجر اَلسَّلَامُ عَلَیْکَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہ کہہ رہا ہے۔ حضورؐ کے شانۂ مبارک پر مہرِ نبوّت کو بھی دیکھا، اُس کو بوسہ دیا اور ایمان لایا۔ بحیرٰی اُن میں سے ایک ہے جو حضورؐ پر آپؐ کے اظہارِ نبوّت سے پہلے ایمان لائے۔

راہب نے ابوطالب کو نصیحت فرمائی کہ "یہود و نصارٰی سے حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کی خوب حفاظت فرمائیں کہ یہ فرزند، نبیِؐ آخرالزّماں ہوگا، اور انؐ کا دین تمام دینوں کا ناسخ ہوگا، انہیںؐ شام نہ لے جاؤ۔ اس کے بعد ابوطالب اپنا سامان وہیں فروخت کر کے مکّہ مکرّمہ واپس آگئے۔"

(مدارجِ نبوّت جلد دوم صفحہ ۴۱)

حضرت مولانا عبدالحق محدّث دہلویؒ اور دیگر سیرت نگاروں سے اس طرح کے متعدد واقعات منقول ہیں۔ لطف کی بات یہ ہے کہ ایک طرف کافر، یہود اور نصرانی دشمنوں سے اُنؐ کی حفاظت کا یہ اندازِ قدرت، وہیں آپؐ کی ذاتِ مبارکہ کی علی الاعلان تشہیر کے یہ قدرتی مناظر، کیا اس بات کا ثبوت نہیں کہ جب اللہ تعالیٰ کسی کام کا ارادہ فرما لیتا ہے اور اپنے کسی مخبرِ صادق کو مبعوث فرماتا ہے تو کوئی اس کے عظیم مشن میں حائل نہیں ہوسکتا۔ اس کا دین، اس کا پیغام مکمل ہو کر رہتا ہے۔ وہ اپنے نبیِ برحقؐ کو اُس کے دشمنوں سے بھی آگاہ فرماتا ہے اور اُن کے ظاہر سے زیادہ اُن کے

باطن کو عزم اور حوصلوں سے سرفرازی بخشتا ہے۔

تربیتِ ربّانی بہ انداز جاری ہے۔ آپؐ کی عمر ابھی پندرہ سولہ کی تھی کہ آپؐ کو جنگِ فجار کی تیسری اور آخری جنگ میں شرکت کا موقع ملا۔

"آپؐ فرماتے ہیں کہ اس جنگ میں مَیں اپنے چچا کے ساتھ شریک تھا اور کچھ تیر بھی پھینکے تھے لیکن میری دلی خواہش یہی تھی کہ ایسا نہ ہو۔ میں اس جنگ میں اپنے چچا کو صرف تیر نکال نکال کر دیتا تھا۔"

دراصل یہ ایک معاہدہ تھا جسے حلفِ فضول کہتے ہیں یعنی وہ معاہدہ جس میں تین اشخاص کے نام کا جزو فضل تھا۔ معاہدہ یہ تھا کہ

"خدا کی قسم ہم مظلوم کا اُس وقت تک ساتھ دیتے رہیں گے جب تک دریا اُون کو تر رکھے (یعنی ہمیشہ ہمیشہ) اور معاشرے میں ایک دوسرے کی ہمدردی اور غم گساری کیا کریں گے۔"

(محمدؐ رسول اللہ صفحہ ۶۰)

یہ معاہدہ آپؐ کی فطرت کے عین مطابق تھا۔ آپؐ نبوّت کے بعد بھی فرمایا کرتے تھے کہ "اگر مجھے نبوّت کے بعد بھی اس اجتماع میں بُلایا جاتا تو میں بخوشی قبول کرتا۔" آپؐ کی فطرت ہی مظلوم کی دادرسی، بُتوں سے کنارہ کشی و بیزاری، جُوا، شراب اور ہر بُرائی سے نفرت تھی۔ آپ عرب کی بہت سی روایات بالخصوص لڑکیوں کو زندہ درگور کرنے کو جڑ سے اُکھاڑ پھینکنے کے خواہش مند رہتے، وہ تمنّا جو اسلام کے فروغ کے بعد پوری ہوئی۔

رزم و بزم کی یہ تربیت مدرسۂ عالیۂ ربّانی، جولان گاہِ کائنات میں ایک فردِ واحد کی، ربّ الاحد کے دستِ قدرت و حکمت سے جاری رہی۔

اور صبر کے ساتھ شکر کی منزلوں سے گذرنے کے اسباب بھی مہیا فرمائے گئے۔

چنانچہ دوسرا سفر شام کا تقریباً ۵۹۵ئہ میں ہوا

آپؐ کی عمر شریف پچیس ۲۵ سال کی تھی، کہ آپ کے چچا نے فرمایا کہ ہم پر تنگی کا دور ہے۔ تمہاری قوم کا مال، خدیجہ بنتِ خویلد، تمہاری قوم کے کچھ لوگوں کے ساتھ، اپنے تجارتی اُونٹوں کے ہمراہ بھیجا کرتی ہیں۔ تم ؐ بھی ان کے پاس جا کر اپنی خدمت پیش کرو۔ حضرت خدیجہ کو اس بات کا علم ہوا تو انہوں نے خود ہی حضورؐ کو بلا لیا اور دوسروں کے مقابلہ میں دوگنا معاوضہ کا وعدہ فرمایا۔

چنانچہ آپؐ سیدہ خدیجہؓ کے خادم میسرہ کو ساتھ لے کر سفر کے لئے روانہ ہوئے۔ آپ کی معجزانہ و مخلصانہ زندگی کو حضرت خدیجہؓ کا خادم دیکھتا۔ دمشق کے راستہ میں ایک جگہ ایک درخت کے نیچے قیام کیا۔ وہاں ایک پادری نے کہا کہ اس درخت کے نیچے سوائے نبی کے کوئی دوسرا نہیں ٹھہر سکتا۔ یہ بھی دیکھا کہ آپؐ جب چلتے تو دو فرشتے آتے اور آپؐ پر دھوپ سے بچاؤ کے لئے سایہ کرتے۔ یہ سب باتیں میسرہ کے ذہن نشین تھیں ۔۔۔ تجارت میں بھی دُوگنا نفع ہوا۔ اِس عاجز کا خیال ہے کہ دوگنا اس لئے کہ معاوضہ کا وعدہ حضرت خدیجہؓ نے دوگنا ہی کیا تھا، اگر اُنؓ کے مُنہ سے زیادہ نکلتا تو وہی ہوتا۔

آپؐ کے اِس سفر پر

آپؐ کے نقاد اِس بات کا اعتراف کئے بغیر نہ رہ سکے، جس کا ذکر خود مسٹر میور نے حضورؐ کے اس سفر کے سلسلہ میں کیا ہے:

کہ "حضرت محمدؐ کو تو کبھی دولت مند بننے کی حرص نہ تھی۔ آپ تو صرف دوسروں کی بھلائی کے لئے کوشاں رہے...... لیکن جب آپؐ کے چچا نے آپؐ کو ترغیب دی تو آپ کی کریم النفسی

نے اپنے چچا کی معاشی تکالیف کو رفع کرنے کے لئے اُن کی خواہش کو قبول فرمایا۔ (محمدؐ رسول اللہ۔ صفحہ ۶۱ بحوالہ مسٹر میور)

نتیجہ وہی ہوا جو قدرت کو منظور تھا

یعنی ربّ العزّت کا اپنے حبیبؐ کے لئے ایک دانش مند، مُستقل مزاج، شریف النفس، متموّل، حسین وجمیل خاتون کا انتخاب۔ اپنی ذاتی خوبیوں کے علاوہ وہؓ قریشی تھیں۔ نسب کے اعتبار سے اعلیٰ واشرف تھیں۔ اُن ایام جہالت میں بھی آپؓ طاہرہ اور سیّدۂ قریش کے لقب سے ملقّب تھیں۔ حضرت خدیجہؓ نے خود اپنی بہن کو اور بقول بعض اپنی کنیز نفیسہ کو آپؐ کے پاس بھیجا جو حضور کی بے نیازانہ اندازِ منظوری سے مسرور واپس آئیں۔ اور آپؐ کا عقد اُن کے (حضرت خدیجہ الکبریٰؓ کے) چچا کی ولایت میں سیدہ خدیجہؓ سے ہو گیا۔

اُس وقت حضورؐ کی عمرِ شریف پچیس[۲۵] سال اور حضرت خدیجہؓ کی چالیس[۴۰] برس کی تھی۔ نکاح کے بعد ولیمہ کی دعوت پر حضرت ابوطالب نے فرمایا:

"خدا ہی کے لئے سب تعریف ہے جس نے ہماری پریشانیوں کو دُور فرمایا اور ہمارے رنج والم کو مٹا دیا"

(محمدؐ رسول اللہ صفحہ ۶۵)

اس سے پہلے حضرت خدیجہؓ کے دو عقد ہو چکے تھے، ایک سے اُنؓ کی اولاد تھی۔ لیکن یہ نکاح جو مشیّتِ ایزدی کا نتیجہ تھا، نہ لذّتِ نفس کے لئے تھا نہ حصولِ زر کے لئے۔ بلکہ رہتی دنیا تک بیوہ عورت کو پھر سہاگ اور مسّرت سے ہمکنار کرنے کی سنّت کا قائم کرنا تھا۔ حضور کی سب اولاد

ــــ واضح ہو کہ جن اولادِ سرورِ کائناتؐ پر اتفاق کیا گیا وہ چھ ہیں (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

بجز حضرت ابراہیمؓ کے حضرت خدیجہؓ سے ہوئی: قاسم۔ طیّب۔ طاہر۔ رقیۃ۔ زینب۔ امِ کلثوم۔ فاطمہ۔ رضوان اللہ علیہم اجمعین۔

(محمدؐ رسول اللہ۔ صفحہ ۶۶)

(باب سوم)

فصل دوم

حضورِ اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کی ازدواجی زندگی سے آپؐ کی سیرتِ طیبّہ ہی کا نہیں بلکہ تاریخِ اسلام کے نئے باب کا آغاز ہوتا ہے۔ یہ وہ دَور ہے جو تقریباً پندرہ سال پر مشتمل ہے اور حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کو ان اہم امور کی طرف توجہ مبذول کرنے کا موقع فراہم کر رہا ہے جن کو نبوّت کا پیش خیمہ

جن میں دو فرزند ہیں، ایک حضرت ابراہیم علیہ السّلام جو ماریہ قبطیہؓ کے لطن سے تولد ہوئے تھے، اور دوسرے حضرت قاسم علیہ السّلام کہ انہی کے نام سے آپؐ کی کنیت ابوالقاسم ہوئی، جو ام المؤمنین حضرت خدیجہؓ سے ہیں، اور چار صاحب زادیاں: سیدہ زینبؓ، سیدہ رقیہؓ، سیدہ ام کلثومؓ اور سیدۃ النساء فاطمۃ الزہراءؓ

بعض علماء صاحب زادوں میں طیّب و طاہر کو بھی شمار کرتے ہیں، اس طرح حضورؐ کی اولاد کی تعداد آٹھ ہو جاتی ہے۔

اور بعض کے نزدیک حضرت قاسمؓ کے بعد آپؐ کے ایک فرزند عبداللہ ہیں جن کا لقب طیّب و طاہر تھا۔ اس طرح سات رسولؐ زادے ہوئے۔ اور اکثر علماءِ انساب کا مذہب یہی ہے

(مدارجِ نبوّت جلد دوم صفحہ ۷۷)

کہنا چاہیئے۔ جن کا تعلق نہ صرف عرب کی معاشرتی، معاشی، اخلاقی زندگی سے تھا بلکہ عالم انسانیت جن کی اصلاح کی منتظر تھی۔

۲۔ عرب اور بالخصوص مکّہ کی زندگی تو بت پرستی اور توہّم پرستی کا تو شکار تھی ہی، یہودیت اور نصرانیت اور دیگر اقوام کے افراد بھی اپنے انبیاء کی تعلیمات بھلا چکے تھے۔ کسی نے کسی کو اللہ کا بیٹا بنا لیا تھا، کہیں ایک خدا کے تین خدا ہو گئے تھے۔ توحید کا تصوّر بھی مٹایا جا رہا تھا۔ اور ظلم و ستم کی گرم بازاری تھی۔ ایسے جانکاہ حالات میں ایک پاک قلب، ایک مضطرب رُوح پر جو گذرتی ہو گی اس کا اندازہ بھی مشکل ہے۔ ازدواجی زندگی سے قبل تجارتی قافلوں کے ساتھ آپؐ نے اندرونِ عرب کا مطالعہ کیا تھا اور گردونواح کے علاقوں کا بھی، جس نے آپؐ کو لوگوں کے زنگ آلود قلوب سے بھی آشنا کر دیا تھا۔

(مکّہ تو بُت پرستی کا مرکز ہی بنا ہوا تھا اور ان کے پجاری ظلمتِ ثلاثہ کے شکار تھے۔

نفس کی سطح پر وہ ہر ظلم کو جو ان کی تشفّیِ قلب کے لئے اور فراہمیِ عیش کے لئے ہو، جائز و روا سمجھتے تھے۔

قلب کی سطح پر وہ ہر محبّت و اخوّت، ہمدردی کے جذبات سے نہ صرف خالی تھے بلکہ اپنی بچّی کو زندہ دفن کر کے بھی ان کی آنکھیں پُرنم نہ ہوتیں اور اسے اپنی بہادری اور تسکینِ 'انا' کا ذریعہ سمجھتے۔

روح کی سطح پر تو ظلمت ہی ظلمت طاری تھی۔ نہ حق کی تلاش، نہ آخرت کا ہوش۔)

وہی اللہ ربّ العزت جس نے آپ صلّی اللہ علیہ وسلّم کو اصلاحِ حال کے لئے منتخب فرما لیا تھا، وہی جو آپؐ کی رسالت کے انوار

سے اُن تاریکیوں کو صبحِ صادق میں بدلنے والا تھا، اُسی نے آپؐ کے قلبِ مضطرب کے لئے وہ ذرائع اور مواقع فراہم فرمائے جو بڑے دُور رس نتائج کے حامل ہوئے۔

۱۔ حضرت خدیجہؓ کے ساتھ شادی نے معاش کی طرف سے یگگونہ سکون عطا کر دیا تھا اور یہ موقع عطا فرمایا کہ اُن بنیادی چیزوں کی اصلاح ہو جو گھر سے شروع ہوتی ہیں۔

حضرت خدیجہؓ نے نکاح کے بعد نہ صرف اپنی ذات کو حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کی نذر کر دیا تھا بلکہ اپنا تمام اثاثہ بھی آپؐ کے تصرفات کے لئے وقف کر دیا تھا جو آپؐ کی تسکینِ خاطر کا موجب ہوا۔ بڑی خوش نصیب ہے وہ ہستی جو اپنی دولت کسی دوسرے کو کارِ خیر میں صرف کرنے کے لئے حوالہ کر دے۔

"اور سیّدہ خدیجہؓ کے علوئے رتبہ کا کیا اندازہ کہ اُنؓ کے ذریعہ اللہ نے اپنے محمدؐ کو غنی بنا دیا۔" اس شادی کے بعد حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم نے خود تجارتی سفر میں جانا موقوف فرما دیا تھا۔ اور اپنے اوقات عزیزوں کی پرورش، ضرورتمندوں کی حاجت روائی اور غور و فکر میں صرف فرماتے۔

مکّہ میں ایک بڑا قحط پڑا۔ اور حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کو اخلاص و فراخدلی سے بے کسوں کی اعانت کا موقع ملا۔ مجبور اور بے کسوں کی مدد کرنے کے ساتھ آپؐ کو اپنے چچا ابو طالب کا خیال آیا جن کی تنگ دستی اور کثیر العیالی کا آپؐ کو علم تھا۔ چنانچہ آپؐ پہلے اپنے مالدار چچا حضرت عبّاسؓ کے پاس تشریف لے گئے اور فرمایا۔ "ہمیں اس قحط سالی کے زمانہ میں حضرت ابو طالب کا بوجھ ہلکا کرنا چاہیئے۔ آپ ان کی اولاد میں سے جعفر کی پرورش اپنے ذمّہ لیں، میں اپنی بیٹی زینب کے ہم عمر، علیؓ کی کفالت کرتا ہوں۔" اس طرح حضرت علیؓ

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ آ گئے۔

اہلِ نظر سے یہ بات مخفی نہیں کہ یہ پرورش صرف علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی پرورش نہ تھی، بلکہ زمانہ بتائے گا اور تاریخ گواہی دے گی کہ تاریخِ اسلام میں ایک دور وہ بھی آئے گا کہ نظرِ التفات اور توجّہ خصوصی سے پرورش ہونے والی ہستی، خلافت راشدہ کے آخری دور میں، ولایتِ عظمیٰ پر فائز ہو گی اور خلافت کے پُر نور دور کے بعد ہزارہا برگزیدہ ہستیوں کو عالم کے لئے مینارِ نُور بنانے کی ضامن ہو گی۔ یہ اولیاء اللہ کہلائیں گے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع میں دین کے اہم مبلغ ہوں گے۔

یہ بات یاد رکھنے کے لائق ہے کہ چونکہ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نرینہ اولاد بچپن ہی میں انتقال کر چکی تھی، اس لئے صرف حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی محبت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے غمگین دل کے لئے موجبِ تسکین تھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عزیزوں پر ہمیشہ کرم فرمایا۔ لیکن قوم کے اکثر افراد احسان فراموش ہی رہے اور دل آزاری واذیت پہنچانے سے باز نہ آئے۔

۲۔ خیر خواہی اور مالی امداد کے علاوہ خواہ اپنوں کی ہو یا غیروں کی، آپ ہر متلاشیٔ حق کے لئے خود شمعِ ہدایت بن کر، زبانِ خاموش سے اصلاحِ حال فرماتے رہے۔ اور پھر جو ہستیاں کسی طرح بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق، اخلاص، سیرتِ مبارکہ سے متاثر ہوئیں، ان کو شرفِ صحبت سے فیض یاب فرماتے رہے۔ نہ بحث و مباحثہ۔ نہ صلاح نہ مشورہ۔ البتہ ایک ربطِ قلبی اصلاحِ حال کا موجب رہتا۔ انہیں میں سے سب سے اہم شخصیت حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی تھی جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے عمر میں دو سال چھوٹے تھے، لیکن نہایت سلیم الطبع، تلاشِ حق کے جویا اور محبت و خلوص کے پیکر تھے۔ خیالات کی ہم آہنگی نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے انہیں قریب کر دیا تھا۔ اور وقت کے ساتھ رشتۂ عقیدت میں اضافہ ہی ہوتا گیا۔

اور ایسا ہونا بھی قدرت کی طرف سے، بارِ نبوت میں ایک رفیق کو اُن کا ہم سفر، ہم خیال وہم فکر بنانا تھا کہ وقت آنے پر اس کے صدق وصفا کے جوہر کھلیں۔ تاریخ گواہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حجاب فرمانے کے بعد جس ذات کو دینِ متین کی رہبری کے لئے منتخب کیا گیا وہ یہی یارِ غارؓ تھا جس نے اپنے دوسال کے دورِ خلافت میں کارِ نبوت کے ہر ہر گوشہ کو استحکام بخشا، اور پہلوئے نبیؐ میں جگہ پائی۔ گویا یہ خلافتِ راشدہ کا وہ عظیم دور ہے جو ہر طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دَور کے بعد، اہم ترین اور اعلیٰ ترین دَور قرار پایا۔

قدرت نے جن ہستیوں کو اس دور میں حضورؐ سے قریب فرمایا ان میں خود آپ کے قریبی عزیزوں میں۔ عثمان بن عفانؓ۔ زبیر ابن عوامؓ، عبدالرحمٰن بن عوفؓ۔ سعد ابن ابی وقاصؓ جعفر ابن ابوطالبؓ۔ عبداللہ ابن جحشؓ اور ابوسلمہؓ۔ خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔

ان کے علاوہ قریش کے معزز لوگوں میں حکیم ابن حزام تھے جو حضرت خدیجہؓ کے بھتیجے تھے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اندازِ اخوت ومحبت سے فیض یاب تھے۔ اسی طرح کچھ لوگ مکہ کے باہر آپؐ کی سیرتِ مبارکہ سے متاثر ہوئے تھے، جن میں حضرت سلمان فارسیؓ کی شخصیت بڑی اہمیت کی حامل ہے۔

اس طرح قدرت نے اس دور میں بھی چند ہستیاں ایسی فراہم کردی تھیں جو آپؐ کی ہم فکر وہم خیال تھیں، جو ایک طرف خود آپؐ کے لئے باعثِ تسکین تھیں، دوسری طرف حضورؐ سے لذتِ قرب پاکر ان کے افکار میں بالیدگی پیدا ہوئی اور جنہیں نبوت کا زمانہ ملا، وہ سرفرازِ ایمان ہوئے۔

۳۔ عرب کی بڑی بدنصیبی "رسمِ غلامی" تھی۔ اور غلاموں کے ساتھ ہمدردی کا فقدان، اور ظلم وزیادتی کی فضا عام تھی۔ حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی اصلاح کی طرف بھی اہم قدم اٹھایا۔ اور غلام کو آزاد کرنے کی سنت

قائم فرمائی۔

زیدؓ، حضرت خدیجہؓ کے غلام تھے۔ وہ دراصل یمن کے ایک قبیلہ کے سردار حارث کے لختِ جگر تھے۔ ایک سفر میں ڈاکوؤں نے انہیں اغوا کر لیا۔ انہیں حکیم بن حزام نے بازارِ عکاظ میں خریدا اور اپنی پھوپھی حضرت خدیجہؓ کی خدمت میں پیش کر دیا تھا۔ حضرت خدیجہؓ نے ان کو اپنی خدمت میں رکھا اور شادی کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت کے لئے آپؐ کے حوالہ کیا۔ یہ حضورؐ کے ساتھ سفر حضر میں ساتھ رہتے۔ آپؐ ان سے انتہائی محبت و شفقت فرماتے۔ اب آنحضرتؐ نے خود خدیجہؓ سے زید کو مانگ لیا اور انہیں آزاد کر دیا اور اس طرح غلام کو آزاد کرنے کی بنیاد ڈالی اور ساتھ ہی محبت و شفقت بدستور قائم رکھی۔ یہاں تک کہ جب زید کے باپ حارث کو اپنے بیٹے کی اطلاع ملی تو وہ حضورؐ کے پاس حاضر ہوئے اور کہا کہ "زید میرا بیٹا، میرا نورِ نظر ہے۔ آپ فدیہ لے کر اس کو رہا فرمادیں، میں عمر بھر احسان مند رہوں گا۔" تو آپؐ نے زید سے فرمایا "ہاں۔ اگر تمہارا دل چاہے تو بغیر فدیہ دیئے اپنے باپ کے ساتھ چلے جاؤ کیونکہ تم آزاد ہو چکے ہو، اور چاہو تو یہاں میرے ساتھ رہو۔" لیکن زیدؓ نے حضورؐ ہی کے پاس رہنا پسند کیا اور اس قرب کو ہزار صلبی رشتوں پر ترجیح دی۔ اسی بنا پر صحابہ کرامؓ اس ناز پروردہ شامی غریب الوطن کو زید بن محمدؐ کہنے لگے۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے زیدؓ کے ساتھ مدت العمر وہ برتاؤ رکھا جو باپ اپنے بیٹے کے ساتھ رکھتا ہے۔ (تاریخِ اسلام، مولانا عاشق الٰہی، صفحہ ۵۲)

اس طرح قبلِ نبوت، زیدؓ کو آزاد فرما کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے غلامی کو معاشرہ سے پاک کرنے کی بنیاد ڈالی۔ اور بعد نبوت اللہ تعالیٰ نے ایک اور رسمِ قبیحہ کو مٹایا کہ منہ بولا بیٹا، اصل بیٹے کی طرح نہیں ہوتا۔ جس کا ذکر

قرآنِ حکیم میں آتا ہے۔

۴۔ اب وقت آگیا تھا کہ نورِ مبینؐ کی تجلیوں سے جملہ قبائل کو قریب لایا جائے اب تک حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے فیض یاب ہستیاں اُن کے عزیز اقربا اور چند وہ نفوس تھے جو آپؐ کی سیرتِ مبارکہ سے متاثر ہو کر آپؐ کے لئے باعثِ تسکین بنے۔ اور وہ لوگ بھی جن کی ہمدردی اور مدد کے لئے حضورؐ کے مکان کے دروازے کھلے۔ اور آپؐ کا آغوشِ محبت ہمیشہ وا رہتا تھا، خواہ یہ مسافر ہوں یا مسکین، تنگ دست ہوں یا حاجت مند۔ آپ ان کی دستگیری اپنا فرضِ منصبی سمجھتے تھے۔

آپؐ کی عمر شریف اس وقت ۳۵ سال کی تھی۔ خانہ کعبہ ابھی انہیں پرانی بنیادوں پر قائم تھا۔ وہی چھوٹی دیواریں جن کو امتدادِ زمانہ نے شکستہ کر دیا تھا، جس کی ابتدا حضرت آدمؑ کے مبارک ہاتھوں سے ہوئی تھی اور حضرت نوحؑ کے زمانہ میں غرقِ آب ہو گیا تھا۔ جس کی تعمیر نو حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ نے فرمائی تھی لیکن اب پانی کے ریلوں سے اس میں شگاف پڑ گئے تھے۔ اس پر چھت بھی نہ تھی۔ ضرورت کا احساس سب کو تھا لیکن خانہ کعبہ کو از سرِ نو تعمیر کرنے کی ہمّت نہ ہوتی تھی۔ دنیا میں کوئی قوم نہیں جو خانہ کعبہ کا احترام نہ کرتی ہو اور اس کی قدامت اور عظمت کی معترف نہ ہو۔ ایسی عمارت کو مسمار کرنے کا خیال بھی ان کے لئے باعثِ تردّد تھا۔ پھر یہاں قدرت کی طرف سے کچھ ایسے پہرے بٹھا دیئے گئے تھے کہ اس کے مسمار کرنے کی ہمت کرنا بھی لوگوں کے لئے آسان نہ تھا۔

خانہ کعبہ کے قریب ایک کنواں تھا جس میں خانہ کعبہ کی نیاز و نذر قبولیت کے لئے ڈالا جاتا۔ اس میں زہریلا خونخوار اژدھا رہتا تھا جس کا معمول تھا کہ ہر روز صبح کنویں سے نکل کر کعبہ کی دیوار پر آ بیٹھتا اور جو کوئی اس

کے پاس جاتا، وہ پھن اُٹھاتا اور منہ پھاڑ کر اس پر حملہ آور ہوتا تھا۔ اس لئے رہی سہی ہمتیں اور پست ہوگئیں اور خانہ کعبہ کے پاس جانے کا نام نہ لیا۔

اللہ کی شان کہ ایک روز صبح کے وقت وہ اژدھا حسبِ معمول اپنی خوفناک نظروں سے اہلِ مکہ کو خوفزدہ کر رہا تھا کہ دفعتاً ایک پرندہ آسمان سے اُترا اور اژدھے کو اپنے سخت پنجے میں داب کر اڑا لے گیا۔ اس وقت ہر فرد و بشر کا خوفزدہ دل مطمئن ہوا اور جگہ جگہ تذکرے ہونے لگے کہ ربّ العزت کو اپنے گھر کی دوبارہ تعمیر کرانا منظور ہے۔

(تاریخ اسلام صفحہ ۴۹)

اہلِ قریش اس کی تعمیر کے لئے مستعد ہوگئے۔ یہ بھی مشیّتِ الٰہی کا ایک کرشمہ تھا کہ اسی زمانہ میں ایک کشتی جدہ کے ساحل سے ٹکرا کر پاش پاش ہوگئی اور اس کی لکڑی اور لوہا خانہ کعبہ کی تعمیر کے لئے قدرت نے فراہم کر دیا۔

غرض مشیّتِ الٰہی نے وہ سب اسباب مہیّا فرما دیئے جو اس نورِ مبین کے تعارف اور بیت اللہ کی تعمیرِ نو کے لئے ضروری تھے۔ اور جس کو رہتی دنیا تک توحید کا مرکز اور اسلام کا قلعہ ہونا روزِ اوّل ہی سے مشیّتِ الٰہی میں قرار پاچکا تھا۔ چنانچہ تعمیرِ کعبہ کا کام شروع ہوا۔ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم بھی دوسروں کے ہمراہ بنفسِ نفیس پتھر اُٹھا اُٹھا کر دیتے تھے۔ جب تعمیر مقامِ حجرِ اسود تک پہنچی تو قبیلہ کے لوگوں میں اختلاف پیدا ہوا کہ حجرِ اسود کو کون اس کی جگہ نصب کرے۔ نوبت جنگ و جدل تک پہنچی۔ بالآخر باہم مشورہ سے یہ بات طے ہوئی کہ جو شخص کل سویرے سب سے پہلے مسجدِ حرام میں داخل ہو وہ اس نزاع کا فیصلہ کرے۔ اللہ کو یوں ہی منظور تھا اور یوں ہی ہوا۔ کہ جو ہستی فجر میں سب سے پہلے مسجدِ حرام میں داخل

ہوئی وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تھی۔ جب لوگوں نے آپؐ کو دیکھا تو یک زبان ہو کر کہا "ہمارا امین آ گیا۔ یہ ہمارے نزدیک امین اور دیانتدار ہیں۔ ہمیں ان کا فیصلہ منظور ہے"۔ حضورؐ نے اپنی چادرِ مبارک بچھا دی۔ پھر اپنے دستِ مُبارک سے سنگِ اسود اُٹھا کر اس پر رکھا۔ پھر قبیلہ والوں سے کہا کہ ہر قبیلہ والا اس کا ایک ایک کونہ پکڑ کر اوپر اُٹھائے۔ جس پر عمل کیا گیا۔ جب وہ پتھر اپنی جگہ تک پہنچا تو حضورؐ نے دستِ مبارک سے اُٹھا کر اس کی جگہ نصب فرمایا۔

یہ واقعہ نہ صرف حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی فراست، ذہانت، معاملہ فہمی پر شاہد ہے بلکہ اس بات کی بھی گواہی ہے کہ ۳۵ سال کی عمر مبارکہ میں تمام قبائل کو آپؐ کی امانت و صداقت پر پورا اعتماد تھا۔ دراصل یہ واقعہ پیش ہی اس وقت اس لئے آیا کہ قبائل کے لوگ دیکھ لیں کہ قدرت نے اُنہیں میں سے ان کے لئے ایک پاک نفس رہنما کا انتخاب فرمایا ہے اور وقت آنے پر اس کی امانت و صداقت پر شبہ نہ کریں۔ اس میں یہ حقیقت بھی مضمر تھی کہ وحدہٗ لا شریک کی عبادت کے لئے جو گھر حضرت ابراہیمؑ کے ہاتھوں تعمیر ہوا تھا جس سے یہود و نصاریٰ اور جملہ قوموں کو عقیدت تھی، جو عنقریب ہی مرکزِ توحید بننے والا تھا، اس کی تکمیل بھی نبی آخر الزماںؐ ہی کے دستِ مبارک سے ہو۔ اور آپؐ کے متبعین، آپؐ کے امتی اس کو آباد کرنے والے اور پیغامِ توحید عام کرنے والے ہوں۔ اور خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مضطرب قلبِ مبارکہ کے لئے اس میں یہ تسکین مضمر تھی کہ آپ کے دستِ مبارک سے تکمیل پایا ہوا کعبہ آپؐ ہی کے ہاتھوں اسلام کے فروغ کا مرکز ہو گا۔

ایک جانب آفاق کی یہ نشانیاں، دوسری جانب خود نفسِ رسولؐ میں

ایک اضطراب کی کیفیت۔ گویا دونوں ہی آپؐ کو آپؐ کے فرائض منصبی کی طرف کشاں کشاں لئے جا رہے تھے۔ آپؐ کن خیالات میں گم رہتے تھے، اس کا اندازہ بھی مشکل ہے۔ آپؐ کا بیشتر وقت خلوت نشینی، اور غور و فکر ہی میں گزرتا۔ آپ اکثر گھر سے نکل جاتے اور اسی عالمِ گمشدگی میں ایک بار جبلِ نور کے اس غار تک پہنچ گئے جہاں رمضان کے مہینے میں آپؐ کے دادا عبد المطلب غور و فکر کی حالت میں معتکف ہوا کرتے۔ اِس جبلِ نور کو پہلے جبلِ حرا بھی کہتے تھے۔ اور یہیں وہ غارِ حرا ہے جو آج بھی اسی قدیم انداز سے اپنے زائرین کو تصورِ رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم سے سرفرازی بخشتا ہے۔ اور اس کی پُر نور فضائیں رُوح کے لئے رَوح کی فراہمی کرتی ہیں۔

اس کی خاموش فضائیں، اس کا محلِ وقوع، اس کی ساخت، سب ہی اپنے دامن میں بے شمار فیوض و برکات لئے ہوئے ہے۔ اس کی بناوٹ اس قسم کی ہے کہ ایک اونچا سا ٹیلہ ہے جس پر یہ غار ہے۔ اس کی دو چٹانیں اس طرح جُڑتی ہیں کہ ان کے درمیان الف "اللہ" کی طرح ایک روشنی کی جگہ بن گئی ہے جو ٹھیک خانہ کعبہ کے سامنے ہے۔ اس کے ایک جانب اسی بلندی پر ایک کھلا مقام ہے جہاں کھڑے ہو کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ تمام عالم اس سے بہت پست ہے۔ یہی مقام حضورؐ کے قلبِ مضطرب کے لئے موجبِ سکون بنا۔

آپؐ وہاں سے واپس آئے اور حضرت خدیجہؓ سے فرمایا کہ میرے لئے سکون کا سامان ہو گیا ہے۔ حضرت خدیجہؓ بھی آپؐ کے ساتھ کچھ ستّو یا مناسب توشہ ساتھ کر دیتیں اور آپؐ اسی غار کا رُخ فرماتے جہاں آپؐ پر استغراق کا عالم طاری رہتا۔ یہ تنہائیاں، یہ خلوتیں، پہلے ہفتوں پھر مہینوں میں بدلتی گئیں۔ اور یہ دور تقریباً پانچ سال پر محیط رہا۔ محدّثین نے غار میں آپؐ کی عبادت کو

تحنّث سے تعبیر کیا ہے۔ یعنی آپؐ اس طرح غار میں قبلہ رُخ اس انداز سے محوِ عبادت رہتے جیسے نماز میں التحیات میں بیٹھتے ہیں۔ نگاہیں قلب کی جانب قلب مالکِ حقیقی سے لَو لگائے ہوئے۔

یہ بھی قرینِ قیاس ہے کہ غار کی ان تنہائیوں میں آپؐ محوِ حیرت ہوں! کہ یہ عالم کیا ہے؟ ہمیں یہاں کیا کرنا ہے؟ اس کے خالق کی ذات صفات کا شاہکار انسان، اس کے فرائض کیا ہیں؟ اُس کو اِس کے فرائض کی طرف کس طرح توجہ دلائی جائے؟ اس اہم کام کی ابتداء کہاں سے ہو؟ اس کے لئے کیا راہ اختیار کی جائے؟

عمرِ شریف چالیس سال ہونے کو آرہی ہے۔ اور اب آپؐ کبھی کسی کُھلے میدان میں اور کبھی اس غار میں شب و روز مشغولِ دعا رہتے۔ آپؐ کا یہ معمول ہو گیا کہ اعتکاف وخلوت سے فارغ ہوئے تو مساکین کو کھانا کھلاتے اور سب سے پہلے بیت اللہ پہنچتے۔ اس کا سات بار طواف فرماتے پھر گھر جاتے اور گھر کے کاموں میں مشغول ہو جاتے۔

بالآخر وہ وقت آگیا کہ رات کی سنسان گھڑیوں میں، صبح کے سہانے وقت تنہائی کے عالم میں، بادِ صبا کی طرح ایک آواز سنائی دیتی کہ "تم بشر ہو لیکن اللہ کے پیغمبر" جس جانب آپؐ جاتے اس طرف ہر شے پر جبروتی جلال کے آثار ہویدا اور بتوں کو یہ کہتا پاتے کہ ہم سے علیحدہ رہیئے کیونکہ آپ اللہ کے پیغمبر، ہماری نگونساری و ہلاکت کا باعث ہوں گے۔ جب بھی آپؐ آبادی سے دور نکل جاتے تو بارہا ایسا اتفاق ہوا کہ آپؐ کو آتے اور جاتے وقت درخت اور پتھروں سے "السلام علیکم یا رسولؐ اللہ" کی آواز سنائی دیتی اور آپؐ حیران ہو کر دائیں، بائیں اور آگے، پیچھے دیکھتے مگر بجز درخت اور پتھروں کے کچھ نظر نہ آتا۔ غرض آپؐ پر وہ حقائق منکشف ہونے لگے جن سے

آپؐ نے جہان کو منور کیا۔ (تاریخ اسلام۔صفحہ ۵۳)

ایک طرف شجر و حجر رسالت کی گواہی دینے کے لئے بے تاب تھے۔ دوسری جانب خود قلب اطہر کا یہ عالم تھا کہ جو کچھ رات کو خواب میں دیکھتے، بعینہٖ وہی پیش آجاتا۔ سچے خوابوں کو حضورؐ نے نبوّت کا چھٹا حصّہ بتایا ہے۔

آخر خلوت کدوں کے جگمگا اٹھنے کا وقت آگیا

اور اب

بقول حضرت مولانا عاشق الٰہیؒ

"ریگستانی زمین کی ریت کا ہر ذرہ اور اونچے اونچے پہاڑوں کا ہر پتھر، نصاریٰ کا گرجا اور یہود کا کلیسا، گویا آپؐ کے وجودِ باوجود کی ہر وارِد وصادر کو بشارت دے رہے تھے اور بزبانِ حال پکار رہے تھے کہ جہالت وکفر کو مٹانے والا پیغمبروں کا سردار، ساری زمین کو ماہتابِ ہدایت کی روشنی سے منوّر کر دینے والا نبی، بہت جلد دنیا میں آنے والا ہے۔"

(تاریخِ اسلام صفحہ ۵۵)

یعنی وہ نبیؐ

جو کلامِ ربّانی میں "کافّۃً لِلنّاس"، اور کائنات کے لئے رحمۃٌ للعالمین ہوگا، اور جس کا ذکرہ دلوں کی ٹھنڈک اور راحتِ جان بنے گا۔

الصّلوٰۃُ وَالسّلامُ علیکَ یارسولَ اللہ

۶

ھو اللہ

احدٌ صمدٌ

بسم اللہ

باب چہارم

سرفرازیٔ نبوّت سے ہجرت تک

(مکّی زندگی)

"اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصّٰابِرِیْنَ"

توحید کی پُر نور تجلّیات سے نورِ مبین کا قلوب کو منوّر کرنا

اور

ضبط۔ تحمّل۔ صبر۔ استقلال

کی مستحکم بنیادوں پر سیرت کی تشکیل فرمانا۔

محمدؐ، کی نبوّت دائرہ ہے نورِ وحدت کا
اسی کو ابتدا کہئے، اسی کو انتہا کہئے

(ماہر القادریؒ)

باب چہارم

یہ باب حضور نور مبینؐ کے انوار کا گویا وہ حصہ ہے جس کو قرآنِ حکیم کی زبان میں "سبحان الذی اسریٰ" کی منزل قرار دیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ اسی دور میں تجلیاتِ ربانی اور قربِ الٰہی کی نعمت سے سرفرازیاں ملیں۔ عبدہٗ ورسولہٗ کے تعلق کو آشکارا کیا گیا۔ وہ قرب یزدانی جسے قابَ قوسین اوادنیٰ سے سمجھایا گیا۔ وہ دید جسے مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰی سے ذہن نشین کرایا گیا۔

اور پھر یہی وہ دور ہے جس میں عبد نے اپنی عبدیت و تسلیم و رضا کی ہر آزمائش میں ضبط و تحمل، صبر و استقلال کی بے مثال مثالیں پیش فرمائیں خود ہی نہیں بلکہ ہر اُس ہستی نے جو اس نورِ مبینؐ سے قریب آئی اور جس کی نگاہوں کو اِسی نورِ مبینؐ کی بصیرت نصیب ہوئی، اور جس نے اُس ذاتِ مبارکہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنی محبت، تعلق، خلوص، لگاؤ اور جان نثاری کا وہ ثبوت دیا کہ رہتی دنیا تک اُن کی قربانیاں اسلام کے فروغ کی ضامن ہوئیں اور رہیں گی۔ ان میں سے ہر ایک سابقون الاولون کی فہرست میں شامل ہوا۔ اور یہی وہ دور ہے جس میں حضرت ابراہیمؑ سے لے کر حضرت عیسیٰؑ تک جس قدر صحیفے نازل ہوئے اور جن ہدایات و احکامات سے انہیں نوازا گیا، اس کا خلاصہ محمدؐ رسول اللہ کے مختصر ۱۳ سالہ دور میں اِس طرح نظروں کے سامنے آیا جیسا کہ خود ان انبیاءؑ کے دور میں وہ آشکارا ہوا تھا۔

گویا ایک طرف یہ دَور رسول اللہؐ کی عظمت و شان، جمال و جلال کا ترجمان ہے تو دوسری جانب یہ عبدہٗ اپنے تقاضائے بشریت کے تحت اپنی انتہائی عاجزی، بےکسی، دوستوں کے طعنے، دشمنوں کی دشنام طرازی اور ہر طرح کی ممکن اذیتوں اور تکلیفوں پر شاہد ہے، اور اُس کا توکل علی اللہ اور صبر و تحمل کے ساتھ تبلیغِ دین کے مختلف مراحل، اُس کے عزم و استقلال اور اُس کے عبدِ کاملؐ ہونے کی شہادت دے رہے ہیں۔

مختصراً یوں کہیئے کہ نبی رسول اللہؐ کی تفسیر یہی دَور کر رہا ہے۔ اور اہلِ ایمان کی آنے والی نسلوں کے لئے ان بنیادی اصولوں کی نشاندہی کر رہا ہے جن پر قائم رہ کر ہی دنیا و آخرت کا فروغ اُن کا نصیبہ ہو سکتا ہے، جس کی بشارت قرآنِ حکیم نے اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِينًا کے الفاظ میں دی۔ اور آج جب سارے 'ازم' اور "مذاہب" ناکامیوں سے ہم کنار ہوتے جاتے ہیں، انہیںؐ کے پرچم سے انسانیت کی آس وابستہ ہے...... لا تقنطوا من رحمة الله کی صدائیں قلب کے لئے ڈھارس بنی ہوئی ہیں۔

آیئے

اس عظیم دَور پر ایک اجمالی نظر ڈالیں جس نے دنیا کو صدیقِ اکبر، عمرِ فاروق، عثمان غنی، علی مرتضیٰ، بلال حبشی، سلمان فارسی، حضرت امیر حمزہ رضی اللہ عنہم، خدیجہ الکبریٰ، اسماء رضی اللہ عنہا جیسی پُر وقار، پُر عزم، پُر حوصلہ، پُر اخلاص ہستیاں عطا فرمائیں۔

آیئے

اس نورِ مُبین صلی اللہ علیہ وسلم کی اُسی کملی، اُسی رداءِ مُبارک کے تانے بانے سے فیض یاب ہوں جن کو قرآن نے سب سے پہلے يَا أَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ، يَا أَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ سے خطاب فرمایا۔ اور دیکھیں کہ چالیسؐ سال کے انتظار کے بعد جو

آفتابِ حقیقت ضوفشاں ہونے جارہا ہے، اس کی کرنیں اسی کالی کمبلی سے کس طرح ہویدا ہوتی ہیں۔ اور باری تعالیٰ اپنے نورٌ وانوار کی تجلّیات سے انسانیت کو کس طرح نواز تا ہے۔ غور کریں کہ اس وحدہٗ لاشریک کی عبادت کی طرف لگا دینے کے لئے اس کمبلی والےؐ کے طریقۂ کار کیا ہیں۔ پھر یہ نورِ مبینؐ خود کن مراحل سے گذرتا ہے اور کن عظیم اور مستحکم بنیادوں پر اپنے سے قریب آنے والی ہر ہستی کی تعمیر فرماتا ہے۔

یہی کمبلی اور ردائے مبارک جو رسالت اور عبدیت کے تانے بانے سے بنی ہے اپنے اندر سبحان الّذی اسریٰ کی رفعتِ شان کے انوارِ رسالت لئے ہوئے ہے اور شعبِ ابی طالب کی دردناک اور جاں کاہ اذیتوں سے گذرنے کے لئے ہر اس عبد کو دعوتِ صبر و تحمّل دے رہی ہے جو اپنے رب سے ملنے کے لئے بیتاب ہو۔

یہ نورِ مبینؐ

اب پیکرِ بشریت میں، لباسِ عبدیت سے مزیّن ہے۔ قلبِ مبارک

لاالٰہ الاّ اللہ کی جلوہ گاہ ہے،

مراحلِ تبلیغ کا آغاز ہے۔ آئیے دیکھیں

کہ اللہ جو اس کا رب ہے، اس کا سہارا، اس کا ہادی، اس کا وکیل، اس کا نصیر، کس طرح اپنی قدرتِ کاملہ اور حکمتِ بالغہ سے اُسے راہِ ہدایت دکھا رہا ہے۔

سبحان اللہ وبحمدہٖ　　　　سبحان اللہ العظیم

○

پہلی ہی بات

جو سمجھائی جارہی ہے وہ یہ ہے کہ سیرت کی تشکیل اور فلاحِ دارین کی بنیاد

علم ہے۔ وہ علم جو ظاہر و باطن، اوّل و آخر کی فہم میں معاون ہو، جو خود صفتِ ذات بن کر آشکارا ہو۔ "وہ علم جو چیزوں کو اُسی طرح دیکھے جیسی وہ ہیں۔" جس کا تعلق محدود اور لامحدود دونوں سے ہو۔ لیکن جس کی جڑیں زمینِ قلب میں مستحکم ہوں اور جس کی شاخیں عرشِ الٰہی کی لامحدود فضاؤں سے قریب کرنے کی ضامن ہوں۔

جو علم محدود تک رہ گیا وہ علم نہیں جہل ہے۔

خلعتِ نبوّت

غارِ حرا کی تاریک اور سنسان فضا ہے، عمرِ شریف چالیس سال کی مدت مکمل کر چکی ہے۔ دوشنبہ ہی کا دن ہے اور اکتالیسویں سال کا آغاز ہے، کہ بارگاہِ رسالت میں جبرئیلِ امینؑ وحیِ الٰہی کے ساتھ حاضر ہوتے ہیں اور کہتے ہیں کہ "اے محمد صلّی اللہ علیہ وسلّم آپ کو مژدہ ہو کہ میں جبرئیلؑ ہوں اور مجھے حق تعالیٰ نے آپ کے پاس بھیجا ہے۔ آپؐ امت کی جانب خدا کے رسول ہیں۔ آپ جن و انس کو کلمۂ طیبہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کی دعوت دیجئے۔ اور کہا "اِقْرَاْ" (اے محمدؐ! پڑھئے، اے حمدِ الٰہی میں مستغرق) پڑھئے۔" حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا کہ میں پڑھا ہوا نہیں ہوں۔ اس کے بعد جبرئیلؑ نے آپ کو اپنی آغوش میں لیا اور پوری طاقت صرف کی، پھر جبرئیلؑ نے حضورؐ کو چھوڑ دیا۔ دوبارہ کہا پڑھئے۔ آپؐ نے وہی جواب دیا۔ جبرئیلؑ نے دوبارہ آغوش میں لے کر دبایا۔ پھر تیسری بار بھی یہی ہوا اور کہا۔

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ ﴿۱﴾ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ﴿۲﴾ اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ ﴿۳﴾ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ﴿۴﴾ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ ﴿۵﴾

پڑھئے اپنے رب کے نام سے جس نے پیدا کیا آدمی کو خون کی پھٹکی سے

بنایا، پڑھئے۔ اور آپ کا رب ہی سب سے بڑا کریم ہے جس نے قلم کے ذریعہ سے علم سکھایا اور انسان کو وہ باتیں سکھائیں جن کا علم اس کو نہ تھا۔

(مدارج النبوت جلد دوم صفحہ ۴۹-۴۸)

اس آیتِ کریمہ کے نزول اور اس کے بعد کے واقعات میں حسبِ ذیل امور بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔

۱۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جبرئیلؑ کے کہنے پر کہ "پڑھئے" نہ پڑھا۔ ہر چند کہ جبرئیلؑ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی آغوش میں تین بار بھینچا اور خوب دبایا، خواہ اپنی طاقت کے برابر، خواہ حضورؐ کی قوت برداشت کے برابر (جو اس عاجز کے نزدیک ہنوز وافر تھی وہ اس کو کیا دباتے۔ جزو کل پر سبقت کیسے پا سکتا)۔ ہاں جب جبرئیلؑ نے فرمایا کہ اللہ کے نام سے پڑھیئے تو حضورؐ نے پانچوں آیات کی تلاوت فرمادی۔

منشاء یہ تھا کہ امت کے لئے صرف پڑھنا فرض نہیں، بلکہ تمام پڑھنا اللہ کے نام، اللہ کے لئے مغفرت الٰہی کے لئے ہو۔ وہ علم حاصل کرے جو نافع ہو۔ اپنے لئے بھی اور اللہ کی مخلوق کے لئے بھی۔ اور اب اس کا حاصل کرنا امت کے لئے گویا فرض ہو گیا۔

۲۔ پھر، واقعہ کا دوسرا حصہ یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا گھر کی جانب مراجعت فرمانا اور حضرت خدیجہؓ سے یہ واقعہ بیان فرمانا اور کہنا "زَمِّلُونِی زَمِّلُونِی" مجھے کمبل اڑھا دو، مجھے کمبل اڑھا دو۔ انہوں نے آپ کو کمبل اڑھایا اور سر دیانی کے چھینٹے دیئے تاکہ خوف دور ہو۔ پھر فرمایا کہ "مجھے یہ ڈر ہے کہ میں کسی خطرہ میں نہ پڑ جاؤں۔"

واضح رہے کہ آپؐ کا ان الفاظ کا ادا فرمانا کسی دنیاوی خوف یا جبرئیلؑ کے دبانے کے باعث نہ تھا۔ بلکہ بارِ نبوت کے تحمل اور برداشت کے ساتھ اور

اُس کے فرائض کی کماحقہٗ ادائیگی کے احساس کے باعث تھا، خصوصاً ان حالات میں جو عرب میں عام تھے۔ یہ بارِ رسالت تھا، یہی وہ بارِ امانت تھا جسے انسان نے اُٹھایا۔ اور اب اُس فریضہ کی ادائیگی کا وقت آ گیا تھا، جزیرۂ عرب ہی میں نہیں سارے عالم میں، انسانوں ہی میں نہیں بلکہ عالمِ اجنّہ میں، صرف اپنے ہی زمانہ میں نہیں بلکہ رہتی دنیا تک اس بار کو اُٹھانا تھا، عالمِ رنگ و بُو میں مختصر قیام کے دوران بھی اور حجاب فرمانے کے بعد بھی۔ وہ فریضہ جو قیامت کے قائم ہونے سے ختم نہیں ہو جاتا، بلکہ وقت کے ساتھ اُس کی ذمہّ داریاں بڑھتی رہتی ہیں۔ جو بعدِ وصال، دورانِ میدانِ حشر اور مقامِ شفاعت، جملہ اُمتّوں کے لئے سفارش کا آپؐ ہی کی ذاتِ انور کے ساتھ خاص تھا۔

نورِ مُبینؐ کے پیشِ نظر یقیناً فرشتے کے دبانے سے ماضی کی وہ یادیں تازہ ہو گئی ہوں گی، جن کو امتدادِ زمانہ نے ذہن سے پردہ پوش کر دیا ہوگا۔ اور یہ تین بار کا دبانا تین ادوار کی یادیں تازہ کرنا ہی ہو سکتا ہے۔ گویا پہلا وہ دور جب ربّ العزّت نے نُورِ مبارک کی تخلیق فرما کر، اُسی سے لوح و قلم، عرش و کرسی پیدا فرمائے تھے۔ دوسرا پھر اسی سے کائنات کی تخلیق فرمانا، بالآخر حضرت آدمؑ کو خلیفۃ اللّٰہ فی الارض کا متحمل بنانا۔ یقیناً یہ وقت عظیم تفکّر، عظیم احساسِ ذمہ داری، عظیم بارِ امانت کے تحمل اور مکمل طور پر توکل علی اللّٰہ کی گھڑی تھی۔

سوچئے! جہاں صرف قرآن کی آیت کے نازل ہوتے وقت حضورؐ ایک بارِ گراں محسوس فرماتے اور پسینے آ جاتے، وہاں اس عظیم گھڑی اور اُن ناقابلِ بیان لمحات میں آپؐ پر جو بھی گذری ہو، اس کا بیان کوئی کیا کر سکتا ہے۔

ہاں

حضرت خدیجہؓ نے اس کے وہی معنی سمجھے جو ایک پاک طینت، شریفُ النفس

خاتون سمجھ سکتی تھی۔ گو ان کی محدود فکر کا دائرہ حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم ہی کی سیرت مبارکہ کے چند برسوں تک محدود تھا لیکن اپنی اس محدود فکر انسانی کے تحت، وہ کہا جو وہؓ اپنے نزدیک حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کی تسلّی کے لئے کہہ سکتی تھیں۔ بایں ہمہ اُن کے یہ الفاظ ایک سیرت نگار، ایک مؤرخ کے لئے، حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کی قبلِ نبوّت زندگی کے لئے ایک بڑی شہادت قرار دیئے گئے۔ حضرت خدیجہؓ نے تسلّی فرمائی اور کہا۔

"آپ غم نہ فرمایئے اور خوش رہیئے کیونکہ اللہ تعالیٰ آپ کو کسی خطرہ میں نہ ڈالے گا، اور نہ آپ کو کسی کے سامنے ذلیل و رسوا ہونے دے گا۔ یقیناً اللہ تعالیٰ آپ کے ساتھ اچھائی ہی فرمائے گا کیونکہ آپ صلۂ رحمی فرماتے ہیں، عیال کا بوجھ اٹھاتے ہیں، ریاضت و مجاہدہ کرتے ہیں، مہمان نوازی فرماتے ہیں، بیکسوں اور مجبوروں کی دستگیری کرتے ہیں، محتاجوں اور غریبوں کے ساتھ بھلائی کرتے ہیں، لوگوں کے ساتھ حُسنِ اخلاق سے پیش آتے ہیں، لوگوں کی سچائی میں ان کی مدد اور ان کی بُرائی سے حذر فرماتے ہیں، یتیموں کو پناہ دیتے ہیں اور امانتیں ادا فرماتے ہیں۔" (مدارج النبوّت جلد دوم صفحہ ۵۰)

حضرت خدیجہؓ کے یہ الفاظ حضور سرورِ کائنات صلّی اللہ علیہ وسلّم کے اس حد تک تو باعثِ تسکین ضرور ہوئے ہوں گے، جو ایک رازداں رفیقِ حیات کی زبان سے سُن کر آپؐ کو ہو سکتی تھی لیکن اس شہادت میں جن امور کی طرف نشاندہی کی گئی ہے وہ حق و حقانیت کی ایک لازوال تصدیق ہے جس کا ثبوت ہر دَور میں ملتا رہے گا۔

عجب لطف کی بات یہ ہے کہ یہ تصدیق قدرت اس انداز سے حضرت خدیجہؓ کی زبان کروا رہی ہے کہ حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کے قلبِ اطہر میں جو اصل گرانی پیدا ہوئی اس میں اللہ ربّ العزّت کی اعانت و کرم

کا تصوّر اور خود آپ صلی اللہ وسلّم کی صفاتِ نبوّت آپؐ کے لئے موجبِ تسکین ہوں۔

دوسرا اہم پہلو اس شہادت کا یہ ہے کہ انسان فطرۃً اہم امور میں انسان ہی کی گواہی قبول کرتا ہے، جب کہ رسول، ایک امر کی صداقت کے لئے اپنے ربّ کی گواہی کا منتظر ہوتا ہے۔ حضرت خدیجہؓ کی یہ شہادت یقیناً نہ صرف اس وقت حضورؐ کے لئے تھی بلکہ اللہ تعالیٰ نے انؓ کو اس حقیقت کے اعتراف کی سعادت اس لئے عطا فرمائی کہ رہتی دُنیا تک یہ عوام و خواص کے لئے سند رہے۔ یہی رسالت اور عبدیت کے وہ تانے بانے ہیں جنہیں سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلّم کی سیرتِ مبارکہ کے مطالعہ کے وقت پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے۔

۳۔ اس سلسلہ میں ایک تیسرے واقعہ کا بیان بھی نہایت ضروری ہے۔ اور یہ وہ واقعہ حضرت خدیجہؓ کا حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کو اپنے چچازاد بھائی ورقہ بن نوفل کے پاس لے جانا ہے۔ ورقہ بن نوفل حضورؐ سے سوال کرتے ہیں اور آپؐ کا پُر صداقت بیان سُن کر اِن الفاظ میں حقیقت کا اعتراف کرتے ہیں جو ایک تاریخی شہادت بن جاتے ہیں۔ ورقہ نے کہا: "یہ وہی ناموس ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السّلام پر نازل ہوا تھا۔ اے محمدؐ! آپؐ کو مبارک ہو کہ آپ اللہ کے رسول ہیں۔ مَیں گواہی دیتا ہوں کہ آپؐ وہی نبی ہیں جس کی حضرت عیسیٰ علیہ السّلام نے بشارت دی کہ "میرے بعد ایک رسول مبعوث ہوگا جس کا نام نامی احمدؐ ہے[1]۔" اور پھر کافروں کے ساتھ آپ کے جہاد، کفّار کا آپ کو رنج و غم اور اذیتیں پہنچانے اور ہجرت پر مجبور کرنے

---

[1] مدارجِ نبوّت جلد دوم صفحہ ۵۱

کے واقعات، تورات و انجیل کی روشنی میں، بیان کئے۔ یہی نہیں بلکہ یہ بھی وعدہ کیا کہ اگر میں زندہ رہا تو میں آپؐ کی مدد کروں گا۔

اس واقعہ میں یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ حضورؐ کا بلا تامّل ورقہ کے پاس چلا جانا خود حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کی اپنی تسلّی کے لئے نہیں بلکہ حضرت خدیجہؓ کی دل جوئی کے ساتھ ان کی قوتِ ایمانی کو مستحکم بنانے کے لئے تھا۔ اور اس لئے بھی تھا کہ دینِ عیسوی کا ایک جیّد عالم، جو خود بھی موحّد تھا، حق کی تلاش میں تھا، اس پر بھی یہ حقیقت عیاں ہو جائے اور اس کے ذریعہ اس جیسی اور ہستیاں جو متلاشئ حق تھیں وہ بھی اس حقیقت سے بے خبر نہ رہیں۔

یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کا وہ طریقۂ تعلیم و تربیت ہے جس کو اللہ ربّ العزت "حکمت" سے تعبیر فرماتا ہے۔ اور جس سے اللہ تعالیٰ نے بدرجۂ اتم حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کو سرفرازی بخشی تھی تاکہ تبلیغِ حق کے ہر مرحلہ میں آپؐ فطرتِ انسانی اور اس کے حدود کو پیشِ نظر رکھیں اور ایسا کوئی ذریعہ اختیار فرمانے میں تامّل نہ فرمائیں جو حق کو عام کرنے کے لئے ضروری ہو۔

○

ان معروضات کی روشنی میں اب ان آیاتِ کریمہ پہ ایک نظر ڈالیں تو محسوس ہوگا کہ یہ اقرأ محض ایک حکم تک محدود نہیں، بلکہ اللہ ربّ العزت کی جانب سے اپنے حبیبؐ کو ایک منشور عطا ہوا ہے جو ایک طرف آپؐ کے تبلیغی مراحل کی نشاندہی کر رہا ہے تو دوسری طرف عنایاتِ الٰہی اور اس کی کرم فرمائی کے وسیلہ سے بھی آگاہی بخشتا ہے

۱۔ جبرئیلِ امینؑ حضورؐ سے خطاب کرتے ہیں، یعنی اس ہستی سے جسے اللہ نے تمام خوبیوں، تمام تعریفوں سے نوازا ہے۔ اور فرماتے ہیں "اِقْرَأْ"

لیکن آپؐ آیتِ مبارکہ کی تلاوت نہیں فرماتے ہیں۔ یہ مقامِ رسالت ہے۔ رسول جو پاتا ہے اللہ سے پاتا ہے۔ بلا اس کے حوالہ کے وہ کوئی کام نہیں کرتا۔

۲۔ لیکن جب "اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ" فرمایا یعنی اپنے ربّ کا نام پڑھیئے، تو آپؐ کے قلبِ سلیم اور آپؐ کی ذاتِ مقدسہ نے اس میں وہ سب کچھ پالیا جو منشاءِ الٰہی تھا۔ یعنی یہ ربِّ محمدؐ ہی کا فرمان ہے جو ہر حال میں حضورؐ کا نگرانِ حال ہے اور رہے گا۔ اور یہ منشور ایک ابدی منشور ہے۔

۳۔ پھر ربّ کی مزید ثنا۔ جو خالقِ کائنات ہے، جس نے سب سے پہلے اس نورِ محمدیؐ سے کائنات کی تخلیق فرمائی تاکہ مراحلِ تبلیغ میں جملہ عالمین کی خیر خواہی حضورؐ کے پیشِ نظر رہے۔

۴۔ ساتھ ہی آپؐ کی توجّہ مبارک "خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ" کی طرف مبذول فرمائی گئی، تاکہ جملہ بنی نوعِ انسان جس کی طرف انبیاء علیہم السلام مبعوث ہوئے اور جس کی جانب آپؐ کو پیغمبرِ آخر بنا کر مبعوث کیا جا رہا ہے، ان سب کی امت کی خیر خواہی حضورؐ کا فرضِ عین رہے۔

۵۔ یہ بات بھی واضح ہو جائے کہ تخلیقِ کائنات ہو یا تخلیقِ انسان، دونوں کی غرض اللہ وحدہٗ لاشریک کی معرفت ہے۔ تاکہ انسان اپنے مقصدِ حیات سے غافل نہ ہو۔

۶۔ اور نہ صرف زبان سے بلکہ زبانِ قلم سے ان حقائق کو آنے والی قوموں کے لئے محفوظ کیا جائے تاکہ جن کی تقدیر میں ان سے فیض یاب ہونے کی سعادت ہے، وہ اس سے محروم نہ رہیں۔

۷۔ پھر یہ علم محض وہ علم نہ ہو جو حواسِ خمسہ سے حاصل کیا جاتا ہے بلکہ وہ علم ہو جو انسان خود نہیں جان سکتا تھا۔ یعنی ایمان کی وہ شاخیں اور شقیں جن کا

تعلق محض اللہ کے علم سے ہے اور جس کے پانے کا ذریعہ اس کے رسولؐ ہیں اور پھر پانچویں آیت عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ میں یہ بات واضح بھی فرما دی کہ نبیؐ کو خود خالق نے تعلیم دی ۔ آپؐ کا معلّم خود اللہ ہے ۔

اللہ ربّ العزّت نے صرف اس منشور پر اکتفا نہ کیا بلکہ اپنے حبیب صلّی اللہ علیہ وسلّم کو ان دشوار گذار مراحل سے گذرنے کا ایک آسان طریقہ بھی عطا فرمایا ، یعنی نماز ۔ غارِ حرا میں صرف آیت ہی نہیں اتری بلکہ اللہ کے حبیبؐ کو جبرئیلِ امینؑ نے اللہ کا ایک تحفہ "نماز" بھی عطا فرمایا ۔ اور اس کے لئے اچھی طرح وضو کرنے اور نماز پڑھنے کا طریقہ ، ربّ العزّت کے فرمان کے مطابق اُس کے حبیبؐ ، اُس کے رسول صلّی اللہ علیہ وسلّم کو پوری احتیاط سے تعلیم فرمایا ، اور پھر دونوں نے مل کر نماز پڑھی ، کہ نماز ہی حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کی آنکھوں کی ٹھنڈک تھی اور حضورؐ نے اسی نماز کی تعلیم اپنی امّت کو دی ۔

ان امور پر ذرا توجّہ سے نظر ڈالنے کے بعد یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ آپؐ کے قلب نے جس ہیبتِ الٰہی کا احساس اس وقت کیا اس کے بعد اس شدّت سے کبھی نہ ہوا ۔ اور اس وقت حضرت خدیجہؓ کا حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کو اپنے انداز سے تسلّی دینا حضرت خدیجہؓ کی محدود لیکن عمیق فراست کی اعلیٰ ترین مثال ہے ۔

سیرتِ مبارکہ کی فہم کے لئے اگر اس رسالت اور عبدیت کے نازک تعلّق کو پیشِ نظر نہ رکھا جائے تو حقیقتِ حال سے کما حقّہٗ آگہی میسّر نہ آئے گی ۔ بلکہ اندیشہ ہے کہ اس تعلّق کو نہ سمجھنا کوتاہ نظری اور محرومیٔ فہم کا موجب بن جائے ۔

مراحلِ تبلیغ اور آغازِ تبلیغ (پہلا دور)

حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم نے جب اس عظیم ذمّہ داری کا آغاز فرمایا تو یہ سلسلہ

اپنوں ہی سے شروع ہوا۔ حضرت خدیجہؓ جو رفیق حیات تھیں اور اس واقعہ سے پوری طرح باخبر تھیں، ایمان کی دولت سے پہلے ہی دن سرفراز ہوئیں۔ پھر حضرت صدیق اکبرؓ اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ مشرف بہ اسلام ہوئے اور آپؐ کی خدمت میں رہنے والے آپؐ کے آزاد کردہ غلام، زیدؓ سب سے پہلے ایمان لانے والے خوش نصیبوں میں سے ہیں۔

سیرت نگار حضرات کا اتفاق ہے کہ مردوں میں حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ، عورتوں میں حضرت خدیجہ کبریٰؓ، بچوں میں علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ، اور موالی میں حضرت زیدؓ بن حارث، سب سے پہلے مشرف بہ اسلام ہوئے۔ یہ وہ ہستیاں تھیں جن کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پاکیزہ زندگی ایک کھلی ہوئی کتاب تھی، اور آپؐ کی صداقت و امانت، ان کے لئے آپؐ کی رسالت کی ایک روشن دلیل تھی۔ پھر وہ لوگ ایمان سے مشرف ہوئے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ مبارکہ سے متاثر تھے، یا حضرت صدیق اکبرؓ اور حضرت خدیجہ کبریٰؓ کی صداقت اور فہم سے۔ اُن سابقون الاوّلون کی فہرست میں "حضرت عثمان غنیؓ۔ حضرت زبیرؓ۔ حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف۔ حضرت طلحہؓ۔ حضرت سعدؓ بن ابی وقاص پہلے شامل ہوئے۔ پھر ابوعبیدہؓ عامر بن عبداللہ بن الجراح، جن کا لقب بعد میں امین الامّت ہوا۔ عبدالاسدؓ بن بلال۔ عثمانؓ بن مظعون۔ عامرؓ بن فہیرہ ازدی۔ ابوحذیفہؓ بن عتبہ۔ سائبؓ بن عثمان مظعون۔ اور ارقمؓ مسلمان ہوئے۔

عورتوں میں ام المومنین حضرت خدیجہؓ کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا عباسؓ کی بیوی امّ الفضلؓ۔ اسماءؓ بنت عمیس۔ اسماءؓ بنت ابوبکرؓ اور فاطمہؓ خواہر عمر فاروقؓ نے اسلام قبول کیا۔" (رحمۃ للعالمین، جلد اوّل صفحہ ۴۹)

ہرچند سلسلۂ وحی تقریباً تین سال بند رہا لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم

خاموشی کے ساتھ لوگوں کو سمجھاتے اور اسلام کی دعوت دیتے رہے۔ یہ دَور گویا آپؐ کا دورِ نبوت تھا۔ جیسا کہ حضرت عبدالحق محدث دہلوی تحریر فرماتے ہیں۔

"محدثین کے مذہب کی رُو سے کہ نبوّت میں تبلیغ اور اِنذار شرط نہیں اور نزولِ وحی تکمیلِ نفس کے لئے کافی ہے، چنانچہ اقراء کی تعلیم تکمیلِ نفس کے لئے نازل ہوئی۔ اور یہ نبوّت ہے۔ اور اس کے بعد سورہ "یٰاَیُّھَا المُدَّثِّر" تبلیغ و اِنذار کے لئے نازل ہوئی۔ اور یہ رسالت ہے۔"

(مدارِجِ نبوّت، جلد دوم، صفحہ ۵۴)

اس دَور میں حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کا اہم فریضہ مشتاقانِ اسلام کی سیرت کی تشکیل رہا، جس کے لئے آپؐ خود نمونہ تھے۔ ان میں صبر کا حوصلہ پیدا کرنا، ضبطِ نفس کی خصوصی تربیت دینا، ضبطِ نفس تونگری میں بھی اور عُسرت میں بھی۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام صرف آزاد فضا میں پروان چڑھتا ہے۔ وہ کسی غلامی کو برداشت نہیں کرتا، خواہ انسان کے اپنے نفس کی غلامی ہو، بلکہ یہ غلامی تو انسان کی بدترین غلامی ہے جو اسے کسل میں مبتلا کرتی ہے۔ عبادات سے محروم رکھتی ہے اور خیر کا دامن ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے۔

حضورؐ کے ساتھ اس دَور میں جو عظیم شخصیتیں آپؐ پر ایمان لا کر آپؐ کی معاون رہیں، اُنہیں دوسروں کے لئے مشعلِ راہ بننا تھا اور خود بھی تزکیۂ نفس اور تصفیۂ باطن کی منزلوں سے گذرنا تھا۔ آپؐ اُن کے ساتھ اکثر پہاڑیوں میں نکل جاتے، اور پہاڑ کی گھاٹیوں میں نمازیں ادا فرماتے۔ یہ اوقات اُن اصحاب کو نظرِ التفات سے سرفرازی بخشنے، قلوب کو ہر خطرہ سے پاک کرنے اور تزکیۂ نفس اور تصفیۂ باطن میں صرف ہوئے جس سے اسلام کی محبت ان کے دلوں میں راسخ ہو گئی۔ ہر چند یہ دَور خاموشی کے ساتھ تبلیغ کا دَور تھا۔ لیکن نہ اثراتِ فیضانِ نظر سے خالی تھا نہ آزمائشِ قلب و جگر سے۔

کفارِ مکہ بالعموم چاشت کے وقت کعبہ کا رُخ نہ کرتے۔ حضورؐ اس موقع سے فائدہ اُٹھا کر کعبہ تشریف لے جاتے اور خاموشی سے نماز میں مشغول ہو جاتے۔ کفارِ مکہ دیکھتے بھی تو معترض نہ ہوتے اسی دوران میں ایک بار حضورؐ اپنے ساتھ حضرت علیؓ کو لئے نماز کو جا رہے تھے۔ ابو طالب نے آپؐ سے دریافت کیا "بیٹا! یہ کون سا مذہب ہے جس پر تم چلتے ہو" آپؐ نے فرمایا "چچا جان! یہ خدا کا، اس کے فرشتوں کا اور ہمارے دادا حضرت ابراہیمؑ کا مذہب ہے۔ اللہ نے مجھے رسول بنایا ہے اور مجھے حکم دیا ہے کہ لوگوں کو راہِ حق دکھاؤں"۔ جناب ابوطالب نے حضرت علیؓ سے بھی یہی دریافت کیا۔ آپؓ نے اپنے والد کے استفسار پر یہی فرمایا کہ میں اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لایا ہوں اور اُن کے ساتھ ہوں۔ جناب ابوطالب ایمان تو نہ لائے لیکن یہ وعدہ ضرور کیا کہ میرے ہوتے ہوئے تم کو کوئی ضرر نہ پہنچا سکے گا۔

اس زمانے میں تعلیم و تربیت کے لئے اصحاب کی مختصر جماعت ایک صحابی، ارقمؓ، کے گھر جمع ہو جاتی اور وہیں حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے قرب اور تعلیم و تربیت سے فیض یاب ہوتی۔ یہ ابتدائی دَور تھا لیکن حضرت ابو بکرؓ کی تڑپ کا یہ عالم تھا کہ آپ چاہتے تھے کہ یہ تعلیم کُھل کر ہو تا کہ لوگ ایمان لائیں۔ حضورؐ کو ابھی اِس کا حکم نہ ہوا تھا اس لئے صدیقِ اکبرؓ کو اس کی اجازت نہ دیتے۔ حضرت ابو بکرؓ کے اصرار پر آنحضرتؐ آپ کے ساتھ باہر آ گئے اور ابو بکرؓ کھڑے ہو گئے۔ ایک ولولہ انگیز تقریر فرمائی اور حضورؐ پر ایمان لانے اور آپؐ کی اتباع پر زور دیا۔ ان کی تقریر سُن کر مشرکین اُن پر لوٹ پڑے، اُن کو اور دوسرے مسلمانوں کو بُری طرح مارا پیٹا۔ یہاں تک اور اس قدر مارا کہ آپؓ کا چہرہ لہولہان ہو گیا۔ چہرے اور ناک میں امتیاز مشکل ہو گیا۔ بنو تیم کے لوگوں نے آ کر چھڑایا۔ آپ کی حالت اس قدر خراب ہو چکی تھی کہ شام تک

بات بھی نہ کر سکے۔ لیکن جب بات کرنے کے قابل ہوئے تو بار بار یہی دریافت فرماتے کہ آنحضرت کا کیا حال ہے، اور اس وقت تک سکون نہ پایا جب تک کہ اسی حالت میں آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر آپ کو دیکھ نہ لیا۔ البتہ اس واقعہ کا اثر یہ ہوا کہ حضرت ابوبکرؓ کی والدہ مشرف بہ اسلام ہوئیں۔

(اقتباس از محمدؐ رسول اللہ صفحہ ۱۴۶ و ۱۴۷)

انوارِ نبوّت کا یہ دور تین سال تک قائم رہا۔ اور شاید یہی فیضانِ نبوّت تھا کہ جس کے انوار حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کے وصال کے بعد تین کے بجائے تین سو سال تک کے لئے خیرُ القرون کا موجب بنے۔

صلّی اللہ علیہ وسلّم

مراحلِ تبلیغ (دوسرا دور)

ضبط و تحمل اب وادیٔ صبر و استقلال کی دشوار گذار گھاٹیوں میں داخل ہو رہا ہے۔ پہلے "وَلِرَبِّكَ فَاصْبِرْ" کا ایک بے آب و گیاہ لق و دق صحرا ہے جہاں حضورؐ پُر نُور کے پروانے صحابہ کرامؓ اپنی جاں نثاری، محبت اور عزم و استقلال کا ثبوت دے رہے ہیں۔ ایسا ثبوت جو رہتی دنیا تک اسلام کی حقانیت پر شاہد رہے۔

خاموش تبلیغ کے تین سال گذر چکے ہیں۔ اب تک مختلف روایات کے پیشِ نظر یہی معلوم ہوتا ہے کہ "اقراء" کے علاوہ حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم پر اِسْتَعِذْ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ اور بِسْمِ اللّٰہ نازل ہو چکی تھی۔ اس کے ساتھ الحمد شریف، جو جزوِ نماز ہے، اس کا نزول ہوا ہے۔ اور اب تبلیغ و انذار کے لئے سورہ "المدّثّر" کا نزول ہوا یہ سورت حضورؐ کو لباسِ عبدیت کی ذمہ داریوں سے باخبر کرتی اور ایک لائحہ عمل پیش کرتی ہے اور

اب تبلیغِ حق کا حکم ہوتا ہے۔

وَاَنۡذِرۡ عَشِیۡرَتَکَ الۡاَقۡرَبِیۡنَ ۙ۝ وَ اخۡفِضۡ جَنَاحَکَ لِمَنِ اتَّبَعَکَ مِنَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ ۚ۝" (سورہ الشعرآء ۲۶، آیت ۲۱۴، ۲۱۵)

یعنی "اپنے قریبی عزیزوں کو عذابِ الٰہی سے ڈرایئے اور جو مومن آپ کی اتباع کریں ان سے نرمی و تواضع سے پیش آیئے"۔

اِن احکام کے پیشِ نظر حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم نے سنّتِ ابراہیمی کی تجدید فرمائی کہ انہوں نے بھی اپنے چچا آزر ہی کو عذابِ الٰہی سے ڈرایا اور دینِ حنیف کی دعوت دی تھی۔ آپؐ نے بھی پہلے اپنے اہلِ خاندان بنو ہاشم کو دین کی دعوت دینے میں پیش قدمی فرمائی کہ تبلیغ کا کام بھی گھر ہی سے شروع ہو۔ حضور پُرنورؐ نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو حکم فرمایا کہ کھانے کا انتظام کریں۔ اس کی تعمیل ہوئی۔ بنو ہاشم قبیلہ کے چالیس افراد جمع ہوئے۔ کھانا اتنا ہی تھا کہ صرف ایک آدمی سیر ہو کر کھا سکتا تھا لیکن سب نے سیر ہو کر کھایا۔ لیکن بجائے اس کے کہ آپؐ کے قبیلہ کے لوگ اس برکت کا احساس کرتے اور آپؐ کے فرمانے پر کان دھرتے، آپ کا چچا ابولہب یہ کہہ کر اُٹھ کھڑا ہوا کہ "بھائیو! محمدؐ نے کھانے پر جادو کر دیا ہے"۔ اور اس کی بکواس نے بات آگے نہ بڑھنے دی۔

دوسری بار پھر ضیافت کا انتظام کیا گیا اور پھر اکابرِ قریش کو دعوت دی گئی۔ اس بار لوگوں کے کھانے سے فارغ ہونے کے بعد آپؐ نے فرمایا، "اے بنی عبدالمطلب! اس وسیع ملک میں کوئی شخص اب تک مجھ سے بہتر دین اور اس سے بہتر آئین لے کر نہیں آیا ہے۔ میں اللہ کا وہ فرمان لایا ہوں جو تمہاری اپنی ضروریات کو حاوی اور تمہاری آخرت کی بہبودی کو کافی ہے۔ مجھ کو اللہ کا حکم ہے کہ میں تم کو اس دین کی تعلیم دوں۔ دیکھیں تم میں سے کون اس سعادت کو حاصل کرتا ہے اور جو میرا کہنا مان کر اللہ کا پیارا اور اللہ کے رسول

کا مددگار بنتا ہے۔" (تاریخ اسلام، عاشق الہٰی میرٹھی۔ صفحہ ۶۱)

اِن سیدھے سادھے پاکیزہ الفاظ کا جواب بدبخت ابولہب نے اپنے قہقہوں سے دیا۔ حضرت علیؓ نے، جو پہلے ہی اسلام لا چکے تھے، اُٹھ کر فرمایا کہ یا رسولؐ اللہ! میں آپ کا ساتھ دوں گا۔ ابولہب کو اور موقع ملا۔ بولا، لو سنو۔ ابوطالب تم اپنے بیٹے کی فرمانبرداری کرو۔ غرض یہ نشست بھی قہقہوں کی دل آزاریوں پر ختم ہوئی۔

اب سورہ حجر کی آیت نازل ہوئی۔

"فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ" ﴿۹۴﴾ (سورۃ الحجر)

یعنی آپ کو خدا کی طرف سے جو حکم ملا ہے اس کا (برملا) اظہار کر دیجئے اور مشرکوں سے بے پروا ہو جائیے۔ اس آیت کے نزول پر حضور نے صفا کی پہاڑی پر چڑھ کر اہلِ قریش کو پکارا۔ حضورؐ کی یہ آواز "اے جماعتِ قریش! اے بنی فہر! اے بنی غالب! اے بنی عدی!" لوگوں کے کانوں تک پہنچی اور عرب کے تمام چھوٹے بڑے کوہ صفا کے چاروں طرف جمع ہو گئے۔ ہر شخص صورتِ سوال تھا اور پوچھ رہا تھا کہ جلدی بتاؤ، کیا بات ہے، کیونکہ عرب کے عام دستور کے بموجب اس طرح لوگوں کو بُلانا انتہائی خطرے یا پریشانی کے وقت ہوتا تھا۔

آپؐ نے فرمایا۔ "اے باشندگانِ عرب! اگر میں تم سے کہوں کہ اس پہاڑ کی دوسری طرف ایک لشکر تمہاری تاک میں ہے جو موقع پا کر تم پر حملہ کرے گا، تو کیا تم یقین کر دگے؟ سب نے ایک زبان ہو کر کہا۔ "اے محمدؐ! ابلےشک ہم یقین کریں گے کیونکہ تم نے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔" اس کے بعد آپؐ نے فرمایا۔ "سنو! عنقریب تم پر عذاب آنے والا ہے۔ تم کو اس جلد آنے والی تباہی سے ڈراتا ہوں۔ اور یہ آنے والی مصیبت بلا ایمان لائے ٹل نہیں سکتی۔ اس عذاب سے تم کو تمہارے ہاتھوں سے بنائے بت، بچا نہیں سکتے اور

نہ یہ پتھر کی مورتیں تمہاری دلی مرادیں پوری کرنے پر قادر ہیں۔ تمہارا ان کے سامنے پیشانی رگڑنا عبث ہے۔ پس اے میری قوم! میرا کہا مانو اور دل سے مجھ پر ایمان لاؤ اور اللہ کو ایک سمجھو اور اس شرک اور بت پرستی سے جس میں تم مبتلا ہو، توبہ کرو تاکہ آخرت کی کٹھن منزل آسان ہو اور اللہ کے عذاب سے بچ سکو۔" (تاریخ اسلام، مولانا عاشق الٰہی میرٹھی صفحہ ۶۲)

ان پُر اثرات کلمات کا جواب بھی قہقہے تھے، اور اب بھی ابولہب ہی کی زبان سے نکلا "اے محمدؐ! تم (نعوذ باللہ) ہلاک ہو، کیا تم نے اس لئے بلایا تھا؟" (لیکن بارگاہِ خداوندی سے یوں فرمان صادر ہوا۔)

تَبَّتْ يَدَآ اَبِىْ لَهَبٍ وَّتَبَّ ؕ ① بے شک ابولہب ہی کے ہاتھ ٹوٹ گئے، وہی تباہ و برباد ہوا۔

اب وادیٔ صبر کی آزمائشیں ہیں اور صحابہ کرامؓ کے ایمان و محبت کے اظہار کا ایک نیا باب شروع ہوتا ہے۔ اور اس میں خود حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے اصحاب کی اذیتوں اور علانیہ مخالفت کا ازسرِ نو آغاز ہوتا ہے۔

عرب کا قبائلی نظام ایک دوسرے کی جان لینے اور اذیتیں پہنچانے میں حائل تھا، لیکن اُن کو اپنے ہی قبیلے کے لوگوں پر اور غلاموں پر اذیتیں پہنچانے میں کوئی چیز مانع نہ تھی۔ چنانچہ وہ غریب مسلمان جو پوشیدہ طور پر ایمان لائے اور ان کے ایمان کا حال ان کے مالکوں کو معلوم ہو جاتا تو وہ ہر طرح کا ظلم ان پر جائز رکھتے۔ اس کے علاوہ چونکہ یہ معاملہ ان کے دینی عقائد سے متعلق تھا اس لئے دوسرے قبائل کے اکابر سے نڈر اور بے خوف ہو کر ان کو طرح طرح کی اذیتیں پہنچانے میں مشرکین کو تردد نہ ہوتا بلکہ خود ان مسلمانوں کے قبائل کے سرداروں سے ان مسلمانوں کے حوالہ کر دینے کی اجازت چاہتے۔ اس طرح

اس داستانِ ظلم وستم کے تین درجے تھے۔

۱۔ اوّل رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو کسی نہ کسی طرح بہر حال ختم کرنے کا ناپاک ارادہ جس کے لئے ہر تدبیر اور سنگین سے سنگین ظلم روا تھا۔

۲۔ دوسرے اُن اکابر سے نمٹنا جو اسلام لائے۔

۳۔ اور تیسرے غریب غلام مسلمانوں کو ایسی عبرت ناک سزائیں دینا۔ جس سے سب ہی لرزہ بر اندام ہو جائیں اور کوئی اسلام کا نام لینے کی جرأت نہ کرے۔

ہم پہلے سرورِ کائنات کی مبارک شخصیت کا مختصر ذکر کریں گے کہ آپ کی محبت سب کا ایمان تھا اور ہے، تاکہ پیکرِ بشریت میں مقامِ عبدیت کھُلے اور اُس کے نبی اور رسول کا مقامِ رضائے الٰہی کا کچھ اندازہ ہو سکے کہ وہ، اللہ کے حکم سے تمام کائنات پر قدرت رکھتے ہوئے بھی، کس قدر اللہ کی مشیت سے راضی اور ہم آہنگ رہتا ہے۔ یہاں واقعات کا اعادہ منظور نہیں، صرف ان کیفیات کا بیان منظور ہے جو نورِ مُبین صلی اللہ علیہ وسلم کے اس پیکرِ بشریت میں ظہور کے بعد، عالمِ انسانیت کے لئے موجبِ ہدایت ہوئیں اور جن سے اخلاقی زندگی کی ایک جامع کتاب کے ابواب کھُلے۔

۱۔ حق کی راہ میں سب سے مشکل چیز صبر ہے۔ اور صبر ہی وہ صفت ہے جس کو نصف ایمان سے تعبیر کیا گیا جو دراصل بے شمار اخلاقِ حمیدہ کی رُوح ہے۔ اسی لئے صبر کا اجر، اللہ تعالیٰ خود اپنے آپ کو فرماتا ہے۔ یہ وہ اجر ہے۔ جو کسی گنتی میں نہیں آسکتا۔ بے حد و حساب لازوال۔ چونکہ یہ دَور اسی "لِرَبِّكَ فَاصْبِرْ" سے عبارت ہے اسی لئے اس دَور میں اس کی بے شمار مثالیں سامنے آتی ہیں۔ کہیں یہ صبر ہر ناگوار کو گوارا کرکے ضبطِ نفس، کا موجب بنتا ہے، کہیں غصہ کو پی جانے پر 'حلم' کا مظہر ہوتا ہے۔ کہیں عیش و عشرت کو اللہ کے لئے ٹھکرا دینے پر 'زہد' کہلاتا ہے۔ اور کہیں قدرے قلیل پر

اکتفا کرکے "قناعت" کہلاتا ہے۔ غرض ہر مصیبت، ہر مشکل، ہر آزمائش میں بھی صبر استقامت و تسکین کا سبب بنتا ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بے شمار ناقابلِ برداشت حالات میں صرف زبانِ خاموش اور توکل علی اللہ ہی سے ان مصائب کا مقابلہ فرمایا۔ یاد رہے اور خوب یاد رہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ "جو کچھ بھی تم کو تکلیف پہنچی ہے وہ ان ؐ کے قلبِ اطہر پر گراں گذرتی ہے" ایک بزرگ کے مکاشفے کے مطابق ہر مومن کے قلب سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب کو ایک خاص لگاؤ ہے۔ گویا ایک ڈوری ہے جو قلبِ مومن کو قلبِ رسول ؐ سے منسلک کئے ہوئے ہے۔ اب سوچو کہ ہر وہ تکلیف جو ایک مومن کو اللہ کے لئے پہنچ رہی تھی وہ قلبِ رسول ؐ پر کس قدر شاق گذرتی ہوگی۔ کیا اس مُنزّہ اور مصفیٰ قلب کو ان اذیتوں، جانکاہ مصائب کا پورا پورا احساس نہ ہوتا ہوگا جو اُن کے مومنوں کو پہنچ رہی تھیں۔ لیکن یہ صبر و برداشت کی قوت جو انہیں ؐ عطا ہوئی تھی، صرف قلبِ رسول ؐ ہی کا حصہ تھی۔ ہم تو اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے، برداشت کرنا تو بڑی بات ہے۔ دراصل کفار مقامِ رسالت کی فہم سے قاصر تھے۔

بات یہ ہے، جیسا امام غزالی ؒ نے فرمایا کہ

"جو شخص صراطِ مستقیم پر چلتا ہے اور نورِ الٰہی سے دیکھتا ہے، اس کی نظر اوّل معنی پر پڑتی ہے پھر ان کی حقیقت سے باہر ہو کر الفاظ کی طرف متوجہ ہوتا ہے، اس لئے کہ الفاظ معنی کے لئے وضع ہوئے ہیں تو اصل معنی ہیں اور الفاظ تابع ہیں۔ اور جو شخص فرع سے اصل کا طالب ہو وہ بے شک لغزش کھائے گا۔

کفار کی پہلی غلطی اسی طرح کے انعکاس سے ہوئی۔" (احیاء العلوم حصہ چہارم، صفحہ ۹۵)

اسی لئے جن لوگوں نے حضورؐ کو محض اپنا جیسا بشر تصوّر کیا وہ آپ کی رسالت، آپؐ کے انوار کو سمجھنے سے قاصر رہے اور یہی کہتے رہے کہ یہ تو ہماری طرح کا آدمی ہے۔ کھاتا ہے، پیتا ہے، چلتا ہے پھرتا ہے، سوتا ہے جاگتا ہے، پھر یہ رسول کیسے ہو سکتا ہے۔ اور جن کی نظر حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کے نورِ مبین، آپؐ کی للّٰہیت اور فطرت پر پڑی وہ آپؐ کے اوصاف، صداقت، امانت، خلوص، محبّت، سے متاثر ہوئے اور کلمہ ان کے قلب و زبان پر ایسا جاری ہوا کہ کوئی اذیّت، کوئی تکلیف اسے قلب سے دُور نہ کر سکی۔

چنانچہ جب حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم نے گلیوں، بازاروں میں اپنے، پرائوں سے تبلیغ کا آغاز فرمایا اور ان کی نظریں اُس معبودِ حقیقی کی طرف پھیرنا چاہیں جو خالقِ کائنات ہے، قادرِ مطلق ہے، نفع و ضرر کا مالک ہے، تو منکرین اور مشرکین نے اپنے قہر و غضب سے، دشنام و اذیّتوں کے ذریعہ آپؐ کو اپنے فرضِ منصبی سے باز رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی اور علانیہ آپؐ کی مخالفت کی۔ آپؐ کو کعبہ میں وعظ فرمانے سے روکا جاتا، لوگ ہر طرح کی ایذا پہنچانے کے درپے ہوتے۔ آپؐ کے عزم کے پیشِ نظر لوگ جمع ہو کر خود آپؐ کے چچا ابو طالب کے پاس گئے جن کی شخصیت اور خاندانی وقار، حضورؐ کے سلسلہ میں ان کے ناپاک ارادے میں حارج تھا۔ اور کہا۔

اے ابو طالب! ہم لوگ تمہاری عمر اور تمہارے درجہ کی تعظیم کرتے ہیں لیکن آخر ہماری تعظیم کی کوئی حد بھی ہے؟ ہم سے یہ نہیں ہو سکتا کہ تمہارا بھتیجا ہم کو اور ہمارے معبودوں کو بُرا کہے اور ہمارے باپ دادوں کو گالیاں دے، گمراہ بتائے اور ہم خاموش بیٹھے سُنتے رہیں۔ تم اُس کو ان باتوں سے روکو، نہیں تو اُس کو ہمارے حوالہ کر دو اور تم کچھ نہ بولو کہ ہم اپنا بدلہ لے کر دل کی سوزش رفع کریں۔" ابو طالب نے کچھ کہہ سُن کر ملائم الفاظ میں، اور کچھ اخلاقی

برتاؤ سے کام لے کر اُن کو ٹالا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم اُسی تن دہی سے اپنا کام کرتے رہے۔

پھر جب یہ سردار اپنی اپنی جگہ دور دراز مقامات پر واپس چلے گئے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تبلیغ کا وہی انداز رہا تو لوگوں میں بغض و حسد کی آگ اور بھڑک اُٹھی۔ اس کے لئے کمیٹیاں بنیں، تجویزیں پیش ہوئیں۔ آخر اس بات پر اتفاق ہوا کہ ابوطالب سے پھر ملا جائے۔ ایک جماعت سرداران قریش کی پھر ابوطالب کے پاس آئی اور کہا "ابوطالب! آپ ہم سب میں معمّر، مرتبہ میں بڑے ہیں۔ ہم نے پہلے بھی آپ سے خواہش کی تھی کہ اپنے بھتیجے کو روک لیجئے۔ مگر آپ نے کچھ نہ کیا۔ واللہ اب ہم اس پر صبر نہیں کر سکتے کہ محمدؐ ہمارے خداؤں، آباء و اجداد کو بُرا کہیں اور ہمیں بے عقل بتائیں، بجز اس کے کہ یا تو آپ انہیںؐ اس بات سے بالکل روک دیں ورنہ ہم آپ سے مقابلہ کریں گے، یہاں تک کہ فریقین میں سے کوئی ایک برباد ہو جائے۔"

(محمدؐ رسول اللہ، صفحہ ۱۵۶)

یہ ایک سخت دھمکی اور سخت مرحلہ تھا۔ ابوطالب اس کے مضمرات سے آگاہ تھے۔ پھر اپنے بھتیجے کو بھی ہر تکلیف و ضرر سے محفوظ رکھنا چاہتے تھے، اس لئے انہوں نے آپؐ کو بلایا اور قوم کی ساری تقریر سُنانے کے بعد حضورؐ سے فرمایا کہ اپنے مقصد سے باز آؤ اور ہمارے بڑھاپے کی لاج رکھو۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس صورتِ حال سے سخت تکلیف پہنچی لیکن آپؐ نے اپنے عزم و استقلال کو ذرا جنبش نہ ہونے دی۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہایت استقلال اور پُر وقار انداز سے جواب دیا کہ:۔

اے چچا! اگر کفّار میرے داہنے ہاتھ پہ آفتاب اور بائیں ہاتھ پر ماہتاب رکھ دیں اور مجھ سے اس کام کو چھوڑنے کے لئے کہیں تب بھی

میں اپنے ارادے سے باز نہ آؤں گا، یہاں تک کہ اللہ اسلام کا بول بالا فرمائے گا یا خود میں اس راہ میں فنا ہو جاؤں گا۔ آپ میری کوشش سے گھبرا گئے تو میرا معاملہ میری تقدیر کے حوالے کر دیجئے اور آپ اپنے آرام میں خلل نہ آنے دیجئے۔ بس میں جانوں اور میرا کام۔"

آپؐ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے جو بتقاضائے محبت تھے۔ چچا کے قلب پر بھی چوٹ لگی اور انہوں نے فرمایا۔" اے میرے بھائی کے بیٹے! جو کچھ تمہارا جی چاہے سو کہو، جو دل میں آئے کرو، قسم ہے خدا کی، میں تم کو نہیں چھوڑوں گا۔[1]

اس بار بھی حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کا عزم، صبر، استقلال، توکّل علی اللہ اور تن دہی سے فرائضِ منصبی بجالانے کا حوصلہ دشمنوں کی ہر مخالفت پر غالب آیا، مشرکین گو حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم پر کھُلّم کھُلا حملہ کی ہمت تو نہ کر سکتے تھے لیکن جب بھی آپؐ عبادت میں مشغول ہوتے تو وہ آپؐ پر پتھر پھینکتے، نجاست ڈالتے، آپؐ تشریف فرما ہوتے تو جمع ہو کر ہنسی مذاق اُڑاتے، کچھ نوش فرماتے تو لوگ گرد اُڑاتے، طرح طرح کے نام۔ ساحر، کاہن، شاعر، مجنون۔ کے الفاظ سے آپ کی اہانت کرتے۔ جو کوئی آپ کا معاون بننے کی کوشش کرتا اس کی داڑھی کھینچتے، مارتے پیٹتے اور آپ سوائے ضبط و تحمّل اور صبر و استقلال کے مظاہرہ کے کسی کو کلمۂ بد بھی نہ فرماتے۔

لیکن

غریب اصحاب پر جو ظلم ہو رہا تھا اس کا برداشت کرنا بھی آسان نہ تھا۔ ان کی اذیّت کے دردناک واقعات سے تاریخ کے صفحات خون آلود ہیں۔ اِن

---

[1] تاریخ اسلام، مولانا عاشق الٰہی میرٹھی۔ صفحہ ۶۵

ہیں چند کا ذکر اس لئے کرنا ضروری ہے کہ ہم اُن اصحابِ کرامؓ کی قدر دل سے کر سکیں، اور یہ سمجھنے کی کوشش کریں کہ دینِ اسلام کا آغاز کن صبر آزما حالات میں ہوا۔ آج اس کے ثمرات سے ہم بہرہ ور ہو کر بھی اگر اپنے ربِّ کریم کا شکریہ ادا نہ کریں اور اپنے آقاؐ اور اُنؐ کے اصحابؓ کی محبت ہمارا طرۂ امتیاز نہ ہو تو یہ ہماری کیسی بدنصیبی ہوگی۔ یہ ذکر چونکہ صرف فروزِ ایمان اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغامِ توحید سے قلب کو منور کرنے کے لئے ہے، اس لئے تعذیبِ صحابہ کا ذکر بھی نہایت اختصار سے پیش کیا جاتا ہے۔

✓ تعذیبِ صحابہؓ

ان جانثارانِ اسلام میں سب سے پہلے حضرت بلالؓ کا ذکر ہے جو حبشی نسل، امیہ بن خلف کے غلام تھے۔ جن کو ٹھیک دوپہر کے وقت تپتی ریت پر لٹایا جاتا، ایک بڑا پتھر ان کے سینے پر رکھ دیا جاتا کہ وہ جنبش بھی نہ کرنے پائیں۔ پھر کہا جاتا کہ اسلام سے باز آؤ ورنہ یوں ہی گھٹ گھٹ کر فنا ہو جاؤ۔ اس وقت بھی ان کی زبان پر "احد، احد" ہوتا۔ جب اُن کے عزم میں فرق نہ آتا تو گلے میں رسی باندھ کر اوباش لڑکوں کے حوالہ کیا جاتا کہ وہ شہر کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک انہیں گھسیٹتے پھریں۔ لیکن اس مردِ مومن، اس مجسمۂ صبر و شکر، کی زبان پر اب بھی "احد، احد" ہی ہوتا۔

اسی طرح ایک مثال حضرت ابوفکیہہؓ کی ہے جو صفوان بن امیہ کے غلام تھے اور حضرت بلالؓ کے ساتھ ایمان لائے تھے۔ امیہ کو جب معلوم ہوا تو اُن کا برتاؤ ان کے ساتھ بھی یہی تھا کہ پاؤں میں رسی باندھی اور آدمیوں سے کہا گھسیٹیں۔ ان کو بھی اسی طرح اذیت دیتے۔ تپتی زمین پر لٹانے، گلا گھونٹتے، سینہ پر پتھر رکھتے۔

مسلمان مردوں ہی پر نہیں بلکہ مسلمان عورتوں پر بھی یہی ظلم ڈھائے جاتے۔ حضرت عمرؓ جو اس وقت تک ایمان نہیں لائے تھے، اپنی کنیز حضرت لبینہؓ کو مارتے، اور مارتے مارتے جب تھک جاتے تو کہتے کہ "میں نے تجھ پر رحم کی بنا پر نہیں بلکہ اس وجہ سے چھوڑ دیا ہے کہ تھک گیا ہوں" اور وہ نہایت استقلال سے جواب دیتیں کہ "تم اسلام نہ لاؤ گے تو خدا اس کا انتقام لے گا"۔ یہی حال اُن دیگر مسلمان بے کس و مجبور عورتوں کا تھا جو کسی کافر کی کنیز تھیں۔

(سیرت النبیؐ، حصہ اوّل صفحہ ۲۲۷)

حضرت عمارؓ بن یاسر یمن کے رہنے والے تھے۔ ان کے والد یاسر جب مکہ میں آئے تو ابو حذیفہ مخزومی نے اپنی کنیز سے شادی کر دی، جس کا نام سُمیّہ تھا۔ عمارؓ انہیں کے شکم سے پیدا ہوئے تھے۔ یہ جب اسلام لائے تو قریش ان کو جلتی ریت پر لٹاتے اور اس قدر مارتے کہ وہ بے ہوش ہو جاتے اور ان کے والد و والدہ کے ساتھ بھی یہی سلوک کرتے۔

حضرت یاسرؓ، حضرت عمارؓ کے والد، کافروں کی اذیتیں اٹھاتے اٹھاتے ہلاک ہوئے۔ اور حضرت سمیہؓ جو عمارؓ کی والدہ تھیں، ان کو ابو جہل نے اس سفاکی اور بے رحمی سے شہید کیا کہ زبان و قلم اس کے بیان سے قاصر ہے۔ یہ راہِ اسلام کی سب سے پہلی شہید خاتون ہیں۔

مظالم کا یہ سلسلہ حضور پُرنور صلی اللہ علیہ وسلم کے علم میں اور بعض وقت آپؐ کی نگاہوں کے سامنے ہوتا لیکن آپؐ جو صبرِ مطلق "لِرَبِّکَ فَاصْبِرْ" کے مقام سے گذر رہے تھے، ان سخت آزمائشوں کے وقت بھی آپؐ کے "سکونِ تام" میں فرق نہ آتا۔ وہ صبر کی ایک چٹان تھے۔ بایں ہمہ، ایسے حالات میں آپؐ کی آنکھوں میں آنسو بھر آتے اور جب کسی غریب بے کس عورت کے سر پر انگارے رکھے گئے، اس کے سامنے اس کے شوہر کے ستر میں

برچھا جھونکا گیا، جب عمارؓ کے والد والدہ کی موشگاف حالت کو دیکھا تو زبان پر بس یہ آیا۔

"عمار کے گھر والو! اللہ تم پر رحم فرمائے
تنگی کے بعد کچھ دور نہیں کہ اللہ فراخی پیدا کردے۔"

(النبی الخاتم۔ مولانا سید مناظر احسن گیلانی صفحہ ۵۳-۵۲)

غرض یہ وہ دور تھا کہ جو مسلمان ہوتا اور اس پر کفار کا کسی طرح بھی بس چلتا تو وہ اس کو طرح طرح کی اذیتیں دیتے۔ کسی کو ننگا کر کے، کمر کے بل تپتی ہوئی ریتلی اور پتھریلی زمین پر لٹا کر آگ میں دھکا ہوا پتھر اُن پر رکھ دیتے۔ کسی کو چٹائیوں میں باندھ کر، ناک کی راہ سے تیز و تند ایندھنوں سے دھواں پہنچایا جاتا۔ لیکن یہ اللہ کے بندے اُف نہ کرتے، حق کی چٹان پر ثابت قدم رہتے۔

ادھر کفار کا ایک یہ مشغلہ تھا کہ حضور پُرنورؐ سے طرح طرح کے سوال کرتے، طرح طرح کے معجزے طلب کرتے۔ اِسی سلسلہ میں وہ سوال ہیں جو یہود سے سُن کر مشرکینِ مکّہ نے حضورؐ سے کئے۔ یہ اصحابِ کہف، ذوالقرنین، اور روح سے متعلق تھے جن کا جواب وحئ الٰہی سے دیا گیا۔

لیکن ان کے اس قسم کے حماقت آمیز مطالبات پر کہ حضورؐ مکّہ کی پہاڑیوں کو ہٹا دیں اور یہاں نہریں جاری ہو جائیں، یا ان کے آباؤ اجداد زندہ ہو جائیں، تو اُس کا جواب بزبان وحی یہی تھا کہ "اے رسول! وہ ہرگز ایمان نہ لائیں گے اگرچہ قرآن کے ذریعہ پہاڑوں کو اپنی جگہ سے ہٹا دیا جائے یا روئے زمین کو طے کر لیا جائے، یا اس کے ذریعے مُردوں سے بات چیت کر لی جائے، یہ سب قدرت صرف اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے۔" (بحوالہ سورۃ الرّعد۔ آیت ۳۱)

حضورؐ کا یہی فرمان تھا کہ میں اللہ کی طرف سے لوگوں کی ہدایت کے لئے آیا ہوں، اس کا کارخانۂ قدرت بدلنے کے لئے نہیں۔ اور نہ یہ میرے اختیار میں ہے۔

ہجرتِ حبشہ

غرض جب کفار کے مظالم، سفاکی اور بہیمیت بڑھتی گئی تو آپؐ نے مسلمانوں کو اجازت دی کہ ان میں سے جو چاہیں وہ حبشہ چلے جائیں۔ وہاں کا بادشاہ نیک اور عادل ہے اور وہاں وہ سکون سے اپنے فرائضِ منصبی ادا کر سکیں گے۔ یہ پہلی ہجرت رجب کے مہینہ میں ۵ھ بعثت نبوی میں (۶۱۵ء) ہوئی لیکن آپؐ خود مکہ میں ٹھہرے رہے اور خفیہ اور علانیہ تبلیغ میں مصروف رہے۔

مہاجروں کا ایک قافلہ جس میں تقریباً ۱۲ مرد اور چار عورتیں تھیں، اس ہجرت کے لئے روانہ ہوئے۔ کفار نے ان کا تعاقب کیا لیکن وہ کشتیوں پر سوار ہو کر روانہ ہو چکے تھے۔ جو لوگ اس ہجرت کے لئے نکلے تھے انہیں سب کچھ مکہ ہی میں چھوڑ کر جانا پڑا۔ یہ پہلی ہجرت بڑی اہمیت کی حامل تھی اس لئے کہ یہ مشکلات اور تکلیفوں میں گھرے ہوئے بے کس مسلمانوں کی اپنے ایمان کے استحکام اور عقیدہ کی ثابت قدمی کے لئے تھی، جو اُن کے عزم و استقلال کا ایک بیّن ثبوت تھی، اور یہ ہجرت دوسری اور تیسری ہجرت کا پیش خیمہ بنی۔

البتہ

اس سنگلاخ زمینِ مکہ میں اسلام اپنی جڑیں پکڑ رہا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا صبر، عزم، استقلال اور اللہ تعالیٰ کی ذات پر کامل بھروسہ، آپ کے پائے استقامت کو کسی وقت بھی متزلزل نہ ہونے دیتا تھا، نہ کفار کی سفاکی نہ یہود کی سازشیں، نہ ابولہب کی دشنام طرازیاں اور سختیاں اور نہ ابوجہل کا جہل اور شقی القلبی اور اس کی غیر معمولی عداوت، جس کے باعث اُسے عہدِ رسالت کا فرعون اور امامِ کفر کہا جاتا ہے۔

مسلمانوں کی تعداد آہستہ آہستہ بڑھتی گئی اور اسلام کو خصوصی تقویت اس وقت پہنچی جب حضرت حمزہؓ، جو حضورؐ کے چچا تھے، ایمان لائے۔ آپؓ کے

ایمان لانے کا واقعہ یوں بیان کیا جاتا ہے کہ ابوجہل کا آنحضرتؐ سے سامنا ہوا تو اُس نے حضورؐ کو ایذا پہنچائی، بُرا بھلا کہا، آپؐ کے دین کی تنقیص و تحقیر کی، مگر حضورؐ خاموش رہے اور کچھ نہ فرمایا۔ یہ واقعہ عبداللہ بن جدعان کی باندی نے، جو صفا کی بلندی پر یہ باتیں سُن رہی تھی، حضرت حمزہؓ کو اس وقت بتائیں، جب وہ شکار سے واپس آئے۔ ابوجہل کی ایذا رسانیاں، تلخ کلامی اور حضورؐ کی خاموشی کا ذکر کر کے کہا کہ دیکھئے آپ کے بھتیجے پر یہ کیسا ظلم ہے۔ حضرت حمزہؓ، جو بالعموم شکار سے واپسی پر پہلے خانہ کعبہ کا طواف کرتے تھے، سیدھے ابوجہل کی طرف گئے جو حرم میں ایک طرف بیٹھا ہوا تھا۔ آپ نے اپنی کمان اُس کے سر پر اس زور سے ماری کہ وہ زخمی ہو گیا۔ ابوجہل نے حضرت حمزہؓ سے کہا کہ معلوم ہوتا ہے کہ تم بے دین ہو گئے ہو۔ حضرت حمزہؓ نے جواب دیا:۔

"بے شک! مجھ پر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی حقانیت منکشف ہو گئی ہے۔ میں نے اسلام قبول کیا ہے، اور گواہی دیتا ہوں کہ بے شک محمدؐ اللہ کے سچے رسول ہیں اور آپؐ جو فرماتے ہیں وہ برحق ہے۔ میں اس سے روگردانی نہ کروں گا، اگر تم میں کچھ صداقت ہے تو مجھے روک کر دکھا دو۔"

(اقتباس محمدؐ رسول اللہ، صفحہ ۱۹۴)

لوگوں نے حضرت حمزہؓ پر حملہ کرنا چاہا لیکن ابوجہل نے کہا "ابُوعمارہ کو چھوڑ دو۔ بیشک میں نے اس کے بھتیجے پر بہت ظلم و ستم کیا ہے۔

اس وقت انتالیس مرد اور عورت مشرف بہ اسلام ہو چکے تھے۔ اب چالیس کے مبارک عدد سے، جو میم محمدی سے ہم عدد ہے اور قرآنِ حکیم میں جس عدد پر سورہ المومن کو جگہ دی گئی ہے، اب اس عدد کی تکمیل کے لئے اللہ رب العزت نے اپنے نبی کریمؐ کی دعا سن لی۔ روایت ہے کہ آپؐ نے دعا فرمائی تھی کہ "اے اللہ تو اسلام کو عمر یا ابوجہل، کسی ایک سے تقویت

پہنچا۔" اب اس دعا کی قبولیت کا وقت آ گیا تھا کہ اس عدد کے مضمر فیوض و برکات کا کچھ ظہور ہو۔ یہ وہی عمرؓ ہیں جنہیں کفار نے حضورؐ کے قتل کا ایک منصوبہ بنانے کے لئے راضی کر لیا تھا اور وہ اس کے لئے تیار ہو گئے تھے اور فخریہ کفار سے کہا تھا کہ میں حضور کا سر تمہارے حوالہ کروں گا اور تم سے سو اونٹ کا انعام لوں گا جو تمہارا وعدہ ہے۔

حضرت عمرؓ نے اپنے اسلام لانے کا واقعہ خود یوں بیان فرمایا ہے کہ "میں اسلام و آنحضرتؐ کی مخالفت میں بہت سخت تھا۔ ایک دوپہر کو مکّہ کی سڑک پر جا رہا تھا کہ مجھے ایک شخص ملا جس نے پوچھا کہ اے خطاب کے بیٹے! کدھر جا رہے ہو۔ تم اس دین سے بیزاری و عداوت کا اظہار کرتے ہو مگر کچھ خبر بھی ہے کہ وہ دین تمہارے گھر میں داخل ہو گیا۔" اس کے بعد اس نے حضرت عمرؓ کو ان کی بہن کے قبولِ دین کی خبر سنائی اور حضرت عمرؓ غصّہ میں بھرے ہوئے گھر پہنچے۔ دروازہ کھٹکھٹایا۔ اندر سے آواز آئی "کون ہے؟" جواب ملا "خطّاب"۔ اس وقت ان کی بہن نے دروازہ کھولا۔ حضرت عمرؓ نے کہا کہ "اے اپنی جان کی دشمن! مَیں نے سنا ہے کہ تو نے اپنا دین بدل ڈالا ہے۔" پھر ان کو اپنی لکڑی سے اتنا مارا کہ خون بہہ نکلا۔ اس نے کہا کہ "بھائی! جو چاہے کر لو۔ میں نے تو اسلام قبول کر لیا ہے۔" اس غصّہ کی حالت میں ان کی نظر کتاب پر پڑی۔ پوچھا "یہ کون سی کتاب ہے۔ مجھے دو۔" بہن نے کہا "یہ میں تم کو نہ دوں گی کیونکہ تم اس قابل نہیں۔ نہ تم غسلِ جنابت کرتے ہو، نہ پاک رہتے ہو۔ یہ وہ کتاب ہے جسے صرف پاک لوگ چھو سکتے ہیں۔" عمرؓ نے غسل کیا اور کتاب کو ہاتھ میں لیا۔ آیت کریمہ۔ سورہ حدید (۵۷) کی پہلی تین آیات پر نظر پڑی:-

"سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ○

لَہٗ مُلْکُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ یُحْیٖ وَیُمِیْتُ وَھُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ○ ھُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاھِرُ وَالْبَاطِنُ وَھُوَ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ○

زمین و آسمان کی ہر چیز اللہ کی تسبیح میں مشغول ہے۔ اور وہی عزت و حکمت والا ہے۔ اسی کے لئے آسمان و زمین کی ملکیت ہے۔ وہی زندہ کرتا ہے وہی مارتا ہے اور وہ ہر شے پر قادر ہے۔ وہی اول ہے وہی آخر ہے اور وہی ظاہر ہے اور وہی باطن اور وہ ہر شئے کو جاننے والا ہے۔"

یہاں تک کہ جب آیت ء "اٰمِنُوْا بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ" پر پہنچے تو اسی وقت زبان سے کلمہ جاری ہوا" اَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰہِ" گھر والے یہ سن کر فرطِ مسرت سے باہر نکلے اور آستانہ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب روانہ ہوئے۔ اس وقت حضورؐ دارِ ارقم میں قیام پذیر تھے۔ جب حضورؐ کا سامنا ہوا تو دو آدمی عمر کو بازوؤں سے پکڑے ہوئے تھے۔ جب حضورؐ کے قریب ہوئے تو آپؐ نے حکم دیا کہ ان کو چھوڑ دو۔ اس کے بعد عمر حضورؐ کے بالکل سامنے بیٹھ گئے۔ پھر حضورؐ نے ان کا گریبان پکڑ کر اپنی طرف کھینچا اور فرمایا۔" اے خطّاب! اسلام قبول کر لے۔ اے خدا! ان کے دل کو ہدایت دے۔" اس وقت حضرت عمرؓ نے پھر کلمۂ شہادت پڑھا۔ اور تمام مسلمانوں نے بڑی بلند آواز سے یوں تکبیر کہی کہ مکّہ کی گلیاں گونج اٹھیں۔

اب تک جو مسلمان ہوتا وہ اپنا اسلام چھپاتا۔ لیکن اب وقت آگیا تھا کہ اب اس کا اظہار بر ملا ہو۔ اس کے بعد حضرت عمرؓ باہر آئے اور اس شخص کے پاس گئے جو بھید چھپاتا نہ تھا۔ وہ خوب زور سے چیخا کہ لو عمر صابی ہو گیا۔ حضرت عمرؓ کہتے ہیں کہ" اس کے بعد لوگوں کا وطیرہ ہو گیا کہ وہ مجھے بلاتے تاکہ

ایذا اور تکلیف پہنچائیں۔ مگر وہ میرے ہاتھ سے مار کھاتے۔ اس پر میرے ماموں ابوجہل نے پوچھا کہ یہ شور و غل کیسا ہے۔ لوگوں نے بتایا کہ عمرؓ دینِ اسلام میں داخل ہو گئے ہیں۔ اس پر میرا ماموں ایک حجر پر کھڑا ہوا اور اس نے مکّہ والوں کو مخاطب کر کے کہا "خبردار ہو جاؤ۔ میں نے اپنے بھانجے کو امان دی ہے۔" اس کے بعد لوگ مجھ سے دور ہٹ گئے۔" (اقتباس از مدارج نبوّت جلد دوم صفحہ ۷۶)

اب حضرت عمرؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلّم سے عرض کیا "یارسول اللہ! کفّار تو لات و عزیٰ کی علی الاعلان پرستش کریں اور ہم دین کو چھپا رکھیں؟" اس کے بعد حضورؐ، حضرت ابوبکرؓ، حضرت حمزہؓ، حضرت علی مرتضیٰؓ کے ساتھ خانہ کعبہ کی طرف چلے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلّم خانہ کعبہ میں داخل ہوئے اور صحابہؓ کے ساتھ دو رکعت نماز پڑھی۔ اس وقت آیت نازل ہوئی۔

یٰٓاَیُّهَا النَّبِیُّ حَسْبُكَ اللّٰهُ وَمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ ○ (انفال آیت ۶۴)

اے نبی! آپ کو اللہ کافی ہے اور مسلمانوں کو جو آپ کی پیروی کرتے ہیں۔"

حضرت ابنِ عباسؓ سے منقول ہے کہ جب حضرت عمرؓ ایمان لائے تو جبرئیلؑ نے حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم سے حاضر ہو کر کہا کہ آسمان والے عمر کے اسلام پر مبارک باد عرض کرتے ہیں اور اظہارِ خوشی و مسرّت کرتے ہیں۔

(روایت ابنِ ماجہ) (مدارج النبوّت، جلد دوم صفحہ ۷۳)

○

اب اہلِ مکّہ میں مخالفت کی آگ اور بھڑک اٹھی۔ ایک طرف حضرت حمزہؓ اور حضرت عمرؓ کا ایمان لانا، دوسری طرف مسلمانوں کو حبشہ کی طرف وقتاً فوقتاً روانہ ہونا۔ وہ اسلام کی فروغ دیکھ نہ سکتے تھے۔ اور حضورؐ کے قتل و ہلاکت پر سختی سے مستعد ہو گئے۔

اور یہیں سے
اب تیسرے مرحلۂ تبلیغ کا آغاز ہوتا ہے۔
جو عبدیت کی بے کسی و مجبوریوں کی آئینہ داری کے ساتھ، رسالت کی عظمت اور مقام عبدیت پر شاہد ہے۔

ہجرت سے ہجرت تک

کفار کے ظلم و ستم سے بچنے کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو حبشہ کی جانب ہجرت کی اجازت رجب ۵ھ بعثت نبوی میں دی تھی۔ ابھی چند ہی ماہ ہوئے تھے کہ حضرت عمرؓ کے اسلام لانے اور علانیہ تبلیغ کے جاری ہونے کی خبر سن کر، چند صحابہؓ حبش سے مکہ واپس آئے تو دیکھا کہ یہاں تشدد کی وہی گرم بازاری ہے۔ سوائے چند شخصوں کے باقی مسلمانوں پر کفار کی ایذا رسانی کا وہی انداز قائم ہے۔ اسلام لانے والوں کو کپڑوں کی جگہ لوہے کی زرہیں پہنا کر دھوپ میں کھڑا کیا جاتا۔ گردنوں میں رسیاں باندھ کر بچوں کے ہاتھ گلی کوچوں میں گھسیٹا جاتا۔ نماز کا پڑھنا اور اللہ والوں کو کلام مجید کی تلاوت کرنی، خفیہ طور پر بھی دشوار ہو گئی تھی۔ اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں دوبارہ حبشہ کی جانب ہجرت کا حکم فرمایا۔ اور اس مرتبہ یکے بعد دیگرے اکثر مسلمان مکہ چھوڑ گئے، یہاں تک کہ بیاسی یا تراسی مرد عورتوں نے حبشہ میں پناہ لی۔ (تاریخ اسلام)

کفار مکہ سے ان کا یہ سکون بھی نہ دیکھا گیا اور وہ تحفہ تحائف اور بیش قیمت ہدیہ کے ساتھ حبشہ پہنچے، اور ارکین سلطنت کی وساطت سے دربار تک رسائی حاصل کی اور ان مہاجر مسلمانوں کے خلاف جھوٹے الزام لگائے انہیں بددین اور بے وقوف بتایا اور کہا کہ یہ لوگ ہمارے دین کی توہین کرتے ہیں،

اور چاہتے ہیں کہ شرفائے عرب ان کے غلام بن جائیں۔ ان کا دین نہ ہمارے دین کے مطابق ہے نہ نصرانیت کے۔ اس لئے ہماری خواہش ہے کہ آپ ہمارے ان فراری مجرموں کو ہمیں واپس فرما دیں۔

مسلمانوں کو دربار میں حاضر ہونے کا حکم ہوا۔ وہ آئے تو حسبِ دستور بادشاہ کو سجدہ نہ کیا۔ نقیبوں نے بھی انہیں بے ادب کہہ کر مخالفت کی اور کہا کہ گنوارو! تم نے بادشاہ کو سجدۂ تعظیمی کیوں پیش نہیں کیا۔ اس وقت حضرت جعفر طیارؓ آگے بڑھے اور اسلامی طرزِ حیات کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا:۔ کہ "ہم اللہ کے بندے ہیں۔ اللہ کے سوائے کسی کو سجدہ نہیں کرتے۔ ہمارے رسولؐ کا یہی حکم ہے کہ اللہ کے سوا کوئی قابلِ پرستش نہیں۔ اللہ جس کو چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے" ان الفاظ کا نجاشی کے قلب پر خاطر خواہ اثر ہوا، اور اس نے ترجمان کے ذریعے چند سوالات کئے۔ اس وقت حضرت جعفر طیارؓ نے وہ تقریر فرمائی جو نہ صرف سیر کی کتابوں میں محفوظ ہے بلکہ اسلام کی حقانیت، مومن کی صداقت اور جرأتِ ایمانی کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ اس کا خلاصہ صرف اس لئے یہاں نقل کیا جاتا ہے کہ اس دور کی مسموم فضاؤں میں اسلام کی حقانیت اور تعلیمات کا ایک واضح تصور قائم رہے۔

حضرت جعفر طیارؓ نے فرمایا۔

"اے منصف بادشاہ! ہم جہالت کے دریا میں ڈوبے ہوئے تھے۔ ہم بتوں کو پوجتے تھے، مردار کھاتے تھے، جھوٹ بولتے تھے اور زنا و فسق و فجور کو اچھا سمجھتے تھے۔ کہ یکایک ہمارے پروردگار نے ہم پر رحم فرمایا اور ہماری شریف ترین قوم میں ایک ہر دلعزیز شخص کو کھڑا کر دیا جس کی نجابت، سچائی، ایمانداری اور نیک چلنی سے ہم سب لوگ واقف ہیں۔ اس پر اللہ کا کلام پاک نازل ہوا۔ اس نے ہم کو اللہ کی وحدانیت بتلائی، شرک سے روکا،

بتوں کو پوجنے، امانت میں خیانت کرنے، پڑوسی پر ظلم کرنے سے منع کیا۔ سچ بولنے کی ہدایت کی۔ اللہ کے کمزور بندوں پر رحم کرنا سکھایا۔ مروّت اور انسانی قدروں سے آگاہ کیا اور کہا کہ کسی پر جھوٹی تہمت مت لگاؤ۔ یتیموں کا مال ظلماً نہ کھاؤ۔ اس نے یہ حکم فرمایا کہ گناہ سے بچو، نماز پڑھا کرو، خیرات دو، روزہ رکھو، جھوٹ نہ بولو، کسی کی غیبت نہ کرو، انصاف کرو اور ہمیشہ ایک اللہ لاشریک کے قائل رہو۔ چونکہ ہم لوگ اس پر ایمان لائے اور ہم نے اس کو پیغمبر سمجھا، اس کی تمام ہدایتوں کو مان لیا اور شرک سے کنارہ کش ہو گئے، اس لئے ہمارے ہم وطن اور کنبہ کے بھائی جو جہالت اور بت پرستی کے دریا میں ڈوبے ہوئے اور نخوت و تکبر کا جامہ پہنے ہوئے تھے، ہم لوگوں کے دشمن بن گئے۔ اور ہمارے قومی و وطنی بھائیوں نے ہم کو یہاں تک ستایا کہ ہم تاب نہ لا سکے اور آپ کے ملک میں پناہ لی، اپنا گھر بار سب اس دین کے لئے چھوڑا اور ہم یہ نہیں چاہتے کہ ہم پھر اسی آگ میں کود پڑیں۔ ہم یہاں صرف اس اُمید پر آئے تھے کہ منصف، رحمدل بادشاہ کی رعایا بن کر ظالم بت پرستوں کے شر سے محفوظ رہیں گے اور کافروں کے پنجۂ ظلم سے نجات پائیں گے۔ افسوس ہے کہ ہمارا قبیلہ یہ دیکھ نہ سکا اور چاہتا ہے جس رحمدل بادشاہ کی سلطنت میں حیوان اور طیور تک ظلم سے امن میں ہیں، ہم دُور افتادہ مسافروں کو وہاں پناہ نہ ملے۔ اور تنگ آ کر دوبارہ اُنہیں ظالم پنجوں کا شکار بنیں جن کے تختۂ مشق ہم عرصہ تک رہ چکے ہیں۔

سو تقدیر کا حکم ٹل نہیں سکتا اور ہمارے لئے جو کچھ مشیّت الٰہی سے صادر ہو، ہمیں بخوشی اُس کے منظور کرنے میں تامّل نہیں ہے۔"

(تاریخ اسلام، صفحہ ۷۵)

جعفر طیّارؓ کے یہ پُر خلوص الفاظ اپنا اثر کئے بغیر نہ رہے۔ نجاشی نے

آپؓ سے حضرت مریمؑ کے متعلق سوال کیا اور آپؓ نے سورہ مریم کی آیات تلاوت کیں۔ بخاشی آبدیدہ ہوگیا اور حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں ان کا خیال دریافت کیا۔ آپ نے فرمایا کہ ہمارے پیغمبر نے کہا کہ "هُوَ عَبْدُ اللهِ وَرَسُولُهُ وَكَلِمَتُهُ اَلْقٰهَا اِلٰی مَرْيَمَ وَرُوحٌ مِّنْهُ" (وہ اللہ کے بندے اور اس کے پیغمبر ہیں اور اس کے حکم ہیں جو مریم کی طرف کہلا بھیجا تھا اور اس کی جانب سے خاص رُوح ہیں)

سورۂ مریم سُن کر بخاشی کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے، اور اُس نے کہا کہ خدا کی قسم، حضرت عیسیٰؑ نہ اس سے زیادہ ہیں اور نہ کم۔

بخاشی نے اس کلمۂ حق کی حقانیت کا اعتراف کیا اور کفار کو واپس جانا پڑا۔ یہی نہیں بلکہ ان کلمات کی صداقت کا اس پر یہ اثر ہوا کہ وہ دل سے مسلمان ہوگیا گو متعدد مصلحتوں کی بنا پر اس کی پردہ پوشی کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان اب سکون سے حبش میں رہنے لگے اور تلاشِ معاش ان کے لئے آسان ہوگیا۔

○

اس ہجرت سے ایک فائدہ تو یہ ہوا کہ ان مسلمانوں کو کفارِ مکہ سے نجات مل گئی، اور دوسرا نتیجہ یہ ہوا کہ حبش کا بادشاہ بخاشی صدقِ دل سے مسلمان ہوا، اور اس نے اعتراف کیا کہ "بخدا! اگر انتظامِ سلطنت میرے سپرد نہ ہوتا تو آپ کے ساتھ چلتا، اور حضورؐ کی جوتیاں اٹھا کر سر پر رکھتا، آفتابہ لے کر وضو کراتا، اور انؐ کی قدم بوسی کو اپنی نجات کا وسیلہ سمجھتا۔"

شاید

اولیاءِ کرامؒ کے مسلک میں رسمِ قدم بوسی اس جذبۂ بے اختیاری کا نتیجہ ہے جسے محبت اور انکسار کا سنگم سمجھنا چاہیئے۔

اور خود نجاشی کو اس کا ثمر یوں ملا

کہ جب اس کا انتقال ہوا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی غائبانہ نماز جنازہ ادا کی۔ اس کے علاوہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی کی غائبانہ نماز جنازہ ادا نہیں فرمائی۔ اللہ اکبر! یہ اعزاز! اور قدم بوسی کی تمنا کے صلہ میں پروانۂ نجات! سبحان اللہ

○

صحابہؓ کے قافلے حبش کی طرف جا رہے ہیں۔ نورِ مبین صلی اللہ علیہ وسلم کے قلبِ اطہر کو سکون مل رہا ہے کہ کم از کم ایک جماعت ہی کفار کے ظلم و ستم سے محفوظ رہے گی۔ آپ کی دعوت و تبلیغ کی سرگرمی کا وہی عالم ہے۔ ادھر حضرت حمزہؓ اور حضرت عمرؓ کے ایمان لانے کے بعد سے اسلام کی قوت بڑھنے کا امکان بڑھتا جاتا ہے، اُدھر قریشِ مکہ نے پھر ایک بار ابو طالب کی حمایت حاصل کرنے کی کوشش کی۔ اور کہا کہ یا تو آپ اپنے بھتیجے کو ہمارے حوالہ کر دیں یا ہم سے جنگ کرنے پر آمادہ ہو جائیں یا پھر اُن کو تاکید کریں کہ ہمارے معبودوں کو بُرا نہ کہیں۔

ابو طالب نے حضورؐ کو بلایا اور کہا کہ قوم کا فیصلہ جنگ کا ہے۔ ہم میں اس کی طاقت نہیں اس لئے اب آپؐ اپنی جان پر رحم کھائیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"اے چچا! آپ خیال فرماتے ہیں کہ میں آپ کی حمایت پر یہ کام کر رہا ہوں، ایسا نہیں ہے۔ میرا حامی میرا رب ہے اور اس کے حکم سے میں یہ کام اسی طرح کرتا رہوں گا جب تک یہ پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ جائے یا خود میری جان اس سعی میں کام آ جائے۔"

ابوطالب نے بھتیجے کا ساتھ چھوڑنا پسند نہ کیا اور کہا "ربِّ کعبہ کی قسم۔ جب تک میں زندہ ہوں تمؐ کو کوئی پابند نہ کرسکے گا"۔

اوراب

پھر مشرکینِ کفّار جمع ہوئے اور فیصلہ کیا کہ وہ بنی ہاشم اور بنی عبدالمطلب کے خلاف ایک معاہدہ مرتّب کریں جس کی رُو سے مکمّل مقاطعہ و بائیکاٹ کیا جائے۔ اُن سے شادی بیاہ، خرید و فروخت، ملنا جلنا، اُٹھنا بیٹھنا، گفت و شنید کوئی نہ کرے۔ انہوں نے بازار والوں سے بھی یہ عہد لیا کہ کوئی چیز اُن کے ہاتھ فروخت نہ کی جائے۔ اس سلسلہ میں انہوں نے ایک عہد نامہ لکھا اور مہر کرکے خانۂ کعبہ پر محرّم ۷ھ نبوّت ۱۶۱۷ء کی چاندرات کو کعبہ میں، وسط میں آویزاں کیا۔

یہ عاجز عرض کرتا ہے کہ محرّم کا چاند دیکھ کر اگر آج بھی مسلمان اس واقعہ کو یاد اور ان مبارک ہستیوں کا احترام کریں جنہوں نے دینِ حق کی بقا کے لئے اسی شب کو اپنی شہادت گاہِ الفت میں قدم رکھنے کے لئے انتخاب کیا تو شاید کسی مشکل سے مشکل گھڑی میں اُنہیں اسلام کے لئے کوئی قربانی پیش کرنے میں تامّل نہ ہوگا۔

اوراب

شعب کی بے آب و گیاہ زمین میں اس قافلۂ بنی ہاشم کو مقید کیا جارہا ہے اس حال میں کہ اُن پر باہر سے بھی کسی شئے کے پہونچنے پر سخت ترین پابندیاں ہیں۔ تین سال تک حضورؐ اور انؐ کے خاندان والے اس وادی میں مقید رہے۔ وادی کے عقب سے بچوں کے بلکنے اور تڑپنے کی آوازیں آتیں حضرت خدیجہؓ حضورؐ کے ساتھ تھیں۔ اپنا تمام سرمایہ انہوں نے لٹا دیا لیکن دولت کا یہ صرف بھی بوڑھوں، بچّوں کو اس کسمپرسی کے عالم میں کہاں کفایت

کر سکتا تھا۔

عرب کا دستور تھا کہ حج کے زمانے میں کسی کے بیت اللہ آنے میں مزاحم نہ ہوتے۔ اور محصورین بھی صرف حج ہی کے زمانے میں باہر نکل سکتے تھے لیکن یہ اسیرِ شعب جس سے بات کرنا چاہتے کوئی اُن سے بات نہ کرتا۔ جس سے رحم کی اُمید کرتے، وہ خون کا پیاسا ثابت ہوتا۔ اور ایامِ حج کے علاوہ اگر کوئی باہر نکلتا تو مارا پیٹا جاتا، اذیت پہنچایا جاتا۔ محصورین کی حالت خراب تر ہوتی گئی۔ اکثر فاقہ پر فاقہ ہوتے۔ کوئی رحمدل رشتہ دار اگر چھپ کر کچھ غلّہ وغیرہ بھیج دیتا تو عہد شکن مشہور ہوتا اور برادری سے خارج کر دیا جاتا۔ واضح رہے کہ شعب ابی طالب میں سب مسلمان نہ تھے۔ تاہم اقربا ہونے کے سبب سب ہی اس مصیبت میں شریک تھے۔ نہ کسی نے حضورؐ کو چھوڑا نہ دشمنوں سے جا ملا، جو مسلمان تھے وہ اس عزم، صبر و استقلال سے اپنے ایمان پر قائم رہے۔ فاقہ سے پیر تھرتھراتے تھے لیکن ایمان میں جنبش نہ آتی تھی۔

اور حج کے ان دنوں میں

حضورؐ ان حالات میں اسی عزم، اسی حوصلہ کے ساتھ تبلیغِ دین کے لئے نکل کھڑے ہوتے۔ ابولہب اور دیگر کفار گستاخیاں کرتے، لوگوں کو منع کرتے کہ آپؐ کی باتوں پہ کان نہ دھریں۔ یہ آزمائش کی گھڑیاں بھی اُس ذاتِ مقدسؐ کے عزم و استقلال کو متزلزل نہ کر سکیں، اور نہ فاقہ کشی، نہ کفار کے طعن و تشنیع۔ آپؐ اس دلیری سے اللہ کی عبادت کی طرف لوگوں کو بلاتے اور ان کو ان کے شرک و کفر کے عواقب سے ڈراتے رہے۔

آخر رحمتِ الٰہی

جوش میں آئی۔ آزمائش کی گھڑیاں ختم ہونے کا وقت آیا۔ خود قریش بنی ہاشم کے ساتھ اپنے اس طرزِ عمل پر لعنت و ملامت کرنے لگے۔ کچھ لوگ جن میں

مطعم بن عدی۔ عدی بن قیس۔ زمعہ بن اسود۔ ابُوالبختری بن ہشام اور زبیر بن ابیہ، شامل تھے۔ ہتھیار لگائے بنو ہاشم اور بنو مطلب کے پاس پہنچے اور انہیں اپنے گھروں کو جانے کی اجازت دے دی۔ (محمدؐ رسول اللہؐ صفحہ ۲۰۳ و ۲۰۴)

قریش میں اب خود ایک نزاع پیدا ہوگیا اور اس بات پر اتفاق ہوا کہ وہ عہد نامہ جو کعبہ میں آویزاں کیا گیا تھا، سامنے لایا جائے۔ اس وقت ابو طالب نے خاموشی سے کہا۔ "محمدؐ نے خبر دی ہے کہ وہ عہد نامہ دیمک چاٹ گئی ہے صرف اس پر اللہ اور رسولؐ کا نام باقی ہے۔ اگر یہ خبر سچی نکلے تو یہ کافی ہے ورنہ اسؐ کے ساتھ جو چاہے کرو۔" عہد نامہ کھولا گیا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمانا حق ثابت ہوا۔ قریش شرمندہ ہوئے اور نبوت کے دسویں سال مطابق ۶۲۰ء شعب ابی طالب سے ان محصورین کو نجات ملی۔ (مدارج النبوت صفحہ ۷۵)

یہ واقعہ خود ابوجہل، ابولہب اور دیگر مشرکینِ قریش کے لئے حضورؐ کے مقام اور آپ کی رسالت کی صداقت پر کافی تھا۔ لیکن جب دلوں پر مُہر لگ جائے اور انسان اپنی ہٹ دھرمی پر قائم رہے تو کوئی شئے، کوئی واقعہ اسے راہِ حق نہیں دکھا سکتا۔

○

حضور صلی اللہ علیہ وسلم وادیٔ بے آب و گیاہ سے نکلے تو عزم و حوصلہ کی دوسری آزمائش کا وقت آگیا۔ اسی سال ۱۰ نبوی میں ابو طالب کا انتقال ہوگیا، جو ہر حال میں حتی الامکان حضورؐ کے معاون رہے۔ پھر اس کے تین ہی دن بعد حضرت خدیجہؓ نے انتقال فرمایا، جنہوں نے اپنا سارا مال و دولت حضورؐ کے قدموں پر نثار کر دیا تھا جو دین کے ہر کام میں صرف ہوا۔ غریبوں محتاجوں کی مدد میں، مظلوموں کے ساتھ ہمدردی میں، غلاموں کی آزادی میں، بھوکوں

کو کھانا کھلانے اور دیگر خیر و خیرات میں۔

یہ دونوں ظاہری سہارے بھی ٹوٹے تاکہ دنیا پر یہ حقیقت آشکارا ہو جائے کہ رسولؐ کا سہارا صرف اس کا اللہ ہوتا ہے، اور وہی اس کا بہترین سہارا ہے، اور مومنوں کو یہ درس قولاً، عملاً اور فوراً دینے کے لئے کہ مسلمان کا ایمان یہی ہونا چاہیئے حَسْبُنَا اللّٰہُ وَنِعْمَ الْوَکِیْل (ہمارے لئے اللہ کافی ہے اور کیا ہی خوب کارساز ہے)

مومن کو تو صبر و شکر کی وادی میں ثابت قدم رہنا، اللہ پر بھروسہ رکھنا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت و اطاعت ہی کو اپنا نصب العین قرار دینا چاہیئے۔ شعب ابی طالب میں جانے سے قبل، پھر اس وادی میں اور اس سے آنے کے بعد بھی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم اسی ضبط، تحمل، صبر و استقلال کے پیکرِ عزم بنے رہے۔ حضرت خدیجہؓ کی جدائی نے گھر کا سکون بھی لے لیا، جناب ابوطالب کی وفات نے خاندان کے ایسے عظیم ہمدرد سے جو آپؐ کی پرورش میں ہر طرح معاون رہا تھا، آپ کو محروم کر دیا۔ گھر میں بچوں کی نگہداشت کی ذمہ داریوں کا اضافہ ہوا اور باہر ظالموں کی ایذا رسانی کے لئے ان کے حوصلے بڑھ گئے۔

اب قریش نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو زیادہ ستانا شروع کر دیا۔ ایک دفعہ ایک شریر نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سر پر کیچڑ پھینک دی۔ نبی اکرمؐ کی بیٹی فاطمہؓ اٹھیں، آپؐ کے سر مبارک کو دھلایا۔ آپ نے بس یہی فرمایا "پیاری بیٹی تم کیوں روتی ہو، تمہارے باپ کی حفاظت خدا خود فرمائے گا۔" (رحمۃ للعالمین جلد اوّل، صفحہ ۶۵)

ایسے بے شمار واقعات اذیت و ایذا رسانی کے آئے دن ہوتے رہتے، لیکن صبر کی وادی کے اس عظیم مسافر کے عزم و استقلال میں ذرا فرق نہ آتا۔

آپؐ اسی لگن، اسی جوش، اسی انہماک اور اسی یقین کے ساتھ کہ حق پھیل کر رہے گا، تبلیغِ حق میں مشغول ہو جاتے۔

لیکن ابھی ربّ العالمین کو

اپنے رحمت للعالمینؐ کی شانِ عزم و استقلال، ان کی لِی ہٹ بک فاصبِرْ کے مظاہر اور بھی دکھانا تھے، اور بتانا تھا کہ اِس عبدِ کامل صلّی اللہ علیہ وسلّم کے رگ و پے میں صبر کی تلخیوں کے برداشت کے حوصلے تاہنوز باقی تھے۔

طائف کی صعوبتیں

حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم مختلف قبائل کی بستیوں میں تشریف لے جاتے۔ زید بن حارثؓ آپؐ کے ساتھ ہوتے۔ ایک دن مکّہ سے طائف کی طرف رُخ فرمایا۔ طائف میں بنو ثقیف آباد تھے۔ اور سرسبز ملک اور سرد پہاڑ پر رہنے کی وجہ سے ان کے غرور کی کوئی حد نہ تھی۔ وہاں کے سردار تین بھائی عبدِ یالیل، مسعود اور حبیب تھے۔ حضورؐ نے ان کو اسلام کی دعوت دی۔ تینوں نے نہایت گستاخی سے حضورؐ کی رسالت کا انکار کیا۔ اور تکبّرانہ انداز اختیار کیا، کہا، "خدا کو (اور) کوئی بھی رسول بنانے کے لئے نہ ملا سوائے اس کے (جسے چڑھنے کو سواری بھی میسّر نہ ہو۔ اُسے رسول بنانا ہوتا تو کسی مالدار حاکم، سردار کو رسول بنایا ہوتا۔" آپؐ نے بلا جبینِ مبارک کو شکن آلود ہوئے۔ اُن سے کہا کہ اچھا، تم اپنے خیالات کو اپنے پاس رکھو۔ ایسا نہ ہو کہ دوسرے لوگ تمہاری ان غلط فہمیوں سے متاثر ہوں اور ایک نعمت سے محروم رہیں۔

(رحمت للعالمینؐ جلد اوّل، صفحہ ۶۶)

ان تینوں نے اپنی گستاخیوں پر اکتفا نہ کیا بلکہ وہاں کے اوباش لڑکوں اور اپنے غلاموں کو بھڑکایا جنہوں نے آپؐ کو (نعوذ باللہ) گالیاں دیں، بُرا بھلا کہا،

آپ پر پتھر برسائے اور اس درجہ بدتمیزی پر اُتر آئے کہ ارد گرد لوگ جمع ہو گئے اور آپ پر حملہ آور ہوئے اور نہایت بے دردی سے مارنا پیٹنا شروع کیا یہاں تک کہ آپ کے پیر لہولہان ہو گئے۔ خون اس درجہ بہہ نکلا کہ پاپوش مبارک میں جم گیا اور وضو کے وقت پیر نکالنا مشکل ہو گیا۔

ایک مقام پر وعظ کہتے ہوئے آپؐ نے اتنی چوٹیں کھائیں کہ حضورؐ بے ہوش ہو کر گر پڑے۔ زیدؓ نے انہیں اپنی پیٹھ پر اٹھایا۔ آبادی سے باہر لے گئے۔ پانی کے چھینٹے دیئے تب آپؐ کو ہوش آیا۔ اب بارگاہِ ذوالجلال والاکرام میں دستِ بدعا ہوئے۔

"اے اللہ! میں اپنی کمزوری، بے سروسامانی اور لوگوں کی تحقیر کے بارے میں تجھی سے شکایت کرتا ہوں۔ تو سب رحم کرنے والوں میں سب سے زیادہ رحم فرمانے والا ہے۔ تو ہی عاجزوں کا پروردگار ہے۔ تو ہی میرا رب ہے۔ میں تیرا بندہ ہوں۔ تو جسے چاہے مجھے سپرد فرما دے، خواہ اس کے جو انسانیت سے عاری ہو یا کسی بدخلق و ترش رو کے، یا کسی ایسے دشمن کے جو ہر طرح اپنی بداعمالیوں پر قابو رکھتا ہو۔ لیکن اے میرے پروردگار! اگر تو مجھ سے راضی ہے، تیرا مجھ پر غضب نہیں، تو مجھے اِن دشمنانِ دین کی ذرا پروا نہیں کیونکہ تیری عافیت و کرم میرے لئے ان سے کہیں وسیع و زیادہ ہے۔" پھر فرمایا

"اے میرے پروردگار! میں تیری ذات کے نور سے پناہ چاہتا ہوں جس سے سب تاریکیاں روشن ہو جاتی ہیں اور جس سے دنیا و آخرت کے سب کام بن جاتے ہیں۔ اے اللہ! میں پناہ چاہتا ہوں تیرے غضب

---

[1] رحمت للعالمین (بحوالہ طبری صفحہ ۱۱۷)

سے اور تیرے عتاب سے، اور ہر حال میں اس وقت تک تیری رضا کا طالب رہوں گا جب تک تو مجھ سے راضی نہ ہو جائے۔ (اے میرے ربّ! تیرے سوا کوئی نہیں) دونوں جہاں میں، نہ تیرے سوا کوئی حرکت ہے اور نہ کوئی دوسری طاقت ہے۔" (رحمت للعالمین صفحہ ۶۸)

آپؐ کی یہ دعا، دعائے طائف کے نام سے مشہور ہے اور جملہ سیرت نگاروں نے نقل فرمائی ہے۔ ہر چند اللہ تعالیٰ نے آپ کی خدمت میں مَلَکُ الجبال کو بھیجا جس نے کہا، اے نبیِ کریمؐ اگر حکم ہو تو اس قوم کو دونوں پہاڑیوں کے درمیان کچل کر ہلاک کر دوں۔ لیکن حضور اکرمؐ نے فرمایا کہ "میں نہیں چاہتا کہ انہیں نیست و نابود کیا جائے۔ بلکہ میں اُمید رکھتا ہوں کہ حق تعالیٰ ان کی نسل سے ایسے لوگ پیدا فرمائے گا جو اس کی عبادت کریں گے اور کسی کو اس کا شریک نہ بنائیں گے۔" (مدارج نبوت صفحہ ۸۱ جلد دوم)

اس وقت ربیعہ کے دونوں بیٹوں نے حضورؐ کو اس حالت میں دیکھا تو رحم آیا اور انگور کا ایک خوشہ آپؐ کے پاس بھیجا۔ آپ نے "بسم اللہ" کہہ کے ہاتھ بڑھایا۔ سیرت نگار لکھتے ہیں کہ عداؔس (غلام) کو یہ لفظ سُن کر حیرت ہوئی اور پوچھا کہ آپ کے شہر کے لوگ تو یہ جملہ نہیں بولتے۔ آپؐ نے عداؔس سے دریافت کیا کہ تم کس شہر کے ہو اور تمہارا مذہب کیا ہے۔ اُس نے کہا کہ میں شہر نینوی کا رہنے والا ہوں اور میرا مذہب عیسائی ہے۔ حضورؐ نے فرمایا۔ "اچھا تم یونسؑ ابن متی کے قصبہ کے رہنے والے ہو۔" عداؔس نے پھر حیرت سے پوچھا کہ آپ کو اُن کی کیسے خبر ہوئی۔ آپؐ نے فرمایا "وہ میرے دینی بھائی تھے۔ وہ بھی نبی تھے اور میں بھی نبی ہوں۔" یہ سنتے ہی عداؔس نے سرِ تسلیم خم کر دیا اور سرِ مبارک اور پائے مبارک کو بوسے دیئے۔ ربیعہ کے بیٹوں نے اپنے غلام کی یہ حالت دیکھی تو چراغ پا ہوئے

اور کہا "کم بخت تو نے اپنا مذہب ہی خراب کر لیا۔" عداس نے جواب دیا کہ "روئے زمین میں کوئی شخص اس (ص) سے بہتر نہیں۔ اس (ص) نے مجھے ایسی بات کی اطلاع دی ہے جسے نبی کے سوا کوئی دوسرا جان نہیں سکتا۔" لیکن آقا کے خوف سے وہ بھی ایمان نہ لایا۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قوم ثقیف[1] کے لوگوں کو مکہ کے قبائل کے مقابلہ میں اور بھی سخت دل پایا تو مایوس ہو کر مکہ کی طرف مراجعت فرمائی۔

راستہ میں مکہ سے باہر نخلہ میں قیام فرمایا اور علی الصباح جب آپ (ص) نماز فجر میں کلام پاک کی تلاوت اپنے مخصوص، پُر اثر انداز سے فرما رہے تھے تو ادھر اجنہ کی ایک جماعت کا گزر ہوا تو وہ، کلام کی لذت اور آپ (ص) کی شیریں کلامی سے متاثر ہو کر، نماز کے بعد آپ (ص) کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سرفراز ایمان ہوئے۔ اور بیعت کر کے اپنی قوم میں تبلیغ کے لئے رخصت ہوگئے۔ غرض یہ آزمائش جو بظاہر مایوسی کے سوا کچھ نہ تھی، تخلیق کی اصل غایت کہ انسان اور جن، دونوں اللہ کی عبادت کریں۔ اس عظیم مقصد میں معاون ہوئی۔

حق یہ ہے

کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں آزمائشوں کے بعد ہی انعام ہیں، ناامیدیوں کے ساتھ امید کی شعاعیں ظاہر ہوتی ہیں۔

○

امید کی پہلی کرن تو یوں ظاہر ہوئی کہ مطعم بن عدی کا دل آپ (ص) کی بے بسی سے پسیجا اور وہ اپنی حفاظت میں آپ (ص) کو گھر لے گیا۔ پھر اپنے بیٹوں

---

[1] یہ لوگ مکہ سے چند میل کے فاصلہ پر طائف میں آباد تھے۔ انہیں کے سردار عمر بن عمیر کے تین بیٹے عبد یالیل، مسعود اور حبیب تھے۔

اور بھتیجوں کے ساتھ ہتھیار باندھ کر خانہ کعبہ میں اعلان کیا کہ "میں محمدؐ کے دین پر تو نہیں ہوں لیکن اُن کا حامی اور مددگار ہوں"۔ چنانچہ آپؐ لوگوں کی کھلم کھلا اذیت سے بچ کر پھر اسی انہماک سے تبلیغِ دین میں مشغول ہو گئے۔

آپؐ اکثر ہم وطنوں سے جُدا رہ کر، جہاں بھی کوئی شریف اجنبی نظر آتا، یا کسی باعزت قبیلہ کے سردار سے ملنا ہوتا، تو تبلیغِ دین فرماتے۔ اس وقت بھی ابولہب اپنی حرکتوں سے باز نہ آتا اور لوگوں کو بھڑکاتا رہتا کہ اے پردیسی لوگو! تم محمدؐ کی باتوں میں نہ آنا۔ یہ تم کو تمہارے بتوں سے چھڑا دے گا۔ اس سے ہر طرح خبردار رہو۔ یہاں بھی پہلے ناکامی ہی کا سامنا کرنا پڑا۔ جن کے پاس جاتے اور پیغامِ توحید پیش فرماتے، وہی اپنی بیزاری کا اظہار کرتا۔ نہ بشارتوں کا ان پر اثر ہوتا نہ خوفِ خدا کا۔ وہی مذاق، وہی استہزا اُن کا وطیرہ ہوتا۔ بعض اگر دین کی طرف رجوع ہونا چاہتے تو یہ پوچھتے، کہ اگر اچھا تم کو کامیابی ہوئی تو ملک و حکومت میں ہمارا ایک حصہ ہوگا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا جواب یہی ہوتا "ملک تو خدا کا ہے۔ وہ مالک ہے۔ جس کے قبضہ میں چاہے دے"۔ لوگ ہنسی اڑاتے کہ ایسا کون ہوگا جو اپنی گردن کٹوائے اور حاکم دوسروں کو بنا دیکھے۔

سالہ بعثت نبوی میں دوسری کرن اُمید کی چمکی

مدینہ کے دو بت پرست قبیلے، اوس اور خزرج، جو اگرچہ ایک ہی دادا کی اولاد تھی، لیکن ان کی باہمی جنگ تاریخ کا خونیں باب ہے، حضورؐ سے ملے۔ قبیلہ خزرج کے لوگوں میں قبیلہ بنی عوف کے ایک سردار سوید بن صامتؓ، جو اپنی شاعری اور علمیّت میں مشہور تھے، آپؐ سے ملنے آئے۔ انہوں نے حضرت لقمان کے صحیفہ سے کچھ نصیحتیں پڑھ کر حضور کو سُنائیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میرے پاس بھی چند نصائح ہیں جو ہدایت اور نور ہیں۔ اور آپؐ

نے قرآنِ حکیم کی چند آیتیں سنائیں۔ سوید بن صامت کلام سے بہت متاثر ہوا اور کہا کہ "بیشک یہ پیارا کلام اور شیریں نصیحتیں ہیں"۔ مدینہ گئے، وہاں لوگوں سے اس کلام کا ذکر کیا۔ لیکن عمر نے وفا نہ کی اور مشرف بہ اسلام نہ ہوسکے۔

آخر قبیلہ خزرج کے کچھ لوگ اس غرض سے حضورؐ سے ملنے آئے کہ ان کی بہادری اور عزم سے فائدہ اٹھا کر ان کی اعانت حاصل کرلیں تاکہ جنگ میں وہ ہمارے معاون رہیں۔ حضورؐ نے ان نووارد اہلِ مدینہ کو وعظ فرمایا اور کلام پاک پڑھ کر سنایا۔ حضرت ایاس بن معاذ، جو ایک سمجھدار ذی فہم نوجوان تھے، کلام کی شیرینی سے متاثر ہوئے اور کہنے لگے کہ لڑائی اور جنگ کے لئے قریش کے قبیلہ سے معاہدہ سے کہیں بہتر ہے کہ ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر بیعت کرلیں۔ لوگوں نے ان سے اتفاق نہ کیا لیکن چند دن بعد، مرتے وقت، کلمہ لا الٰہ الا اللہ اُن کی زبان پر تھا۔

گو قریش سے اس موقع پر کوئی معاہدہ نہ ہوا، اور نہ کسی نے حضورؐ کے ہاتھ پر بیعت کی لیکن بالآخر حق اپنا اثر دکھائے بغیر نہ رہا۔

بیعتِ عقبۂ اولیٰ

سنہ ۱۱ نبوی میں عقبہ پہاڑی کے قریب مدینہ کے رہنے والے چھ خزرجی اشخاص مشرف بہ اسلام ہوئے۔ یہ واقعہ ۶۲۰ء کا ہے جب یہ چھ مسلمان اپنے وطن واپس گئے اور انہوں نے اس خبر کو مشہور کیا کہ ملکِ عرب میں ایک نبی پیدا ہوئے ہیں، جو محبت و اخوت کا پیغام دیتے ہیں، سینکڑوں سال کے جھگڑے ختم کرتے ہیں اور بُت پرستی سے نکال کر اللہ کی طرف بلاتے اور راہِ ہدایت دکھاتے ہیں، تو چند دنوں میں مدینہ منورہ کی گلی گلی اور کوچہ کوچہ میں مقدس اسلام کا چرچا عام ہوگیا۔ اس بیعت کو بیعتِ عقبۂ اولیٰ کہتے

ہیں چونکہ یہ عقبہ پہاڑی پر ہوا تھا۔

دوسرے سال بھی اہلِ یثرب چھ مشہور قوموں کی طرف سے چھ آدمیوں کو ساتھ لائے اور اسی جگہ پر جہاں وہ پہلے چھ آدمی ایمان لائے تھے یہ چھ بھی داخلِ اسلام ہوئے، یعنی حضور سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دستِ مبارک پر بیعت ہوئے۔ جو اقرار ان لوگوں نے کیا وہ یہ ہے :-

"ہم لوگ کسی کو خدا کا شریک نہ بنائیں گے، چوری، زناکاری، اولاد کے قتل سے باز رہیں گے۔ ہم کسی کی چغلی اور شکایت نہ کریں گے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہر ایک حق بات کو مانیں گے۔ اور خوشی وغم میں اُن کے شریکِ حال رہیں گے۔"

یہی معاہدۂ عقبۂ اولیٰ کہلایا۔ اسی اقرار کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک بزرگ صحابی مصعبؓ بن عمیر کو اپنے ساتھ مدینہ لے گئے تاکہ اُن سے کلام مجید پڑھیں اور دینی باتیں سیکھیں۔

(تاریخِ اسلام از مولانا عاشق الہٰی میرٹھی صفحہ ۱۰۳)

شبِ معراج

الہٰی کیست کو آمد دامن فشاں بہ درگاہت
کہ از گرد و غبارِ او کہکشاں ریزد

عبدیت نے جب اپنے کمالِ ضبط، تحمل، صبر و استقلال کے مظاہرے نہایت عاجزی، انکساری، عزم کے ساتھ پیش کئے اور اپنے ربّ کے لئے ہر طرح کی تکالیف نہایت خندہ پیشانی کے ساتھ برداشت کیں تو ربِ کریم کی رحمتِ بے پایاں جوش میں آئی اور اس عبدِ کاملؐ کی ایسی عزت افزائی فرمائی کہ :-

عبدیت اور الوہیت کی کمانیں مل گئیں

فاصلہ کم ہوتے گئے اور مقام "قابَ قوسین او ادنیٰ" میں "قف" کا حکم فرما کر شرفِ باریابی اور لطفِ ہمکلامی کے ساتھ مشاہدۂ حق سے شادکام فرمایا۔ اِس کا بیان سورہ اسریٰ اور سورہ نجم میں تفصیل سے قرآنِ حکیم میں آیا ہے۔

(دیکھئے فیوض القرآن صفحات ۶۴۱-۶۴۳)

یہاں اختصار کے ساتھ چند امور کی طرف توجہ مبذول کرنے کی سعادت حاصل کی جا رہی ہے۔

ایک رات، طائف سے واپسی اور ہجرت سے ایک سال قبل، کا واقعہ ہے کہ جبرئیلؑ براق کی سواری کے ساتھ تشریف لاتے ہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خانۂ کعبہ سے بیت المقدس اپنے ہمراہ لے جاتے ہیں۔ بیت المقدس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ تشریف آوری جسم و جسمانیت کے ساتھ تھی۔ یہاں بھی ایک بار کعبہ سے روانگی سے قبل سینہ کے چاک ہونے اور قلبِ اطہر کو سونے کے ایک تشت میں رکھ کر پاک سے پاک تر بنانے کا واقعہ مروی ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے استقبال کے لئے بیت المقدس میں تمام انبیاء کرام از آدمؑ تا حضرت عیسیٰ علیہم السلام جمع ہیں۔ آپؐ امامت فرماتے ہیں اور وہ سب بطور مقتدی نماز ادا کرتے ہیں۔ گویا تمام انبیاء علیہم السلام، جو اس نورِ مبینؐ کے اخلاقِ کریمانہ کی جھلکیوں سے اپنے اپنے زمانہ میں سرفراز ہوئے تھے، سب عملاً بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق کرتے ہیں اور حضورؐ کی امامت اُن کے نبی ہونے کی تصدیق کے ساتھ اُنؑ کے اُس عہد کی تصدیق تھی جو روزِ الست اُنؑ سے ربِّ کریم نے لیا تھا اور جس کی پوری پوری ادائیگی انہوںؑ نے اپنے اپنے زمانہ میں کی۔

پھر آسمانوں کی جانب سفر ہوتا ہے۔ ہر آسمان پر پہنچتے ہیں، جبرئیل امین ؑ دروازہ کھلواتے ہیں۔ آواز آتی ہے "آپ ؑ کے ساتھ کون ہے؟" جواب دیا جاتا ہے۔ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)، پھر پوچھا جاتا ہے "کیا آپ ؑ کو اُن ؑ کی طرف بھیجا گیا تھا؟" جبرئیل ؑ جواب دیتے ہیں۔ "ہاں" دروازہ کھلتا ہے۔ پھر جملہ ملائکہ اور ہر آسمان پر قیام پائے ہوئے انبیاء ؑ، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا خیر مقدم کرتے ہیں اور کہتے ہیں "کیا ہی خوب آنے والا ہے؟"

اسی طرح ساتوں آسمانوں کی سیر کرائی جاتی ہے اور مختلف آسمانوں پر حضرت آدم علیہ السلام، حضرت یحییٰ ؑ، حضرت عیسیٰ ؑ، حضرت یوسف ؑ، حضرت ادریس ؑ حضرت ہارون ؑ، اور چھٹے آسمان پر حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ساتویں پر حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ملاقات ہوتی ہے۔ سب ہی خوشی و مسرت کا اظہار کرتے ہیں۔

یہاں تک کہ آپ "سدرۃ المنتہیٰ" تک پہنچتے ہیں، جہاں چار نہریں بہہ رہی ہیں، دو اوپر اور دو نیچے پوشیدہ۔ جنہیں آسمان پر جنت کی نہریں اور زمین پر نیل و فرات بنایا گیا۔ اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے "بیت المعمور" لایا گیا، جس میں روز ستر ہزار فرشتے داخل ہوتے ہیں۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو شراب، دودھ اور شہد کا ایک ایک پیالہ پیش کیا گیا۔ آپ ؐ نے دودھ کا پیالہ لے لیا۔ جبرئیل ؑ نے فرمایا "یہ پیالہ اس فطرت صحیحہ کی علامت ہے جس پر آپ ؐ کی امت قائم رہے گی۔ اب وہ مقام آیا کہ جسے کائنات کی سرحد کہنا چاہیئے۔

ایک سواری براق چھوٹتی ہے۔ دوسری سواری رف رف پر حضور ؐ تنِ تنہا سفر طے کرنا شروع کرتے ہیں کہ مقامِ جبرئیل ؑ صرف یہاں تک تھا کہ اس کے بعد کا سفر ان کے امکان و قوت کے اس درجہ باہر تھا کہ اگر

ایک قدم بھی آگے بڑھائیں تو اُن کے پَر ہی جل جائیں۔

"سفر ہنوز جاری ہے۔ اِلیَّ، اِلیَّ کی صدائیں گوش مُبارک سُن رہے ہیں۔ عرش سے بالائے عرش کا سفر ہے۔ سطحِ نُور پہ، نورانی سواری پر ایک نُورالسمٰوٰت والارض کا رسولؐ، اُس کا عبدؐ، حضوری کے منازل طے کر رہا ہے اور اس قرب و دید سے نوازا جاتا ہے جس کا ذکر سورۂ نجم میں آتا ہے، جس کی طرف "ھوالسمیع البصیر" میں سورہ بنی اسرآئیل میں اشارہ ہے۔ یہ بلانے والے کا بُلانا، خالقِ کائنات کا بُلانا ہے اور بلانا بھی اپنے خاص چُنے ہوئے عبد اور رسولؐ کو بلانا ہے۔ زمین و آسمان کی فضا اور اس کی جملہ مخلوقات کی کیا مجال کہ کوئی شے اس میں حارج ہو سکے۔ وہاں تو حقیقت الحقائق اپنے عبدؐ کو حقائق دکھانے لے گیا ہے۔ مثال سے سمجھانے کی ضرورت کیا ہے۔ یہاں مثال کا گذر ہی نہیں۔ بے مثال ربّ کی بے مثال نوازش ہے۔ البتہ معراج میں امّت کے لئے نماز کا تحفہ ملا اور معراج ہی میں سورۂ بقرہ کی آخری دو آیتیں عطا ہوئیں تاکہ بندۂ مومن نفسانیت پر غلبہ پا سکے اور معراج کی ان کیفیات سے جو اس کا نصیبہ ہوں، محروم نہ رہے۔"

(از فیوض القرآن صفحہ ۶۴۲)

اس سفر میں حضورِ اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے جنت و دوزخ، لوح و قلم، عرش و کرسی، تمام عجائباتِ علوی کی سیر کی۔ اور اس نماز کو جو پہلے پچاس وقت کی فرض ہوئی تھی، حضرت موسیٰ علیہ السّلام کے مشورے پر تخفیف کرواتے رہے لیکن جب صرف پانچ نمازیں فرض رہ گئیں تو آپؐ کی حیا نے گوارا نہ کیا کہ اللہ تعالیٰ سے امّت کے لئے مزید تخفیف کی درخواست کی جائے۔ لیکن اللہ ربّ العزّت کے کرم کا اظہار یوں ہوا کہ پانچ وقت کی نماز کا ثواب پچاس وقت کی نماز کے برابر ہی ہو گا۔ اللہ اپنے انعامات میں

کمی نہیں فرماتا۔ سُبحان اللہ۔

اس واقعہ معراج میں یہ بات بھی ملحوظِ خاطر رہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس رَف رف کے سفر میں جو ایک عالمِ بےخودی میں ہو رہا تھا، خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو جس آواز سے مانوس کیا گیا وہ آواز ان کے دوست صدیقِ اکبرؓ کی تھی۔ اور یہ بھی یاد رہے کہ مقامِ رسالت کی انتہائی بلندیوں پر پہنچ کر بھی، عبدِ کاملؐ اپنی امت کو نہ بھولا، اور نماز میں اُس لطفِ ہم کلامی کی یادوں کو التحیات میں جگہ دے کر ہر مومن کے لئے باعثِ تسکین بنا دیا گیا

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اس بلندیٔ مراتب کے متعلق حضرت مولانا عبدالحق دہلوی رحمت اللہ علیہ نے ایک ایسی پیاری بات کہی ہے کہ اس کو یہاں نقل کرنے کو جی چاہتا ہے۔ آپ ایک روایت کو بیان کرتے ہیں ۔ مروی ہے کہ عرش کے داہنی جانب نُور کی ایک نہر ہے جو سات آسمانوں اور سات زمینوں اور سات دریاؤں کے برابر ہے۔ روزانہ علی الصبح جبرئیل علیہ السلام اس میں غسل کرتے ہیں اور جب بازو جھاڑتے ہیں تو حق تعالےٰ اس کے ہر قطرہ سے کئی ہزار فرشتہ پیدا فرماتا ہے۔

اور اس کے بعد

"حضرت شیخؒ فرماتے ہیں کہ اگر آسمانوں میں فرشتوں کی تسبیح سے فرشتے پیدا ہوتے ہیں تو کیا تعجب ہے کہ زمین پر بھی حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خاصانِ بارگاہِ قدس اور صلحاءِ امت کی تسبیحات وتہلیلات سے فرشتے پیدا ہوتے ہوں گے۔ وَاللّٰہُ عَلیٰ کُلِّ شَیٍٔ قَدِیر

(مدارج النبوت، حصہ اوّل، صفحہ ۳۰۱)

حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ، بیانِ معراج سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے علم کے متعلق ایک حدیث یوں بیان فرماتے ہیں کہ جب

حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے رب کے قریب ہوئے، اور اُن میں یہ تاب نہ تھی کہ کچھ جواب دے سکتے، تو اللہ تعالیٰ نے اپنا دستِ قدرت حضورؐ کے دونوں شانوں کے درمیان بے کیف وحد بڑھایا، جس کی ٹھنڈک آپؐ نے اپنے سینے میں محسوس فرمائی۔ اور حضورؐ فرماتے ہیں۔ "اس وقت مجھے تمام اولین و آخرین کا علم عطا ہوا اور طرح طرح کے علوم تعلیم فرمائے جن میں ایک علم ایسا تھا جس کے نہ ظاہر کرنے کا مجھ سے عہد لیا گیا، ایک علم ایسا تھا جس کے ظاہر کرنے اور چھپانے کا مجھے اختیار دیا گیا اور ایک علم ایسا تھا جس کو اپنی امت کے ہر خاص و عام میں تبلیغ کرنے کا حکم فرمایا گیا۔"

(مدارجِ نبوّت جلد اوّل صفحہ ۳۰۵)

اسی علم کے سلسلہ میں حضرت محدثؒ ایک حدیث یوں بیان فرماتے ہیں کہ "مجھے رَف رَف پر بٹھایا گیا وہ مجھے لے کر روانہ ہوا یہاں تک کہ عرش پر پہنچا تو..... عرش سے ایک قطرہ میرے قریب آیا اور وہ میری زبان پر گرا اور میں نے اس چیز کو چکھا جسے چکھنے والے نے کبھی اس سے زیادہ شیریں نہ چکھا ہوگا۔ اور مجھے اولین و آخرین کی خبریں حاصل ہوگئیں اور میرا دل روشن ہو گیا۔ عرش کے نور نے میری آنکھ کو ڈھانپ لیا اور اس وقت میں نے تمام چیزوں کو اپنے دل میں دیکھا اور اپنے پسِ پشت بھی ایسا ہی دیکھنے لگا جیسے اپنے سامنے دیکھتا ہوں۔"

(مدارج النبوّت، حصہ اوّل صفحہ ۳۰۶)

المختصر

جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے "ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰی" اور "مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰی" کی منازلِ عرفان اور مشاہدِ احدیت و جمالِ صمدیت سے فیض یاب، زمین کی طرف مراجعت فرمائی تو یہ واقعۂ معراج لوگوں کے لئے

باعثِ آزمائش بن گیا۔ ضعیف الاعتقاد مسلمان بھی مرتد ہوکر ہنسی اڑانے لگے۔ بُت پرستوں کو لعن طعن کا موقع مِلا۔ لوگ حضرت ابوبکر صدیق رضؓ کے پاس پہنچے۔ کہا۔ لو اب تو آپؓ کے دوستؐ آسمانوں کی سیر کرنے لگے۔ بیت المقدس، جنت و دوزخ، سب ایک لحظہ میں دیکھنے لگے۔ صدیقِ اکبرؓ نے فرمایا کہ جب ایک لحظہ میں آسمانی وحی کا اُنؐ پر اترنا مان لیا، آپؐ کو اللہ کا پیغمبر اور رسول مان لیا، تو پھر اس ملکوتی سیر پر ایمان لانا کون سی بڑی بات ہے؟ اور صدیقِ اکبرؓ کا لقب پایا۔

دراصل معراج کا یہ واقعہ لوگوں کے لئے امتحان کی ایک کسوٹی بن گیا جس پر کھرے کھوٹے کی پہچان بھی آسان ہوگئی کہ صاحبِ ایمان مردِ مومن اور کمزور اور ناقص العقل لوگوں میں امتیاز ہو جائے۔ یہ کسوٹی آج بھی ہے۔ خصوصاً ان کے لئے جو صرف سبب و اسباب ہی پر بھروسہ کرتے ہیں اور مسبب سے غافل ہیں، اور یہ نہیں سمجھتے ہیں کہ معراج کا تمام واقعہ "سبحان الذی" سے شروع ہوتا ہے۔ وہ اللہ جو تمام سبب و اسباب سے بلند و بالا ہے۔ سب اُس کے پیدا کئے ہوئے ہیں۔ زمان و مکان اُس کے ہیں۔ معراج کے متعلق قلب میں شبہ لانا یا شبہ کا آنا، اللہ کی قدرت پر شک کے مترادف ہو جاتا ہے۔ اللہ ہمیں محفوظ رکھے۔

○

افسوس یہ ہے کہ معراج کے اس واقعہ کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب، استہزا، ایذا اور تکلیفوں میں اور اضافہ ہوگیا۔ لوگ طرح طرح سے آپؐ کو اذیتیں پہنچاتے (ایک بار آپ حرم میں مشغولِ عبادت تھے کہ آپ کے کسی دشمن نے آپؐ کی چادرِ مبارک پکڑ کر اس زور سے کھینچی کہ آپؐ

کے گلے میں پھندا پڑ گیا۔ صدیق اکبرؓ دیکھ کر دوڑے اور آپ کو بچایا۔ حضورؐ کی زبان پر صرف یہ آیا "افسوس ہے کہ لوگ خدا کے رسول کو صرف اس لئے سزا دیتے ہیں کہ وہ اللہ کا پیغام پہنچاتا، اللہ کی طرف بلاتا ہے"

حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے مکان تشریف لے جاتے تو وہاں بھی دشمنِ اسلام چین نہ لینے دیتے۔ آپؐ کے پڑوسی دیواروں کے اوپر سے خاک دھول پھینکتے، کنکریاں مارتے، بچری کی نجاست پھینکتے بلا اس خیال کے کہ وہ کہاں جا رہی ہے، کپڑوں پر، سروں پر یا کھانے کی ہانڈی پر، کبھی نماز کی حالت میں ذبح کی ہوئی بھیڑ بکریوں کی غلاظت آپؐ پر ڈالتے۔ آپؐ گھر میں بھی ایک پتھر کی آڑ میں نماز پڑھتے، لیکن ان کا یہ طریقہ جاری رہتا۔ آپؐ یہی فرماتے۔ "اے عبد مناف! یہ کون سا انصاف ہے کہ پڑوسی کے ساتھ یہ سلوک روا رکھتے ہو" یہ جملے بھی اندازِ تبلیغ لئے ہوتے۔ کبھی پڑوسی کے حق کی طرف توجہ دلاتے کبھی اس انداز میں اللہ اور اس کی عبادت کی عظمت کا پہلو نمایاں ہوتا۔

(اقتباس از تاریخِ اسلام، مولانا عاشق الٰہی صفحہ ۱۱۲-۱۱۵)

بیعتِ عقبۂ ثانیہ ۱۳ نبوی

جیسا بیان ہو چکا ہے کہ حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم حج کے زمانے میں، جب مختلف قبیلوں کے لوگ مکہ آتے، تو آپؐ ان کو بت پرستی کی جہالت سے نکالنے اور راہِ حق کی دعوت دینے میں مشغول رہتے۔ اُدھر مدینہ منورہ میں حضرت مصعبؓ بن عمیر قبیلہ بنو عبدالاشہل کو مقدس مذہب اسلام کے عقائد و تعلیمات سے بہرہ مند فرمانے میں شب و روز مشغول رہتے۔ حضرت مصعبؓ کی بھی یہ مساعیٔ جمیلہ بارآور ہو رہی تھیں اور اسلام

کی شعاعیں یثرب کے گوشے گوشے میں پھیل رہی تھیں۔ اور وہاں کے لوگ حضور سرورِ کائنات صلّی اللہ علیہ وسلّم کے جمالِ نورفشاں کے ہمہ تن منتظر تھے۔ ۱۳ سنہ نبوی میں یثرب کی ایک بُت پرست قوم نے عرب کی رسمِ قدیم کے مطابق مکّہ آنے کا ارادہ کیا اور ستر مسلمان بھی ان کے ساتھ ہو گئے تاکہ اس موقع سے فائدہ اُٹھا کر حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کی زیارت سے شرف یاب ہو سکیں، اور ممکن ہو تو آپؐ کو اپنے ساتھ لینے آئیں۔ چنانچہ یہ لوگ شروع ماہ ذی الحجہ میں، ۷۵ آدمیوں کے قافلہ میں جس میں ۷۳ مرد اور ۲ عورتیں تھیں، مکّہ آئے اور حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کو خُفیہ طور پر اپنے آمد کی اطلاع دی۔ اور اسی عقبہ پہاڑی پر جہاں ان سے پہلے ان کے مسلمان بھائی نے شرفِ بیعت حاصل کیا تھا، وہ بھی اس مقام پر اس سعادتِ بیعت سے سرفرازی کے متمنی ہوئے۔

حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم وسطِ ایامِ تشریق، تہائی رات گذرنے کے بعد، عقبہ پہاڑی پر تشریف لے گئے۔ ادھر یہ مسلمان بھی اپنے بُت پرست ساتھیوں سے چھپ کر خفیہ طور سے عقبہ کی پہاڑی پر پہنچ گئے، اور اس نورِ مبینؐ کے گرد ہالہ بنا کر باادب بیٹھ گئے۔ اس وقت آپؐ کے چچا حضرت عباسؓ نے جو اس وقت تک مسلمان نہ ہوئے تھے، سلسلۂ کلام کا یوں آغاز فرمایا:۔

"اے جماعتِ خزرج! تم کو معلوم ہے کہ محمدؐ ہم میں باعزت شمار ہوتے ہیں اور بڑے قبیلے کی حفاظت و امن میں رہتے ہیں، گو اُنؐ کے اپنے مذہب کے سبب مکّہ میں انؐ کے مخالف زیادہ ہو گئے ہیں پھر بھی وہؐ جس نگاہِ رفعت سے دیکھے جاتے ہیں وہ شاید دوسروں کو حاصل نہ ہو کیونکہ جو لوگ مخالف ہیں وہ درحقیقت انؐ کے دین کے مخالف ہیں، محمدؐ کے مخالف نہیں۔ لیکن محمدؐ اُن کی بے جا مخالفتوں سے تمہارے ساتھ جانا پسند کرتے ہیں۔

اب تم اپنی قوت و ہمت کو دیکھ لو۔ اگر تم اُنؐ کے جاو بے جا ہر حکم کی تعمیل کر سکو اور انؐ کو ہر چھپے اور کھلے دشمن سے بچا سکو، تو تم کو اختیار ہے محمدؐ کو اپنے ساتھ لے جاؤ۔ اور اگر یہ تمہاری طاقت سے باہر ہے اور تم کسی آنے والے زمانے میں دست کشی کا خیال کرتے ہو تو بہتر ہے کہ ابھی صاف جواب دے دو تاکہ محمدؐ کی یہ موجودہ عزت و حفاظت برقرار رہے۔"

(تاریخِ اسلام صفحہ ۱۱۶ ـ ۱۱۷)

نووارد انصار نے حضرت عباسؓ کی گفتگو سنی اور کہا ہم اپنے پیشوا حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ آپؐ کیا فرماتے ہیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے اسلام کے محاسن بیان فرمائے۔ کچھ آیات کی تلاوت فرمائی۔ مذہبِ اسلام کی خوبیاں بیان فرمائیں۔ اور عبادتِ باری تعالیٰ کی طرف رغبت دلائی۔ پھر مختصراً یوں فرمایا:

"اللہ تعالیٰ کے لئے عہد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی کی عبادت نہ کرو۔ اور میرے لئے یہ عہد کرو کہ جو کہوں وہ سنو اور مانو۔ رنج میں خوشی میں، افلاس میں تونگری میں، بہر حال میری اطاعت کرو، تابعدار رہو۔ اللہ کے واسطے خرچ کرو۔ حق بات کے اظہار میں کسی ملامت کرنے والے کا خوف نہ کرو۔ مجھ کو اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھو اور جس طرح اپنے بچوں اور عورتوں کی حفاظت کرتے ہو ایسی ہی میری حفاظت کرو۔"

سب نے یہ عہد دل سے قبول کیا اور سید الانصار حضرت براءؓ ابن معرور نے ہاتھ بڑھایا، پھر تمام نووارد انصار نے دستِ مبارک پر بیعت کی۔ البتہ ایک یقین دہانی جوان کی دلی آرزو تھی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ضرور چاہی اور عرض کیا کہ ہمارے ماں باپ حضورؐ پر قربان لیکن غلبہ و نصرت کے بعد آپؐ ہم لوگوں کو چھوڑ کر پھر مکہ تو نہ چلے جائیں گے حضور صلی اللہ علیہ وسلم

نے تبسم فرمایا اور فرمایا "نہیں ہرگز نہیں۔ تمہارا خون میرا خون۔ تم ہمارے ہو۔"
(میرا جینا مرنا تمہارے ساتھ ہے) آج تک اس عہد و پیمان کی خوشبو سے
مدینہ کی گلیاں مہک رہی ہیں۔

اس کے بعد حکم فرمایا کہ ۱۲ آدمیوں کو چن کر اپنا نقیب مقرر کرو جو اپنی
ماتحت رعایا کے نگہبان اور حاکم قرار پائیں۔ اور یہ فخر قبیلۂ خزرج کے
نو۹ حضرات کو اور قبیلۂ اوس کے تین۳ آدمیوں کو حاصل ہوا۔ اور اس طرح
پہلے ہی دن محبت، امانت، حفاظت و ہمدردی کی بنیاد محض خاندان
اور قبیلہ سے نکال کر، اسلامی اخوت پر رکھ دی۔

پھر نو وارد قبیلہ کے لوگوں نے دریافت کیا کہ ہماری اس قربانی کا جو ہم
جان و مال سے اسلام کے لئے دیں، اور ہر حال میں حلقۂ غلامی سے وابستہ رہنے
کا، ہم کو کیا صلہ ملے گا۔ فرمایا خواجۂ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے:۔

"عقبیٰ کی خوشی اور جنت کا پُر فضا باغ"

تب تو اور بھی خوشی سے، دل سے، حضورؐ کا ہاتھ مانگا اور بیعت کی لذت
اٹھائی۔ اور خاموشی سے واپس جا کر اپنے خیموں میں سو رہے۔

صبح ہوتے ہوتے پوشیدہ بیعت کی خبر مکہ میں عام ہو گئی اور سختی سے
یثرب کے قافلہ والوں سے استفسارِ حال کیا گیا۔ مشرکین نے قسم کھا کر
یقین دلایا کہ یہ محض افواہ ہے۔ آخر قافلوں نے کوچ کیا اور اہلِ مکہ نے
اپنا غضب و غصہ نکالنے میں ان کا تعاقب کیا۔ اس میں حضرت سعدؓ بن
عبادہ، جو اپنی قوم کے نقیب تھے، پکڑے گئے۔ کافروں نے آپ کی مشکیں
کسیں اور زمین میں گھسیٹتے ہوئے مکہ لائے اور اس شہید کے زخموں نے،
وعدۂ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی حقانیت کو، انہیں آنکھوں سے اس کا اپنا
مقام اسی دنیا میں دکھلا دیا۔

یعنی "عقبیٰ کی خوشی اور جنّت کا پُر فضا باغ "
ساتھ ہی حیاتِ جاوداں اس دنیا میں بھی۔

○

ہجرتِ صحابہ کرام

اب تک مسلمانوں کو ہجرت کا حکم نہ ملا تھا۔ مدینہ کی اس جماعت کے مسلمان ہونے کے بعد کفارِ مکّہ نے مکّہ کے مسلمانوں پر اور بھی تشدّد شروع کر دیا تھا۔ گویا وہ اپنے دل کے پھپولے یوں پھوڑ رہے تھے کہ ہر قسم کی اذیّت ان مسلمانوں پر روا رکھتے اور رحم نہ آتا۔

آخر آپؐ ذی الحجہ سے صفر تک مکّہ میں مقیم رہے لیکن اپنے اصحاب کو مدینہ کی طرف ہجرت کا حکم فرما دیا۔ مکّہ سے یثرب کی جانب یہ ہجرت عام مسلمانوں کے لئے مصائب اور دشواریوں سے خالی نہ تھی۔ سب ہی کو اپنا گھر بار، مال و متاع، وطن اور وطن کی محبّت کو قربان کرنا پڑا۔ کسی کی گود سے اس کا بچّہ چھین لیا گیا۔ کسی کو قید کر لیا گیا۔ کسی کو زدوکوب کیا گیا۔ لیکن سب ہی اہلِ ایمان ثابت قدم رہے۔ اسلام پر جئے، ایمان پر مرے۔ اب صرف مکّہ میں حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کے علاوہ، حضرت ابوبکر صدیقؓ اور ان کے گھر والے اور سیّدنا علی مرتضیٰؓ باقی تھے۔ اور حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم حکمِ الٰہی کے منتظر تھے۔

ہجرت

اہلِ مدینہ کی حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کے ساتھ یہ عقیدت اہلِ مکّہ کے لئے اور بھی حسد کا موجب ہوئی اور آخر قریش نے دارالندوہ میں یہ فیصلہ کیا کہ

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو (نعوذ باللہ) قتل کر دیا جائے۔ اور یہ اس طرح ہو کہ ہر قبیلہ کا ایک ایک جوان اس سازش میں شریک ہو، تاکہ آپؐ کا خون بہا تمام قبائل پر تقسیم ہو جائے، اور سب قبیلوں سے مل کر جنگ کرنے کی کسی کو ہمت نہ ہو۔ کہا جاتا ہے کہ یہ مشورہ ابوجہل کا تھا۔ اس مشورہ میں شیطان ایک نجدی بزرگ کی صورت میں شریک ہوا اور ابوجہل کی اس تدبیر کو بالاتفاق منظور کروایا۔ لیکن اللہ رب العزت کو اب رحمت کے کچھ اور دریچے کھولنا تھے اور کسی اور وادیٔ صبر و شکر سے اپنے حبیبؐ کو گزارنا تھا۔

چنانچہ جبرئیلِ امینؑ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس سازش کی خبر کر دی۔ جب رات کی تاریکی چھا گئی تو کفارِ قریش آپؐ کے دروازہ پر جمع ہو گئے۔ اُدھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو حکم فرمایا کہ اس آزمائش کی رات کو وہ آپؐ کے بستر پر سو جائیں اور آپؐ کی سبز چادر اُوڑھ لیں۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تشریف لے جانے کے بعد بھی گھر میں ٹھیریں اور لوگوں کی امانتیں اُن کو واپس کر کے حضورؐ کے پاس پہنچ جائیں۔ حضرت علیؓ نے تعمیلِ ارشاد فرمائی۔ پس بقول صاحبِ فضیلت شیخ مکتبہ جامعہ فؤاد، قاہرہ۔

"حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی وہ اولین شخصیت تھی جس نے صرف حق تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے اپنی جان کو فروخت کر دیا تھا اور جس نے اپنی جان کی قربانی سے آنحضرتؐ کو اعداء سے محفوظ کر دیا تھا۔"

(محمد رسول اللہ صفحہ ۲۴۱)۔

اہلِ سیر فرماتے ہیں کہ آیتِ کریمہ: وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِیْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ رَءُوْفٌ بِالْعِبَادِ (کچھ لوگ وہ ہیں جنہوں نے اپنے آپ کو اللہ کی خوشنودی کی خاطر فروخت کیا، اور اللہ بندوں

کے ساتھ بہت مہربان ہے) (البقرہ ۲۰۷) اسی ضمن میں نازل ہوئی۔

(مدارج نبوت صفحہ ۹۲)

کفارِ قریش آپؐ کی تاک میں تھے۔ رات گئے آپؐ اُن کے سامنے ہی سے حجرۂ مبارک کے باہر نکلے۔ آپؐ کے دونوں ہاتھوں میں مٹی تھی اور یہ مٹی آپؐ نے ان سرداروں پر پھینک دی اور سورہ یٰسٓ شریف کی چند آیات کی تلاوت فرماتے ہوئے باہر نکل گئے۔ فَاَغْشَیْنٰهُمْ فَهُمْ لَا یُبْصِرُوْنَ۔ (اور اللہ تعالیٰ نے ان کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا اور وہ دیکھ نہ سکے)۔

جب محاصرین کے ذرا ہوش درست ہوئے تو حضورؐ کی تلاش ہوئی اور پلنگ پر سوئے ہوئے علی مرتضیٰؓ کو دیکھ کر یہی سمجھے کہ محمدؐ ابھی سو رہے ہیں۔ صبح حضورؐ کے بستر سے علی مرتضیٰؓ اُٹھے۔ پوچھا تمہارے دوست کہاں ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ یہ تو تم بتاؤ۔ میں کیا جانوں۔ پہرہ تم دے رہے تھے۔ قریش غصّہ و ندامت سے علیؓ کو زدوکوب کرنے لگے۔ بالآخر چھوڑ دیا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم حجرہ سے نکل کر سیدھے صدیق اکبرؓ کے مکان پر گئے اور ہجرت کا حکم سنایا۔ صدیق اکبرؓ نے پوچھا کہ حضور کیا میں بھی ساتھ ہوں گا۔ فرمایا "ہاں۔ تم ہمارے ہمراہ ہو گے۔" یہ سُن کر صدیقؓ کے خوشی سے آنسو جاری ہو گئے۔ اور ایک مشرک کو، جو طویل راہِ مدینہ سے واقف تھا معاوضہ دے کر ساتھ لیا، اور مدینہ کی جانب ہجرت فرمائی اور مکّہ سے تین میل کی مسافت پر غارِ ثور میں مقیم ہوئے۔ یہاں بھی قریش نے تعاقب کیا اور حضرت اسماءؓ سے دریافتِ حال کیا اور اُنؓ سے بھی اُسی بدتمیزی سے پیش آئے۔

غارِ ثور میں حضرت ابوبکر کے صاحبزادے عبداللہ چھپ کر مکّہ کی

تیسرے میں اور ابوبکرؓ کا غلام عامر رات کو چھپا کر بکریاں لاتا اور دودھ فراہم کرتا۔ اسماءؓ، صدیقؓ کی صاحبزادی، کچھ توشہ بھیج دیتیں۔ غار میں داخل ہوتے وقت پہلے حضرت صدیق اکبرؓ تشریف لے گئے اور اپنی چادر پھاڑ کر، جہاں جہاں سوراخ تھے اس سے وہ سوراخ بند کئے لیکن ایک سوراخ بڑا تھا، صدیقِ اکبرؓ نے اپنے پیر کا انگوٹھا اس پر رکھ لیا، اس خیال سے کہ یہ سانپ کا بل نہ ہو۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو آواز دی کہ تشریف لے آئیں۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم غارِ ثور میں داخل ہوئے اور صدیقؓ کا زانو آپؐ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے تکیہ بنا۔ آپؐ استراحت فرما رہے تھے، صدیقِ اکبرؓ کا قلب جذبۂ شکر گزاری سے معمور تھا۔ ساتھ ہی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سلامتی کے لئے خوف بھی بہ تقاضائے بشریت لاحق تھا۔ آخر صدیقؓ کا خدشہ صحیح ثابت ہوا۔ وہ بِل ایک سانپ ہی کا تھا جس نے صدیقؓ کے پیر میں کاٹ لیا۔ آپ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھ کھلی تو حضورؐ کا لعابِ دہن صحت و تشفی کا موجب ہوا۔

عرب کے لوگ پیر کے نشان سے راہی کا پتہ چلا لیتے تھے۔ قریش ایک قائف کو ساتھ لے کر تلاش کو نکلے اور غار تک پہنچ گئے لیکن ان کو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ غار کے منہ پر مکڑی کا جالا تنا ہوا ہے اور پاس ہی جنگلی کبوتروں نے انڈے دیئے ہوئے ہیں۔ اس لئے اس جانب خیال بھی نہ ہوا کہ کوئی اندر جا سکتا ہے۔ لیکن لوگوں کی باتوں کی آواز غار میں صدیقؓ کے کان سُن رہے تھے۔ آخر بشر تھے۔ گھبرائے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا...... (صدیقؓ) غمگین نہ ہو۔ اللہ ہمارے ساتھ ہے۔"

(سورۃ التوبہ)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس غارِ ثور میں تین دن رہے۔ چوتھی شب دو اونٹنیاں آ گئیں۔ ایک پر حضورؐ اور ابوبکرؓ، اور دوسری پر راہ بتانے والا اور،

صدیقؓ کا غلام عامر بن فہیرہ، مدینہ کی جانب اور[1] سمندر کے کنارے کے راستہ غارِ ثور سے، دو شنبہ کے دن روانہ ہوئے۔[2] اس طرح جب کچھ فاصلہ طے کر لیا تو سراقہ بن مالک، جو سو اونٹنیوں کے لالچ میں نہایت تیزی اور مسلح، آپ کا پیچھا کر رہا تھا، قریب آگیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نظر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ اتنے میں اس کا گھوڑا گھٹنوں کے بل گرا اور وہ نیچے آگیا۔ اس نے پھر گھوڑے کو اٹھایا حضورؐ نے تلاوت فرماتے اپنا سفر جاری رکھا یہاں تک کہ وہ پھر قریب ہوا اور حضرت صدیقؓ کو پھر حضورؐ کے متعلق اندیشہ ہوا۔ آپؐ نے حسبِ دستور تسلی دی۔ اس بار آپ کی زبانِ مبارک سے نکلا "الٰہی ہمیں اس کے شر سے بچا" ابھی یہ الفاظ زبانِ مبارک سے نکلے ہی تھے کہ اس کا گھوڑا پھر زمین میں دھنس گیا۔ اس نے عاجزانہ انداز سے امان مانگی۔ آپؐ نے صرف امان ہی نہیں دی بلکہ ایک عریضۂ امان بھی عامر سے لکھوا کر عطا فرما دیا۔

رات میں ایک بڑھیا (ام معبد) کے یہاں قیام فرمایا۔ اس کے پاس کھانے کو کچھ نہ تھا۔ البتہ ایک جانب ایک کمزور بکری کھڑی دیکھی۔ بڑھیا کی اجازت سے بسم اللہ کہہ کر اس کے تھنوں پر ہاتھ مارا اور جتنے برتن تھے وہ سب دودھ سے بھر دیئے۔ آپؐ تشریف لے گئے۔ جب اس بڑھیا کا شوہر واپس آیا اور یہ معجزہ دیکھا تو آپؐ کے متعلق سوال کیا۔ بڑھیا نے آپؐ کا حلیۂ مبارک بتایا کہ ان "صاحبِ قریش" سے ملے کہ مکہ کے باہر آپؐ اسی نام سے جانے جاتے تھے۔

اسی سفر میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ملاقات مسلمانوں کے ایک تاجر قافلہ سے ہوئی جن میں حضرت زبیرؓ اور طلحہؓ موجود تھے۔ یہ لوگ آپؐ کو

---

[1] یعنی عبداللہ بن اریقط دیلمی، جو مشرک تھا۔ [2] حضورؐ نے مکہ سے یکم ربیع الاوّل پنجشنبہ کے دن ہجرت فرمائی تھی۔ (محمد رسول اللہ صفحہ ۲۴۵)

دیکھ کر قدمبوس ہوئے اور دو جوڑے کپڑے، ایک حضورؐ کے لئے اور ایک صدیقِ اکبرؓ کو پیش کئے۔ یہ بھی قدرت کا نظام تھا کہ شہنشاہِ کونین صاف ستھرے لباس میں مدینہ میں داخل ہوں۔ مدینہ کے قریب اثناءِ راہ میں بریدہ اسلمی ملا جو اپنی قوم کا سردار تھا اور سَو اونٹ کے لالچ میں حضورؐ کی تلاش میں نکلا تھا کہ آپؐ کو (نعوذ باللہ) گرفتار کر کے مکّہ پہنچا دے اور انعام کے ساتھ اہلِ مکّہ کا محسن بنے۔ لیکن اس کی نظر جب حضورؐ کے چہرۂ اقدس پر پڑی تو اس کے قلب میں ایک ہیبت سما گئی اور ایسا مبہوت ہوا کہ قدم آگے نہ بڑھا سکا۔ بریدہ نے کلمہ پڑھا اور اس کے ساتھ ستّر آدمی اور مسلمان ہوئے۔ غرض صاف ستھرا لباس آپؐ نے زیبِ تن فرمایا، بریدہ اسلمی بھی خادم کی حیثیت سے آپؐ کے ساتھ ہوا۔

اُدھر یثرب کے مرد عورت، بچّے بوڑھے، سب ہی دید کے مشتاق روز ہی انتظار میں پہاڑی درّوں اور کوہستانی راستوں میں کھڑے، چشم براہ رہتے، اور ایک وقت تک جو اِن گرم ملکوں میں انتظار کا عام تھا انتظار کرتے۔ ایک ایسے ہی عالمِ انتظار میں جب دھوپ تیز ہوتی گئی تو اس قافلۂ نورانی کے مشتاقِ دید اپنے گھروں کو واپس ہوئے۔ مشیتِ الٰہی نے چاہا کہ اس قافلہ کے جلال و جمال پر نظر کسی یہودی ہی کی پڑے کہ اُس کے اوسان خطا ہوں۔ یہی ہوا۔ ایک یہودی، جو کسی اپنی غرض سے اپنے مکان کی چھت پر چڑھا تھا، اُس کی نظر قافلہ پر پڑی اور وہ چلّا اُٹھا:

"لو۔ اے اہلِ یثرب! تمہارا مقصود آ گیا۔" اس آواز کا سُننا تھا کہ ہر طرف سے جوق در جوق، جاں نثارانِ نورِ حق، پروانہ وار نثار ہونے کے لئے جمع ہو گئے اور حضور پُر نور صلّی اللہ علیہ وسلّم بارہ ربیع الاوّل ۱۳ نبوی دوشنبہ کے دن، قریب دوپہر، حدودِ یثرب میں داخل ہوئے۔ مشتاقِ دید کے نعرے

"مرحبا۔ اللہ اکبر" ہر طرف سے بلند ہوئے اور جوش و مسرت سے لڑکیوں نے گانا شروع کیا

طلع البدر علینا من ثنیات الوداع
وجب الشکر علینا ما دعیٰ للہ داع
ایّھا المبعوث فینا جئت بالامر المطاع

(تاریخ اسلام ۱۳۵)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ تشریف لے جانے سے قبل مقام قبا میں، جو مدینہ منورہ سے دو میل کے فاصلہ پہ ہے، قبیلہ بنی عمر بن عوف کے سردار کلثوم رضؓ بن الہدام کے پاس قیام فرمایا۔ اور یہاں پہنچ کر پہلا کام جو نبی برحق صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا وہ "مسجدِ قبا" کی بنیاد ڈالنا تھا۔

مسجدِ قبا کی بنیاد ڈالنا صرف ایک پتھر نصب کرنا نہ تھا بلکہ آپؐ نے پتھر قبلہ کی جانب قائم فرمایا پھر صحابہؓ کے ساتھ اس کی چہار دیواروں کے حدود قائم کئے اور پتھر جمائے۔ واضح رہے کہ اس وقت تک قبلہ بیت المقدس ہی تھا۔ یہی وہ پہلی مسجد ہے جس کے متعلق قرآن میں فرمایا گیا کہ یہ مسجد پہلے ہی دن سے تقویٰ و پرہیزگاری پر قائم کی گئی۔

(سیرت النبی جلد اوّل صفحہ ۲۶۶)

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے علاوہ خلفائے ثلاثہؓ اس کی تعمیر میں شامل رہے۔ مزدوروں کے ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم خود بھی کام کرتے تھے۔ بھاری بھاری پتھر اٹھاتے، اور عقیدت مندوں کے اصرار کے باوجود دوسرا پتھر اٹھا لیتے۔

حضرت علی مرتضیٰ رضؓ بھی بعد میں شریک ہوئے۔ مکّہ میں اپنے فرائض کی انجام دہی کے بعد حضرت علیؓ مدینہ روانہ ہوئے۔ وہؓ صرف راتوں کو

چلتے اور دن کو چھپتے رہتے۔ جب چار سو میل کا سفر کر کے مدینہ منوّرہ حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کے قدموں میں پہنچے تو آپؓ کے پیر ورم آلود، سفر کی تکان سے چور، چہرۂ مبارک غبار آلود، حضورؐ نے آپؓ کو دیکھا تو آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ زخموں پر لعابِ دہن لگایا اور آپؓ نے بھی وہی سکون پایا جو حضرت صدیق اکبرؓ کو غارِ ثور میں میسّر ہوا تھا۔

واضح رہے کہ مسجدِ قبا وہ پہلی مسجد ہے جس میں صحابہ کرامؓ نے حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کے ساتھ باجماعت نماز ادا فرمائی۔ یہاں کے اس مختصر قیام کے بعد حضورؐ جمعہ کے دن مدینہ منوّرہ کے لئے روانہ ہوئے۔ اور راستہ میں بنو سالم بن عوف کے مقام پر جمعہ کا وقت ہو گیا، تو آپؐ نے وہیں، وادی کی ایک مسجد میں، سَو ۱۰۰ ہمراہی مسلمانوں کے ساتھ نمازِ جمعہ ادا فرمائی۔ یہاں بھی بعد میں مسلمانوں نے باقاعدہ مسجد تعمیر کر لی۔ (محمد رسول اللہ اور تاریخ اسلام)

حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کی ولادت شریف دوشنبہ کے دن ہوئی۔ دوشنبہ ہی کے دن آپؐ نے نبوّت کا اعلان فرمایا۔ دوشنبہ ہی کے دن سنگِ اسود اُٹھا کر کعبہ میں نصب فرمایا۔ دوشنبہ کے دن وصال فرمایا۔ حضرت عمرؓ کے عہدِ خلافت میں آپؐ کے مکّہ سے مدینہ کو ہجرت فرمانے کے دن سے اسلامی تاریخ و سنہ کی ابتدا قرار پائی۔ لیکن سال کی ابتداء حضرت عمرؓ نے ہجرت کے ماہ ربیع الاوّل سے دو ماہ قبل محرّم سے شروع فرمائی۔

اس عاجز کے نزدیک ماہِ محرّم سے سال شروع کرنے کی شاید یہ وجہ ہو کہ حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کو اپنے قبیلہ بنو ہاشم کے ساتھ اسی ماہِ محرّم کی پہلی تاریخ کو اس وادیٔ صبر "شعبِ ابی طالب" میں داخل کیا گیا تھا۔ اور اس لئے بھی تاکہ مسلمان اس تاریخ کو بھی ہمیشہ ذہن نشین رکھیں۔ اور ——

آپؐ کے خاندان کی عظمت ان کے دلوں میں قائم رہے۔

۱۵

بعد نبوّت
نورِ مبینؐ کی مکّی زندگی اور عرفانِ حقائق

آیئے

ذرا غور سے اس مکّی زندگی پر ایک اجمالی نظر ڈالیں جس میں ایمان کی بنیادیں ڈالی گئیں، اہلِ ایمان کے تیقّن کے لا متزلزل ستون قائم کیے گئے اور حسنِ عمل کے بلند ترین معیار کا تعیّن ہوا۔

۱۔ ہر چند کہ یہ مکّی دَور "وَلِرَبِّكَ فَاصْبِرْ" کا دَور ہے لیکن یہ وہ صبر ہے جو شکر کا انداز لئے ہوئے ہے۔ اور انداز ہی نہیں بلکہ اس کے بیّن ثبوت فراہم کر رہا ہے۔

جو لوگ اس دَور میں مشرّف بہ اسلام ہوئے انہیں سوائے تکلیفوں اور اذیتوں کے اور کچھ نہ ملا۔ گرم ریت پر لٹائے گئے، آگ کی دھونیاں ناک میں دی گئیں، گرم پتھر ان کے سینوں پر رکھے گئے، جلتے ہوئے انگاروں پر انہیں لٹایا گیا، سڑکوں پر انہیں کھینچا گیا، لیکن وہ عزم، حوصلہ و ایمان کے پہاڑ اپنی جگہ پہ قائم رہے اور ان کی زبانوں پر "احد، احد" کے سوا کچھ نہ تھا۔ گویا یہ وہ بزرگ ہستیاں تھیں جنہوں نے کسی کی نظرِ التفات کے صدقہ میں، پہلے ہی مرحلہ میں قرآن ختم کر لیا۔ اور کسی "قُل" کے کہنے والے کے طفیل خود سورۂ اخلاص کی تنویر بن گئے۔

سبحان اللہ۔

واضح رہے کہ

۲۔ یہ ان ہستیوں اور روشن چراغوں کا دَور ہے جنہوں نے خود آگ میں جل کر ظلمتوں کو چھانٹا۔ اور یہ اُن پاک مومن و مومنات کا دَور تھا جن کے قلوب میں، باوجود تمام دشنام طرازیوں اور اذیتوں کے، حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کے متعلق کوئی وسوسہ تک نہ آیا۔

۳۔ اس دَور نے عبادت و عبدیت کے معیار قائم کئے اور اخلاق اور اخلاص کے جواہر پاروں سے عالمِ انسانیت کو بہرہ مند کیا۔

۴۔ اللہ تعالیٰ کا کلام، حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کی زبان سے نکلتا لیکن اُن کی رگ و پے میں سرایت کر جاتا۔ "یہ قرآن میں سے گذرتے، قرآن اِن میں سے گذرتا"۔ یہ شاہدِ رسولؐ بھی تھے اور شاہدِ انوارِ قرآن بھی ۔۔۔ اور ..... اور ..... خالصتہً اللہ کے بندے، جاں نثارِ نبوّت، پروانۂ شمعِ رسالت اور پرستارِ توحید۔

۵۔ انہوں نے کلمہ پڑھا ہی نہیں، خود کلمہ بن گئے۔ ان کا باطن لا الٰہ الاّ اللہ کی جلوہ گاہ بنا اور ان کا ظاہر محمد رسول اللہ کا آئینہ دار۔ اور ان کے ظاہر و باطن کی یکائی میں کبھی فرق نہ آیا۔ انہوں نے کلمہ کے ٹکڑے نہ ہونے دیئے۔ توحیدِ مطلقہ پر اُن کا ایمان رہا۔

۶۔ یہ وہ بزرگ ہستیاں ہیں جن کے تصوّر ہی سے "سبحان اللہ" زبان پر جاری ہو جاتا ہے۔ حمد کے مرقع، نظر میں گھوم جاتے ہیں اور "اللہ اکبر" کی مسجدوں سے اٹھتی ہوئی صدائیں فضا میں روحِ بلالیؓ کی گلاب پاشی کر جاتی ہیں۔

یاد رہے

صحابہ کرامؓ کا یہ ضبط و تحمّل، صبر و استقلال انعکاسِ ذاتِ محمدی صلّی اللہ علیہ وسلّم کے باعث تھا۔

اور یہ سبب کیا تھا؟ فیضانِ نبوّت..... وہی انوارِ شمع عرفان جس کی
یہ معزز ہستیاں رضی اللہ عنہم، مرد و زن، پروانے بنے ہوئے تھے
ﷺ وآلہ واصحابہ وسلّم
اور خود

اب یہ نورِ مبین پیکرِ بشریت میں جلوہ نما تھا، اس کی راتیں "المزمّل" کی تفسیر اور اس کے دن "المدثّر" کے مرقع تھے۔ یعنی سورۂ مزمّل آپ کے آداب ذکر و فکر، آدابِ خرقہ پوشی کی ترجمان تھی تو سورۂ المدثّر آپ کی اندازِ تبلیغ و خیر اندیشی کی آئینہ دار۔ گویا یہ ذاتِ مقدسہ ہمہ وقت و ہمہ تن دینِ متین کے فروغ کے لئے کوشاں تھی جس کے عزم و استقلال کو نہ راتوں کی کافرانہ سازشیں اور نہ دن کی اذیتیں ذرا جنبش دے سکیں۔ اور آپ ہر حال میں وَلِرَبِّكَ فَاصْبِرْ کا ستونِ محکم بنے رہتے۔

۷۔ ہر چند کہ آپ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے مکّہ کی کافرانہ فضاؤں میں آنکھیں کھولیں لیکن ہمیشہ توحیدِ مطلقہ کی پُرنور فضاؤں ہی میں سانس لیا۔ اور اسی کو مقصدِ حیات، منزلِ اوّل، قرار دے کر رنج و غم، کرب و بلا، تکلیف و اذیّت کے مراحل سے گذرتے رہے۔

۸۔ یہی وہ خاتم النبیّینؐ، رسول الثقلینؐ ہیں جنہوں نے تیرہ (۱۳) سال کے مختصر زمانہ میں "مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ" کی انس و جن دونوں میں ایک ایسی جماعت پیدا کر دی جو رہتی دنیا تک اپنی مثال آپ ہے اور جنہوں نے آخرت کا پروانۂ نجات دنیا ہی میں حاصل کر لیا۔

۹۔ یہی وہ نبی برحقؐ ہیں جو درد امّت لے کر آئے، عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ کی تفسیر بنے۔

یاد رہے، نور کی تقسیم نہیں ہوتی۔ نور متعلق بہ نور ہے نور کا تعلق ہر حال

میں نور سے باقی رہتا ہے۔ یہ تعلق نورِ مبین صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر اُمّتی سے ہے۔
پھر سوچو کہ جب ان سابقون الاوّلین پر مصیبت کے پہاڑ ٹوٹتے ہوں گے، تو قلبِ رسولِ کریمؐ پر کیا گذرتی ہوگی۔ ہر صحابیؓ کے لئے اپنا غم تھا یا غمِ رسولؐ، لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قلبِ اطہر پر سب کے غم۔ ہر مومن و مومنہ کے درد و کرب کے برداشت کی قوت من جانب اللہ ہی تھی، ورنہ اُسے کون اُٹھا سکتا تھا۔

۱۰۔ یہی وہ نبی مکرّمؐ ہیں جنہوں نے اپنی ذاتِ مبارکہ میں رسالت اور عبدیت کے انوار بیک وقت سمو لئے۔ مقامِ عبدیت میں اپنی عبدیت کا اظہار اپنے ربّ کے حضور عجز، انکسار، گریہ زاری کے ساتھ صورتِ سوال بن کر کیا۔ اور اس کی مخلوق اور اپنی امت کے سامنے، اپنی رسالت، اپنے پیغام کی صداقت کا ہر حال میں ثبوت دیا۔ قولاً، فعلاً، عملاً اور نورؐ جس پر حضورؐ کے ارشادات اور معجزات آج بھی شاہد ہیں۔ اور اس دور میں بھی سب کا حق اسی مکہ میں ادا کیا گیا جسے ظلم و بے کسی و بے بسی کا دور کہا جاتا ہے۔

۱۱۔ اس تیرہ۱۳ سال کے دور میں جو لفظ احد کے عدد سے ہم عدد ہے، اللہ جلّ شانہٗ کی شانِ یکتائی پر ایمان لانے والوں کے وہ نمونے پیش کئے گئے کہ یقیناً ملائکہ کو پہلی بار اپنے ربّ کے فرمان پر، کہ حضرت آدمؑ کو سجدہ کرو، ایک روحانی مسرّت و فخر کا احساس ہوا ہوگا۔

۱۲۔ اور یہی وہ دور ہے جس میں محدود کی سرحدوں کو توڑ کر لا محدود سے منسلک کر دیا گیا۔ آخرت مومن کی جولانگاہ بن گئی۔

۱۳۔ علم تو آدم علیہ السّلام کو بھی عطا ہوا تھا۔ وہ علمِ اسماء تھا۔ لیکن علمِ کامل سے انسانِ کامل صلی اللہ علیہ وسلم کو سرفرازی بخشی گئی۔
یہی وہ مکّی دور ہے جس میں علم کو صرف محسوسات اور دنیاوی امور میں معاون

بننے کے حدود سے نکال کر مقصدِ حیات، آخرت و رضائے الٰہی سے اس درجہ منسلک کر دیا گیا، کہ سوائے انبیاء اولوالعزمؑ کی زندگی کے اور کہیں نظر نہیں آتا۔

اور خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے علم کی وسعتوں پر تو واقعاتِ معراج ہی شاہد ہیں جو اسی دَور سے متعلق ہے۔ جہاں اس حقیقت کو دل نشین و روح نشین فرما دیا گیا کہ علم ہی اوّلین صفتِ الٰہی ہے۔ علم نور ہی ہے۔ فکر کی بالیدگی، روح کی شگفتگی، اسی سے ہے۔ اور اس کا مخزن اور سرچشمہ حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم، منبعِ علم و حکم ہی ہیں جو جس قدر آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے قریب ہوگا اسی قدر اس علم و عرفان کے لئے اس کا سینہ خود بخود کشادہ ہوتا جائے گا۔

اب یہی محبتِ رسولؐ، علم و عرفان کی جُوئے نور بن جائے گی۔ اجمال کے ساتھ، لطف و کرم کے ساتھ، یقینِ محکم کے ساتھ، عملِ پیہم کے ساتھ۔

واضح رہے کہ یہ دَورِ علمِ اجمالی کا تھا۔ ابھی اس نورِ مُبینؐ کے وہ اہم پہلو جلوہ گر ہونے کو باقی تھے جن کے باعث معراج سے واپسی ہوئی تاکہ کارِ نبوّت کی تکمیل ہو، توحیدِ مطلقہ کی عملی صورتیں، انفرادی اور اجتماعی زندگی میں آشکارا ہوں اور تا قیامِ قیامت مسلمانوں کی زندگی سے متعلق ہر پہلو کے لئے راہوں کا تعین ہو جائے، جس کا ذکر انشاء اللہ اگلے باب میں آئے گا۔

اور

ابھی اسی سرزمینِ مکّہ سے "اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ" کا مژدۂ جانفزا اللہ ربّ العزت کے دربار سے ہونا باقی تھا۔

یہی وہ دَور ہے جس میں
ہجرت کے انوار سے سرفرازی بخشی گئی

یعنی

عوام کے لئے ہجرت حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کی زبانِ مبارک میں یوں ہے کہ بُرائی سے بھلائی کی طرف گام زن رہیں۔

اور خواص کے لئے ہجرت یہ قرار پائی کہ مہاجر الی اللہ بنیں اور نقشِ پائے صدیق رضؓ کو نشانِ راہِ حق بنا کر ظاہراً اور باطناً حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم سے والبستۂ نور ہونے کا سبق سیکھیں۔

اولیاءِ کرامؒ کے لئے ہجرت یہ ہے کہ امانتوں کی ادائیگی پیشِ نظر رہے، اور اُنؒ کا باطن رسولِ مقبول صلّی اللہ علیہ وسلّم کی محبّت سے منوّر رہے، اُنؒ کے قدم حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی طرح بستر رسول مقبول صلّی اللہ علیہ وسلّم سے قدمِ رسول مقبولؐ کی مسافتیں طے کرتے رہیں، تاکہ اُنؒ کے زخموں کو سرورِ کائنات صلّی اللہ علیہ وسلّم کا لعابِ دہن اسی دنیا میں نصیب ہو۔ اور آخرت میں بھی قُربِ رسول کریم صلّی اللہ علیہ وسلّم اُنؒ کا نصیبہ ہو۔

مقصودِ کائنات صلّی اللہ علیہ وسلّم ہی اُنؒ کی منزلِ مراد رہے۔ اپنے آقاؐ کا ہو جانا

اور

حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کی قدم بوسی ہی کو اپنی معراج تصوّر کرنا
تاکہ کسی پروانۂ شمعِ نبوّت کی طرح کہہ سکیں

للہ الحمد سرفراز شدم — نورِ حق بہ نورِ محمدؐ دیدم

و

باب پنجم (مدنی زندگی)

سُبحانَ اللہ　　سُبحانَ اللہ
اَلحمدُ للہ　　اَلحمدللہ

لو بھائی گلستانِ مدینہ کی مہک آرہی ہے

میں اب سجدہ کروں، دل کو سنبھالوں، یا بڑھوں آگے
نظر آتا ہے کوسوں سے کسی کا آستاں مجھ کو

آیئے نذرانۂ عقیدت پیش کریں

اَللّٰھُمَّ صَلِّ علیٰ سیّدِنا و مولانا محمّدٍ النّبیِّ الاُمّیِّ مَعْدَنِ الْجُودِ وَالْکَرَمِ مَنْبَعِ الْعِلْمِ وَالْحِلْمِ وَ عَلیٰ اٰلِہٖ وَ بَارِکْ وَسَلِّمْ

و

صلی اللہ علی النبیّ الامیّ واٰلہٖ　　صلی اللہ علیہ وسلّم صلوٰۃً وَسَلَاماً عَلَیْکَ یَارَسُوْلَ اللہ

مدینہ منوّرہ میں داخلہ

نمازِ جمعہ سے فارغ ہو کر نورِ مُبین صلّی اللہ علیہ وسلّم یثرب میں جنوب کی طرف سے داخل ہوئے۔ اور پہلا فیضانِ نبوّت یہ تھا کہ اب یثرب مدینۃ النبی ہو گیا اور "مدینہ" نام پایا۔

حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کی تشریف آوری کے وقت وہی جوش و خروش، وہی تسبیح و تقدیس کے کلمات مردوں عورتوں اور بچّوں کی زبانوں پر تھے جو بقول قاضی محمد سلمان صاحب منصور پوری، "نورِ خدا کا جلوہ دیکھنے کے لئے سراپا چشم بن گئے تھے۔ زبانوں پر مرحبا، صلِّ علیٰ، اللہ اکبر کے ساتھ ساتھ معصوم بچیّوں کے دلنواز ترانے عجب پُر کیف سماں پیش کر رہے تھے۔

"اشرق البدر علینا	ان پہاڑوں سے جو ہیں سوئے جنوب
من ثنیات الوداع	چودھویں کا چاند ہے ہم پر چڑھا
وجب الشکر علینا	کیسا عمدہ دین اور تعلیم ہے
مادعا للہ داع	شکر واجب ہے ہمیں اللہ کا
ایہا المبعوث فینا	ہے اطاعت فرض تیرے حکم کی
جئت بالامر المطاع	بھیجنے والا ہے تیرا کبریا"

(رحمۃ للعالمین صفحہ ۹۵)

یہ وہی لڑکیاں ہیں جو ان اصحاب کی اولاد تھیں جنہوں نے حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کے ہاتھ پر مکّہ معظمہ میں بیعت کی تھی یا وہ جو مصعب بن عمیر یا ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہما کی ہدایت اور تعلیم سے مدینہ میں مسلمان ہوئے تھے۔

حضور سرورِ کائنات صلّی اللہ علیہ وسلّم جب مدینہ میں داخل ہوئے تو ہر انصاری کی خواہش ہوئی کہ آپؐ اس کے گھر میں رونق افروز ہوں۔ ہر

شخص اپنی جان وماں سے خدمت کو تیار تھا۔ آپؐ نے فرمایا کہ اس اونٹنی کا راستہ چھوڑ دو۔ یہ خدا کی طرف سے مامور ہے۔ یہ اونٹنی پہلی بار جہاں بیٹھی وہ قبیلہ بنی نجار کے دو کمسن بچوں کی زمین تھی لیکن حضورؐ نیچے نہ اُترے۔ وہ پھر اُٹھی اور تھوڑی دور چل کر پھر گھوم کر پہلی جگہ کے قریب بیٹھ گئی اور گردن جھکا دی۔ تب حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس پر سے اُتر آئے اور حضرت ابوایوب انصاری جن کا گھر اس جگہ سے قریب تھا، اونٹنی کا کجاوا اور دوسرا سامان اپنے گھر لے گئے اور آپؐ انہیں کے یہاں فروکش ہوئے۔ پھر اس دو بچوں کی زمین کو خرید کر وہاں "مسجدِ نبوی" کی سادہ تعمیر کے کام کا آغاز فرمایا۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بنفسِ نفیس اصحاب کے ساتھ مسجد کی تعمیر میں حصہ لیا۔ اور اسی کے ساتھ اپنے حجرے تعمیر فرمائے اور پھر ان میں منتقل ہوئے۔

آغازِ کار

آغازِ کار یہاں مسجد ہی سے ہوا۔ گویا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کے قلوب میں یہ بات راسخ فرمائی کہ جہاں جاؤ وہاں اپنے گھر کی تعمیر سے پہلے مسجد کی تعمیر ضروری سمجھو۔ جو تمہاری عبادات اور اجتماعی زندگی کا مرکز ہو اور اس کی بنیاد خالص توحید و تقویٰ پر ہو۔ یہی وجہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قبا کے مختصر قیام میں بھی سب سے پہلے مسجدِ قبا کی بنیاد رکھی۔ اور بنیاد ہی نہیں بلکہ اس کی تعمیر میں اپنے صحابہؓ کے ساتھ کام کیا۔ یہی وہ مسجد ہے جس کی تعمیر اللہ رب العزت کی بارگاہ میں قبولیت کی سند سے سرفراز ہوئی۔ اور پھر مدینہ منورہ میں داخلہ کے ساتھ ہی آغازِ کار مسجد ہی سے فرمایا۔

مولانا عبدالحق محدث دہلویؒ نے خوب فرمایا کہ:۔

آیتِ کریمہ سورہ توبہ (۱۰۸)۔

لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَی التَّقْوٰی مِنْ اَوَّلِ یَوْمٍ اَحَقُّ اَنْ تَقُوْمَ فِیْهِ ؕ فِیْهِ رِجَالٌ یُّحِبُّوْنَ اَنْ یَّتَطَهَّرُوْا ؕ وَاللّٰهُ یُحِبُّ الْمُطَّهِّرِیْنَ ﴿۱۰۸﴾

"وہ مسجد جس کی بنیاد اوّل دن سے پرہیز گاری پر رکھی گئی وہ اس لائق ہے کہ آپؐ اس میں کھڑے ہوں (وہاں تشریف لے جائیں یا نماز پڑھیں) اس (مسجد) میں ایسے لوگ (آتے) ہیں جو پاک رہنے کو پسند کرتے ہیں۔ اور اللہ پاک رہنے والوں کو پسند کرتا ہے۔"

اس آیت کو اکثر مفسرین نے مسجدِ قبا سے متعلق کیا ہے لیکن اس کا اطلاق دونوں مساجد پر ہوتا ہے، مسجدِ قبا پر بھی اور مسجدِ نبوی پر بھی۔ یہ آیتِ کریمہ دونوں پر صادق ہے کہ دونوں مسجدوں کی تاسیس و تعمیر اوّل دن سے تقویٰ پر ہے۔"

(مدارج النبوت جلد دوم صفحہ ۱۱۱)

آیئے

اس آغازِ کار سے متعلق چند اہم امور پر ایک اجمالی نظر ڈالیں جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مدنی زندگی اور آپؐ کے طریقہ کار کی تفہیم میں معاون ہے۔

ایک حقیقت کا اعلان

پہلی اہم بات یہ ہے کہ

حضور صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ میں داخل ہوئے تو جمعہ کی نماز اپنے سو (۱۰۰) ہمراہیوں کے ساتھ مدینہ منورہ کے محلہ بنو سالم بن عوف میں پڑھی اور جمعہ کا خطبہ ارشاد فرمایا۔ یہ خطبہ ایک خصوصی اہمیت کا حامل تھا۔ گویا اہلِ مدینہ اور خود اپنے ساتھیوں پر اس حقیقت کا ایک برملا اعلان تھا کہ نبی کے قیام و ہجرت کے مقصد میں فرق نہیں ہوتا۔ اس کا مقصدِ حیات اللہ کے پیغام کو بلا خوف و تردّد لوگوں کے سامنے پیش کرنا ہوتا ہے۔ اس کی غرض، لوگوں کو ہدایت اور

مخلوقِ خدا کی خیر خواہی ہوتی ہے۔ وہ کسی سے کوئی اجر نہیں چاہتا۔ اس کا اجر اللہ کی رضا ہوتا ہے۔

اس اعلان کے ساتھ ہی یہ امر بھی واضح کرنا تھا کہ مدینہ کی جانب ہجرت، اسی وحیٔ الٰہی اور اللہ کے پیغام کو بدلے ہوئے حالات کے تحت اور زیادہ قوت اور وضاحت سے پیش کرنا تھا جس کا آغاز مکۂ معظمہ میں ہوا، جس کا لبِ لباب توحید، رسالت، آخرت اور تقویٰ ہی ہے۔ وہ تقویٰ جو نہ صرف مساجد کی اساس اور بنیاد ہوتا ہے بلکہ جس پر مومن کی سیرت کی تشکیل ہوتی ہے، جس کی رُوح اتباع و محبتِ رسول ہے۔ اور یہ غلط فہمی ہر گز نہ ہو کہ مسلمان یہاں تلاشِ سکون میں آئے ہیں۔ اسلامی نظامِ زندگی پر مکمل عمل انفرادی طور پر ممکن نہیں۔ مدینہ آنے کا مقصد اسلامی معاشرہ اور مملکت کا قیام تھا اور یہ راستہ بے حد دشوار اور کٹھن تھا۔

پہلے خطبۂ جمعہ میں آپؐ نے اللہ کی وحدانیت اور خود محمد صلّی اللہ علیہ وسلّم کے اللہ کے رسول اور بندے ہونے پر خاص زور دیا۔ آخرت کا بیان واضح انداز سے فرمایا اور ایک بھائی کو دوسرے بھائی کے لئے نیکی اور خیر خواہی کی تلقین فرمائی۔ عملِ صالح کی اہمیت کی طرف خصوصی توجہ مبذول فرمائی۔ اور ہر چند کہ یہ پہلا خطبہ تھا جو ایک آزاد فضا میں دیا جا رہا تھا لیکن حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم نے اس خطبہ میں نہ مکہ کے بُت پرستوں اور مشرکوں کے مظالم اور اذیتوں کا ذکر فرمایا اور نہ ان کو کسی بُرے لفظ سے یاد کیا۔ یہ بڑے حوصلہ کی بات تھی اور مقامِ رسالت کے تحمل، صبر اور استقلال پر ایک فطری دلیل ہے۔ جس کو قرآنِ حکیم نے یوں واضح کیا ہے:۔

"وَإِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيمٍ" (القلم:۴) (اور بے شک آپؐ عظیم اخلاق پر فائز ہیں)

اس میں یہ نکتہ بھی پوشیدہ ہے کہ حضرت مخبرِ صادق صلّی اللہ علیہ وسلّم پر یہ حقیقت

آشکار تھی کہ ان مشرکوں کی بڑی غالب اکثریت دامانِ اسلام میں پناہ لینے والی تھی۔
گویا یہ خطبہ مدینہ منوّرہ میں داخل ہونے سے قبل ہی حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کے مقصدِ ہجرت کا وہ دیباچہ تھا جس پر مدینہ میں کتاب التوحید کی تکمیل قلوب پر ہونا تھی۔

(۲) مکّہ میں حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کو بت پرستوں اور مشرکوں کا سامنا تھا لیکن مدینہ منوّرہ میں مسلمانوں کی ایک اچھی خاصی تعداد کے باوجود، بت پرستوں اور یہود و نصاریٰ کی جماعتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ یہی نہیں بلکہ ان کے علاوہ ایک نہایت مطعون طبقہ مدینہ میں پیدا ہوا، وہ منافقین کا تھا، جو دل سے مسلمان نہ تھے لیکن منہ سے خود کو مسلمان کہتے اور ہر طرح کی سازشوں میں شریک رہتے تھے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم کے ابتدا ہی میں جب انسان کی تین قسموں کا ذکر ہوا تو سورہ البقرہ کے پہلے رکوع میں پانچ آیات مسلمانوں کے متعلق دو[۲] کفار کے متعلق بیان ہوئیں اور پھر دوسرے رکوع میں پوری کی پوری تیرہ[۱۳] آیات منافقین کے حال، ان کی مزاجی کیفیت، ان کی حیلہ سازی، فتنہ پردازی اور ان کے انجام کار کے متعلق نازل ہوئیں تاکہ مسلمان ہمیشہ اس طبقہ سے باخبر رہیں جس سے اسلام کو ہمیشہ خطرہ لاحق ہوتا رہے گا۔ اور اس کے بعد پوری تفصیل سے یہود و نصاریٰ کا ذکر آتا ہے۔

ہر چند حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کو مدینہ منورہ میں قریشِ مکّہ کی اذیتوں سے کچھ نجات ملی، لیکن یہود و نصاریٰ اور منافقین کی سازشوں اور ان کے متواتر حملوں سے دوچار ہونا پڑا۔ اور یہ اس بابرکت ذات نبوی صلّی اللہ علیہ وسلّم کا فیضان تھا کہ اُن کے یہی فتنے اور سازشیں اسلام کی گوناگوں رحمتوں کا موجب بنیں۔

(۳) مکّہ معظّمہ میں جن چار عناصر، ضبط، تحمل، "لربک فاصبر"، اور

استقلال پر صحابہ کرامؓ کی سیرت کی تشکیل کی بنیاد رکھی تھی، اس کا نتیجہ مکّہ میں یوں ظاہر ہوا کہ ۱۳ سال کے مختصر قیام میں توحید کی روح، احدیتِ باری تعالےٰ، مسلمانوں کے دلوں میں اس طرح گھر کر گئی کہ دنیا کی کوئی اذیت، کوئی تکلیف ان کے عزم کو متزلزل نہ کر سکی۔

گویا مکّی زندگی نورِ مبین صلّی اللہ علیہ وسلّم کی ذاتِ مبارکہ کا وہ پرتو تھا، جو زبانوں پر احد احد بن کر آشکارا ہوا تھا۔

لیکن اب مدینہ منورہ کی آزاد فضاؤں میں وقت آ گیا تھا کہ دینِ حنیف کی انہیں بنیادوں پر، ایک ایسی لازوال عمارت کی تعمیر ہو جس پر اسلام کا پرچم تاابدالآباد لہراتا رہے، اور مسلمانوں کی زندگی کا ہر گوشہ توحیدِ باری تعالیٰ کے رنگ میں رنگ جائے۔ ان کا باطن اگر "لا الٰہ الا اللہ" کی جلوہ گاہ ہو تو ان کا ظاہر "محمدؐ رسول اللہ" کا آئینہ دار رہے، بلکہ اُن میں وجودِ باری تعالیٰ کی اہمیت کا ایک ایسا یقین پیدا ہو جائے کہ فکرِ انسانی کے خودساختہ بُت اس سے ٹکرا کر خود پاش پاش ہو جائیں اور مومن کی زندگی کے ہر شعبہ کے لئے راہوں کا تعیّن ہو جائے، خواہ اس کا تعلق تعلیم و تربیت سے ہو یا معاشرتی و معاشی زندگی سے، جنگ سے ہو یا صلح سے، مردوں سے ہو یا عورتوں سے، اسلامی دنیا کے حدود سے ہو یا غیر ممالک سے۔ گویا مہد سے لحد تک کا ایک منظم نظام، رسولِ برحق صلّی اللہ علیہ وسلّم کے انوار سے آشکارا ہو۔ مختصراً یوں کہیئے کہ مکّی زندگی اس نورِ مبینؐ کی آئینۂ ذات تھی تو مدنی زندگی آئینۂ صفات بنی، یعنی ترجمانِ احمدؐ و تفسیرِ محمدؐ صلّی اللہ علیہ وسلّم۔

مکّہ معظمہ میں اگر انفرادی زندگی کی تشکیل ہوئی۔ اور ایسی ہستیاں فیضانِ نبوّت کا ظہور بن کر سامنے آئیں جو قابلِ اعتماد اور نورِ ایمان سے مزیّن تھیں، تو یہاں مدینہ منورہ میں ایک جماعتی زندگی کی تشکیل حضور سرورِ کائنات صلّی اللہ علیہ وسلّم

کے پیشِ نظر تھی۔ یعنی قومی زندگی کی ایک ایسی عمارت جس کی اینٹیں مکہ میں بنی تھیں لیکن مدینہ میں ان کو اس انداز سے چُنا گیا کہ مکی اور مدنی مہاجر و انصار سب ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن گئے۔ اُن کی قوت ایمانی، ان کی حمیتِ اسلامی، ان کی محبت و فدائیت کے جلوے دنیا نے دیکھے اور وہ تاریخِ عالم میں اپنی مثال آپ بنے۔ صلوا علیہ و آلہٖ و صحبہٖ اجمعین۔

کتابِ مدینہ کے پریشان اوراق کی جزو بندی اور جلد بندی کے لیے یہ ضروری سمجھا گیا کہ ایک اتحاد کی صورت پیدا کی جائے۔

مواخاۃ

جو مسلمان مدینہ کے رہنے والے تھے وہ کوئی بڑے تاجر اور مالدار لوگ نہ تھے۔ دولت و ثروت یہود کے ہاتھوں میں تھی۔ اقتدار بھی انہی کے قدم چوم رہا تھا۔ البتہ ایمان کی دولت سے سرفرازی کے بعد مسلمانوں میں ایک کیفیت استغنا اور باہمی محبت ضرور پیدا ہو گئی تھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد اس پر نورٌ علیٰ نور کی موجب ہوئی۔ حضور نے پہلا کام یہ کیا کہ مدینہ کے جن لوگوں نے اسلام کی مدد کی تھی، اُن کا نام "انصار" قرار دیا اور جو لوگ مکہ سے ہجرت کر کے آئے تھے اور اپنے عزیز و اقارب، مال و دولت سب چھوڑ کر مدینہ آئے تھے انہیں "مہاجر" کا لقب دیا۔ اور اس غرض سے کہ یہ آپس میں مل جل کر رہیں، آپؐ نے ان میں بھائی چارہ فرمایا۔ اس طرح مہاجر و انصار ایک دوسرے کے رنج و راحت میں شریک بن گئے۔ انصار نے اپنی منقولہ و غیر منقولہ جائیداد کا نصف اپنے مہاجر بھائیوں کو دے دیا۔ بعض انصار نے تو مواخاۃ کا حق اس حد تک ادا کیا کہ اگر اُن کے دو بیویاں تھیں تو ایک کو طلاق دے کر اپنے مہاجر بھائی کے نکاح میں دے دی۔ تاریخِ عالم ایسی اخوت کی مثال کہاں پیش کر سکتی ہے۔ اس مواخاۃ کی تقریب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے

پیش قدمی فرمائی اور آپؐ نے حضرت علیؓ کا ہاتھ پکڑ کر فرمایا "یہ میرے چچازاد بھائی ہیں اور اب دینی بھائی بھی۔ پھر مختلف قبیلوں اور مہاجرین کے درمیان رشتے مستحکم ہوئے۔ تقریباً ۴۵ انصار خاندان اور ۴۵ مہاجر خاندان اس طرح شیر وشکر ہوگئے جیسے حقیقی بھائیوں کے خاندان ہوں اور یہ دونوں قبیلے اوس وخزرج، جو آپس میں ہمیشہ برسرِ پیکار رہتے تھے، ایک دوسرے کے دوست بن گئے، ان کے دل صاف ہوگئے، نفرت کی جگہ محبّت نے لے لی۔
حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم نے دعا فرمائی :-

"اے اللہ! ہمارے صاعؑ و مُد میں برکت عطا فرما اور اس شہر کو ہمارے لئے توانائی کا شہر بنا دے۔۔۔۔۔۔۔۔۔"

حضور صلّی اللہ علیہ وسلم کی یہ دعا بارگاہِ ایزدی میں قبول ہوئی اور مدینہ ہر بیمار کے لئے موجبِ صحت، موجبِ انوار اور موجبِ ایمان بن گیا۔ اور مدینہ کے ۲۹ اچھے اچھے نام لوگوں کی زبانوں پر آئے جس میں طیبہ، مدینہ، ھٰذا البلد خصوصی انوار کے حامل ہیں۔

مدینہ کی آبادی

مدینہ منوّرہ میں اکثریت یہود کی تھی جو اس لئے مدینہ میں آئے تھے کہ ان کے برگزیدہ نبیؑ نے ان کو نبی آخر الزّماںؐ کی بشارت سنائی تھی۔ اور اُس علاقہ کی خبر پہونچا دی تھی جو آخری نبیؐ کا مستقر بننے والا تھا۔ وہ نبیٔ موعود کے یثرب میں منتظر تھے۔ انہیں یہ اُمید تھی کہ یہ نبی یہود کے قومی ادبار کو ان کے سروں سے دُور کرے گا اور انہیں دوبارہ شان وشوکت، حکومت و

سا صاع و مُد: تولنے اور ناپنے کے پیمانے۔

سلطنت، بخشے گا۔ وہ خود حضرت عیسیٰؑ کی نبوّت کے قائل نہ تھے، اور جب انہوں نے دیکھا سرورِ کائنات صلّی اللہ علیہ وسلّم حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کو نبی برحق مانتے ہیں، تو وہ آپ کے دشمن ہو گئے۔

ادھر مدینہ کے عیسائی بھی ایک نبی موعود کے منتظر تھے۔ وہ بھی یہاں مقیم تھے۔ ان کو بھی اُمید تھی کہ یہ نبی (صلّی اللہ علیہ وسلّم) اُن کو یہود کے مظالم سے نجات دلائے گا اور عیسائیت کے فروغ کا موجب ہوگا۔ لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ آپؐ عیسائیوں کے خود ساختہ اصول۔ حضرت عیسیٰؑ کا خدا کا بیٹا ہونا، تین خدا ہونا وغیرہ۔ کو غلط سمجھتے ہیں تو وہ بھی آپؐ سے منحرف اور آپؐ کے دشمن ہو گئے۔

اس کے علاوہ مدینہ کی ایک ذی اثر شخصیت عبداللہ بن ابی بن سلول تھا جس کا اَوس وخزرج کے قبیلوں پر بڑا رعب تھا۔ برسہا برس کی جنگوں سے وہ قبیلے تنگ آ چکے تھے اور عبداللہ بن ابی، ان کی اس کمزوری سے فائدہ اُٹھا کر، اب اپنی بادشاہت کا خواب دیکھ رہا تھا۔ جب اس نے دیکھا کہ یہ دونوں قبیلے اسلام کی طرف راغب ہو گئے تو اس نے یہود میں اپنا اثر و رسوخ بڑھایا اور دونوں پر اپنا اثر قائم رکھنے کے لئے صورت یہ اختیار کی کہ مسلمانوں میں بیٹھ کر مسلمانوں کا ساتھ دیتا، گویا وہ مسلمان ہی ہے، اور یہود کی محفلوں میں جا کر یہود کی حمایت کرتا اور ان کی سازشوں میں شریک ہوتا۔ اور یہی وہ پہلی شخصیت ہے جس نے نفاق کا بیج مدینہ میں بویا، "منافق" کہلایا، منافق جیا، منافق مرا، اور اپنے ساتھ منافقین کو دوزخ میں اسفل السافلین کی راہ دکھائی۔

معاہدہ

حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم نے ان منافقین کو قطعی نظر انداز فرما کر

یہود ونصاریٰ سے ایک معاہدہ پہلے ہی سنہ ہجری میں یہ فرمایا کہ نسل اور مذہب کے اختلاف کے باوجود یثرب کے سب لوگ ایک ہی قوم سمجھے جائیں اور جو لوگ معاہدہ کرنے والی قوموں کے ساتھ جنگ کریں توان کے خلاف سب مل کر مدینہ منورہ کا دفاع کریں گے۔ جنگ کے دنوں میں یہود مسلمانوں کے ساتھ مصارف میں شریک ہوں گے۔ مظلوموں کی مدد ونصرت کی جائے گی۔ مدینہ کے اندر کشت وخون، معاہدہ کرنے والی سب قوموں پر حرام ہوگا۔ کوئی شخص اپنے معاہد کے ساتھ مخالفانہ کارروائی نہ کرے گا......"

(اقتباس از رحمۃ للعالمین جلد اوّل صفحہ ۱۰۰)

اس معاہدہ پر مدینہ کی تمام آباد قوموں نے دستخط کئے۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلّم نے گردونواح کے قبائل کو بھی اس معاہدہ میں شامل کرنے کی سعی فرمائی جس کی تکمیل مختلف وجوہ سے نہ ہو سکی۔ جس کی وجہ وہی یہود کی سازشیں اور کفارِ مکہ کے قلوب میں نفرت کی وہ آگ تھی جو ان کو چین نہ لینے دیتی تھی۔

○

مدنی زندگی کے دورانِ قیام، حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کے کوئی دو لمحے ایک سے نہیں گذرے۔ کیونکہ آپؐ کی ہر سانس اُس اسلام کے فروغ کے لئے وقف تھی جس کو تا قیامِ قیامت نہ صرف زندہ رہنا تھا بلکہ جس کی حق وحقانیت کا ثبوت خود نمونہ بن کر دیا تھا۔

اس عاجز نے یہ لفظ "خود" اس لئے لکھا کہ اسلام کا خمیر، اس کی تنظیم خود اپنی صداقت وحقانیت پر دال ہے خواہ اسے مسلمان اپنی زندگی میں اپنائیں یا نہ اپنائیں۔ ایک وقت آئے گا اور ضرور آئے گا کہ اس کی حقانیت عالم پر روشن ہو کر رہے گی۔ اور یہ وہ فیضانِ نورِ نبوّت ہوگا جس کے ملائکہ منتظر ہیں،

لیکن حضورؐ کو اس وقت تو اس حقیقت کو خود آشکار فرمانا تھا چنانچہ مکہ میں عرفانِ ذاتِ باری تعالیٰ کے لئے نورِ مبین صلی اللہ علیہ وسلم نے تیرہ (۱۳) سال لئے۔

لیکن

صفاتِ نورِ حق کی پردہ کشائی دس (۱۰) ہی سال میں کر دکھائی۔

آیئے

دیکھیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ کار کیا تھا کہ یہی طریقہ کار آج بھی نورِ مبینؐ کے اسوۂ حسنہ کی یافت کا ضامن ہے۔

و

طریقۂ کار

اس نورِ مبین صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ مبارکہ پر قلم کون اٹھا سکتا ہے جس کی تفسیر خود قرآن ہو۔ اور اُنؐ کی ذاتِ مبارکہ پر درود وسلام کا حق کون ادا کر سکتا ہے جس پر خود اللہ جلّ شانہٗ ہر گھڑی درود بھیج رہا ہو۔

البتہ

مفسّرین نے تفسیریں اپنی فہم کی حد تک لکھیں یا یوں کہیئے کہ اللہ تعالیٰ نے اُنہیں تفسیر لکھنے کی سعادت سے نوازا۔ اس طرح حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ پر ہر روز تقریباً ایک کتاب کا اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ اسے بھی اللہ ربّ العزّت ہی کی شانِ کریمی سمجھنا چاہیئے۔

بزرگ سیرت نگاروں نے جو کچھ لکھ دیا اُسی کی خوشہ چینی مختلف انداز سے عام ہوتی رہتی ہے۔ یہاں بھی انہیں مستند کتابوں کے حوالہ سے واقعات کا بیان ہے۔ البتہ جس مقصد کے پیشِ نظر یہ خاکہ پیش کرنے کی سعادت حاصل کی جا رہی ہے اسی کی طرف توجہ مرکوز رکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یعنی ہر دَور

یس نورِ مبین صلی اللہ علیہ وسلم کے لامتناہی انوار، جو کہیں خزانوں اور جڑوں کی طرح پوشیدہ رہے اور کہیں جمادات نباتات سے لے کر کائنات کی جملہ تخلیقات میں آشکارا ہوئے اور ہر دور میں کارِ رسالت کی انجام دہی، از ازل تا ابد اسی شان سے جاری رہی، اور رہے گی اور اُس وقت بھی جب نہ زمان تھا، نہ مکان اور اس وقت بھی جب نورِ مبین کے انوار اللہ رب العزت کی توحیدِ مطلقہ واحدیتِ ذات پر شاہد ہوں گے۔

O

مکہ مکرمہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سیرت کی تشکیل کے لئے جن عناصرِ اربعہ کو اختیار فرمایا، ان کا ذکر گذشتہ ابواب میں ہو چکا ہے۔ یہاں اُنہیں ضبط، تحمل، لِرَبِّكَ فَاصْبِرْ، اور استقلال ہی کی بنیادوں کو قائم رکھتے ہوئے اور اسی مقصدِ رسالت، توحید، رسالت، آخرت، تقویٰ اور احسان کے پیشِ نظر جن صفات کو حضورؐ نے انتخاب فرمایا وہ گویا اُنہیں اربعہ عناصر کی شاخیں تھیں۔ یہ بھی چار ہیں:

"ضبط" کے ساتھ "تنظیم" کو منسلک فرمایا کہ جماعتی زندگی کے لئے نظم و نسق ایک اہم حقیقت ہے۔

"تحمل" کے ساتھ "فراستِ" (مومن) کی تلقین فرمائی اور حکمت کے رموز کو آشکارا فرمانے پر زور دیا۔

"لِرَبِّكَ فَاصْبِرْ" کے ساتھ ایک آزاد زندگی کے لئے "جہاد فی سبیل اللہ" اور "شجاعت" کی تلقین فرمائی گئی۔

"استقلال" کے ساتھ "قدرت" کے حصول پر زور دیا، خواہ یہ قدرت حواسِ خمسہ سے حاصل کی گئی ہو یا صفائے باطن و ذکرِ الٰہی سے۔

اگر ہم غور کریں تو آج بھی کسی ادارہ کے قیام سے لے کر بڑی سے بڑی مملکت کے قیام تک کے لئے انہیں اجزاءِ باطنی وظاہری کو اپنا کر ہی حصولِ مقاصد میں کامیابی حاصل کی جا سکتی ہے۔ بشرطیکہ ہر قدم پر نیک نیتی واخلاص پیشِ نظر رہے اور مقصد نفس پرستی نہیں، خیر خواہیِ مخلوق ہو۔

(۶)

اب اسی "طریقہ کار" کا مختصر بیان حضور سرورِ کائنات صلّی اللہ علیہ وسلّم کے ان مراحلِ تبلیغ کے سلسلہ میں ہے جو مدنی زندگی میں آپؐ کی فکر و عمل کا محور رہے۔

اس کی ابتداء

"تنظیم" ہی سے ہوئی۔ وہ تنظیم جو مسلمانوں کو دن میں پانچ بار، ضبطِ نفس کے ساتھ، جماعتی زندگی کے فرائض سے آشنا کرے۔ یہ تحفہ صلوٰۃ تھا جو مکہّ کی زندگی میں عطا ہو چکا تھا لیکن اس کا اجتماعی پہلو آشکارا نہ ہوا تھا۔ وہ کسی آزاد فضا کا منتظر تھا جو اسے مدینہ منوّرہ میں میسّر آئی۔ اگر فرد کے لئے نماز ضبطِ نفس و اخلاص کے ساتھ یادِ الٰہی کی تلقین ہے تو با جماعت نماز میں انہیں جماعتی زندگی سے ہم آہنگ رکھنے کی موجب ہوتی ہے۔ اور آپس میں اتحاد و اتفاق کا باعث بنتی ہے، بشرطیکہ دل صاف ہوں۔

اس جہادِ محراب کے ساتھ، جہاد فی سبیل اللہ کے لئے بھی اسی تنظیم کی اہمیت کو پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے تاکہ یہ جہاد بھی اسی ضبطِ نفس و اخلاص اور للہیت کے پہلو لئے ہوئے ہو جو نماز کے اہم تقاضے ہیں۔

اس جہادِ محراب کے لئے سب سے پہلے مساجد کی تعمیر کو اہمیت دی گئی۔ مسجدِ قبا کے مختصر قیام میں بھی اور مسجدِ نبوی کی تعمیر میں بھی۔

اور اسی تنظیم کے ساتھ، اوّلین اہمیّت حصولِ قدرت کو عطا ہوئی۔ اگر اللہ کے ذکر سے دلوں کو مستحکم بنانے اور تسکین کے لئے نماز اور نمازِ باجماعت کے ذرائع فراہم کئے گئے تو حصولِ علم کے لئے بھی سب سے پہلے مسجد نبوی کی تعمیر کے ساتھ صفۂ نبوی سے علم و عرفان کے چشمے جاری کئے گئے تاکہ "تحمّل" کے ساتھ حکمت "و فراست" کا عرفان ممکن ہوسکے، اور بوجھ اٹھانا مقصدِ حیات نہ ہو بلکہ بوجھ کو ہلکا کرنا، نتائج کے حصول کی طرف پیش قدمی کرنا، صبر و تحمّل کے ساتھ کاموں میں لگا رہنا مقصدِ حیات ہو۔ اور "لربك فاصبر" کے ساتھ "جہاد فی سبیل اللہ" کو منسلک کر کے حق کے لئے جینے اور حق کے لئے مرنے کی تعلیم عطا کی گئی، حیاتِ ابدی کے دریچے مومن کے لئے کھول دیئے گئے۔

و

تعلیم و تربیّت

حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم نے اپنی مدنی زندگی میں بھی جن بنیادی اصولوں کو مختلف شعبۂ حیات میں بھر مخصوص انداز سے ظاہر فرمایا، اس میں سب سے اہم مقام تعلیم و تربیّت ہی کو حاصل ہے اور یہی دراصل نقطۂ بائے بسم اللہ قرار پایا۔

مکی زندگی میں بھی نزولِ قرآن کے وقت اسی علم کی اہمیت "اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ" سے واضح کی گئی تھی۔ یہاں بھی عملاً حضور سرورِ کائنات صلّی اللہ علیہ وسلّم نے اس کو مسجدِ نبوی سے ملحق مقامِ صفّہ کو ان اصحاب کی تعلیم و تربیّت کے لئے منتخب فرمایا جو وہیں قیام بھی فرماتے تھے اور ہر گھڑی فیضانِ رسالت سے سرفراز بھی ہوتے اور حصولِ علم میں مشغول رہتے۔ یہ ان لوگوں کی جماعت تھی جو مکّہ سے ہجرت کر کے تشریف لائے تھے لیکن غربت وعسرت میں گرفتار، وہ کسی قبیلہ سے بالخصوص متعلق نہ تھے۔ ان کی تعداد چار سو تک ہوگی۔ یہ اپنی معاش بھی وقت نکال کر حاصل کرتے، لیکن دراصل وہ سب کے سب حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کے زیرِ نگرانی مقیم اور آپؐ ہی کی خصوصی ذمّہ داری اور نگرانی سے شرف یاب تھے۔ انہیں اصحاب میں سے وہ حضرات بھی تیار ہوئے جو اسلام قبول کرنے والے مختلف قبائل کی تعلیم و تربیت کے لئے بھیجے جاتے۔ یہ سب کے سب حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کے ساتھ غزوات میں شریک ہوتے۔ مسجد میں ان کا قیام گویا ہر گھڑی ان کے لئے فیضانِ نظر کا موجب تھا۔ اور جب بھی غزوات میں مالِ غنیمت حاصل ہوتا تو اس کی تقسیم میں سب سے پہلے ان کا خیال رکھا جاتا۔ غرض تعلیم کا یہ انداز صرف کتاب و اسباق تک محدود نہ تھا، بلکہ ان کو خود ایک جامع کتاب بنانا اور ان کی زندگی کے ہر شعبے کو تعلیماتِ اسلامی کے سانچے میں

ڈھالنا تھا اور ان کا اٹھنا بیٹھنا، چلنا پھرنا، حصولِ علم، حصولِ معاش، ان کے اخلاق و عادات، سب کو سیرتِ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا آئینہ دار بنانا تھا۔ سبحان اللہ! ایسا کیوں نہ ہو کہ:-

ان کے معلّم خود سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم تھے
اور حضورؐ کے علم کا سرچشمہ خود ذاتِ باری تعالیٰ تھی

یوں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم خود ایک نورِ مبین تھے۔ وہ ہستی تھے جنہیں تخلیقِ عالم سے قبل ہی "الرحمٰن" نے "علم القرآن" سے سرفرازی بخشی تھی۔ تخلیق تو اس کے بعد کی بات ہے جب انسان پیدا کیا گیا اور اسے بیان عطا ہوا۔ پیکرِ جسمانیت میں آنے اور نبوت کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر نزولِ وحی کی ابتداء ہوئی۔ اور موقع و محل کے تحت آیاتِ قرآنی کا نزول ہوا تاکہ ہر آیت کا پس منظر اس کی تفہیم میں معاون ہو "ہرچند قرآنِ حکیم وجہِ نزول اور شانِ نزول میں مقید نہیں، بلکہ قولِ الٰہی زمان و مکان پر حاوی ہے۔"

مکی زندگی کی آیات میں اگر عقائدِ صحیحہ پر زور تھا، بُت پرستی سے قلوب کو ہٹا کر اللہ وحدہٗ لاشریک کی عرفانِ ذات پر خصوصی توجہ تھی اور جس کے ساتھ رسالت اور آخرت کا پُر اثر بیان تھا، صبر و استقلال کی تلقین تھی، تو یہاں مدنی زندگی کے ہر شعبہ کے لئے اسلامی اندازِ فکر و عمل کی تلقین ہو رہی ہے، خواہ اس کا تعلق روزمرہ کی زندگی سے ہو، عبادات سے ہو، معاش سے ہو، اخلاق سے ہو، دشمنوں سے معرکہ آرائی سے ہو، یا دوستوں کی دلجوئی سے، اور پھر اس جامعیت کے ساتھ اسلام کی فکر و عمل کو دس سال کی مختصر مدت میں اس انداز سے آشکارا کیا جا رہا ہے کہ ہر صحابی خود ایک کتاب بن جائے اور انوارِ قرآن سے مزین ہو۔ یہی وہ فیضانِ رسالت تھا جس کی بنیاد وحی الٰہی اور عملِ رسولؐ تھا۔

یہاں یہ بات پیش نظر رہنا چاہیئے کہ وحی الٰہی جس کا تعلق قلب رسولؐ سے تھا، اس کی مختلف صورتیں تھیں اور اس کے درجات اس طور پر ہیں:۔

"۱۔ سچے خواب ۔ آپؐ جو خواب دیکھتے وہ صبحِ صادق کی طرح صحیح ثابت ہوتے۔ (خوابِ رسولؐ وحی میں شامل ہیں اور اس میں کوئی شک نہیں)

۲۔ وہ وحی جو فرشتہ کے بغیر آپؐ کے قلب پر القا ہوتی اور آپؐ جان لیتے کہ یہ وحی ہے محض الہام نہیں۔

۳۔ جبرئیلِ امین کا انسان کی شکل میں آنا اور بالمشافہ خطاب کرنا، جس سے آپؐ وہ بیان کردہ آیات یاد فرمالیتے۔

۴۔ جبرئیلِ امین آپؐ سے گھنٹی کی سی آواز سے مخاطب ہوتے۔ وحی کی یہ قسم آپ پر بہت گراں گذرتی۔ (صلصلۃ الجرس)

۵۔ کبھی حضرت جبرئیلؑ اپنی اصلی صورت میں حاضر ہوتے اور وحی پیش کرتے۔

۶۔ وہ وحی جو خود حق تعالیٰ نے آپؐ کو اس وقت القا کی تھی جب آپؐ شبِ معراج میں آسمانوں پر تھے۔ یہ القا براہِ راست اس ازلی کلامِ ربّانی کے ذریعہ ہوا تھا جس میں نہ حرف تھے، نہ آواز، اور نہ اس میں کوئی واسطہ تھا بلکہ اس موقع پر آپؐ کو ذاتِ مقدسہ الٰہیہ کا بلاواسطہ اور بے حجابانہ دیدار نصیب ہوا تھا۔

۷۔ ان کے علاوہ بھی دوسری وحی وہ تھی جو کسی ذریعہ کے بغیر براہ راست، خدا کے ازلی کلام کی سماعت کے ذریعہ آپؐ پر نازل ہوئی، جو بلا رویتِ ذات تھی جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بغیر رویتِ ذات کے ہمکلامی کا شرف حاصل ہوا۔" (محمد رسول اللہ۔ صفحہ ۶۹۴)

یہی علم، سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے تبلیغی مراحل کی کامیابی کا اہم راز تھا۔

اور یہی وہ صداقت تھی جس کے سامنے ہر باطل سرنگوں ہونے پر مجبور ہو جاتا۔
ہدایت پانا نہ پانا قسمت کی بات تھی۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کو اس وحی، اس پیغامِ الٰہی سے سرفرازی بخشی اور ان کی سیرت کو اسی کے انوار میں مزین فرمایا۔ گویا وحی متلو (جس کی تلاوت کی جائے) قرآن بنا اور وحیٔ غیر متلو خود ذاتِ مقدسہ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ اقوال ہیں جنہیں ہم حدیث کہتے ہیں۔ حدیث کے معنی و مفہوم کو قلبِ رسولِ کریم پر القا کیا جاتا اور ان معانی کو آپؐ اپنے الفاظ میں بیان فرماتے۔ اسی لئے اطاعتِ حدیث واجب ہے۔ اور پھر حدیثِ قولی بھی ہے اور فعلی بھی۔ سرورِ کائنات فداہ ابی وامی کا تبسم، سکوت اور شکنِ جبیں بھی حدیث میں شامل ہے۔

چنانچہ مسلمانوں کی عام تعلیم و تربیت کے علاوہ، اکثر یہود و نصاریٰ سے مناظرے، مباحثے اسی وحی الٰہی کی روشنی میں ہوتے اور وہ جس حق پر پردہ ڈالنا چاہتے تھے وہ نمایاں ہو کر رہتا۔ تبلیغ کا یہ طریقہ بڑی اہمیت کا حامل رہا۔ اس کے دو فائدے ہوئے۔ ایک تو یہود و نصاریٰ پر یہ بات خوب واضح ہو گئی کہ آپؐ یقیناً اللہ کے رسول ہیں اور ان تمام امور سے آگاہ ہیں جو ان کی کتابوں میں مذکور ہوئے۔ ان میں وہ حقائق بھی شامل تھے جو اِن لوگوں نے بدل ڈالے۔ دوسرے یہ کہ جن امور میں بحث ہوتی اس میں یہود و نصاریٰ خود اپنی کتابوں کی روشنی میں، کسی انکار کی گنجائش نہ پاتے۔ ہٹ دھرمی کا تو کوئی علاج نہیں۔ تیسرا بڑا فائدہ یہ ہوا کہ جن کے دلوں میں حق کی تمنا تھی، جنہیں اپنی کتابوں کی بشارتوں پر ایمان تھا، وہ بلا تردد مشرف بہ اسلام ہوئے۔ انہیں میں عبداللہ بن سلام تھے۔ جو اس عہد میں یہودیوں کے ایک بڑے برگزیدہ عالم تھے۔ اور توریت کی پیشین گوئی کے مطابق نبیٔ موعود کے انتظار

میں زندگی گزار رہے تھے۔ انہوں نے حضورؐ کے اسمِ مُبارک اور زمانۂ بعثت سے سمجھ لیا کہ آپؐ ہی وہ نبی آخر الزّماں ہیں۔ انہوں نے توریت کی بیان کردہ نشانیوں کے مطابق سرکارِ دوعالمؐ کی زندگی کا مطالعہ کیا اور مشرف بہ اسلام ہوئے۔ یہی نہیں بلکہ اپنی قوم کی ہٹ دھرمی، بہتان طرازی، بے وفائی اور فتنہ پردازی سے بھی حضورؐ کو یوں باخبر کیا کہ خود پسِ پردہ چھپ گئے اور حضورؐ سے عرض کیا کہ ان یہود سے جو آپ کے پاس آئے ہیں، اِن کے متعلق سوال فرمائیں۔ حضورؐ نے ان یہود سے پوچھا "تم عبداللہ بن سلام کو جانتے ہو، کون شخص ہیں" سب نے کہا "وہ ہمارے سردار اور بڑے جیّد عالم ہیں" جب وہ بات ختم کر چکے تو عبداللہ بن سلام سامنے آئے اور کہا "اے یہود! میں گواہی دیتا ہوں کہ محمدؐ اللہ کے رسول ہیں جن کے اوصاف ہماری تورات میں ہیں۔ میں خود بھی اُنؐ پر ایمان لایا ہوں۔ ان کی تصدیق کرتا ہوں" لیکن یہود نے عبداللہ کو جھوٹا بنایا اور ان سے اُلجھ پڑے۔ عبداللہ نے حضورؐ سے عرض کیا کہ آپؐ نے دیکھا کہ یہ قوم کیسی فتنہ پرداز ہے۔

انہیں کے متعلق حضرت انسؓ سے صحیح بخاری میں روایت ہے کہ عبداللہ بن سلام کو آنحضرتؐ کی مدینہ تشریف آوری کا علم ہوا تو آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور تین باتیں دریافت کیں۔

۱۔ قیامت کی پہلی علامت کیا ہے۔ ۲۔ اہلِ جنّت کا پہلا کھانا کیا ہوگا؟
۳۔ بچہ کس بنا پر اپنے باپ کے مشابہ اور کس بنا پر ننھیال کے مشابہ ہوتا ہے؟
حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم نے ان کا وہی جواب دیا جن کا علم عبداللہ سلام کو توریت سے حاصل ہوا تھا اور جواب سُن کر وہ ایمان لائے۔

یہود تعصب اور حسد کی آگ میں جلتے رہتے تھے اور اس طرح کے بے شمار سوال کرتے رہتے جن سے شکوک پیدا ہوں۔ چنانچہ ایک مرتبہ دو یہودی

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے قرآن میں فرمایا ہے کہ ہم نے حضرت موسیٰ کو نو (۹) نشانیاں عطا فرمائیں۔ وہ نو نشانیاں کیا تھیں؟ فراستِ نبوت نے اسی وحی الٰہی کی روشنی میں انہیں نو (۹) نشانیاں گنوا دیں۔

ا۔ کسی کو اللہ کا شریک نہ بنانا۔ ۲۔ زنا نہ کرنا۔ ۳۔ جس کا قتل خدا نے حرام کیا ہو اسے قتل نہ کرنا بجز حق کے۔ ۴۔ چوری نہ کرنا۔ ۵۔ جادوگری نہ کرنا۔ ۶۔ مجرم سے پیشتر کسی کی شکایت بادشاہ کے پاس نہ لے جانا۔ ۷۔ سود نہ کھانا۔ ۸۔ پارسا عورت کو زنا کی تہمت نہ لگانا۔ ۹۔ خاص ہفتہ کے دن کے بارے میں غلو سے کام نہ لینا۔ یہ سُن کر دونوں یہودیوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دستِ مبارک چوم لئے، کلمۂ شہادت پڑھا اور مسلمان ہو گئے۔

ایسے ایک دوسرے موقع پر ایک یہودی نے سوال کیا کہ نبی کی کیا پہچان ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا۔ "اس کی آنکھیں تو سوتی ہیں مگر دل نہیں سوتا۔" سبحان اللہ۔

ایک اور موقع پر سوال کیا گیا کہ اسرائیل نے اپنے اوپر کون سا کھانا حرام کر لیا تھا۔ حضورؐ نے فرمایا "حضرت یعقوب کا مرغوب کھانا اونٹ کا گوشت تھا اور مرغوب مشروب اونٹ کا دودھ تھا۔ آپ نے ایک بیماری کے تحت نذر مانی تھی کہ اگر حق تعالیٰ انہیں اس طویل بیماری سے شفا دے گا تو وہ اپنا سب سے مرغوب کھانا اور سب سے پسندیدہ مشروب چھوڑ دیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو صحت دی اور آپ نے یہ دونوں چیزیں اپنے آپ پر حرام کر لیں"۔ یہود کو اعتراف کرنا پڑا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سچ فرمایا۔

ایک ایسا ہی واقعہ حضرت عباسؓ سے متعلق ہے جب آپ اسلام نہیں لائے تھے اور غزوۂ بدر میں قید ہوئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا۔ "اپنے

دونوں بھتیجوں عقیل بن ابی طالب اور نوفل بن حارث اور اپنے حلیف عتبہ بن عمر، کا فدیہ ادا کرو۔" عباسؓ نے کہا آپؐ جانتے ہیں کہ میں سب سے زیادہ مفلس شخص ہوں۔ حضورؐ نے یہ سُن کر فرمایا۔" وہ مال کہاں ہے جو آپ نے امّ فضل کو دیا تھا اور کہا تھا کہ اگر مجھے کچھ ہو گیا تو یہ رقم میرے بیٹوں فضل، عبداللہ اور قثم کو دے دینا۔" حضرت عباسؓ نے فرمایا کہ بے شک آپؐ اللہ کے رسول ہیں کہ یہ راز وہ تھا جس کا علم امّ فضل کے سوا کسی کو نہ تھا۔

(محمد رسول اللہ صفحہ ۳۳۲)

ایسا ہی غزوۂ بدر کے بعد عمیر کا واقعہ ہے جنہوں نے کہا تھا کہ واللہ اگر میں مقروض نہ ہوتا اور میرے متعلقین نہ ہوتے اور ان کی بربادی کا اندیشہ نہ ہوتا تو میں محمدؐ کے پاس پہونچ جاتا انہیں قتل کر ڈالتا۔ (نعوذ باللہ) میرے پاس اس کی معقول وجہ یہ ہے کہ میرا بیٹا ان کے پاس قید ہے۔ صفوان نے اسے یقین دلایا کہ وہ اس کا قرض ادا کرے گا اور اس کے متعلقین کا تاحیات ذمہ دار ہے۔ پس عمیر اسی بُرے ارادے سے حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کے پاس پہنچا۔ حضرت عمرؓ نے اسے پکڑ لیا اور حضورؐ کے سامنے پیش کیا۔ آپؐ نے فرمایا۔" اسے میرے پاس آنے دو۔" پھر فرمایا" عمیر میرے قریب آؤ" پوچھا "عمیر کس غرض سے آئے ہو۔" کہا۔ میں اس قیدی کی وجہ سے آیا ہوں جو آپ کے پاس ہے (یعنی میرا بیٹا وہب) حضورؐ نے فرمایا کہ "یہ تلوار کس لئے ہے۔ سچ سچ بتا دو کہ کس مقصد سے آئے ہو۔" کہا کہ صرف اسی غرض سے، اپنے بیٹے کے لئے۔ آپؐ نے فرمایا۔" ایسا نہیں۔ بلکہ تو نے اور صفوان بن امیہ نے مقام حجر میں بیٹھ کر قریش کے گڑھے والے مقتولوں کا ذکر کیا۔ پھر تُو نے کہا کہ اگر مجھ پر قرض کا بار نہ ہوتا اور اہل و عیال کی ذمہ داری نہ ہوتی تو میں محمدؐ کو قتل کر ڈالتا۔ اس پر میرے قتل کی شرط پر صفوان بن امیہ نے یہ ذمہ داری سنبھال

لی۔ لیکن خدا کی مشیئت میرے اور تیرے درمیان حائل ہوگئی۔" عمیر بول اٹھا۔ "بے شک آپ اللہ کے رسول ہیں کہ اس واقعہ کی خبر میرے اور صفوان کے سوا کسی کو نہیں۔" تب عمیرؓ مسلمان ہوئے۔ (محمد رسول اللہ صفحہ ۱۴۲)

ایسے بے شمار واقعات ہیں جن کی بنا پر قریش یا یہود مسلمان ہوئے اور یہ اسی علم کا ثمر تھا جو وحی الٰہی سے تھا یا اثر تھا اس خصوصی قطرہ علم کا جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حلقِ مبارک میں ڈالا گیا۔

یہی وجہ ہے

کہ آپؐ کا سب سے بڑا معجزہ خود آپؐ کا علم تھا، آپؐ کی معجز نما ذات تھی، آپؐ کے اخلاق تھے اور وہ فراستِ نبوی تھی جو ہر حال میں، موقع و محل کے اعتبار سے، حالات کا مقابلہ کرتی۔

یہی وجہ ہے

کہ آپ نے اس زمانہ میں بھی جب مسلمان مجبور و بےکس تھے اور جو کچھ تھا بھی وہ غزوۂ بدر میں صرف کر بیٹھے تھے اور انہیں سب سے زیادہ دولت کی ضرورت تھی۔ اس وقت جب کہ قیدی حسب حیثیت چار ہزار درہم سے لے کر ایک ہزار درہم تک کے فدیہ پر چھوڑے گئے۔ ایسی حالت میں بھی جس کے پاس فدیہ کی رقم نہ تھی اور جو اچھا پڑھنا لکھنا جانتا تھا اسے مدینہ کے لڑکوں میں سے دس سپرد کئے گئے کہ وہ انہیں نوشت و خواند سکھائے اور جب لڑکے لکھنا پڑھنا سیکھ جاتے تو اسی کو قیدی کے فدیہ کے طور پر قبول کر کے اُسے آزاد کر دیا جاتا۔

یہ سب اس لئے تھا

کہ مسلمانوں میں علم عام ہو۔ وہ علم جو حصولِ معاش کے لئے ضروری ہے اس میں بھی کسی سے پیچھے نہ رہیں اور وہ علم جو خاص ان کی ملک ہے یعنی علمِ کتاب

وہ ہمیشہ اس سے بہرہ ور رہیں، اور اس علم کا حصول ہر مرد و زن، بچے بوڑھے، پر فرض کیا گیا۔

آپ نے دیکھا

مدنی زندگی کا آغاز اسی مسجد اور علم سے ہوا تاکہ ظاہر و باطن کی پاکی کے ساتھ مقصدِ حیات پیشِ نظر رہے۔ یعنی اللہ کی بندگی اور تسخیر کائنات

اور

اس کے حصول کا ذریعہ، علم، عرفان و اخلاق قرار پایا

○

نماز اچھی، حج اچھا، روزہ اچھا اور زکوٰۃ اچھی
مگر میں باوجود اس کے مسلماں ہو نہیں سکتا
نہ جب تک کٹ مروں میں خواجۂ یثربؐ کی حرمت پر
خدا شاہد ہے کامل میرا ایماں ہو نہیں سکتا

(ظفر علی خانؒ)

غزوات و سرایا

(تنظیم، شجاعت، فراست اور قدرت کی جلوہ آرائیاں)

اس نورِ مبین صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حقیقت کو بھی آشکارا فرمایا کہ علم ہی نور نہیں، تلوار بھی نور ہے اور نور و نورانیت میں لے جانے کی ضامن ہے بشرطیکہ اس کا استعمال حصولِ اقتدار اور حصولِ مملکت کے لئے نہ ہو، بلکہ ان اقدار کی حفاظت کے لئے ہو جو فلاحِ دارین کی موجب ہیں۔ یعنی وہ تلوار جو اللہ کے حکم سے میان میں آئے اور اللہ کے حکم سے میان سے باہر نکلے، جس کا وار نفس کے تحت نہیں، امر کے تحت ہو، تاکہ ظلمت کا قلع قمع ہو۔ ہدایت کے انوار چمکیں۔

آیئے

اب انہیں چار اہم اجزاء، تنظیم، فراست، شجاعت و قدرت کے مظاہر ان غزوات و سرایا میں دیکھیں اور سمجھیں کہ تابع امر کی کیا شان ہوتی ہے اور اسے نتیجۃً کیا ملتا ہے۔ کیا عجب ہے کہ نورِ مبینؐ کی یہ تجلیات ہمارے قلوب سے ظلمت کے دور کرنے اور نورِ ایمان سے منور کرنے میں معاون ہوں اور امت مسلمہ اپنی نجات کی راہ پا سکے۔

چونکہ ان چاروں صفات کا تعلق بنیادی طور پر علم ہی سے تھا اور علم کا سرچشمہ ذاتِ مقدسہ اور وحیِ الٰہی سے تھا اس لئے علم کا بیان پہلے ہوا۔

؎ جن جنگوں میں رحمتِ عالم حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے شرکت کی انہیں غزوہ کہتے ہیں اور جن میں آپؐ نے شرکت نہیں فرمائی ان کو سریہ کہتے ہیں۔ بعض سرایا میں جنگ نہیں ہوئی اور اسلامی لشکر اپنے مقاصد کی تکمیل کے بعد واپس آ گیا۔ (محترم کشفی صاحب)

آئیے! اب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شانِ فراست، تنظیم، شجاعت اور قدرتِ خفی و جلی کے جلوے غزوات و سرایا میں دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کریں۔

ترجیحاتِ نبوی ؐ

مدینہ میں تشریف لانے کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا پہلا کام تعمیرِ مسجد تھا، پھر امن کے لئے معاہدے، فروغِ اسلام کے لئے علم و اخلاق اور ملی زندگی کے عناصرِ اربعہ ضبط، تحمل، صبر و استقلال پر قائم رہنا۔ ابھی ہجرت کا پہلا سال تھا اور جنگ و قتال کی اجازت نہ ملی تھی۔ آپ ؐ نے اس زمانہ میں جو جماعتیں مختلف صحابہؓ کی سرکردگی میں، مدینہ کے باہر بھیجیں ان کا مقصد محض دشمنوں کی حرکات و سکنات کے ساتھ ساتھ ان قافلوں پر نظر رکھنا تھا جو مختلف مقاصد کے تحت مدینہ کے قریبی راستوں سے آتے جاتے رہتے تھے۔ بعض سیرت نگاروں نے انہیں بھی سرایا کہا ہے۔ اس مقصد کے لئے جو جماعتیں بھیجی جاتیں وہ صرف مہاجرین کی ہوتیں۔ ان کو معمولی صف بندی کے آداب سکھائے جاتے لیکن جنگ کا حکم نہ دیا جاتا۔ اور محض حفاظت کے لئے اپنے ہمراہ تیر و تلوار کی بھی اجازت ہوتی۔ دراصل یہ حفاظتی اقدام تھے سرایا نہ تھے۔ البتہ ۲ھ ہجری میں آیاتِ قتال نازل ہونے کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہودِ مدینہ کی ریشہ دوانیاں اور منافقین کی خفیہ سازشوں اور قریشِ مکہ کے نہایت خطرناک ارادوں کی بیخ کنی کے لئے جہاد کئے۔ اس میں سرایا بھی تھے اور غزوات بھی۔

پہلا غزوہ ابواء

آپ ؐ نے ۲ھ میں مہاجرین کے ہمراہ مدینہ سے کوچ کیا۔ علم حضرت حمزہ

کو دیا گیا۔ اور آٹھ منزلیں طے کرنے کے بعد مقام الابواء، (جہاں آپؐ کے والد ماجد مدفون تھے) تشریف فرما ہوئے اور قبیلہ بنی ضمیرہ سے باہمی امداد و اعانت کا معاہدہ کیا۔ معاہدہ یہ تھا کہ بنی ضمیرہ آپؐ سے جنگ نہ کریں گے، نہ آپؐ کے خلاف اپنی جماعت میں اضافہ کریں گے، نہ آپؐ کے مقابلہ میں آپؐ کے دشمنوں کی مدد کریں گے بلکہ اگر کوئی آپؐ پر حملہ کرے گا تو آپؐ کی مدد کریں گے۔ یہ ایک تحریری معاہدہ تھا۔ اس غزوہ میں حضورؐ کے ساتھ صرف ساٹھ مہاجر شتر سوار تھے۔

غزوہ بواط

پھر ہجرت کے تیرھویں مہینہ میں غزوہ بواط پیش آیا۔ اس میں آپؐ صرف دو سو مہاجروں کے ہمراہ نکلے۔ آپؐ نے قریش کے قافلہ کا سراغ لگانا چاہا، جس میں قریش کے سو آدمی اور سامان سے لدے ہوئے ڈیڑھ ہزار اونٹ تھے، لیکن یہ قافلہ مل نہ سکا اور آپؐ بغیر جنگ کے واپس مدینۂ منورہ تشریف لے گئے۔

غزوہ بدر اولیٰ

قریشِ مکہ نے مسلمانوں پر یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ وہ تین سو میل سے بھی آکر اُن کو زک پہونچا سکتے ہیں، مدینہ کی چراگاہ پر حملہ کر دیا اور اُن کے مویشی ہانک لے گئے۔ قریش کی اس جماعت کا سردار کرز بن جابر فہری تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے تعاقب کے لئے لشکرکشی فرمائی یہاں تک کہ آپؐ بدر کی وادی صفوان تک پہنچے۔ لیکن کرز نہ مل سکا اور آپؐ واپس ہوئے۔ اسے پہلا غزوہ بدر کہتے ہیں۔

غزوہ عشیرہ

اسی طرح ہجرت کے دوسرے سال ماہِ جمادی الاوّل میں آپؐ ڈیڑھ دو سو مہاجرین کے ساتھ نکلے۔ اس جہاد میں کسی کو شریک ہونے پر مجبور نہ کیا گیا۔ ان مجاہدین کے ساتھ صرف تیس اونٹ تھے اور ان کا مقصد قریش کے ایک قافلہ کو روکنا تھا جو شام کی طرف جا رہا تھا۔ حضورؐ کو معلوم ہوا تھا کہ قریش کا ایک قافلہ مکہ سے روانہ ہوا ہے جس میں ابوسفیان اپنے تجارتی مال اور ایک جماعت کثیر کے ساتھ جا رہا ہے۔ لیکن جب آپؐ مقام عشیرہ پر پہونچے، جو بنی مدلج سے آباد تھا، تو آپؐ کو معلوم ہوا کہ وہ قافلہ چند روز پہلے ہی گذر چکا ہے۔ اس لئے آپؐ نے اپنا سفر ختم فرمایا اور کچھ دن یہاں قیام فرما کر بنی مدلج اور اُن کی ہم عہد قوم بنی ضمرہ سے مصالحت فرمائی، اور اس کے بعد مدینہ واپس ہوئے۔ (تاریخ اسلام صفحہ ۱۶۴)

سریہ عبداللہ بن جحش (واقعہ نخلہ)

اسی طرح ہجرت کے سترھویں مہینہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوعبیدہ بن جراحؓ کو تیاری کا حکم دیا۔ لیکن ابوعبیدہ پر حضورؐ سے جدائی کا صدمہ پایا تو عبداللہ بن جحش اسدی کو بارہ مہاجروں کے ساتھ ایک نخلستان کی طرف روانہ کیا جہاں مکہ کے قریب ابن عامر کا باغ تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں ایک پرچہ دیا اور فرمایا کہ اسے دو دن کی مسافت کے بعد پڑھیں، اور اس میں تحریر کردہ حکم پر عمل کریں، اور اس کام کے لئے اپنے ساتھیوں کو مجبور نہ کریں۔ انہوں نے پرچہ کھولا تو اس میں لکھا تھا کہ مکہ اور طائف کے درمیان واقع باغ میں جا کر اتریں اور قریش کی تاک میں رہیں

اور ان کے حالات معلوم کریں، پھر ساتھیوں کو اطلاع دیں۔ اس پرچہ کو پڑھ کر سب کے سب بخوشی اُن کے ساتھ روانہ ہو گئے۔ یہ رجب کا مہینہ تھا جس میں عرب میں جنگ نہیں ہوتی تھی لیکن دشمن کے مقابلہ میں مسلمانوں کو جنگ کے لئے تیار ہونا پڑا۔ اس میں عمر بن حضرمی مسلمانوں کے تیر سے قتل ہوا، اور دو اشخاص گرفتار ہوئے۔ اس میں مالِ غنیمت بھی ملا اور پہلا خمس نکالا گیا لیکن جب یہ مسلمان ان قیدیوں کے ساتھ مدینہ منورہ پہنچے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں نے تم کو لڑائی کا حکم نہ دیا تھا۔ اُن کو سخت ندامت ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی تسلی یوں فرمائی کہ آیتِ کریمہ نازل ہوئی جس میں یہ بات واضح کر دی گئی کہ بے شک حرمت کے مہینوں میں جنگ بڑا گناہ ہے لیکن اس سے بڑا گناہ تو یہ ہے کہ لوگوں کو حرم میں داخل ہونے سے روکا جائے اور ان کو جلا وطن کر دیا جائے۔ یہ آیت[۱] مسلمانوں کے اطمینانِ قلبی کا موجب ہوئی اور دونوں قیدیوں کو فدیہ لے کر چھوڑ دیا گیا۔

اب قبل اس کے

کہ ہم اہم غزوات کا ذکر کریں، ان سرایا اور غزوات کا اصل مقصد، اس کے طریقۂ کار، اور مضمرات کا مختصر ذکر ضروری ہے تاکہ یہ غلط فہمی نہ ہو کہ ان غزوات کا مقصد لوگوں کو زبردستی مسلمان بنانا یا اُن کے قافلوں کو لوٹنا تھا۔

جیسا عرض کیا جا چکا ہے کہ ہمارے پیشِ نظر ان غزوات کی تفصیل نہیں بلکہ نورِ مبین صلی اللہ علیہ وسلم کی اُن تجلیاتِ عزم، تنظیم، فراست،

---

[۱] البقرہ آیت : ۲۱۷

شجاعت وقدرت کو آشکارا کرنا ہے جو مسلمانوں کے لئے ہر دور میں رہنمائی کا سبب ہوں، خواہ دنیا اپنی مادّی ترقی میں کتنی ہی آگے بڑھ جائے۔
اور اس لئے بھی کہ مسلمانوں کے پیشِ نظر یہی مقصدیت رہے جس کی بنیاد مکّی زندگی میں استوار کی گئی اور جس کے ثمرات کا ظہور حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کی مدنی زندگی میں ہوا۔ یعنی مسلمان کسی حال میں اپنی زندگی کے اصل مقصد سے غافل نہ ہوں اور ہر حال میں اپنی ظاہری اور باطنی صلاحیتوں کو اسی مقصدیت یعنی توحید، رسالت، آخرت، محبّت اور فدائیت کے لئے وقف کر دیں۔

یہ بات بھی

واضح رہے کہ خود آیتِ قتال کا نزول اس بات پر شاہد ہے کہ مسلمانوں کے لئے جس جنگ کی اجازت دی گئی وہ مدافعت کی جنگ تھی نہ کہ جارحیّت کی، مظلوموں کو ظلم سے نجات دلانے کے لئے تھی نہ کہ لوگوں کے املاک پر قبضہ جمانے کے لئے تھی، معابدوں کی اہمیّت کو برقرار رکھنے کے لئے تھی، آزادیٔ مذاہب کے لئے تھی۔ تاکہ مسجد و محراب، دونوں جگہ مسلمانوں کا اخلاق ہی ان کی تلوار بنے جو دوسروں کو کاٹنے کے بجائے، ان کے دلوں میں گھر کرے۔

یہ بھی واضح رہے

کہ بزدلی کی بنیاد اور جڑ موت کا خوف ہے۔ حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم نے یہ مژدہ، جانفزا مسلمانوں کو سنا کر کہ ان کے جان و مال اللہ تعالیٰ نے جنّت کے عوض خرید لیا ہے، ان کے دلوں سے موت کا خوف سلب کر لیا تھا۔
شرط صرف یہ ہے کہ یہ قتال اللہ کے لئے ہو۔ پھر جنہوں نے جان دی اُن کے بارے میں حکم خداوندی ہے کہ اُنہیں مردہ نہ کہو کیونکہ وہ زندہ ہیں

اور اللہ کے یہاں سے اپنا رزق پاتے ہیں۔ انہیں شہید کا لقب اور منصب عطا ہوا یعنی انہوں نے توحیدِ باری تعالیٰ کا ثبوت اس کی شہادت، اپنے خون سے دی۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں حیات جاوداں سے نوازا اور جنت کے دروازے ان کے لئے کھول دیئے۔

راہِ خدا میں جنگ و قتال کی کئی صورتیں ہو سکتی ہیں:-

۱:- دشمن کا زور توڑنا۔ ۲۔ ان کی دشمنی اور سازشوں سے ہوشیار رہنا۔ ۳۔ ان کے مقابلہ کے لئے ہر طرح تیار رہنا۔ ۴۔ اور خود ایک ایسی زندگی بسر کرنا کہ دشمنوں کے قلوب پر مسلمانوں کا رعب بیٹھ جائے ان کی صداقت، ان کی حقانیت، اور دین کی محبّت میں سب کچھ قربان کرنے کا جذبہ، اُن کو متأثر کئے بغیر نہ رہے، اور وہ خود مسلمانوں سے ڈرتے رہیں نہ کہ مسلمان اُن سے ڈریں ——— ہر غزوہ اور ہر سریہ حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کی اسی فراستِ نبوی، اسی حکمتِ عملی کا ترجمان ہے۔ آپ نے دیکھا کہ آیتِ قتال کے نزول سے قبل گو آپؐ نے کسی حملہ کا حکم نہ دیا لیکن اندازیہ اختیار فرمایا کہ مسلمان ہر وقت ہوشیار اور ہر مقابلہ کے لئے تیار رہیں۔ ساتھ ہی قبائل اور یہود سے معاہدے کئے تاکہ مسلمانوں کو زیادہ سے زیادہ تحفظ حاصل رہے۔ مسلمانوں نے ہمیشہ معاہدہ کا پاس کرنا اپنا فرضِ عین سمجھا اور ایک قومی زندگی کا تصوّر دے کر اہلِ مدینہ کو متحد کیا۔ یہی نہیں بلکہ مدینہ کے باہر خود مدینہ کی حفاظت کے لئے جو لوگ بھیجے جاتے وہ مہاجر ہوتے، کیونکہ انصار سے شہر کے اندر حفاظت کا عہد تھا نہ کہ باہر کا۔

اب جن غزوات کا ذکر آرہا ہے وہ سب اہم غزوات ہیں۔ یہ بات بھی واضح رہے کہ لڑائی کی اصل کامیابی کا راز چونکہ عسکری حکمتِ عملی پر ہے، اس لئے ہر غزوہ کو اسی نقطۂ نظر سے دیکھنا چاہیئے۔ اصل چیز لشکر

کی نقل و حرکت، صحیح موقع اور صحیح وقت کی تلاش ہوتی ہے تاکہ اپنی مرضی کے علاقہ، اپنی مرضی کے وقت اور اپنی مرضی کے حالات میں دشمن کو لڑنے پر مجبور کر دیا جائے۔ اور جہاں یہ صورت ممکن نہ ہو وہاں قوتِ ایمانی اور توکل علی اللہ میں ذرہ برابر فرق نہ آئے۔ اکثر غزوات میں اللہ رب العزت کی طرف سے مسلمانوں کی غیبی مدد اس طرح ہوئی جیسے خانہ کعبہ پر حملہ کے وقت ابابیلوں کے ذریعہ ابرہہ کا لشکر تباہ کیا گیا تھا۔ اگرچہ اس کی یہاں مثالیں کم ہیں لیکن یہ ضروری ہے کہ وہ "قدرۃ خفی" جو رسالت کا جزو ہے اور جس کو عملی جامہ پہنانا اذن الٰہی کے تابع ہوتا ہے، اس سے کام لیا گیا، تاکہ مجبور اور بے ساز و سامان مسلمانوں کے حوصلے بڑھتے رہیں اور وہ سوائے اپنے رب پر بھروسے اور اپنے رسولؐ کی محبت کے ہر شئے کو ہیچ جانیں۔

غزوہ بدر کبریٰ ۔ ۱۷ رمضان المبارک ۲ھ

اس اہم غزوہ کے حالات سورۂ انفال میں تفصیل کے ساتھ آئے ہیں۔ اس غزوہ میں کچھ ایسی صورت پیدا کی جاتی ہے کہ جذبۂ جنگ کے ساتھ جذبۂ ایمانی کی آزمائش ہو جائے اور اس جنگ میں شریک معزز ہستیاں تا ابد الآباد ایک معزز مقام کی مالک ہوں۔ نہ بھولئے کہ جس کی وحدانیت کو عام کرنے کے لئے رسولِ برحق نکل رہے ہیں، وہی ان کا سہارا اور پشت پناہ بھی ہے۔

واقعہ نخلہ میں قریش کا ایک شخص حضرمی قتل ہوا تھا اور دو قید ہو گئے تھے۔ قریش انتقام کے لئے آگ بگولہ ہو رہے تھے۔ قتل کا بدلہ لینے کے علاوہ قافلے کے لُٹ جانے کا بھی خوف تھا، اس لئے ابوسفیان ایک بڑا سرمایہ تجارت لے کر ستر آدمیوں کے ساتھ نکلا۔ اس نے ضروری احتیاط

کی ہوگی۔ لیکن جب اس کو راہ میں یہ خبر ملی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم مقابلے کے لئے آرہے ہیں، تو اس نے ایک قاصد مکہ بھیجا۔ تاکہ قریش کو صورت حال سے باخبر کرے اور زیادہ سے زیادہ کمک پہنچ جائے۔ اس موقع پر مکہ کے رؤسا میں سوائے ابولہب کے کوئی پیچھے نہ رہا۔ اس نے اپنی جگہ عاصم بن ہشام کو چار ہزار درہم دے کر روانہ کیا۔ یہ سب کے سب اس تجارتی قافلہ کی حمایت اور حفاظت کی غرض سے روانہ ہوئے تھے۔

گویا ایک طرف ابوسفیان کا ایک ہزار اونٹوں سے لدا ہوا مختصر قافلہ ضروری احتیاط کے ساتھ اور دوسری جانب اس کی حمایت کے لئے ایک عظیم لشکر جس میں مکہ کے تقریباً ایک ہزار افراد شامل تھے، ان میں سے چھ سو زرہ پوش تھے۔ ساتھ ہی سو گھوڑے۔ ان پر بھی زرہ پوش سوار، سات سو اونٹ۔ ان کے علاوہ رجز پڑھنے والی عورتیں شامل تھیں جو مسلمانوں کی ہجو کرتیں اور مشرکینِ مکہ کے جوشِ انتقام کو بڑھاتی جاتی تھیں۔ ان کے کھانے کا انتظام بارہ اشخاص کے سپرد تھا۔ ہر روز دس اونٹ ذبح ہوتے۔ غرض یہ اپنی دولت اور تکبر کے نشہ میں چور تھے۔

ادھر مسلمان جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نکلے، ان کی تعداد تین سو تیرہ تھی۔ یہ پہلا غزوہ ہے جس میں آپ کے ساتھ انصار بھی تھے۔ اور ان کی تعداد ۲۰۷ تھی، باقی مہاجر تھے۔ لشکر میں کل ستر اونٹ اور پانچ گھوڑے تھے۔ حضورؐ نے روانگی کا قصد فرمایا۔ زرہ زیب تن فرمائی۔ اور چھوٹے بچوں کو واپس کیا لیکن بعض کو روتا دیکھ کر لشکر میں شرکت کی اجازت دے دی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ میں آٹھ صحابہ کو اپنا جانشین چھوڑا جس میں حضرت عثمان بن عفانؓ بھی تھے جنہیں اپنی زوجہ حضرت رقیہؓ کی تیمار داری کے لئے رکنا پڑا۔

اب حضور صلی اللہ علیہ وسلّم نے ابوسفیان کے قافلہ کے متعلق دریافتِ حال کے لئے بھیجا اور اس کا رُخ معلوم کر کے یہ امر صحابہؓ پر چھوڑا کہ وہ ابوسفیان کے قافلہ پر حملہ کر کے مال و دولت حاصل کریں یا اس عظیم جنگی لشکر سے مقابلہ کریں جو اس کی مدد کو جا رہا تھا۔ آپؐ نے صحابہ کو قریش مکہ کی روانگی کی اطلاع بھی دے دی اور یہ بھی فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تم سے کسی ایک پر غلبہ کا وعدہ کیا ہے۔ صحابہ کا زیادہ تر رجحان اسی جانب تھا کہ قریش کے قافلہ کو لُوٹ لیا جائے تاکہ وہ جنگ کے لئے ساز و سامان خرید سکیں۔ لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کا چہرۂ مبارک متغیّر ہو گیا۔ پہلے مہاجرین سے مشورہ کیا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمرؓ نے پُرجوش تقریریں فرمائیں۔ پھر آپؐ انصار سے مخاطب ہوئے کیونکہ انصار سے معاہدہ صرف مدینہ کے اندر جنگ میں ساتھ دینا تھا۔

اس وقت سعدؓ بن عبادہ جو انصار کے سردار اور ایک عظیم صحابی تھے، کھڑے ہوئے اور اپنے تعاون کا پورا یقین دلایا اور فرمایا "واللہ! ہم جنگ کرنے والوں میں شدید بہادر اور میدانِ جنگ میں ثابت قدم رہنے والے ہیں۔"

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کے استفسار کا یہ انداز بھی ایک طرف فراستِ نبوی پر شاہد ہے اور دوسری جانب عسکری حکمتِ عملی کی ایک اعلیٰ مثال ہے جب صحابہ کی نظر اسباب پر پڑی، نبی برحقؐ کی نظر مسبب الاسباب کے وعدہ پر گئی۔ جب اللہ کی طرف سے ایک فتح کی خبر مل چکی ہے تو اپنی کمزوریوں کو کیا دیکھنا۔ آخر طالوت نے بھی تو اسی تعداد ۳۱۳ کے ساتھ جالوت کی فوج کو شکست دی تھی۔ مسلمانوں میں تو اس سے زیادہ جذبۂ شہادت، شوقِ شہادت اور ذوقِ توحید کے فروغ کی تمنا موجود تھی۔ عسکری حکمتِ عملی کا ایک پہلو یہ تھا کہ مہاجر و انصار کا اتحاد باقی رہے، اُن کے دلوں میں میل نہ آئے۔ اور پھر

اللہ کے لئے صبر و استقامت کا ایک مظاہرہ میدان جنگ میں بھی ہو جائے جو مکّی زندگی کی یاد دل کو تازہ کر دے۔

غزوہ بدر حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کی حکمتِ عملی، تنظیم، فراست، شجاعت، قدرتِ خفی کی اعلیٰ ترین مثال ہے۔ مثال ہی نہیں بلکہ تا ابد الآباد یہ کسوٹی ہے۔ خود حضورؐ کے دورِ نبوت میں بھی جب بھی مسلمان اس کسوٹی پر پورے اُترے، جن کا باطن انکسار و عجز اور جن کا ظاہر شہادت اور توکل علی اللہ تھا، تو وہ ہمیشہ کامیاب ہوئے۔ اور جہاں اس میں ذرّہ برابر بھی فرق آیا اسی قدر انہیں خسارے کا سامنا کرنا پڑا۔

میدانِ جنگ میں

قریش وادیٔ بدر کے انتہائی آخری جانب خیمہ زن ہو گئے اور مسلمانوں کو ریتلی زمین پر خیمہ زن ہونا پڑا، جس میں جانوروں کے پیر دھنستے تھے۔ مشرکین مسلمانوں سے پہلے بدر کے پانی کے پاس پہنچ گئے جسے انہوں نے گھیر لیا اور پانی کا وافر انتظام کر لیا۔ ادھر مسلمانوں کو پینے، وضو اور غسل کے لئے بھی پانی میسّر نہ تھا۔ یعنی میدانِ جنگ میں عسکری فضیلت بھی قریشِ مکہ کو حاصل تھی، اور جملہ آسانیاں بھی گویا ان کی کامیابی کا پیش خیمہ بن گئی تھیں۔ بظاہر فتح انہیں کی معلوم ہوتی تھی۔

لیکن

اللہ پر توکل کامیابی کی ضمانت ہے کہ اُس کا وعدہ حق ہوتا ہے۔ نبیٔ برحق صلّی اللہ علیہ وسلّم کا قول حق کا ترجمان ہوتا ہے۔ ادھر مسلمانوں کے دِلوں کو تسلّی دیتے اور اُنہیں ذرا آرام پہونچانے کے لئے قدرت نے اُن پر نیند کا غلبہ طاری فرمایا، اُدھر بارش ہوئی اور ریتلی زمین بیٹھ گئی اور اس پر چلنا پھرنا آسان ہو گیا۔ مسلمانوں نے بھی حوض بنا بنا کر بارش کا پانی محفوظ کر لیا اور

تازہ دم ہو گئے۔ گویا قوتِ ایمانی ظاہراً بھی موجب تسکین بن گئی۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ایک جھونپڑا ایک ٹیلہ پر تیار کیا گیا۔ حضرت صدیقِ اکبرؓ تلوار تان کر پاس کھڑے ہوئے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے میدانِ جنگ کا معائنہ فرمایا۔" اور جگہ جگہ اپنے دستِ مبارک کے اشارے سے فرماتے رہے کہ انشاء اللہ یہاں فلاں آدمی مارا جائے گا، یہاں فلاں شخص ہلاک ہوگا،..... چنانچہ ایک جگہ بھی اس کے خلاف نہیں ہوا اور آپؐ کا فرمانا حرف بحرف صحیح ثابت ہوا۔"

(نبیؐ رحمت، جلد اوّل ص۲۱۸)

صبح ہوئی تو قریش کا قافلہ ایک ٹیلہ پر چڑھا جس سے مسلمان انہیں صاف نظر آ رہے تھے۔ اُدھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم اُنؓ کی جانثاری، بے سروسامانی اور جذبۂ شہادت سے متأثر ہو کر دُعا فرما رہے تھے۔

"اے میرے معبود! یہ قریش ڈینگیں مار رہے ہیں۔ یہ تیری مخالفت اور میری تکذیب پر اترے ہوئے ہیں۔ ربّ العزت تیری مدد کا انتظار ہے جس کا تو نے وعدہ فرمایا ہے۔ اے اللہ! تو ان کے تکبّر کو خاک میں ملا دے۔ اے اللہ! تیرے یہ بندے جو میرے ساتھ ہیں اگر ہلاک ہو گئے تو پھر زمین پر تیری عبادت کرنے والا کون ہوگا؟" (تاریخ اسلام۔ ۱۷۰)

جمعہ کا دن۔ رمضان المبارک کی ۱۷ تاریخ تھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرامؓ کی صف بندی فرمائی۔ جنگ کا آغاز ہوا۔ قریش کے تین جوان میدانِ جنگ میں نکلے اور مسلمانوں کو مقابلہ کے لئے للکارا۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے نوجوان ولید بن عتبہ کا کام تمام کیا۔ حضرت حمزہؓ نے اپنے مقابل شیبہ کو قتل کیا۔ حضرت عبیدہؓ اور عتبہ کے مقابلہ میں کچھ دیر لگی۔ پھر حضرت علیؓ اور حضرت حمزہؓ کی مدد سے اس کا بھی خاتمہ ہوا۔ اور حضرت عبیدہؓ جن کو سخت

زخم آئے تھے، انہیں اٹھا کر لائے۔ ان کا انتقال بدر سے واپسی پر صفراء کے مقام پر ہوا۔ گھمسان کی جنگ شروع ہوئی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اونگھ آ گئی۔ آپؐ کو خواب میں کفار کی تعداد کم دکھائی گئی۔ آپؐ نے صحابہ کو اس کی اطلاع دی اور وہ ثابت قدمی اور شجاعت کا پیکر بن گئے۔ اب حضور صلی اللہ علیہ وسلم بنفسِ نفیس اپنے خیمہ سے باہر نکلے۔ مٹھی بھر کنکریاں لے کر قریش کی طرف پھینکیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے چہرے مسخ کر دیئے۔ قرآنِ حکیم میں آتا ہے کہ اے رسول! یہ آپ نے نہیں ہم ہی نے کنکریاں پھینکیں تھیں۔ حضور نے صحابہ کرامؓ کو خدا کا وعدہ یاد دلایا۔ پھر خیمہ میں تشریف لے گئے اور سربسجود ہو کر مصروفِ دعا ہو گئے، اسی تڑپ کے ساتھ جس طرح غزوۂ بدر کے شروع ہونے سے قبل رات بھر "یا حیُّ"، "یا قیوم" کے اسمائے حسنیٰ سے اللہ تعالیٰ کو یاد فرماتے رہے تھے۔

اس جنگ میں اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے بھی مسلمانوں کی مدد فرمائی۔ جس کا ذکر سورہ انفال میں آتا ہے۔ یہ ملائکہ بدر کے دن سیاہ یا سرخ، سفید و سبز عمامے باندھے ہوئے تھے اور حضرت جبرئیل کا عمامہ زرد رنگ کا تھا اور ان کے گھوڑے ابلق اور نشان زدہ تھے۔ یہ ملائکہ بدر کے دن بادلوں کے سایہ میں آئے تھے۔ اس کا منظر عام لوگوں نے یوں دیکھا کہ مسلمانوں میں سے جب کوئی مشرک کی طرف تلوار چلاتا تو اس کی تلوار کے اس کے جسم میں لگنے سے پہلے، اس کا سر اس کے تن سے جدا ہو کر نیچے گر پڑتا۔

جس بہادری، جانثاری اور سرفروشی کے جذبہ سے مسلمان لڑے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ ہر ایک کی زبان پر احد، احد، امتی، امتی جاری تھا۔ اس جنگ میں ستر قریش قتل کئے گئے جن میں اکثر اپنی قوم کے سردار تھے۔ اور ستر ہی قریش قید ہو کر مسلمانوں کے ہاتھ آئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قریش

بھاگ کھڑے ہوئے۔ اور وہ جو بدر میں ابوجہل کی ان تمناؤں کے ساتھ داخل ہوئے تھے کہ یہاں رقص و سرود کے جلسے ہوں گے اور شراب کے دور چلیں گے، اپنے کیفرِ کردار کو پہنچے۔

صحابہؓ میں صرف چودہ حضرات شہید ہوئے ان میں چھ مہاجر اور آٹھ انصار تھے، رضی اللہ عنہم۔ "پہلے شہید عمیر بن الحمام الانصاریؓ تھے۔ انہوں نے حضورؐ سے جب یہ سُنا کہ جنت اپنی وسعتوں میں زمین و آسمان کے برابر ہے تو اس وقت وہ کھجوریں کھا رہے تھے۔ یہ سُن کر بولے کہ "پھر دیر کس بات کی ہے" کھجوریں پھینکیں اور میدانِ کارزار میں لوٹ پڑے اور شہادت سے سرفراز ہوئے۔

چونکہ اس وقت تک ابوجہل کا حال معلوم نہ ہوا تھا اس لئے حضورؐ نے صحابہؓ کو اس کی تلاش کا حکم فرمایا کہ اسے لاشوں میں ڈھونڈو۔ وہ وہیں ملا اس حال میں کہ دم توڑ رہا تھا۔ اسے قتل کیا گیا۔ ابوجہل کے ذہن سے اس وقت بھی فرعونیت نہ گئی۔ اس نے قتل کے وقت اپنے قاتل کا نام پوچھا تاکہ اس کی قوم اس کا بدلہ لے سکے۔ اور کہا کہ میرا سر کندھوں کے پاس سے کاٹنا تاکہ ہر شخص سمجھ جائے کہ یہ بڑا سردار تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو جب سر پیش کیا گیا تو آپؐ نے فرمایا "یہ شخص اس امت کا فرعون اور عمارتِ کفر کی چوٹی تھا۔" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے ایک بڑا گڑھا کھودا گیا اور آپؐ نے حکم دیا کہ سب کفار کو اس میں ڈال دیا جائے۔ اس کی تعمیل ہوئی۔ ان کفار کو اس گڑھے میں ڈالنے کے تین دن بعد رات کے وقت حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے صحابہ کے ساتھ تشریف لائے اور گڑھے کے کنارے کھڑے ہو کر فرمایا۔ "اے گڑھے والو۔ تم قبیلہ قریش کے بدترین لوگ تھے۔ میں نے تم کو ایمان کی دعوت دی مگر تم نے جھٹلایا۔ اب تباہ ہو" اور آپؐ نے ان

کے نام سے انہیں خطاب فرمایا۔ پوچھا۔ "تم سے تمہارے رب نے وعدہ کیا تھا، تم نے اس وعدہ کو صحیح پالیا۔ کیونکہ مجھ سے جو میرے رب نے وعدہ کیا تھا، میں نے صحیح پایا۔" حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ حضورؐ! یہ تو مردہ ہیں۔ ان میں روح باقی نہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "میں تم سے جو کچھ کہہ رہا ہوں، وہ تمہارے مقابلہ میں اسے زیادہ سُن رہے ہیں لیکن فرق یہ ہے کہ وہ میری بات کا جواب نہیں دے سکتے۔"

جن لوگوں کو فدیہ لے کر چھوڑا گیا ان کے متعلق بھی استصواب رائے ہوا حضرت عمرؓ کی رائے ہوئی کہ ان کو قتل کر دیا جائے تاکہ مسلمانوں کا رعب اور اسلام کی برتری لوگوں کے دلوں میں بیٹھ جائے۔ صدیق اکبرؓ کی رائے تھی کہ ان سے فدیہ لے کر چھوڑ دیا جائے۔ چونکہ اکثر صحابہؓ کی رائے بھی یہی ہوئی، اس لئے فدیہ لے کر انہیں رہا کر دیا گیا۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت عمرؓ کی رائے کی موافقت میں آیت نازل فرمائی۔ دراصل ایسے تقریباً تیئس مواقع ہیں جہاں حضرت عمرؓ کی رائے کی موافقت میں آیات نازل ہوئیں۔ یہ بھی فراستِ نبوی کا ایک خصوصی حصّہ تھا جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ملا تھا۔

یہاں یہ بات پیشِ نظر رہے کہ ایسے تمام امور میں جن میں اللہ تعالیٰ کا حکم نازل نہ ہوتا، نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم صحابہؓ کو اجماع، فکر اور تدبّر فی القرآن کی تربیت دینا چاہتے تھے، ورنہ وہؐ اللہ کے نور سے اشیاء کو دیکھتے تھے۔

بدر میں اس کامیابی کا اثر، مدینہ اور گرد و نواح میں، بہت گہرا ہوا۔ گرد و نواح کے دشمن مسلمانوں سے خائف ہو گئے، بہت سے یہود اسلام لے آئے۔ انہیں میں عبداللہ بن ابی منافق تھا جو دل سے اسلام نہ لایا تھا اور مسلمانوں کی ان کامیابیوں کے باوجود یہود کی سازشوں، اسلام دشمنی اور مخالفت میں، ان کا شریک رہا۔

قریشِ مکہ پر اس کے اثرات کی نوعیت مختلف تھی ۔ وہاں عورتوں نے اپنے مقتولوں کا ایک ماہ تک سوگ منایا۔ ابولہب بدر کی داستان ابوسفیان سے سن کر ہوش و حواس کھو بیٹھا اور سات دن کے اندر چیچک کے مرض میں مبتلا ہو کر مر گیا۔ اس کی نعش بے گور و کفن پڑی رہی اور جب سڑنے لگی تو اسے ایک گڑھے میں لکڑی سے دھکیل کر دبا دیا گیا۔ قریش نے از سر نو مسلمانوں سے اس جنگ کا بدلہ لینے کی ٹھان لی ۔ عورتوں نے بھی اپنے سر کے بال کاٹ ڈالے لیکن نوحہ و بکا سے باز رہیں کہ مسلمان ان کی حالت دیکھ کر خوش نہ ہوں اور مذاق نہ اڑائیں ۔

اہلِ بدر کی فضیلت

اس سے بڑھ کر اور کیا ہو گی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالےٰ نے اہلِ بدر کو معاف کر دیا ہے اور ارشاد فرمایا ہے ۔

اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ فَقَدْ غَفَرْتُ لَکُمْ — اے اہلِ بدر تم جو چاہو کرو۔ میں نے تمہاری مغفرت فرما دی ہے ۔ یا یہ فرمایا:

فَقَدْ وَجَبَتْ لَکُمُ الْجَنَّۃُ — تمہارے لئے جنت واجب ہو گئی ۔

(محمد رسول اللہ صفحہ ۳۴۷)

اور جیسا حضرت حفصہؓ سے امام احمدؒ نے روایت کی ہے کہ حضورؐ نے فرمایا" مجھے امید ہے کہ جو شخص بدر یا حدیبیہ میں شریک ہوا وہ انشاء اللہ دوزخ میں

(حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی فراست اور عسکری حکمت عملی پر بریگیڈیر گلزار احمد کی کتاب "غزواتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ھجرت سے بدر تک" ایک اچھا تحقیقی مقالہ ہے ۔ اسی پر دوسرے غزوات کی حکمتِ عملی کا کچھ قیاس کیا جا سکتا ہے جو ہماری افواج کے لئے یقیناً سبق آموز ہوگا)

داخل نہ ہوگا۔"
آج بھی سترہ رمضان کی شب، اہلِ بدر کے واسطے، جو دعائیں مانگی جاتی ہیں، اللہ تعالیٰ اُن کو قبول فرماتا ہے۔ سبحان اللہ۔

○

حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کے سرایا اور غزدات کی تعداد بالعموم ۸۱ بتائی جاتی ہے جس میں ۲۷ غزوات تھے۔ بخاری شریف کے بموجب ان کی تعداد ۱۹ ہے اور بعض نے ۲۱ بتائی ہے لیکن بقول ابن قیم غزواتِ کبار صرف سات ہیں: بدر۔ احد۔ خندق۔ خیبر۔ فتح مکہ۔ حنین۔ تبوک۔ ان غزوات کا ذکر قرآن مجید میں اس طور پر ہے:۔
سورہ انفال میں "بدر"۔ سورہ آل عمران میں "احد"۔ احزاب میں "خندق" اور احوالِ بنی قریظہ۔ سورہ حشر میں بنی نضیر کا اجلاء۔ سورہ الفتح میں ذکر "حدیبیہ اور خیبر"۔ اور سورہ نصر میں فتح مکہ۔" (سیرت رسول اللہ)
یوں تو ہر غزوہ اور سریہ ہی حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کی حکمت عملی اور فراست کا ایک مظہر ہے اور آنے والی نسلوں کے لئے اہم عسکری نکات مضمر ہیں، لیکن ان میں بدر اور احد خاص طور سے بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ ہم نے بدر کا ذکر کسی قدر تفصیل سے کیا۔ آیئے اس غزوۂ احد پر بھی اسی انداز سے نظر ڈالیں۔ یہ غزوہ بھی بڑے عبرت آمیز اسباق کا حامل ہے۔ یہ بدر کے ایک سال بعد ۳ھ میں پیش آیا اور ایک دوسرے ہی پس منظر میں۔

غزوۂ احد

بدر میں ابوسفیان کا قافلہ بچ کر نکل گیا تھا اور مکہ میں دارالندوہ میں تقسیم

کے لئے ٹھہرا ہوا تھا۔ ابھی اس کا مال مالکوں کو نہیں دیا گیا تھا۔ یہ مشورہ ہوا کہ یہ جملہ سامان جنگ کی تیاری کے لئے صرف ہو تاکہ مسلمانوں سے بدر کے مقتولین کا بدلہ لیا جا سکے۔ اس کا راس المال پچاس ہزار دینار تھا اور فی دینار ایک دینار ہی نفع تھا۔ سب نے اس رائے سے اتفاق کیا۔ اور اب اسی سے جنگ کی تیاریاں شروع ہوئیں۔

بدر میں ابوعزہ، جو قبیلہ قریش کا مشہور ہجو گو شاعر تھا اور جسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بدر میں اس کے افلاس کے باعث بلا فدیہ چھوڑ دیا تھا، اُس نے حضورؐ کے اس احسان کا یہ بدلہ دیا کہ خود اور اپنے ایک رفیق شاعر کے ساتھ قبائل میں گشت کر کے پُرجوش انتقامیہ اور رجزیہ اشعار پڑھتا اور مخالفت کی آگ بھڑکاتا۔ اس طرح قریش نے انتقام کی تیاریاں کیں اور ساتھ ہی معزز سرداروں کی بیویوں کو جو بدر میں قتل ہوئے تھے، اُن کو ساتھ لیا تاکہ ان کی بدحواسی، دیوانگی اور نفرت لوگوں میں انتقام کی آگ اور شعلہ زن کرے۔

چنانچہ ابوسفیان کا قافلہ تین ہزار افراد پر مشتمل، مدینہ کی جانب روانہ ہوا۔ اس میں سات سو زرہ پوش، دو سو گھوڑے اور ستر عورتیں بھی تھیں، جن کے ساتھ ڈھول، گانے اور شراب کا سامان تھا۔ یہ لشکر[1] ۵ رشوال کو روانہ ہوا تھا جس کی اطلاع حضرت عباسؓ نے ایک خط کے ذریعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دی۔ آنحضرتؐ نے صحابہ کو یہ مشورہ دیا کہ وہ مدینہ میں ٹھہرے رہیں۔ اگر کفارِ مکہ مدینہ میں داخل ہوں تو ان سے جنگ کریں اور گھروں کے اوپر سے ان پر پتھر برسائیں، کیونکہ مسلمانوں نے مدینہ کے ہر

---

[1] اقتباس از سیرت رسول اللہؐ۔ نواب علی صاحب صفحہ ۲۳۴ و محمدؐ رسول اللہ صفحہ ۳۶۸۔

طرف اینٹوں کی دیواریں کھڑی کر کے اس کو قلعہ بنا دیا تھا۔ اکابر مہاجر اور انصار کی یہی رائے تھی، خود عبد اللہ بن ابی (منافق) نے بھی اسی رائے سے موافقت اپنے نقطۂ نظر سے بہتر سمجھی۔ لیکن وہ پُرجوش مسلمان جو جنگِ بدر میں شریک نہیں ہوئے تھے، انہوں نے اصرار کیا کہ یا رسول اللہ! ہمیں موقع دیجئے کہ ہم بھی اپنے دل کی تمنا پوری کریں۔ اور مقابلہ میدانِ جنگ میں ہو۔ یہ اس لئے بھی ضروری ہے تاکہ دشمن یہ نہ سمجھے کہ ہم بزدلی سے شہر کے باہر نہیں نکلے۔ حضرت حمزہ بن عبد المطلب نے بھی اس کی تائید فرمائی۔ چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم، ۱۴ شوال کو جمعہ کے دن، ایک ہزار کی جمعیت کے ساتھ مدینہ سے باہر نکلے۔ عبد اللہ بن ابی (منافق) اپنے تین سو ساتھیوں کے ساتھ یہ کہہ کر واپس چلا گیا کہ حضورؐ نے ہمارے مشورہ پر عمل نہیں کیا۔ اب آپؐ کی جماعت میں سات سو افراد تھے اور صرف دو گھوڑے تھے۔ حضورؐ نے مدینہ سے شمال و مغرب کے قریب وادیِ احد کے کوہستانی سلسلہ کے قریب قیام فرمایا اور احد پہاڑ کو پشت پر لے کر صف بندی کی۔ مشرق کی طرف کوہ عینین تھا جس میں ایک درّہ تھا۔ جدھر سے کفار گھس کر اندر آ سکتے تھے۔ اسی لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پچاس تیر انداز، عبد اللہ ابن جبیر کی ماتحتی میں، وہاں حفاظت کے لئے مقرر فرمائے، اور یہ حکم دیا کہ وہ آخر وقت تک وہاں ٹھہرے رہیں اور کسی حالت میں اپنی جگہ سے نہ ہٹیں، اور ثابت قدمی سے جمے رہیں، خواہ جنگ کا کچھ ہی نقشہ ہو۔

پہلا منظر

۱۵ شوال ۳ھ ہفتہ کے دن، سورج کے طلوع کے ساتھ میدانِ جنگ گرم ہوا تو کافروں کے خون کے فوّارے ہر جانب ریگستانی زمین کو لالہ زار بنا رہے

تھے۔ پہلے ابوعامر میدان میں نکلا، جو قدیم قبیلہ اوس کا سردار تھا اور اپنی زاہدانہ زندگی کے باعث راہب کے لقب سے موسوم تھا، وہ حضورؐ کی دشمنی کے باعث مدینہ سے نکل کر مکّہ میں جا بسا تھا، اور اُسے یقین تھا کہ جب اس کے قبیلہ اوس کے لوگ اُسے اہلِ مکّہ کے ساتھ دیکھیں گے تو اُس کے ساتھ ہو جائیں گے، لیکن انہوں نے اسے راہب کے بجائے فاسق کے نام سے پکارا اور کہا کہ ہم خوب جانتے ہیں کہ تُو کون ہے۔ پھر تیر اور پتھر کی بارش ہونے لگی۔ اہلِ مکّہ نے اپنی تعداد پر بھروسہ کر کے مسلمانوں پر شدید حملہ کیا۔ یہ بھی کوشش کی کہ پسِ پُشت درّہ سے داخل ہو جائیں لیکن تیر اندازوں نے اُن کے عزائم کو ناکامیاب بنا دیا۔ پھر قریش کا علمبردار طلحہ مبارز طلبی کرتا ہوا آگے بڑھا اور کہا کہ تم کہتے ہو کہ تمہاری تلواریں ہم کو دوزخ میں بھیجتی ہیں اور ہماری تلواریں تم کو بہشت میں۔ اب ہے کوئی جو میرا مقابل ہو۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے بڑھ کر اسے داخلِ جہنّم کیا۔ اب جنگِ عام شروع ہو گئی۔ تیر اور پتھروں کی بارش ہونا شروع ہوئی۔ اہلِ مکّہ اپنی تعداد پر بھروسہ کر کے نہایت شدّت سے حملہ آور ہوئے لیکن مسلمانوں کی تلواروں نے اِن کے خون سے میدانِ جنگ کو سُرخ بنا دیا اور حضرت سعد ابن وقاص اور عاصم بن ثابت نے تیروں سے اپنے جوہر دکھائے اور حضرت حمزہؓ، علیؓ اور زبیر رضی اللہ عنہم اپنی تلواروں سے دشمن کی صفیں الٹنے لگے۔

اُس وقت حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم نے اپنے دستِ مبارک میں تلوار لے کر فرمایا کہ کون ہے جو اس کا حق ادا کرے۔ اس کے خواہش مند سب ہی تھے، لیکن حضورؐ نے اپنی تلوار ابو دجانہؓ انصاری کو دی، جو عرب کے مشہور، با عزّت پہلوان تھے۔ ابو دجانہؓ بے خوف و خطر لشکرِ اعدا میں گھسے اور اس تیزی سے اور صفائی سے تیغ زنی شروع کی کہ لاشوں کے انبار لگا دیئے۔ قریش اپنے

عَلم کو گرنے نہیں دے رہے تھے، اب اُن کو یکے بعد دیگرے قتل ہوتے ہوئے
دیکھ کر بدحواس ہو رہے تھے۔ ان کے لشکر میں ابتری پھیل گئی اور فوج بھاگ
کھڑی ہوئی۔ اس وقت کچھ مسلمانوں نے مالِ غنیمت لوٹنا شروع کر دیا۔ جو لوگ
درہ پر جمع تھے وہ بھی ضبط نہ کر سکے اور سوائے دس آدمیوں کے، سب حضور
صلّی اللہ علیہ وسلّم کا فرمان بھول گئے۔ شیطان یوں ہی مومنوں کے قلوب میں
وسوسے ڈالتا ہے۔ عبداللہ ابن جبیر نے جو ان کے سردار تھے، اپنے ساتھیوں
کو سمجھانے اور روکنے کی کوشش کی لیکن انہوں نے کوئی توجہ نہ دی۔ آخر وہ ہوا
جس کا اندیشہ تھا۔

دوسرا منظر

خالد بن ولید جو اس وقت تک مسلمان نہ ہوئے تھے، بڑے موقع شناس
تھے۔ انہوں نے پشت سے حملہ کر دیا۔ دس تیرانداز ان کا مقابلہ کیا کرتے۔
لڑائی کا نقشہ بدل گیا۔ مسلمان تتر بتر ہونے لگے۔ سب عزم و استقلال اور
ثابت قدمی چند افراد کی نافرمانی کی نذر ہو گئی۔ اس حملہ میں سوائے چند اولوالعزم
صحابہ کے سب کے پیر اُکھڑ گئے۔ ثابت قدم رہنے والوں میں حضرت ابوبکرؓ
حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ، حضرت طلحہؓ جیسی ہستیاں رہ گئیں۔ اس میں ستر
صحابہؓ شہید ہوئے، جن میں حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کے چچا حضرت امیر حمزہ
رضی اللہ عنہ بھی داخل تھے اور حضرت جابرؓ کے والد حضرت عبداللہ بھی۔
اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَیْهِ رَاجِعُوْنَ ۔
اس افراتفری میں کسی کو کسی کا ہوش نہ رہا۔ بعض مدینہ کی جانب بھاگے،
بعض پتھروں کے پیچھے چھپ گئے۔ حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کے گرد جو حضرات
تھے۔ انہوں نے حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم پر اپنی جانیں قربان کیں۔ حضورؐ زخمی ہوئے۔

ابن قمیہ نے بڑھ کر فرقِ مبارک پر تلوار ماری جس کی وجہ سے مغفر کی دو کڑیاں کٹ کر چہرہ انور میں چبھ گئیں۔ ابن قمیہ نے نعرہ مارا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شہادت کا غل مچ گیا۔ دشمنوں کے لشکر میں ابن قمیہ کی دھوم مچ گئی۔ حضرت حمزہؓ کی نعش کی بے حرمتی کی گئی۔ ابوسفیان کی بیوی ہندہ، اپنے جوشِ انتقام میں، حضرت حمزہؓ کا جگر چبانے لگی۔ اور اسی پر اکتفا نہ کیا گیا بلکہ زنانِ قریش نے لاشوں کو مثلہ کر کے شہداء کے اعضا کے ہار بنا کر گلے میں ڈالے۔ غرض اس منظر میں، جو کچھ میدانِ کربلا میں ہوا اور جو کچھ فدائیانِ اسلام پر تا قیامت ہونے والا ہے، سب کا عکس موجود ہے۔

اس جنگ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو شدید اذیتوں سے دوچار ہونا پڑا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سر مبارک پر ایک پتھر اس زور سے آ کر لگا کہ آپؐ گر پڑے اور بے ہوش ہو گئے۔ حضرت علیؓ اور حضرت طلحہؓ نے ہاتھوں پر تھام کر سہارا دیا۔ آپؐ کے چار دندانِ مبارک شہید ہوئے۔ چہرہ مبارک زخمی ہوا۔ حضرت فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا کو خبر ہوئی تو آپ نے زخم دھوئے۔ حضرت علیؓ پانی ڈالتے۔ حضرت فاطمہؓ نے چٹائی کے ٹکڑے جلا کر اس کی راکھ زخموں میں بھری، تب خون بند ہوا۔

ابوسفیان نے حضورؐ اور ان کے رفقاء کے نام لے کر پکارا۔ حضورؐ نے ان کو جواب دینے سے منع فرمایا۔ ابوسفیان جواب نہ پا کر یہی سمجھا کہ سب چل بسے، لیکن حضرت عمرؓ سے ضبط نہ ہوا اور فرمایا کہ تیرا سر کچلنے کو ہم سب باقی ہیں۔ ابوسفیان یہ کہہ کر روانہ ہوا کہ اب پھر بدر ہی میں تم سے اگلے سال نبٹیں گے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو حکم فرمایا کہ کافروں کا تعاقب کریں اور دیکھیں کہ گھوڑوں پر سوار اونٹ ساتھ لئے جاتے ہیں یا اونٹوں پر سوار ہو کر گھوڑے ساتھ جا رہے ہیں۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہوا کہ

لوگ اونٹوں پر سوار ہیں تو آپؐ نے سمجھ لیا کہ اُن کا رُخ مکّہ کی طرف ہے، مدینہ کی جانب نہیں۔ پھر پہاڑ سے اُتر کر شہداء کی تدفین فرمائی اور فرمایا کہ لاشوں کو ایک جگہ رکھو پھر شہادت کی بشارت دی۔

یہ بات بھی واضح رہے کہ چھیالیس سال بعد، حضرت معاویہؓ کے زمانہ میں سیلن کی وجہ سے شہداء کی قبریں کھودی گئیں کہ نعشوں کو مدینہ منورہ میں منتقل کیا جائے گا، تو سب کے بدن اسی طرح شگفتہ تھے اور چھونے سے تازہ خون جاری ہو جاتا۔

حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم جب مدینہ واپس آئے تو سب صحابہؓ کے گھروں میں جا کر تعزیت فرمائی۔ پھر اپنی تلوار ذوالفقار کھول کر اپنی بیٹی فاطمہؓ کو دی اور فرمایا کہ اس کو صاف کر کے رکھو، اس نے خوب جوہر دکھلائے۔

اس طرح یہ جنگ احد کے پہلے مرحلہ میں حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کے وہ صفات زیادہ نمایاں تھے جو مدنی زندگی کا جوہر تھے۔ یعنی فراستِ نبوی، جذبۂ شہادت۔ اور پھر چند لوگوں کی نادانی کے باعث آپؐ کو دوسری کیفیت میں سے گذرنا پڑا، اور آپؐ نے اپنے مکّی دَور کے صفاتِ اربعہ سے کام لے کر شکست کو نا اُمیدی میں بدلنے نہ دیا۔

○

ہم نے ان دونوں غزوات کا ذکر کسی قدر تفصیل سے اس لئے کیا کہ یہ بات واضح ہو جائے کہ اتباعِ رسول ہی میں مومن کی نجات ہے۔ جب وہ اللہ اور اس کے رسولؐ پر بھروسہ کرتا ہے تو وہ محتاجِ اسباب نہیں رہتا۔ لیکن جب اس کی نظر اپنے اسباب کی فراوانی پر پڑتی ہے اور خصوصاً جب وہ حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کے فرمان پر عمل چھوڑ دیتا ہے، تو جیتی بازی ہار جاتا ہے۔ مکّہ میں حضور

صلی اللہ علیہ وسلم کا باطن مدینہ تھا اور ظاہر مکہ۔ مدینہ میں آپؐ کا باطن مکہ رہا اور ظاہر مدینہ۔ خوب سمجھ لو کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ظاہر و باطن میں فرق نہیں۔

یہ بھی واضح رہے

خُلق کے پہلو اُحد میں بھی اسی قدر نمایاں رہے جیسے مکہ میں تھے

خود زخم کھائے

تو زبانِ مبارک پر یہی آیا۔ رَبِّ اغْفِرْ قَوْمِی فَاِنَّھُمْ لَا یَعْلَمُوْن ٥

(اے خدا میری قوم کو بخش دے۔ وہ جانتے نہیں)

پھر

جب تیروں کی بارش جاری تھی تب بھی حسرت کے ساتھ فرمایا

"وہ قوم کیا فلاح پا سکتی ہے جو اپنے پیغمبر کو زخمی کرتی ہے"

دعائے مغفرت پر ربِّ ذوالجلال نے

ناپسندیدگی کا اظہار فرمایا۔ اور یہ آیت اتری لَیْسَ لَکَ مِنَ الْاَمْرِ شَیْءٌ

(اے حبیبؐ) آپ کو اس معاملہ میں اب کچھ اختیار نہیں)

(سیرۃ النبی صفحہ ۳۵۶)

غزوہ احزاب (خندق)

یہود کی سازشوں کا سلسلہ کبھی ختم نہ ہوا۔ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مدینہ میں داخل ہونے کے بعد سے آج تک اسی انداز سے جاری ہے جب بھی ان سے معاہدہ کیا گیا انہوں نے اسے پسِ پشت ڈال دیا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ میں داخل ہونے کے بعد ہی سے سب سے پہلے مدینہ کی تمام قوموں سے معاہدہ کیا تھا۔ لیکن یہود نے کبھی کسی معاہدہ کا پاس نہ کیا۔ مسلمان جب بدر کی جنگ پر گئے تو مدینہ میں انہوں نے

مسلمان عورتوں کو چھیڑنا شروع کیا اور ایک مسلمان کو قتل بھی کیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بدر سے واپسی پر باز پرس کی تو بغاوت پر اتر آتے۔ حضورؐ نے انہیں حکم دیا کہ مدینہ چھوڑ کر خیبر میں جا کر آباد ہوں۔ پھر اس جلاء بنو نضیر کے بعد انہوں نے اہلِ مکہ سے سازشیں کیں۔ حضورؐ اس کی اطلاع پاکر، خود ان کے محلہ میں گئے اور دیوار کے نیچے بیٹھ کر ان سے باتیں کیں۔ اس موقع سے بھی یہود نے فائدہ اٹھا کر چاہا کہ حضورؐ پر ایک پتھر دیوار کے اوپر سے پھینک کر آپؐ کو ہلاک کیا جاتے (نعوذ باللہ)۔ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو باخبر فرما دیا اور آپؐ وہاں سے ہٹ گئے۔

۵ھ میں انہوں نے پھر مسلمانوں کا قلع قمع کرنے کی سازشیں گویا از سرِ نو شروع کیں اور متفقہ کوشش کی کہ تمام قبائل مجتمع ہو کر مسلمانوں پر حملہ کریں۔ اور اس کے لئے بیس سردار مقرر کئے کہ جا کر قبائل کو اس کے لئے تیار کریں۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دس ہزار کی خونخوار جماعت مدینہ پر حملہ آور ہوئی۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سلمان فارسی کی رائے سے اتفاق فرماتے ہوئے مدینہ کے گرد خندق کھودنے کا حکم دیا۔ اصحاب خندق کھودنے کے فن سے واقف نہ تھے لیکن بقول حضرت مولانا عاشق الٰہی، "اخلاص سب کچھ کروا دیتا ہے"۔ اب ایک طرف جنگ تھی اور دوسری طرف گویا مسلمان خود محصور تھے اور مدینہ کے اندر یہود کی سازشوں کی گرم بازاری تھی۔ انہوں نے ہر مدد سے انکار کی ٹھان لی تھی۔ لیکن یہاں بھی اللہ کے حبیبؐ کا اللہ پر بھروسہ اور آپؐ کے صحابہ کی آپؐ کی ذاتِ عالیہ سے محبت وہ سب کچھ کروا رہی تھی، جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم چاہتے۔ خندق کے کھودنے کے وقت ایک چٹان ایسی آئی کہ صحابہؓ کی ہمت ٹوٹ گئی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بنفسِ نفیس کدال ہاتھ میں لے کر ایک ضرب ایسی ماری کہ وہ پاش پاش

ہو گئی حق یہ ہے کہ بقول کشفی صاحب "حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کی ہر اہم گھڑی ایک مستقل معجزہ ہے"۔

یہی وہ مواقع ہیں جہاں فراستِ نبوی اور ایمان کی تجلیات سے وہ نتائج ظہور پذیر ہوتے ہیں جن کا اندازہ بھی نہیں کیا جا سکتا۔ ہر قبیلہ مسلمانوں کے خون کا پیاسا، زمانۂ دراز کی عداوت دلوں میں لئے ہوئے، جوشِ انتقام سے سرشار، اور ادھر منافقوں کی بد طینتی اور حیلہ سازی۔ ادھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا صبر اور استقامت، اور صحابہؓ کا جذبہ فدائیت۔ جنگ شروع ہوتی ہے۔ ایک مقام پر خندق کو تنگ پا کر عمرو بن عبدِ وُدّ جو قریش کا ایک مشہور پہلوان اور ہزار دں لوگوں پر بھاری سمجھا جاتا تھا، اپنے چند جوانوں کے ساتھ خندق عبور کر آیا اور مقابلہ کا خواہاں ہوا۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی تلوار سے قتل ہوا۔ تیروں کی بارش شروع ہوئی۔ پتھروں اور تیروں سے ان کا مقابلہ کیا گیا۔ مسلمانوں کو قبیلہ بنی قریظہ سے امید تھی کہ وہ اپنے معاہدہ پر قائم رہیں گے لیکن انہوں نے بھی قطعی انکار کیا۔ یہ محاصرہ تقریباً ایک ماہ قائم رہا۔ ادھر سختی سے تیروں کا زور مخالفین کی طرف سے تھا، حضورؐ نے مختلف حصوں پر اصحاب کے دستے متعین فرما دیئے تھے، یہاں ذراسی لغزش بھی خطرناک ثابت ہو سکتی تھی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی فراست، عزم و استقلال کے بے شمار نمونے اسی ایک غزوہ میں نظر آئے۔ آخر اللہ رب العزت کی مدد شامل ہوئی۔ خود بنی قریظہ کی جانب سے جو ناامیدیاں ہوئیں ان کا تدارک حکمتِ عملی نے کیا۔ اب آسمانی تازیانہ یہ پڑا کہ تیز و تند ہوائیں چلنا شروع ہو گئیں۔ یہاں تک کہ خیموں کی طنابیں اُکھڑ گئیں اور رسیاں ٹوٹ گئیں۔ گھوڑے بھاگنے لگے۔ کفار کی فوج کی ہمت ٹوٹ گئی۔ آخر ابوسفیان نے واپسی کا فیصلہ کیا اور صبح ہوتے ہی وہ میدان جہاں دس ہزار کی فوج پڑی تھی، ایک

بیابان نظر آنے لگا۔ آخر ایک ماہ کی جنگ میں چھ مسلمان شہید ہوئے اور تین سو کفار قتل ہوئے، جو حضورؐ کی فراست اور حکمتِ عملی کا بیّن ثبوت ہے۔

اس جنگ میں کفار نے ہزاروں دینار کی پیش کش کے عوض اپنے سردار عمرو بن عبدِ وُد کی لاش طلب کی۔ حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا "تم اسے یوں ہی لے جاؤ، ہم مُردے کی قیمت نہیں کھاتے۔"

اس جنگ کے دوران کا واقعہ ہے جس کا ذکر صفیہ بنت عبدالمطلب نے فرمایا۔ آپ فرماتی ہیں کہ جب ہم سبھوں کے ساتھ قلعہ میں تھے اور حسّان بن ثابت ہماری نگرانی کے لئے وہاں موجود تھے، کہ ایک یہودی کسی صورت سے قلعہ کے قریب آگیا اور قلعہ کے چاروں طرف گھوم رہا تھا۔ حسان بن ثابت نے تو اس کے مقابلہ سے گریز کیا اور کہا کہ میں تو صرف شعر کہنا جانتا ہوں لیکن حضرت صفیہؓ ایک لوہے کی سلاخ لے کر قلعہ سے اتریں اور اس کا کام تمام کر دیا۔

حضرت سعد بن معاذؓ جو اس جنگ میں زخمی ہوئے تھے، ان کی زبان پر یہ دعا تھی۔ "اے خدا! مجھے اس وقت تک موت نہ دینا جب تک بنو قریظہ کے بارے میں میری آنکھیں ٹھنڈی نہ ہوں۔"

بنی قریظہ

اللہ تعالیٰ نے سعدؓ کی یہ دعا سُن لی۔ بنی قریظہ کا معاہدہ ان کی سازشوں کے باعث ٹوٹ چکا تھا۔ حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم غزوہ احزاب (خندق) سے واپسی پر ہتھیار کھول کر غسل فرما رہے تھے کہ حضرت جبرئیلؑ تشریف لائے اور فرمایا کہ حق تعالیٰ کا حکم ہے کہ فوراً بنی قریظہ پر چڑھائی کیجئے اور ان کے مسئلہ سے فارغ ہو کر پھر غسل فرمایئے۔ چنانچہ آپ نے اسی وقت لشکر جمع فرمایا اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے ہاتھ میں عَلَم دے کر، اور شیخین یعنی صدیق اکبرؓ اور عمر فاروقؓ کو دائیں

بائیں لے کر بنو قریظہ کی جانب روانہ ہو گئے اور حکم دیا کہ مسلمان عصر کی نماز بنی قریظہ پہنچ کر ادا کریں۔ حضرت سعدؓ کو جب اس غزوہ کا علم ہوا تو باوجود زخم سے خون جاری ہونے کے، آپ بھی سواری پر ساتھ ہوئے۔

بنی قریظہ کا محاصرہ کیا گیا اور یہ محاصرہ تقریباً ایک ماہ رہا۔ لیکن محاصرہ کا یہ رعب و دبدبہ تھا کہ ایک صبح بنی قریظہ نے فیصلہ کیا کہ ہم کو حضرت سعدؓ بن معاذ کا فیصلہ قبول ہے۔ یہ سمجھ کر کہ سعدؓ اور ان کا قبیلہ اوس جو بنی قریظہ کا حلیف تھا اُن کی رعایت کریں گے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی درخواست منظور فرمائی۔ یہ ہے مشیت ایزدی، یہ ہے فراستِ نبوی کہ انہوں نے اسے اپنے حق میں بہتر جانا اور اپنا فیصلہ حضورؐ پر چھوڑنے کے بجائے، سعد کو اپنا حکم تسلیم کیا۔ سعد بن معاذ نے اپنا فیصلہ اُنہیں کی کتاب توریت سے یوں صادر فرمایا[1]:۔

۱:۔ بنو قریظہ کے جنگجو مرد قتل کئے جائیں۔ ۲۔ عورتیں اور بچے مملوک بنائے جائیں۔ ۳۔ مال تقسیم کیا جائے۔ اسی پر عمل ہوا۔ وہ یہ نہ سمجھے کہ اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر فیصلہ چھوڑا گیا ہوتا تو زیادہ سے زیادہ انہیں وہی سزا دی جاتی جو بنو نضیر کو دی گئی تھی۔ لیکن اللہ تعالیٰ کو یوں ہی منظور تھا کہ سعدؓ کی آرزو پوری کی جائے اور یہود کا زور توڑا جائے۔ چنانچہ حضور نے سعدؓ سے فرمایا: قَضَیْتَ بِحُکْمِ اللہِ۔ تو نے اللہ کے حکم کے مطابق فیصلہ کیا[2]۔

اِن غزوات و سرایا، بالخصوص آخر الذکر غزوہ احزاب اور بنو نضیر اور بنی قریظہ سے جہاد کے بعد مدینہ منورہ میں یہود کی مرکزی حیثیت باقی

۱؎ سیرت النبی، شبلی صفحہ ۴۰۵

۲؎ سیرت رسول اللہ، پروفیسر نواب علی، صفحہ ۲۸۵

نہ رہی اور وہ اپنی قوت سے محروم ہو گئے۔ ادھر منافقین کی تعداد بھی کم ہونا شروع ہوئی کیونکہ وہ اپنی آنکھوں سے اسلام کا عروج دیکھ رہے تھے اور ہر بار انہیں انتہائی ذلت کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ اس طرح اب مدینہ منورہ بجائے مرکزِ ظلم و ستم کے ایک عظیم الشان دینی اور دنیوی اقتدار کا مرکز بن گیا تھا۔ اور وہ دن دور نظر نہ آتا تھا کہ سرزمینِ عرب فراستِ نبوی کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دے گی۔

حدیبیہ ۶ھ

بہر حال، چھوٹے چھوٹے غزوات و سرایا کا سلسلہ جاری رہا۔ یہاں تک کہ ایک اہم واقعہ حدیبیہ کا ۶ھ میں پیش آیا۔ حدیبیہ مکہ معظمہ کے قریب ایک کنویں کا نام تھا۔ اس کنویں کے قریب ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ اب یہ ایک بستی ہے اور حرم سے قریب ہے۔ یہ واقعہ یوں پیش آیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خواب میں دیکھا کہ آپؐ اور آپؐ کے صحابہؓ بحالتِ امن، اپنے سروں کو منڈاتے اور بال کتراتے ہوئے بیت اللہ شریف میں داخل ہو رہے ہیں۔ اس بناء پر آپؐ نے ماہ ذیقعد ۶ھ میں عمرے کا قصد فرمایا۔ آپؐ کا ارادہ جنگ کا نہ تھا۔ سات سو مجاہدین آپؐ کے ساتھ تھے۔ اور ان کے قربانی کے جانوروں کی تعداد بھی اسی حساب سے ستر اونٹ یا گائیں تھیں۔ آپؐ کے عمرے کے ارادہ سے باخبر ہو کر کچھ مسلمان بھی ساتھ ہو لئے۔ ان کی تعداد بھی چھ سو سے زائد نہ ہو گی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف حفاظتی ہتھیار ساتھ لئے جن کی سفر میں ضرورت پڑ سکتی تھی۔ تلواریں نیام میں

۱۔ سیرت رسول اللہ۔ علامہ نور بخش صفحہ ۱۲۵

تھیں۔ قریش کو جب حضورؐ کی روانگی کی اطلاع ملی تو فوراً جنگ کی تیاریاں شروع کر دیں۔ اور خالد بن ولید کا ہراول دستہ دو سو سواروں پر مشتمل، روانہ ہوا۔ لیکن حضورؐ دشوار گذار راستوں سے ہوتے ہوئے مقام حدیبیہ پہنچ گئے۔ راستہ میں ایک مقام پر آپؐ کی اونٹنی قصویٰ بیٹھ گئی۔ آپؐ نے اس کا رُک جانا خدا کے حکم کے تحت قرار دیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جب وہاں قیام کا حکم فرمایا تو وہاں پانی نہ تھا۔ یہاں آپؐ کا یہ معجزہ بھی اہلِ ایمان نے دیکھا کہ جب آپؐ کے سامنے ایک لوٹا پانی کا پیش کیا گیا اور یہ کہا گیا کہ بس ہمارے پاس اتنا ہی پانی ہے، تو آپؐ نے اپنا دستِ مبارک لوٹے میں ڈال دیا اور اور پانی آپؐ کی انگلیوں سے معجزانہ طور پر اُبلنے لگا جیسے چشمہ سے اُبلتا ہے۔ یہاں تک کہ سارے قافلہ نے پانی پیا اور جانوروں کو پلایا اور وضو کیا۔ اس کے بعد آپؐ نے اپنے ترکش سے ایک تیر نکال کر ایک صحابی کو دیا کہ خشک کنویں میں گاڑ دیں۔ اس کے ڈالنے کے ساتھ ہی اس میں سے پانی اُبل پڑا۔ اور اسلامی لشکر نے حُدیبیہ میں با اطمینان قیام کیا۔ آپؐ کو اس وقت بدیل بن ورقاء نے آکر اطلاع دی کہ عرب قبائل نواحِ حُدیبیہ میں جمع ہو رہے ہیں، اور بلا جنگ کے مکّہ میں آپؐ کا داخلہ ممکن نہ ہوگا۔ آپؐ فرمائیں کہ آپؐ کا منشا کیا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا کہ ہم لوگ جنگ کی غرض سے نہیں بلکہ عمرے کی نیّت سے آئے ہیں۔ قریش پر افسوس ہے کہ مجھ سے جنگ پر آمادہ ہیں۔ پورا عرب ہی مجھ سے جنگ کے لئے بدحواس ہے۔ قریش چاہیں تو میری پناہ و امان میں داخل ہو کر، دوسروں سے مصالحت کر لیں۔ آپؐ نے مزید فرمایا کہ میں دھمکیوں سے ڈرنے والا نہیں، میں اللہ کا پیغام پہونچا رہا ہوں اور پہونچاتا رہوں گا، اور کوئی طاقت مجھے روک نہ سکے گی۔

جب حضورؐ وہاں اطمینان سے ٹھہر گئے تو بدیل بن ورقاء پھر اپنے قبیلہ خزاعہ کے چند لوگوں کے ساتھ آیا اور آپؐ سے آپؐ کی تشریف آوری کا سبب دریافت کیا۔ آپؐ نے اُسے پھر اطمینان دلایا کہ میرا یہ سفر صرف عمرے کی غرض سے ہے۔ یہ لوگ قریش کے پاس واپس گئے اور کہا کہ تم محمدؐ کے متعلق جلدبازی سے کام لے رہے ہو۔ لیکن قریش نے بدیل بن ورقاء کی گفتگو سُنی اور اُس کا مشورہ نہ مانا۔ اسی طرح دوسرے لوگ جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس مصالحت کے خیال سے آتے اور اُن کی نظریں صحابہؓ کی اس جماعت پر پڑتیں جس کی مثال انہوں نے کبھی نہ دیکھی تھی تو وہ بھی حیران رہ جاتے چنانچہ جب عروہ بن مسعود، جو اپنی قوم میں بڑی عزت و مرتبہ کا حامل تھا، حضورؐ کے پاس پہنچا اور بے تکلفانہ انداز سے گفتگو شروع کی تو اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ کے جذبۂ ادب وعظمت کا جو اثر ہوا وہ اس کے الفاظ سے ظاہر ہے: "اے قوم! واللہ میں بڑے بڑے بادشاہوں کے درباروں میں وفد لے گیا ہوں، قیصر، کسریٰ، نجاشی کے درباروں میں گیا ہوں، اُن کی حالت دیکھی ہے۔ لیکن میں نے جو رنگ و انداز محمدؐ کے ساتھیوں کا دیکھا، وہ کہیں نظر نہ آیا۔ میں نے دیکھا کہ محمدؐ کے مُنہ کا تھوک بھی زمین پر گرنے نہیں دیتے۔ وہ آپؐ کے وضو کا پانی بھی آپس میں تقسیم کرنے میں مسابقت کرتے ہیں۔ اگر کسی کو ایک قطرہ بھی نصیب نہیں ہوتا تو دوسرے کے نم ہاتھوں کو چھُو کر اپنے منہ اور آنکھوں پر مل لیتا ہے۔ اس تابعدار جماعت کی حالت یہ ہے کہ وہ محمدؐ کے سامنے بلند آواز سے بھی بات نہیں کرتے اور جب بھی آپؐ کی زبان سے حکم صادر ہوتا تو فوراً اس کی تعمیل میں لگ جاتے۔ ایسی قوم تمہارے روکے نہیں رک سکتی۔"

(اقتباس از محمد رسول اللہ صفحہ ۴۹۶)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اہلِ مکہ کے مقصد کا اندازہ ہوا تو آپؐ نے حضرت عثمانؓ

کو سفیر کے طور پر قریش کے پاس بھیجا۔ مگر قریش نے ان کو نظر بند کر لیا اور یوں مشہور ہو گیا کہ آپ قتل ہو گئے۔ اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک درخت کے نیچے بیٹھ کر بیعت الرضوان لی کہ اب عثمانؓ کے خون کا قصاص لازم ہو گیا۔ صحابہ نے جوش و خروش کے ساتھ بیعت کی۔

قریش نے مشہور مقرر سہیل بن عمرو کو، جسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگِ بدر میں رہا کر دیا تھا، اپنا سفیر بنا کر حضورؐ کے پاس بھیجا۔ اس نے حسب ذیل شرطیں پیش کیں۔ جو کسی طرح بھی بظاہر مسلمانوں کے قابلِ قبول نہ ہو سکتی تھیں۔

۱۔ اس سال مسلمان واپس جائیں۔ وہ مکہ میں داخل نہیں ہوں گے۔ ہاں آئندہ سال زیارت کر سکتے ہیں، بشرطیکہ صرف تین دن سے زیادہ قیام نہ کریں، صرف ایک تلوار ساتھ لائیں جو غلاف میں ہو۔

۲۔ لڑائی دس سال تک موقوف رہے۔ دوست دشمن آپس میں مل سکتے ہیں لیکن اگر قریش بلا اذن مدینہ چلا جائے تو واپس کر دیا جائے گا، مگر جو شخص مدینہ سے مکہ چلا آئے وہ واپس نہ ہو گا۔

۳۔ عرب کے جس قبیلہ کا جی چاہے، بلا روک ٹوک معاہدہ کر سکتا ہے۔ خواہ قریش سے ہو یا محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے۔ (از تاریخ اسلام صفحہ ۲۴۶)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی فراستِ نبوی نے اس میں کیا دیکھا کہ قبول کیا، اس کا اندازہ آنے والے وقت سے ہوا، لیکن صحابہؓ کے لئے یہ شرائط بڑی صبر آزما تھیں اور دلوں پر شاق گذر رہی تھیں۔

معاہدہ کی کتابت شروع ہوئی۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے بسم اللہ الرحمن الرحیم لکھا۔ سہیل نے کہا کہ میں نہیں جانتا کہ رحمٰن کون ہے۔ وہی باسمك اللّٰهمّ لکھو۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے چشم پوشی فرمائی اور کہا یہی لکھ دو۔ اس کے بعد حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے لکھا کہ یہ صلح نامہ محمد ﷺ رسول اللہ اور سہیل کے درمیان

ان شرائط کے ساتھ طے ہوا ہے۔ سہیل نے پھر کہا کہ اگر ہم آپ کو اللہ کا رسول مان لیں تو پھر جھگڑا ہی کیا ہے۔ اس لئے یہاں محمدؐ بن عبداللہ لکھا جائے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے اپنے جذبۂ ایمانی کے تحت اس کو مٹانا گوارا نہ کیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اسے مٹا دیا اور یہ قضیہ بھی طے ہوا۔

صلح نامہ تحریر ہوا عین اس وقت سہیل بن عمرو کے لڑکے ابوجندلؓ، جو اسلام قبول کرنے کے باعث، پابزنجیر تھے اور سخت اذیتیں اٹھا رہے تھے، آپؐ کے سامنے آئے۔ بے رحم باپ نے ابوجندلؓ کے منہ پر زور کا تھپڑ مارا اور حضورؐ سے کہا کہ اسے مجھے واپس دیجئے۔ یہی معاہدہ ہے۔ حضورؐ نے ابوجندلؓ سے کہا کہ صبر کرو۔ اللہ تم کو اور دوسرے کمزور مسلمانوں کو جو مکہ میں رہ گئے ہیں، ہر مصیبت سے نجات دے گا۔ ہم معاہدہ کی بدعہدی نہیں کر سکتے۔

قریش خوش ہوئے کہ مسلمان اس سال عمرہ نہ کر سکیں گے اور صحابہ کے دلوں پر سخت صدمہ گزرا کہ اس قدر دب کر کیوں صلح کی گئی لیکن جب زبانِ مبارکؐ سے یہ سنا کہ "ہم اللہ کے حکم کے بندے ہیں، اپنے حکم سے کچھ نہیں کرتے"۔ تو سب نے سر تسلیم خم کر دیا، چنانچہ ھدی کے جانور ذبح ہوئے، بال کٹوائے یا منڈوائے گئے، احرام کھلا، اور حدیبیہ میں بیس دن قیام کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ واپس آئے۔

یہی وہ صلح ہے جسے قرآنِ حکیم نے "فتح مبین" سے تعبیر کیا اور مسلمانوں کو اپنی تبلیغی جدوجہد سے، جو کامیابی اب تک نہ ہوئی تھی، اس سے کہیں زیادہ وہ اِس صلح نامہ کے بعد وہ فیض یاب ہوئے۔ یہ فراستِ نبوی کی اعلیٰ ترین مثال ہے اور صبر و شکر کا عظیم ترین مقام۔ اصحابؓ کے قلوب پر ان شرائط پر تکدرِ خاطر بھی انؓ کی حضورؐ کی محبت اور اسلام کی عظمت پر شاہد ہے اور پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کے تحت سرِ تسلیم خم رکھنا، ان کا شیوہ راضی برضا

کا اعلیٰ مرقع ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ

اس صلح نامہ کے بعد مکہ اور مدینہ کے درمیان آمدورفت کا سلسلہ شروع ہونے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاص، صحابہؓ کی بے مثال محبت و فدائیت، اور اسلام کی جاذبیت اور کشش، سے قریش جس قدر اس دور میں متاثر ہوئے، اس سے پہلے انہیں اس کا موقع نہ ملا تھا۔

اس صلح نامہ کے مضمرات اور اس کے ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بے پناہ تبلیغی مساعی اور اصلاح معاشرہ کا بیان ایک الگ عنوان کے تحت پیش کیا جا رہا ہے، تاکہ ہم سمجھ سکیں کہ کس طرح اللہ رب العزت نے اپنے نبیٔ برحقؐ کے ہاتھوں، ایک مختصر مدت میں، دینِ حق کی حقانیت کو تمام ادیان پر غالب فرما دیا۔

فیضانِ نبوّت

غزوات تو صرف سرورِ کائناتؐ کی حیاتِ مبارکہ کا ایک پہلو ہیں جو خود منشاءِ تبلیغ نہ تھے بلکہ تبلیغی مساعی کو جاری رکھنے، مسلمانوں کی حفاظت، دشمنوں کی سازشوں سے بچنے، ان کی نخوت و گھمنڈ کا سر توڑنے کا طریقۂ کار تھے، اور ان کا مقصد دُنیا پر یہ حقیقت آشکارا کرنا تھا کہ مسلمان کی زندگی اس کی اپنی نہیں، اللہ کی ہوتی ہے۔ وہ اُسی کے لئے جیتا اُسی کے لئے مرتا ہے۔ لیکن نبوّت کا اصل کام احکامِ الٰہی کو عام کرنا، ایک ایسے معاشرہ کو تشکیل دینا ہوتا ہے جو صحتِ عقیدہ، حسنِ معاشرہ کے ساتھ تہذیبِ نفس پر مبنی ہو۔ تزکیہ نفس و

تصفیہ باطن جس کے پیش نظر ہو۔اس کی زندگی کا ہر پہلو توحید باری تعالےٰ کا ایک عملی نمونہ رہے۔ یعنی حضورؐ کی حیاتِ مبارکہ ہی میں انفرادی اور اجتماعی زندگی کے ہر شعبہ کے لئے ایسے قوانین وضوابط طریقہ کار کے ساتھ، ایک ایسی تنظیم وجود میں آجائے جو ہر زمانہ میں، ہر فکری رجحان اور عملی بے راہ روی کا مقابلہ یقین اور ایمان کے ساتھ کر سکے۔ اور یہ سب کام اس دس سال میں انجام پذیر ہونا تھا۔

وحیِ الٰہی کا سلسلہ جاری ہے۔ قلب رسول خود انوارِ الٰہی کا مرکز اور منبع علم وحکم ہے اور اس مختصر دور میں مومنین کی ایک مختصر جماعت کو اس علم وحکم کے ہر پہلو سے مزیّن کرنا ہے۔ آیئے! انتہائی اختصار کے ساتھ ان تجلیاتِ نبوّت کے دائم وقائم انوار پر ایک نظر ڈالیں جو زندگی کے مختلف شعبوں سے وابستہ ہیں۔ ان تبلیغی مساعی میں اوّلیت علم کو تھی، جس کا بیان شروع ہی میں ہوا۔ یہاں اس کا ذکر ایک دوسرے پہلو سے ضروری ہے۔ یعنی "یُزَکِّیْہِمْ وَیُعَلِّمُہُمُ الْکِتَابَ وَالْحِکْمَۃَ" کی تشریح۔

غزوات ہی کو لیجیے!۔

ان تمام غزوات کے باوجود، جب کسی قبیلہ کے لوگ مسلمان ہوتے اور ان کی ہدایت کے لئے معلّمین کی ایک جماعت ان کے ساتھ کی جاتی۔ بارہا ایسا ہوا کہ ان معلّمین کو ظالمانہ انداز سے شہید کیا گیا۔ لیکن نہ مسلمانوں کے حوصلے پست ہوئے، نہ حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کے عزم میں فرق آیا، نہ یہ سلسلہ بند کیا گیا۔ حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کی صحبتِ مبارکہ نے ہر مومن کو ایک مینارِ نور بنا دیا تھا، جو اپنے اخلاق، عادات واطوار میں حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کا تابع ہوتا، اور اسی بدر کامل سے پائی ہوئی تجلیات کو عام کرنے میں سرتاپا مشغول رہتا۔ چنانچہ صلح نامہ کے بعد، جب اہلِ مکّہ حضورؐ کے شہر مدینہ

ہیں بلے تکلّف آنے لگے اور اِن صحابہ کرامؓ کی زندگی۔ تعلّقات، معاشرات، معاملات، محبّت، اخوّت اور حضورؐ پر فدائیت، کے جلوے دیکھتے تو انتہائی متاثر ہو کر جاتے۔ اور یہی وجہ ہے کہ جس تیزی سے اسلام صلح حدیبیہ کے بعد پھیلا، اس سے قبل کبھی نہ پھیلا تھا۔ اور یہ سب جلوہ تھا اُسی نورِ مُبین صلّی اللہ علیہ وسلّم کا جس نے زندگی کے ہر پہلو کو اخلاق کے سانچے میں ڈھال دیا تھا حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم جو خود صفاتِ الٰہی کے ترجمان تھے اور مومن آپؐ کے صفاتِ مبارکہ کے شیدائی۔

سوچیئے! جہاں قرآن اور صاحبِ قرآن، جہاں "نور" و "کتابِ مُبین" کا سنگم ہو، اور کلامِ ربّانی نورِ مُبینؐ کی زبانِ اقدس سے جاری ہو، تو اس کے انوار اور اثرات کا کیا بیان ہو۔ زبانِ پُر انوار سے جو نکلتا ہو گا اس کی شیرینی، حلاوت کو تو ہر رُوح اپنے میں جذب کرنے کے لئے بےتاب ہوتی ہو گی۔ اور پھر اس کے احکام پر عمل پیرا ہو کر جو ثمرات اِن بزرگ ہستیوں کو میسّر آتے ہوں گے، اور جو حمد ان کی زبان پر جذبۂ شکر گذاری سے جاری ہوتی ہو گی، اُس کی اثر پذیری کو تحریر میں کیسے لایا جا سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ زبانِ اقدسؐ سے جو نکلا وہ دلوں میں اُتر گیا۔ پھر آیاتِ ربّانی سے چہرۂ انورؐ پر جو کیفیات نمایاں ہوتیں، وہی کیفیات ان صحابہؓ میں پیدا ہوتیں۔ اس طرح وہ علم و عرفان جو برسہا برس میں کسی طرح عام نہ ہو سکتا تھا، وہ لمحوں میں مومنینؓ کی سیرت کا جزو بن رہا تھا۔ اور یہ سرمایۂ علم و عرفان صرف مسلمانوں کے لئے نہیں بلکہ اس کے دریچے ہر اس شخص کے لئے کھلے ہوئے تھے جو آپ صلّی اللہ علیہ وسلّم سے فیض کا طالب ہوتا کہ آپ صلّی اللہ علیہ وسلّم رحمت للعالمین مسلمانوں ہی کے لئے نہیں بلکہ کافۃ للنّاس ہونے کے باعث جمیع مخلوق کے لئے بھی ہیں، اور یہی آپ صلّی اللہ علیہ وسلّم کی وہ صفتِ خصوصی ہے جو آج تک

جاری وساری ہے۔

نبوت ورسالت کے اس فیضانِ عام کے ساتھ اب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ مبارکہ کے چند گوشوں کو اُجاگر کرنے کی سعادت حاصل کی جارہی ہے۔

اسلام میں صحتِ عقیدہ کے بعد سب سے اہم چیز اصلاحِ معاشرہ ہے۔ اور اصلاحِ معاشرہ میں سب سے اہم مقام عورت ہی کو حاصل ہے چنانچہ قرآن حکیم کی ترتیلی ترتیب میں بھی سورہ البقرا ور آلِ عمران کے بعد سورۃُ النساء ہی آتی ہے تاکہ ازدواجی زندگی میں عورتوں کا مقام، معاشرہ میں ان کی قدر، ان کے فرائض وحقوق کے حدود کا تعیّن ہو جائے، اور اللہ ربّ العزت کی ایک لطیف مخلوق فیضانِ نبوت سے محروم نہ رہے۔

اور

تبلیغی مراحل میں بھی ان کا کردار، ان کی اہمیت، فروغِ دین کی ضامن ہو۔ ہم اسی اہمیت کے تحت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے شعبۂ حیات کے اسی گوشہ سے صلح حدیبیہ کے بعد کے تبلیغی مراحل کا آغاز کرتے ہیں۔

ازواجِ مطہرات رضؓ

مردوں کی زندگی کے لئے تو حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی مجاہدانہ زندگی تھی، لیکن بہت سے مسائل ایسے ہوتے ہیں جن کا تعلق اس لطیف جنس سے ہے جسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے شیشے سے تعبیر فرمایا۔ ضروری تھا کہ ان کی تعلیم وتربیت، ان کے متعلق مسائل، معاشرہ میں ان کی اہمیت کے پیشِ نظر انہیں کی ہم جنسوں کے ذریعہ ہو۔ اور یہ کام صرف ازواجِ مطہرات رضؓ ہی فرما سکتی ہیں، جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سب سے زیادہ قریب تھیں، آپؐ کے اقوال

اعمال و انوار کی عینی شاہد ہیں۔

حضرت خدیجہؓ

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پچیس (۲۵) سال کی عمر میں ایک بیوہ خاتون حضرت خدیجہؓ سے شادی کی، جن کی عمر اس وقت چالیس (۴۰) سال کی تھی، جس کا ذکر مکی زندگی میں آچکا ہے، جنؓ کی تعریف میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جب لوگوں نے میری تکذیب کی تو انہوںؓ نے میری تصدیق کی۔ جب وہ لوگ کافر تھے وہؓ اسلام لائیں۔ جب میرا کوئی معاون نہ تھا انہوں نے میری مدد کی۔ جب لوگوں نے مجھے کسب مال سے روکے رکھا تو انہوںؓ نے اپنے مال میں مجھے شریک کیا۔ انہوںؓ نے (بجز حضرت ابراہیمؓ) میری سب اولاد جنی۔" گویا حضرت خدیجہ کبریٰؓ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تسکین و تعاون کے لئے، اور باقی ازواجؓ امت کی تعلیم و تربیت کے لئے ایک عطیہ ربانی تھیں۔

حضرت سودہؓ

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دوسری شادی، حضرت خدیجہؓ کے انتقال کے بعد اسی سال ۱۰ نبوی میں حضرت سودہؓ سے ہوئی چار سو درہم مہر قرار پایا۔ اور اسی سال آپؐ کی شادی ماہِ شوال میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ، کی صاحبزادی حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے ہوئی جب کہ ان کی عمر صرف چھ سال چھ ماہ کی تھی۔ یہاں حضورؐ کی حیاتِ مبارکہ کے دونوں پہلو فرائضِ دنیا و دین نمایاں ہیں۔ حضرت سودہؓ سے نکاح، وہ بھی پچاس سال کی عمر میں، اس لئے تھا کہ بچوں کی دیکھ بھال ہو سکے تبلیغی مساعی میں بشریت کے پہلو حارج نہ ہوں کیونکہ اس وقت حضرت فاطمہؓ اور حضرت کلثومؓ کی خبر گیری کرنے والا

کوئی نہ تھا۔

حضرت عائشہ صدیقہؓ

سے نکاح ان کی کم عمری میں، بحکم ربانی ہوا کہ شریعتِ مطہرہ کی تشریح ایک ذہین، کم عمر خاتون ہی کر سکتی ہے اگر اس کی تربیت بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نظرِ التفات کے تحت ہو۔ اور اللہ رب العزت نے اس مقصد کی تکمیل کے لئے حضرت عائشہ صدیقہؓ کو سرفرازی بخشی۔ چنانچہ حضرت عائشہ صدیقہؓ ہی کے ذریعہ عورتوں میں فروغِ اسلام کے ساتھ اُن سے متعلق مسائل کی فہم عام ہوئی۔ آپ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مدینہ میں ابتداء ہی سے ساتھ رہیں اور علم و حکمت کی وہ توانائی حاصل کی جس کا اجرا آپ کی ذاتِ مبارکہ سے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے ۴۷ سال تک ہوتا رہا۔ آپ سے ۲۲۱۰ حدیثیں مروی ہیں۔ ہر چند نسبی فضیلت تو حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کو حاصل تھی کہ آپ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی چہیتی صاحبزادی تھیں اور یہ بھی کہ آپؓ سیدنا امام حسن و امام حسین علیہما السلام کی والدہ ماجدہ تھیں۔ لیکن کمالاتِ علم و تبلیغِ دین کے لحاظ سے حضرت عائشہ صدیقہؓ کا اسمِ گرامی سرِ فہرست ہے۔

حضرت صدیقہؓ کو یہ فخر بھی ہمیشہ حاصل رہا کہ خود جبرئیل علیہ السلام حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تشریف لائے اور حضرت عائشہ صدیقہؓ سے شادی سے قبل آپؓ کی شبیہ مبارکہ حضورؐ کو دکھائی۔ اور شادی کے بعد ایسا بھی ہوا کہ آپؓ حضورؐ کے ساتھ ایک ہی لحاف یا کمبل میں ہوتیں اور نزولِ وحی ہوتی۔ آپ ہی کی آغوش اور سینے کا تکیہ تھا جب حضورؐ کا وصال ہوا۔ آپؓ

۱؎ تاریخ اسلام صفحہ ۹۵

ہی کا حجرہ تھا جو آپؐ کی آرام گاہ بنا۔ اور وقت رخصت حضورؐ وہی مسواک فرما رہے تھے جو حضرت عائشہ صدیقہؓ نے خود چبا کر پیش کی تھی۔ یہ بات خود حضرت عائشہ صدیقہؓ کے لئے انتہائی اعزاز و کرم و محبّت کا اظہار ہے سبحان اللہ! اس عظمت کا تصوّر ہی کون کرسکتا ہے۔ خوش نصیب ہے امّت جسے ایسی مائیں اللہ کے حکم سے ملیں، اسے قیامت میں کیا خوف کیا ڈر ہو سکتا ہے، شرط ایمان ہے۔

حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم نے ارشاد فرمایا کہ مردوں میں بہت سے کامل گذرے ہیں، لیکن عورتوں میں مریمؑ بنت عمران (حضرت عیسٰیؑ کی والدہ) اور آسیہ بنت مزاحم (فرعون کی بی بی) کے سوا اور کوئی کامل پیدا ہی نہیں ہوئی۔ اور عائشہؓ کو ان عورتوں پر اس طرح فضیلت ہے جس طرح ثرید کو کھانے پر (یعنی سب سے زیادہ اور کہیں زیادہ)

حضرت عائشہ صدیقہؓ کا نکاح تو مکّہ مکرّمہ میں ہوا تھا لیکن مدینہ منوّرہ آپؓ کی عظمت، فضیلت، علم و عرفان کی جلوہ گاہ بنا۔ مدینہ منوّرہ میں حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم نے جو شادیاں فرمائیں ان کا مقصد کہیں فیضانِ رحمت سے قبائل کو قریب کرنا، کہیں دردمند دلوں کی دلجوئی فرمانا تھا۔

حضرت حفصہؓ

حضرت عائشہؓ کی شادی کے بعد آپؐ نے حضرت عمرؓ کی صاحبزادی حضرت حفصہؓ سے عقد کیا۔ واقعہ یہ ہوا کہ حضرت حفصہؓ کے پہلے شوہر کا انتقال ہوگیا تو حضرت عمرؓ نے حضرت ابوبکر صدیقؓ سے اپنی بیٹی کے عقد کے متعلق کہا۔ انہوں نے انکار کیا۔ پھر حضرت عثمانؓ کو پیش کش کی مگر انہوں نے بھی توجّہ نہ دی۔ ان دونوں کا انکار حضرت عمرؓ پر شاق گذرا تو آپؓ نے رسول اللہؐ

سے ذکر فرمایا۔ آپؐ نے یوں دلجوئی فرمائی "اللہ تعالیٰ نے حضرت عثمانؓ کو تمہاری بیٹی سے بہتر بیوی عطا فرما دی اور تمہاری بیٹی کو حضرت عثمانؓ سے بہتر شوہر عطا فرما دیا" اس طرح حضرت عثمانؓ نے حضرت ام کلثومؓ سے شادی کر لی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حفصہؓ سے شادی فرمائی۔ اس وقت ان کی عمر ۲۰ سال کی تھی۔ یہ واقعہ ۳ھ کا ہے۔

حضرت حفصہؓ سے شادی محض دلجوئی کے علاوہ بارگاہِ رسالت سے خود حضرت عمر فاروقؓ کی قدر دانی کا جذبہ لئے ہوئے ہے۔

حضرت جویریہؓ

ان شادیوں میں وہ محترم خواتین بھی شامل ہیں جو جنگ میں قید ہو کر آئیں لیکن وہ سردارانِ قوم کی لڑکیاں تھیں۔ ان میں غزوہ احزاب (۵ھ) میں جو لوگ گرفتار ہو کر آئے اِن میں حضرت جویریہؓ بھی تھیں، جو حارث بن ابی ضرار کی بیٹی تھیں، اور اسیرانِ جنگ لونڈی غلام بنا کر تقسیم کر دیئے گئے۔ حضرت جویریہؓ حضرت ثابتؓ بن قیس کے حصہ میں آئیں۔ جویریہ کی شرافت کے پیشِ نظر آپؐ نے حضرت ثابتؓ سے فرمایا کہ ان سے فدیہ لے کر ان کو چھوڑ دو۔ پھر آنحضرت نے اِن کا فدیہ ادا فرمایا۔ سیرت نگار یہ بھی لکھتے ہیں کہ جویریہؓ کے والد حارث نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ میری بیٹی کنیز بن کر نہیں رہ سکتی۔ آپؐ اسے آزاد کریں۔ آپ نے جواب دیا کہ یہ معاملہ جویریہؓ ہی پر چھوڑ دو۔ انہوں نے جواب دیا کہ میں رسول اللہؐ کی خدمت میں رہنا پسند کرتی ہوں۔ اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آپؓ سے شادی کر لی۔ یہ شادیاں دلجوئی کے ساتھ قبائل کو قریب لانے اور ان میں جذبۂ قدر دانی پیدا کرنے میں یقیناً معاون بنیں اور ان کے دوررس

نتائج اسلام کے لئے بہت مفید ہوئے۔

حضرت زینبؓ بنتِ جحش اسدیہ

اسے دلجوئی کہئے یا ایک رسمِ قبیح کی اصلاح کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی پھوپھی زاد بہن، جو خود بھی حسن و جمال میں ممتاز تھیں، ان کی شادی اپنے منہ بولے بیٹے زیدؓ سے کر دی۔ دراصل آپؐ کا یہ اندازِ شفقت محض اُنؓ کے والد حارث کی دلجوئی کے لئے تھا۔ زیدؓ کو غلامی سے آزادی بھی حضورؐ نے عطا فرمائی تھی۔ اس شادی کا منشاء یہ تھا کہ غلام اور آزاد کا یہ فرق بھی مٹ جائے۔ لیکن زیدؓ بہر حال غلامی کا داغ لئے ہوئے تھے اور انؓ کے مزاج اور حضرت زینبؓ کے مزاج میں بڑا فرق تھا۔ زیدؓ اس نعمتِ عظمٰی کی قدر نہ کر سکے۔ حضورؐ سے انہوں نے شکایت کی۔ آپؐ نے سمجھانے کی کوشش کی لیکن کامیابی نہ ہوئی اور زیدؓ نے طلاق دے دی۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بہ فرمانِ الٰہی انؓ سے نکاح فرمایا۔

اس واقعہ کا قرآنِ حکیم میں سورہ احزاب میں ذکر آیا ہے۔ دراصل اللہ تعالیٰ کو یہی منظور تھا کہ یہ رسمِ قبیح مٹا دی جائے کہ منہ بولے بیٹے کی بی بی سے نکاح جائز نہیں۔ حضرت زینب کو فخر تھا کہ ان کا نکاح زمین پر نہیں اللہ تعالیٰ نے آسمان پر حضورؐ سے کر دیا جس کی تعمیل زمین پر ہوئی۔ اب زیدؓ بن محمدؐ، زیدؓ بن حارث ہی کہلائے گئے۔ یہی فرمانِ ربانی تھا کہ لے پالکوں کو ان کے باپ کے نام سے پکارو۔

حضرت زینبؓ اپنے آپ کو حضرت عائشہ صدیقہؓ کا ہمسر اور مدِمقابل خیال کرتی تھیں۔ حضرت زینبؓ انتہائی سچ بولنے والی صلۂ رحمی کی پابند اور متبحر خاتون تھیں۔ چنانچہ جب حضرت عائشہ صدیقہؓ پر منافقین

نے تہمت لگائی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ سے پوچھا تو آپ نے فرمایا "مجھے عائشہؓ کی بھلائی کے علاوہ اور کسی چیز کا علم نہیں۔"

حضرت امّ سلمہؓ

حضرت امّ سلمہؓ بنت ابی امیہّ کا نام ہند اور کنیت امّ سلمہ تھی۔ امّ سلمہؓ کی شادی پہلے اُن کے چچازاد بھائی ابوسلمہ (عبداللہ) سے ہوئی تھی۔ امّ سلمہؓ اور ابوسلمہؓ دونوں بہت پہلے اسلام میں داخل ہو چکے تھے۔ دونوں نے حبشہ کی طرف ہجرت کی تھی پھر مدینہ آئے۔ بلکہ امّ سلمہؓ پہلی خاتون ہیں جو مدینہ آئیں۔ ابوسلمہؓ بدر و اُحد غزوات میں شریک ہوئے۔ پھر ایک سریہ پر گئے تو زخم پھوٹ آئے اور ۴ھ میں وفات پائی۔ امّ سلمہؓ حمل سے تھیں۔ وضعِ حمل کے بعد حضرت ابوبکرؓ نے انؓ سے درخواست کی۔ انہوںؓ نے انکار کیا۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پیغام بھیجا۔ انہوں نے فرمایا کہ میں ایک غیوّر عورت ہوں، صاحب عیال ہوں، میرا دنیا میں کوئی نہیں جو میرا نکاح کر دے، میری عمر بھی زیادہ ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سب زحمتوں کو گوارا فرمایا اور انؓ کی تسلی فرمائی اور نکاح ہو گیا[1]۔ آپؓ ہی وہ خاتون ہیں جو صلحِ حدیبیہ میں حضور کے ساتھ تھیں۔ اور آپؓ کے غمزدہ دل کے لئے اُن کی فراست معاون ہوئی۔ یہ واقعہ ہوا کہ حدیبیہ کے صلح نامہ سے صحابہ کرامؓ کو تکدر تھا، اور احرام اتارنے میں پس و پیش تھا۔ حضرت امّ سلمہؓ نے حضورؐ سے فرمایا کہ آپؐ تردّد نہ فرمائیں، خود احرام اتاریں، حلق فرمائیں۔ یہ محبت کے بندے آپؐ کا اتباع یقیناً کریں گے۔ چنانچہ یہی ہوا۔

---

[1] سیرت النبی جلد دوم صفحہ ۳۸۱

اُمِّ حبیبہ رض

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج رض میں حضرت اُمِّ حبیبہ رض بھی تھیں جو ابوسفیان کی بیٹی تھیں جو اس وقت تک مسلمان نہیں ہوئے تھے۔ پہلے ان کا نکاح عبیداللہ بنت جحش سے ہوا تھا۔ دونوں نے اسلام لاکر حبشہ ہجرت کی تھی۔ عبیداللہ عیسائی ہوکر حبشہ میں رہ گیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ام حبیبہ رض کی حالت دغربت کے مدِ نظر نجاشی کی معرفت نکاح کا پیغام بھیجا۔ اور ۷ھ میں نکاح ہوگیا۔

حضرت زینب رض بنت خزیمہ

اس کے علاوہ، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات رض میں حضرت زینب رض بنت خزیمہ ہلالیہ تھیں۔ وہ رض مساکین کو کثرت سے کھانا کھلانے کی شائق تھیں اور اُمّ المساکین کی کنیت کے ساتھ مشہور تھیں۔ وہ عبداللہ بن جحش کی بیوہ تھیں جو جنگِ اُحد میں شہید ہوئے۔ حضور سے نکاح کے دو ہی تین ماہ بعد وفات پائی۔

آنحضرت کی زندگی میں حضرت خدیجہ رض کے بعد یہی ایک بی بی تھیں جنہوں نے وفات پائی، حضور نے نمازِ جنازہ پڑھی اور وہ جنّت البقیع میں مدفون ہوئیں۔ (سیرت النبی جلد دوم صفحہ ۳۸۰)

حضرت میمونہ رض، حضرت صفیہ رض

حضرت میمونہ رض بنتِ حارث ہلالیہ اور حضرت صفیہ رض اسرائیلیہ بھی آپ کی ازواجِ مطہرات میں شامل ہیں۔ صفیہ ان کا اصل نام تھا۔ زرقانی نے لکھا ہے کہ عرب کا قاعدہ تھا کہ مالِ غنیمت کا جو بہترین حصہ امام

یا بادشاہ کے لئے مخصوص ہو جاتا اُسے صفیہ کہتے اور چونکہ وہ رضی جنگِ خیبر میں اسی طریقہ کے موافق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح میں آئیں، اس لئے ان رضی کا نام صفیہ[1] مشہور ہو گیا۔ (سیرت النبی جلد دوم صفحہ ۳۸۷)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم اُن سے نہایت محبت فرماتے اور اُن رضی کی دلجوئی فرماتے۔ مشہور ہے کہ ایک بار آپ رضی غمگین ہوئیں کہ دیگر ازواج بالخصوص حضرت عائشہ رضی اور حضرت زینب رضی اپنے آپ کو ان سے افضل کہتی ہیں۔ حضور نے اُن سے فرمایا کہ تم یہ کیوں نہیں کہتیں: کہ "ہارون ع میرے باپ، موسیٰ ع میرے چچا اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) میرے شوہر ہیں۔ اس لئے تم لوگ مجھ سے کیونکر افضل ہو سکتی ہو"

حضرت صفیہ رضی کی وفات ۵۰ھ میں ہوئی اور جنت البقیع میں دفن ہوئیں۔ (سیرت النبی جلد دوم صفحہ ۳۸۸)

اس طرح

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواجِ مطہرات کی تعداد گیارہ ہے، یعنی چھ قبیلۂ قریش کی (یعنی حضرت خدیجہ رضی، حضرت عائشہ صدیقہ رضی، حضرت حفصہ رضی، حضرت ام حبیبہ رضی، حضرت اُم سلمہ رضی اور حضرت سودہ رضی) اور چار غیر قریش سے (حضرت زینب رضی بنت جحش اسدیہ، میمونہ رضی بنت حارث، حضرت زینب رضی بنت خزیمہ اور حضرت جویریہ رضی) اور ایک حضرت صفیہ رضی غیر عربیہ جو بنی اسرائیل سے تھیں۔

○

ہم نے ازواجِ مطہرات کا ذکر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے تبلیغی مراحل

---

[1] مؤلف "محمد رسول اللہ" نے لکھا ہے کہ آپ رضی کا نام زینب تھا حضور نے صفیہ نام دیا (محمد رسول اللہ صفحہ ۲۷۵)

سے قبل کیا ہے۔ اس لئے کہ یہ شادیاں بھی ظلمتِ کفر کو دُور کرنے اور نور و نورانیت سے معاشرہ کو اجاگر کرنے کی اہم کڑی ہیں۔ اس بات کو ذہن نشین کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ان ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن کے رشتۂ زوجیت سے منسلک ہونے کے علل و اسباب پر ایک اجمالی نظر ڈالی جائے۔

اس دور میں جزیرۂ عرب ہی میں نہیں بلکہ دنیا کے ہر خطہ میں سب سے زیادہ مظلوم طبقہ عورت ہی کا تھا۔ عربوں میں جنگوں کا سلسلہ جاری تھا، جہاں مردوں کے قتل کے بعد عورتوں اور بچوں کو لونڈی غلام بنا لیا جاتا، اور ہر طرح کی سختی اور ظلم ان پر روا رکھا جاتا۔ یہ بات حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں بھی تھی، لیکن چونکہ اس کا خاتمہ اس وقت ممکن نہ تھا اس لئے انہوںؑ نے اسے جائز قرار دے دیا تھا۔ عیسائیت نے شادی کی اہمیت ہی کو نظر انداز کر دیا تھا جس کی وجہ سے معاشرے میں بے شمار بُرائیاں پیدا ہوئیں۔ جہاں عورت ہی کا کوئی مقام نہ ہو وہاں بیوہ اور مجبور عورت کا پرسانِ حال کون ہوسکتا تھا۔ چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پیشِ نظر ایک نہایت اہم کام عورت کی عزت و احترام کو قائم رکھنا تھا، اور اُن کے حقوق و فرائض کا تعین کرنا تھا۔ تاکہ وہ خود بھی معاشرے میں ایک باعزت زندگی گزار سکیں اور اُن کی گود کی پرورش پائی ہوئی اولاد احترامِ انسانیت کا سبق سیکھے۔

یہی وجہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مکی زندگی میں دو امور پر خصوصی توجہ فرمائی یعنی غلاموں کی آزادی اور عورتوں کی عزت و احترام۔ چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جو بھی شادیاں فرمائیں ان میں سوائے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے سب بیوہ خواتین تھیں، جن کے شوہر جہاد میں شریک ہوئے تھے اور جن رضی اللہ عنہن کا نگرانِ حال کوئی نہ تھا۔ اور یہ شادیاں بھی محض

شادیاں نہیں بلکہ اس مقصد کے تحت تھیں، کہ اُن کے ذریعہ معاشرے میں عورتوں کے متعلق احکاماتِ الٰہی، معاملات، اور پاکیزہ روایات عام ہوں۔ ساتھ ہی لوگ عورت کی قدر کرنا سیکھیں۔ اُن کے حقوق کا پاس اور اُن کی نگہداشت اپنا فرضِ اوّلین خیال کریں۔

یہاں یہ بات بھی پیشِ نظر رہے کہ جن بیوہ خواتین سے حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم نے شادی کی اُن رضؓ میں سے ہر ایک کو حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کی اس محبت وشفقت کا پورا پورا احساس ہوا جو انہیں رضؓ کبھی اپنے پہلے شوہر سے نصیب نہ ہوئی تھی۔ ان شادیوں کا ایک فائدہ یہ بھی ہوا کہ جس قبیلہ سے اُن رضؓ کا تعلق ہوتا اُس سے تعلقات بہتر ہوتے، اور اپنے قبیلے کے بچّوں اور عورتوں کے لئے ایک نمونہ، ایک معلّمہ ثابت ہوتیں۔

البتہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی وہ شخصیت تھی جس نے سوائے اپنے والد ماجد کے کسی مرد کی خوشبو بھی نہ سونگھی تھی۔ حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم سے اُن رضؓ کا نکاح بحکمِ الٰہی حضرت عائشہ رضؓ کی کم عمری میں ہوا جبکہ وہ صرف چھ سال کی تھیں، اور خوب واضح رہے کہ حکمِ الٰہی بڑی اہم مصلحتوں کا حامل ہوتا ہے۔ اس کم عمری میں حضرت عائشہ صدیقہ رضؓ کا حضورؐ کے ساتھ رشتۂ زوجیت میں منسلک ہونے کی بڑی غایت یہ تھی کہ حضرت عائشہ رضؓ کی تربیت مکمل طور پر حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کی نظرِ التفات کے تحت ہو۔ اور انہیں رضؓ حضورؐ کی توجہ، اندازِ فکر وعمل سے پوری طور سے آگاہی رہے، جس کی ضرورت امّتِ مسلمہ کو خود حضورؐ کی حیاتِ مبارکہ اور اس سے زیادہ آپؐ کے وصال کے بعد ہوگی۔

چنانچہ اپنے بچپن سے لے کر حضورؐ کے وصال تک کوئی بات بالخصوص عورتوں سے متعلق ایسی نہ تھی جس کا حضرتِ صدیقہ رضؓ کو علم نہ ہو۔ یہی وجہ ہے

کہ آپؓ نے حضورؐ کے وصال کے بعد ۴۶ یا ۴۷ سال تک عورتوں کی تعلیم و تربیت کی خدمت انجام دی، یا یوں کہیے کہ آپؓ نے انہیں درسِ حدیث دیا، کیونکہ حضرت عائشہؓ سے دو ہزار سے زائد احادیثِ مبارکہ مروی ہیں۔

مخفی نہ رہے کہ انہیں ازواجِ مطہراتؓ کے ذریعہ مرد و زن کے تعلقات کے نمونے پیش ہوئے۔ غلط فہمیوں کے ازالہ کی راہیں متعین کی گئیں، مجبور اور طلاق یافتہ عورتوں کے لئے بہتر زندگی کے طریقوں کا تعین ہوا۔ ان سب کی آپس کی کمزوریوں سے، مثلاً بغض، حسد وغیرہ سے انہیں آگاہی کا درس ملا۔ استغناء کی لذت سے شناسائی نصیب ہوئی، اور آج بھی ہمیں انہیںؓ کی زبان سے وہ جملہ احادیث پہنچی ہیں جو ہماری ازدواجی اور معاشرتی زندگی میں راہنما ہیں۔ انہیں میں بیاہ کے طریقے، صلۂ محبت و دلجوئی کی تلقین۔ ورثہ میں عورتوں کے حقوق۔ اور بالآخر اگر جدائی ضروری ہو تو اس کے طریقے جو قرآن نے امت کے لئے کھولے، ان کی تفسیر بھی انہیں مبارک ہستیوںؓ کی زبانِ مبارک سے ملی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواجِ مطہراتؓ ایک تہائی قرآن کی ترجمان ہیں اور وہؓ خود آیتِ تطہیر سے سرفراز ہیں۔ سبحان اللہ۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ ہمارا آدھا علم فقہ انہیںؓ کا عطیہ ہے۔

ہم نے یہاں تفصیل سے ان واقعات کا ذکر نہیں کیا جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی ازدواجی زندگی میں پیش آئے۔ اس لئے کہ یہ ازواج نورِ مبین صلی اللہ علیہ وسلم کی تجلیات کے ظاہر و باطن کے وہ سرچشمہ ہیں جن کا ذکر قرآنِ حکیم میں بڑی فضیلتوں کے ساتھ آتا ہے، اور ان ازواجِ مطہراتؓ کی اس رفاقت، صداقت، محبت پہ اللہ رب العزت کے عظیم وعدے ہیں۔ قرآنِ حکیم میں سورۂ محمد و سورۂ فتح کے بعد الحجرات کا بیان خود انؓ کی

عظمت پر شاہد ہے۔ وہؓ ہماری مائیں ہیں۔ ہمارے لئے یہ کیا کم خوش نصیبی ہے کہ انؓ کو ہماری ماں فرما کر انؓ کی عظمت، وقار، و محبت کو ہمارا سرمایۂ ایمان بنا دیا۔ الحمد للہ

یہی نہیں

بلکہ وہ معاشرہ جہاں بیٹی کو زندہ دفن کر دیا جاتا تھا، وہاں ان بیٹیوں کا وجود ایسا پُرنور بنا یا کہ جب عثمانِ غنی رضی اللہ عنہ کے گھر گئیں تو وہؓ ذوالنورین کہلائے، اور وہ چہیتی بیٹیؓ جو حضورؐ کی آنکھوں کی ٹھنڈک تھیں اُنؓ کا لقب

خاتونِ جنّت ہوا۔

اور آج بھی جو کچھ عورتوں کو مشرق و مغرب میں حقوق ملے ہیں وہ بھی صدقہ ہے انہیں تعلیماتِ اسلامی کا جس کی اوّلین تفسیر خود ازواجِ مطہراتؓ اور آپ کی صاحبزادیاں ہیں۔

○

ہم نے حضورؐ کے غزوات کے

بعد ازواجِ مطہراتؓ کا ذکر کیا کہ یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے تبلیغی مراحل کی ایک اہم کڑی تھی۔ اور اب ہم پھر حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کے اُن مقاصدِ بعثت کی طرف آپ کی توجہ مبذول کر رہے ہیں، جو تکمیلِ دین اور فروغِ اسلام کا موجب ہوئے۔

اُن کی اہم کڑیاں ہیں:

۱۔ حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کے روزانہ کے معمولات جس میں صحابہ کرامؓ اور اہل البیت والاطہارؓ شمولیت فرماتے اور جو عام مسلمانوں کے لئے رہتی دنیا تک روشن چراغ ہیں۔

۲۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ وفود جو آپؐ نے عرب اور عرب کے باہر بھیجے۔
۳۔ فتحِ خیبر اور سریۂ موتہ۔
۴۔ فتحِ مکہ۔
۵۔ آزمائشیں اور تکمیلِ دین۔
۶۔ خطبہ حجۃ الوداع۔
۷۔ شمسِ نبوت جو غروب ہونے کے لئے طلوع ہی نہ ہوا تھا۔

و

فیضانِ رسالت کی ضیا باریاں

ا۔ تربیتِ صحابہ کرام رضؓ

رسالت کا مقصد ہی توحید کے انوار کو عام کرنا تھا۔ کہیں معاہدہ سے کہیں غزوات سے اسی مقصد کے لئے راہ ہموار کرنا تھا اور کہیں قلوب کو انوارِ توحید کی ضیا باریوں سے جگمگانا تھا۔ گویا غیروں کو اپنانا اور اپنوں کو سنوارنا تھا یہی کارِ رسالت تھا۔ آپ نے دیکھا کہ ایک طرف جانثار مسلمانوں کی مختصر جماعت اپنی بقا اور تحفظ میں سرگرم عمل ہے۔ میدانِ کارزار میں شہادتیں بھی ہوتی ہیں اور لوگ زخمی بھی ہوتے ہیں، تیمار داروں کی دیکھ بھال بھی ہوتی ہے، اور شہداء کے گھر والوں سے تعزیت اور ان کی دلجوئی کا سلسلہ بھی جاری ہے۔ لیکن ہر حال میں وہ ایمان پرور مناظر یعنی نمازِ پنجگانہ ذوق و شوق لگن اور اخلاص سے جاری ہے۔ میدانِ جنگ میں مجاہدوں کی ایک صف کفار کے خلاف نبرد آزما ہے اور دوسری صف سجدہ میں اپنے معبود سے مصروفِ کلام۔

یہ سلسلہ مومنوں کے قلوب کو نورِ ایمان سے منور کرنے اور رکھنے کے لئے نصف رات کے بعد ہی شروع ہو جاتا۔ ابھی صبح صادق نہیں ہوئی لیکن سرورِ کائنات ؐ اور ان کے اہلِ بیت، صحابہؓ کرام، مومنین و مومنات نمازِ تہجد میں مشغول ہیں۔ بارگاہِ ربّ العزت میں سربسجود، گوشۂ چشم سے آنسو جاری، تسبیح و تہلیل میں مصروف ہیں کہ صبح صادق ہو جاتی ہے۔ اور مدینۂ منورہ کی فضائیں اللہ اکبر کی صداؤں سے گونج اٹھتی ہیں۔ گویا اذان کے ساتھ ہی روحِ بلالی نے قلوب میں ایک نئی زندگی پیدا کر دی، ان مسلمانوں نے مسجد کا رُخ کیا، صفیں قائم ہوئیں۔ جہاں مقتدی صحابہ کرامؓ ہوں اور پیشوا اور امام خود

سرورِ کائنات صلّی اللہ علیہ وسلّم ہوں اس نمازِ باجماعت کی پُرانوار کیفیات کا بیان کیسے ہو۔ یہ عبادت بھی تھی، تربیتِ قلب وروح بھی اور اسلامی زندگی کی مجموعی وفاداریوں کی آئینہ دار بھی۔

نمازِ فجر، مغرب اور عشاء میں تلاوت بالجہر ہوتی، صبح کی نماز جس میں بالخصوص اسرارِ حضوری کھلتے ہیں، حضورؐ بڑی بڑی سورتیں تلاوت فرماتے، کبھی سورۂ بقر شروع ہوتی جو تقریباً ڈھائی پاروں پر مشتمل ہے، صحابہؓ کا خیال ہوتا کہ شاید اب حضورؐ رکوع فرمائیں گے، لیکن لذّتِ کلام میں محو نبیؐ سورۂ آلِ عمران شروع کر دیتا ہے۔ یہ اصحابؓ ہیں جن کی زبان عربی ہے اور قرآنی تعلیمات جن کی رگوں میں لہو بن کر دوڑ رہی ہیں، اور امام وُہ ہیں جن کے سینۂ اقدس پر ان آیات کا نزول ہوا یعنی رسولِ عربیؐ۔ سوچیے جہاں اس کیف آور فضاؤں میں زندگی کے مختلف شعبوں سے متعلق آیات کی تلاوت کی جاتی ہوگی تو اس کی کیف سامانیاں تعلیمی اور تربیتی اہمیت، جلال وجمالِ قرآنی، اس کی بشارت وتنذیر کا اثر قلوب پر کیا ہوتا ہوگا۔ کیا یُزَکِّیۡکُمۡ وَیُعَلِّمُکُمُ الۡکِتٰبَ وَالۡحِکۡمَۃَ کا اس سے بہتر کوئی وقت ہو سکتا ہے؟ یہی وہ نمازیں تھیں جو پانچ وقت صحتِ عقائد، حسنِ معاشرہ، تہذیبِ نفس، تزکیۂ باطن کی نعمتوں سے مومنوں اور مومنات کو سرشار کرتیں اور خود ان کو مفسّرِ قرآن بنانے میں معاون ہوتیں۔ گویا یہ نمازیں ذریعہ تھیں، مومنین ومومنات کو زندگی اور آخرت کے جملہ امور سے آگاہی اور ان کی اہمیّت کو قلوب میں راسخ کرنے کا۔ اور یہ وہ عبادت تھی جس کو ہر حال میں جاری رکھنے کا حکم تھا۔ صحت، بیماری، سفر وحضر، جنگ، امن ہر حال میں۔

یہی نہیں بلکہ خوب سے خوب تر بننے اور نورِ قرآن کی حفاظت کے لئے ضروری تھا کہ نہ صرف اس کی تلاوت کی جائے بلکہ اسے محفوظ کیا جائے، چنانچہ

صحابہ کرامؓ کی ایک جماعت قرآن حکیم کی کتابت کرنے اور ایک جماعت اس کو حفظ کرنے پر مامور ہوئی اور یہ وہ دور تھا جب قرآن کی آیات سب ہی کے وردِ زبان تھیں۔

ابھی سورج نکلا تھا کہ نورِ مبینؐ کے گرد صحابۂ کرامؓ کی جماعت جمع ہو گئی کہیں مسائل کا بیان ہے، کہیں خواب کی تعبیریں بیان کی جا رہی ہیں، کہیں اشیاء کی افادیت اور ان کے اثرات کا بیان ہے کہیں آنے والے حالات کا ذکر ہو رہا ہے، کہیں ماضی کے واقعات کی نقاب کشائی ہو رہی ہے۔

اکثر عشاء کے بعد خصوصی محفلوں میں منتخب حضرات کو اس علم سے آگاہی بخشی جاتی جس کے بتانے پر حضورؐ مامور تھے، اور جس کا عرفان ایک نبیِ برحقؐ ہی کو ہو سکتا تھا۔

پھر انہی عبادات میں جمعہ کی نماز کو لیجئے، نمازِ جمعہ کے وقت ایک رُوح پرور اجتماع ہوتا اور یہ عظیم مجمع اپنے رسولؐ کی زبانِ اقدس سے موقع و محل کی مناسبت سے ضروری احکام سے سرفرازی پاتا۔ اس دن صحابۂ کرامؓ کو نہ صرف جلال و جمال کے انوار میسّر ہوتے بلکہ حالات کے تحت اگر قلب پر کوئی خیال، کوئی خطرہ آتا بھی تو نبیؐ کا قلب اُس سے آگاہی عطا کرتا اور وہ بھی پاک صاف ہو جاتا۔ اور یہ خطاب اسلامی عقائد بالخصوص توحید، رسالت آخرت، تقویٰ اور احسان کے اہم نکات کے بیان پر مشتمل ہونے کے ساتھ ایمان کی بنیادوں کو مستحکم کرنے اور اسلام کے انوار کو آشکارا کرنے کا موجب ہوتا۔ اس اجتماع میں مرد عورت سب ہی شامل ہوتے۔

یوں تو قرآنِ حکیم اور احادیثِ مبارکہ حضورؐ کی عبادات اور اخلاق کی روشن، بے غبار، لافانی اور اہم ترین دستاویز ہیں لیکن جس کے پاس وقت کم ہو اور وہ حضورؐ کی عبادات کی ایک جھلک دیکھنے کا خواہش مند ہو تو اِس

دور میں بھی بفضلہٖ ایک جیّد بزرگ محترم حضرت صوفی برکت علی صاحب لودھیانوی نے ایک گراں قدر تالیف "کتاب العمل بالسنۃ المعروف ترتیب شریف" چھ جلدوں میں لکھ کر ایک نسخۂ کیمیا امت کو عطا کر دیا ہے، اور اس کی کاپیاں دُنیا بھر کے عظیم کتب خانوں میں ارسال فرمائی ہیں۔ اس کتاب کا سرسری مطالعہ آپ پہ اس حقیقت کو آشکارا کر دے گا کہ اس نورِ مبینؐ کے شب و روز، ماہ و سال کن ریاضتوں، عبادتوں اور حالتوں میں گذرتے، اور جو معزز ہستیاں، مومنین اور مومنات، اہلِ بیتؓ اور اصحابؓ کرام اِس نورِ مبینؐ کے قریب آ گئے ان کے قلب و نظر کا کیا عالم ہوا۔ یہ وہ سلسلہ تھا جو نبوت کے بعد شروع ہوا اور وقت کے ساتھ اس میں اضافہ ہی ہوتا رہا، یہاں تک کہ ازل تا ابد زندگی کا کوئی رُخ ایسا باقی نہ رہا جس کی پردہ کشائی حضورؐ کے پاک ہاتھوں سے، یا جس کا بیان حضورِ انورؐ کی زبانِ مقدسہ سے نہ ہوا ہو۔ اس کا مزید ذکر "ثمراتِ نبوّت" میں آئے گا کہ حضورؐ کا مقصدِ حیات ہی تبلیغ تھا۔

(۲) وفود اور دعوت نامے

صلحِ حدیبیہ کے بعد وقت آ گیا تھا کہ پیغامِ حق حجاز کے باہر بھی عام ہو اور دعوتِ اسلام کو صرف خطۂ عرب تک محدود نہ رکھا جائے۔

آنحضرتؐ صلحِ حدیبیہ سے واپس آئے تو لوگوں نے کثرت سے اسلام میں داخل ہونا شروع کیا اور آپ نے سمجھ لیا کہ حجاز کے باہر دعوتِ اسلام کے عام کرنے کا وقت آ گیا ہے۔ اور اس کا بہترین طریقہ صحابہ کرامؓ کے ذریعہ سلاطین کو دعوتِ اسلام کے علاوہ اور کیا ہو سکتا تھا؟ چونکہ سلاطین کوئی مکتوب اُس وقت تک نہیں پڑھتے تھے جب تک اس پر کاتب کی مُہر نہ ہو، اس لئے حضورؐ نے چاندی کی انگوٹھی پر اپنا اسمِ گرامی اس انداز سے

کندہ کروایا کہ نیچے محمدؐ اُس کے اوپر رسول اور اُس کے اوپر اللہ کا لفظ کندہ تھا۔ یہ سادہ سی مہر آپؐ کے اسمِ گرامی کے ساتھ آپؐ کے منصبِ عُظمیٰ کی نشاندہی کر رہی تھی۔ آپ نے دیکھا کہ یہی حقیقت حروفِ مقطعات بن کر شروع کتاب میں بھی آئے ہیں۔[1]

اِن خطوط کے لئے حضورؐ نے ان اصحابؓ کو منتخب فرمایا جو اُن ملکوں میں جاتے رہتے یا جا چکے تھے، جہاں کے سلاطین کو خطوط بھیجنا منظور تھا۔ یہ صحابہؓ وہاں کے رسم و رواج سے آگاہ تھے۔ چنانچہ رسولؐ نے ان صحابہؓ کو جمع فرمایا اور یوں ارشاد فرمایا "اے لوگو! خدا نے مجھ کو تمام دنیا پر رحمت بنا کر بھیجا ہے۔ دیکھو، حواریینِ عیسیٰؑ کی طرح اختلاف نہ کرنا۔ جاؤ، میری طرف سے پیغامِ حق ادا کرو"۔ (تاریخِ اسلام صفحہ ۲۶۲)

حضورؐ نے جن سلاطین اور رؤسائے عرب کے نام دعوت نامے بھیجے اور جن صحابۂ کرام کے ذریعہ بھیجے، ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں:۔

۱۔ حضرت وحیہ کلبیؓ کو شہنشاہِ روم ہرقل کی جانب۔
۲۔ حضرت شجاع بن وہب اسدیؓ کو حارث بن ابی شمر غسانی کی جانب۔
۳۔ حضرت عبداللہ بن حذافہ سہمیؓ کو کسریٰ شاہِ فارس پرویز بن ہرمز۔
۴۔ حضرت حاطب بن ابی بلتعہؓ کو سلطان مقوقس فرمانروائے قبط کی جانب۔
۵۔ حضرت عمر بن ضمریؓ کو اصحمہ نجاشی کی جانب۔
۶۔ حضرت سلیط بن عمر عامریؓ کو ہوذہ بن علی حنفی شاہِ یمامہ کی جانب۔
۷۔ حضرت علاء بن حضرمیؓ کو منذر بن ساوی تمیمی کی جانب۔

---

[1] الٓمٓ — ا: الف، اللہ؛ ل: رسول؛ م: محمدؐ

۸۔ حضرت عمروؓ بن عاصؓ کو عمّان کے دو بادشاہوں کے پاس۔

عام ذہن میں یہ سوال اُبھرتا ہے کہ ابھی مکہّ فتح نہیں ہوا، خیبر میں یہودیوں کا تسلط ہے۔ اس وقت بیرونی ممالک اور روسائے عرب کی جانب ان دعوت ناموں کے بھیجنے میں کیا حکمت تھی۔ کیا یہ قبل از وقت اقدام نہ تھا اور وہ بھی مطلق العنان شہنشاہِ روم اور متکبّر شاہِ ایران کے درباروں میں اپنے مکتوبات اور قاصدوں کو بھیجنا، دراصل یہی وہ فراستِ نبوی تھی، اور یہی وہ طریقۂ کار تھا جس کی کوئی بڑے سے بڑا جرنیل بھی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ یہ تو اللہ کے عظیم ترین رسول کی جانب سے فریضۂ رسالت کی تکمیل کی طرف ایک قدم تھا، اور یہ بتانا تھا کہ اُس کے ہوتے ہوئے کبریائی کا حق کسے حاصل ہے۔ جن سیرت نگاروں نے حضورؐ کی اس حکمتِ عملی کو سراہا ہے انہوں نے اس کی تائید میں یہ سمجھا کہ:۔

۱۔ حضورؐ کو یہ معلوم ہو سکے کہ اِن ملوک اور امراء کی رائے اور خیال آپؐ کے متعلق کیا ہے۔ گویا یہ اس دَور کے سلاطین کی مزاج شناسی کا ایک طریقہ تھا۔ تاکہ کسی بھی لائحۂ عمل میں اس کا خیال رکھا جائے۔

۲۔ یہ معلوم ہو سکے کہ خود یہ ملوک اپنی کتاب اور اپنے علم کی روشنی میں اسلام سے کس قدر متاثر ہیں۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کی وجہ سرورِ کائنات ؐ کا اس "فتح مبین" پر یقینِ کامل تھا جس کی بشارت حدیبیہ سے واپسی پر اللہ ربّ العزت کی جانب سے عطا ہو چکی تھی۔ اس لئے آپ نے خیال فرمایا کہ اب عزم صادق سے عمل پیرا ہو کر اللہ ربّ العزت کی تائیدِ غیبی کا سہارا لیا جائے۔ اور اس سلسلے میں فراستِ نبویؐ، نظام کار، قدرتِ خفی کے وہ مظاہر پیش کئے جائیں، جو فطرتِ رسولؐ کو اللہ کی خصوصی عطا ہوتی ہے۔ اور اس

طرح لوگوں کو دینِ حق کی دعوت دی جائے۔ رہا اسلام کے متعلق اقوامِ عالم کا ردِّ عمل معلوم کرنا، حضورؐ کے متعلق ان کی رائے کا علم، ان کا اسلام کو قبول کرنا یا نہ کرنا یہ سب ثانوی اغراض تھیں۔ اصل مقصد اسلام کا پیغام پہنچانا تھا۔ اور بتدریج اسلام کی حقانیت کی طرف لوگوں کو مائل کرنا تھا یعنی پہلے بتانا، پھر سمجھانا اور بالآخر منوانا۔ رہی ہدایت وہ منجانب اللہ ہے۔ اُن کی قسمت کہ ہدایت پائیں یا محرومِ ہدایت رہیں۔

آپ دیکھیں گے ان سلاطین و امراء میں سے بعض نے اسلام قبول کر لیا، بعض نے اپنی عقیدت کا ثبوت نہایت اخلاص سے پیش کیا، بعض نافرمانی پر اُترے، تکبر میں گرفتار ہوئے اور تباہ ہوئے، بعض نے کسی حکمتِ عملی کا سہارا لیا اور ناکامیاب رہے لیکن یہ تو بہرحال ہوا کہ اسلام کی آواز بیرونی ممالک تک اس شان سے پہنچی کہ اسلام کی سربلندی دینی اور سیاسی وقار لوگوں کے دلوں میں گھر کئے بغیر نہ رہا۔

بقول مؤلف "محمد رسول اللہؐ" "یہ سب فتحِ مکہ سے قبل ہی ہوا"۔ (صفحہ ۵۳۹)

حضورؐ کے نورِ بصیرت اور تجلیاتِ ایمانی سے سرفرازی پانے کے لئے ضروری ہے کہ شاہِ روم اور شاہِ ایران کے عظیم درباروں میں جن صحابہؓ کرامؓ نے یہ دعوت نامے پیش کئے اُن کا کچھ مختصر بیان کیا جائے۔

(۱) آنحضرتؐ کا دعوت نامہ ہرقل (شاہِ روم کے نام)

حضورؐ ایک مختصر خط دحیہ کلبیؓ کو عطا فرماتے ہیں۔ نہایت سادہ، نہایت واضح، لیکن نبیِ برحقؐ کے یقین کامل اور ایمان کا ترجمان۔

مِنْ مُحَمَّدٍ رسول اللّٰہ اِلٰی ھِرَقْل عَظِیْمِ الرُّوم۔ وَالسَّلَامُ عَلٰی مَنِ اتَّبَعَ الْھُدٰی اَمّا بعد۔ اَسْلِمْ تَسْلَمْ یُؤْتِکَ اللّٰہُ اَجْرَکَ مَرَّتَیْنِ

وَاِنْ تَتَوَلَّ فَاِنَّ اِثْمَ الْاَکَارِیْیِنَ عَلَیْکَ ۔

محمد رسول اللہ کی طرف سے عظیم روم کے بادشاہ ہرقل کے نام ۔ جس نے ہدایت کا اتباع کیا اس پر سلام ہو۔ اما بعد اسلام قبول کر لو نجات پا جاؤ گے، اللہ تعالٰے تم کو دوگنا اجر عطا فرمائے گا۔ اگر اسلام سے روگردانی کرو گے تو تمہاری رعایا کا گناہ بھی تمہاری گردن پر ہو گا۔ (محمد رسول اللہ ۔ صفحہ ۵۱۱)

آپؐ یہ سربمہر دعوت نامہ وحیہ کلبی کو اس ہدایت کے ساتھ دیتے ہیں کہ یہ خط جا کر بصرہ کے حاکم کو دے دیں تاکہ وہ اسے ہرقل تک پہنچا دے۔ بصرہ کا حاکم حارث نامی غسان کا بادشاہ تھا۔

اب ملاحظہ فرمایئے کہ خط ہرقل کے نام اور دیئے جانے کا حکم بصرہ کے حاکم کو۔ یہ بات صرف نبیؐ کے قلب پر آشکارا ہو سکتی تھی کہ ہرقل اپنی نذر پیش کرنے بیت المقدس میں حاضری دے گا اور دورانِ سفر بصرہ کے حاکم کو حضورؐ کا گرامی نامہ پیش کرنے کا موقع مل جائے گا، یہ قدرتِ خفی کی ایک جھلک ہے۔ اب اس قدرتِ خفی کا وہ منظر بھی ملاحظہ ہو جب اس خط کے پیش ہونے کے وقت ہرقل کے قلب کو اس کے پیغام کی اہمیت سے مانوس کیا جا رہا ہے۔ موقع یہ ہے کہ ہرقل بیت المقدس میں پہنچ کر اپنی نماز سے فارغ ہوتا ہے، اور اس کے پادری اور روم کے معزز امراء ساتھ ہیں۔ وہ ایک روز صبح سویرے بہت مغموم اٹھتا ہے اور آسمان کی طرف نظریں اٹھا کر دیکھتا جاتا ہے۔ پادری اس سے اس کی کیفیت معلوم کرتے ہیں، وہ کہتا ہے "بات یہ ہے کہ مجھے گذشتہ شب یہ دکھایا گیا کہ "ختنے والا ظاہر ہونے والا ہے۔" پادری اس کو اطمینان دلاتے ہیں کہ اس میں پریشانی کی کیا بات ہے، ہمارے علم میں صرف یہودی ختنہ کرواتے ہیں ہم اُن سب کی گردنیں اُڑا دیں گے۔ ہرقل کو اس کے امراء اور پادری

اس قسم کی تسلیاں دے رہے ہیں، کہ والیٔ بصرہ کا ایک قاصد ایک عرب کے ساتھ آتا ہے، رواج کے مطابق ھدیئے پیش کئے جاتے ہیں اور قاصد عرض کرتا ہے کہ اے بادشاہ یہ شخص عرب کے بکری والوں میں سے ہے اور اپنے ملک میں ایک عجیب وغریب واقعہ کے ظہور کی اطلاع دیتا ہے۔ اس شخص نے بتایا ہے کہ ہم میں ایک شخص ظاہر ہوا ہے، جو اس کا دعویٰ کرتا ہے کہ وہ نبی ہے اور بعض لوگوں نے اس کی تصدیق کی ہے اور وہ اس کے متبع ہو گئے ہیں اور کچھ اس کے خلاف ہیں۔ اور میں انہیں اسی حال میں چھوڑ کر آیا ہوں۔

ہرقل نے جب یہ خبر سُنی تو اُس نے حکم دیا کہ اسے ننگا کر دو، تو وہ مختون نکلا۔ ہرقل نے کہا، واللہ یہ وہی شخص ہے جو مجھے خواب میں دکھایا گیا۔ اس کے کپڑے واپس کر دو اور اس کی قوم کے کسی فرد کو پکڑ کر میرے پاس لاؤ۔ ہرقل کو بصرہ کے حاکم کے ذریعے حضورؐ کا گرامی نامہ مل چکا ہے۔

اب دیکھئے! روم کے افسر ابوسفیان کو پکڑ کر ہرقل کے دربار میں پیش کرتے ہیں۔ ابوسفیان ابھی مسلمان نہیں ہوئے ہیں اور ان کے دل میں حضورؐ کی نفرت اور ان سے بغاوت کا جذبہ کار فرما ہے۔ ابوسفیان سے ہرقل سوال کرتا ہے ترجمان کے ذریعے گفتگو ہوتی ہے، ابوسفیان اپنے فطری جذبۂ نخوت وعداوت کے تحت شہنشاہِ روم کے دل سے حضورؐ کی عظمت کم کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن اس کی توجہ صرف سوال وجواب پر ہے اور آخر میں جب وہ اپنے تاثرات اور عقیدت کا اظہار کرتا ہے تو لوگوں میں ایک شور وغل مچ جاتا ہے ابوسفیان اور اس کے ساتھی رخصت کر دیئے جاتے ہیں۔ اس کے بعد، ہرقل قصر حمص میں چلا آتا ہے اور امرائے روم کو قصر میں جمع کر کے حکم دیتا ہے کہ دروازے بند کر دیئے جائیں، اور یوں

خطاب کرتا ہے:۔

"اے گروہِ رُوم اگر تم فلاح اور رُشد کے طالب ہو اور چاہتے ہو کہ تمہارا ملک برقرار رہے تو اس نبی پر ایمان لے آؤ"۔ یہ سُنتے ہی سب لوگ چراغ پا ہو جاتے ہیں اور محفل سے رخصت ہونے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔ ہرقل ایک ذہین انسان تھا ان کی اس نفرت کو دیکھ کر اس نے فوراً کہا۔

"اے لوگو میں نے تم کو آزمانے کے لئے یہ جملے کہے تا کہ اندازہ ہو کہ تم اپنے دین پر کس قدر مستحکم ہو"۔ یہ سُن کر سب کے سب خوش ہو جاتے ہیں اور قیصرِ رُوم کو سجدہ کرتے ہیں۔

یہ مکالمہ جو ہرقل اور ابوسفیان کے درمیان ہوا قیصرِ رُوم کے فہم اور ذہانت کا آئینہ دار ہے لیکن وہ چونکہ ایمان کی دولت سے سرفراز نہ ہوا تھا اس لئے ملک گیری کی تمنّا اس پر غالب رہی۔

غور طلب امور یہ ہیں کہ خط کا اس وقت پہنچنا جبکہ اس کی شہنشاہیت اور اس کی کامیابیاں عروج پر تھیں۔ اس نے خود نہ رسولِ عربیؐ کو دیکھا تھا نہ آپؐ سے واقف تھا صرف حالات سُنے اور وہ بھی آپ کے ایک دشمن سے۔ خط سُنا وہ بھی ایک سادہ سا اور مُبرا ایمان۔ سفیر کو دیکھا تو وہ بھی ایک معمولی سا انسان پھر وہ کون سی طاقت تھی جس نے اس کے قلب پر اس قدر گہرا اثر کیا اور وہ کیسا خواب تھا جس کی صداقت پر اُسے پورا یقین آگیا۔

بلاشبہ یہی وہ فیضانِ نورِ مُبینؐ تھا

جس کے ظاہری اور باطنی جلوے اس مختصر دَور میں عام ہو رہے تھے، مسجدوں میں محرابوں میں غزوات اور معاملات میں اور جس کا ظہور رحمت تھا مظلوموں کے لئے غمزدہ قلوب کے لئے رحمت تھا یتیموں کے لئے

اور بیواؤں کے لئے "صلی اللہ علیہ وسلم"

(۲) حارث بن ابی شمر غسّانی

حارث غسّانی قیصرِ روم کی طرف سے دمشق کا حاکم تھا، یہ خط شجاع بن وہب اسدی لے جاتے ہیں، وہی سادہ عبارت، وہی خدائے وحدہٗ لاشریک پر ایمان لانے کی سادہ اور پُر یقین الفاظ میں دعوت اور اس وعدے کے ساتھ کہ اگر ایسا کروگے تو تمہارا ملک باقی رہے گا۔ اور یہ وقت بھی وہ تھا کہ جب غسّانی قیصرِ رُوم کی دعوت کی تیاریوں میں مشغول تھا۔ آپؐ نے اُس کے دربان کو یہ خط دیا۔ دربان نے یہ جواب دیا کہ تمہاری وہاں رسائی نہیں ہوسکتی جب تک کہ وہ برآمد نہ ہوں۔ اور اس دوران میں وہ دربان خود آنحضرتؐ کے حالات کے بارے میں دریافت کرتا رہا، اور حضورؐ کے حالات سے اس درجہ متاثر ہوا کہ اُس پر گریہ طاری ہوگیا۔ اُس نے کہا کہ میں نے جو کچھ انجیل میں پڑھا تھا یہ بالکل اُس کے مطابق ہے، البتہ میرا خیال تھا کہ آپؐ کا ظہور شام میں ہوگا، لیکن عرب میں ہوا۔ دربان ایمان لایا لیکن اپنا ایمان ظاہر نہ کیا۔

ایک دن حارث سر پر تاج رکھے باہر نکلا تو شجاع نے اُس کو وہ خط پیش کیا۔ اُس نے یہ گرامی نامہ پڑھ کر پھینک دیا، اور کہا کہ مجھ سے میرا مُلک کون لے سکتا ہے۔ اور فوراً لشکر کو تیاری کا حکم دیا۔ اور قیصرِ روم کو اس معاملے کی اطلاع دی۔ اس وقت حضرت وحیہ کلبیؓ ہرقل قیصرِ روم کے پاس موجود تھے، جنہیںؓ حضورؐ نے قیصرِ روم کے پاس بھیجا تھا۔ جب قیصر نے حارث کا یہ خط پڑھا تو اُسے لکھا کہ اس پیغمبرؐ کی طرف کوچ مت کرو، اور اس کا خیال چھوڑ دو، اور مجھ سے آکر بیت المقدس میں ملو۔

جب حضورؐ کو حارث کی گستاخی کی اطلاع ملی تو آپؐ نے فرمایا کہ
اس کا ملک تباہ ہو گیا۔ سوچو یہ اتفاق نہ تھا کہ قیصر کو حارث کا خط اپنا خط
ملنے کے بعد اس وقت ملے جب حارث لشکر کشی کی تیاری کر رہا ہو اور وہ
بھی اس وقت جب وحیہ کلبی اس کے پاس موجود ہوں اس سلسلے میں اک
دربان دل سے ایمان بھی لے آئے اور قیصر روم کے دل میں آپؐ کے جلال و
جمال کا سکہ بیٹھ جائے۔ یقیناً یہ ایک غیر مرئی نظام قدرت کے تحت ہو رہا تھا۔
اِسے اللہ تعالیٰ کی مشیت کہو یا اُس کے رسولؐ کی قدرتِ خفی کا اظہار دونوں
بہر حال اللہ کی جانب سے ہیں، ایک بالواسطہ ایک بلاواسطہ۔

(۳) نامہ گرامی کسریٰ شاہِ فارس کے نام

حضورؐ نے عبداللہ بن حذافہ سہمیؓ کو اپنا نامۂ مبارک شہنشاہِ فارس
کے پاس بھیجا تھا۔ دعوت نامے میں وہی دعوتِ اسلام تھی لیکن اس اضافے
کے ساتھ کہ میں تمام لوگوں کی طرف بھیجا گیا اللہ کا رسولؐ ہوں۔
خسرو پرویز متکبر بادشاہ، ہرمز کا بیٹا، اور نوشیروانِ عادل کا پوتا
تھا۔ لیکن خود نہایت مغرور اور بد دماغ واقع ہوا تھا۔ اگرچہ وہ قیصر روم
کے ہاتھوں حال ہی میں ذلیل ہو چکا تھا لیکن اس کی فطرت نہیں بدلی تھی،
اس نے حضورؐ کا اسم گرامی اپنے نام سے پہلے دیکھا تو غصہ اور تکبر سے آگ بگولا
ہو گیا اور نامۂ مبارک کو پھاڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیا، اور اُس کے بعد
اپنے ماتحت صوبۂ یمن کے حاکم بازان کو خط لکھا کہ وہ مدعیٔ نبوت کو گرفتار
کر کے اُس کے پاس بھیجے۔ چنانچہ گورنر بازان نے اپنے میر منشی بابویہ کو
دو آدمیوں کے ساتھ حضورؐ کے پاس بھیجا۔ اور یہ خط لکھا کہ آپ ان دونوں
کے ساتھ خسرو پرویز کی خدمت میں پہنچیں۔ چنانچہ جب یہ لوگ حضورؐ کے

پاس حاضر ہوئے تو ان کی داڑھیاں مُنڈی ہوئی تھیں اور اُن کی مونچھیں بڑھی ہوئی تھیں، تو آنحضرتؐ نے اُن کی طرف نظر اُٹھا کر دیکھنا بھی گوارا نہ کیا، اور فرمایا تم پر افسوس ہے، کس نے یہ حکم دیا ہے (مونچھیں بڑھاؤ اور داڑھی مُنڈاؤ) انہوں نے جواب دیا، ہمارے مالک (یعنی کسریٰ) نے۔ آنحضرتؐ نے فرمایا، میرے مالک نے مجھے داڑھی بڑھانے اور مونچھیں کتروانے کا حکم دیا ہے۔ پھر فرمایا، اب واپس چلے جاؤ کل میرے پاس آنا۔

ذرا اس پُرسکون جواب پر غور کیجئے اور یہ بھی دیکھئے کہ حضور نے کس طرح اس کی توجہ اپنے مالک (وحدہٗ لاشریک) کی طرف کس لطیف انداز سے منتقل فرمائی اور کس سادہ انداز سے اس کی قدرت اور حکمت کی طرف ایک مستحکم اشارہ فرمایا اور اس کے بعد نہایت سادگی سے فرما دیا کہ کل صبح میرے پاس آؤ۔ ان جملوں میں کیسی معنویت، کتنی دور اندیشی اور کتنی عظیم پیشین گوئیاں مضمر ہیں۔

وہ لوگ جو دوسرے دن آتے ہیں، اور آپ فرماتے ہیں کہ کسریٰ کو تو اُس کے بیٹے شیرویہ نے قتل کر دیا۔ گویا ان کو یہ بھی بتانا تھا کہ میرا مالک کتنا عظیم اور کتنی حکمت والا ہے۔ اور تم جس کو مالک سمجھے بیٹھے ہو اس کی اپنی جان تک اس کے اپنے اختیار نہ تھی یہ شانِ نبوّت کا مظاہرہ بھی تھا اور تبلیغِ دین بھی۔ دونوں قاصد حیران رہ گئے، اور کہا کہ آپؐ نے مجھے بُری خبر سنائی۔ آپ چاہتے ہیں کہ یہ خبریں اپنے شہنشاہ کو پہنچا دوں۔ آپ نے فرمایا "ضرور، اور یہ بھی کہہ دینا کہ میرا دین اور میری حکومت وہاں تک پہنچ کر رہیں گے جہاں تک کسریٰ کی حکومت پہنچ چکی ہے۔ اور اپنے شاہ سے کہہ دینا کہ اگر تم اسلام لے آئے تو اس وقت میں حکومت تمہارے پاس ہی رہنے دوں گا، اور آئندہ کے لئے تمہاری قوم کی بادشاہت کو اسی طرح

باقی رکھوں گا۔"

(محمد رسول اللہ صفحہ ۵۲۱)

ان دونوں قاصدوں نے واپس آکر باذان کو یہ روداد سنائی۔ وہ حیران ہوا اور کہا کہ "واللہ یہ کسی بادشاہ کی گفتگو نہیں ہوسکتی اور معاملہ کو مؤخر کر دیا۔ ابھی اس کی گفتگو ختم بھی نہ ہوئی تھی کہ شیرویہ کا فرمان باذان کو ملا جس میں یہ بھی تحریر تھا کہ جس شخص کے متعلق (یعنی رسولِ کریمؐ) تمہارے پاس حکم بھیجا گیا ہے، اس کے لئے میرے حکم ثانی کا انتظار کرو۔

باذان یہ فرمان پڑھ کر نہ صرف متحیر ہوا بلکہ حضورؐ کی صداقت اور نبوت پر ایمان لایا اور یمن میں اس کے ساتھ جتنے اہلِ فارس تھے سب مشرف بہ اسلام ہوگئے۔

بابویہ نے اپنے اثنائے گفتگو باذان سے یہ بھی کہا تھا کہ آج تک میں نے اپنی زندگی میں کبھی اس شخص سے زیادہ پُر رُعب اور دبدبے والی ہستی سے گفتگو نہیں کی۔ یہی جلال وجمال کے وہ مناظر تھے جو تسخیر قلوب کے موجب بنے اور فروغِ اسلام کے ضامن۔ تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ انہی معجز نما خطوط کا اثر تھا کہ مصر کے

(۴) سلطان مقوقس

فرمانروائے قبط، نے حضور کا خط پاکر آنکھوں سے لگایا، سینے سے لگایا، ایک ہاتھی دانت کے ڈبے میں رکھا، اور نہایت ادب اور احترام سے اس کا جواب لکھوایا، اور کثیر اور بیش قیمت تحفوں کے ساتھ حضرت حاطبؓ کو واپس کیا اس کے ساتھ ہی اس نے اپنے تحائف میں ملک کی دو خوب صورت عورتیں بھی حضورؐ کو بھیجیں۔ انہی میں ماریہ (بمعنی مریم) اور اُن کی بہن سیرین تھیں۔ یہ مصر کی حسین وجمیل خواتین تھیں۔ جب یہ عورتیں حضرت حاطبؓ

کے ساتھ آرہی تھیں تو دونوں نے ان رضؓ کی تبلیغ سے متاثر ہو کر اسلام قبول کر لیا تھا۔ انہی ماریہ قبطیہ سے حضورؐ کے صاحبزادے حضرت ابراہیم پیدا ہوئے تھے جن کا کم عمری میں انتقال ہو گیا۔

(۵) اصحمہ نجاشی

یہی انوارِ مکتوب اس وقت ظاہر ہوئے جب آنحضرتؐ کا نامۂ گرامی عمرو بن ضمریؓ لے کر اصحمہ نجاشی کے پاس گئے۔ مسلمانوں کی حبشہ کی طرف ہجرت نے نجاشی کے قلب کو اسلام کے لئے کشادہ کر دیا تھا، یہاں تک کہ جب حضورؐ نے مدینے کی طرف ہجرت فرمائی اور اکثر صحابہؓ حبشہ سے مدینہ آگئے۔ اس وقت بھی پچاس ساٹھ صحابۂ کرامؓ حبشہ ہی میں مقیم رہے۔

حضورؐ نے اصحمہ کو دو خط بھیجے تھے۔ ایک میں اسلام کی دعوت تھی اور دوسرا خط حضرت امِ حبیبہؓ کے بارے میں تھا، جن کے شوہر شہید ہو گئے تھے، اور انؓ کا وہاں کوئی دیکھ بھال کرنے والا نہ تھا۔ آپؐ نے اپنے اس خط میں اصحمہ کو اجازت دی تھی، کہ امِ حبیبہؓ سے آنحضرتؐ کا غائبانہ عقد کر دے۔ یہ انؓ کی دلجوئی کے لئے تھا، جس کا ذکر ہو چکا ہے۔ نجاشی نے اس کی تعمیل کی اور آپؐ کے خط کو آنکھوں سے لگایا، تعظیماً تخت سے اتر کر زمین پر بیٹھا، اور اسلام قبول کیا۔ یہ بھی مورخین نے لکھا ہے کہ دراصل نجاشی مسلمانوں کی پہلی ہجرت کے وقت حضرت جعفرؓ کی تقریر سے متاثر ہو کر مشرف بہ اسلام ہو گیا تھا۔ لیکن شاید اس وقت اس کو پوشیدہ رکھنا ہی مناسب سمجھا تھا۔ یہ فخر نجاشی ہی کو حاصل ہوا کہ اس کی وفات پر حضورؐ نے اپنے صحابہؓ کے ساتھ اس کی نمازِ غائبانہ ادا فرمائی۔ اور فرمایا کہ "آج ایک مردِ مومن کا انتقال ہو گیا؟" (بخاری شریف)

آپ دیکھ رہے ہیں کہ سادہ اور مختصر خطوط کا کیا اثر ہو رہا ہے۔ فتحِ مبین کی بشارت قلوب کی فتح کی موجب بن رہی ہے، اور جو اس دعوت کو قبول نہیں کرتے وہ کیسے خسارے میں رہتے ہیں۔

(۶) ہوذہ بن علی

عرب کے جن رؤسا کے پاس گرامی نامہ ارسال کیا گیا، ان میں ایک ہوذہ بن علی حنفی شاہِ یمامہ تھا۔ اُس نے گرامی نامہ پاکر اپنی سیاست سے کام لینا چاہا، اور دعوت کو پسند کرتے ہوئے یہ شرط لگائی کہ حضورؐ اپنے کاموں میں کچھ اُس کا بھی حصہ مقرر فرمائیں یعنی اپنی نبوّت اور خلافت میں شامل فرمالیں۔ آپؐ نے جب یہ سُنا تو صرف یہ فرمایا کہ ہوذہ اور اُس کا ملک دونوں تباہ ہو گئے۔

ابھی آنحضرتؐ فتحِ مکہ سے واپس ہی ہوئے تھے کہ ہوذہ کی موت کی خبر آپ کو مل گئی۔ اس وقت آپؐ نے یہ خبر دی کہ یمامہ میں میرے بعد ایک کذّاب ظاہر ہوگا، جو دعویٰ نبوّت کرے گا اور قتل کیا جائے گا۔ زبانِ معجز بیان سے جو پیش گوئی فرمائی تھی، وہی ہوا۔ یہ تو تھی شان ہمارے آقائے دوجہاںؐ کی، جن کے متعلق خود قرآن فرما رہا ہے: وَمَا یَنۡطِقُ عَنِ الۡهَوٰی ۝ اِنۡ هُوَ اِلَّا وَحۡیٌ یُّوۡحٰی ۝ (وہ خود کچھ نہیں کہتے، وہی کہتے ہیں جو اللہ ان سے کہلواتا ہے)۔ وہؐ تو اللہ کے رسول ہیں اور ترجمانِ حق۔

(۷) منذر بن ساوی تمیمی

ایک دعوت نامہ منذر بن ساوی تمیمی کو حضرت علا بن حضرمیؓ کے ذریعے بھیجا گیا، جس کو پاکر وہ حلقہ بگوشِ اسلام ہوئے اور چونکہ آنحضرتؐ

کا یہ نامۂ گرامی اس شخص کو جو اسلام میں داخل نہ ہونا چاہے۔ آزادی دیتا تھا کہ اگر چاہے تو اسلام قبول کرے ورنہ جزیہ عطا کرے۔ چنانچہ بحرین والے مذہباً یا تو آتش پرست تھے یا یہود۔ جب منذر نے ان کو اسلام پیش کیا تو اُن میں بعض نے بخوشی اسلام قبول کر لیا۔ اور بعض اپنے مذہب پر قائم رہے اور جزیہ دینا منظور کیا۔

آخری دو دعوت نامے عمان کے دو بادشاہوں کے نام تھے یہ دونوں مشرف بہ اسلام ہوئے۔

و

دورِ آخر و انجامِ کار

صلح حدیبیہ کے بعد ہم نے دعوت ناموں کا ذکر نورِ مبین کے "طریقۂ کار" کے تحت کیا ہے، اور جنگِ خیبر جس کا ذکر بالعموم سیرت نگار حضرات نے پہلے کیا ہے۔ ہم نے اس کے بعد اس کا ذکر مناسب سمجھا صرف اس لئے رحمتؐ للعالمین کا ہر انداز نرالا ہے، اس میں ہر جگہ رحمت کے پہلو شامل ہوتے ہیں آپؐ کا "طریقۂ کار" ہی یہ تھا کہ پہلے قلوب کو فتح کیا جائے پھر ان دشمنوں کے قلعوں کی طرف رُخ ہو جو اسلام کی بیخ کنی پر آمادہ تھے۔

دراصل اس آخری دَور میں جو ۷ھ سے لے کر ۱۰ھ تک پر مشتمل ہے، اس میں جو بھی غزوات اور سرایا ہوئے، ان میں قضائے عمرہ اور فتحِ مکہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ لیکن ان فتوحات سے پہلے اس کی ابتداء جزیرۂ عرب کے باہر کی گئی، اس لئے کہ اہلِ فارس اور شہنشاہِ روم کا دبدبہ اور شوکت عرب کے یہود اور کفّار کے دل میں بٹھائی ہوئی تھی اس کا قلع قمع کیا جائے اور ان کفار کے قلوب میں اسلام کا وقار اور عظمت پیدا ہو۔

چنانچہ شہنشاہِ روم نے عرب کے کسی شخص کو اپنے سامنے پیش کئے جانے کا حکم دیا، تو ابوسفیان ہی کو قدرت نے اس کے لئے انتخاب کیا۔ مکّہ میں ان کی ساکھ کا ڈنکا بجتا تھا، اور ہر سازش کے محرّک یہی ابوسفیان ہوتے تھے۔ اللہ تعالٰی نے انہیں اپنی آنکھوں سے شہنشاہِ روم کے سامنے حضورؐ کے گرامی نامہ کا اثر خوب دکھایا، اور خود ہرقل کی زبان سے ابوسفیان کو یہ الفاظ سُنا دیئے۔ "ابوسفیان اگر وہ تمام باتیں جو تم نے مجھ سے کہی ہیں وہ صحیح ہیں تو وہ ایک دن یقیناً میرے پیروں تلے کی اِس زمین پر غالب آکر رہیں گے۔ میری دلی آرزو تھی کہ میں اُن ؐ کے پیر دھوتا۔ بس اب تم اپنے

کام پر جا سکتے ہو۔"   (محمدؐ رسول اللہ صفحہ ۵۱۵)

ابوسفیان جب وہاں سے اٹھ کر چلا تو اپنا ایک ہاتھ دوسرے ہاتھ پر مارتا جاتا تھا اور کہتا تھا "اے اللہ کے بندو! ابن ابی کبشہ (یعنی حضورؐ) کا معاملہ اتنا عظمت اختیار کر چکا ہے کہ بنو اصفر کے سلاطین تک اپنی شاہی حکومت پر اس کے غلبے کے خیال سے خائف رہنے لگے ہیں۔"

(محمدؐ رسول اللہ صفحہ ۵۱۵)

کیا خود ابوسفیان کے قلب کو ہلا دینے کے لئے یہ واقعہ کافی نہ تھا، کیا اس کی ہمت پڑ سکتی تھی کہ جب حضورؐ مکہ معظمہ میں داخل ہونا چاہیں تو لشکر لے کر اُنؐ کے مقابلے کا ارادہ بھی کر سکے۔

یہ فراستِ نبوی یہ قدرتِ خفی ہی حضورؐ کی کامیابی کا راز تھا کیونکہ آپؐ جس کے عبد اور رسول تھے "اپنے سب کام محض اُسی وحدہٗ لاشریک کے لئے، اسی کے حکم، اُسی کے ارادے کے تحت کرتے جو انؐ کا مالک و مختار تھا، پھر دنیا کے کسی بڑے سے بڑے بادشاہ کی بھلا کیا ہمت ہو سکتی تھی کہ انؐ کے مقابلے میں ٹھہر سکے۔ اسی لئے جس طرح صلحِ حدیبیہ کے بعد وقت آ گیا تھا کہ سلاطینِ روم کو دعوتِ اسلام دی جائے، اسی طرح اب جزیرۂ عرب کے یہود اور کفارِ مکہ کی سرزنش کا بھی وقت آ چکا تھا۔ اور وہ کام یعنی فروغِ دین اور تبلیغِ اسلام اور تکمیلِ اسلام، جس کا آغاز نبوت کے پہلے دن سے کیا گیا تھا، اُس کی تکمیل کی طرف پورے عزم و استقلال کے ساتھ قدم اٹھانے کا وقت قریب آ گیا تھا تا کہ تکمیلِ دین اور رضائے الٰہی سے سرفرازی ہو۔ آپ

---

[۱] ابن کبشہ، آمنہ بنت وہب، والدہ ماجدۂ آنحضرتؐ کے دادا تھے۔ اُن کی کنیت ابوکبشہ تھی، وہ بتوں کی پرستش میں قریش کے مخالف تھے۔ اسی بنا پر آنحضرتؐ کو اُن سے تشبیہ دی جاتی تھی۔

صلی اللہ علیہ وسلم نے صلح حدیبیہ کے بعد بلا تاخیر اس کی ابتداء غزوہ خیبر سے کی۔

"خیبر" محرم ۷ھ

خیبر کا وسیع علاقہ مدینہ منورہ سے تقریباً سو میل کے فاصلے پر شام کی جانب واقع ہے یہ ایک شاداب علاقہ تھا جس میں بکثرت کھجور کے باغات تھے اور زرعی زمینیں۔ انہیں زرعی زمینوں اور باغات کے درمیان یہود کے مستحکم قلعے تھے جو ایک دوسرے سے فاصلے پر واقع تھے، اور یہی سات قلعے ان کی تمام سازشوں کا مرکز تھے۔ یہاں کے یہود ایک جنگجو جماعت، اور ان کے ناقابلِ تسخیر قلعے ان کی ہمت افزائیوں کا موجب تھے۔

فراستِ نبوی ؐ نے جان لیا تھا کہ صلح حدیبیہ سے یہود ضرور غلط فائدہ اٹھانے کی کوشش کریں گے۔ ہر چند کہ اس وقت صحابہؓ کے دل مضمحل تھے لیکن حضور ؐ نے یہی مناسب سمجھا کہ یہودیوں کو سازشوں کا زیادہ موقع نہ دیا جائے جس کے کچھ آثار نمایاں ہونے شروع ہو گئے تھے چنانچہ حضور ؐ نے حدیبیہ سے ذی الحج میں واپسی پر ہی محرم کے مہینے میں اس غزوہ کا قصد فرمایا۔ اور جاں نثار صحابہؓ کی ایک کثیر جماعت نے اس غزوہ میں آپ ؐ کے ساتھ شرکت فرمائی۔ اسلامی لشکر میں اس وقت ڈیڑھ ہزار صحابہؓ شامل تھے۔

اس غزوہ کی ابتداء یوں ہوئی کہ چند دن قبل کچھ غطفانی بدو حملہ کر کے چراگاہوں سے چرتے ہوئے مویشی ہنکا لے گئے تھے، اور مسلمانوں نے تعاقب کر کے انہیں حاصل کر لیا تھا۔ ان غطفانیوں کا یہود سے عہد تھا کہ وہ ہمیشہ مسلمانوں کے خلاف یہود کا ساتھ دیں گے۔ چنانچہ حضور ؐ نے خیبر کی اس مہم میں اُسی جانب قیام فرمایا جس جانب قبیلۂ غطفان رہتا

تھا، تاکہ اس کو اسلامی لشکر کی اطلاع ہو جائے اور اگر اس کی خواہش ہو تو وہ بھی اپنے ارمان نکال لے، اس کے بعد آپ آگے بڑھے اور رات کے وقت جب تمام اہلِ خیبر بے خبر سو رہے تھے خیبر کے قلعہ پر پہنچ گئے

یہود اپنی حفاظت سے غافل نہ تھے۔ بالعموم اُن کے پہرے دار اور چوکیدار راتوں کو گشت لگاتے رہتے تھے۔ لیکن اس دن اُن پر نیند طاری ہوگئی۔ یہ محض اتفاق نہ تھا بلکہ قدرتِ خفی کا ایک ادنیٰ مظاہرہ تھا کہ خیبر والوں پر خوابِ غفلت مسلط کر دیا گیا۔ چونکہ حضورؐ غفلت کی حالت میں کسی پر حملہ نہ فرماتے، اور شب خون کو جائز نہ سمجھتے تھے، یہ آپ کی رحمتِ عام کا ایک پہلو تھا، اس لئے آپؐ نے رات کو انتظام فرمایا اور صبح صف بندی فرمائی اور اس وقت جب یہود اپنے آلاتِ زراعت لے کر باہر نکلے تو اسلامی لشکر کو سامنے پایا۔ وہ چلا اُٹھے واللہ محمدؐ پورا لشکر لے کر حملہ آور ہوئے ہیں۔ اس کے بعد اُلٹے پاؤں قلعے میں گھس گئے۔

یہود اس اسلامی لشکر کا کھلے میدان میں مقابلے سے گریز کرتے رہے، صرف قلعوں کے پاس ہی لڑتے، اور جب بھی اُنہیں شکست ہوتی وہ قلعوں میں گھس جاتے۔ چھ دن تک یہ جنگ جاری رہی، کچھ فتوحات بھی ہوئیں لیکن قلعے فتح نہیں ہوئے۔ آخر حضورؐ نے حضرت محمد بن مسلمہؓ سے فرمایا کہ کل میں اُس شخص کے ہاتھ میں عَلَم دوں گا جو اللہ اور اُس کے رسولؐ سے محبت رکھتا ہے، اور اللہ اور اُس کے رسولؐ اُس سے محبت رکھتے ہیں۔ وہ پیچھے نہ ہٹے گا، اور حق تعالیٰ اس کے ہاتھ پر اس مہم کو سر فرمائے گا اور فتح عطا فرمائے گا، اور اُسے تیرے بھائی کے قاتل سے بدلہ لینے کا موقع بھی عطا فرمائے گا۔" (محمد رسول اللہ صفحہ ۵۴۳)

ہر شخص متمنّی تھا کہ عَلَم اسے نصیب ہو لیکن صبح حضورؐ نے حضرت علیؓ

کو طلب فرمایا۔ آپؐ کو بتایا گیا کہ انہیںؓ آشوبِ چشم ہے۔ تو آپؐ نے اُنؓ کو بُلا کر اپنا مبارک لعاب دہن ان کی آنکھوں پر لگایا اور فرمایا بسم اللہ کرو۔ چنانچہ حضرت علیؓ کی آنکھیں فوراً اچھی ہوگئیں، اور آپؓ نے بڑھ کر قلعے کا محاصرہ کرلیا، اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی بے مثال شجاعت کے باعث یکے بعد دیگرے خیبر کے قلعے فتح ہوتے، اور وہاں سے بے شمار مال غنیمت اموال، زمین، نقود و ہتھیار مسلمانوں کے ہاتھ آیا۔ پہلا قلعہ جو فتح ہوا وہ 'ناعم' تھا جو ابو الرافع کی اولاد کا تھا یعنی قموص جو تمام قلعوں میں بڑا مستحکم قلعہ تھا، وہاں کے یہود نے جنگ کیئے بغیر اپنا مال و دولت مسلمانوں کو دینا گوارا نہ کیا اور دونوں طرف سے صف بندی ہوئی۔ حضرت علیؓ قلعہ قموص کے نیچے آگئے تو انہوںؓ نے اپنا علَم سنگریزوں کے ایک ٹیلے پر نصب کیا۔ چنانچہ احبارِ یہود میں سے ایک نے پوچھا کہ آپؓ کون ہیں، تو آپؓ نے بتایا میں علیؓ ہوں، اُس نے کہا میں نے توریت میں تمہارے اوصاف پڑھے ہیں چنانچہ جو شخص سب سے پہلے قلعہ کے باہر نکلا وہ حارث تھا، جو مرحب کا بھائی تھا وہ ہیبت جری اور بہادر تھا، جنگ میں وہ حضرت علیؓ کے ہاتھوں قتل ہوا، پھر مرحب انتقام کے لئے بہادروں کی ایک جماعت کے ساتھ باہر نکلا۔ مرحب نے پہل کرنا چاہی، لیکن ذوالفقارِ حیدریؓ کی ایک ضرب ہی اُس غدّار کے خود کو کاٹتی، زنجیروں کو چاٹتی حلق تک آگئی اور اس کے دو ٹکڑے ہوگئے۔ یہود اپنے قلعوں میں بھاگنے لگے۔ حضرت علیؓ ان کے تعاقب میں بڑھے، اس حالت میں ایک یہودی نے آپؓ کے دستِ مبارک پر ایسا وار کیا کہ آپؓ کی ڈھال زمین پر گر پڑی اور دوسرا اسے لے کر بھاگا آپؓ نے اس وقت ایک جوش کے عالم میں خندق کو پھاند کر قلعہ کے آہنی دروازے کا پٹ اکھاڑ دیا اور اسے ڈھال بنا کر لڑنے لگے۔ یہی یدُ اللّٰہی ہے اور قوتِ الٰہی

کا مظہر۔ جب جنگ کے بعد لوگوں نے اِس دروازے کو ہٹانا چاہا تو چالیس آدمی اسے ہلا نہ سکے۔ (مدارجِ نبوّت جلد دوم صفحہ ۲۱۴)

یہ واقعہ اس طرح بھی بیان کیا گیا ہے کہ مرحب جو یہود کا ایک بہادر پہلوان تھا، میدان میں نکلا اور مقابلے کا خواہاں ہوا۔ حضرت علیؓ نے چاہا کہ اُس کا مقابلہ کریں، لیکن محمد بن سلمہؓ نے کہا، چونکہ میرا بھائی محمود یہودیوں کے ہاتھوں قتل ہوا ہے، اس لئے اُس کا انتقام لینے کا موقع مجھے دیا جائے۔ اور محمد بن سلمہؓ نے اس کا مقابلہ کیا اور اس کی پنڈلیاں کاٹ دیں، وہ زخم سے تڑپنے لگا۔ لیکن محمد بن سلمہؓ نے اسے قتل نہ کیا بلکہ یہ کہا کہ اچھا ہے کہ تُو اپنی موت کا مزہ چکھتا رہے لیکن حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے اِس حال میں اُسے دیکھ کر اس کا سر قلم کر دیا، اور وہ اپنے کیفرِ کردار کو پہنچا۔

اس کے بعد متعدّد قلعے یکے بعد دیگرے فتح ہوئے، یہاں تک کہ اِس غزوہ میں ۹۳ یہود قتل ہوئے اور پندرہ مسلمان شہید ہوئے۔ اس میں مسلمانوں کو وہ خزانے بھی ملے جو مدینہ منوّرہ سے یہود جلا وطنی کے وقت اپنے ساتھ لے گئے تھے، اور وہ خزانے بھی جو قلعہ میں تھے، یا انہوں نے باہر چھپا دیئے تھے۔ بعض قلعوں سے کھانے کے ذخائر برآمد ہوئے، جو اس وقت مسلمانوں کے کام آئے جب فاقوں کی نوبت آ گئی تھی، اور اس کے استعمال کی اجازت حضورؐ نے انہیں دے دی تھی۔ اس مالِ غنیمت میں تلواریں، نیزے، عربی کمانیں اور زرہیں سب شامل تھیں۔ اس کے ساتھ توریت کے متعدّد نسخے بھی ملے۔ اور یہود ان نسخوں کو واپس لینے حضورؐ کے پاس حاضر ہوئے، تو آپؐ نے انہیں واپس کرنے کا حکم دیا۔ یہود آپ کے اِس جذبۂ احترام سے بھی متاثر ہوئے کہ آپؐ نے ان کی مذہبی کتاب بلا معاوضہ احترام کے ساتھ واپس فرما دی۔

بہت سے اہم واقعات اس غزوہ سے متعلق ہیں۔ فتح خیبر سے واپسی پر حضورؐ کی خدمت میں بکری کا گوشت بطورِ ھدیہ پیش کیا گیا۔ آپؐ نے اس کا ایک ٹکڑا چبایا اور تھوک دیا، کیونکہ اُس بکری نے آپؐ کو خبر دی کہ وہ مسموم ہے۔ جب میزبان یہودن سے حضورؐ نے اس کے متعلق سوال کیا، تو اُس نے اقرار کیا، اور وجہ یہ بتائی کہ اگر آپؐ سچے نبی ہیں تو اللہ تعالیٰ آپؐ کو باخبر کر دے گا، اور اگر ایسا نہیں تو ہم آپؐ سے نجات پا جائیں گے۔ اس کے بعد وہ یہودن ایمان لے آئی۔ اور ایک دوسرے صحابیؓ جنہوں نے گوشت کھایا تھا اُنؓ کی وفات ہوئی۔

۲۔ خیبر کی فتح کے بعد جب حضرت جعفرؓ بن ابی طالب اپنے سولہ ساتھیوں کے ساتھ واپس آئے، تو حضورؐ نے اُنؓ کی پیشانی پر بوسہ دیا اور گلے لگایا۔ اور فرمایا کہ "میں نہیں کہہ سکتا کہ کون سی مسرت میرے لئے بڑی ہے، خیبر کی فتح یا جعفرؓ کی آمد"۔ آپ نے حضرت جعفرؓ سے یہ بھی فرمایا کہ "تم جسمانی اور اخلاقی دونوں حیثیتوں سے میرے مُشابہ ہو"۔ یہ وہ جملہ تھا جس پر حضرت جعفر فخر فرماتے اور فرطِ مسرّت سے رقص فرماتے۔ حضورؐ نے اس رقص پر ناگواری کا اظہار نہیں فرمایا۔ اسی واقعہ کو صوفیہ کے رقص "حال" کے جذبے کی اصل قرار دیا گیا ہے، جبکہ وہ مجالس میں اور ذکر سماع میں وجد کی لذت پر رقص کرتے ہیں۔" (محمدؐ رسول اللہ صفحہ ۵۴۹)

واضح رہے کہ حضورؐ کا جذبۂ مسرّت محض خون کے رشتے یا ماضی کی کارکردگی پر نہیں تھا بلکہ اس اہم واقعہ سے متعلق ہے جس کا ذکر جنگِ موتہ میں آئے گا۔

۳۔ فتحِ خیبر کے بعد جب صحابہؓ تھک کر چُور چُور ہو رہے تھے، تو حضورؐ نے آخرِ شب فرمایا کہ، ہم میں سے کون ہے جو ہمیں فجر کے وقت بیدار کرے۔

حضرت بلالؓ کھڑے ہوئے اور نوافل میں مشغول ہو گئے۔ لیکن ذرا اپنے اُونٹ کی پیٹھ سے ٹیک لگا کر بیٹھے تو نیند کا غلبہ ایسا آیا کہ سو گئے اور سورج نکل آیا۔ پہلے حضورؐ بیدار ہوئے، پھر آپ نے حضرت بلال کو بیدار کیا، اذان ہوئی، اور آپؐ نے باجماعت نماز پڑھی۔ جب سلام پھیرا تو آپؐ نے صحابہؓ سے فرمایا، جب نماز پڑھنا بھول جاؤ تو یاد آنے پر ادا کرو۔

۴۔ اس غزوہ میں فدک آپؐ کی ذاتی ملکیت میں آگیا، جو یہود نے آپ ہی کو پیش کیا تھا۔ آپؐ اس کی آمدنی مسافروں پر، بنی ہاشم کے بچوں کی تربیت پر، اُن کی بیوہ خواتین کی شادیوں پر خرچ فرماتے۔ یہی وہ فدک ہے جو باعثِ نزاع بنا، جس کا ذکر آئندہ اپنے موقع پر آئے گا۔

۵۔ اسی غزوہ میں حضورؐ نے گدھے کے گوشت کی حرمت فرمائی۔ صحابہ کرامؓ نے یہ آواز سنتے ہی اپنی ہانڈیاں اُلٹ دیں اور گوشت پھینک دیا۔

۶۔ اسی غزوہ میں مدتِ معینہ تک نکاح کی، جس کو متعہ کہتے ہیں، ممانعت ہوئی۔ اور غزوۂ اوطاس میں پھر مباح ہوا اور پھر حرام ہوا اور حضورؐ نے فرمایا "متعہ" حرام ہے قیامت تک۔ (تاریخ اسلام صفحہ ۲۵۵)

۷۔ غزوۂ خیبر کے واقعات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ جب حضورؐ نے وادیٔ قریٰ کی طرف جاتے ہوئے منزلِ صہبا میں قیام فرمایا تو نمازِ عصر کے بعد حضرت علیؓ کے زانو پر سر رکھ کر لیٹ گئے اور آپ سو گئے کہ وحی کا نزول شروع ہو گیا۔ اس میں اس قدر دیر لگی کہ آفتاب غروب ہو گیا۔ حضورؐ نے علیؓ سے دریافت فرمایا کہ تم نے نمازِ عصر پڑھی۔ آپؓ نے کہا، نہیں یا رسول اللہؐ۔ حضورؐ نے یوں دُعا فرمائی کہ اے رب اگر علیؓ تیرے اور تیرے رسولؐ کی اطاعت میں تھے تو آفتاب کو حکم دے کہ وہ لوٹ آئے تا کہ وہؓ نمازِ عصر ادا کریں۔ یہی ہوا کہ آفتاب واپس ہوا، اس کی شعاعیں پہاڑوں اور ٹیلوں پر پڑیں۔ یہ منظر مخلوقِ خدا

نے دیکھا۔ درحقیقت یہی وہ روح پرور واقعات ہیں جو ایک طرف اہلِ ایمان کی تازگی اور شگفتگی کے موجب ہوتے، تو دوسری جانب دعوتِ اسلام کی صداقت کے۔ (مدارج نبوت جلد دوم صفحہ ۴۲۷)

حضورؐ جب واپس ہوئے تو وادیٔ قریٰ کی طرف متوجہ ہوئے جہاں کے یہود آمادۂ پیکار تھے۔ آپؐ نے چار دن وہاں قیام فرمایا، اسلام کی دعوت دی۔ جو لوگ جنگ پر آمادہ ہوئے، اُن سے جنگ ہوئی، اس میں بہت سے یہود مارے گئے، اور بہت سا سامان مسلمانوں کے ہاتھ آیا۔ آپؐ نے وادیٔ قریٰ کے یہودیوں پر یہ احسان کیا کہ اُن کی اراضی اور اُن کے باغات انہیں واپس فرمائے۔

اسی سال کے بعد اس عمرہ کی جو صلح حدیبیہ میں قضا ہوا تھا تکمیل فرمائی گئی۔ اسے عمرۂ قضا کہہ لیجئے یا دوسرا عمرہ، یہ فقہی مسئلہ ہے۔

جیسا ابتداء میں کہا جا چکا ہے کہ حضورؐ نے عرب کے باہر جن سلاطین کو خط بھیج کر فراستِ نبویؐ کا اظہار کیا تھا۔ اس کی افادیت کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ خالد بن ولید جو مسلمان نہیں ہوئے تھے کہتے ہیں کہ صلح حدیبیہ کے وقت میں نے سوچا قریش میں کوئی قوت نہیں رہ گئی۔ میں نجاشی کے پاس بھی نہیں جا سکتا کہ وہ مسلمان ہو گیا۔ پھر خیال آیا کہ ہرقل کے پاس جا کر میں نصرانی ہو جاؤں۔ آخر سوچا کہ اپنے ملک میں ٹھہرا رہوں اور دیکھوں کہ پردۂ غیب سے کیا ظہور میں آتا ہے۔ آخر اللہ رب العزت نے انہیں اسلام سے سرفرازی بخشی اور اسلام کو عظیم جرنیل عطا فرمایا۔" وہ جرنیل جسے حضرت رسولِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کی تلوار فرمایا۔ حضرت خالد شہادت کی شدید تمنا کرتے تھے لیکن یہ تمنا پوری نہیں ہوئی کیونکہ اللہ کی تلوار ٹوٹ نہیں سکتی تھی۔"[1]

---

[1] محترم کشفی صاحب۔

سریۂ موتہ (جمادی الاول ۸ھ)
(روم کی عظیم عیسائی سلطنت سے مقابلہ)

امام بخاریؒ نے اِس سریہ کو غزوہ لکھا ہے، اگرچہ حضورؐ بنفسِ نفیس اِس میں شریک نہ تھے۔ اس کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ ایک عظیم حکومت کی ایک کثیر فوج کے مقابل مسلمانوں کا ایک لشکر بھیجا گیا تھا۔ حقیقت یہ بھی ہے کہ یہ سریہ نہیں غزوہ ہی تھا، اور ہر چند حضورؐ اس میں جسم و جسمانیت کے ساتھ موجود نہ تھے، لیکن جو کچھ ہو رہا تھا وہ سب حضورؐ کی نظروں کے سامنے تھا، اس کی تنظیم بھی حضورؐ ہی نے فرمائی، جیسا کہ آگے ذکر آئے گا۔

اس غزوہ کا سبب یہ ہوا کہ حضورؐ نے حارث بن ابی شمر غسانی کے نام ایک نامۂ گرامی دے کر بھیجا تھا، جو ہرقل قیصر روم کی طرف سے بصرہ کے حاکم تھے۔ حضورؐ کے یہ نامہ بر حضرت حارثؓ بن عمیر ازدی تھے۔ جب آپؓ موتہ میں ٹھہرے تو شرجیل بن عمر غسانی نے، جو قیصر روم کی طرف سے شام کا حاکم تھا، آپؓ کو ٹوکا اور دریافت کیا کہ تمہارا کیا ارادہ ہے، شاید تم محمدؐ کے قاصد ہو۔ انہوںؓ نے فرمایا، ہاں اُس نے سنتے ہی اُنہیںؓ بندھوا کر اُنؓ کی گردن اُڑا دی۔ حضورؐ کے صرف یہی قاصد تھے جو شہادت سے سرفراز ہوئے۔

آنحضرتؐ کو یہ خبر ملی تو آپ کو اس کا صدمہ ہوا، اور فوراً روم سے جہاد کے لئے ایک لشکر ترتیب دیا گیا۔ مسلمانوں کی یہ جنگ ایک عالمی مسیحی لشکر سے تھی۔ مسلمانوں کی جماعت تین ہزار مجاہدین پر مشتمل تھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے زیدؓ بن حارث کو اس لشکر کا سپہ سالار مقرر فرمایا اور ارشاد فرمایا کہ اگر زیدؓ جہاد میں کام آجائیں تو اُن کی جگہ حضرت جعفرؓ بن ابی طالب لیں گے، اور اگر وہ بھی شہید ہو جائیں تو عبداللہؓ بن رواحہ سپہ سالار ہوں گے۔ اگر

وہ بھی شہید ہوں تو جماعت جس کو چاہے سپہ سالار مقرر کرے۔ گویا جنگ کا نقشہ نگاہِ رسالت ﷺ کے سامنے تھا اور یہ بھی معلوم تھا کہ بالآخر کس کی فتح ہو گی۔ یہ وہی خالد رضؓ ہوں گے جن کو ابھی اسلام میں داخل ہوئے تین ماہ بھی نہیں ہوئے تھے۔ اور جو قریش کی کمزوریوں سے بیزار ہو کر عیسائیت قبول کرنے کا خیال کر رہے تھے۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ

اس فراستِ نبوی کی طرف توجہ دلائی جائے جس کا ایک سرا مشیئتِ الٰہی سے متعلق ہوتا ہے اور دوسرا مخلوق سے۔ واضح رہے کہ حضور کی مدنی زندگی میں چار اصول آپ ﷺ کی حکمت عملی کا ستون تھے، یعنی ضبط و تنظیم، صبر و تحمل، عزم و توکل اور جہاد (شجاعت و قدرت) لیکن دراصل اس کا سرچشمہ بارگاہِ ایزدی کے علم و رضا سے متعلق تھا، جس کی اطلاع وحی کے ذریعے ہوتی رہتی، اور آپ ﷺ اس کی وسعتوں سے کماحقہٗ آگاہ ہوتے، جس کا علم دوسروں کو وقت آنے ہی پر ہوتا۔ چنانچہ صلحِ حدیبیہ کے موقع پر فتحِ مبین کا اشارہ نہ صرف ظاہری عسکری فتح، فتح مکہ، فتح خیبر سے متعلق تھا، بلکہ فتوح القلوب کی بھی نشاندہی کر رہا تھا جس کے جلوے فتح مکہ میں عام ہوئے، اور ساتھ ہی یہاں آنے والے قلبی مکاشفات کی غمازی بھی کر رہا تھا، جو آپ ﷺ کے صحابہؓ، متبعینؒ، اولیاءِ کرام کو میسر آنے والے تھے۔ البتہ اس کے لئے تنظیم کے ساتھ شجاعت اور فراست ضروری ہو گی۔ اَلسَّعْیُ مِنِّیْ وَالْاِتْمَامُ مِنَ اللّٰہِ اسی کی طرف اشارہ ہے۔

یہ بھی واضح رہے

کہ حضور کا ہر فعل رہتی دنیا تک ایک اسوۂ حسنہ ہے، یعنی کام کرنے کا وہ طریقہ جو اللہ کو پسند ہو اس لئے کسی جنگ کی حالت میں بھی حضور ﷺ ان فرائضِ منصبی کی طرف ضرور نشاندہی فرماتے جو اصحابؓ کو جنگ کی حالت میں بھی برقرار رکھنے

کا حکم تھا۔ دیکھئے قیصرِ روم کی ایک یا دو لاکھ فوج سے مقابلہ ہے اور فوج بھی وہ جو تمام مروّجہ آلاتِ حرب سے آراستہ ہے اس وقت آپؐ اپنے جانثار صحابہؓ کو جو اِس مختصر اسلامی لشکر میں شامل ہیں یوں نصیحت فرماتے ہیں:
"میں تمہیں خدا کی طرف توجّہ اور اپنے مسلمان ساتھیوں سے حسنِ سلوک کی نصیحت کرتا ہوں۔ اللہ کا نام لے کر اللہ کی راہ میں اللہ کے بن کر جہاد کرنا، نہ عہد شکنی کرنا نہ کسی قسم کی زیادتی کرنا، نہ کسی بچّے عورت اور بوڑھے اور عبادت گاہ میں گوشہ نشین شخص کو قتل کرنا، کسی کھجور کے باغ کے قریب تک نہ جانا، نہ کسی مکان کو منہدم کرنا۔ (محمد رسول اللہ صفحہ ۸، ۵)
کون جرنیل کون حاکم اِن حالات میں ان امور کی طرف اس فیصلہ کُن انداز سے لشکر کی توجہ مبذول کرنے کا تصوّر بھی کر سکتا ہے۔ یہ تو وہی ذاتِ مقدّسہ کرے گی جس کا مقصدِ حیات یہ زندگی نہیں بلکہ وہ ذات ہو جو خالقِ کائنات ہے اور جس کی طرف ہر ایک کو واپس ہونا ہے۔

جنگ کا نقشہ

اِدھر اسلامی لشکر کی خبر غسّانی کو ملی، اور وہ ایک لاکھ رومیوں کے ساتھ مقابلے کے لئے نکل کھڑا ہوا۔ مسلمانوں کے سامنے ایک جرّی لشکر تھا۔ بعض کا خیال ہوا کہ صورتِ حال سے حضورؐ کو مطلع کیا جائے لیکن حضرت عبداللہ بن رواحہؓ کھڑے ہوتے ہیں اور افواج کو یوں مخاطب فرماتے ہیں کہ دیکھو جس غرض سے تم نے یہ سفر کیا ہے اگر وہ حاصل نہ ہوا تو یہ کیا کم ہے کہ اس مقصد کے لئے تمہاری جان کام آجائے گی، سب کے حوصلے بلند ہو گئے۔ مشرکوں کی فوج نے اسلامی لشکر کو اچانک گھیر لیا۔ مقابلہ ان لوگوں سے تھا جن کے بے پناہ ہتھیار گھوڑے جنگی سامان موجود تھا۔ مسلمان انتہائی عزم،

شجاعت بہادری سے لڑے، لیکن ایک طرف تین ہزار سپاہی اور دوسری طرف اتنا عظیم لشکر۔ پہلے زیدؓ بن حارثہ شہید ہوئے۔ اب علم حضرت جعفرؓ بن ابی طالب نے سنبھالا، جو پہلے گھوڑے پر بیٹھ کر برد آزما رہے، پھر گھوڑے سے اُتر کر اسے مار دیا، اور جنگ میں مصروف ہو گئے۔ گھوڑا اس لئے مار دیا کہ اس پر بیٹھ کر کوئی دشمنِ اسلام کسی مسلمان کو نقصان نہ پہنچا سکے۔ یہ تھا اندازِ حسنِ سلوک اپنے بھائی مسلمانوں کے ساتھ عین جنگ کی حالت میں۔

ادھر جنگ موتہ ہو رہی تھی اور اُدھر مدینہ منورّہ میں حضورؐ کے سامنے سے حجاب اُٹھا دیئے جاتے ہیں۔ آپؐ ان واقعات کو آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں اور فرما رہے ہیں۔ دیکھو!

"حضرت جعفرؓ نے پہلے اپنے گھوڑے کی کوچیں کاٹ دیں، پھر حملہ کیا۔ انؓ کا دایاں بازو کٹ گیا تو علم بائیں ہاتھ میں لے لیا۔ بایاں بھی کٹ گیا تو بغل میں لے لیا، یہاں تک کہ شہید ہو گئے" حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا بیان ہے کہ میں نے انؓ کی لاش کو دیکھا تو اس پر نوّے سے زیادہ زخم تلواروں اور برچھیوں کے تھے جو سب سامنے تھے پشت پر ایک بھی نہ تھا۔

حضورؐ نے حضرت جعفرؓ کی شہادت کے بعد انؓ کو بہشت میں فرشتوں کے ساتھ اُڑتے ہوئے دیکھا، یوں بھی ہے کہ بشکلِ فرشتہ دونوں بازوؤں کے ساتھ اُڑتے ہوئے دیکھا۔ اسی لئے اُن کو جعفرِ طیارؓ یا جعفر ذوالجناح بھی کہتے ہیں۔ (سیرتِ رسولِ عربیؐ۔ علامہ نور بخش توکلیؒ۔ صفحہ ۱۴۳)

شاید یہی وہ واقعہ ہے کہ جس کی بِنا پر حضورؐ نے حضرت جعفرؓ کو حبش سے واپسی پر دیکھ کر فرمایا تھا کہ میں نہیں کہہ سکتا کہ مجھے خیبر کی فتح کی زیادہ خوشی ہے یا جعفرؓ کی ملاقات کی۔

حضرت جعفرؓ کے بعد علم عبداللہؓ بن رواحہ نے سنبھالا۔ جب آپؓ بھی

شہید ہوتے، اس کے بعد مجاہدوں نے خالدؓ بن ولید کو اپنا امیرِ لشکر مقرر کیا۔
خالدؓ بن ولید نے عسکری حکمتِ عملی سے کام لیا اور اگلے دن دستے کو پیچھے کی
طرف اور داہنی جانب میمنہ کو میسرہ کی طرف تبدیل کیا۔ رومی سمجھے کہ کمک
آگئی ہے۔ ادھر مسلمان جانثار جس عزم اور شجاعت کا مظاہرہ کر رہے تھے
اس سے بھی ان کی ہمت لوٹ رہی تھی۔ چنانچہ رومی لشکر بھاگ کھڑا ہوا،
اور فتح کا سہرہ خالدؓ بن ولید کے سر رہا۔

کیا یہ نگاہِ نبوت کی صداقت کے لئے کافی نہیں کہ ایک معجزانہ
انداز سے اس جنگ کے تینوں سپہ سالاروں کی شہادت کی اطلاع
سرکارؐ نے رخصت ہوتے وقت دے دی تھی اور یہ بھی ہدایت کی کہ کس کے
بعد کون سپہ سالار ہوگا۔ اور پھر جب لشکر واپس آیا تو منادی کرائی گئی، لوگ
جمع ہوئے، حضورؐ نے فرمایا کہ تم حالات بیان کرتے ہو یا میں بیان کروں
پھر جنگ کے چشم دید حالات حضورؐ نے بیان فرمائے۔ حضورؐ نے اس دن
اس لشکر کو کرّاری قرار دیا اور خالد بن ولید کا ذکر سیف اللہ کہہ کر فرمایا۔ اس
جنگ میں ہونا تو یہ چاہیئے تھا کہ مسلمانوں کا کوئی مجاہد بھی نہ بچتا لیکن یہ اللہ
کا کرم تھا کہ دو لاکھ کے مقابلے میں بارہ[۱۲] مسلمان شہید ہوئے، باقی صحیح سالم مدینہ
واپس آئے۔ مقتولین کی تعداد کیا تھی، یہ معلوم نہ ہو سکا۔ حقیقت یہ ہے
کہ یہ غزوہ موتہ حضورؐ کی صداقتِ نبوّت کی معجزانہ شہادت ہے، جس نے
مسلمانوں کے دلوں کو شگفتگیٔ ایمان سے نوازا اور کفّار اور اہلِ کتاب
کے دل ہلا دیئے۔

دیکھیے

جنگ کے بعد بھی جنگ کے متعلق اہم امور کی تعلیم و تربیت کا کام جاری
ہے۔ کہ نبوّت کا اصل مقصد مسلمانوں کی سیرت کی تشکیل ہے۔ حضورؐ حضرت

جعفرؓ کے گھر جاتے ہیں اُنؓ کی شہادت پر غم گساری فرماتے ہیں، ان کے متعلقین کے لئے دعائے خیر کرتے ہیں۔ پھر اپنے گھر آتے ہیں اور حضرت جعفرؓ کے گھر والوں کے لئے کھانا تیار کرنے کا حکم دیتے ہیں۔ پھر اپنی بیٹی حضرت فاطمہ زہراؓ کے پاس آتے ہیں۔ آپؐ اپنے چچا کو یاد فرماتی ہیں وہاں بھی تسلی تشفی کے ساتھ اپنے شہید چچا کے گھر والوں کے لئے کھانا تیار کرنے کا حکم دیتے ہیں۔ یہی وہ سنّت ہے جو آج بھی مسلمانوں میں اموات کے موقع پر قائم ہے۔

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ اصل مقصد فروغِ اسلام کے لئے نازک ترین حالات میں بھی نہ کسی قربانی سے دریغ کیا گیا، اور نہ کسی کسل کو دخل دیا گیا۔ سخت سے سخت مہم میں انتہائی ناسازگار حالات میں جاںنثار اور وفاشعار صحابہؓ نے فدائیتِ رسولؐ کی نئی نئی روائتیں قائم کیں، اور ہر حال میں توحید کی عظمت اسلام کے فروغ کی تمنا، اور جذبۂ خیرخواہی دلوں میں راسخ رہا۔

یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ آج بھی "مَا صَاحِبُكُمْ" کی بشارت ہمارے ساتھ ہے۔ آپؐ کی رحمت آج بھی ہمارے لئے مینارِ کرم ہے۔ البتہ ہمیں یہود و نصاریٰ اور مشرکین سے کسی مقابلے میں یونہی تنظیم فراست و شجاعت سے اپنے ایمان اور اپنے جذبۂ جاںنثاری کا ثبوت دینا ہوگا، اس یقین کے ساتھ کہ اللہ اور اس کے رسولؐ کا کرم ہمارے ساتھ ہے۔ تربیتِ رسالت آج بھی ہماری رفیق ہے۔ یہ رفاقت ابدی ہے، اور ان کی نگاہِ کرم آج بھی ہمارے حال سے غافل نہیں۔ (الحمد للہ)

ص۱ سورۃ النجم آیت ۲

فتح مکہ

اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا (سورۃ الفتح)

اسی سال، ۸ رمضان المبارک کو جب مدینہ اور اس کے ارد گرد چھوٹی چھوٹی جھڑپیں جاری تھیں، آخر وہ وقت آ گیا کہ وہ فیصلہ کن مقابلہ بھی ہو جاتے، اسلام غالب ہو اور کفر کی ہر طاقت کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے پاش پاش کر دیا جائے۔ اس کی ابتدا اس طرح ہوتی ہے کہ آنحضرت ؐ سے صلح حدیبیہ میں یہ معاہدہ ہو چکا تھا کہ جو قبیلہ جس قبیلے کا حلیف بننا چاہے بن سکتا ہے، چنانچہ قبیلۂ بنو بکر قریش کے معاہدے اور ذمہ داری میں داخل ہو، اور قبیلۂ خزاعہ آنحضرت ؐ کے معاہدے اور ذمہ داری میں داخل ہوا۔ ان دونوں قبیلوں میں زمانۂ جاہلیت میں جنگیں ہوتی رہتی تھیں لیکن اسلام کے ظہور کے بعد یہ جنگیں سرد پڑ گئی تھیں۔

صلح حدیبیہ کے بعد صورتِ حال اور بگڑ گئی لوگ کھل کر مسلمانوں کو بُرا کہتے، ان کی ہجو کرتے، اور ان کے سردار اپنے اپنے مقاصد کے تحت مشغولِ عمل رہتے۔ اس سلسلے میں کچھ واقعات ایسے ہوئے کہ قریش نے خزاعہ کے مقابلے میں بنو بکر کی مدد کی، اور ان کے اور آنحضرت ؐ کے درمیان جو معاہدہ تھا اُسے توڑ دیا۔ خزاعہ پر متعدد حملے ہوئے، یہاں تک کہ مجبور ہو کر اس نے حرم میں پناہ لی۔ "بنو بکر حرم کا احترام ملحوظ رکھ کر رُک گئے لیکن اُن کے رئیسِ اعظم نوفل نے کہا کہ یہ موقع پھر کبھی ہاتھ نہیں آ سکتا اور حدودِ حرم میں خزاعہ کا خون بہایا گیا۔" (سیرت النبی جلد اوّل صفحہ ۴۷۲)

حارث بن ہشام نے ابوسفیان کے پاس آ کر اپنی قوم کی اس نادانی کی اطلاع دی۔ ابوسفیان نے کہا کہ یہ ایسا واقعہ ہے کہ محمد ؐ ضرور ہم سے جنگ

کریں گے۔ اور اُس نے اپنی بیوی ہندہ کا خواب بیان کیا کہ حجون سے خون کا ایک سیلاب امڈتا ہوا آیا ہے اور خزمہ میں آکر رک گیا ہے[1]۔ یہ بھی اسی قدرتِ خفی کا کرشمہ تھا جو ابوسفیان کی بیوی کو دکھلایا گیا کیونکہ اس کی نفرت مسلمانوں سے لانہایت تھی۔ دوسری طرف خزاعہ کے سردار عمر بن سالم خزاعی وہاں سے چالیس سواروں کے ساتھ روانہ ہو کر حضورؐ کی خدمتِ اقدس میں مدینہ پہنچے، اور فی البدیہہ چند اشعار پڑھے[2]، جن کا ترجمہ یہ ہے۔

"اے اللہ میں محمدؐ کو یاد دلاتا ہوں، وہ پُرانا معاہدہ جو ہمارے باپ اور اس کے باپ عبدالمطلب کے درمیان ہوا۔"

"یارسول اللہ! آپ ہماری مدد کیجئے، اور اللہ کے بندوں کو بلائیے جو ہماری مدد کو آئیں۔ قریش نے آپؐ سے وعدے کے خلاف کیا، اور آپؐ کا حکم اور وعدہ توڑ ڈالا۔"

"انہوں نے وتیر میں ہمارے گھروں پر بحالتِ خواب حملہ کیا اور ہمیں رکوع و سجود کی حالت میں قتل کر دیا۔"

حضورؐ نے فرمایا عمر تمہاری مدد کی جائے گی۔ پھر آپؐ نے حضرت ضمرہؓ کو تین شرائط کے ساتھ بھیجا کہ قریش ان میں سے جس کو چاہیں اختیار کر لیں۔
(۱) خزاعہ کے مقتولین کا خون بہا۔ (۲) قریش، بنوبکر کی حمایت میں دستبردار ہو جائیں (۳) اعلان کر دیں کہ حدیبیہ کا معاہدہ ٹوٹ گیا۔ قریش نے تیسری شرط منظور کر لی۔ اس طرح حدیبیہ کا صلح نامہ ختم ہوا۔

حضورؐ نے پوشیدہ طور پر جنگ کی تیاریاں شروع کیں لیکن یہاں

---

[1] محمد رسول اللہ صفحہ ۵۹۲

[2] زرقانی بحوالہ سیرت رسول عربی، علامہ نور بخش توکلی صفحہ ۱۴۵۔

حاطب بن ابی بلتعہ نے اہلِ مکہ کو ایک خفیہ خط کے ذریعے حضورؐ کی تیاریوں کی اطلاع دینے کے لئے ایک عورت کے ہاتھ ایک خط بھیجا۔ آنحضرتؐ کو اللہ تعالےٰ نے باخبر فرما دیا۔ آنحضرتؐ نے حضرت علیؓ، زبیرؓ اور مقدادؓ کو روانہ کیا اور فرمایا کہ روضہ خاخ میں تم کو ایک سانڈنی سوار عورت ملے گی۔ اُس کے پاس قریش کے نام ایک خط ہے وہ لے آؤ۔ اِن حضراتؓ نے اس عورت کو روضہ خاخ میں جا لیا۔ اور اس خط کے متعلق دریافت کیا۔ اُس نے انکار کیا، اُس کی تلاشی لی، کچھ برآمد نہ ہوا۔ حضرت علیؓ نے فرمایا کہ میں قسم کھاتا ہوں کہ رسول اللہؐ نے جھوٹ نہ فرمایا، تم خط نکال دو ورنہ میں تمہارے کپڑوں کی تلاشی لوں گا۔ یہ سُن کر اس نے اپنے سر کے بالوں میں سے وہ خط نکالا۔ یہ خط حضورؐ کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ آپؐ نے حاطبؓ سے پوچھا، تم نے یہ کیا حرکت کی۔ انہوں نے جواب دیا۔ یا رسول اللہ! میرے بال بچے مکہ میں ہیں، اور وہاں میرا کوئی نہیں، میں نے چاہا قریش کی ہمدردی حاصل کروں تاکہ میرے بچے محفوظ رہیں۔ بس یہی حقیقتِ حال ہے۔ ورنہ اللہ اور رسولؐ جانتے ہیں کہ میں دین سے نہیں پھرا ہوں، اور مجھے یہ بھی یقین ہے کہ فتح آپ ہی کی ہوگی میرے خط سے یہ رُک نہ جائے گی۔ حضرت عمر فاروقؓ نے حاطبؓ کا سر قلم کرنے کا مشورہ دیا۔ لیکن حضورؐ نے فرمایا کہ انہیںؓ کچھ نہ کہو کہ یہ اصحابِ بدر میں سے ہیں۔ (سیرت رسولِ عربی۔ نور بخش توکلی صفحہ ۱۴۶)

المختصر آنحضرتؐ ۱۰ رمضان المبارک کو ۱۰ ہزار فوج کے ساتھ مدینہ سے روانہ ہوئے۔ حضرت عباسؓ جو ہجرت کر کے مدینہ منورہ آ رہے تھے وہ بھی شریک ہوئے، البتہ اپنے اہل و عیال کو مدینے روانہ کر دیا۔ یہ بھی فراستِ نبوی تھی کہ ایک مقام پر پہنچ کر آپؐ نے فوج کو الگ الگ آگ روشن کرنے کا حکم دیا۔ قریش کو لشکرِ اسلام کی روانگی کی اطلاع مل چکی تھی۔ ابوسفیان اس کی

تحقیق میں نکلا تھا کہ یہ آگ دیکھی۔ اُس نے اپنے ساتھیوں سے کہا یہ آگ کیسی ہے۔ کسی نے کہا کہ خزاعہ قبیلے کی آگ ہے۔ ابوسفیان نے جواب دیا کہ وہ چند گنتی کے لوگ ہیں، یہ آگ ان کی نہیں ہو سکتی۔ اس درمیان میں خیمۂ نبوی کی حفاظت پر مامور دستے نے ابوسفیان کو پکڑ لیا اور حضورؐ کی خدمت میں لے گئے، ابوسفیان اُس وقت ایمان لے آیا۔

آنحضرتؐ کو ابوسفیان کی قلبی کیفیت کا اندازہ تھا چنانچہ آپؐ نے مکّہ کی طرف روانگی کے وقت حضرت عباسؓ سے فرمایا کہ ابوسفیان کو پہاڑ کی چوٹی پر کھڑا کر دو، تاکہ وہ لشکرِ اسلام کا منظر آنکھوں سے دیکھے لشکر کے جتھے یکے بعد دیگرے نکلنا شروع ہوئے فضا نعرۂ تکبیر سے گونج گئی سعدؓ بن عبادہ جن کے ہاتھ میں علم تھا انہوں نے ابوسفیان سے کہا آج گھمسان کے معرکے کا دن ہے آج کعبہ حلال کر دیا جائے گا۔ حضورؐ کو جب اس کی اطلاع ہوئی تو آپؐ نے فرمایا کہ سعد نے غلط کہا۔ (حقیقت یہ ہے) "کہ آج کعبہ کی عزت کا دن ہے اور اُس پر غلاف چڑھایا جائے گا"۔ اس کے بعد حکم دیا کہ علم سعدؓ سے لے کر قیسؓ ان کے بیٹے کو دے دیا جائے۔ جہاں اس قدر قلبی نزاکتوں پر نظر ہو، اس نگاہِ دُور رس کے انداز کون سمجھ سکتا ہے۔

حضورؐ اس شان سے مکّے میں داخل ہوتے کہ آپؐ قصویٰ نامی اونٹنی پر سوار تھے سرخ چادر کے ٹکڑے سے سر کو لپیٹے ہوئے تھے۔ آپؐ کے پیچھے اُسامہؓ بن زید سوار تھے۔ آگے پیچھے دائیں بائیں، مہاجرین و انصار کی کثرت تھی۔ مکّے میں داخل ہوتے وقت مسلمانوں کی اس کثرت عظیم الشان اجتماع پر جب حضورؐ کی نظر پڑی تو سرورِ کائناتؐ نے اپنا سر عاجزی سے جھکا لیا اور زبانِ مُبارک سے فرمایا:۔ اللّٰھُمَّ لا عیش الا عیش الآخرۃ " اے میرے اللہ حقیقی زندگی آخرت ہی کی زندگی ہے۔

آپؐ نے اس دن جملہ سردارانِ لشکر کو حکم دیا کہ جنگ سے باز رہیں اور کسی سے جنگ نہ کریں بجز اس کے کہ وہ خود ہی ان سے لڑنے کی ابتداء کریں۔ اور خالد بن ولید کو حکم دیا کہ مکہ کی زیریں گھاٹی سے داخل ہوں۔ اور حضورؐ سے صفا میں آکر ملیں اس درمیان کسی سے جنگ نہ کریں لیکن اس وقت صفوان بن امیہ قریش کی ایک جماعت کے ساتھ خالد کے راستے میں حائل ہوئے اور ان پر تیر برسائے۔ آخر کار خالد بن ولید کو مقابلہ کرنا پڑا اس میں دو صحابی شہید ہوگئے اور بارہ تیرہ قریش قتل کئے گئے، حضورؐ نے خالد بن ولید سے باز پرس فرمائی اور خالد کی اس یقین دہانی پر کہ ان کے دستے پر حملہ پہلے کفار نے کیا تو حضورؐ نے فرمایا: اللہ کو یوں ہی منظور تھا۔

جب حضورؐ بیت اللہ شریف کے قریب پہنچے تو آپؐ کے گرد سراپا آہن پوش مہاجرین و انصار کے سوا کوئی نہ تھا۔ آپؐ قصویٰ سے اترے پہلے حجر اسود کو بوسہ دیا پھر اپنی اونٹنی پر طواف کیا بیت اللہ کے گرد ۳۶۰ بت تھے۔ جنہوں نے خانۂ خدا کو بت خانہ بنا رکھا تھا۔ آپؐ کے دستِ مبارک میں ایک لکڑی تھی۔ آپ ایک ایک کرکے انکو "ٹھوکے" دیتے اور گراتے جاتے تھے اور آپؐ کی زبانِ مبارک پر یہ آیت تھی:۔

"جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ ۚ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا" (بنی اسرائیل۔۸۱)

(حق آگیا اور باطل مٹ گیا بے شک باطل مٹنے ہی والا ہے)

بت اوندھے منہ گرتے جاتے تھے آپؐ بیت اللہ شریف کے اندر داخل ہوئے تو حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسمٰعیلؑ کے مجسمے دیکھے جن کے ہاتھوں میں جوا کھیلنے کے تیر دیئے گئے تھے آپؐ نے فرمایا خدا ان کو غارت کرے اللہ کی قسم ان دونوں نے کبھی تیروں سے جوا نہیں کھیلا، کعبہ کے اندر بھی لکڑی کی ایک کبوتری بنی ہوئی تھی آپ نے اسے توڑا جو تصویریں تھیں انہیں مٹایا

اور اللہ کا گھر تو اللہ کے لئے اور طواف کرنے والوں کے لئے پاک بنا دیا۔ حضورؐ نے کعبہ کے اندر نماز پڑھی۔ اور ہر طرف تکبیر کہی پھر دروازہ کھول دیا گیا۔ مسجدِ حرام قریش کی صفوں سے بھری ہوئی تھی۔ آپؐ نے دروازے کے بازوؤں کو پکڑ کر خطبہ دیا۔ فرمایا:۔

ایک اللہ کے سوا کوئی معبود برحق نہیں اس کا کوئی شریک نہیں، اللہ نے بے شک اپنا وعدہ پورا فرمایا اور اپنے بندے کی مدد کی اور کافروں کے گروہوں کو شکست دی۔ اے قریش اللہ نے تم سے جاہلیت کا غرور اور نسبت پر افتخار دور کر دیا تمام لوگ آدم کی اولاد ہیں اور آدم مٹی سے بنے۔ پھر یہ آیت پڑھی:۔

يَاأَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّأُنْثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَّقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا ۚ إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ ۝

(الحجرات۔۱۳)

اے لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تمہاری قومیں اور قبیلے بنائے تاکہ ایک دوسرے کی شناخت کرو اور اللہ کے نزدیک تم میں زیادہ عزت والا وہ ہے جو زیادہ پرہیزگار ہے۔

(اقتباس از سیرت رسولِ عربیؐ مولانا نور بخش توکلی صفحہ ۱۴۷)

ان کرم نوازیوں کا کیا بیان ہو جو فطرتِ نبوی کے ساتھ خاص تھیں۔ اس کا ایک منظر تو وہ تھا کہ لوگ اسلامی لشکر کو دیکھ کر بدحواس ہو کر بھاگ رہے تھے اور حضورؐ کے عفو و درگزر کا اب یہ عالم تھا کہ اعلانِ عام تھا:۔

۱۔ جو ابوسفیان کے گھر میں چلا جائے امن پا گیا حالانکہ ابوسفیان ہی ہادیِ اسلامؐ اور اسلام کے شدید ترین دشمن تھے۔

۲۔ جو خانۂ کعبہ میں داخل ہو گیا امن پا گیا۔

۳۔ جس نے ہتھیار ڈال دیئے یا اپنے گھر کے دروازے بند کر لئے اس کے لئے بھی امن ہے۔

اور اب قریش حضورؐ کے سامنے ہیں جن سے مسجد بھری ہوئی ہے، یہ وہی لوگ ہیں جنہوں نے اپنی ایمان دشمنی اور حضورؐ کو اذیت پہنچانے میں کوئی کسر باقی نہیں چھوڑی۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم قریش سے پوچھتے ہیں کہ بتاؤ آج ہم تمہارے ساتھ کیا سلوک کریں۔

قریش جواب دیتے ہیں۔ ہم آپؐ سے نیکی کی توقع رکھتے ہیں۔ آپؐ شریف بھائی اور شریف برادر زادہ ہیں۔

حضورؐ کی زبانِ مبارک پر وہی الفاظ آتے ہیں جو حضرت یوسفؑ نے اپنے بھائیوں سے کہے تھے: "لَا تَثْرِیْبَ عَلَیْکُمُ الْیَوْمَ"

اِذْهَبُوْا فَاَنْتُمُ الطُّلَقَاءُ

آج تم پر کوئی الزام نہیں۔ جاؤ تم آزاد ہو۔

اعلانِ عفو کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم حرم میں بیٹھ جاتے ہیں کرم نوازی کا یہ سلسلہ جاری ہے، حکم فرماتے ہیں کہ تم بھی بیٹھ جاؤ، عثمان بن طلحہ کو بلایا جاتا ہے۔ یہ وہی ہیں جنہوں نے حضورؐ سے گستاخیاں کی تھیں اور آپؐ نے فرمایا تھا کہ اس خانۂ کعبہ کی کنجیاں ایک دن میرے ہاتھوں میں ہوں گی۔ عثمان نے جواب دیا تھا کہ بے شک اس دن قریش ہلاک ہو جائیں گے۔ آپؐ نے فرمایا تھا کہ نہیں بلکہ وہ زندہ رہیں گے اور عزت پائیں گے، اور یہ کنجی جو

آج تمہارے پاس ہے اور اس دن بھی تمہارے پاس ہی رہے گی۔ آج جب عثمان کی طلبی ہوئی تو وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ واقعی کنجی انہی کو عطا ہوگی۔ وہ کنجی جس کے طالب جلیل القدر صحابی تھے کنجی عثمان بن طلحہ کو عطا ہوئی اور پیشگوئی بھی پوری ہوئی۔ کون تصور کرسکتا ہے اُس عفوونوازی کا جس کا مظاہرہ کوہِ صفا پر ہوا۔ حضورؐ جب بیت اللہ سے صفا تشریف لے گئے تو وہاں بھی کثیر تعداد مردوں اور عورتوں نے اسلام قبول کیا۔

جس میں

اس دن مردوں میں امیر معاویہ اور عورتوں میں اُن کی والدہ ہند بھی تھی جس نے حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کا کلیجہ چبایا تھا۔

اس طرح

مکّہ میں داخل ہوتے وقت ابوسفیان حضرت ابوسفیانؓ ہوئے اور فتح مکہ کے بعد معاویہ حضرت امیر معاویہؓ بن کر صحابہؓ کی معزز جماعت میں شامل ہوگئے۔ اور

ہندہ جس کا گناہ شاید کوئی معاف نہ کرتا

رحمت للعٰلمین کے عفو و درگذر کی ایک عظیم شہادت بنی جو رہتی دُنیا تک باقی رہے گی۔

و

آزمائش اور تکمیلِ ایمان

ہر چند مسلمانوں کو فتحِ مکہ جیسی نعمت سے سرفرازی ملی جو فروغِ اسلام کی ضامن تھی لیکن وہ کفر جو عرب کے ریشے ریشے میں سرایت کرچکا تھا اس کے ظاہری اور باطنی آثار کا غلبہ ہنوز باقی تھا۔ نگاہِ رسالت کے سامنے اسلام ہی نہیں تکمیلِ اسلام کا مسئلہ تھا۔ ایک طرف کفار کے جھتے مختلف مقامات میں سر اٹھاتے تھے اور دوسری طرف اکثر مسلمانوں کے قلوب میں ایمان پوری طرح سے داخل نہیں ہوا تھا۔ فتح مکہ کے بعد ایک کثیر تعداد میں لوگ مسلمان ہوئے لیکن وہ ان آزمائشوں سے نہیں گذرے تھے جن سے مہاجرین اور انصار کو گذرنا پڑا تھا، ابھی ان کی تربیت بھی نگاہِ لطف و کرم کو کرنا تھی۔ فتح مکہ کے بعد کا دور انہی امور کی جانب راہ نمائی کا دور ہے جن سے مسلمانوں کو بہر حال گزرنا تھا۔ اس وقت بھی اور آج بھی جب نورِ مبینؐ حجاب میں ہے۔

فتح مکہ کے بعد کے واقعات کا ذکر اسی نقطۂ نظر سے اہم ہے کہ یہاں کفار کی یک جہتی اور اسلام سے ان کی بغاوت، کے ساتھ خود مسلمانوں کے قلوب میں جو کمزوریاں تھیں۔ بالخصوص ہوا اور ہوس اور خود غرضی جس سے اسلام کو ہمیشہ خطرہ اور اندیشہ تھا اس کی اصلاح بھی ضروری تھی۔ تاکہ مسلمان اپنے نفسوں کے حملوں کے ساتھ منافقوں کی چالوں سے بھی باخبر رہیں اور ان کے پائے استقامت کو کبھی جنبش نہ ہو۔ وہ خوب یاد رکھیں کہ اللہ حق ہے، اللہ کا رسولؐ برحق ہے، اسلام حق ہے اور اللہ و رسولؐ کا فرمان حق ہے۔ آپ کی اطاعت گویا اللہ کی اطاعت ہے۔

غزوۂ حُنین

فتحِ مکہ کو ابھی چند ہی دن ہوئے تھے کہ ۱۰ شوال ۸ھ کو حُنین کا غزوہ

برپا ہوتا ہے حُنین ایک وادی کا نام ہے جہاں قبیلۂ ہوازن آباد تھا۔ فتح مکّہ کی خبر پاکر یہ قبیلہ برافروختہ ہوگیا اور قرب وجوار کے امراء کے ساتھ مل کر حملے کے لئے تیار ہوگیا۔ اس قبیلے میں تجربہ کار سرداروں کے علاوہ بنوسعد بن بکر بھی شامل تھے جو اس قبیلے سے تعلق رکھتے تھے جہاں آنحضرتؐ نے اپنا زمانۂ شیرخواری گذارا تھا۔ انہی میں بنو ہاشم کا سردار امیر دُرید بن صمّہ بھی تھا جو ایک تجربہ کار بہادر شخص تھا لیکن اب بوڑھا ہو چکا تھا لیکن اس کی فنی مہارت کی وجہ سے اسے ساتھ لے لیا گیا تھا۔ کفّارِ لشکر کے سردار مالک بن عوف نے سپاہیوں کو حکم دیا کہ وہ بال بچّے مویشی ومال و دولت سب ساتھ لے کر جنگ کے لئے نکلیں تاکہ ثابت قدمی سے لڑیں اور اپنی حفاظت کے لئے اپنی جان کی بازی لگادیں۔ کہا جاتا ہے کہ اس لشکر کی مجموعی تعداد تیس ہزار تک پہنچ چکی تھی۔

ادھر حضور دس ہزار مجاہدین جو مدینۂ منوّرہ سے مکّہ آئے تھے اور دو ہزار جو فتحِ مکّہ کے دن اسلام لائے تھے لے کر مقابلے کے لئے نکلے اس وقت اسلامی لشکر کی شان دیکھ کر کسی صحابی کی زبان پر آیا کہ ہم آج عدد کی کمتری کی بنا پر مغلوب اور شکست خوردہ نہ ہوں گے۔ حضورؐ مکّہ سے پوری تیاری کے ساتھ نکلے اور حُنین کے موقع پر پہنچ کر صبح سویرے ہی وادی میں داخل ہوئے دُرید بن صمّہ کے مشورے پر وہ لوگ جو مختلف تنگ مقامات میں چھپے ہوتے اچانک مسلمانوں پر لوٹ پڑے لیکن مسلمان ہمّت نہ ہارے اور جوابی حملہ اس عزم وہمت سے کیا کہ ان کو شکست دی لیکن یہاں بھی آج وہی ہوا جو اُحد کے دن ہوا تھا جب تیراندازوں نے درّہ چھوڑ کر غنیمت کا مال لوٹنا شروع کر دیا تھا "نفس" نے "امر" پر غلبہ پالیا اور اُس کا خمیازہ بھگتنا پڑا تھا۔

دشمنوں نے موقع پاکر تیروں کی بارش شروع کردی اور افراتفری عام ہوگئی، ایک کو دوسرے کی خبر نہ رہی۔ اس طرح بنو سلیم کا دستہ جو حضورؐ کا شریک جنگ تھا شکست سے پریشان ہوکر بھاگا۔ اُسے بھاگتا دیکھ کر اہلِ مکّہ کے دوسرے مجاہدین نے بھی فرار کی راہ اختیار کی اور فتح کی جگہ شکست کا سامنا ہوا۔

ایسے ہی موقع پر جب عقل حواس کھو بیٹھتی ہے، قدم اُکھڑ جاتے ہیں، فراستِ نبویؐ ایمان کی ڈھال اور توکل الی اللہ کی شمشیر برہنہ لے کر سامنے آتی ہے۔ آپؐ یہ حالات دیکھ کر میدان کے ایک جانب تشریف لے آئے، اور آپؐ کے ساتھ صحابہ کرامؓ کی ایک مختصر جماعت جو چند افراد پر مشتمل تھی رہ گئی، جو سو سے زیادہ نہ تھے۔ حضورؐ نے اپنے خچر کو ایڑھ لگائی اور ہوازن کی طرف بڑھے، چند صحابہؓ نے خچر کی لگام اور رکاب پکڑی کہ حضورؐ آگے نہ بڑھ جائیں، اس وقت زبانِ مبارک پر یہ الفاظ تھے۔ "انا نبیؐ لا کذب انا ابن عبد المطلب" میں پیغمبر ہوں اور اس میں جھوٹ نہیں میں عبدالمطلب کا بیٹا ہوں۔ اس وقت اس نورِ مبینؐ نے اپنی رسالت کے ساتھ اپنی بشریت کی طرف لوگوں کی توجہ مبذول فرمائی اور حق کی صداقت کی طرف ان مختصر ترین الفاظ میں دعوت دی۔ یہ کلمات، سنتے ہی حضرت عباسؓ نے نہایت بلند آواز میں پکارنا شروع کیا: "اے گروہِ انصار! اے بیعتِ رضوان والو! جس کے کان میں یہ الفاظ پہنچے اس کا رُخ اپنے نبیؐ کی جانب ہوگیا۔ آپؐ صف آراء ہوئے اور پھر "تنورِ جنگ گرم ہوا" لڑائی کا نقشہ بدلنا شروع ہوا۔

اس وقت بھی قدرتِ خفی اور قدرتِ جلی کے جلوے بھی عام ہوئے وہ قدرتِ خفی جو منجانب اللہ تھی۔ اس وقت ملا الاعلیٰ کے فرشتوں کی مدد

آئی۔ اور قدرتِ جلی کا اظہار اس طرح ہوا کہ حضور نے ایک مٹھی خاک لے کر کفار کے لشکر کی جانب پھینکی تو اس کے ذرّات منتشر ہو کر ہر کافر کی آنکھوں تک پہنچے، اور ان پر سراسیمگی کی حالت طاری ہو گئی۔ آخر لشکرِ کفار کو شکست ہوئی، جس کا ذکر سورۂ توبہ میں آتا ہے۔ مسلمانوں نے کفار کا تعاقب کیا اور ان کو قتل کرنا اور گرفتار کرنا شروع کیا اس جنگ میں خالد بن ولید کو بھی زخم آئے۔ اور ان کو بھی لعابِ دہن سے سرفرازی ملی۔ انہوں نے فوراً صحت پائی اس طرح جلال و جمال کے جو نقشے حنین میں عام ہوئے اور قدرتِ الٰہی کے جن معجزات کا ظہور ہوا اس کی غرض یہ بتانا تھا کہ جب اللہ پر یقینِ کامل کے ساتھ اس کی راہ میں جہاد کے لئے مستعد ہو جایا جائے تو اس کی مدد ضرور شاملِ حال ہوتی ہے۔ اس جنگ میں مالِ غنیمت بھی کثرت سے ملا اور بہت سے لوگ بھی مسلمان ہوئے۔

ایک اور آزمائش

اس شکست کے بعد کفار کچھ تو اوطاس میں اور کچھ طائف میں جمع ہو گئے۔ پہلے اوطاس میں مقابلہ ہوا، پھر طائف میں۔ دونوں جگہ لشکرِ اسلام کو کامیابی ہوئی اور جب آنحضرتؐ طائف سے مقام جعرانہ تشریف لائے تو مالِ غنیمت ایک بڑی تعداد میں جمع تھا۔

اونٹ	۲۴ ہزار
بکریاں	۴۰ ہزار
چاندی	۴ ہزار اوقیہ

لے سیرت رسولِ عربی صفحہ ۱۵۷

آپؐ نے غنیمت کی تقسیم سے قبل کچھ دن قبیلۂ ہوازن کا انتظار فرمایا پھر مالِ غنیمت کی تقسیم شروع فرمائی اور تالیفِ قلوب کی بناء پر غنیمت کا مال سب اہلِ مکّہ کو دے دیا۔ آپؐ ان کے مزاج شناس تھے۔ آپؐ نے انصار کو اس میں سے کچھ بھی نہ دیا۔ کچھ انصار نوجوان اس تقسیم پر بڑبڑائے کہ لڑائی کے وقت تو ہم بلائے جاتے ہیں اور مال قریش کو دیا جاتا ہے۔ آنحضرتؐ کے گوشِ مبارک تک یہ الفاظ پہنچے تو آپ نے انصار کو طلب کیا اور پوچھا کہ کیا بات ہے۔ انصار صاف گو اصحاب تھے۔ فرمایا کہ آپ نے جو سُنا وہ سچ ہے لیکن یہ ہمارے کچھ نوجوانوں نے ایسا کہا ہے، ہمارے دل پاک ہیں۔

دیکھئے اللہ کے رسول صلّی اللہ علیہ وسلّم کس طرح تالیفِ قلوب کے ساتھ تشفیِ قلوب فرماتے ہیں اور فراستِ نبوی سے کس طرح دلوں کو موہ لیتے ہیں۔

حضورؐ حمد فرماتے ہیں اور یوں خطاب فرماتے ہیں

"اے گروہِ انصار کیا یہ سچ نہیں کہ تم گمراہ تھے، اللہ تعالیٰ نے میرے ذریعہ تم کو ہدایت دی۔ تم پراگندہ تھے اللہ تعالیٰ نے میرے ذریعے تم کو جمع کر دیا۔ اور تم مفلس تھے اللہ تعالیٰ نے میرے ذریعے تم کو دولت مند کر دیا۔"

انصار سنتے اور ہر فقرے پر کہتے کہ بیشک، یہ سچ ہے اور یہ بھی حق ہے کہ اللہ کے رسولؐ نے اس سے بڑھ کر بھی ہم پر احسان فرماتے ہیں۔

اندازِ کلام ملاحظہ ہو، اب آپؐ اسی گروہ سے یوں مخاطب ہیں:

اے گروہِ انصار تم بخدا یہ بھی کہہ سکتے ہو، اور میں اس کی تصدیق کرتا جاؤں گا، تم یوں احسان جتا سکتے ہو۔

"تو (رسولِؐ خدا) ہمارے پاس اس حال میں آیا کہ لوگوں نے تیری تکذیب کی تھی ہم نے تیری تصدیق کی، لوگوں نے تیرا ساتھ چھوڑ دیا تھا ہم نے تیری

مدد کی، لوگوں نے تجھے نکال دیا تھا ہم نے تجھے پناہ دی، تو مفلس تھا ہم نے جان و مال سے تیری مدد کی۔"

انصار آبدیدہ تھے۔ زبانِ رسالتؐ فرما رہی تھی "اے انصار ہم نے جو کچھ کیا وہ تالیفِ قلوب کے لئے تھا۔ اے گروہِ انصار کیا تم یہ پسند نہیں کرتے کہ جب قریش اہلِ مکہ اونٹ اور بکریاں لے کر اپنے گھر جائیں اس وقت تم رسولؐ اللہ کو اپنے ساتھ لے کر گھر پہنچو۔" آپؐ نے فرمایا "اللہ کی قسم! تم جو کچھ لے کر جا رہے ہو وہ اس سے بہتر ہے جو وہ لے کر جا رہے ہیں۔ اگر لوگ کسی وادی اور درّے میں چلیں تو میں انصار کی وادی اور درّوں میں چلوں گا۔"

ہر طرف سے اے رسولؐ ہم راضی ہیں، اے رسولؐ ہم راضی ہیں، کی صدائیں بلند ہوئیں۔ ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ نبیٔ برحقؐ انصار ہی کے ساتھ گئے۔ اور آج بھی ان ہی کے درمیان ہیں۔

اِسی غزوہ میں عفو و درگزر کا ایک اور سماں بھی ملاحظہ ہو۔ مالِ غنیمت تقسیم ہو چکا، اسیران بھی تقسیم ہو چکے۔ اس وقت آپؐ کی دائی حلیمہ سعدیہ اور آپ کے رضائی بھائی تشریف لاتے ہیں۔ وہی اس قبیلے ہوازن کے وفد کے رئیس تھے۔ پہلے انہوں نے اظہارِ اسلام کیا، پھر قیدیوں کے متعلق درخواست کی، اور کہا: یا رسولؐ اللہ! جو قیدی چھپروں میں ہیں، ان میں آپ کی خالائیں، پھوپھیاں، بہنیں اور وہ بھی ہیں جنہوں نے آپ سے محبت کی تھی۔

آپ کا دل بھر آیا، فرمایا، ہم نے انتظار کے بعد تقسیم کی تھی کہ شاید کوئی خاندان مسلمان ہو کر اپنے قیدیوں کی رہائی کا مطالبہ کرے ہم کو اپنے اسیروں پر اختیار ہے۔ ان کو آزاد کیا جاتا ہے۔ تم دوسروں سے اس کی درخواست کر سکتے ہو۔ کون تھا جو حضورؐ کی اس بخشش، اس عفو و درگزر کے بعد اس کی

اتباع نہ کرتا۔ چنانچہ مہاجرین اور انصار نے بغیر عوض کے اپنے اسیر رہا
کیئے ان کی تعداد چھ ہزار تھی۔ رحمت کا یہ مظاہرہ اور وہ بھی فتح کے بعد اس
فراخی سے، تاریخ کے صفحات شاید ہی پیش کر سکیں۔
یہاں بھی امت کو مال کی محبت پر ذات کی محبت کو، اور نفس کی
محبت پر قلب و روح کی محبت کا درس دیا گیا تاکہ فروغ اسلام دراصل فروغ
اقدار کا موجب بنے۔

ایک اور آزمائش۔ ہجرت کا نواں سال اور غزوہ تبوک

یوں تو غزوۂ طائف اور اوطاس کے بعد اور بھی چھوٹی چھوٹی جھڑپیں یا
لشکر کشی متعدد وجوہ سے جاری رہے، جن کو فروغِ اسلام کے لئے جہاد یا
تکمیلِ ایمان کی مشقیں کہا جا سکتا ہے، لیکن اس میں ایک آزمائش جو سخت گرمی
کے زمانے میں ہونا تھی وہ ابھی باقی تھی یہ غزوۂ تبوک کی تیاری ہے۔ تبوک
مدینۂ منورّہ سے شام کی جانب چودہ منزل کے فاصلے پر واقع تھا۔ یہ غزوہ
رجب ۹ھ میں واقع ہوا۔
وجہ یہ ہوئی کہ مدینہ میں خبر پہنچی کہ رومیوں اور عیسائی عربوں نے
مدینے پر حملے کی تیاری کر لی ہے۔ آنحضرتؐ نے بھی اپنا قصدِ جہاد سب سے
بیان فرمادیا، اور اہلِ مکہ اور قبائل سے جانی اور مالی مدد طلب فرمائی۔ گرمی
کی شدت کا یہ عالم تھا کہ لوگ اونٹ ذبح کرتے اور اس کی آنتوں کا پانی
نکال کر پیتے، اسی بنا پر غزوہ تبوک کو غزوہ عُسرت بھی کہا گیا ہے۔
یہی وہ غزوہ ہے جہاں آزمائشیں اکابر صحابہؓ سے لے کر عام مسلمانوں
تک کی ہوئیں۔ جب حضورؐ نے مال طلب فرمایا سب ہی نے مدد کی لیکن
صدیقِ اکبرؓ نے چالیس ہزار درہم حضورؐ کو پیش کیے، حضورؐ نے پوچھا اپنے

متعلقین کے لئے بھی کچھ چھوڑا ہے؟ صدیقؓ نے فرمایا: اللہ اور اس کے رسولؐ کو چھوڑ کر آیا ہوں۔ حضرت عمر فاروقؓ اپنا نصف سرمایہ پیشِ خدمت کرتے ہیں۔ پوچھا جاتا ہے کہ کیا چھوڑ کر آئے ہو؟ حضرتِ عمرؓ جواب دیتے ہیں نصف سرمایہ حاضر کیا ہے اور نصف متعلقین کے لئے چھوڑ کر آیا ہوں۔

یہاں ان کی بھی آزمائش ہوئی جن کے پاس سواری نہ تھی۔ چند صحابہؓ افسردہ خاطر، روتے ہوئے حاضرِ خدمت ہوئے کہ "یارسول اللہؐ اگر سواری کا انتظام فرما دیا جائے تو ہم اس سعادت سے محروم نہ رہیں گے"۔ حضور نے فرمایا "میرے پاس تو سواریاں نہیں"۔ اور یہ روتے ہوئے واپس ہوئے، جن کی شان میں آیت نازل ہوئی، اور اللہ تعالیٰ نے ان کو ہر مواخذے سے بری فرمایا۔ ان میں وہ بھی تھے جو منافقین میں سے تھے، اور کسی وجہ سے جہاد میں شرکت نہ کرنے کا عذر کیا، یہ خود بھی شریک نہ ہوئے اور دوسروں کو بھی باز رکھنے کی کوشش کی، اُن کا سردار عبداللہ بن اُبَیّ تھا۔ ان میں وہ بھی دیہاتی تھے جنہوں نے نہ جانے کے طرح طرح کے بہانے بنائے، جن کا ذکر قرآنِ حکیم کے سورۂ توبہ میں آتا ہے۔

یہاں وہ لطیف نکتہ پیش کرنا ضروری ہے، جو ہرچند منافقین کی دل آزاریوں کے بعد ظاہر ہوا، لیکن قدرت کو اسے ظاہر فرمانا تھا، اور اسی سے ایک اہم حقیقت کی طرف رہنمائی منظور تھی۔ اس غزوہ میں روانگی کے وقت حضورؐ نے صدیقِ اکبرؓ کو نماز پڑھانے کے لئے اپنا جانشین بنا کر چھوڑا اور مدینے میں محمد بن مسلمہؓ کو اپنا قائم مقام بنایا اور حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کو حضورؐ کے خاندان والوں کی نگرانی کا کام سونپا گیا۔ اس پر منافقین نے طرح طرح کی باتیں کہہ کر شانِ رسالت کی توہین اور علی کرم اللہ وجہہٗ کی دل آزاری کی۔ حضرت علیؓ سے برداشت نہ ہوا، آپؓ نے ہتھیار سنبھالے

اور تبوک کی طرف روانہ ہو گئے، اور حضورؐ سے مقام جرف جو مدینے سے تین میل کے فاصلے پر موجود ہے جا ملے۔ حضورؐ نے پوچھا کہ کیوں آ گئے؟ حضرت علیؓ نے منافقوں کے طعنوں کا ذکر کیا، آپ نے فرمایا "وہ جھوٹ بولتے ہیں تم کو میں نے اپنے خاندان کی نگرانی کے لئے چھوڑا ہے تم واپس جاؤ" اور فرمایا:

"اے علیؓ کیا تم اس بات پر راضی نہیں کہ تم میرے لئے ویسے ہی قوتِ بازو بنو، جیسے حضرت ہارون حضرت موسیٰ کے لئے تھے۔ فرق یہ ہے کہ میرے بعد کوئی نبی آنے والا نہیں ہے" اس پر حضرت علی کرم اللہ وجہہ مدینے واپس ہو گئے۔ (محمد رسول اللہؐ صفحہ ۶۵۳)

جو نکتہ خاص طور سے واضح فرمانا تھا وہ یہ کہ مقامِ ولایت کو مقامِ نبوّت کے ساتھ ایک خاص تعلق ہے۔ یعنی تم ہر اہم غزوہ میں اس پیکرِ بشریت کے ساتھ میرے معاون رہے ہو، اور خلافتِ راشدہ کے زمانہ میں بھی تمہارا علم اور تمہارا خلوص ان کا معاون رہے گا۔ اور جب یہ دَور ختم ہونے کا وقت آئے گا تو پھر کوئی نبی نہ آئے گا لیکن اللہ تعالیٰ اپنے علماءِ راسخین اور اولیاءِ کرام کے ذریعے دین کی حفاظت فرمائے گا اور اس کا سرچشمہ اسی خلافتِ راشدہ سے خلیفۂ چہارمؓ کے دَور میں پھوٹے گا۔

اس غزوہ میں اس قدرتِ جلی کے جلوے بھی پیش آئے کہ جب آپ مقامِ حجر میں پہنچے، جہاں کے کنوؤں کا پانی لوگوں نے پینا چاہا، اور بعض نے اس سے آٹا بھی گوندھا۔ اس وقت آپؐ نے فرمایا، اونٹوں کو نہ کھولا جائے، کوئی ان کنوؤں کا پانی نہ پیئے اور نہ استعمال کرے، اور کوئی شخص کسی دوسرے کے بغیر اکیلا باہر نہ نکلے۔ یہ وہی مقہور وادی ہے جس کا ذکر قرآن مجید میں آتا ہے۔

ہر چند تبوک میں جنگ نہ ہوئی اور آپؐ مدینے تشریف لے آئے تو اس وقت بھی جو لوگ اس جہاد میں پیچھے رہ گئے تھے آ کر حاضرِ خدمت ہوئے،

تو آپؐ نے فرمایا کہ کوئی شخص ان سے ہم کلام نہ ہو۔ چنانچہ حضورؐ نے اور صحابہ کرامؓ نے ان سے مُنہ پھیر لیا۔ بعضوں نے اپنے کو مسجدِ نبوی کے ستونوں سے باندھ دیا تھا اور یہ عہد کیا تھا کہ جب تک ان کی توبہ قبول نہ ہوگی وہ یوں ہی بندھے رہیں گے۔ اور اس طرح اپنا معاملہ اللہ پر چھوڑ دیا تھا۔

لطف کی بات یہ ہے کہ جب منافقوں نے طرح طرح کے عذر پیش کئے تو آپؐ نے نہ صرف ان کی بات سُنی بلکہ ان کا عذر بھی قبول کر لیا۔ کیونکہ نگاہِ رسالت ان کے قلوب کی کیفیات سے واقف تھی۔ بتانا یہ تھا کہ تنبیہ اور تربیت اپنوں کی ہوتی ہے، غیروں سے درگذر کر کے ان سے دُور ہی رہا جاتا ہے، یہی وہ منافقین ہیں جنھوں نے مسجدِ قبا کے قریب مسجدِ ضرار بنائی تھی، اور حضور سے درخواست کی تھی کہ اس میں نماز پڑھاویں۔ آپؐ نے وعدہ فرمایا تھا کہ تبوک سے واپسی پر اس میں نماز پڑھوں گا۔ لیکن اللہ ربّ العزّت نے اپنے حبیبؐ کو منافقین کی نیّت سے واقف فرما دیا، اور تبوک سے واپسی پر آپؐ نے حکم دیا کہ حضورؐ کے پہنچنے سے پہلے وہ مسجد جلا دی جائے، جس کا ذکر سورۂ توبہ میں آتا ہے۔

"اصلاحِ حال۔ ایک نازک گھڑی"

حضورؐ کے سامنے ہر حال میں اصلاحِ معاشرہ اور تہذیبِ نفس کے مسائل پیش رہے ہے۔ معاشرہ کو شگفتہ بنانے اور اعلیٰ اقدار سے منور رکھنے کا بار بڑی حد تک جنسِ لطیف پر ہے، جسے عورت کہتے ہیں۔ یہ اصلاح کے مسائل بھی کاشانہ نبوّتؐ سے اٹھتا تھے، جہاں کئی کئی دن تک چولہے میں آگ نہ جلتی، جہاں عسرت اور فاقوں سے امہات المومنین کو دوچار ہونا پڑتا۔ ایسے حالات میں ان کے دل میں، یہ خیال آتا کہ ان کے نان ونفقہ میں کچھ

اضافہ ہو ایک فطری خیال تھا۔ لیکن نگاہِ رسالتؐ جانتی تھی کہ آپؐ جو بھی اقدام محض ازراہِ ہمدردی فرمائیں گے تو وہ امّت کے لئے ایک اصول بن جائے گا اور اندیشہ تھا کہ عورتیں زیادہ سے زیادہ اپنے مردوں کو رزق اور آرائش کی طرف مائل کرنے کی موجب ہوں۔ چنانچہ ایک موقع پر جب امہات المومنین نے اس خیال کا اظہار فرمایا تو جبینِ رسالتؐ پر شکن آگئی اور ازواجِ مطہرات سے الگ ہو گئے۔ یہ الگ ہونا اور الگ رہنا اس واضح انداز سے تھا کہ صحابہ کرامؓ اور جملہ عورتوں کو اس بات کا خوب علم ہو جائے، اور وہ اس سلسلے میں حضور کے اندازِ فکر کو سمجھیں، غور کریں اور وہ امور ہمیشہ پیشِ نظر رکھیں جو قومی زندگی کے انحطاط کا موجب ہو سکتے ہیں۔ اللہ ربّ العزّت نے بھی سورۂ احزاب میں جہاد کی فضیلت کے بعد اس تسلّی و تشفی کا ذکر فرمایا ہے۔ گویا اس راز کی گرہ کشائی کی گئی ہے کہ مومن کی مجاہدانہ زندگی میں عورت کے صبر و شکر کو بڑا دخل ہے، اس کا منشاء بھی عام عورتوں کی اصلاح ہے، اور اس انداز سے کہ وہ یہ سمجھ کر صبر و شکر کے انداز اپنائیں کہ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت ہی ان کا جہاد ہے، اور اس جہاد کا میدان خود ان کا گھر اور ان کا نفس ہے۔ چنانچہ سورۂ احزاب میں اس اطاعتِ رسولؐ کے مختلف پہلوؤں کا ذکر ہے، اور ایک مقام پر صاف لفظوں میں یوں بھی فرما دیا گیا ہے:

يَاأَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِأَزْوَاجِكَ إِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِيْنَتَهَا فَتَعَالَيْنَ أُمَتِّعْكُنَّ وَأُسَرِّحْكُنَّ سَرَاحًا جَمِيْلًا ○ وَإِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَالدَّارَ الْاٰخِرَةَ فَإِنَّ اللّٰهَ أَعَدَّ لِلْمُحْسِنٰتِ مِنْكُنَّ أَجْرًا عَظِيْمًا ○ (آیات ۲۸ و ۲۹)

"اے نبی آپؐ اپنی بیویوں سے فرما دیجئے کہ اگر تم دنیا کی زندگی اور اُس کی

دولت کی خواہاں ہو تو آؤ میں تم کو کچھ دولتِ (دنیا) دے کر حسن و خوبی کے ساتھ رخصت کر دوں۔ اور اگر تم کو اللہ اور اُس کا رسول اور آخرت عزیز ہے تو اللہ نے تم میں سے نیکی (یعنی صبر و شکر سے زندگی بسر) کرنے والیوں کے لئے اجرِ عظیم تیار کر رکھا ہے۔"

چنانچہ جب آنحضرتؐ نے ان کو یہ آیات سنائیں تو سب نے نہایت خوشدلی کے ساتھ اللہ اور اُس کے رسولؐ کی اطاعت کو پسند فرمایا۔

اصلاحِ حال کا ایک اور منظر

یہ آزمائش اعلیٰ سے نہیں بلکہ ایک اسفل سے متعلق ہے ملاحظہ ہو کہ اسلام کا بدترین دشمن اور منافق عبداللہ بن ابی کا آخری وقت ہے۔ آنحضرتؐ خود عیادت کے لئے تشریف لے جاتے ہیں۔ وہ درخواست کرتا ہے کہ آپؐ میری نماز پڑھائیں اور میری قبر پر تشریف لائیں۔ آپؐ اقرار فرماتے ہیں پھر وہ قاصد بھیج کر ایک کُرتے کی درخواست کرتا ہے تاکہ وہ اس میں مدفون ہو۔ آپ وہ بھی عنایت فرماتے ہیں۔ حضرت عمر فاروقؓ جن کو فراستِ نبویؐ کا ایک بڑا حصّہ بخشا گیا تھا، عرض کرتے ہیں یا رسول اللہؐ! یہ آپ کا پیرہن مبارک اور اس خبیث و غلیظ انسان کو دیا جا رہا ہے؟" آپؐ جواب دیتے ہیں کہ "میرا ایسا کرنا اسے اللہ کے حکم سے نہیں بچا سکتا، البتہ مجھے توقع ہے کہ اس بات سے متاثر ہو کر اس کے ایک ہزار ساتھی حلقہ بگوشِ اسلام ہو جائیں گے۔ اور یہی ہوا البتہ فاروق اعظمؓ کے جذبۂ محبت کی قدردانی رب العزت کے دربار سے یوں ہوئی کہ جب اس منافق کا جنازہ حضورؐ کے سامنے لایا گیا، اور آپؐ نے چاہا کہ اس کی نماز پڑھائیں، تو حضرت عمر فاروقؓ سامنے کھڑے ہو گئے، اور یہ آیات نازل ہوئیں۔

وَلَا تُصَلِّ عَلٰٓى اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا وَّلَا تَقُمْ عَلٰى قَبْرِهٖ ط اِنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَمَاتُوْا وَهُمْ فٰسِقُوْنَ ○

(التوبۃ۔ آیت ۸۴)

ترجمہ:۔ اے میرے حبیبؐ، آپؐ مرنے والے منافقین میں سے کسی کی نمازِ جنازہ نہ پڑھائیں اور نہ اس کی قبر پہ کھڑے ہوں (کیونکہ آپؐ کا کسی قبر پہ کھڑا ہونا موجبِ رحمت بن جاتا ہے) بلاشبہ وہ لوگ جنہوں نے اللہ اور اس کے رسولؐ کا انکار کیا وہ حالتِ فسق میں مرے، اور فاسقوں کے ساتھ ہی ان کا انجام ہوگا۔

یہ واقعات فتحِ مکہ کے بعد کے ہیں۔ غور طلب بات یہی ہے کہ یہاں بھی اپنوں کی اصلاح کے لئے ان کو تنبیہہ کی جاتی ہے، اور غیروں پر کرم نوازیوں سے ان کو اصلاحِ حال کا موقع دیا جاتا ہے۔

یہ جملہ واقعات جو فتحِ مکہ کے بعد ہوئے وہ حضورؐ کی تبلیغ، اصلاحِ حال، عفو و درگذر، اور رحمتِ عام کے پردہ کشا ہیں، لیکن احکامِ الٰہی کی بجاآوری میں نہ کسی مصلحت سے کام لیا جاتا ہے اور نہ اس کی تعمیل میں تاخیر کی جاتی ہے۔

ایک اور اہم واقعہ

اسی دور کا ایک واقعہ فریضۂ حج کے موقعہ پہ پیش آیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم، صدیقِ اکبرؓ کو ۹ ہجری ذی الحج کو مکہ روانہ فرماتے ہیں تاکہ وہ لوگوں کو حج کرائیں اور یہ قافلہ امیر الحجاج صدیقِ اکبرؓ کی سربراہی میں روانہ ہوتا ہے۔ قافلے کے ساتھ قربانی کے جانور ہیں۔ قافلہ روانہ ہو چکا ہے، فریضۂ حج کی ادائیگی صدیقِ اکبرؓ کو سپرد کی جا رہی ہے۔ پھر حضرت علی کرم اللہ وجہہ آنحضرتؐ کی اونٹنی قصویٰ پر سوار ہو کر آپؐ سے جا ملتے ہیں۔ صدیقِ اکبرؓ یہ

دریافت فرماتے ہیں کہ کیا آنحضرتؐ نے آپؓ کو امیرِ حج مقرر فرما کر بھیجا ہے۔ آپؓ جواب دیتے ہیں نہیں۔ بلکہ اس لئے بھیجا ہے کہ میں لوگوں کے سامنے سورۂ براُت کی آیات تلاوت کروں اور ہر معاہدے والے کو اس معاہدے کی تحریر واپس کر دوں۔ (سورۂ توبہ جس کو سورۂ براُت بھی کہتے ہیں) چنانچہ ایسا ہی ہوا امیرِ حج صدیقِ اکبرؓ رہے، اور سورۂ براُت کی تلاوت حضرت علیؓ نے فرمائی، اور سب معاہدے منسوخ ہوئے واضح رہے کہ سورۂ براُت (توبہ) قرآنِ حکیم کا واحد سورہ ہے جس سے قبل بسم اللہ نہیں لکھی پڑھی جاتی ہے۔

حضرت علیؓ کو بھیجنے کی ایک مصلحت یہ بھی تھی کہ عرب میں دستور تھا کہ معاہدہ جب منسوخ کر کے واپس کیا جاتا تو اس کو صرف وہی شخص واپس کر سکتا تھا، جو اس کا قریبی رشتہ دار ہو۔ اس لئے حضرت صدیق اکبرؓ کے بعد حضرت علیؓ کو روانہ کیا گیا۔ یہ نکتہ بھی ملحوظ خاطر رہے کہ یہاں یہ اشارہ بھی فرما دیا گیا ہے کہ اکابر اصحابؓ رسول اللہ پر تو نبوّت سے سرفراز ہیں، جو ظاہر و باطن دونوں میں ان کا مظہر ہے۔ لیکن ولایت محض بطونِ رسالت سے متعلق ہوتی ہے اور تابعِ نبوّت ہوتی ہے۔ چنانچہ نمازیں حضرت علیؓ نے حضرت صدیقِ اکبرؓ ہی کی امامت میں پڑھیں، مکہ مکرمہ میں بھی اور حج سے واپسی پر مدینے کے راستے میں بھی۔ اور جب خلفائے راشدین کے ساتھ ان اکابر ہستیوں کا دور ختم ہوا، اور حضرت علیؓ خلیفہ ہوئے، اس وقت گویا آپؓ خلافت اور ولایت دونوں کے ترجمان تھے۔ اور آپؓ کے بعد اتباعِ نبیؐ کی پابندی کے ساتھ بہ کارِ رسالتؐ اولیائے کرام ہی کے سپرد ہوا، جن کا ذکر آئندہ باب میں آئے گا، اور اس حقیقت کو بھی آشکارا کر دیا گیا کہ کوئی ولی کسی بھی مقام پر پہنچ جائے وہ صحابہؓ سے کسی صورت سے بھی افضل نہ ہوگا۔ کیونکہ وہؓ آسمانِ نبوّتؐ کے وہ ستارے ہیں جن کی ہدایت پر قرآن گواہ ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ نگاہِ رسالت ؐ میں صدیقِ اکبر ؓ اور حضرت علی ؓ کو الگ الگ بھیجنے کی اصل غایت ہی یہ تھی کہ صدیقِ اکبر ؓ جملہ غیر اسلامی روایات کو مٹا کر حج کے اسلامی مناسک کی تعلیم کو عام کرنے کا پورا پورا اہتمام کریں تاکہ عام مسلمانوں کے قلوب میں حج کی عظمت راسخ ہو، اور اللہ رب العزت کے سامنے عاجزی اور بندگی کا نمونہ بننا لوگ سیّدنا صدیقِ اکبر ؓ سے سیکھیں اور سیدنا علی کرم اللہ وجہہ کو اس آیت برأت کے ساتھ اس لئے بھیجا گیا تھا کہ ان کی نظریں تمام تر کفّار پر رہیں۔ اور اس بات پر نظر رکھیں کہ اللہ تعالیٰ کی شانِ جلالی کے سامنے کفّار کا برتاؤ کیا ہوتا ہے، وہ سرِ تسلیم خم کرتے ہیں یا پھر مقابلے کے لئے تیار رہتے ہیں۔ یہی وہ احکامِ الٰہی تھے جس سے کفّار کے دل دہل گئے۔ اعلانِ عام ہوا کہ:

۱۔ اللہ اور اس کا رسول ؐ کافروں سے بیزار ہے۔ اس لئے نہ ان کا مسلمانوں سے کوئی معاہدہ معتبر ہے نہ مسلمانوں کا اُن سے۔

۲۔ جس قبیلے سے کسی خاص مدّت کے لئے معاہدہ کیا گیا وہ باقی رکھا جائے گا اور باقی منسوخ سمجھا جائے گا۔

۳۔ کفّار کو چار ماہ کی مہلت ہے کہ وہ اس میں اسلام قبول کرلیں ورنہ ان کو تہہِ تیغ کر دیا جائے گا۔ اور کسی کو بازپرس کا استحقاق حاصل نہ ہوگا۔

۴۔ اس سال کے بعد مسجدِ حرام میں کوئی کافر داخل نہ ہوگا، اور یہ ناپاک مشرک اب کعبہ کے قریب نہ آئیں گے۔

اس طرح جب صدیقِ اکبر ؓ لوگوں کی تربیت ذہنی اور مناسکِ حج کی تعلیم پر مشغول رہے، اور سیّدنا علی ؓ کفّار کے قلوب کا جائزہ لیتے رہے کہ وہ کسی شر کی طرف مائل ہونے تو نہیں جا رہے ہیں، اور اپنی توجہ پوری طرح ان کی حرکات و سکنات پر مرکوز رکھی۔ ظاہر و باطن اسی اکائی کا نتیجہ تھا کہ مومنین

کے دلوں میں اسلام کی محبت اس درجہ راسخ ہوگئی کہ حجۃ الوداع کے موقع پر اسلام کے فروغ کی ضمانت اور تکمیلِ دین کی نعمت سے مومنوں کو سرفرازی بخشی گئی جس کا ذکر حجۃ الوداع میں آئے گا۔

وفود و معجزات

المختصر نورِ مبین، ماہتابِ نبوت کی چاندنی چھٹکی ہوئی ہے اور پیکرِ بشریت کے ان آخری لمحات میں اعلیٰ اور اسفل سب کو اپنی تجلیات سے سرفرازی بخش رہی ہے۔ البتہ نگاہِ رسالت دیکھ رہی ہے کہاں کہاں اس نورانی فرش میں شکن یا جھول باقی رہ گئی ہے۔ اس کو بھی نکال دیا جائے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اللہ تعالیٰ کی جملہ مخلوق ہے مومن، کافر، یہود، نصاریٰ اور دیگر مذاہب کے پیروکار، اور وہ بھی جو اپنی عقل ہی کو اپنا رہنما سمجھتے ہیں اور وہ بھی جن کی "انا" نے انہیں کسی کے سامنے سر جھکانے نہیں دیا۔ نگاہِ رسالت کے انداز ہر جگہ نرالے ہیں۔ اربابِ نظر سے یہ بات پوشیدہ نہیں کہ حضور کے تبلیغی منازل تین ہیں

(۱) بتانا۔ (۲) سمجھانا اور (۳) منوانا

(۱) بتانا۔ آیاتِ ربانی اور فطرتِ نبوی سے۔ (۲) سمجھانا حکمتِ نبوی سے۔
(۳) منوانا۔ مباحثہ، مجادلہ، مباہلہ اور فراستِ نبوی اور معجزات سے، جو شواہدِ نبوت ہیں۔

رہی ہدایت وہ اللہ کے حکم سے ہے، جس کے نصیب میں ہوتی ہے اُسی کو ملتی ہے۔
یہ آخری دور تکمیلِ ایمان کا دور ہے جس کے کچھ مناظر گذشتہ صفحات میں پیش کئے گئے۔ اب اُن وفود اور جماعتوں کا ذکر آرہا ہے جو اسلام کے فروغ سے متأثر ہو کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوتے

ہیں، کچھ ماننے اور قبول کرنے کے لئے، کچھ نہ ماننے اور بحث مباحثہ کے لئے۔ لیکن حضورؐ کا آغوشِ رحمت سب کے لئے وا ہے۔

یہ وفود تو کچھ ابتدا میں بھی آئے تھے، لیکن بہت کم، جن کا ذکر اپنے اپنے مقام پر ہوا لیکن تسلسلِ بیان کے لئے بعض کا ذکر کبھی مختصر یہاں بیان کیا گیا ہے۔ لیکن آٹھویں اور بالخصوص نویں ہجری میں یہ وفود اس کثرت سے آئے کہ اس سال یعنی ۹ھ ہی کو سنۃ الوفود کہا جاتا ہے۔ ان کی تعداد تیس سے بھی زیادہ تھی، ان میں وہ بھی تھے جو ایمان و عرفان کے نمونے بنے اور وہ بھی جو کذّاب کہلائے۔ اور ایسے بھی تھے جو آئے تو پروانہ وار قدموں پر اپنے کو نثار کر دیا، سینکڑوں کی تعداد میں مسلمان ہوئے۔

۱۔ چنانچہ وفد مزنیہ[1]، جس میں اس قبیلے کے چار سو افراد حاضرِ خدمت ہوئے اور جب واپس ہونے لگے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے راستہ کے لئے کچھ خوراک کا سوال کیا۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا: بھائیو میرے پاس تو کچھ نہیں سوائے چند کھجوروں کے گچھوں کے۔ وہؓ ان لوگوں کو اپنے ساتھ اپنے گھر لے گئے کہ وہ خود دیکھ لیں۔ چنانچہ جب وہ گھر پہنچے تو واقعی وہاں چند کھجوروں کے سوا کچھ نہ تھا، لیکن اللہ تعالےٰ نے اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کے شیدائیؓ کو رُسوا نہ کیا بلکہ ان کھجوروں میں اس درجہ برکت عطا فرمائی کہ چار سو انسانوں نے جس قدر چاہیں کھجوریں لیں اور اُن میں کچھ کمی نہ آئی۔ یہ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے شیدائیوں پر اللہ کا کرم تھا۔ اس مہتابِ رسالت کے معجزات تو عالم پر آشکارا ہیں، اور یہی وہ ورثہ انبیاءؑ ہے جو اصحابِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم

---

[1] مزنیہ: یہ ایک بڑا قبیلہ تھا جو مصر تک پہنچ کر قریش کے خاندان سے مل جاتا ہے۔ (سیرت النبی جلد دوم صفحہ ۴۰)

اور اولیاء کرام کو ملا۔ بقول عراقی یہ وفد مدینہ میں ۵ھ میں آیا تھا۔
۲۔ اوّل وفد وفد المدینہ سنۃ خمس وفد وا مزنیہ
انہیں میں نجران کے ان عیسائیوں کے گروہ کا ذکر آتا ہے جو جنگِ خیبر کے بعد مدینہ میں آیا جس میں ساٹھ[۶] آدمی تھے۔ جو مشاہیر علماء پر مشتمل تھا۔ انہوں نے حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم سے حضرت عیسیٰ[۱] کے متعلق سوال کیا، اس پر سورہ آل عمران کی تقریباً اسی[۸] آیات نازل ہوئیں، مباحثہ ہوا، اس پر بھی وہ ایمان نہ لائے تو سورہ آل عمران کی آیت اکسٹھ[۶۱] کا نزول ہوا جس میں نبی کریم صلّی اللہ علیہ وسلّم کو مباہلہ کی اجازت عطا ہوئی۔
اے رسول پھر جو کوئی آپ سے (مسیح کی عبدیت اور اللہ تعالیٰ کی ربوبیت) کے بارے میں حجّت کرے، اس کے بعد کہ آپ کے پاس سچی خبر آچکی ہے تو کہہ دیجئے کہ (اب فیصلہ اللہ پر چھوڑ دو) آؤ ہم اپنی بیٹیوں کو بھی بلائیں اور تمہاری بیٹیوں کو بھی۔ اور اپنی عورتوں کو بھی اور تمہاری عورتوں کو بھی اور پھر اپنے آپ کو اور تم کو بھی پھر نہایت عاجزی کے ساتھ اللہ سے دعا کریں اور جھوٹوں پر خدا کی لعنت بھیجیں۔" (یہ آیتِ مباہلہ کا ترجمہ ہے۔)
چنانچہ حضورؐ مباہلہ کے دن خود اپنی بیٹی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا، علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ، سیدنا امام حسن و امام حسین علیہما السلام کو ساتھ لے کر تشریف لائے۔ لیکن عیسائی جماعت اس حلقۂ نور کے انوار کی تاب نہ لائی، اور ان کے لاٹ پادری نے کہا کہ اے نصرانیو! میں آج وہ چہرے دیکھ رہا ہوں کہ اگر وہ اللہ سے کہیں کہ پہاڑ ہٹا دے تو وہ ہٹا دیئے جائیں گے، اس لئے ان سے مباہلہ کی ہمّت نہ کرو۔ چنانچہ وہ چلے گئے اور حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا کہ

ص۱۔ سیرت النبی جلد دوم صفحہ ۸۰۔

اگر وہ مباہلہ کرتے تو قیامت تک ایک عیسائی کا نام ونشان باقی نہ رہتا۔ غرض اس واقعہ کے بعد اکثر عیسائی اسلام تو نہ لائے لیکن مطیع اور باجگذار ہوئے۔

بعض وفود آتے اور آپؐ سے دین کے متعلق مختلف سوال کرتے، اور آپ حسب عادت ان کا احترام کرتے تعلیم وتزکیہ سے مالا مال فرماتے۔ وہ آپؐ کی رسالت کی تصدیق کرتے اور بیعت کرتے اور اپنی قوم میں جاکر پورے انہماک سے اسلام کی تبلیغ میں لگ جاتے یہاں تک کہ قبیلے کے قبیلے مسلمان ہوجاتے۔

ان میں وہ خوش نصیب بھی ہوتے جو دعا کی درخواست کرتے اور سرفرازی پاتے۔ چنانچہ جب دُوس کا وفد آیا جس میں حضرت طفیل ابن عمر دُوسی جو اپنی قوم کے ایک شریف انسان اور مشہور شاعر تھے، آپؐ سے درخواست فرمائی کہ دعا فرمایئے کہ مجھے کوئی ایسی کرامت عطا فرمائے کہ جس کو میں اپنی قوم میں اپنے مذہب کی صداقت پر دلیل لاسکوں"۔ چنانچہ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا فرمائی تو آپ کے چہرے پر ایک روشنی پیدا ہوگئی جو چراغ کا کام دیتی، پھر انہوں نے دعا کی کہ یا اللہ اسے جُدا کردے، چنانچہ وہ الگ ہوگئی اور چراغ بن کر دُور تک نور پھیلانے لگی۔ (تاریخ اسلام مولانا محمد عاشق الٰہی میرٹھی صفحہ ۳۶۲)

ایسے ہی متعدد واقعات کا ذکر سیرت نگار حضرات نے کیا ہے۔ انہیں میں بعض وقت ان جماعت کے لوگوں میں جن کو حضورؐ ازراہِ کرم تعلیم وتربیت کے ساتھ بے شمار انعامات سے بھی نوازتے وہاں بچے بھی محروم نہ رہتے۔ چنانچہ ایک ایسے ہی موقع پر حضورؐ نے دریافت فرمایا کہ کیا کوئی ایسا شخص تو نہیں جسے انعام نہ ملا ہو۔ تو جماعت کے لوگوں نے کہا کہ ایک لڑکا جو نہیں آیا ہے۔ حضورؐ نے فرمایا، اُسے لے آؤ۔ وہ حاضر ہوا اور عرض کی یا رسول اللہؐ! میری حالت پر توجہ فرمایئے۔ نہ مجھے ان سرداروں کی طرح کھجوریں درکار ہیں نہ کپڑے۔ میری تمنا تو یہ ہے

دعا کیجئے کہ حق تعالٰے میری مغفرت فرما دے، مجھ پر رحمت نازل کرے اور میرے دل کو غنی کر دے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس کے احوال سے بہت مسرور ہوئے۔ تینوں دعاؤں کی سرفرازی کے ساتھ انعام و کرام سے نوازا۔ (سبحان اللہ)

(تاریخ اسلام صفحہ ۳۶۳)

کبھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جمعہ کے لئے مسجدِ نبوی میں کھڑے ہوتے تو مسجد کے ایک گوشہ سے ایک وفد کے لوگوں کی آواز بلند ہوتی ہے کہ:

"یا رسول اللہ ہم مسلمان ہو کر حاضر ہوئے ہیں۔ ہم قحط سال اور تنگ حال ہیں"۔
آپؐ منبر پر کھڑے ہو جاتے ہیں اور دعا کے لئے ہاتھ اٹھاتے ہیں"
یا اللہ اپنے شہروں اور چوپاؤں کو پانی دے۔ اپنی رحمت کو پھیلا اور اپنے مُردہ ملک کو زندہ فرما........" اللہ تعالٰی مسلمانوں کی تنگ حالی کو دُور فرماتا ہے۔

(تاریخ اسلام صفحہ ۳۶۴)

وفد بہراز:۔ ایک موقع پر یمن کی جانب سے تیرہ مسلمان اپنی قوم کے وکیل بن کر حضرت مقدادؓ کے دروازے پر پہونچتے ہیں جو اپنی مہمان نوازی کے لئے مشہور ہیں۔ وہ اُن کے سامنے کچھ ملیدہ رکھ دیتے ہیں۔ حضرت مقدادؓ وہ ماحضر بارہا اُن کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ وفد کو حیرت تھی کہ اس میں کمی کیوں نہیں آتی۔ سب سیر ہو کر کھاتے ہیں اور اس میں بچ بھی رہتا ہے۔ حضرت مقداد رضی اللہ عنہ کی بیوی ضباعہ بنت الزبیر اپنی لونڈی سدرہ کے ہاتھ وہی بچا ہوا ملیدہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بھیجتی ہیں۔ حضورؐ اس وقت ام سلمہؓ کے حجرہ میں تھے۔ آپؐ نے سدرہ کو دیکھا اور فرمایا کہ ضباعہ کا تحفہ ہے۔ پیالہ لے لیا اور سدرہ سمیت سارے گھر والوں کو کھلایا۔ اس طباق میں اب بھی کمی نہ آئی تھی۔ وفد کے لوگوں کو حیرت تھی۔ حضرت ضباعہ نے جواب دیا کہ اس میں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کھایا ہے، اگر تم جیسے

ہزار انسان برسوں مقیم رہیں تو اس میں کوئی کمی نہ آئے گی، یہ معجزہ وفد کی عقیدت و محبت کا موجب ہوا اور وہ حضرات تعلیماتِ اسلامی سے سرفراز واپس ہوئے۔
چنانچہ یہ وہ دور ہے کہ وفد پر وفد گردو نواح سے آتے اور ایمان لاتے اور واپس جاتے اور ہمہ وقت تبلیغِ دین میں مشغول ہو جاتے۔ ایک ایسا ہی وفد شعبان ۱۰ھ میں حاضر ہوا۔ یہ وفدِ خولان تھا۔ اس نے عرض کیا کہ آپؐ کی زیارت کے لئے دور و دراز مسافت طے کر کے حاضر ہوئے ہیں۔ ہم نے راہ کی سخت تکلیفیں جھیلی ہیں، ہمارے اونٹوں کے جگر پھٹ گئے، اور نرم و سخت وادیاں اور پہاڑ اور جنگل طے کر کے ہم خدمتِ اقدس میں پہنچے ہیں۔ آپ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا کہ اسی کا تو نتیجہ ہے کہ تمہارے اونٹ جتنے قدم چلے، ہر قدم پر ان کی ایک نیکی لکھی گئی، اور میری زیارت کے آنے کا یہ ثمرہ ہے کہ میں اپنے زائر کی شفاعت کا ذمّہ دار ہوتا ہوں، وہ میری پناہ اور ذمّہ داری میں آجاتا ہے۔ (یہی آج بھی زائرینِ مدینہ سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کا وعدہ ہے)

ایسے وفود اپنی ماضی کی زندگی پر شرمندہ ہوتے اور حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کی عنایات، کرم نوازیوں پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے۔ ایسے تمام وفود کے قیام میں حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم اپنے اصل فریضہ یعنی تبلیغِ دین کے اہم پہلوؤں سے آگاہ فرماتے۔ انہیں اسلامی عقائد، اعمال، فرائض کی تعلیم دیتے۔ اگر معاملہ صرف وفود کی ہدایت تک محدود ہوتا تو یہ کام بھی مشکل نہ ہوتا لیکن حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کے پیشِ نظر ہر لمحہ ہر ایک کی ہدایت، ہر ایک کی رہنمائی تھا۔ توحیدِ باری تعالیٰ سے ان کے قلوب کو منوّر کرنا، رسالت کے انوار اور اس

ے اقتباس از تاریخ اسلام صفحہ ۳۶۴ - ۳۶۷

کی عظمتوں سے روشناس کرنا، اسلام کی وسعتوں اور رفعتوں سے اُن کے اذہان کو متاثر کرنا، اور ایمان کی دولت سے مالامال کرنا تھا۔

اس میں وہ اہم گھڑیاں بھی آتیں جن میں حضورؐ کو اپنی نبوّت کی صداقت کے لئے معجزات سے کام لینا ہوتا، کہیں شق القمر کا معجزہ ہے، اور کہیں چرند، پرند، شجر، حجر، شمس و قمر اس کے شاہد بن جاتے ہیں۔

اس موضوع پر ایک مختصر کتاب شواھدِ نبوّت ایک عاشقِ رسول حضرت عبدالرحمٰن جامیؒ کی اپنے انداز سے ہے، پھر ہر سیرت نگار نے اس کے باب قائم کیئے ہم یہاں ان کی تفصیل کو پیش کرنے کے بجائے صرف اس حقیقت پر اکتفا کرتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کی ذاتِ مبارکہ ہمہ تن معجزہ ہے۔ آپؐ کی گفتار، کردار، اخلاق، حیاتِ مبارکہ کا ہر لمحہ، ہر سانس، یہاں تک کہ جبینِ مبارک پر کوئی شکن بھی سب حضورؐ کی معجزانہ حیاتِ مبارکہ پر شاہد ہیں۔

ہم نے اس کتاب میں نورِ مبین صلی اللہ علیہ وسلّم کی حیاتِ مبارکہ کو جس انداز سے پیش کرنے کی سعادت حاصل کی ہے ہم اسی ایک معجزہ پر آپؐ کی توجہ کے طالب ہیں۔ پھر اس کے جلو میں جو آتا گیا وہ بیان ہوتا گیا اور بیان ہوتا جائے گا۔

وَمَا تَوْفِیْقِیْ اِلَّا بِاللّٰہ

حجّۃُ الوداع

جب اسلام کی روشنی عرب کے اندر باہر ہر جانب پھیل گئی خانۂ کعبہ میں صدیقِ اکبرؓ نے ایک سال قبل کے دورانِ قیام میں مسلمانوں کو آدابِ قبول سے مانوس فرما دیا اور ارضِ کعبہ ہمیشہ کے لئے کفّار کے لئے حرام کر دیا گیا۔ اس وقت اس ہادیٔ برحق نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کے جلو میں ایک حج وہ ہوا جو مسلمانوں کی انفرادی و اجتماعی کیفیات کے ساتھ توحیدِ باری تعالیٰ کا ایک بے مثال نمونہ اور فروغِ اسلام کی تا قیامت بقا کا ضامن بنا۔

آخر ماہ ذی قعدہ کا چاند نظر آیا اور وفود کی کثرت سے جو آستانہ سرورِ کائنات صلّی اللہ علیہ وسلّم پر حاضر رہتی اس سے بھی فراغت ملی آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فریضۂ حج کا ارادہ فرمایا۔ یہ وہ خبر تھی جس نے مسلمانوں کے قلوب میں مسرّت و جوش و خروش کی ایک لہر دوڑا دی۔

۲۵ ذی قعدہ کو حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم نے غسل فرمایا اور قصوایٰ اُونٹنی پر سوار ہو کر اس فریضۂ حج کی ادائیگی کے لئے اس طرح تیار ہوئے کہ ستر اونٹ بطور ہدیہ ساتھ تھے۔ خاندان کے لوگ، ازواجِ مطہّراتؓ ہمراہ تھیں، اور سب بآوازِ بلند تلبیہ پڑھ رہے تھے۔

اَللّٰھُمَّ لَبَّیْكَ ، لَبَّیْكَ لَاشَرِیْكَ لَكَ لَبَّیْكَ

قافلہ رواں تھا۔ لبیک کی جانفزا آوازیں فضاؤں میں گونج رہی تھیں جب نظر بیت اللہ شریف پر پڑی حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم نے ہاتھ اُٹھا کر تکبیر کہی اور بابُ السّلام کی طرف سے حرم شریف میں داخل ہوئے اور موقع موقع پر صحابہ کرامؓ کی جماعت کو ضروری احکامات سے آگاہ فرماتے جاتے۔ نویں ذی الحجہ کو جُمعہ کے دن اشراق کے وقت عرفات کے جانب روانہ ہوئے جہاں آپ نے مقامِ نمرہ

میں خیمہ میں قیام فرمایا۔ظہر وعصر کی نمازوں کو جمع فرمایا،یعنی ظہراور عصر کی نمازیں یکے بعد دیگرے ظہر کے وقت ادا فرمائیں پھر جبلِ رحمت پر تشریف لے گئے اور اپنی اُونٹنی پر سوار ہوئے اور اس مجمع میں سے جو ایک لاکھ چالیس ہزار فدائیانِ اسلام پر مشتمل تھا خطاب فرمایا۔جن کا ذکر آگے آئے گا یہی وہ خطبہ ہے جو نہ صرف ان اصحاب کرام کے لئے ایک مشعلِ ہدایت تھا،بلکہ ان تمام مسلمانوں کے لئے جو اسلام میں قیامت تک شامل ہونے والے تھے،ایک زندہ جاوید منشور تھا، وہ منشور جس کے ختم پر خود ربّ العزت نے اس پر اپنی رضا اور تکمیلِ دین کی مہر ثبت فرما دی۔حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم خطبہ سے فارغ ہوئے تو وہ آیتِ مبارکہ نازل ہوئی جس نے اصحاب کی آنکھوں کو پُرنم کر دیا اور ان کے منوّر چہروں کو منوّر سے منوّر تر کر دیا:

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا ؕ (آیت ۳: سورہ المائدہ)

(مسلمانو!) آج ہم نے تمہارے لئے تمہارا دین کامل کر دیا اور اپنی نعمتیں تم پر پوری کر دیں اور اسلام کو دین پسند کیا۔

و

نبی صلی اللہ علیہ وسلم
کا
خطبہ
بیوم حجۃ الوداع

(۱) يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي لَا أَرَانِي وَإِيَّاكُمْ نَجْتَمِعُ فِي هٰذِهِ الْمَجْلِسِ أَبَدًا [1]

(۱) لوگو! میں خیال کرتا ہوں کہ میں اور تم پھر کبھی اس مجلس میں اکٹھے نہیں ہوں گے۔

(۲) إِنَّ دِمَاءَكُمْ وَأَمْوَالَكُمْ وَأَعْرَاضَكُمْ حَرَامٌ عَلَيْكُمْ كَحُرْمَةِ يَوْمِكُمْ هٰذَا فِي بَلَدِكُمْ هٰذَا۔ فِي شَهْرِكُمْ هٰذَا۔ وَسَتَلْقَوْنَ رَبَّكُمْ فَيَسْأَلُكُمْ عَنْ أَعْمَالِكُمْ أَلَا فَلَا تَرْجِعُوا بَعْدِي ضُلَّالًا يَضْرِبُ بَعْضُكُمْ رِقَابَ بَعْضٍ [2]

(۲) لوگو! تمہارے خون، تمہارے مال اور تمہاری عزتیں ایک دوسرے پر ایسی ہی حرام ہیں، جیسا کہ تم آج کے دن اس شہر کی، اس مہینہ کی حرمت کرتے ہو۔ لوگو! تمہیں عنقریب خدا کے سامنے حاضر ہونا ہے اور وہ تم سے تمہارے اعمال کی بابت سوال فرمائے گا خبردار! میرے بعد گمراہ نہ بن جانا کہ ایک دوسرے کی گردنیں کاٹنے لگو۔

---

[1] معدن الاعمال حدیث نمبر ۱۱۷، عن وابصہؓ رواہ ابن عساکر

[2] عن ابی بکرۃ۔ صحیح بخاری باب حجۃ الوداع۔

(۳) أَلَا كُلُّ شَيْءٍ مِنْ أَمْرِ الْجَاهِلِيَّةِ تَحْتَ قَدَمَيَّ مَوْضُوعٌ۔ وَدِمَاءُ الْجَاهِلِيَّةِ مَوْضُوعَةٌ وَإِنَّ أَوَّلَ دَمٍ أَضَعُ مِنْ دِمَائِنَا دَمُ ابْنِ رَبِيعَةَ بْنِ الْحَارِثِ كَانَ مُسْتَرْضِعًا فِي بَنِي سَعْدٍ فَقَتَلَهُ هُذَيْلٌ۔ وَرِبَا الْجَاهِلِيَّةِ مَوْضُوعَةٌ وَأَوَّلُ رِبًا أَضَعُ رِبَانَا رِبَا عَبَّاسِ بْنِ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ فَإِنَّهُ مَوْضُوعٌ كُلُّهُ۔

(۳) لوگو! جاہلیت کی ہر ایک بات میں اپنے قدموں کے نیچے پامال کرتا ہوں۔ جاہلیت کے قتلوں کے تمام جھگڑے ملیامیٹ کرتا ہوں۔ پہلا خون جو میرے خاندان کا ہے یعنی ابن ربیعہ بن الحارث کا خون جو بنی سعد میں دودھ پیتا تھا اور ہذیل نے اسے مار ڈالا تھا میں چھوڑتا ہوں۔ جاہلیت کے زمانہ کا سود ملیامیٹ کر دیا گیا۔ پہلا سود اپنے خاندان کا جو میں مٹاتا ہوں، وہ عباس بن عبدالمطلب کا سود ہے وہ سارے کا سارا چھوڑ دیا گیا۔

(۴) فَاتَّقُوا اللّٰهَ فِي النِّسَاءِ فَإِنَّكُمْ أَخَذْتُمُوهُنَّ بِأَمَانِ اللّٰهِ وَاسْتَحْلَلْتُمْ فُرُوجَهُنَّ بِكَلِمَةِ اللّٰهِ وَلَكُمْ عَلَيْهِنَّ أَلَّا يُوطِئْنَ فُرُشَكُمْ أَحَدًا تَكْرَهُونَهُ فَإِنْ فَعَلْنَ ذٰلِكَ فَاضْرِبُوهُنَّ ضَرْبًا غَيْرَ مُبَرِّحٍ۔ وَلَهُنَّ عَلَيْكُمْ رِزْقُهُنَّ

(۴) لوگو! اپنی بیویوں کے متعلق اللہ سے ڈرتے رہو۔ خدا کے نام کی ذمہ داری سے تم نے ان کو بیوی بنایا۔ اور خدا کے کلام سے تم نے ان کا جسم اپنے لئے حلال بنایا ہے۔ تمہارا حق عورتوں پر اتنا ہے کہ وہ تمہارے بستر پر کسی غیر کو (کہ اس کا آنا تم کو ناگوار ہے) نہ آنے دیں۔ لیکن اگر وہ ایسا کریں تو ان کو ایسی مار مارو جو نمودار نہ ہو۔ عورتوں کا حق تم پر یہ ہے کہ تم ان کو

وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ

اچھی طرح کھلاؤ، اچھی طرح پہناؤ۔

⑤ وَقَدْ تَرَكْتُ فِيْكُمْ مَا لَنْ تَضِلُّوْا بَعْدَهٗ اِنِ اعْتَصَمْتُمْ بِهٖ كِتَابَ اللّٰهِ۔

⑤ لوگو! میں تم میں وہ چیز چھوڑ چلا ہوں کہ اگر اس کو مضبوط پکڑ لوگے تو کبھی گمراہ نہ ہوگے۔ وہ قرآن اللہ کی کتاب ہے۔

⑥ اَيُّهَا النَّاسُ اِنَّهٗ لَا نَبِيَّ بَعْدِيْ وَلَا اُمَّةَ بَعْدَكُمْ اَلَا فَاعْبُدُوْا رَبَّكُمْ وَصَلُّوْا خَمْسَكُمْ وَصُوْمُوْا شَهْرَكُمْ وَاَدُّوْا زَكٰوةَ اَمْوَالِكُمْ طَيِّبَةً بِهَا اَنْفُسُكُمْ وَتَحُجُّوْنَ بَيْتَ رَبِّكُمْ وَاَطِيْعُوْا وُلَاةَ اَمْرِكُمْ تَدْخُلُوْا جَنَّةَ رَبِّكُمْ[1]

⑥ لوگو! نہ تو میرے بعد کوئی پیغمبر ہے اور نہ کوئی جدید امت پیدا ہونے والی ہے خوب سن لو کہ اپنے پروردگار کی عبادت کرو اور پنجگانہ نماز ادا کرو۔ سال بھر میں ایک مہینہ رمضان کے روزے رکھو۔ مالوں کی زکوٰۃ نہایت خوشدلی کے ساتھ دیا کرو۔ خانہ خدا کا حج بجا لاؤ۔ اور اپنے اولیائے امور حکام کی اطاعت کرو جس کی جزا یہ ہے کہ تم اپنے پروردگار کے فردوس بریں میں داخل ہوگے۔

⑦ وَاَنْتُمْ تُسْاَلُوْنَ عَنِّيْ فَمَا اَنْتُمْ قَائِلُوْنَ؟

⑦ لوگو! قیامت کے دن تم سے میری بابت بھی دریافت کیا جائیگا۔ مجھے ذرا بتا دو کہ تم کیا جواب دوگے؟

قَالُوْا نَشْهَدُ اَنَّكَ

سب نے کہا کہ ہم اس کی شہادت دیتے ہیں:

قَدْ بَلَّغْتَ

کہ آپ نے اللہ کے احکامات ہم کو پہنچا دیئے۔

وَاَدَّيْتَ

آپ نے رسالت و نبوت کا حق ادا کر دیا۔

وَنَصَحْتَ

آپ نے ہم کو کھرے کھوٹے کی بابت اچھی طرح بتا دیا۔

---

[1] معدن الاعمال حدیث نمبر ۱۱۰۸ - ۱۱۰۹ عن ابی امامہ رواہ ابن جریر و ابن عساکر

فَقَالَ بِاِصْبَعِہِ السَّبَّابَۃِ یَرْفَعُھَا اِلَی السَّمَآءِ وَیَنْکُسُھَا اِلَی النَّاسِ ۔	(اس وقت) نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی انگشتِ شہادت کو اٹھایا۔ آسمان کی طرف انگلی کو اٹھاتے تھے اور پھر لوگوں کی طرف جھکاتے تھے۔ (فرماتے تھے) اے خدا سُن لے (تیرے بندے کیا کہہ رہے ہیں۔)
اَللّٰھُمَّ اشْھَدْ	اے خدا گواہ رہنا (کہ یہ لوگ کیا گواہی دے رہے ہیں۔)
اَللّٰھُمَّ اشْھَدْ	
اَللّٰھُمَّ اشْھَدْ	اے خدا شاہد رہ۔ (کہ یہ سب کیسا صاف اقرار کر رہے ہیں۔)
ثَلَاثَ مَرَّاتٍ [1]	
(۸) اَلَا لِیُبَلِّغِ الشَّاھِدُ الْغَائِبَ فَلَعَلَّ بَعْضَ مَنْ یُبَلِّغُہٗ اَنْ یَّکُوْنَ اَوْعٰی لَہٗ مِنْ بَعْضِ مَنْ سَمِعَہٗ [2]	(۸) دیکھو! جو لوگ موجود ہو وہ ان لوگوں کو، جو موجود نہیں ہیں، اُن کی تبلیغ کرتے رہو۔ ممکن ہے کہ بعض سامعین سے وہ لوگ زیادہ تر اس کلام کو یاد رکھنے اور حفاظت کرنے والے ہوں، جن پر تبلیغ کی جائے۔

از

(رحمۃ للعالمین) جلد اوّل (۲۳۲-۲۳۴)

یہ ہے وہ ابدی منشور جس کو اپنا کر ہی ہم راہ ہدایت پا سکتے ہیں

اور

جو آج بھی بھٹکی ہوئی انسانیت کے لئے پیام امن ہے

---

[1] عن امام جعفر صادق عن امام محمد باقر بروایت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ صحیح مسلم باب حجۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔
[2] عن ابی بکرہ صحیح بخاری باب حجۃ الوداع۔

اس آیتِ کریمہ کے متعلق جو اس موقع پر نازل کی غور طلب یہ بات ہے کہ مسلمانوں نے تو کہا تھا اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللهُ لیکن یہاں ربّ العزّت گواہی دے رہا ہے کہ بے شک اے حبیبؐ آپ نے اپنا مشن مکمل فرمایا۔ اور وہ کام حضرت آدم علیہ السّلام کے ذریعہ آپ ہی کے نورِ مبینؐ سے شروع ہوا تھا آج تکمیل کو پہونچا اور یہی وہ دین قرار پایا جس کو اللہ تعالیٰ نے پسند فرمایا۔

(سبحان اللہ)

وَصَلَّى اللّٰهُ عَلَى النَّبِيِّ الْاُمِّيِّ وَاٰلِهٖ

و

وہ شمسِ نبوت جو غروب ہونے کے لئے طلوع ہی نہ ہوا تھا

ہاں

وہ خاتم النّبییّن بن کر آیا تھا اور یہ بتانے کے لئے آیا تھا

لَا نَبِیَّ بَعْدِی

(میرے بعد کوئی نبی نہیں)

آمَنْتُ بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ وَلَا نَبِیَّ بَعْدَہٗ

○

ہاں

اس پیکرِ بشریت میں اس نور کو مس کرنے کی سعادت اور اس کی خدمت کا موقع جملہ اولوا العظم ملائکہ کو ملا۔ تو عزرائیل کو بھی اس کی سعادت سے محروم نہ رکھا گیا موت شئی کے لئے ہے، جس سے وجودِ شئے ہے وہ لافانی ہے۔ یہی وہ مکالمہ تھا جو زبانِ صدیق رضؓ اور شمشیرِ عمرؓ کے درمیان میں ہوا۔

اس وقت

جب یہ نورِ مبینؐ عوام کی آنکھوں سے پیکرِ بشریت میں اوجھل ہو گیا تو اب فیصلہ ربّ العزّت ہی کا کلام کرے گا اور وہی حق ہوگا، وہی حق تھا، وہی حق ہے۔ یعنی وہ آیتِ کریمہ جو صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کی زبان پر آئی اور مسلمانوں نے محسوس کیا جیسے وہ اسی وقت کے لئے تھی۔ اور انہوں نے لقاءِ ربّ کے ساتھ رسالت کی وسعتوں اور انوار کو سمجھا۔

واضح رہے

کہ قرآنِ حکیم یوں تو تمام کا تمام ہی اللہ ربّ العزت کی احدیتِ ذات اور واحدیتِ صفات پر شاہد ہے لیکن ان سب کا بیان اور اُس کی تفسیر محمدؐ رسول اللہ ہی سے کی گئی ہے۔ ہر جگہ قرآن شریف میں حضورؐ کو اللہ تعالیٰ کے اسماءُ الحسنیٰ کی طرح اچھے اچھے ناموں سے یاد کیا گیا اور صرف چار مقامات پر اسمِ محمدؐ کو جگہ دی گئی ہے تاکہ اس کی عظمت، مقام، حقیقت میں کسی قسم کا تلبّس نہ آنے پائے اور ذاتِ مقدسہ کے انوارِ رسالت پر کوئی حجاب نہ آنے پائے، نہ زندگی میں نہ رفیقِ اعلیٰ کی طرف سفر کرنے کے بعد۔

حضرت صدیقِ اکبرؓ نے حضرت فاروقِ اعظمؓ کی توجہ جس آیت کی جانب مبذول فرمائی وہ سورۂ آل عمران کی آیت ۱۴۴ ہے۔

وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ؕ اَفَاۡئِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ ؕ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْـــًٔا ؕ وَسَيَجْزِى اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ ○

(اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تو صرف (خدا کے) پیغمبر ہیں، اُنؐ سے پہلے بھی بہت سے پیغمبر ہو گذرے ہیں، بھلا اگر یہ مر جائیں یا مارے جائیں تو تم اُلٹے پاؤں پھر جاؤ؟ اور جو اُلٹے پاؤں پھر جائے گا تو وہ خدا کا کچھ نقصان نہ کر سکے گا۔ اور اللہ تعالیٰ شکر گذاروں کو (بڑا) ثواب دیتا ہے)

یہاں بھی بتانا یہ تھا کہ لوگو دیکھو تم وہ غلطی نہ کرنا جو دوسری اُمتوں نے کی۔ کیسے ناسمجھ ہو کہ تمہاری نظریں آپؐ کے پیکرِ بشریت پر پڑ رہی ہیں۔ وہؐ تو پیکرِ بشریت میں بھی تمہاری اصلاح کے لئے آئے اور تمہارے لئے اپنی سُنّت قائم کرنے تشریف لائے، یاد رکھو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) درحقیقت صرف اللہ کے رسول ہیں، اُنؐ کی رسالت اُنؐ کے انوار پر تمہاری نظر ہونا چاہیئے نہ کہ جسم و پیکرِ جسمانی پر۔ اسی جسم و جسمانیت تک تو کفار اپنی نظریں محدود

کرکے عذابِ دائمی کے موجب بنے۔

اسی حقیقت کو دوسری جگہ اور بھی واضح انداز میں سورہ احزاب کی آیت ۴۰ میں بیان کیا گیا ہے۔

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا ۝

(اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں بلکہ خدا کے پیغمبر اور نبیوں (کی نبوّت) کی مُہر (یعنی اس کو ختم کرنے والے) ہیں۔)

یہاں بھی یہی بات

ذہن نشین کی جا رہی ہے کہ اے بَشَر بَشَر کی رٹ لگانے والو آپؐ کی بشریت کو سمجھو۔ وہ تم میں سے کسی کے باپ نہیں۔ اُنؐ کا تعلق تو ہم (اللہ جل جلالہٗ) سے ہے، وہ ہمارے رسول ہیں، خاتم النّبیین ہیں۔ آخری نبی ہیں۔

پھر سورہ الفتح میں حضورؐ کے اسمِ گرامی محمدؐ کو جس شان سے جگہ دی گئی ہے اُس کا بیان ہو چکا ہے۔ بلکہ اِن الفاظ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ؕ (آیت ۲۹) کو کلمہ کا جزو بنا دیا گیا ہے۔

اور

حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے نام کی سورت (سورۂ محمدؐ) میں اس انقلاب خیز حقیقت کو آشکارا کر دیا گیا کہ جس نے آپ کی راہ روکی تباہ ہوا۔ اور جو اللہ اور اس کے رسولؐ پر ایمان لایا اور عمل صالح کئے اور اُس پر ایمان لایا جو اُنؐ پر نازل ہوا تو اُس کے گناہ دُور کر دیئے گئے اور اُس کی حالت سنوار دی گئی۔

مومنو! مسلمانو! سمجھو

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو لوگوں نے دیکھا، اُنؐ کی رسالت کو نہ صرف ان

آنکھوں سے دیکھا۔ بلکہ ایمان کی آنکھوں سے دیکھا۔ رسالت کی یافت بصیرت سے ہے نہ کہ بصارت سے۔ یہ رسالت بھی ایک نور ہے جو اپنی آغوش میں جملہ کائنات کو لئے ہوئے ہے۔ یہ چادرِ رسالت حمد سے بنی ہے۔ اس کے تانے بانے، ظاہر باطن، سب حمد ہیں۔ رسالت اپنی اسی چادرِ حمد کے نور و انوار میں اپنوں کو غیروں کو لے لینے کے لئے بے تاب ہے۔ اس کا ظاہر بھی رحمت ہے اس کا باطن بھی رحمت ہے۔ یہ پرتو الرحمٰن والرحیم ہے یہ تو سائبانِ رحمت ہے۔ جب تک رسالت کی عظمت کو نہ سمجھو گے نورِ رسالت کو کیا سمجھ سکو گے۔ پھر جب صفت ہی کو نہ سمجھے تو پھر ذات کی یافت کیسے میسّر ہو گی؟ نور السمٰوٰت والارض کو کیا سمجھو گے۔ یاد رکھو محروم رسالت، محروم توحیدِ باری تعالیٰ ہوتا ہے، یہی تو کلمہ نے سمجھایا ہے کہ

پہلے کہو، پھر سمجھو، اور پھر ہو جاؤ

اُسی سانچہ میں ڈھل جاؤ جو نُور و انوار میں لے جاتا ہے، کہ نُور کی یافت بھی نُور ہی سے ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس حجاب میں جانے کے حالات اور اس وقت شمعِ نبوت کے پروانوں کی بے تابی کا ذکر جملہ سیرت نگاروں نے کیا ہے۔ اسی تڑپ کے ساتھ، اسی عقیدت کے ساتھ، اسی محبت کے ساتھ، پوری تفصیل کے ساتھ، اسی گرانیٔ قلب کے ساتھ جو حالات کا تقاضا تھا۔ یہاں اس کا اعادہ منظور نہیں، صرف چند اُمور کی طرف توجہ مبذول کرنا ہے۔

یہ سطور جب لکھی جا رہی ہیں وہ ربیع الاوّل ہی کا مہینہ ہے، وہی مہینہ جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس زمینِ آب و گِل کو اپنی تشریف آوری سے سرفرازی بخشی تھی، وہی ماہ جب یہ شمسِ نبوت حجابِ ذات میں جا رہا ہے۔ اس طرح ۱۳ یوم علالت کے بعد کہ قیام حضرت عائشہ صدیقہؓ

کے حجرۂ مبارک میں ہے، جس کا دروازہ مسجدِ نبوی کی طرف کھلا ہے، اور آپؐ حضرت صدیقِ اکبرؓ کو امامت کے فرائض انجام دیتے ہوئے ملاحظہ فرماتے ہیں۔ اور تسکین کی لہریں چہرۂ اقدس پر گھوم جاتی ہیں۔ سَرِ اقدس حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے سینۂ مبارک پر تکیہ کئے ہوئے، دہنِ مبارک میں مسواک اور زبان پر

"اِلَی الرَّفِیْقِ الْاَعْلٰی" کے کلمات ہیں۔

یہ بھی دوشنبہ کا دن تھا۔ ۱۲ ربیع الاوّل ۱۱ھ۔ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْکَ یَا نُوْرَ مُحَمَّدٍ

واضح رہے یہ جانا اس لئے نہ تھا کہ سب جانے کے لئے آئے ہیں اس لئے حضورؐ بھی جا رہے ہیں۔ نہیں نہیں۔ یہ جانا اسلام کو تکمیل کی ان منازل سے گذارنے کے لئے تھا جس کو قُربِ قیامت میں اختتام پذیر ہونا تھا۔ اور پھر قیامت میں اسی جسم وجسمانیت اسی شخص محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پیکر میں امت اور مخلوقِ خدا کے لئے پیکرِ رحمت بن کر ظاہر ہونا تھا، جس کا ذکر آئندہ ابواب میں آئے گا۔

قرآنِ حکیم میں

اللہ تعالیٰ نے حضورؐ کے زمانہ میں آپؐ کے وصال سے کچھ قبل ہی اس کی خبر سورہ النصر میں دے دی تھی۔ "اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰہِ وَالْفَتْحُ" اس کا ایک منظر تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ میں مکمل ہو چکا تھا، یعنی فتحِ مکہ۔ لیکن ابھی کُل کائنات میں بھی فروغِ اسلام کا علم بلند ہونا اور بالآخر اسلام ہی رہ جانا، باقی تھا۔ رسالت کو یہ کام بظاہر حجاب ہی میں رہ کر انجام دینا تھا، کہ آپؐ خاتم النبیین ہیں۔

اسی طرف حضور صلی اللہ علیہ وسلم

نے حجۃ الوداع کے دن اشارہ فرمایا کہ "لوگو میں خیال کرتا ہوں کہ میں تم

کبھی اس مجلس میں اکٹھا نہ ہوں گے ۔ وہی ہوا

ہاں امت کو یہ ضرور سمجھا دیا

کہ تم اپنے سے مجھ کو جدا نہ سمجھنا۔ یاد رکھو جس نے میری قبر کی زیارت کی اس نے میری ہی زیارت کی (یعنی میں (صلی اللہ علیہ وسلم) تو تم کو دیکھ بھی رہا ہوں گا، تمہاری دعا، کلام، سلام بھی سُن رہا ہوں گا لیکن تمہارا مجھ کو دیکھ سکنا یہ تمہارے اپنے احوال پر ہے۔)

یہ بھی اطمینان دلا دیا تھا

کہ جس نے مجھے خواب میں دیکھا اس نے بھی مجھی کو دیکھا۔

(تاکہ عوام کے دل نہ ٹوٹیں اور حضورؐ جب چاہیں جس کو اپنی دید سے سرفرازی بخشیں)

یہ بھی واضح فرما دیا

کہ ہم (نورِ مبینؐ) زندگی میں جسم وجسمانیت کے ساتھ اور اب تاقیامِ قیامت نور و نورانیت کے ساتھ تمہارے ساتھ ہیں۔

مجھ کو یاد کرنے کا ذریعہ صلوٰۃ ہے، وہ صلوٰۃ جو اللہ کے لئے ہے لیکن میری آنکھوں کی ٹھنڈک ہے۔

اور

وہ صلوٰۃ بھی جو میرا ربّ کریم ہر لمحہ مجھ پر بھیجتا ہے اور جس میں تم کو شریک بنا کر تمہارے لئے لامتناہی فلاح وبہبود، کرم وفضل کے در کھول دیئے ہیں۔

اَللّٰھُمَّ

اِفْتَحْ لِیْ اَبْوَابَ رَحْمَتِكَ وَارْزُقْنِیْ مِنْ زِیَارَتِ رَسُوْلِكَ كَمَا رَزَقْتَ اَوْلِیَاءَكَ وَاَھْلَ طَاعَتِكَ وَاغْفِرْلِیْ وَارْحَمْنِیْ یَا خَیْرَ مَسْئُوْلٍ

یہ بات بھی

یاد رکھنے کی ہے کہ ایک ہی دن، ایک ہی ماہ حضورؐ کی ولادت اور وصل کا صرف اس لئے ہے کہ یہ نورِ مبینؐ جو ازل تا ابد ادائیگیٔ فرض میں مصروفِ عمل ہے اس کی اس حیاتِ مبارکہ کو اسی پس منظر اور اسی مستقبل کے انوار میں دیکھا جائے، اسے ایک عام انسان کی زندگی اور موت سے تعبیر نہ کیا جائے۔

ہاں

آپؐ کی بعثت و ولادت پر نذرانہ عقیدت کا سلسلہ جاری ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مومنوں کے لئے اپنے اس خصوصی احسان کا ذکر لَقَدْ مَنَّ اللّٰہُ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ کے ساتھ فرمایا ہے۔

صَلَّی اللّٰہُ عَلَی النَّبِیِّ الْاُمِّیِّ وَاٰلِہٖ

وَصَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ

صَلٰوۃً وَّسَلَامًا عَلَیْکَ یَارَسُوْلَ اللّٰہ

و

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○

باب ششم

اللّٰھُمَّ صَلِّ علیٰ سیّدنا محمد معدن الجود والکرم منبع العلم والحِکَم
وعلیٰ اٰلہٖ وَبارک وسلّم

نورِ مبین صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم

○

حجابِ نورِ مصطفےٰ کے بعد نورِ مبین صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم
کے
انوارِ مبارکہ نفخِ صور تک
تنویر و تجلّیات

باب ششم

یاسمہ

"اللہ نور السمٰوات والارض"

نور کی یافت نور ہی سے ہے

قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّكِتٰبٌ مُّبِيْنٌ۔ "تمہارے پاس اللہ کی طرف سے نورِ مبین (صلی اللہ علیہ وسلم) آیا اور واضح کتاب (قرآنِ حکیم)"۔ یہ نورِ مبین صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ مبارکہ کی چھٹی منزل ہے، جو قرآنِ حکیم کی چھٹی منزل کی طرف راہنمائی کرتی ہے۔ وہ چھٹی منزل جس میں اللہ رب العزت نے اپنی توحید خالص کا راز امتِ مسلمہ پر آشکارا فرمایا ہے، اور بتایا ہے کہ جس نے جس قدر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نور کو دیکھا آپؐ کی ذاتِ مبارکہ کو سمجھا، اور جس قدر آپؐ کے اخلاقِ حمیدہ سے اپنے کو مزین کر سکا، اسی قدر وہ اپنے رب سے قریب ہو گیا۔ بلاشبہ کلمہ پڑھنے سے انسان مسلم ہوتا ہے لیکن جب تک سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اور آپؐ کے اوصافِ حمیدہ، اس کے ظاہر و باطن میں بس نہیں جاتے، اس پر کلمہ کا راز نہیں کھلتا اور وہ درجۂ تکمیل ایمان تک نہیں پہنچتا۔ قرآن کی اس منزل پر، توحید باری تعالےٰ کے بیان کے بعد، سات حجاباتِ نوری اٹھائے گئے ہیں۔ پھر اس نورِ مبین صلی اللہ علیہ وسلم سے قرب کی راہ دکھائی گئی ہے، اور فتحِ مبین سے نوازا گیا ہے، اور سورۂ فتح کی آخری آیت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے گرد جو نجوم درخشاں تھے اُن کی تعریف کی گئی ہے۔ بتایا گیا ہے کہ نائج امر کیسے ہوتے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم، آپؐ کے اصحابؓ اور اہلِ بیتؓ کا ذکر ایک ساتھ آتا ہے۔ ان کی پہچان بتائی جاتی ہے یہ وہ ہستیاں ہیں جو اللہ کے فضل اور اس

کی رضامندی کے طلب گار ہیں۔ اُن کی علامت اُن کے پُرنور نشانِ سجدہ ہیں جو اُن کے چہروں پر نمایاں ہیں۔ اُن کے چہروں پر عبادت کے آثار، پیشانی پر سجدہ کے نشان، ولایت کا باران کی جبین پر ہے۔ یہ تو الگ پہچانے جاتے ہیں۔ ان کا ذکر تو توریت و انجیل میں آچکا ہے۔ اب تو اسلام کی کھیتی لہلہارہی ہے۔ اللہ نے اُن کو انعامات سے نوازا ہے لیکن اللہ کا یہ وعدہ ہے کہ قیامت تک جو صاحبِ ایمان ہوگا اور نیک عمل کرے گا اسے مغفرت اور اجرِ عظیم سے نوازا جائے گا۔

خوب یاد رہے کہ

اب نورِ مبین صلی اللہ علیہ وسلم کے اس پیکرِ بشریت میں ظاہر ہو جانے کے بعد، نورِ معرفت کو اسی پیکرِ بشریت میں ڈھونڈھنا ہوگا، اور جب مل جائے تو اُس کے قدموں میں سر دے دینا ہوگا۔ اُس کے دامنِ رحمت سے لپٹ جانا ہوگا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے

اس کی طرف یوں راہنمائی فرمائی ہے کہ میں تمہارے درمیان دو چیزیں چھوڑے جاتا ہوں، ایک قرآن اور دوسرے میرا اسوۂ حسنہ۔ یوں بھی فرمایا۔ ایک قرآن اور دوسرے میرے اہلِ بیتؓ[1]۔ قرآنِ حکیم، اللہ تعالیٰ کا کلام، نورِ ہدایت اور خُلقِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کا مُرقّع ہے اور آپؐ کے اصحابؓ اس اخلاق کے نمونہ، آپؐ کے اہلِ بیتؓ اس کی محبت کے آئینہ دار ہیں۔ اسی لئے حضورؐ نے اپنے اصحابؓ کو نجوم سے اور اپنے اہلِ بیتؓ کو کشتی سے تعبیر فرمایا کہ جو اس میں بیٹھ گیا حوادثِ زمانہ کے تھپیڑوں سے، بد اعتقادی کے بھنور سے بچ گیا، نجات پا گیا۔

---

[1] ترمذی شریف

نہ بھولو کہ

کشتی اور نجوم کا تعلق تعینِ رُخ کے لئے لازم و ملزوم ہے۔ یہ دونوں ایک دوسرے سے رشتۂ رسالت میں وابستہ ہیں۔ دونوں ایک ہی منبعِ فیض سے اپنی اپنی استعداد کے مطابق ایک نورِ ہدایت پائے ہوئے ہیں۔

کارِ نبوتؐ

وہ ہستیٔ مبارکہ صلّی اللہ علیہ وسلّم جو صحابہ کرامؓ کی نظروں کے سامنے تھی وہ اب حجاب میں ہے لیکن اس طرح نہیں کہ ہم کو چھوڑ دیا ہو۔ نہیں نہیں۔ بلکہ اب تو دلوں میں گھر کر جانے کے لئے، روح میں تازگی و بالیدگی پیدا کرنے کے لئے ہمارے ساتھ ہیں۔ آج بھی حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم ہمارے سلاموں کا جواب دیتے ہیں، ہماری دعاؤں اور التجاؤں کو بارگاہِ ربّ العزت میں پہنچاتے ہیں، ہماری دعاؤں کی قبولیت اور ہمارے لئے خیر کے طالب ہیں۔ اور آج بھی ہمیں علم و حکمت سے نوازنے، ہماری روح کو پاک سے پاک تر کرنے کے لئے اسی سرزمین میں اسی شہرِ مدینہ میں مقیم ہیں۔ گنبدِ خضریٰ انؐ کی آرام گاہ کا نشان ہے۔ وہ آرام گاہ جسے مولانا محمد یوسف بنوریؒ نے ساتوں آسمانوں، عرشِ مجید اور کعبہ شریف سے بلا اختلاف افضل قرار دیا ہے۔ (معارف السنن جلد ۳ صفحہ ۳۲۳)۔ اور حضور انور صلّی اللہ علیہ وسلّم آج بھی اس ملت کی اسی طرح شیرازہ بندی میں مصروف ہیں جیسے حیاتِ مبارکہ میں تھے، لیکن باندازِ دگر۔

چنانچہ سورۂ جمعہ میں ربّ العزت فرماتا ہے

"هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۗ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝۲ وَّاٰخَرِيْنَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوْا بِهِمْ ۗ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝۳" (سورہ جمعہ آیات ۲-۳)

وہی تو ہے جس نے (عرب کے) ان پڑھ لوگوں میں ان ہی (کی قوم) میں ایک رسول بھیجا جو (علوم باطنی سے آراستہ، جس کا منبع فیض خود ذاتِ باری تعالیٰ ہے) جو ان (لوگوں) کو اس کی آیتیں پڑھ کر سناتا ہے اور ان کو پاک کرتا ہے (اور ان کے ظاہر و باطن کو سنوارتا) ہے۔ اور کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے اگرچہ یہ لوگ اس سے قبل صریح گمراہی میں تھے۔ اور (ان موجودہ لوگوں کے علاوہ) ان میں سے دوسرے لوگوں کے لئے بھی جو ابھی ان میں شامل نہیں ہوئے (یعنی موجودہ اور آنے والے تمام لوگوں کے لئے اس رسولِ برحق کو مبعوث فرمایا گیا ہے)۔ اور وہی (اللہ رب العزت) زبردست حکمت والا ہے۔

ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَ اللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ۝۴

(سورہ جمعہ۔ آیت ۴)

یہ اللہ کا فضل ہے۔ جس کو چاہتا ہے عطا فرماتا ہے۔ اور اللہ بڑے فضل والا ہے۔

اب اس زبردست حکمت والے رب کے انداز دیکھو کہ نورِ مبین ﷺ اسی طرح بظاہر حجاب میں ہے لیکن کارِ نبوت (آیات کو سنانا، قلوب کو پاک کرنا اور علم و حکمت سے لوگوں کو آراستہ کرنے کا کام) اسی طرح جاری ہے۔

کیسے

یہ سمجھنے کی بات ہے۔

۱۔ پہلی بات تو یہ ذہن نشین رہے کہ جملہ انبیاء علیہم السلام زندہ ہیں۔ اور سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم، جو امام الانبیاء ہیں، وہ نہ صرف حیات بعد الموت سے سرفراز ہیں بلکہ کارِ رسالت کی ذمہ داریوں کو اسی بِاِذْنِہٖ[1] طرح سنبھالے ہوئے ہیں۔ اسی انداز سے کہ جملہ رسالتیں انہیں ﷺ کی رسالت میں ضم ہو گئی ہیں

---

[1] "...... الَّذِیْ جَعَلَہٗ بِاِذْنِہٖ مُتَصَرِّفًا فِی الْکَوْنَیْنِ ......"
از درود شریف، سید حمایت علی شاہ صاحبؒ (زادِ راہ صفحہ ۱۰۹)

ویسے ہی جیسے تمام کتبِ سماوی کی تعلیمات قرآن ہیں۔ چنانچہ حضرت علامہ جلال الدین سیوطی متوفی ۹۱۱ھ نے اپنی کتاب اِنْبَاءُ الاذکیاء فی حیات الانبیاءُ میں متعدد احادیث جمع فرمائی ہیں۔ چند جو انبیاء علیہم السلام کی حیات بعد الموت پر شاہد ہیں درجِ ذیل ہیں:

(۱) صحیح مسلم میں حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ معراج کی رات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا گذر موسیٰ علیہ السلام کے پاس سے ہوا جبکہ وہ اپنی قبر میں نماز پڑھ رہے تھے۔

(۲) ابوالعلیٰ نے اپنی مسند میں اور بیہقی نے اپنی کتاب حیات الانبیاء میں حضرت انسؓ سے روایت کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اَلْاَنْبِیَاءُ اَحْیَاءٌ فِیْ قُبُوْرِھِمْ یُصَلُّوْنَ"

انبیاء علیہم السلام اپنی قبروں میں زندہ ہیں اور نماز پڑھتے ہیں۔

(۳) بخاری نے حضرت عمارؓ سے روایت کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ کا ایک فرشتہ ایسا ہے کہ جسے اللہ تعالےٰ نے تمام مخلوقات کی جتنی قوت شنوائی دے رکھی ہے اور میری قبر پہ مقرر کر رکھا ہے تاکہ جو شخص بھی (اور کہیں بھی) مجھ پر درود بھیجے تو وہ اسے مجھ تک پہنچا دے۔

(۴) سیوطی نے اَنْبَاءُ الاذکیاء میں ایک حدیث نقل فرمائی ہے کہ ابوداؤد اور بیہقی نے اوس ثقفی سے روایت کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جمعہ کا دن سب سے افضل دن ہے اور تم سب اُس دن کثرت سے درود بھیجا کرو۔ تمہارا درود مجھ پر پیش کیا جائے گا۔ صحابہؓ نے عرض کیا: یارسول اللہ ہمارا درود آپ پر کیسے پیش کیا جائے گا جب کہ آپ پوشیدہ ہو چکے ہوں گے۔ آنحضرت نے فرمایا:

إِنَّ اللّٰهَ حَرَّمَ عَلَى الْأَرْضِ أَنْ تَأْكُلَ أَجْسَادَ الْأَنْبِيَاءِ

(اللہ تعالیٰ نے زمین کے لئے انبیاءؑ کے جسموں کو کھانا حرام کر دیا ہے)

(یہ حدیث متعدد کتبِ احادیث میں مروی ہے۔)

(۵) دارمی نے اپنی مسند میں بیان کیا ہے کہ مروان بن محمد نے سعید بن عبدالعزیز سے روایت کی ہے کہ جن دنوں حرّہ کا واقعہ پیش آیا ان دنوں مسجدِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں نہ اذان ہوئی نہ اقامت کہی گئی۔ ان دنوں سعیدؓ مسجد میں رہے۔ قبرِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے جب جھنجھناہٹ کی آواز آتی تو یہ سمجھ جاتے کہ نماز کا وقت آگیا ہے (خصائص کبریٰ میں یوں بھی آتا ہے کہ مجھے آنحضرتؐ کی قبر سے اذان کی آواز آتی اور میں بڑھ کر اقامت کہتا اور نماز پڑھتا۔)

ان اور بکثرت دیگر روایات سے یہ حقیقت واضح ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور تمام انبیاءؑ زندہ ہیں۔ واضح رہے کہ اللہ تعالیٰ نے شہداء کے متعلق فرمایا:

"وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِينَ قُتِلُوا فِي سَبِيلِ اللّٰهِ أَمْوَاتًا ط

بَلْ أَحْيَاءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُونَ O" (آل عمران۔ آیت ۱۶۹)

"اللہ کی راہ میں جو قتل ہوئے ہیں ان کو مردہ نہ سمجھو بلکہ وہ زندہ ہیں اور اپنے رب کے یہاں سے رزق پاتے ہیں۔"

انبیاء علیہم السلام کا مرتبہ تو شہداء کے مقابلہ میں کہیں بلند و بالا ہے۔ ہر نبیؑ میں شہادت اور نبوت کے اوصاف پائے جاتے ہیں۔ ہر نبیؑ اسرارِ الٰہی اور امورِ غیب کی شہادت دیتا ہے۔ اس لئے وہ اس آیت کے عام مفہوم میں شامل ہے۔

اور

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے وفات کے وقت فرمایا کہ وہ اس گوشت کا، جو ایک یہودن نے زہر ملا کر دیا تھا، اثر اپنے حلق میں محسوس فرماتے ہیں۔ اس لئے تو آپؐ اس طرح بھی شہید ہیں۔

حضرت عبدالقادر بغدادیؒ فقیہ، جو شافعیہ کے استاد مانے جاتے ہیں۔
فرماتے ہیں:۔
"ہماری جماعت کے محقق متکلمین کہتے ہیں کہ ہمارے نبیؐ وفات کے بعد زندہ ہیں، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی امت کی عبادت گذاری پر خوش ہوتے ہیں اور اپنی امت کی معصیت کاریوں پر افسردہ ہوتے ہیں۔ نیز یہ کہ آپؐ کی امت میں جو کوئی آپؐ پر درود بھیجتا ہے وہ آپؐ تک پہنچتا ہے[1]"

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ کے متعلق تو اہلِ سنت والجماعت اور مسلمانوں کے تمام اکابر علماء کرام کا اتفاق ہے۔ لیکن اس سلسلہ میں اپنے ایک جیّد فقیہہ عالم مولانا عبید اللہ صاحبؒ کا ایک واقعہ نقل کرنے کو جی چاہتا ہے۔
مولانا میرے زمانۂ قیام جامعہ بہاول پور کے دوران فقہ کے استاد تھے۔ حضرت مولانا کا علماءِ دیوبند سے تعلق تھا۔ نہایت منکسر المزاج، خاموش طبیعت تھے۔ چلتے تو نظریں زمین پر رہتیں، عمامہ سر پر ہوتا۔ جامعہ پیدل تشریف لاتے اور محلہ والوں کا سامان بازار سے خرید کر واپسی میں لے جاتے۔ وہ حج کو تشریف لے گئے۔ ایک دن اس عاجز سے ازراہِ کرم و خلوص ملنے تشریف لائے۔ ہم دونوں اکیلے تھے۔ میں نے مولانا سے عرض کیا کہ حضرت حج تو آپ کا انشاء اللہ مقبول ہے ہی، کوئی ایسا واقعہ بیان فرمائیے جو آپ کے ساتھ خاص ہو اور میرے لئے باعثِ تازگی ایمان ہو۔

پہلے تو آپ چپ رہے۔ پھر میرے اصرار پر شاید اس عاجز کی محبت سے متاثر ہو کر اور ازراہِ کرم فرمایا۔ "میں بوڑھا آدمی ہوں جب روضۂ اقدس پر سلام کے لئے حاضر ہوا تو بہت پیچھے لوگوں میں دبا ہوا کھڑا تھا۔ خیال آیا کہ

---

[1] یہ اقتباسات حیاتِ جاوداں مؤلفہ ڈاکٹر پیر محمد حسن سے ماخوذ ہیں۔

نہ جانے حضور صلی اللہ علیہ وسلم میرا سلام بھی خود سماعت فرمائیں گے یا نہیں۔ بس اس خیال ہی سے آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہیں مجھ پر ایک کیفیت طاری ہوئی اور میں نے دیکھا کہ تمام لوگ جو وہاں موجود تھے وہ سب صف بستہ ہیں اور ایک کے بعد ایک مواجہ شریف کے سامنے سے گذر رہے ہیں اور سلام پیش کر رہے ہیں۔ میں (مولانا صاحب) بھی جب گذرا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو سلام پیش کیا تو آپؐ نے مجھے دیکھا اور تبسم فرمایا۔"

یہ واقعہ

ایک ایسی بزرگ ہستی نے خود اس عاجز سے بیان فرمایا اور اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں اور یہ واقعہ خود ان کی بزرگی پر بھی شاہد ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کے مدارج کو بلند سے بلند تر فرمائے۔

صرف یہ ایک واقعہ نہ صرف حیاتِ نبیؐ پر شاہد ہے بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اندازِ رحمت، کرم، تزکیۂ نفس، تصفیۂ باطن، کا ایک اہم ثبوت ہے۔

۲۔ **دوسری بات** یہ ہے کہ اس دَور میں نورِ مُبین صلی اللہ علیہ وسلم کو سمجھنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اندازِ تبلیغ کو آپؐ کے پیکرِ بشریت میں اجمالاً سمجھیں؛ جو تابعین اور تبع تابعین کے لئے مشعلِ راہ بنا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی نبوّت کی ابتدائی ۱۳ سالہ مکّی زندگی میں جو انداز اختیار فرمایا وہ آپؐ کے لئے اللہ ربّ العزّت کی ایک خصوصی عطا تھی یعنی ایک نگاہِ لطف و کرم سے تزکیۂ نفس فرما کر توحیدِ ربّ العزّت کی تخم ریزی قلوب میں فرماتے، پھر علم و حکمت سے اس کی آبیاری فرماتے۔ گویا "یُزَکِّیْھِمْ" کو اوّلیت حاصل ہوتی۔ پھر "یُعَلِّمُھُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَۃَ" سے سرفرازی بخشی جاتی۔ لیکن مدنی زندگی میں، جہاں آزادی سے اسلام کی اشاعت

کے مواقع ملے، وہاں امت کی توجہ، علم وحکمت کی طرف مبذول فرمائی گئی، اور تزکیۂ نفس اور تصفیۂ باطن کا کام جاری رکھا گیا۔ اسے سنتِ ابراہیمی کہہ لیجئے جس کی دعا انہوں نے فرمائی تھی کہ "اے اللہ۔ ان میں ایک نبی پیدا فرما جو انہیں تیری آیات پڑھ کر سنائے، علم وحکمت کی تعلیم دے، دانائے راز بنائے اور ان کے قلوب کو پاک فرما دے۔"

گویا

یوں کہئے کہ تبلیغ کے دو انداز ہمیشہ رہے ہیں۔ ایک ذہن سے روح کی جانب اور دوسرا روح سے ذہن کی جانب۔ ایک کے لئے ذہنی تشفی کا سامان، علم وحکمت سے مہیا کیا جاتا ہے اور دوسرے کے لئے مقامِ روح سے اس کو ظلمت سے نور میں لایا جاتا ہے، یہی اندازِ تبلیغ علماءِ راسخین اور اولیاءؒ عظام نے اپنایا۔

پھر روح پر یہ کارفرمائیاں کس انداز سے ہوتی ہیں، اس کے لئے روح کے متعلق کچھ عرض کر دینا ضروری ہے۔ یہاں بھی اپنے محترم ڈاکٹر پیر محمد حسن صاحب کی کتاب "حیاتِ جاوداں" سے کچھ اقتباسات پیش کرنا، دلچسپی سے خالی نہیں کیونکہ ڈاکٹر صاحب نے اپنی اس کتاب میں اپنی رائے کو اہمیت دینے کے بجائے احادیث اور ائمہء وقت کے اقوال پر اکتفا کیا ہے۔

روح

(۱) "روح کا وجود تمام مذاہب نے تسلیم کیا ہے۔ چنانچہ ہندی میں اسے "آتما" کہا جاتا ہے اور روحِ کل، یا اللہ تعالیٰ کو "پرماتما" کہتے ہیں۔ دنیا کے تمام مذاہب روح کو غیر فانی تسلیم کرتے ہیں۔ ہندو تو اسے غیر فانی ہی نہیں بلکہ ازلی و ابدی سمجھتے ہیں۔ لہٰذا ان کے یہاں جو ازلی و ابدی ٹھہری تو مخلوق نہ رہی

مگر اسلام روح کو مخلوق بتاتا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کی دیگر مخلوق کی طرح یہ بھی اس کی مخلوق ہے اور بدن سے جدا ہونے کے بعد باقی رہتی ہے۔" (صفحہ ۳-۴)
چنانچہ قرآنِ حکیم میں آدم کی پشت سے ارواح کا نکالنا اور ان سے عہد لینے کا ذکر ابتدائی ابواب میں آچکا ہے

(۲) روح کیا ہے ؟

اس کا جواب یہود کے سوال کے جواب میں نہایت بلیغ انداز سے قرآن میں یوں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یوں حکم فرماتا ہے کہ آپ کہہ دیجئے۔" قُلِ الرُّوحُ مِنْ أَمْرِ رَبِّي وَمَا أُوتِيتُم مِّنَ الْعِلْمِ إِلَّا قَلِيلًا ۝ (سورہ بنی اسرائیل۔ آیت ۸۵)
اے حبیبؐ! آپ فرما دیجئے کہ روح میرے رب کے امر سے ہے اور تمہیں اس کے متعلق بہت تھوڑا علم دیا گیا ہے۔
اس طرح قرآنِ حکیم نے قیاس آرائیوں کے دروازے کو بند کر کے یوں بتایا کہ رُوح ایک غیر محسوس چیز ہے جس کے سمجھنے سے عقل قاصر ہے۔ اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کو حق جانو کہ آپؐ ہی دانائے راز ہیں یہی ادب ہے اور یہی ایمان۔

وہ بزرگ ہستیاں جو روح کی حقیقت کی جویا ہوئیں اور انہیں اس کا عرفان ہوا، وہ بھی اس حقیقت سے انکار نہ کر سکیں کہ انہیں اس کی حقیقت کا علم نہیں۔ ان صوفیا کرام میں حضرت جنید بغدادیؒ خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں
(۳) قرآنِ حکیم میں روح کو نفس سے بھی تعبیر فرمایا۔ لیکن روح[1] اور نفس[2]

---

[1] روح کو لغوی اعتبار سے دیکھیئے تو روح میں مسرت و شادمانی اور راحت و رحمت کے معانی ہیں (یہ لقائے رب سے خوشی ہوگی)۔ قرآنِ حکیم میں یہ لفظ وحی (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

کے درمیان جو فرق ہے اسے بقول ڈاکٹر صاحب، سہیلی نے خوب واضح کیا ہے۔
سہیلی کہتے ہیں۔

"فرشتے کو روح سے وہی نسبت ہے جو انسان کو فرشتوں سے ہے۔ چنانچہ فرشتے ہمیں دیکھ سکتے ہیں اور ہم انہیں نہیں دیکھ سکتے۔ یہی حال روح کا ہے کہ وہ فرشتوں کو دیکھ سکتی ہے اور وہ اسے نہیں دیکھ سکتے۔ یہاں یہ بھی واضح ہو گیا کہ مخلوق کہنے سے ان کی مُراد صرف یہی نہیں کہ وہ مخلوق اور حادث ہے کیونکہ یہ تو ایک واضح بات ہے، جبکہ اس سے مراد یہ ہے کہ فرشتوں اور انسانوں کی طرح ایک مستقل مخلوق ہے۔ روح اور نفس کے درمیان جو لطیف فرق ہے وہ سہیلی کے ان الفاظ سے زیادہ تمہیں واضح اور عمدہ طور پر نہیں ملے گا"

(از الروض الانف۔ حیات جاوداں صفحہ ۷)

(۴) اب سوال یہ ہوتا ہے کہ کیا موت صرف بدن کے لئے ہے یا روح بھی بدن کے ساتھ مر جاتی ہے۔؟

روح بدن میں ہوتی ہے تو اس کی وجہ سے ایک روح کی دوسری روح سے شناخت ہوتی ہے۔ گویا بدن روح کے لئے ایک ڈھانچہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بدن کی بناوٹ نفس کی بناوٹ کے مطابق ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ روح بدن سے صورت حاصل کرتی ہے۔ گویا روح بدن سے اس طرح تاثر حاصل کرتی

(بقیہ حاشیہ) کے لئے بھی استعمال ہوا ہے (سورۂ شوریٰ، آیت ۵۲)۔ یہ امر رب ہی انسان کو دوسری تمام مخلوقات سے الگ کرتا ہے۔ یہ الوہیاتی توانائی ہے۔ مادہ سے آزاد۔

۲؎ نفس کا لفظ انسانی ذات کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرتا ہے۔ جدید اصطلاح میں اسے SELF یا سائیکی کہہ لیجئے، اور یہ انسانی نفس، روح کی طرح غیر مادّی ہے جس میں اختیار بھی ہے اور ارادہ بھی۔ (محترم ابوالخیر کشفی صاحب)

ہے اور اس سے جُدا ہوتی ہے جس طرح بدن روح سے۔

لہٰذا

اگر یوں سمجھا جائے کہ جس طرح بدن سے روح کا جدا ہونا بدن کی موت ہے اسی طرح روح کا بدن سے جُدا ہونا اس کی موت ہے لیکن اس کو موت نہیں آتی، وہ اپنی اس حالت سے جُدا ہو جاتی ہے جس میں وہ پہلے تھی۔ اور اس جدائی کے بعد روح کے لئے نعمتیں بھی ہیں اور عذاب و ثواب بھی۔ چنانچہ قرآن حکیم میں آتا ہے:

"كَيْفَ تَكْفُرُونَ بِاللَّهِ وَكُنتُمْ أَمْوَاتًا فَأَحْيَاكُمْ ۖ ثُمَّ يُمِيتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيكُمْ ثُمَّ إِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ﴿٢٨﴾" (البقرہ۔ آیت ۲۸)

(کافرو!) تم خدا سے کیونکر منکر ہو سکتے ہو۔ جس حال میں تم بے جان تھے تو اس نے تم کو جان بخشی۔ پھر وہی تم کو مارتا ہے پھر وہی تم کو زندہ کرے گا۔ پھر اسی کی طرف لوٹ کر جاؤ گے۔

اس طرح قبر میں میت کا زندہ ہونا ثابت نہیں ہوتا ورنہ تین بار زندگی کا ذکر ہوتا۔ لیکن اس میں وہ ہستیاں مستثنیٰ ہیں جن کو اللہ نے اپنی کسی مشیئت کے تحت کچھ وقت کے لئے زندہ فرما دیا جن کا ذکر قرآن میں آتا ہے۔ دوسرے انبیاء و شہداء کو ایک خاص زندگی عطا ہوتی ہے اور جن کے لئے اللہ تعالیٰ نے فرما دیا کہ ان کے جسم کو زمین کھا نہیں سکتی اور وہ اللہ کے یہاں سے رزق پاتے ہیں۔ جن کے ادراک سے ہمارے ناسوتی حواس قاصر ہیں۔ البتہ یہ واضح ہو جاتا ہے کہ روح کو حیاتِ نو سے سرفرازی ملی ہے اور اس کا تعلق زمین و آسمان سے نہایت سرعت و لطافت کا ہے۔ اس کا چڑھنا اور اترنا لمحہ کی بات ہے بلکہ اس سے بھی کم، اس کا اثر جسم پر یا جسم کے کسی حصّہ پر ہوتا ہے نہ کہ مکمل جسم پر۔ اسے جسم کی حیات سے تعبیر نہ کیا جائے ہے[1] (حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ ہو)

(۵) البتہ مومن اور کافر کی روح میں بڑا فرق ہے۔ مومن کی روح آزاد، علیین پر، عرش کے نیچے ہے جو عرش سے فرش تک آجا سکتی ہے۔ اس کو اس کا مقام جنت میں دکھا دیا جاتا ہے۔ لیکن کافر کی روح سجین میں مقید اور مبتلائے عذاب ہوتی ہے۔

(۶) قبر میں منکر نکیر کے آنے اور سوال وجواب کے وقت جو تعلق روح اور جسم کا ہوتا ہے وہ عارضی ہوتا ہے اور جسم کے اس حصہ پر ہوتا ہے جس سے اس سوال وجواب کا تعلق ہے۔ لیکن اس وقت بھی مردہ کا قبر میں اٹھنا ایسا نہیں ہے جیسا کہ آدمی سو کر اٹھتا ہے، اور اس پر وہ تمام کیفیات طاری ہوں جو جاگ جانے کے بعد ہوتی ہیں۔ بلکہ وہ ایک عارضی کیفیت ہے اور اس کے بعد اس کا مقام متعین ہو جاتا ہے۔ ثواب یا عذاب کے در کھل جاتے ہیں۔

○

اس اقتباس سے یہ بتانا منظور تھا کہ ہمارے جسم میں جو چیز قابلِ قدر ہے اور جس کی حفاظت اور جس کی بالیدگی و تزکیہ پر نظر رکھنا ہے، وہ یہی روح ہے، جس پر زندگی میں بھی انوار کی بارش ہوتی ہے اور اگر یہ کسی صالح کی روح ہے، کسی اللہ والے کی روح ہے، کسی متقی، باخدا بزرگ کی روح ہے تو وصال کے بعد ان کے احوال بہت بلند و اعلیٰ ہوتے ہیں۔ جیسا کہ شیخ

۱؎ فرشتہ موت کا چھوتا ہے گو بدن تیرا
ترے وجود کے مرکز سے دُور رہتا ہے (اقبالؔ)

نہ بھولیں کہ کائنات کا مرکزِ وجود و مقصودِ کائنات نورِ مبین صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہیں۔

عفیف الدین یافعی نے اولیاء اللہ کے متعلق فرمایا کہ اُن کو زندگی میں بھی اعلیٰ منصب سے سرفرازی ملتی ہے اور وصال کے بعد بھی۔ اور اولیاء اللہ پر ایسے احوال وارد ہوتے ہیں جن میں وہ آسمانوں اور دنیا کی ملکوت کا مشاہدہ کر لیتے ہیں، اور وہ انبیاء کو مردہ نہیں زندہ دیکھتے ہیں۔ جیسا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے موسیٰ علیہ السلام کو قبر میں دیکھا تھا۔ یہ بات بھی ثابت ہو چکی کہ جو چیزیں انبیاء کو بطور معجزہ عطا ہوئیں وہی باتیں اولیاء اللہ کو بطور کرامت عطا ہو سکتی ہیں، بشرطیکہ وہ کسی کو چیلنج نہ کریں۔ انبیاء کے زندہ ہونے کے متعلق علماء کے بہت سے صریح بیان موجود ہیں۔

(ڈاکٹر پیر محمد حسن۔ حیات جاوداں۔ صفحہ ۲۵۹)

پھر

جس ذاتِ مبارکہ، جس نورِ مبین صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات بعد الموت کا ذکر ہو رہا ہے وہ نہ صرف کائنات میں سب سے افضل ہیں، انبیاء و مرسلین میں افضل ہیں، ملائکہ المقربین میں افضل ہیں، بلکہ خود اللہ کے حبیب ہیں اور اللہ رب العزت نے کل کائنات کے لئے آپؐ کے نورِ مبین کو وجہِ تخلیق قرار دیا ہے۔ تو اُن کی حیاتِ مبارکہ میں کہاں شک کی گنجائش ہے۔ ہاں آپؐ کے مقام کو سمجھنے کی کوشش کرنا چاہیئے

حقیقت یہ ہے کہ

ہم جس کو حضورؐ کے وصال سے تعبیر کرتے ہیں وہ تو ایک فرض کی ادائیگی کے لئے ایک سنت کا قائم کرنا تھا۔ امت کو یہ بتانا تھا کہ نورِ مبین صلی اللہ علیہ وسلم نے پیکرِ بشریت میں آکر اسلام کے فروغ اور اللہ کی محبت و عظمت کو دلوں میں راسخ کرنے کی کیسی کیسی جدوجہد کی۔ جو فریضہ اب تمہارا یعنی امت مسلمہ کا ہے۔ پھر یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ وہ حقیقت یعنی موت جس سے ہر کس وناکس

کا سابقہ ہوتا ہے۔ اور اس کے بعد اُٹھنے والے مسائل جن سے ہر ایک کو دوچار ہونا تھا، ان کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنا کوئی اسوۂ حسنہ نہ چھوڑیں، یہاں تک کہ مرض الموت کی شدت کی حالت میں بھی جن فرائضِ منصبی کا خیال ضروری ہے ان سے آگاہی نہ بخشیں۔ اور اپنے رفیقِ اعلیٰ کے پاس جانے سے پہلے یہ اطمینان نہ کرلیں کہ اسلامی زندگی کا ہر گوشہ واضح ہوگیا یا نہیں چنانچہ بیماری کی حالت میں، پردہ اُٹھا کر، تمام صحابہؓ کو صدیقِ اکبرؓ کی اقتدا میں نماز پڑھتے دیکھ کر مسرت کے ساتھ چہرۂ مبارکہ پرسکون کی کیفیت کا طاری ہونا جہاں ایک جانب تنظیم کی تکمیل پر شاھد تھا وہیں آپؐ کے ظاہری حجاب کے بعد صدیقِ اکبرؓ کی امامت پر۔

دُنیا سے آپؐ کا تشریف لے جانا تو صرف لباسِ بشریت سے الگ ہونا تھا۔ لیکن جس کام کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم آخری نبی کی حیثیت سے مبعوث ہوئے، وہ تو ابھی جاری تھا اور جاری رہے گا۔ یعنی لوگوں کی ہدایت، تزکیۂ نفس، تصفیۂ باطن، فیضانِ رسالت کے انوار۔ اور یہ سب کچھ اب مدینہ منورہ میں اپنی قیام گاہِ مبارکہ سے فرمائیں گے، فرمارہے ہیں۔ اور روضۂ مبارکہ پر حاضری گویا آپ کی دنیاوی حیات کی حاضری کے مماثل سمجھی جائے گی، جس کا اجر شفاعت ہوگا۔ؔ

یہ تو فصل نہیں وصل ہی ہے، موت نہیں حیات ہی ہے، وہ وصل جو ایک طرف رفیقِ اعلیٰ کے قرب کا موجب اور دوسری جانب امت کے ہر حال میں اس کا معاون۔ سبحان اللہ۔

ؔ حیاتِ نبویؐ کی دلیل خود مدینہ کی گلیاں ہیں۔ (محترم کشفی صاحب)

رسالتِ نبی کریمؐ

واضح رہے کہ حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کی حیاتِ مبارکہ اور رسالت لازم و ملزوم ہیں، نقطۂ آفرینش سے مقامِ محمود تک۔ جب تک ہم رسالت کو محدود نظروں سے دیکھتے رہیں گے ہماری نظریں حقائق سے قاصر رہیں گی کہ رسالت تو لامحدود (ذاتِ باری تعالیٰ) کو پانے کا ایک لامتناہی وسیلہ ہے۔ زمان و مکان کے حدود میں بھی اور اس سے ورئ الوریٰ۔ اس کی مختلف صورتیں ہیں۔ یہ نورِ رسالت کہیں محض نور بن کر، کہیں مثالی پیکر اور جسم و جسمانیت میں آشکارا ہوتا ہے۔ اس کو کلیّت میں پانا اور سمجھنا ہی معرفتِ الٰہی ہے۔ اور یہ رسالت ہی محمدؐ اور اللہ تعالیٰ کے درمیان کی ڈوری ہے، جس کا ایک سِرا، ایک کنارا ہم تک پہنچا ہے۔ ہمیں اس بے ہمتا احد و صمد کی صفات و ذات کی تجلّیات کو اسی آئینۂ رسالتِ محمدیؐ، اسی ذاتِ مبارکہ کے انوار میں دیکھنا اور سمجھنا ہوگا۔ اور پھر آپؐ کے انوار سے اس منزل کے سمجھنے کی سعی کرنا ہوگی جس کا تعلّق عالمِ برزخ سے ہے۔ پھر شاید اسی عالم میں یہ آنکھیں وہ دیکھ لیں جو اُخروی آنکھیں مقامِ محمود پر دیکھیں گی۔

ہم ذات کی یافت کا ذکر کر رہے ہیں۔ حضور سرورِ کائنات صلّی اللہ علیہ وسلّم کی ذاتِ مقدّسہ میں ایک وہ رُخ ہے جو ہر گھڑی اپنے رب کی طرف متوجّہ ہے جسے لِیْ مَعَ اللّٰہِ وَقْتٌ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اسے آپؐ کا باطن کہہ لیجئے۔ اس کو نبی کی ولایت کہہ لیجئے کہ اس جیسی کوئی ولایت نہیں۔ دوسرا حضورؐ کا ظاہر ہے جو مخلوق کی طرف بصورتِ بشریت مشغولِ عمل ہے۔ یہ سب وہ کام کرتا ہے جو تقاضائے بشریت ہیں، جاگتا ہے، چلتا پھرتا ہے، کھاتا پیتا ہے۔ اس کے اولاد ہوتی ہے، صحت و بیماری کی منزلوں سے گذرتا

ہے۔ لیکن اس کی اِن ظاہری زندگی کے اثرات سے اس کا باطن ہمہ وقت پاک رہتا ہے۔ اس کی آنکھیں سوتی ہیں۔ اس کا دل جاگتا رہتا ہے۔ وہ ظاہر میں "اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُکُمْ" ہوتا ہے۔ (یعنی میں تمہارا جیسا انسان ہوں) لیکن ہم ان جیسے انسان نہیں، کہ آپؐ نے فرمایا "لَسْتُ کَاَحَدٍ مِّنْکُمْ" (تم میں سے کوئی میرا جیسا نہیں) اس فرق کو سمجھنا ہے اور ہمیشہ پیشِ نظر رکھنا ہے۔ مراد یہ ہے کہ میرا باطن تمہارا جیسا نہیں ہے۔ میرا باطن سرّالاسرار ہے، اور میرا ظاہر بھی نورالانوار ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ظاہر خلق کی جانب مشغول ہے اور باطن مشاہدۂ حق میں کسی نے خوب کہا ہے۔ "مخلوق سے حجاب روا ہے، حق سے حجاب روا نہیں"۔ اس لئے جس طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ظاہر پر نیند روا ہے اسی طرح آپ کے ظاہر پہ موت روا ہے۔ اور چونکہ آپؐ کے باطن پر نیند روا نہ تھی اس لئے باطن پر موت بھی روا نہ تھی۔ اسی لئے مومن کا ایمان ہے کہ آپؐ کو قبرِ مبارک میں بھی اسی طرح کا علم ہے جس طرح زندگی میں تھا۔ آج بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم امتِ مسلمہ کی اصلاحِ حال کے لئے اسی طرح مصروفِ عمل ہیں جیسے حیاتِ مبارکہ میں تھے، صرف اس فرق کے ساتھ کہ دنیا میں یہ جسم و جسمانیت کے ساتھ رہی اور عالمِ برزخ میں یہ روح و روحانیت کے ساتھ ہے۔ اس میں امت کے لئے دعائے خیر، ان کے لئے استغفار، اطرافِ زمین میں برکت کے لئے تشریف لانا اور صالحین کی مجالس میں شرکت فرمانا، اپنے مخصوص محبت کرنے والے، جنہیں ولایت کے انوار سے سرفرازی بخشی ہے، ان کی راہبری فرمانا اور اس باطنی نظام پر پوری نظر رکھنا جو امت کی اصلاحِ حال کے لئے روح کی سطح سے اولیائے کرام کے ذریعہ جاری وساری ہے۔ اس سلسلہ میں موضوع کی وضاحت کے لئے دو اقتباسات کافی ہیں:۔

ایک حدیثِ مبارکہ اور اس کا ترجمہ حیاتِ جاوداں سے اور دوسرا لطیف نکتہ مدارجِ نبوّت سے۔ یہ حدیثِ مبارکہ حضورؐ کی اس عالمِ برزخ کی حیاتِ مبارکہ کے متعلق ہے:۔

"مَامِنْ اَحَدٍ یُسَلِّمُ عَلَیَّ اِلَّا رَدَّ اللّٰهُ اِلَیَّ رُوْحِیْ حَتّٰی اَرُدَّ عَلَیْهِ السَّلَامُ"
اس حدیث کے متعلق ڈاکٹر محمد حسن نے نہایت اعلیٰ بات کہی ہے۔ رَدَّ اللّٰهُ جملہ حالیہ ہے اور قانونِ (زبان) عربی کے مطابق جب جملہ حالیہ ہو اور فعل فعلِ ماضی ہو تو وہاں قَدْ کا لفظ مقدر ہوتا ہے، جس طرح آیت میں۔
" اَوْ جَآءُوْكُمْ حَصِرَتْ صُدُوْرُهُمْ " (النساء ــ ۹۰) اسی طرح یہاں جملہ حالیہ میں فعلِ ماضی واقع ہوا ہے اس لئے قَدْ کا لفظ مقدر مانا جا سکے گا۔ نیز یہ کہ حَتّٰی یہاں پر تعلیلیہ نہیں ہے بلکہ محض عطف کے لئے ہے اور یہاں "وَ" کے معنی دے رہا ہے۔ اب اس حدیثِ مبارکہ کا ترجمہ یوں ہوگا:۔

"جو شخص مجھ پر سلام بھیجتا ہے تو چونکہ اللہ تعالیٰ نے مجھ پر میری روح پہلے ہی لوٹا دی ہوتی ہے، اس لئے میں اس کے سلام کا جواب دیتا ہوں۔
یہ امر بھی دلچسپی سے خالی نہیں کہ بیہقی نے اپنی کتاب حیوٰۃ الانبیاء میں قَدْ کے ساتھ ہی اس حدیث کو نقل کیا ہے۔ یعنی قَدْ رَدَّ اللّٰهُ اِلَیَّ رُوْحِیْ گویا یہاں قَدْ کا ذکر ہے جو ڈاکٹر صاحب کی اس تحقیق پر مزید اثبات کی دلیل ہے۔

(حیاتِ جاوداں صفحات ۱۶۸۔ اور ۲۶۷)

اسی طرح لفظ قَدْ کے مقدر ہونے کی دوسری مثال الزمر میں آیت ۷۳ کا حصہ ہے۔ حَتّٰی اِذَا جَآءُوْهَا فُتِحَتْ اَبْوَابُهَا۔ یعنی (قَدْ فُتِحَتْ)

ایک لطیف نکتہ

حضرت مولانا عبدالحق محدث دہلویؒ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے

اثباتِ حیاتِ مبارکہ کے بارے میں قبرِ اطہر سے اس کے تعلق کو بھی واضح کیا ہے۔ چنانچہ آپ فرماتے ہیں:۔

مخفی نہ رہنا چاہیئے کہ بعد از اثباتِ حیاتِ حقیقی دنیاوی، اس کے بعد اگر کوئی کہے کہ حق تعالیٰ نے حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے جسدِ اقدس کو ایسی حالت اور ایسی قدرت بخشی ہے کہ جس جگہ چاہیں بذاتِ خود تشریف لے جائیں یا مثالی صورت میں آ سکتے ہیں .... خواہ آسمان پر یا زمین میں خواہ قبر شریف میں یا کسی اور جگہ، تو ایک صورت ہوتی مگر اس کے باوجود ہر حال میں قبرِ انور کے ساتھ نسبت مردی ہے۔ (یعنی حضورؐ کا قیام و تعلق قبرِ اطہر سے باقی ہے)

حضرت مولانا فرماتے ہیں، اس تعلق کے مختلف شواہد ہیں۔ اس کی مثال میں حضرت محدثؒ ۵۵۷ھ کا وہ واقعہ پیش فرماتے ہیں جب سلطان نورالدین شہید نے تین بار خواب میں دیکھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سلطان کو باخبر فرمایا کہ کس طرح دو نصرانی خبیث آپؐ کے جسمِ اطہر کو اس مقام سے نکالنے کی کوشش میں مصروف ہیں۔ چنانچہ سلطان ایک ہزار آدمیوں کے ساتھ مدینہ طیبہ پہنچا اور اُن دونوں ملعونوں کو پایا اور اُن کو آگ میں ڈال کر جلا دیا۔ اس کے بعد حجرۂ شریف کے چاروں طرف خندق کھدوا کر اسے سیسہ سے بھر دیا۔

یہ وہ واقعہ ہے کہ جسے مدینہ منورہ کے تمام مورخین نے تصریح سے بیان فرمایا ہے۔ یہ واقعہ جسم سے روح کے تعلق پر دلالت کرتا ہے۔

حضرت محدثؒ یہ بات واضح کرنا چاہتے ہیں کہ حضورؐ کے قیام قبر شریف اور جنت میں تضاد نہیں۔ اوّل تو "ہر مومن کی قبر جنت کے باغوں کا ایک باغ ہے اور حضورؐ کی قبر شریف تو افضلِ ریاضِ جنت ہے" اور یہ حقیقت عالمِ برزخ کی کیفیات میں سے ہے۔

"دوسرے ممکن ہے کہ حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کی اپنی قبرِ شریف میں سے ہی ایسے تصرّف و تفوّذ کی حالت ہوتی ہو کہ آسمان و زمین اور جنت ہر جگہ سے، حجاب مرتفع ہو گئے ہوں (اُٹھ گئے ہوں) اور بغیر تجاوز و انتقال کے تصرّف و تفوّذ فرماتے ہوں۔ اس لئے امورِ آخرت اور احوالِ برزخ کو دنیا کے احوال پر، جو کہ حدود و جہات سے مقید و تنگ ہے، قیاس نہیں کر سکتے۔"

(مدارج النبوت جلد دوم صفحہ ۶۷۱)

حضرت محدث رح کے ان الفاظ کی صداقت کو اگر ہم حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کی حیاتِ مبارکہ کی روشنی میں دیکھیں تو اس پر ہمارا ایمان قوی سے قوی تر ہو جائے گا۔

یہ وہ ذاتِ مقدسہ ہے جس کے جلوے ہم گذشتہ پانچ ابواب میں دیکھتے آ رہے ہیں اور اس جسم و جسمانیت اور پیکرِ بشریت میں آنے کے بعد بھی جس قدر معجزات حضور ؐ کے بچپن سے ہمارے سامنے آتے ہیں ان میں ہمیں یہی نظر آیا کہ یہ حجابات اور تعینّاتِ دنیاوی اُن ؐ کے لئے اُن ؐ کے رب نے یہاں بھی اُٹھا لئے تھے۔ بچپن میں چاند سے کھیلتے ہیں۔ جوانی میں اس کے دو ٹکڑے ایک انگشت سے فرماتے ہیں۔ شجر و حجر جن کو سلام کرتے ہیں۔ چوپائے جن کی نبوت پر گواہی دیتے ہیں، ستونِ حنانہ جن کی جُدائی پر روتا ہے۔ ہرن کے بچّے جن کے دامنِ رحمت میں پناہ لیتے ہیں۔ یہ تو وہ ہستی ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں دنیا ہی میں قدرتِ کاملہ سے نواز دیا تھا۔ اور اُن ؐ کی حیاتِ مبارکہ کا کوئی لمحہ، کوئی قول، کوئی فعل اپنے رب کے حکم کے بغیر تھا ہی نہیں، اور اپنے رب ہی کے لئے تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ حضور ؐ کی تمام زندگی ہی معجزہ ہے۔ بایں ہمہ وہ معجزات جو فہمِ انسانی سے ہر طرح بلند و بالا تھے انہیں معجزات ہی کہا گیا، اور سیر نگاروں نے اُنہیں معجزات

کے تحت جگہ دی۔ ان میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ تمام معجزات ہیں جنہیں شواہدِ نبوت کہنا چاہیئے۔ جامی رحمۃ اللہ علیہ نے اس نکتہ کو پا لیا اور اپنی کتاب شواہدِ نبوت میں ان کو یکجا کیا۔

یہ اس لئے بھی ضروری تھا کہ اس عبدہٗ و رسولہٗ کے نور و نورانیت، اُس کی رسالت اور اُس کی عبدیت کے انوار الگ الگ سمجھائے اور بتائے جا سکیں ورنہ یہ سب تو ایک ہی محمدؐ احمدؐ حامدؐ محمودؐ کی ذاتِ مقدسہ کے لباسِ حمد کے تانے بانے ہیں، جس نے اپنے کو اپنے رب سے کسی حال میں الگ کرنا پسند نہ فرمایا۔

پھر جب رسالت باقی ہے اور اب کسی نبی کو نہیں آنا ہے تو یہ کام حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی امت ہی کے سپرد ہونا ہے۔ اور امت کے اکابر کو ہدایت حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی فرماتے ہیں۔ اس کی چند مثالیں پیش کی جا چکی ہیں، لیکن تشنگی کا تقاضا ہے کہ اس معجزانہ اندازِ ہدایت کا ذکر کچھ زیادہ شرح و بسط سے ہو۔

و

بعد از وصال حضورؐ کا اندازِ رُشد و ہدایت

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا سلسلہ رُشد و ہدایت جو حیاتِ مُبارکہ میں جاری تھا، اب بھی جاری ہے۔ پہلے بھی مبلغین تیار کر کے بھیجے جاتے تھے جو لوگوں کو دین کی باتیں، اس کی حکمت سے آشنا کرتے تھے، اور یہ کام اب بھی جاری ہے۔ پہلے بھی صدیقِ اکبرؓ و علی مرتضےٰؓ کو اصلاحِ حال کے لئے مکہ سے مدینہ بھیجا گیا۔ اس لئے کہ صدیقِ اکبرؓ کارِ نبوت یعنی تبلیغِ دین کا فریضہ، آپؐ کے ایک نائب کی حیثیت سے ادا فرمائیں اور علی مرتضےٰؓ کو بھی اسی طرح حکم دے کر الگ روانہ کیا گیا کہ کافروں سے جملہ تعلق کے خاتمہ کا اعلان کر دیں۔ ایک کا کام فروغِ اسلام کے لئے مسلمانوں کی جماعت کو تیار کرنا تھا، دوسرے کا اسلام کی بنیادوں کو مستحکم کرنے کے لئے کفر کی بیخ کنی کرنا تھا۔ یہی دونوں ہستیاں حضورؐ کے بعد بھی خلافتِ راشدہ کی اوّل و آخر بنتی ہیں۔ ان کے بعد ایک جماعت پر رُشد و ہدایت کو بدرجۂ اتم اور امتِ محمدیہ کو مجموعی طور پر تبلیغ کی وراثت عطا کی گئی ہے۔ اس وراثت کی ادائیگی کے لئے قرآن و احادیث کے ساتھ ساتھ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بہر حال ایک شخصی اور قلبی تعلق لازم ہے۔ آج بھی یہ سلسلہ اسی کاشانۂ نبوی آرام گاہِ سرورِ کائناتؐ سے جاری و ساری ہے۔ جہاں سے علم و عرفان عطا ہوتا ہے۔

حال ہی میں زیارت نبی کریم بحالتِ بیداری و خواب پر دو نہایت مفید کتابیں محترم محمد عبد المجید صاحب صدیقی نے مرحبا پبلیکیشنز سے شائع کی ہیں جن میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ مبارکہ کے متعلق مایۂ ناز علمائے کرام کے گراں قدر خیالات اور اقتباسات بھی پیش کئے ہیں۔ چنانچہ علامہ جلال الدین سیوطی کا قول نقل فرماتے ہیں کہ:۔

"حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے جسمِ اطہر اور روحِ مقدس کے ساتھ زندہ ہیں۔ آپؐ تصرف فرماتے ہیں اور اقطارِ زمین وعالمِ ملکوت میں جہاں چاہیں تشریف لے جاتے ہیں۔ آپؐ تبدیلی کے بغیر، اسی ہیئت میں جس میں وصال سے پہلے تھے، آپؐ فرشتوں کی طرح لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہیں۔ جب اللہ تعالیٰ کسی پر مہربانی فرماتا ہے تو وہ پردہ اُٹھ جاتا ہے اور اُسے حقیقتہً زیارتِ بابرکت نصیب ہوتی ہے۔

(زیارت نبیؐ بحالت بیداری۔ از محمد عبدالمجید صدیقی صفحہ ۶)

اسی سلسلہ میں فاضل مؤلف نے حاجی امداد اللہ مکی، حضرت مولانا رشید گنگوہی، حضرت مولانا قاسم نانوتوی، حضرت عبدالحق محدث دہلوی اور دیگر اکابر، علماء کرام کے اقتباسات پیش کئے ہیں اور ۱۱۴ واقعات زیارت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم، بحالت بیداری ضبطِ تحریر میں لانے کی سعادت حاصل کی ہے، جو صوفیاء، علماء، فقہا اور اکابر بزرگانِ دین سے ماخوذ ہیں۔

اسی طرح فاضل مؤلف نے اپنی کتاب سیرت النبیؐ بعد از وصال میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھنے کے متعلق چند علماءِ کرام کے ارشادات کے ساتھ ۲۵۰ سے زیادہ واقعات درج فرمائے ہیں جن کے مستند ہونے میں کسی قسم کے شک وشبہ کی گنجائش نہیں۔

یہ دونوں کتابیں مرحبا پبلیکیشنز لاہور سے شائع ہوئی ہیں، جن کا مطالعہ ہر طرح نہایت پُرفیض ہے۔ ہم اس کتاب سے اقتباس پیش کرنے کے بجائے اُن چند واقعات پر اکتفا کریں گے جو دورِ قدیم وجدید دونوں ادوار کے بزرگوں سے متعلق ہیں۔ اور جن سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خصوصی انداز رُشد وہدایت کے ساتھ محبت وشفقت کے پہلو نمایاں ہوتے ہیں، عوام وخواص دونوں کے لئے۔

۱۔ اس سلسلہ میں ہم ایک عالم دین و فقیہہ اور استادِ جامعہ بہاول پور کا ذکر گذشتہ اوراق میں کر چکے ہیں جہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مثالی انداز سے اپنی حیاتِ مبارکہ کے انوار سے ان کی سماعت اور بصارت دونوں روشن فرمائے۔

۲۔ دوسری مثال امام ابوبکر بن ابو اسحٰق کی کتاب "تعرّف" سے پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہے ہیں۔ یہی وہ کتاب ہے جس کے متعلق شیخ شہید سہروردیؒ (م ۵۸۷ھ) نے فرمایا۔

"اگر یہ کتاب "تعرّف" نہ ہوتی تو کوئی تصوّف کو نہ جان سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کتاب نے تصوّف کے متعلق نہ صرف چند بنیادی غلط فہمیوں کا ازالہ کیا بلکہ تصوّف اور شریعت کے تعلق کو نمایاں کر دیا اور یہ واضح کیا کہ تصوّف، شریعت ہی کی وہ منزل ہے جہاں لطافتوں کا اظہار قلب و روح پر ہوتا ہے۔ اور اللہ کی حکمت کے ساتھ اُس کی قدرت کا عرفان میسّر آتا ہے۔"

ابوبکر محمد بن علی کتانیؒ فرماتے ہیں:۔

"میں نے اپنی عادت کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا اور ان کی یہ عادت تھی کہ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہر دوشنبہ اور جمعرات کی رات کو دیکھا کرتے تھے اور اُن سے مسائل پوچھا کرتے تھے اور آپؐ اُن کا جواب دیا کرتے تھے۔ کتانیؒ کہتے ہیں کہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ وہ میری طرف آ رہے ہیں اور اُنؐ کے ساتھ چار اشخاص ہیں۔ آپؐ نے مجھ سے پوچھا۔ اے ابوبکر (محمد بن علی کتانی) کیا تو اسے جانتا ہے۔ میں نے کہا ہاں یہ ابوبکرؓ ہیں۔ پھر فرمایا۔ کیا تو اسے پہچانتا ہے۔ میں نے کہا ہاں یہ عمرؓ ہیں۔ پھر فرمایا۔ کیا تو اسے پہچانتا ہے۔ میں نے کہا۔ ہاں یہ عثمانؓ ہیں۔ پھر فرمایا۔ کیا تو اس چوتھے کو پہچانتا ہے۔ میں رک گیا اور جواب نہ دیا۔ آپؐ نے

دوبارہ وہی سوال کیا اور میں پھر رک گیا۔ آپؐ نے تیسری بار وہی سوال دہرایا میں پھر رک گیا۔ میرے دل میں ان کے متعلق ایک رشک پایا جاتا تھا۔ ابوبکر (کتانیؒ) کہتے ہیں کہ اس پر (آپؐ نے) اپنے ہاتھ کا مکا بنایا اور اس سے میری طرف اشارہ کیا۔ پھر ہاتھ کھولا اور میرے سینہ پر مارا اور کہا۔ اے ابوبکر کہو۔ یہ علی بن ابی طالب ہیں۔ پھر میں نے کہا۔ یہ علیؓ بن ابی طالب ہیں۔ ابوبکر کتانیؒ کہتے ہیں۔ اس کے بعد آپؐ نے مجھے اور علیؓ کو بھائی بھائی بنا دیا۔ کتانیؒ کہتے ہیں کہ اس کے بعد علی رضی اللہ عنہ نے میرا ہاتھ پکڑا اور کہا۔ اے ابوبکر اٹھو ہم صفا کی طرف نکل چلیں۔ چنانچہ میں آپؓ (حضرت علیؓ) کے ساتھ صفا کو نکل گیا، اور میں اپنے حجرے میں سویا ہوا تھا۔ اٹھا تو دیکھتا ہوں کہ صفا پر ہوں۔"

(تعرف ترجمہ محمد حسن صفحہ ۲۴۸)

اس واقعہ سے بھی یہ بخوبی ظاہر ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کس طرح اولیاء کرام و علماء راسخین و صالحین کو علوم سے بہرہ مند کرتے ہیں اور "یُزَکِّیْہِمْ" یعنی قلب کو پاکی عطا فرماتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ شاید ہی کسی بزرگ کی کوئی کتاب ہو جس میں حضورؐ کی کرم نوازیوں کا کوئی نہ کوئی واقعہ آپ کو نہ مل جائے۔

ایک واقعہ اپنے استاد محترم حضرت احمد عبد الصمد فاروقی قادریؒ کا پیش خدمت کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں۔ جس کا ذکر استادِ محترم نے اس عاجز سے ایک خاص موقع پر فرمایا تھا۔ حضرت قبلہ سے مجھے شرفِ تلمذ ۱۹۵۵ء سے حاصل رہا ہے۔ میری خوش نصیبی تھی کہ پانچ سال تک درسِ قرآن کا سلسلہ جاری رہا۔ اور ان کی وفات کے بعد، اللہ ربّ العزت کے کرم سے "فیوض القرآن" کے نام سے قرآنِ حکیم کا ترجمہ و تشریح پیش کرنے کی نعمت سے سرفرازی ملی۔

حضرت استادِ محترم قبلہؒ نے اس عاجز سے بیان فرمایا، جس کو آج ان کی وفات کے ۲۷ سال بعد پہلی مرتبہ ضبطِ تحریر میں لا رہا ہوں اور یادداشت سے آپ کے بیان کی ترجمانی کر رہا ہوں۔ اس کا مقصد واقعہ کا بیان کرنا ہے۔ الفاظ بعینہٖ وہ نہیں ہیں جو قبلہ محترم نے فرمائے ہوں گے۔ استادِ محترم نے فرمایا:۔

"ایک رات میں نے خواب میں دیکھا کہ مسجدِ نبوی میں ہوں اور دیگر اکابر اصحاب جلوہ افروز ہیں۔ (آپ نے ان کی ترتیب بھی اس عاجز کو بتائی تھی لیکن اس خیال سے کہ کہیں غلطی نہ ہو جائے، تحریر میں نہیں لا رہا ہوں۔) ان عظیم ہستیوں کو دیکھ کر میں ایک ستون کی آڑ میں بیٹھ گیا۔ سامنے حاضر ہونے کی جسارت نہ کی۔ میں اس ستون کی آڑ میں بیٹھا تھا کہ ایک ہستی (جو غالباً حضرت بلالؓ تھے) تشریف لائی اور مجھے حکم دیا کہ تم کو بلایا گیا ہے۔ میں ان کے ساتھ ہو لیا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے دست بستہ کھڑا ہو گیا۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ منبر پر جا کر (غالباً خطاب کا لفظ فرمایا تھا، یا) حمد و ثنا کریں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں منبر پہ جانے کی میری ہمت نہیں ہو رہی تھی اور میں بڑے تذبذب میں پڑ گیا۔ اتنے میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اپنی شہادت کی انگلی میری جانب بڑھائی اور میں نے دیکھا کہ اس میں سے ایک نور نکلا جس سے معاً میں نے اپنے کو منبر پہ پایا۔"

استادِ محترم فرماتے تھے کہ میں عربی زبان میں تقریر کی صلاحیت نہ رکھتا تھا لیکن اس وقت اللہ تعالیٰ نے کچھ ایسی توفیق عطا فرمائی کہ بے تکلف اللہ کی حمد اور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی ثنا میں موزوں الفاظ زبان پر آنے لگے ...... اس کے بعد آنکھ کھل گئی اور دیر تک اس پُر نور پُر کیف ماحول کے تصور میں غرق رہا۔"

شاید اسی کا فیض تھا کہ مجھ جیسے عاجز کو اللہ رب العزت نے اپنے

کلام معجز بیان کی تشریح اور تفسیر کی سعادت بخشی جس کا تعلق ہرگز میری کسی صلاحیت سے نہیں بلکہ محض فضلِ الٰہی تھا کہ اس کو عوام و خواص میں مقبولیت حاصل ہوئی اور اس وقت جب یہ سطور تحریر کر رہا ہوں پانچواں ایڈیشن شائع ہو رہا ہے۔ الحمدللہ۔

ایک اور واقعہ

حیدر آباد کے دوران قیام میں مجھے ایک عالمِ دین اور بزرگ سے شرفِ نیاز کی سعادت حاصل ہوئی۔ ایک بار اپریل ۱۹۷۱ء میں آپ نے کرم فرمایا اور غریب خانہ پر تشریف لائے۔ اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ہم نے فیوض القرآن کی تینوں جلدیں ان کو پیش کیں۔ آپ نے تیسری جلد ہاتھ میں لی، چند صفحے الٹے اور سورہ روم کا پانچواں رکوع شروع فرمایا۔ پہلی ہی آیت "ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ........ آیت ۴۱" کے چند الفاظ پڑھ کر آبدیدہ ہو گئے۔ پھر خود ہی ترجمہ کرنا شروع کیا کہ "خشکی و تری میں فساد پھیل گیا مشرق و مغرب میں فساد پھیل گیا۔ اور یہ سب لوگوں کے اپنے کرتوت تھے۔ یہ فرماتے اور روتے جاتے، یہاں تک گریہ گلوگیر ہو گیا۔ ہم سب بھی رونے لگے۔ اس گریہ کی وجہ چند ماہ بعد سمجھ میں آئی جب مشرقی پاکستان کا المیہ ہوا اور دونوں خطے ایک دوسرے سے جدا ہو گئے۔ اس کو مومن کی فراست سے تعبیر کیجئے یا پاک قلب پر ہونے والے حالات کا انعکاس۔

ان بزرگ کا نام حضرت مولوی حافظ قبلہ حمایت علی شاہ قاسمیؒ تھا۔ اب وصال فرما چکے ہیں۔ ان کی کرم نوازیوں میں ان کی ایک دعا تو "فیوض القرآن" ہی میں شامل ہے۔ لیکن ان کی جس عنایت و محبت کا ذکر اس سیرتِ پاک کے سلسلہ میں کر رہے ہیں وہ ہمارے لئے حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی نظرِ التفات و نظرِ کرم کا وہ عظیم و گراں قدر عطیہ ہے جسے ہم اپنے لئے حضور

صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نصیب فرمائے۔
یہ واقعہ اُس خط سے متعلق ہے جو انہوں نے ازراہِ کرم مجھے میرے خط کے جواب میں لکھا۔ ان بزرگوں کی محبت کا کون اندازہ کرے۔ اس زمانہ میں میں حیدر آباد میں مقیم تھا اور میری بی بی سخت علیل تھیں۔ ایک دن نمازِ ظہر کے بعد گھر آیا تو خلافِ معمول بیمار بی بی کو بہت مسرور و خوش پایا۔ اور انہوں نے فرمایا کہ آج ایسا خط آیا ہے کہ جسے پڑھ کر آپ بہت خوش ہوں گے۔ اور اس کے بعد حضرت محترم شاہ صاحب کا خط دیا۔ بحمد اللہ یہ میرے پاس تبرک کی طرح محفوظ ہے۔ اور آج اسے صرف اس لئے نقل کرنے کی جرأت کر رہا ہوں کہ ہمارے نوجوان یہ جان لیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک ادنیٰ، عاجز، گنہگار امتی پر بھی کیسا کرم فرماتے ہیں، بلا واسطہ نہ سہی بالواسطہ۔

نقلِ گرامی نامۂ حضرت شاہ صاحب

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْم

مُحِبّیِ الکَرِیم ۔ ذُو الکَرَمِ العَمِیمِ بِغَایَتِ التکریم علیہ التسلیم
ھٰذا ھُوَ دُعَائِی زَمَلُکَ مُتَوَسِّلِی بِالقُدرَتِی الخَفِی واَدْرَکَکَ
فِی قَضَاءِ حَاجَتِکَ اَحْمَدِیْ عَلَیْہِ صَلّٰی وَسَلَّمَ وَاحِدِیْ وَاَحَدِیْ
پُرخلوص خط پڑھا تو دل میں یوں القا ہوا جسے کاغذ کے صفحہ پر منقش کر کے ہدیہ نذر کر دیا۔ خدا کو اپنے مطلوب کی بارگاہ میں ہماری یہ التجا مرغوب ہو۔ آمین
اَلسَّلَامُ عَلَیْکُم ۔ وعلیٰ مَنْ لَدَیْکُم

طالبِ نظر
حمایت قاسمی

ے اور یہاں آپؐ کی مبارک انگشت تھی۔

"الے لیجئے! یہ نوشتہ، شب کو لکھ کر سرہانے رکھ دیا تھا۔ دیکھا دستِ قدرتِ خفیؐ میں یہ نوشتہ ہے اور باندازِ متبسّمانہ اس پر نظر۔ اور فرماتے ہیں۔

"مَن کَتَبَ، ھٰذَا" میں نے جواباً عرض کیا، مِمَّنْ ھٰذَا سِوَائِیْ آقَائِیْ وَ مَوْلَائِیْ اور یہاں[1] آپ کی مبارک انگشت تھی۔ ہونا یوں چاہیئے تھا بِالْقُدْرَۃِ الْخَفِی۔

ابوبکرؓ و عمرؓ۔ عثمانؓ و حیدرؓ وہاں موجود تھے۔ اللہ اکبر۔ الحمدللہ۔

آپ کے حق ہمارا طریقۂ دعا سرورِ عالم نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کو پسند آیا۔ ....

.... بہن کو سلام پہنچاؤ۔

والسلام

حمایت قاسمی

پھر سنیئے۔ جی میں آیا کہ اس کی نقل ارسال کر دی جائے لیکن خیال آیا کہ اسی بہانے تو سعادتِ دیدار میسّر آیا۔ (نوٹ) مقام انگشت کو بار بار آنکھوں سے لگایا اور اسی پر اکتفا کیا اور خود پر آپ کو ترجیح دی کہ ترجیح کے ہو بھی مستحق۔ ملنے ملانے سے سوا لطف۔ فَاذْکُرُوْنِیْ اَذْکُرْکُمْ۔ میں ہے جسے خوب جانتے ہو، پھر ملے کون اور کس سے۔ یہی نا! کہ منجانب حجاب منظورِ احتساب ہے۔ اچھا پھر سلام۔ عجب تماشہ ہے! غلطی اور التفات کا موجب!!

حضرت شاہ صاحب نے

اس گرامی نامہ میں جو اس عاجز، عاصی، بے مایہ، کے متعلق لکھا وہ ان کی کرم نوازی

---

[1] "بالقُدرتی" پر۔ ہونا یوں چاہیئے تھا بِالْقُدْرَۃِ الْخَفِی۔

بزرگانہ شفقت ہے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ اس نادان بے مایہ کے لئے ان کا یہ گرامی نامہ، جس کو حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دستِ مبارک میں لیا اور جس میں اس عاجز کے لئے ایک بزرگ کی دعا ہے، بڑی خوش بختی و کرم نوازی کا موجب ہے۔

اور

یہ حقیقت بھی واضح ہو جاتی ہے کہ نبیؐ الامیؐ کس طرح ایک غلطی سے متنبہ بھی فرما دیتے ہیں۔ اور آپؐ کی شانِ رحمت کس قدر وسیع ہے کہ ایک ادنیٰ امتی کو بھی اگر دعائے خیر سے کوئی ان کا محب یاد کرے تو وہ بھی رحمت سے محروم نہیں رکھا جاتا۔

اب آخر میں

اپنے ایک اور بزرگ، کرم فرما، محسن کے ذکر پر اس فصل کو ختم کرتا ہوں۔ وہ اللہ کے فضل سے حیات ہیں لیکن نام بتانا پسند نہیں فرماتے۔ نہایت مخلص، معصوم، کم سخن، دُبلے پتلے انسان ہیں۔ صبر و شکر کا مجسمہ۔ کم لوگ ہوں گے جو ان کے ان کی اِن واردات اور کوائف سے آگاہ ہوں گے۔ ان کا کرم تھا کسی جذبۂ محبت سے بے قابو ہو کر اس عاجز کو اس حقیقت سے سرفرازی بخشی اللہ اپنے بچپن کا خواب سُنایا جب ان کی عمر سات سال ہی کی تھی فرمایا:۔

"ایک بار خواب میں دیکھا کہ تہجد کی نماز حضور صلی اللہ علیہ وسلم باجماعت فرما رہے ہیں، صحابہ کرامؓ مقتدی ہیں۔ میں بھی نماز میں شریک ہو گیا۔ نماز ختم ہونے پر سب چلے گئے بس میں رُکا رہا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ازراہِ کرم میری جانب توجہ فرمائی اور فرمایا کہ چار کتابیں پڑھا کرو۔ ضبط، تحمل۔ صبر۔ استقلال۔ آنکھ کھل گئی۔ چھ سات ماہ بعد ایک بزرگ ہستی کی زیارت ہوئی اور یوں محسوس کیا کہ وہ حضورؐ کے فرستادہ ہیں اور انہوں نے یوں کرم فرمایا کہ پہلے میرے سامنے ......

ایک مجذوب لایا گیا اور مجھ سے پوچھا کہ تم یہ ہونا چاہتے ہو۔ میں نے سر ہلایا۔ نہیں۔ پھر ایک انسان جُبّہ قبا میں جیسے پیر بزرگ ہوتے ہیں، لائے گئے۔ پھر یہ سوال کیا گیا۔ تم یہ ہونا چاہتے ہو؟ پھر میں نے کہا۔ نہیں۔ پھر ایک آدمی عام لباس میں، سادہ کپڑے لیکن جاذب نظر سامنے آیا۔ آپؐ نے فرمایا۔ یہ ہونا چاہتے ہو۔ میں نے کہا۔ ہاں۔ پھر آنکھ کھل گئی" اور بحمد اللہ استعداد اور گوناگوں مشکلوں اور تکلیفات کے باوجود ان کے قلب پر کوئی گرانی نہیں آتی۔ اکثر محفلوں میں، جہاں ذکرِ انوارِ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم ہوتا ہے، شرکت فرماتے ہیں تو بعض میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی کا احساس، بلکہ آپؐ کے دیدار سے شرف یاب ہوتے ہیں۔ اور یہ سلسلہ دید و حضوری جاری ہے۔

اس عاجز کے نزدیک

شاید ہی مسلمانوں کا کوئی گھر ہو جس میں کسی نہ کسی بزرگ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی سعادت خواب یا بیداری میں نصیب نہ ہوئی ہو۔ البتہ ہر شخص آپؐ کو اپنے ظرف اور استطاعت کے مطابق ہی دیکھ سکتا ہے۔

○

میرے استاد محترم حضرت احمد عبد الصمدؒ فرماتے تھے کہ

"تمہارے ضمیر کی آواز حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز ہے۔ اس پر نظر رکھا کرو تاکہ ہدایت یافتہ رہو، گمراہی سے بچو"

"سمندر خشک ہو جائیں۔ درخت قلم بنا دیئے جائیں تو ختم ہو جائیں لیکن اللہ کی حمد ختم نہ ہو" ختم المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم جو سراپا حمد ہیں، پھر ان کی حمد و ثنا کون کرے جنؐ پر ان کا رب خود درود بھیجے، جنؐ کے لئے اپنی کائنات کی تخلیق فرمائے اور ان کی نسبت اور تعلق سے ہر ذرہ کو فیض یاب کرے۔

یہ سلسلہ تو ازل سے ہے اور ابد تک جاری ہے۔ جب تک زمان ہے، مکان ہے، اشیاء ہیں، انہیں رحمت کی ضرورت ہے، اس وقت تک رحمت للعالمینؐ کا پرتوِ فیض عام ہے۔

یہاں تو صرف اندازِ رحمت، انداز رشد و ہدایت کے چند نمونے پیش کئے گئے کہ ان پر قیاس کر کے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وسعتِ رسالت، فہمِ رسالت، انوارِ رسالت کو جو جس قدر چاہے سمجھ لے، پھر بھی اس کی فہم، اس لامحدود رحمت کے احاطہ سے قاصر رہے گی۔ یہ کیا کم خوش نصیبی ہو گی کہ دامنِ رحمت سے وابستگی مل جائے گی۔

○

اب آیئے
حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اندازِ رشد و ہدایت، صدیقین، شہداء وصالحین کے واسطہ سے سمجھنے اور پانے کی سعادت حاصل کریں۔

خلافتِ راشدہ

اب حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے رفیقِ اعلیٰ کے پاس ہیں اور رفیقِ غارؓ کو دین (کارِ رسالت وکارِ نبوت) کی ذمہ داریاں سونپی جا رہی ہیں۔ وقتِ رخصت امامت کی ذمہ داریاں تو سونپی ہی جا چکی تھیں، اور حضرت صدیق اکبرؓ کی فضیلت ذہن نشین کی جا چکی تھی تاکہ امت کسی تفرقہ میں نہ پڑے۔ البتہ غلط فہمیاں ہوئیں لیکن بالآخر وہی ہوا جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرما گئے تھے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ میں نے پہلے پہل جس شخص کو بھی دعوتِ اسلام دی، اس نے تھوڑا بہت تامل و توقف ضرور کیا لیکن ابوبکرؓ

ہیں کہ دعوتِ اسلام کے بعد بغیر کسی دلیل و برہان کے مجھ پر ایمان لائے اور میرے مصدّق بنے۔ رضی اللہ عنہ، (شواھد نبوت صفحہ ۲۵۸)

جنگ حنین میں گھمسان کا رن پڑا تو حضرت جُندب (یہ حضرت سیّدنا ابوذر غفّاری کا اسمِ گرامی ہے) حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کی خدمت میں حاضر ہو کر کہنے لگے "حضورؐ ہمیں بتایئے کہ آپؐ کے اصحابؓ میں سے گراں ترین شخص کون ہے جسے ہم کسی امر واقعہ کے بعد آپؐ کا خلیفہ منتخب کرلیں"۔ حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا "یہ ہیں میرے وزیر، ابوبکر صدیقؓ جو میرے بعد قائم مقام ہوں گے۔ ان کے بعد میرے دوست عمرؓ کی باری ہے جو نہایت صائب باتیں کرتے ہیں۔ اور اس کے بعد عثمانؓ بن عفّان ہیں جو مجھ سے ہیں اور میں اُن سے ہوں۔ اور پھر علیؓ میرے بھائی ہیں جو محشر میں میرے مصاحب ہوں گے"۔ رضی اللہ عنہم (شواھد نبوّت صفحہ ۲۴۵)

حضرت سفینہ رضی اللہ عنہ، سے روایت ہے کہ میں نے رسالت مآب صلّی اللہ علیہ وسلّم سے سُنا کہ میرے بعد مدّتِ خلافت تیس سال رہے گی۔ اس کے بعد ملوکیت اور سلطانیت کا تسلّط ہو جائے گا۔ پھر حضرت سفینہؓ نے کہا کہ سوا دو سال سے کچھ زیادہ مدّتِ خلافت ابوبکرؓ۔ دس سال چھ مہینے آٹھ دن مدّت خلافت سیدنا فاروقِ اعظمؓ۔ بارہ سال سے زائد حضرت عثمان غنیؓ کی مدّت خلافت اور چھ سال سیدنا علی مرتضیٰؓ کی مدّت خلافت۔
(شواھد نبوّت صفحہ ۳۴۵)

؎ اس حساب سے ساڑھے انتیس سال ہوتے ہیں۔ بہت سے اہلِ نظر و صاحبانِ نظر و صاحبانِ قلب سیدنا حسن بن علی رضی اللہ عنہ، کی مدّتِ خلافت کو بھی شامل کرتے ہیں، اور یہ دُرست ہے کیونکہ ان چھ مہینوں کو شامل کرکے خلافتِ راشدہ کی مدّت تیس سال ہو جاتی ہے۔ (محترم کشفی صاحب)

باب ششم　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　فصل دوم

خلافتِ راشدہ

حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کے حجاب فرما جانے کے بعد کے قرون کو دو حصّوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ۱۔ دورِ خلافت راشدہ اور اصحابؓ رسول اللہ کا دور۔ ۲۔ اصحابؓ کے بعد تابعین اور اولیاءِ کرام کا دَور۔

یہ بات مخفی نہیں کہ ولایت و نبوّت کا چولی دامن کا ساتھ ہے، اس فرق کے ساتھ کہ ہر نبی ولی ہوتا ہے لیکن ہر ولی نبی نہیں ہوتا ہے۔ انبیاء وہ ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے نبوّت کے لئے برگزیدہ فرمایا اور اولیاء وہ ہیں جو نبی کے متبع ہو کر، انہیںؑ کی تعلیمات و تربیت کے فروغ کے لئے مختص کئے جاتے ہیں۔ اور صالحین میں تو سب صاحبِ ایمان شامل ہیں جو دوسروں کے لئے شمعِ ہدایت بنتے ہیں۔ رسالت کی اصلی غرض توحیدِ باری تعالیٰ سے قلوب کو مزیّن کرنا ہے اور اللہ تعالیٰ کی بنیادی صفات سے ذہنوں کو منوّر کرنا ہے۔ انہیں امّ الصفات کہتے ہیں جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ یہ صفات چار ہیں۔

۱۔ حیات۔ ۲۔ علم۔ ۳۔ ارادہ۔ ۴۔ قدرت۔ اور انہیں کے امتزاج سے تین اہم صفات کا ظہور ہوتا ہے جنہیں سمع، بصر، و کلام کہا جاتا ہے۔ اس طرح اللہ ربّ العزت کی یہ سات صفات اُمّ الصّفات کہلائیں یعنی (۱) حیات۔ ۲۔ علم۔ ۳۔ ارادہ۔ ۴۔ قدرت۔ ۵۔ سمع۔ ۶۔ بصر اور ۷۔ کلام۔

یہی صفات حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کے لئے اللہ کا عطیہ ہیں اور ہر صحابیؓ نے اسی سے اپنی اپنی تشنگی کے مطابق سیرابی پائی ہے۔ ان میں سے چار ذی مرتبت اصحابؓ کا ذکر حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم نے خلافت کے سلسلہ

ہیں فرمایا۔ گویا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب ظاہر ہیں اور آپ ہی کی حیاتِ[1] مبارکہ، آپؐ ہی کے علم[2] آپؐ ہی کے ارادہ[3] اور آپؐ ہی کی قدرت[4] سے فیض یاب ہیں۔ یہ چار صفات کلمہ کے چار الفاظ لا الٰہ الا اللہ سے ہم عدد ہیں۔ یعنی ان کی زندگی کا مقصد صرف اللہ رب العزت کی توحیدِ مطلقہ کے تصور سے زندگی کے ہر شعبہ کو معمور کرنا ہے اور کچھ نہیں۔ اور اسی لئے اپنے اپنے مقام پر اپنا ثانی نہیں رکھتے۔

واضح رہے کہ یہ اصحابِؓ رسول ہیں اور آنے والی اُمّت کے لئے آسمانِ ہدایت کے روشن ستارے ہیں۔ انہیں کی زندگی سے حیات، علم، ارادہ و قدرت کے مفہوم کو ذہن نشین کرنا ہوگا۔ حیات جاوداں کیسے حاصل کی جاتی ہے۔ خلوص کسے کہتے ہیں۔ اسلام کی بنیادوں کو مستحکم کیسے کیا جا سکتا ہے۔ اس کے لئے ہمیں حضرت صدیقِ اکبرؓ کے مختصر دورِ خلافت کا مطالعہ کرنا ہوگا۔ عدل گستری اور علم تفصیلی کے ساتھ اسلام کی وسعتوں کو سمجھنے کے لئے دورِ فاروقؓ کو اپنانا ہوگا۔ ارادہ کی نزاکتوں کے ساتھ حلم۔ محبت۔ نور و عرفان کا سبق ہمیں سیدنا عثمان غنیؓ کے دورِ خلافت سے لینا ہوگا۔ حضرت علیؓ سے قدرت و شجاعت کا اور پھر فروغِ اسلام کے لئے قربانیوں کا درس ہمیں انہیں سِيمَاهُمْ فِي وُجُوهِهِم مِّنْ أَثَرِ السُّجُودِ سے لینا ہوگا۔ ہو سکتا ہے کہ کسی دورِ خلافت میں ہمیں تاریخ کی روشنی میں کچھ لغزشیں نظر آئیں لیکن ہم یہ نہ بھولیں کہ ہمیں ان معزز ہستیوں کو تاریخ کی روشنی میں نہیں بلکہ رسالت کی روشنی میں دیکھنا ہوگا اور اس بات پر یقینِ کامل رکھنا ہوگا کہ ان کے ارادے خالصتہً للّٰہیت پر مبنی تھے۔ نتائج کے موافق یا ناموافق ہونے سے ان کی عظمت و پاکیزگیٔ قلب میں فرق نہیں آتا۔ یہ لغزشیں بھی انہیں سے ہونا تھیں تاکہ اُمت ان سے ہوشیار رہے اور اس حقیقت کو خوب

ذہن نشین کرلے کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں مواخذہ ہر اس عمل پر ہے جو نفس کے لئے کیا گیا ہو۔ اور جو عمل خالصتہً اللہ کے لئے ہو اور اس میں غلطی ہو جائے، اس کے لئے اللہ رب العزت کے یہاں درگذر ہی نہیں بلکہ کرم اور نوازشیں ہیں۔ اصحابِ کرامؓ سے بعض لغزشیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ مبارکہ میں ہوئیں جنہیں منافقین نے محض اپنی اسلام دشمنی کے لئے ایک بہانہ بنایا اور آپؐ کے بعد بھی ایسے لوگوں کی کمی نہ رہی جنہوں نے نفس کی خاطر حق کا خون کیا۔ دونوں میں بڑا فرق ہے۔ ان چند معروضات کے بعد آیئے دورِ صحابہؓ میں نورِ مبین صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات رشد و ہدایت و انوار کا مطالعہ کریں۔

○

خلیفۂ رسولؐ اللہ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ،

نورِ مبین صلی اللہ علیہ وسلم کی تنویرِ صدق و خلوص۔

(۱۱ھ تا ۲۲ جمادی الآخر ۱۳ھ۔ دو سال تین ماہ دس دن۔ عمر ۶۳ سال)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پردہ فرمایا

اور منافقین کو موقع ملا کہ اپنی سازشوں اور فتنوں سے اسلام کا شیرازہ بکھیر دیں۔ سب سے پہلے مسئلہ خلافت ہی کو ہوا دی گئی تاکہ مہاجرین و انصار کا اتفاق جو خار کی طرح منافقین کی آنکھوں میں کھٹکتا تھا ختم ہو۔ لیکن اسی مملکت اسلام میں ابھی ایسے مہر و ماہ موجود تھے جنہوں نے اپنی فراست و دُور اندیشی، سمجھ اور عاقبت بینی سے اس کو ہر ظلمت سے بچا لیا۔ اور وہی صدیقِ اکبرؓ جن کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا وزیر قرار دیا تھا، منصب خلافت کے لئے منتخب ہوئے کہ آپ ہی سب سے بزرگ، معمرؓ اور بااثر تھے۔

صدیقِ اکبرؓ کا پہلا خطبہ ہی

آپ کی عملی پالیسی کا آئینہ دار ہے۔ اور نہایت واضح انداز میں جس بات کی طرف توجہ مبذول فرماتے ہیں وہ یہ کہ خلافت بادشاہی نہیں بلکہ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی غلامی کا طوق پہن کر آپؐ کی نبوّت کے ہر عمل کو روشن کرنا ہے اور دین کے ہر رکن کی حفاظت ہے۔ صدیقِ اکبرؓ فرماتے ہیں۔

"صاحبو! میں تم پر حاکم مقرّر کیا گیا ہوں حالانکہ میں تم لوگوں میں سے بہتر نہیں ہوں۔ اگر میں اچھا کام کروں تو میری اعانت کرو اور بُرائی کی طرف جاؤں تو مجھے سیدھا کرو۔ صدق امانت ہے اور کذب خیانت ہے۔ انشاء اللہ تم میں سے کمزور ترین فرد ہی میرے نزدیک سب سے قوی ہے یہاں تک کہ میں اس کا حق اسے واپس دلا دوں۔ اور انشاء اللہ تمہارا قوی ترین فرد ہی میرے نزدیک ضعیف ترین ہے یہاں تک کہ اس سے دوسرں کا حق دلا دوں۔ جو قوم جہاد فی سبیل اللہ چھوڑ دیتی ہے اس کو اللہ ذلیل وخوار کرتا ہے اور جس قوم میں مکّاری عام ہو جاتی ہے اللہ اس کی مصیبت کو بھی عام کر دیتا ہے۔ میں اللہ اور رسولؐ کی اطاعت کروں تو میری اطاعت کرو۔ لیکن جب اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کروں تو تم پر اطاعت نہیں۔ نماز کے لئے کھڑے ہو جاؤ۔ خدا تم پر رحم کرے۔"

(از خلفائے راشدین۔ دار المصنفین صفحہ ۲۵)۔

صدیقِ اکبرؓ کا منشا یہ تھا کہ مَیں، خود کچھ نہیں، خود خلیفۃ اللہ نہیں بلکہ اللہ کے رسولؐ کا خلیفہ ہوں۔ اُنؐ کے مقام، انؐ کے مشن کی سربلندی میرا فرض ہے۔ چنانچہ صدیقِ اکبرؓ کا مختصر دَور دراصل اسلام اور تعلیماتِ اسلامی کے بنیادی اصولوں کو محکم سے محکم تر کرنے کا دَور ہے۔ نبوّت وخلافت کے حدود کو قائم کرنے اور ان کی طرف واضح طور سے راہنمائی کا دَور ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ

نورِ محمدیؐ جانشین صدیقِ اکبرؓ میں رہنمائے امت ہے۔ اور حضرت صدیق اکبرؓ انتہائی عزم سے ان فتنوں اور سازشوں کے سدِ باب میں مشغول ہیں جو اسلام کو درپیش ہیں۔ ان میں پہلا فتنہ مدعیانِ نبوت کا قلع قمع تھا۔ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں بعض مدعیانِ نبوت پیدا ہو چکے تھے، جن میں مسیلمہ کذاب کا نام سرِ فہرست ہے۔ لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ان کی تعداد میں خاصا اضافہ ہو گیا اور یہ مرض عرب میں وبا کی طرح پھیل گیا۔ حضرت صدیقِ اکبرؓ نے صحابہؓ سے مشورہ کیا اور مہاجرین اور انصار کی ایک جمعیت کو خالدؓ بن ولید کی سربراہی میں فتنہ کے انسداد کے لئے روانہ کیا۔ شدید مقابلہ اور جنگ کے بعد مسلمانوں کو کامیابی ہوئی۔ لیکن اس میں حفاظ ایک کثیر تعداد میں اللہ کو پیارے ہو گئے۔

دوسرا فتنہ مرتدین کا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بہت سے عرب سردار مرتد ہو گئے اور اپنے اپنے حلقۂ اثر میں بادشاہ بن کر بیٹھ گئے۔ صدیقِ اکبرؓ نے اس طوائف الملوکی کا خاتمہ بھی اسی عزم سے کیا جس سے مدعیانِ نبوت کا کیا تھا۔

ایک جماعت خود مسلمانوں میں وہ کھڑی ہوئی جس نے زکوٰۃ سے انکار کیا۔ صدیقِ اکبرؓ اس کی سرکوبی کے لئے مستعد ہو گئے۔ یہاں تک کہ بعض صحابہؓ نے بھی یہ خیال ظاہر کیا کہ جو قوم توحید و رسالت کا اقرار کرتی ہے اس سے جنگ کیسے کی جا سکتی ہے۔ لیکن صدیقِ اکبرؓ نے نہایت عزم اور غیر متزلزل ارادہ سے کام لیتے ہوئے فرمایا۔

"خدا کی قسم اگر ایک بکری کا بچہ بھی، جو رسول اللہؐ کو دیا جاتا تھا، کوئی دینے سے انکار کرے گا تو میں ان کے خلاف جہاد کروں گا۔" یہ تھا سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر فعل اور ہر رکن اسلام کو زندہ رکھنے کا جذبہ،

جس نے اسلام کی بنیادوں کو سوا دو سال کے مختصر دورِ خلافت میں لا متزلزل اور مستحکم تر بنا دیا۔ صدیقِ اکبرؓ کو نہ صرف حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات میں بلکہ ان کے حجاب کے بعد بھی گویا حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے وہ حضوری حاصل تھی کہ کسی اہم سے اہم مصلحت کے تحت بھی کسی بڑے سے بڑے یا چھوٹے سے چھوٹے مسئلہ میں تبدیلی کا تصور بھی نہ کرتے تھے۔

چنانچہ اُسامہ بن زیدؓ والی مہم کا مشہور واقعہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی حیاتِ مبارکہ میں شام پر حملہ آور ہونے کا حکم دیا تھا صحابہ کرامؓ کی رائے ہوئی کہ اس مہم کو ملتوی کر دیا جائے۔ لیکن حضرت صدیقِ اکبرؓ نے فرمایا کہ "ابو قحافہ کے بیٹے ابو بکر کی کیا مجال کہ جو عَلم رسول اللہؐ کے ایماء سے رُوم کے مقابلہ کے لئے بلند کیا گیا تھا اس کو کسی دوسری جانب حرکت دی جائے۔" اور آپؓ نے برہم ہو کر فرمایا "خدا کی قسم اگر مدینہ اس طرح آدمیوں سے خالی ہو جائے کہ درندے آکر میری ٹانگ کھینچنے لگیں، جب بھی میں اس مہم کو نہیں روک سکتا۔"

یہی وہ یقینِ کامل تھا کہ تمام مشکلات کے باوجود صدیقِ اکبرؓ نے اُسامہؓ کو اس طرح رخصت کیا کہ اُسامہؓ گھوڑے پر سوار اور جانشینِ رسولؐ پیادہ پا گھوڑے کے ساتھ دوڑ رہے تھے۔ اور جب انؓ سے حضرت اُسامہؓ فرماتے کہ آپ گھوڑے پر سوار ہو لیں، تو صدیقِ اکبرؓ جواب دیتے "اس میں کیا مضائقہ ہے اگر میں تھوڑی دیر تک راہِ خدا میں پاؤں غبار آلود کر دوں۔ غازی کے ہر قدم پر سات سو نیکیاں لکھی جاتی ہیں۔"

(خلفائے راشدین۔ صفحہ ۲۸)

پھر چالیس دن بعد جب اُسامہؓ اپنے مقصد میں کامیاب ہو کر واپس آئے تو صدیقِ اکبرؓ نے ان کا استقبال فرمایا۔ اس مہم کی کامیابی کا نفسیاتی طور پر اثر دشمنانِ اسلام پر پڑا، اور اِس درجہ کہ اُن پر خوف اور رعب طاری ہو گیا۔

صدیقِ اکبرؓ وہ جانشینِ رسولؐ تھے جن کی زندگی کا ہر لمحہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت میں گذرا تھا۔ اور آپ کا قلب اس قدر مصفّا اور منزّہ اور ہم آہنگِ مزاجِ رسولؐ ہو گیا تھا کہ صدیقِ اکبرؓ کا ہر ارادہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارادہ تھا۔ جس طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر ارادہ اللہ کا ارادہ تھا۔ کون سمجھ سکتا ہے کہ وہ قلب جو اپنے رسولؐ کی محبّت میں اس درجہ سرشار ہو، اس کی معیت رسولؐ کا کیا مقام ہو گا۔ وہ معیت جس پر قرآن شاھد ہے اور وہ معیت جو وفات کے بعد آج بھی روضۂ مبارکِ رسولؐ میں مشہودِ خاص وعام ہے

باوجود اس محبّت، معیت و قرب کے صدیقِ اکبرؓ کی احتیاط کا یہ عالم تھا کہ چند احادیث جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی آپ نے جمع فرمالی تھیں، تلف کردیں کہ کہیں ان میں کوئی لفظ ایسا نہ آگیا ہو کہ جو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے زبانِ مبارک سے نہ نکلا ہو، بلکہ اسی کا ہم معنی لفظ آپؓ نے ادا فرمایا ہو۔

البتہ

قرآنِ حکیم کی جمع و ترتیب میں پورے انہماک سے حصّہ لیا۔ حضرت عمرؓ کو اندیشہ ہوا کہ اگر صحابہؓ کی شہادت کا یہی سلسلہ رہا تو کہیں قرآنِ حکیم ہی ضائع نہ ہو جائے۔ چنانچہ جانشینِ رسولؐ نے اس کام کو اوّلیت دی اور جمع و ترتیب کا کام شروع کیا۔ زیدؓ بن ثابت جو کاتبِ وحی تھے، انہیں قرآن شریف کے جمع کرنے کا حکم دیا اور انہوں نے نہایت کوشش و احتیاط سے یہ کام انجام دیا۔

صدیقِ اکبرؓ کا دور

گویا سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوّت کے انوار کو عام کرنے، ایمان کی بنیادوں کو مستحکم بنانے، بلکہ اسلام کی عمارت کے ایک ایک کنگورے کی حفاظت کا دور تھا۔ بہت کم مواقع ایسے آئے جہاں حضرت صدیقِ اکبرؓ کو اجتہاد سے کام لینا پڑا۔ لیکن ان میں بھی اکابر صحابہ کرامؓ کی آراء اور قرآنِ حکیم

اور سنتِ رسولؐ کو ہمیشہ پیشِ نظر رکھا گیا، اور تدبر سے کام لیا گیا۔ مثلاً فدک کا تنازعہ یا جھگڑا، یا حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا چھ ماہ بعد بیعت فرمانا جس سے بعض لوگوں کو کچھ غلط فہمی پیدا ہوئی، لیکن در اصل یہ تاخیر بڑی اہمیت کی حامل تھی۔ بات یہ ہوئی کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے صدیقِ اکبرؓ کی بیعت چھ ماہ بعد پوری یک سوئی کے ساتھ کی اور یہ وقت حضرت فاطمۃ الزہراؓ کی دلجوئی میں صرف کیا۔ خود جنابِ علی مرتضےٰؓ فرماتے ہیں۔

محمد بن سیرین سے روایت ہے کہ جب ابوبکرؓ کی بیعت لی گئی تو حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے بیعت میں دیر کی اور خانہ نشین رہے۔ ابوبکرؓ نے کہلا بھیجا کہ کس چیز نے آپ کو میری بیعت سے باز رکھا، کیا آپ میری امامت کو ناپسند کرتے ہیں۔ علیؓ نے کہا کہ آپ کی امامت کو میں ناپسند نہیں کرتا لیکن میں نے قسم کھائی ہے کہ جب تک قرآن جمع نہ کر لوں، نماز کے سوا اپنی چادر نہیں اوڑھوں گا۔ (خلفائے راشدین صفحہ ۳۶)

اس امر واقعہ کی گہرائیوں پر اگر نظرِ غور سے دیکھا اور سمجھا جائے تو تمام شکوک رفع ہو جاتے ہیں۔

پھر قرآنِ حکیم کی خدمت اور خاتونِ جنتؓ کے پردہ فرمانے کے بعد، حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے جب صدیقِ اکبرؓ کے دستِ مبارک پر بیعت فرمائی تو انہوںؓ نے امانت، تَعَاوَنُوْا عَلَی الْبِرِّ وَالتَّقْوٰی کا حق ادا کر دیا اور پھر ہر خلیفۂ راشدؓ کے معاون ہوئے، اور ان سب نے اس حقیقت کا اعتراف کیا کہ اگر علی مرتضےٰؓ نہ ہوتے تو ہم تباہ ہو جاتے۔ یعنی اُن کے علم کی وجہ سے ہم مسائلِ فقہی کو قرآن و نورِ نبوّت کی روشنی میں حل کرنے پر قادر ہوئے۔ بلکہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی بیعت کے بعد حضرت ابوبکرؓ نے بعد نمازِ ظہر علیؓ کی طرف سے عذر خواہی کی اور حضرت علیؓ نے شاندار

الفاظ میں اُن رضؓ کے فضل و شرف کا اعتراف کیا" (بخاری شریف باب غزوۂ خیبر)
ایک مسئلہ باغِ فدک کا ہے جو خاتونِ جنت رضؓ کی ناراضگی سے متعلق ہے۔
کہ فدک کے معاملہ میں صدیقِ اکبر رضؓ نے ان کا حق انؓ کو نہیں دیا۔ لیکن یہ وہی نازک بات ہے کہ جس کا تعلق ذاتِ نبی کریمؐ سے وابستہ تھا۔ جیسا کہ حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کی وفات کے وقت آپ نے فرمایا کہ نبی جہاں وصال پاتا ہے وہیں مدفون ہوتا ہے اور اسی لئے حجرۂ عائشہ میں حضورؐ مدفون ہوئے۔ اس طرح آپ نے فرمایا کہ نبی کریم صلّی اللہ علیہ وسلّم کا ارشاد ہے کہ نبی کا ورثہ نہیں ہوتا۔ اور اس لئے حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کے طرزِ عمل سے صدیقِ اکبر رضؓ نے سرِ مو انحراف نہ کیا۔ لیکن خاتونِ جنت رضؓ کے اس ملال کو دور کرنے کے لئے ہر طرح کے وظیفوں اور ہر طرح کا تعاون فرما کر ان کا اور پھر حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا آئینۂ دل صاف کر لیا۔

حضرت صدیقِ اکبر رضؓ نے زندگی میں کبھی بیت المال سے اپنی ذات پر خرچ نہ کیا اور نہ کچھ بیت المال میں چھوڑا۔ جو ملا تقسیم ہوا اور آخر میں صرف بیت المال میں ایک دینار باقی تھا۔

کاش ہمیں

صدیقِ اکبر رضؓ کے ان مکاشفات اور خوابوں کا علم ہوتا جو ہر وقت ان کے لئے موجبِ ہدایت بنے ہوں گے۔ صدیقِ اکبر رضؓ کا ہر لمحہ حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کے ساتھ گذرا۔ کیسے ممکن ہے کہ دن رات کے بیشتر لمحات میں ان کو پرتوِ انوار سے سرفرازی نہ ملتی رہی ہو، بیداری میں بھی اور خواب میں بھی۔ بایں ہمہ مستند سیرت نگاروں نے چند واقعات کا ذکر کیا ہے۔ ان میں سے دو کے ذکر پر ہم اکتفا کرتے ہیں۔ ایک ابتدا، ایک انتہا۔

ایک ابتدا

۱۔ حضرت عبداللہ ابنِ مسعود انصاریؓ فرماتے ہیں کہ حضرت ابوبکرؓ کا اسلام وحی کی شبیہہ ہے۔ کیونکہ آپ نے فرمایا کہ بعثتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے میں نے خواب میں ایک نورِ عظیم دیکھا، جو آسمان سے اتر کر کعبہ کی چھت پر نازل ہوا اور مکۂ معظمہ میں کوئی ہی ایسا گھر ہوگا جو اس نور سے فروزاں نہ ہوا ہو۔ ہر گھر کے انوار ایک جگہ جمع ہو کر ایک ہی نور بن گئے۔ یہ نور سب سے پہلے میرے ہی گھر میں آیا اور میں نے (اسے اپنے گھر میں محفوظ کرنے کے لئے) اپنا دروازہ بند کر لیا۔ صبح ہوئی تو میں نے یہ خواب یہودیوں کے ایک اسقف کو سُنایا۔ اس نے کچھ سوالات کئے اور پھر کہا۔ "خداوند تعالیٰ تمہیں میں سے ایک پیغمبر پیدا کرے گا اور تم اس کے وزیر ہو گے، اس کی وفات کے بعد اس کے خلیفہ ہو گے۔ (شواھد نبوت صفحہ ۲۵۸)

دوسرا خواب، دیدارِ نبیؐ۔ صدیقِ اکبرؓ کا ایک عظیم خواب

یہ اس پیکرِ صدق و وفا کا خواب ہے، جس کا مزاج، ہم آہنگِ مزاجِ رسولؐ تھا، جس کے دن خدمتِ خلق میں، جس کی راتیں یادِ الٰہی میں گذرتیں، جو نماز میں اس طرح کھڑا ہوتا جیسے ایک بے حس لکڑی۔ رقت اور خشوع و خضوع کا یہ عالم کہ تلاوت کے وقت گریہ درگلو ہوتا۔ روتے روتے ہچکی بندھ جاتی۔ جس کا طرزِ زندگی سادہ۔ جس کو اللہ تعالیٰ نے دولت سے نوازا اور اس نے وہ دولت سرکار علیہ السلام کے قدموں پر ڈالی۔ دنیا سے رخصت ہوتے وقت اس صدیقِ اکبرؓ کے پاس ایک اونٹ، ایک غلام اور ایک چادر تھی۔ اپنی بیٹی حضرت عائشہ صدیقہؓ کو حکم دیتے ہیں کہ یہ سامان حضرت عمرؓ کے پاس بھیج دو۔

(۲) حضرت صدیقؓ کا وقتِ آخر ہے، ہزارہا مومنین کا مجمع ہے۔ آپ مسلمانوں سے خطاب فرماتے ہیں۔

"ایک دن اپنی بیماری کے دوران، میں نے خلافت کی سپردگی کے لئے متواتر استخارہ کیا اور اللہ تعالیٰ سے التجا کی کہ مجھے ایسے شخص کو امرِ خلافت تفویض کرنے کی توفیق دے جس سے وہ خوش رہے۔ پھر فرمایا کہ تم جانتے ہو، میں دروغ گوئی سے کام نہ لوں گا۔ اور ایسا کون عقل مند ہے جو لقائے ربانی کے وقت اس پر افترا وبہتان باندھے اور مسلمانوں پر جھوٹ بولنے کو جائز سمجھے۔" تمام حاضرین بولے۔ "اے خلیفۂ رسولؐ اللہ! آپ کی راست گوئی اور صدق وصفا پر کس کو شک ہے۔ آپ جو کہنا چاہتے ہیں کہئے۔" حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا کہ رات کے آخری حصہ میں مجھے سخت نیند آئی۔ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دیدارِ پُر انوار سے مشرف ہوا۔ آپؐ نے دو سفید کپڑے پہن رکھے تھے اور میں ان کپڑوں کے دونوں کناروں کو ملا رہا تھا۔ ناگاہ وہ دونوں کپڑے سبز ہونا، اور چمکنا شروع ہو گئے۔ ان کی درخشانی اور تابانی سے دیکھنے والوں کی آنکھیں چندھیائی جاتی تھیں۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دائیں بائیں دو نہایت حسین وجمیل نوجوان کھڑے تھے جن کی دید سے دل وجان مسرور ہوتے جاتے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے السلام علیکم کہہ کر مجھے مصافحہ سے مشرف کیا اور اپنا دستِ مبارک میرے سینہ پر رکھ دیا، جس سے میرا اضطراب اور خفقانِ دل دور ہوا۔ پھر فرمایا:۔

"اے ابوبکرؓ! تمہیں مجھ سے ملنے کا بہت اشتیاق ہے۔ کیا ابھی وقت نہیں آیا کہ تم میرے پاس آجاؤ۔" میں خواب میں بہت رویا۔ پھر میں نے کہا "یارسول اللہؐ! وہ دونوں آپ کے قریب ہوئے۔" حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "ابھی کچھ قربت باقی ہے کیونکہ وصال میں تمہارے بغیر جدائی ہے۔"

اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "اللہ تعالیٰ نے تمہیں خلافت سپرد کرنے کا اختیار دے دیا ہے۔" میں نے عرض کیا۔ "آپ ہی کسی کو پسند فرمائیں۔" حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "اللہ نے فاروقؓ کو رعیت کا والی بنایا ہے جو صادق و قوی ہیں اور وہ زمانے بھر کے زمین و آسمان میں پاکیزہ ترین شخص ہیں۔" پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ دونوں آدمی وفات کے وقت تمہارے وزیر ہوں گے اور بہشت میں تمہارے ساتھ ہوں گے۔ پھر اس کے بعد حضورؐ نے مجھے السلام علیکم کہا، پھر ان دونوں جوانوں نے السلام علیکم کہا، اور بولے کہ تمہیں ناپسندیدہ چیز سے مخلصی حاصل ہوگئی ہے۔ تم آسمان میں بھی صدیق ہو، انسانوں میں بھی صدیق ہو، فرشتوں میں بھی صدیق ہو اور زمین میں بھی صدیق ہو۔ میں نے عرض کیا۔ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ دونوں جوان کون ہیں۔ آپ نے فرمایا۔ یہ دونوں معظم و اکرم فرشتے ہیں جن کے نام جبرئیلؑ اور میکائیلؑ ہیں۔ یہ فرما کر حضورؐ تشریف لے گئے اور میں بیدار ہو گیا میرے گالوں پر آنسو بہہ رہے تھے اور میرے گھر والے میرے سرہانے کھڑے تھے۔"

صدیقِ اکبرؓ کی وفات سے متعلق ایک اہم واقعہ

وفات سے پہلے سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ، نے وصیت فرمائی تھی کہ میرے تابوت کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے روضۂ انور کے پاس لے جانا اور السلام علیک یا رسول اللہ کہہ کر عرض کرنا کہ حضورؐ ابوبکرؓ آپؐ کے آستانۂ عالیہ پر حاضر ہوا ہے۔ اگر اجازت ہوگی تو دروازہ کھل جائے گا اور مجھے اندر لے جانا ورنہ جنت البقیع میں دفن کر دینا۔

جب سیدنا صدیقِ اکبرؓ کی وصیت پر عمل کیا گیا اور ابھی وہ کلمات پایۂ اختتام کو نہ پہنچے تھے کہ پردہ اُٹھ گیا اور آواز آئی۔ "حبیبؓ کو حبیبؐ کی طرف لے آؤ۔" سبحان اللہ۔ (شواہد نبوت ۲۵۹ تا ۲۶۳)۔

یہ سب "حُب" ہی کے تو جلوے تھے۔ یہ نورِ مبین ؐ کی کرم فرمائیاں جو اپنی محبت کرنے والوں سے اُس وقت بھی جاری تھیں، آج بھی جاری ہیں، بحفظِ مراتب کے ساتھ۔ یہ نورِ مبین ؐ کی ضیا باریاں، یہ سلسلۂ رشد و ہدایت جو اُس وقت عام تھا، آج بھی روضۂ اطہر و مطہر سے ہر خاص و عام کے لئے عام ہے۔ دیدۂ بینا اور قلبِ منیب شرط ہے۔

○

یہ تھا، مقامِ صدیق رضؓ، مقامِ صدق و وفا
جس کی حیاتِ جاوداں کی بشارت مُوْتُوْا قَبْلَ اَنْ تَمُوْتُوْا میں مضمر رہی۔ جو مرنے سے پہلے مرمٹا۔ اور خلفائے راشدین رضؓ میں صفتِ حیات کا ترجمان ہوا۔

○

یہ نورِ مبین ؐ کی پہلی کرن تھی جو رحمت کے ساتھ قدرت کی ترجمان بنی
جس کا اشارہ جبرئیل امین اور میکائیل علیہما السلام کے حسن و جمال میں دکھایا گیا

○

دورِ سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ

(۱۳ھ تا یکم محرم ۲۴ھ۔ خلافت دس سال ۶ ماہ ۸ یوم۔ عمر ۶۳ سال)

نورِ مبین صلی اللہ علیہ وسلم کی تنویرِ عدل و تنظیم

سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ ۲۲ جمادی الآخر ۱۳ھ کو مسندِ خلافت پر متمکن ہوئے اور بالاتفاق تمام صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے آپ رضی اللہ عنہ کے دستِ مبارک پر بیعت کی۔ اور اپنے زہد، تقویٰ، عدل، انصاف، خداترسی، خدمتِ خلق، علم و فضل، نظم و ضبط، فیاضی، مفلس و بےنوا کی دستگیری، قرابت کی پاسداری، مہمان نوازی اور پھر انکساری و عاجزی کے باعث دلوں میں گھر کیا اور عَلمِ اسلام کی سربلندی کے ضامن ہوئے۔

اگر صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کے دَور نے ایمان کے ستونوں کو استحکام بخشا تو سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا دورِ خلافت اسلام کے فروغ، اسلام کی وسعتوں، رفعتوں، اس کی ضبط و تنظیم کو بامِ عروج پر پہنچانے کا موجب بنا۔ اگر صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے طریق و عمل کو بنیادِ ایمان بنایا اور کسی تبدیلی کو روا نہ رکھا تو سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اپنے علم و فضل، اپنی اصابت رائے اور اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم کے مشورہ پر بھروسہ کرتے ہوئے قرآنِ حکیم کے فرمودات اور سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اساس پر زندگی کے ہر ہر شعبہ میں ترقی کی راہوں کو وسعت دی اور ایک ایسی تنظیم، اور نظم و ضبطِ ریاست قائم فرمایا جو آج بھی اپنی مثال آپ ہے، اور مسلمانوں کے لئے جادۂ راہِ بقا اور فلاحِ دارین کے حصول کا ضامن ہے۔

ہمارا مقصد سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی حیاتِ مبارکہ پیش کرنا نہیں بلکہ آپ کی سیرتِ مبارکہ اور نظم و تنظیم، عدل گستری، کے وہ مناظر پیش کرنا ہے جسے

جملہ مومنین نورِ مبین صلّی اللہ علیہ وسلّم کے فیضانِ تربیت کا اثر اور حضورؐ کی نگاہِ لطف و کرم کا ثمرہ سمجھتے ہیں اور خوب جانتے ہیں کہ جب حضورِ صلّی اللہ علیہ وسلّم کی دعا ہی سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہٗ کے قبولِ اسلام کا موجب ہوئی، تو یقیناً آپؓ کا دورِ خلافت بھی آپ صلّی اللہ علیہ وسلّم کے پرتوِ نبوت کا ترجمان ہونا چاہیئے جہاں غزوے بھی ہوں، جہاد بھی ہو، لوگوں میں اخوت بھی ہو اور پھر وہ ہر حال میں اللہ کے حکم کے تابع و فرمانبردار رہیں۔ گویا حضورِ صلّی اللہ وسلّم نے مکّہ معظمہ میں ڈالی ہوئی بنیادوں پر فروغِ اسلام کا کام مدینہ منوّرہ میں اپنی حیاتِ مبارکہ میں جاری فرمایا، اب آرام گاہِ نبویؐ، کاشانۂ مصطفویؐ سے 'بعد از وصال' حجاب میں رہ کر خلفاءِ راشدین کی راہنمائی فرمانا تھی تاکہ ان خلفائے جلیل کے ذریعہ ایک ایسی مثال قائم ہو جائے کہ اگر امت اِن اصولوں پر کاربند رہے تو دنیا کی کوئی طاقت اس کی سربلندی میں مانع نہیں ہوسکتی اور کوئی سازش اسے نقصان نہیں پہنچا سکتی۔ لیکن اگر وہ اس فراست سے محروم ہوگی تو قدم قدم پر ٹھوکر کھانے کے امکان ہیں۔

اور یہ بھی واضح فرما دیا تھا کہ

جس طرح نورِ مبین صلّی اللہ علیہ وسلّم وصال فرما جانے کے بعد اپنے خلفاءؓ، اولیاءؒ اور صالحین کا مونس اور ان کا راہنما ہے۔ اسی طرح وہ تو راہِ سلوک کے ہر مسافر کے راہ نما ہیں، چشمِ بینا اور استحکام نسبت شرط ہے۔ المختصر خلفائے راشدینؓ ہوں یا اکابر صحابہ کرامؓ، اور اُنؓ کے بعد اولیاءِ عظامؒ و علماءِ راسخین، ان سب کے قلوب پر جن کا تسلّط ہے، ان کی روح پر جن کی کارفرمائی ہے وہ نورِ مبین صلّی اللہ علیہ وسلّم کی تنویر ہے۔ آج بھی راہِ حق کا راہ نما، نورِ محمدیؐ ہی ہے، گو چلنے والوں کی صورتیں مختلف ہے۔

اب دیکھیئے

اللہ کے پیارے نبیؐ کے اسوۂ حسنہ کی کیسی مثالیں سیدنا عمر فاروقؓ کی کارکردگی اور سیرتِ فاروقؓ میں نظر آتی ہیں، تاکہ لوگ چند سنتوں کو اپنا کر اہم اجزاءِ ایمانی اور حسنِ معاشرہ سے غافل نہ ہو جائیں۔ حضرت فاروق اعظمؓ کی زندگی سے لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ" کے معنی سمجھیں اور لفظ "فِي رَسُولِ اللّٰهِ" کے ترجمان بنیں۔

آیئے

ذرا اس "فی" کی وسعتوں کو سمجھنے کی کوشش کریں۔

غزوات

سیدنا عمر فاروقؓ کے غزوات پر نظر ڈالیئے۔ ان غزوات پر نہیں جن میں سیدنا عمر فاروقؓ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے، مثلاً بدر، احد، غزوۂ خندق، خیبر وغیرہ۔ بلکہ ان فتوحات پر جو سیدنا عمر فاروقؓ کے دورِ خلافت میں ہوئیں۔ ان میں فتوحاتِ عراق ہیں، قادسیہ کی فیصلہ کن جنگ ہے، فتوحاتِ شام ہیں، فتوحاتِ مصر ہیں، پھر میدانِ یرموک اور بیت المقدس کے سفر ہیں، مختلف مجاہدانہ معرکہ آرائیاں ہیں۔ یہاں ان کا مختصر اور اجمالی حال لکھنا بھی ممکن نہیں۔ تاریخ کے صفحات سیدنا فاروق اعظمؓ کے عزم، فراست، شجاعت، تقویٰ، صبر اور استقلال پر شاھد ہیں۔ آپؓ نے دس سال اور چند ماہ کے مختصر زمانہ میں روم وایران کی عظمت و تنظیم کے شیرازے منتشر کر دیئے۔ اور وہ بھی کسی جذبۂ کشورستانی کے تحت نہیں بلکہ اس لئے اور صرف اس لئے کہ ظلم و تعدّی کا خاتمہ کیا جائے، انصاف و عدل گستری کے دَور کا آغاز ہو اور اسلام کا پیغام مخلوقِ خدا میں عام ہو۔ ان ؓ کی نظروں کے سامنے خلیفۂ اوّلؓ کا اندازِ معرکہ آرائی پھر تا رہا اور حضرت صدیق اکبرؓ

کی وہ وصیت ان کے کانوں میں گونجا کرتی تھی، جو وہ اپنے سپہ سالاروں کو فرمایا کرتے۔ یعنی "دیکھو تم ایسی قوم کے پاس جاؤ گے جنہوں نے اپنے کو خدائی عبادت کے لئے وقف کر دیا ہے۔ میں تم کو دس وصیتیں کرتا ہوں۔ کسی عورت، بچے اور بوڑھے کو قتل نہ کرنا۔ پھل دار درخت کو نہ کاٹنا۔ کسی آباد جگہ کو ویران نہ کرنا۔ بکری اور اونٹ کو کھانے کے سوا بیکار ذبح نہ کرنا۔ نخلستان نہ جلانا۔ مالِ غنیمت میں غبن نہ کرنا۔ اور بزدل نہ ہو جانا۔"

فاروقِ اعظمؓ کے دَور کی ہر جنگ میں آپ دیکھیں گے کہ اس وصیت پر عمل ہوا۔ بچوں، بوڑھوں اور عورتوں سے تعرض نہ کیا گیا۔ قتلِ عام سے گریز کیا گیا۔ درختوں تک کو بے وجہ نہ کاٹا گیا۔ اور پھر اپنے عدل وانصاف اور اخلاق کے وہ نمونے پیش کئے گئے کہ رعایا ان کی گرویدہ ہو گئی۔ بلکہ جیسا مورخین لکھتے ہیں کہ لوگ مسلمانوں کی اعانت میں پیش پیش رہتے اور اسلامی حکومت کو خدا کی رحمت تصور کرتے۔ مثلاً:۔

"فتوحاتِ شام میں خود شامیوں نے جاسوسی کی اور خبر رسانی کی خدمات انجام دیں۔ حملۂ مصر میں خود قبطیوں نے سفرمینا کا کام کیا۔ اسی طرح عراق میں خود عجمیوں نے اسلامی لشکر کے لئے پل بندھوائے اور غنیم کے راز سے مطلع کر کے نہایت گراں قدر خدمات انجام دلائیں۔ ان حالات کی موجودگی میں سکندر اور چنگیز جیسے سفاکوں کا نام لینا کس قدر بے موقع ہے۔ سکندر اور چنگیز کی سفاکیاں فوری فتوحات کے لئے مفید ثابت ہوئیں لیکن جس سلطنت کی بنیاد تعدی پر ہوتی ہے وہ کبھی دیرپا نہیں ہوتی۔ چنانچہ ان لوگوں کی سلطنتیں بھی نقش برآب ثابت ہوئیں۔ برخلاف ان کے فاروقِ اعظمؓ نے جو وسیع سلطنت قائم کی اس کی بنیاد عدل وانصاف اور مسالمت پر قائم ہوئی تھی۔ اس لئے وہ آج تیرہ سو سال بعد بھی اسی طرح ان کے جانشینوں

کے قبضہ اور اقتدار میں ہیں۔" (خلفاءِ راشدین۔ مولوی حاجی معین الدین۔ صفحہ ۸۰)
یہ جنگیں کوئی معمولی جنگیں نہ تھیں۔ یہ دشمنوں کی عظیم طاقتوں سے ایک صحرا نشین قوم کی جنگ تھی جس کے پاس ایمان کی طاقت کے سوا کوئی طاقت نہ تھی لیکن جس نے آزاد فضاؤں میں پرورش پاکر آزادی برقرار رکھنے کے انداز سیکھے تھے، جس کو اپنے بے لوث سپہ سالاروں کی قوتِ فیصلہ پر بھروسہ تھا اور جنہیں اپنے خلیفۂ وقت رضؓ سے محبت ہی نہیں بلکہ ان کے لئے ایک جذبۂ فدائیت سے سرشار تھے۔ مثال کے لئے:
قادسیہ کی فیصلہ کن جنگ کا حال اسی کتاب خلفاءِ راشدین سے ملاحظہ فرمایئے۔
"غرض رستم نے غضبناک ہوکر فوج کو کمر بندی کا حکم دیا۔ اور خود تمام رات جنگی تیاریوں میں مصروف رہا۔ صبح کے وقت قادسیہ کا میدان عجمی سپاہیوں سے آدمیوں کا جنگل نظر آنے لگا۔ جس کے پیچھے پیچھے ہاتھیوں کے کالے کالے پہاڑ عجب خوفناک سماں پیدا کر رہے تھے۔ دوسری طرف مجاہدینِ اسلام کا لشکر صف لبتہ تھا۔ اللہ اکبر کے نعروں میں جنگ شروع ہوئی۔ دن بھر ہنگامۂ محشر برپا رہا۔ وہ دن ختم ہوا۔ تو دوسرے دن شام کی چھ ہزار (۶۰۰۰) فوج عین معرکہ کے وقت پہنچی جس میں سیّدنا فاروق اعظمؓ نے بیش قیمت تحائف بھی غازیانِ اسلام کے لئے بھیجے تھے۔ تیسرا دن آیا اور مسلمانوں نے اپنے اونٹوں پر سیاہ جھولی ڈالی۔ ہاتھیوں کے مقابلہ کی تدبیر نکالی۔ یہ کالے دیو اور پہاڑ نما ہاتھی جس طرف جُھک جاتے اس حصّہ کا قلع قمع ہوجاتا۔ چنانچہ مسلمانوں نے پارسی نومسلموں سے مشورہ کیا اور اس نتیجہ پر پہنچے کہ اگر ہاتھیوں کی آنکھیں اور سونڈ بیکار کر دی جائیں تو یہ بادل چھٹ سکتے ہیں۔ چنانچہ سعدؓ، قعقاعؓ، حمال اور ربیع اس خدمت پر مامور ہوئے۔ ان لوگوں نے ہاتھیوں کو نرغے میں لے لیا اور برچھے مار

کر اُن کی آنکھیں بیکار کر دیں۔ قعقاعؓ نے آگے بڑھ کر بیلِ سفید پر تلوار ماری کہ مستک الگ ہو گئی تو وہ جھرجھری لے کر بھاگا اور اس کے ساتھ تمام ہاتھی اس کے پیچھے ہو لئے۔ اس طرح اسلامی فوج کو ان کالے بادلوں سے نجات ملی۔ اور پھر ایسا رن پڑا کہ نعروں کی گرج سے زمین دہل اٹھی۔ رستم زخموں سے چور ہوا۔ ایک نہر میں کود پڑا کہ تیر کر نکل جائے۔ لیکن اسلامی لشکر کے ایک سپاہی نے اس کی ٹانگ پکڑ کر کھینچ لیا اور تلوار سے اس کا کام تمام کیا۔ اور رستم کی زندگی کے ساتھ سلطنتِ ایران کا بھی فیصلہ ہو گیا۔

(اقتباس از خلفاء راشدین صفحہ ۶۸)

ایک طرف بہادر لشکریانِ اسلام کا یہ حال تھا دوسری طرف خلیفۂ وقتؓ کی توجہ ہر گھڑی ان کے ساتھ تھی۔ مثلاً ساریہؓ کی لشکرکشائی کے موقع پر ایک روز حضرت سیدنا عمر فاروقؓ منبر پر خطبہ دے رہے تھے کہ آپ نے خطبہ ترک کر کے تین بار "یَا سَارِیَۃُ الْجَبَلُ" فرمایا پھر خطبہ میں مشغول ہو گئے۔ خطبہ ختم ہوا تو حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے اس عجب انداز کا سبب پوچھا جس کی وجہ سے لوگوں کو آپؓ پر طعنہ زنی کا موقع ملا۔ آپؓ نے فرمایا کہ جس وقت میں نے ایسا کیا تھا میں دیکھ رہا تھا کہ ساریہؓ اور اس کے ساتھی کفار سے ایک پہاڑ کے دامن میں جنگ کر رہے تھے اور کفار آگے پیچھے سے ان پر ٹوٹ پڑنے کو تھے۔ جب میں نے یہ دیکھا تو میں بے اختیار ہو گیا اور مجھے یہ الفاظ زبان پر لانا پڑے تاکہ پہاڑ کی پشت کی طرف لوٹ کر وہ دشمن سے رہائی پائیں۔

کہتے ہیں کہ مدینہ سے لشکرِ ساریہؓ تک ایک ماہ کا فاصلہ تھا۔ اور ساریہؓ واپس مدینہ منورہ پہنچے تو انہوں نے تصدیق کی کہ ہم نے پکارنے والے کی یہ پکار "یَا سَارِیَۃُ الْجَبَلُ" سنی اور ہم مُڑ کر پہاڑ کی طرف

گئے اور کفار پر کامیابی پائی۔ (شواھد نبوت صفحہ ۲۶۵)۔

الغرض خلیفہؓ کی توجہ الی اللہ۔ اللہ کا فضل، نبیؐ کی رحمت، لشکریانِ اسلام کا جوش و ولولہ و تمنائے شہادت، سب ہی ایک یکائی بن کر فاروقِ اعظمؓ کے دورِ خلافت کی کامیابی کا راز بنے۔ اور یہی وہ یکائی ہے جس کی طرف سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کی راہنمائی فرمائی۔ ان کو فراستِ مومن، اور تلوارِ ایمان کے ساتھ اخلاقِ محمدیؐ کا جامۂ نورانی بخشا جو بڑی سے بڑی جنگ میں کامیابیوں کا ضامن بنا۔

فتوحاتِ شام

آقائے دوجہاں صلی اللہ علیہ وسلم سے قلبِ فاروقؓ کو جو لگاؤ تھا، اور جس فراستِ نبوی سے انہیں سرفرازی ملی تھی، اس کی ایک اعلیٰ مثال یرموک کی جنگ ہے جو ہرقل کی بہادر فوج سے لڑی گئی۔ ہرچند سیدنا عمر فاروقؓ نے بعض اہم امور کے پیشِ نظر حضرت خالدؓ کی جگہ حضرت ابوعبیدہؓ کو سالارِ لشکر بنا دیا تھا لیکن حضرت خالدؓ کے جذبۂ ایمانی نے اس کی کچھ پروا نہ کی، اور بدستور اسی تندھی سے مصروف پیکار رہے۔

بقول محترم کشفی صاحب "فتح اور خالد مترادف الفاظ بن گئے تھے اور خلیفۂ ثانی رضی اللہ عنہ، یہ نہیں چاہتے تھے کہ یوں اسلام کی حقانیت غبار آلود ہو۔ اور حضرت خالدؓ نے ثابت کر دیا کہ مسلمان اپنی شہرت اور کشورستانی کے لئے جنگ نہیں کرتا بلکہ اعلائے کلمۃ الحق کے لئے تلوار کو وسیلہ بناتا ہے۔"

مسلمانوں کی مستقل اور مسلسل فتوحات نے ہرقل، شاہِ روم کو ہلا دیا تھا۔ وہ حیران تھا کہ مسلمانوں کی بے قاعدہ اور بے سروسامان فوج، اس کی دس گنا قواعددان، باسامان اور جنگ آزمودہ فوجوں پر کس طرح فتح یاب ہو

جاتی ہے۔ انہوں نے دمشق اور اُردن کو فتح کرنے کے بعد حمص وبعلبک کے قلعوں پر جو نہایت مضبوط تھے اور جن میں سامانِ حرب اور مدتوں کے لئے خوراک کافی تھی، کیسے آناً فاناً مسلمانوں کے ہاتھ ختم ہو گئے" کیا وہ انسان نہیں، یا واقعی خدا ان کے ساتھ ہے" لہٰذا اس نے ارادہ کر لیا کہ اس بار جس قدر بھی فوج جمع ہو سکے۔ اور جس قدر تیاری ضروری ہو، کی جائے اور مسلمانوں کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا جائے۔ اس لئے اس نے ہر سمت سے فوج طلب کی اور مختلف جنرلوں کے تحت مختلف اطراف میں لاکھوں کی تعداد میں فوج بھیج دی۔ یہاں تک کہ بیت المقدس کی حفاظت کے لئے بھی کثیر فوج اور رسد روانہ کی باوجود اس تیاری کے ہرقل کا دل دہل رہا تھا" کیونکہ مسلمانوں کی عارفانہ زندگی، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی فتوحاتِ عرب، خلفاءؓ کا درویشانہ اسلوبِ حیات اور مسلمانوں کی فوق العادت شجاعت وجانبازی کی خبریں، بیس سال سے اُس تک پہنچ رہی تھیں۔ اس کے دل پر اسلام کی عظمت اور ہیبت بیٹھی ہوئی تھی۔ صلح کے پیغام آئے۔ صلح کے جواب میں مسلمانوں کا جواب صرف یہ تھا کہ "یا آپ ہماری اطاعت قبول کریں یا مسلمان ہو جائیں" غرض پانچ لاکھ کی فوج کے مقابلہ میں مجاہدین نے جس عزم وہمت، شجاعت وولولہ ایمانی کا ثبوت دیا، اور ان سے کچھ زیادہ ہی ان کی عورتوں نے ان کی حوصلہ افزائی کی، اور جانثاری اور ایمان کے ثبوت میں ان سے کچھ آگے ہی بڑھ گئیں۔ اور خالدؓ کی حکمت عملی نے ایک بار پھر اسلام کی دھاک کفار کے دلوں میں بٹھا دی۔ خالدؓ اس بہادری سے لڑے کہ ایک دن میں ان کے ہاتھ سے ۹ تلواریں ٹوٹیں۔ مسلمانوں کو عظیم الشان فتح ہوئی۔ ایک لاکھ پچاس ہزار رومی میدان میں قتل ہوئے۔ بھاگتے ہوئے جو مارے گئے اور جو دریا میں غرق ہوئے وہ اس کے علاوہ۔ اور مسلمانوں نے ایک عظیم انعام سے سرفرازی پائی۔

"بشارت"

"جس دن یہ معجزانہ معرکہ ختم ہوا اس رات سیدنا عمرؓ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوبکرؓ صدیق کو خواب میں دیکھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بشارت سنائی کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو فتح دی، ان کے دشمنوں کو ہلاک کیا اور یہ آیت پڑھی:۔ تِلْكَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِيْنَ لَا يُرِيْدُوْنَ عُلُوًّا فِي الْاَرْضِ وَلَا فَسَادًا ؕ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ (القصص ۸۳)
"یہ آخرت کا گھر ہے اسے ہم انہیں کو دیتے ہیں جو دنیا میں سرکشی اور فساد پھیلانا نہیں چاہتے۔ اور انجام پرہیزگاروں کے واسطے ہے۔"

صبح حضرت عمرؓ نے یہ خواب سب کو سنایا۔ آپؓ کی پریشانی دور ہوئی۔ پھر چند دنوں کے بعد حضرت ابوعبیدہؓ کا مفصل خط ملا جس میں فتح یرموک کا پورا اور مکمل واقعہ تھا۔ اور بیت المقدس کی طرف بڑھنے کے لئے خلیفہ کا مشورہ طلب کیا گیا۔" (النبی والاسلام[1] از ڈاکٹر محمد عبدالحکیم خاں[2])

ہم انہیں چند فتوحات کے بیان پر اکتفا کرتے ہیں کہ ایک نے ایران اور دوسرے نے رومی حکومت کا قلع قمع کیا اور جنہوں نے متعصب سے متعصب مؤرخوں سے یہ خراجِ تحسین لے لیا کہ "بیشک مسلمانوں کی جسارت قابلِ تعریف ہے جنہوں نے اپنی فوج کے مقابل دس گنا فوج پر نقط جنگِ یرموک میں فتح ہی حاصل نہ کی بلکہ رومیوں کی تمام ہمتیں پست کر دیں۔"

(خلفائے راشدین)

○

---

[1] النبیؐ والاسلام، مطبوعہ ۱۹۱۵ (انبالہ)

[2] مؤلف تفسیر القرآن بالقرآن، مفتاح القرآن وغیرہ۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کے نورِ مُبین کے متعلق ہم بیان کر چکے ہیں کہ احادیث میں اسے عقل اور قلم سے بھی تعبیر کیا گیا ہے یعنی اوّل ماخلق اللہ نوری کے ساتھ کہیں اَوّلُ ماخلق اللہ العقل یا اَوّلُ مَاخَلَقَ اللہُ القلم آیا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا۔

اس سے مراد وہ فراست ہے جو

سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلّم کی جانب سے مومن کو عطا ہوتی ہے۔ وہ صفتیں ہیں جو ذہن کی بالیدگی کا باعث ہوتی ہیں، وہ علم ہے جو ہر مومن پر فرض کیا گیا ہے جو حصولِ قدرت اور عرفان دونوں میں معاون ہے۔ یہ صلاحیتیں خلفاءِ راشدینؓ کو بدرجۂ اتم دربارِ رسالت سے عطا ہوئی تھیں جن کے مظاہر خود آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کے دَور میں اہلِ ایمان نے دیکھے، اور جن کے جلوے ان اکابر خلفاءؓ کے دَور میں آشکارا ہوئے۔

حضرت صدیقِ اکبرؓ کے زمانہ میں حجاز کی تنظیم ہوئی تھی، چند شعبہ قائم ہوئے تھے۔ لیکن نہایت منظّم حکومت کا آغاز فاروقِ اعظمؓ کے دَور میں ہوا۔ انہوں نے نہ صرف قیصر و کسریٰ کی وسیع سلطنتوں کو اسلام کے ممالکِ محروسہ میں شامل کیا بلکہ حکومت و سلطنت کا باقاعدہ نظام بھی قائم کیا جس کو مولانا شبلی نعمانیؒ کی معرکہ آراء تصنیف "الفاروق" اور مولانا معین الدین نے "خلفائے راشدینؓ" کے سلسلہ میں بیان کیا ہے۔ یہاں ان کا اجمالاً بیان کر دینا ہی کافی ہے۔

۱۔ طرزِ حکومت۔ حضرت فاروقِ اعظمؓ نے قومی مسائل کے حل کے لئے مجلسِ شوریٰ کی باضابطہ تشکیل فرمائی، جس میں مہاجر اور انصار کے منتخب اور اکابر صاحب الرائے حضرات شامل تھے۔ مثلاً حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ، حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ، حضرت معاذؓ، حضرت ابی بن کعبؓ،

حضرت زید بن ثابتؓ وغیرہ۔" ویسے شوریٰ پر عمل پہلے سے ہوتا تھا اور سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن حکیم کے ارشاد کے مطابق شوریٰ کو اسلامی معاشرہ کی امتیازی خصوصیت بنا دیا تھا۔ وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ" (محترم کشفی صاحب)

مجلس عام۔ مجلسِ شوریٰ کے علاوہ ایک مجلس عام تھی، جس میں مہاجر اور انصار کے تمام سردارانِ قبائل شامل ہوتے، مجلس کو کسی اہم معاملہ کے متعلق فیصلہ کے وقت طلب کیا جاتا۔ ورنہ سب کام مجلسِ شوریٰ ہی انجام دیتی۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ ہر شخص کو اپنے حقوق کی حفاظت کا موقع ملے اور انتظامِ مملکت میں شرکت کا احساس ہو۔

خلفائے راشدینؓ نے اپنے فرائض اور حقوق کی تشریح اکثر خطبات میں فرمائی ہے، جس پر وہ سختی سے عامل رہے۔ اس کا ذکر یہاں اس لئے ضروری ہے کہ آج سے زیادہ مسلمانوں کو کبھی اس طرز کے دریا دل قوی حاکم کی ضرورت نہ تھی۔

حضرت عمرؓ فرماتے ہیں

"مجھ کو تمہارے مال میں اسی طرح کا حق ہے جس طرح یتیم کے مال میں اس کے مربی کا ہوتا ہے۔ اگر میں دولت مند ہوں گا تو کچھ نہ لوں گا۔ اگر صاحبِ حاجت ہوں گا تو اندازے سے کھانے کے لئے لوں گا۔

صاحبو! میرے اوپر تمہارے متعدد حقوق ہیں جن کا تم کو مجھ سے مواخذہ کرنا چاہیئے۔ یہ کہ ملک کا خراج اور مالِ غنیمت بیجا طور پر نہ جمع کیا جائے۔ یہ کہ وہ میرے ہاتھ سے بے جا طور پر صرف نہ ہونے پائے۔ اور یہ کہ تمہارے روزینے بڑھاؤں اور تمہاری سرحدوں کو محفوظ رکھوں۔ اور یہ کہ تم کو خطرہ میں نہ ڈالوں"

انصاف سے ذرا گریبان میں منہ ڈال کر، ہماری حکومتیں اس نصب العین

کا مقابلہ اپنی طرزِ حکومت سے کریں اور دیکھیں اور سمجھیں کہ اسلام ان سے کیا چاہتا ہے۔ یہ نورِ مبین صلی اللہ علیہ وسلم کی نورانی تجلیات ہیں جو صحابہ کرامؓ کے ذریعہ عام کی گئیں۔

۲۔ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں لوگوں کو نکتہ چینی کی محض اجازت ہی نہ تھی بلکہ ان کے اعتراض کا شافی جواب دیا جاتا تاکہ ان کو اطمینان ہو جائے۔ اگر اعتراض کسی غلط اطلاع یا غلط فہمی کی بنا پر ہوتا تو اصلاح کر دی جاتی اور معترض سے کسی غلطی کا مواخذہ نہ کیا جاتا۔ کسی شہری کے ذہن میں کسی قسم کے خوف کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا۔

۳۔ آپ نے نظامِ حکومت کے سلسلہ میں ملک کو صوبوں اور ضلعوں میں تقسیم کیا۔ اس میں مفتوحہ ممالک بھی تھے۔ پھر ان کے والی یعنی حاکم صوبہ، جسے گورنر کہہ لیجئے۔ کاتب یعنی میر منشی۔ کاتب دیوان یعنی فوجی محکمہ کا میر منشی۔ صاحب الخراج یعنی ٹکس کلکٹر۔ صاحب الاحداث یعنی افسر پولیس۔ صاحب بیت المال یعنی افسر خزانہ۔ قاضی یعنی جج وغیرہ قائم کئے۔ اور ایسے لوگوں کی جو ذی فہم متدین، راستباز تھے اور عدل و انصاف پر ثابت قدم رہنا اپنا فرض سمجھتے تھے، ان جگہوں پر تقرری کی۔

۴۔ پھر عملی احتساب بھی جاری رہا۔ تاکہ فرض شناسی میں کوتاہی نہ ہو اور عمّال کی کمزوریوں پر سختی سے باز پرس ہو۔

۵۔ شعر و شاعری کے ذریعہ ہجو، بدگوئی، بدمذاقی کو عام ہونے سے سختی سے روکا گیا۔ آوارگی اور شراب خوری پر حد قائم کی گئی کہ قوم بے لگام نہ ہو جائے۔

۶۔ سادہ زندگی کی تلقین عملاً خلیفۂ وقت نے کی، جنؓ کے کپڑوں پر جا بجا پیوند ہوتے۔ کسی کے بدن پر حریر و دیبا دیکھ لیتے تو چہرے پر غم و غصّہ کے آثار

نمایاں ہو جاتے اور اُس کی تادیب کی جاتی۔
۷۔ محکمۂ پولیس پر خاص نظر رکھی جاتی کہ لوگوں پر کسی قسم کی زیادتی نہ ہو۔ اور وہ اپنے فرائض تندہی سے انجام دیں۔ لوگ ناپ تول میں کمی نہ کریں، اور انصاف کا نمونہ قائم کریں۔
۸۔ بیت المال کا حساب سختی سے رکھا جاتا۔ ہر صوبہ کے سالانہ مصارف کے بعد جو رقم بچتی وہ مدینہ منورہ کے بیت المال میں منتقل کی جاتی۔ بیت المال کی وسعت کا اندازہ اس سے کیجئے کہ دارالخلافہ کے باشندوں کی جو تنخواہیں اور وظائف مقرر تھے، وہ کم و بیش تین کروڑ درہم سالانہ تھے۔ واضح رہے کہ اس میں نہ صرف ماموروں کی تنخواہیں تھیں بلکہ لوگوں کے وظائف شامل تھے، جس میں آقا و غلام دونوں کو برابر ملتا، کسی قسم کا فرق روا نہ رکھا جاتا۔
۹۔ پھر تعمیرات کے کام جاری ہوئے۔ سڑکیں بنیں۔ نئے نئے خوبصورت شہر آباد کئے گئے۔
۱۰۔ فوجی نظم و نسق پر خاص توجہ دی جاتی۔ حضرت فاروقؓ نے چاہا کہ فوجی تعلیم عام ہو لیکن چونکہ یہ بات فوراً ممکن نہ تھی اس لئے قریش اور انصار سے اس کی ابتداء کی گئی۔ ایک رجسٹر پر ان لوگوں کے نام درج کئے گئے۔ ان کے فرائض سے انہیں آگاہ کیا گیا۔ ان کے مشاہرے مقرر کئے گئے جو ۲۰۰ سے ۴۰۰ درہم تک تھے۔
۱۱۔ اسلامی ممالک کی مردم شماری ہوئی اور کچھ دنوں میں یہ نظام قریش اور انصار سے عام کر کے، تمام قبائلِ عرب میں عام کیا گیا۔ سب کی تنخواہیں یا وظیفے مقرر ہوئے۔ یہاں تک کہ شیر خوار بچوں کے وظیفے بھی مقرر کئے گئے
۱۲۔ حضرت عمر فاروقؓ کے سامنے دو چیزیں بڑی اہمیت رکھتی تھیں۔ ایک علم اور دوسرے مکارمِ اخلاق۔ تعلیم کے لئے تو انہوں نے بچوں اور لڑکوں

کے لئے لکھنے پڑھنے کے علاوہ حساب، گھوڑے کی سواری، تیر اندازی، تیغ زنی اور تیراکی کو لازمی قرار دیا۔ ایک شخص نے کہا کہ تیراکی کو لازمی نصاب میں شامل نہ کیا جائے۔ آپؓ نے فرمایا کہ اگر حساب نہیں آتا تو کوئی حساب بتا دے گا لیکن جب کوئی ڈوب رہا ہو تو کون مدد کرے گا۔ اس طرح اخلاقی زندگی میں آزادی، مساوات، عزتِ نفس کا خاص خیال تھا۔ دیگر خوبیاں جو عام مسلمانوں میں ہونا ہی چاہئیں، ان کا ذکر ہی کیا۔ وہاں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت، عدل، انکساری، فراستِ مومن، امانت، دیانت، جیسے اعلیٰ اخلاق کے بے شمار نمونے ان کے سامنے تھے، اور جو اسلام لانے کے بعد ان کی فطرت ہی بن گئے تھے۔

۱۳۔ حضرت عمرؓ کو فوج کی تربیت کا اس درجہ خیال تھا کہ انہوں نے بہت تاکیدی احکام جاری کئے کہ ممالکِ مفتوحہ میں کوئی عرب زراعت یا تجارت کا مشغلہ اختیار نہ کرے تاکہ اس کی وابستگی اس سرزمین سے ہو کر نہ رہ جائے اور اس کے سپاہیانہ جوہر کو نقصان پہنچے۔ قواعد کے متعلق چار چیزوں پر خاص زور تھا۔ تیرنا، گھوڑا دوڑانا۔ ننگے پاؤں چلنا۔ تیر چلانا۔ اور چار ماہ بعد سپاہیوں کو رخصت دی جاتی تھی کہ اپنے اہل و عیال سے ملیں۔ جفاکشی کے خیال سے حکم تھا کہ اہلِ فوج رکاب کے سہارے سے سوار نہ ہوں، نرم کپڑے نہ پہنیں، دھوپ کھانا نہ چھوڑیں اور حماموں میں نہ نہائیں۔

۱۴۔ نیز جسمانی فرائض کے ساتھ مذہبی خدمات، اشاعتِ اسلام کے لئے جدوجہد، احادیث پر زور، یہاں تک کہ ان کو نقل کروا کے حکام کے پاس بھجوانا، مشاہیر صحابہؓ کو تعلیم کے لئے مقرر فرمانا آپ کا معمول رہا۔ حدیث کے بعد فقہ پر زور دیا گیا۔ حضرت عمرؓ نے اپنے خطبوں میں فقہ کے مسائل شامل فرماتے۔ ممالکِ محروسہ میں مساجد تعمیر کیں۔ امام و مؤذن

مقرر کئے۔ حرم محترم کی عمارت کی توسیع ۱۷ھ میں فرمائی۔ غلافِ کعبہ کے لئے عمدہ کپڑا انتخاب فرماتے۔ ہر سال حج کے موقع پر وفد جاتے اور خبر گیری کی خدمات انجام دیتے۔

عدل و انصاف، علم و فضل میں وہؓ اپنی مثال آپ تھے۔ حضور سرورِ کائناتؐ حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ کی مثال اپنی دو انگلیوں (یعنی شہادت کی انگلی اور درمیانی انگلی) کو ملا کر دیتے۔ منشا یہ تھا کہ علمِ تفصیلی سے علمِ اجمالی جدا نہیں ہو سکتا اور انگلیوں میں ایک بڑی ایک چھوٹی قد کی نسبت سے بھی تھی۔ حضرت عمر فاروقؓ اس علمِ تفصیلی کے باعث چھوٹی سے چھوٹی بات کا خیال رکھتے۔ قرآن سے استدلال میں آپ کو خصوصی ملکہ تھا۔

غرض حبِ رسولؐ اور اتباعِ رسولؐ شانِ عمر تھی۔ وہ نورِ نبوّت کے پروانے تھے اور، اللہ کی راہ میں سب کچھ، اس کے رسولؐ کی خوشنودی کے لئے نثار کرنے کو تیار رہتے۔ انہوں نے صرف ظاہری اتباع پر تکیہ نہیں کیا بلکہ قلبِ رسولؐ سے امت کی محبت، غریبوں کی دادرسی، کمزوروں کی مدد، فقراء و مساکین کی خدمت اخذ کی غرض جو کچھ آستانۂ نبوّت سے پایا تھا، اس پر عامل رہے جس کی مثالوں سے تاریخ کے صفحات بھرے پڑے ہیں۔ مثلاً الفاروقؓ، خلفائے راشدینؓ، تاریخ اسلام، وغیرہ۔

اس مینارِ عدل و انصاف و علم و فضل، امیر المومنینؓ کی شہادت کا واقعہ ۲۳ھ کو ماہ ذی الحجہ کی آخری تاریخوں میں پیش آیا۔ کہتے ہیں کہ مغیرہ کا غلام ابولولو نامی حضرت عمرؓ سے شاکی ہوا اور آپؓ کا دشمن ہو گیا۔ آپ کی عادت تھی کہ آپ سب سے پہلے صبح کی نماز ادا کرنے کے لئے مسجد پہنچا کرتے تھے۔ ابولولو پہلی صف میں کھڑا ہو گیا اور اس نے آپؓ پر زہر سے بجھے ہوئے خنجر سے دو تین وار کئے یہاں تک کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ،

گر گئے۔ ابولولو نے اس دن تیرہ آدمیوں کو اسی طرح گرفتاری سے بچنے کے لئے شہید کیا لیکن وہ پھر پکڑا گیا۔

لوگ آبدیدہ تھے اور حضرت عمرؓ فاروق کی تعریف، انؓ کے مساعیٔ جمیلہ کا ذکر ان کی زبان پر تھا، کہ آپؓ نے بات کاٹ کر فرمایا۔

"میری تمنا تھی کہ جب دنیا سے جاؤں تو مجھے نہ کسی سے کچھ لینا ہو، نہ کسی کو کچھ دینا ہو۔ اور جب دفن ہوں تو حضور پُرنور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ"

حضرت عمر فاروقؓ نے لیا تو کسی سے کچھ نہیں لیکن دیا سب کچھ حُبِّ رسولؐ و اتباعِ رسولؐ کی وہ بے مثال مثالیں (جن میں ان کا عدل و انصاف، عفو و درگزر، سزا و جزا، تواضع، مساوات، خدمتِ خلق، غیرت، اخوت اور محبت شامل ہیں) چھوڑی ہیں جو رہتی دنیا تک امت کے لئے مشعلِ ہدایت رہیں گی۔ اور آج بھی رفیقِ غار سیدنا ابوبکر صدیقؓ کے پہلو میں، حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کے روضۂ مبارک میں آرام فرما رہے ہیں۔

یقیناً

سیدنا عمر فاروقؓ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے محض مقامِ عدل و انصاف کے ترجمان نہیں بلکہ آپؐ کی تجلیاتِ ایمانی، بالخصوص عزم و فراست، علم و عرفان کے مینارِ نور ہیں جس میں صدقِ صدیقؓ، حلمِ ذوالنورینؓ، شجاعتِ علیؓ کے جوہر آشکارا ہیں۔ یہ سب فیضانِ رسالت نہ تھا تو اور کیا تھا۔ اور اسے محض نورِ مبین صلی اللہ علیہ وسلم کی تنویر اور تجلیات نہ کہا جائے تو کیا کہا جائے۔

دورِ سیدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ

(محرم ۲۴ھ تا ۱۲ ذی الحجہ ۳۵ھ۔ عمر شریف ۸۲ سال)

سیدنا صدیق اکبرؓ اور سیدنا عمر فاروقؓ کا دور نورِ مبین کی تجلّیاتِ ایمانی اور فروغِ اسلام کا دَور تھا۔ گویا حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم نے جن افکار و اعمال کو اپنایا، یہ دوران کی تفصیل تھا اور اسلام کے بامِ عروج پر پہنچنے کا ضامن ہوا۔ اس دَور کی ان کامیابیوں کے بعد یہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کے ساتھ تو اللہ تعالیٰ کی تائیدِ غیبی تھی، ہم لوگوں کے لئے آپؐ کا اتباع کیسے ممکن ہے۔ حضرت صدیقِ اکبرؓ اور عمرِ فاروقؓ نے آپؐ کے نقشِ قدم پر چل کر ایمان و اسلام، حضورؐ کے مکّی اور مدنی ادوارِ حیات کے اصولوں کی صداقت کو نمایاں فرمایا، اور آپؐ کے اس فرمان کی تصدیق فرمائی کہ اللہ کی عنایات، کرم و فضل اور نصرت، اُمّت کے متّبعین اور محسنین کے ساتھ رہے گی بشرطیکہ وہ ایمان و عمل میں اپنے امکان بھر کوتاہی نہ کریں۔

لیکن

اب وقت آگیا تھا کہ خلافتِ راشدہ ہی کے دور میں وہ حقائق بھی اُمّتِ مسلمہ پر روشن ہو جائیں جو معاشرہ اور ریاست میں فتنہ و فساد کا موجب ہو سکتے ہیں اگر ان پر کڑی نظر نہ رکھی جائے۔ ساتھ ہی یہ بات بھی واضح ہو جائے کہ اللہ ربّ العزّت نے انسانوں کو ارادہ کی آزادی عطا فرمائی۔ اگر نیک نیتی سے انسانی ارادہ کے تحت کوئی فروگذاشت ہوئی تو اللہ معاف کرنے والا درگذر فرمانے والا ہے۔ لیکن اگر وہ اپنے نفس اور ہوا ہوس کے تحت کوئی غلط قدم اٹھاتا ہے تو اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کی بازپرس ہے۔

شاید اللہ رب العزت نے اسی مشیت کے تحت
سیدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ،
کو
مقامِ ارادہ پر فائز فرمایا
اور

اپنی چار صفات، حیات۔ علم۔ ارادہ۔ قدرت۔ میں سیدنا عثمان غنی رضؓ کو اس مقامِ ارادہ سے سرفرازی بخشی۔ تاکہ امت کے لئے راہِ حق کشادہ ہے، اور اگر اس سے کوئی لغزش سرزد ہو تو وہ برملا اس کی اصلاح کرلے۔

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ،

ایک عظیم ہستی ہیں۔ آپ رضؓ اس وقت ایمان کی دولت سے سرفراز ہوئے جب لوگ قبائلی تعصب کے شکار تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت عقبہ بن معیط اور ابوسفیان اس لئے کر رہے تھے کہ عرب کی قیادت بنو امیہ سے نکل کر بنو ہاشم میں نہ پہنچ جائے۔ لیکن حضرت عثمان غنی رضؓ کا آئینۂ دل کسی تعصب سے غبار آلود نہ تھا۔ آپ نے نہایت آزادی سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوتِ تبلیغ پر لبیک کہا، اس وقت جبکہ پینتیس ۳۵ چھتیس ۳۶ مرد وزن مشرف بہ اسلام ہوئے تھے۔ (خلفائے راشدین۔ صفحہ ۱۳۴)

آپ رضی اللہ عنہ،

اپنے زہد، عبادت، فیاضی، سخاوت، رحمدلی، اقربا نوازی اور عشقِ قرآن کے لئے مشہور ہوئے۔ اسی وجہ سے دنیا آج انہیں جامع القرآن کی صفتِ خاص سے یاد کرتی ہے۔ آپ کو اللہ تعالیٰ نے دولت دے کر دولت سے بے نیاز فرما دیا تھا۔ اس لئے عثمانِ غنی رضؓ مشہور ہوئے۔ اسلام کے لئے ہر وقت، ہر طرح

کی مدد و اعانت کے لئے تیار رہتے۔ "بیر مدینہ" آپ کی اس ایثار کی یادگار رہا۔ یہ ایک کنواں تھا جس کو حضرت عثمان غنیؓ نے خرید کر مدینہ کے مسلمانوں کے لئے وقف کر دیا تھا۔

آپ رضی اللہ عنہ ذوالنورین کے لقب سے مشہور ہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کی دو صاحبزادیوں سے آپ کی شادی ہوئی۔ پہلے سیدہ رقیہؓ سے، جو مکہ میں حضورؐ کی بعثت سے کوئی سات سال پہلے پیدا ہوئیں۔ اور مکہ والوں نے عثمان و رقیہ ہی کو "احسن زوجین" کہا۔ اور دوسری شادی سیدہ امّ کلثومؓ سے ہوئی جن کے نکاح کے وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلّم نے حضرت عثمانؓ کو بلایا اور فرمایا۔ "یہ جبرئیلؑ ہیں جو کہہ رہے ہیں کہ خدائے بزرگ کا حکم ہے کہ میں اپنی دوسری بیٹی تجھ سے بیاہ دوں۔" (رحمۃ للعالمین صفحہ ۱۰۲ جلد دوم)

اور سیدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ، تو یوں بھی ذوالنورین ہوئے کہ ایک تو حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کی ذاتِ مبارکہ سے اِن نکاحوں سے والبتہ نور ہوئے، دوسرے حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کے دل کے سرور، کلامِ الٰہی عام کرنے کی سعادت سے سرفرازی پائی کہ یہ بھی نور ہے۔

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ،

کی خلافت کا آغاز اسی شان سے ہوا جس میں صدیقِ اکبرؓ کی نرمیٔ طبع اور حضرت فاروق اعظمؓ کی فراست نمایاں ہیں۔ اور چھ سال نہایت کامیابی سے یہ دورِ خلافت اسلام کی ترقیوں کا ضامن رہا۔ لیکن اس درمیان حضرت عثمان غنیؓ نے کچھ ایسے فیصلے فرمائے جو ہر چند ذَاتِ ذَا القُربٰی حَقَّہٗ کے تحت تھے اور نہایت نیک نیتی پر مبنی تھے، لیکن ان کے نتائج خاطر خواہ برآمد نہ ہوئے۔ جن لوگوں کو آپؓ نے اہم جگہوں پر مقرر فرمایا انہوں نے آپؓ کے اخلاقِ محمدیؐ سے غلط فائدہ اٹھایا اور سازشوں کے موجب بنے۔ ہر چند کہ علم ہونے پر آپ

نے ان کا تدارک فرمایا لیکن جو نقصان ہونا تھا وہ ہو چکا۔ ان میں چند خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

۱۔ حضرت عثمانؓ کے ایک چچا حکم نامی تھے جن کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے غداری کی وجہ سے جلا وطن کر دیا تھا، لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عثمان غنیؓ کی سفارش پر، انہیں معاف فرما دیا تھا، جس کی اطلاع عام صحابہؓ کو نہ تھی۔ حضرت عثمان غنیؓ نے اپنے ان چچا کو اپنے دورِ خلافت میں پھر بلا لیا اور انہیں ایک لاکھ درہم بخشے۔ پھر ان کے بیٹے مروان سے اپنی بیٹی کی شادی کر دی اور اسے وزیر بنا لیا اور خلافت کی مہر اس کے سپرد کر دی۔

یقیناً حضرت عثمان غنیؓ کا یہ فیصلہ اس نیک نیتی پر مبنی تھا کہ وہ دونوں آپؓ کا احسان مانیں گے اور ہر طرح اسلامی حکومت کے لئے خلیفہؓ کے قوتِ بازو بنیں گے لیکن ایسا نہ ہوا اور مروان نے آپؓ کی اطلاع کے بغیر احکام صادر کرنا شروع کئے۔

۲۔ حضرت عمرو بن العاصؓ کو معزول فرمانا اور اپنے سوتیلے بھائی عبداللہ بن ابی سرح کو پورے مصر کا گورنر بنانا جن کے خلاف متعدد الزام تھے۔ اور عمرو بن العاص (جن کے حسنِ تدبر سے رومی تک متاثر تھے) کی برطرفی کا اثر ہر طرح برا ہوا۔

۳۔ انہوںؓ نے شام میں اپنے چچا زاد بھائی امیر معاویہؓ بن ابوسفیان کو گورنر بنایا جو بنو امیہ کے سردار تھے۔ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں بھی امیر معاویہؓ کو دمشق میں گورنری دی گئی تھی لیکن حضرت عمرؓ کی بیدار مغزی، مستعدی، سطوتِ اخلاقی اور ذاتی رعب و دبدبہ کے سامنے کس کی مجال تھی کہ بدعنوانی کی ہمت بھی کرتا۔ برخلاف اس کے حضرت عثمان غنیؓ نہایت رحم دل، کریم النفس واقع ہوئے تھے جن کے حسنِ اخلاق سے لوگوں نے غلط فائدے اٹھائے۔ اس کے باوجود جو فتوحات بالخصوص حضرت عثمان غنیؓ کے دورِ خلافت کے پہلے

چھ سال میں ہوئیں، وہ ان کی ذاتی صلاحیتوں اور جذبۂ تبلیغ دین پر شاہد ہیں۔
آپؓ کے زمانہ میں ۲۴ھ میں بعض چھوٹے چھوٹے واقعات پیش آئے۔
یعنی آذر بائجان، آرمینیہ میں فوج کشی ہوئی جہاں کے لوگوں نے خراج دینا بند کر دیا تھا۔ رومیوں کی سازشوں اور چھیڑ چھاڑ کی خبر سن کر ان کے خلاف امیر معاویہؓ کی مدد دو ہزار کی جمعیت کے ساتھ شام میں کی گئی۔ اسی طرح مصر کے جس علاقہ نے خراج دینے سے انکار کیا تھا، ان کی گوشمالی کی گئی۔
۲۵ھ میں سکندریہ کے لوگوں نے بغاوت کی، اس کو کچلا گیا۔
۲۵ھ میں ہی مہم طرابلس کا اہتمام ہوا لیکن باقاعدہ کارروائی ۲۷ھ میں کی گئی، جس میں حضرت عثمانؓ نے دار الخلافت سے بھی ایک لشکر جرّار روانہ کیا، اس میں عبداللہ بن زبیر، عبداللہ بن عمر، عبدالرحمٰن بن ابی بکر رضی اللہ عنہم خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ اسی سال امیر معاویہؓ نے ایشیائے کوچک میں شامی سرحدوں کے قریب دو رومی قلعے فتح کئے۔
۲۶ھ میں افریقہ کے علاقے الجزائر اور مراکش، عبداللہ بن زبیرؓ کی ہمت و شجاعت سے زیر نگین ہوئے۔ اور بڑے بڑے معرکے پیش آئے لیکن فتح اسلامی لشکر ہی کو ہوئی۔
۲۷ھ میں اسپین پر حملے ہوئے۔ قبرص پر حملہ ہوا جو اب سائپرس کہلاتا ہے۔ اس پر حملہ کی اجازت امیر معاویہؓ نے طلب کی لیکن مرکز سے حوصلہ افزائی نہ ہوئی۔ بالآخر ۲۸ھ میں قبرص پر حملہ کیا گیا۔ یہ بحری جنگ تھی۔ جس میں اہلِ قبرص کو مغلوب کیا گیا۔ اور اہلِ قبرص سات ہزار (۷۰۰۰) دینار سالانہ ادا کرنے لگے۔
اسی طرح ۳۱ھ میں ایک عظیم الشان بحری بیڑا، جو تقریباً پانچ سو (۵۰۰) جہازوں پر مشتمل تھا، رومیوں نے سواحلِ شام پر حملہ کرنے کے لئے بھیجا جس کا مقابلہ امیر معاویہؓ نے حضرت عثمانؓ کے حکم سے کیا اور عبداللہ بن ابی سرح، امیر البحر

کو حکم دیا کہ اسلامی بیڑا از سرِ نو مرتّب ہو۔ رومی جہازوں کا راستہ روکا گیا۔ رومی، اسلامی جہازوں میں گھس آئے۔ پھر وہ گھمسان کی لڑائی ہوئی کہ مسلمانوں کے خنجر و تلوار سے ہزاروں رومی لقمۂ اجل ہوئے اور اسلامی بیڑے کو فتح یابی نصیب ہوئی۔ (اقتباسات از خلفائے راشدین صفحہ ۱۵۱)

فتوحات کے علاوہ بھی

بہت سے فلاح و بہبود اور تبلیغِ دین کے کام حضرت عثمان غنیؓ کے دورِ خلافت میں ہوئے۔ ان سب میں سب سے اہم قرآنِ حکیم کا با ترتیب جمع کرنا اور ممالکِ اسلامیہ میں اس کی اشاعت تھا۔

دوسری اہم خدمت مسجد نبوی کی توسیع تھی جس میں آپؓ آخری وقت تک مشغول رہے اور مسجد کے ستونوں کو خوبصورت سنگریزوں سے سجانے اور اس کے فرش کو خوب سے خوب تر بنانے کو اپنا فرضِ عین سمجھ کر ادا فرماتے رہے۔

تبلیغ دین کے لئے بھی حضرت عثمانؓ خود جاتے اور اس کا ایک منظّم طریقہ کار مرتّب فرمایا تھا۔ آپ دیگر کاموں میں بھی اسی جوش و خروش سے حصّہ لیتے۔ افسوس اس بات پر ہے کہ ابھی دورِ عثمانیؓ کی ترقی کا دَور تھا کہ آپ کے ہاتھ کی وہ انگشتری جس پر کلمہ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ کندہ تھا، ایک چشمہ میں گر گئی اور باوجود انتہائی کوشش کے نہ ملی۔[1] ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مشیت الٰہی کو یہی منظور تھا کہ اب حضرت عثمانؓ پر ان امور کو بھی بے نقاب کر دیا جائے جو آگے چل کر اسلامی روایات و اخلاق پر ضرب کاری لگانے کا موجب ہوں گے۔ اور ارادہ کا یہ مقام کہ انّما الاعمال بالنّیات لوگوں پر بخوبی ظاہر ہو جائے۔ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ جب امام بخاری نے

---

[1] تذکرۃ الکرام تاریخ خلفائے عرب و اسلام۔ صفحہ ۲۳۷۔

بخاری شریف مرتب فرمائی تو اس حدیث کو اوّلیت کے لئے منتخب کیا۔

غرض مختلف وجوہ سے دورِ عثمانی رضؓ میں ایسے فتنے اُٹھے کہ ان کا سدِّ باب نہ ہوسکا اور جو بالآخر شہادتِ حضرت عثمانِ غنی رضؓ کا سبب بنے۔ اور پھر ایک ایسا سلسلہ شروع ہوا جس کی انتہا کربلا کے بے آب وگیاہ میدان میں شہادتِ امام حسین رضؓ پر ہوئی۔ سیرت نگاروں نے اس کے مختلف وجوہ لکھے ہیں۔ لیکن سیدنا حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے ایک ہی جملہ میں ان سب کو ایک جگہ سمو دیا ہے، جس کا ذکر ابنِ خلدون نے کیا ہے۔

"کسی نے حضرت علی رضؓ سے پوچھا کہ کیا بات ہے کہ جب آپ خلیفہ بنائے گئے تو مسلمانوں میں اختلاف ہوگیا لیکن حضرت فاروق رضؓ کو خلیفہ بنانے میں کسی نے چوں نہ کی۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے جواب دیا۔ "صدیق رضؓ اور فاروق رضؓ مجھ جیسے لوگوں پر حاکم تھے اور میں تم جیسے لوگوں پر حاکم ہوں۔" ابن خلدون نے اس کو یوں سمجھایا ہے کہ اس زمانہ میں لوگوں میں دین پورے جوش وشباب پر تھا اور اس دَور میں وہ جوش ٹھنڈا پڑ گیا ہے۔ لیکن حضرت علی رضؓ کے کلام کی بلاغت اس سے زیادہ اسباب کی طرف نشاندہی کر رہی ہے، جو دورِ عثمانی اور دورِ علی رضؓ دونوں پر صادق آتے ہیں۔ مثلاً

۱۔ فاروق اعظم رضؓ کے زمانہ تک قومیت اور قبائلی رنگ نے مذہب کا دامن چاک نہ کیا تھا جو ان کے بعد کے دورِ عثمان رضؓ وعلی رضؓ میں قبائلی تعصب کی صورت میں ظاہر ہوا۔

۲۔ اور یہ تعصب صرف قبیلوں کی حد تک محدود نہ رہا بلکہ خود غرضی ونفس پرستی نے تو قبیلے کے تصوّر کو بھی پسِ پشت پھینک دیا۔ مثلاً خود امیر معاویہ رضؓ کا حضرت عثمانِ غنی رضؓ کی حکم عدولی فرمانا، مروان کا حضرت عثمان رضؓ کی رحمدلی سے غلط فائدہ اٹھانا۔

۳- جو لوگ دورِ عثمانؓ و علیؓ میں تھے ان میں بیشتر تعداد ان لوگوں کی تھی جنہوں نے فتحِ مکہ سے قبل کسی غزوہ میں شرکت تک نہ کی تھی اور صرف اسلام کا عروج ہی دیکھا تھا اور انہیں اس دین کی وہ قدر نہ تھی جو سابقون الاوّلون کو حاصل تھی۔

۴- دورِ صدیق و عمرؓ، فقر اور عاجزی کے ساتھ جوشِ ایمانی کا دور تھا۔ اب دورِ عثمانؓ میں فروغِ اسلام کے ساتھ لوگ عیش و عشرت کے عادی ہو گئے تھے۔ یہاں تک کہ مدینہ اب پرانا مدینہ نہ رہا تھا۔ اس میں عالیشان مکان بن گئے تھے۔

۵- مسلمانوں میں ضعفِ ایمانی کا سبب وہ شادیاں بنیں جو غیر قوموں اور اُن علاقوں میں کی گئیں جہاں لوگوں کے دلوں میں اسلام نے جڑ نہیں پکڑی تھی۔

۶- پھر اس کے ساتھ نفس پرستی نے یہود کو سازشوں کا موقع فراہم کر دیا۔ یہ سب اسباب حضرت علیؓ کے الفاظ میں مضمر ہیں۔ یہ بھی سچ ہے کہ جہاں عوام میں یہ خرابیاں آجائیں، وہاں رحمدلی، مروّت، نرمی اور بردباری، شرانگیزی کا تدارک نہیں کر سکتی، مفسدین نے اس سے بے جا فائدہ اٹھایا اور تمام دنیائے اسلام میں فتنہ پردازی، فتنہ سازی کا بازار گرم ہو گیا۔ اور ہر طرح کی افترا پردازیوں اور کذب بیانیوں سے حضرت عثمان غنیؓ کو بدنام کرنے کی کوشش کی گئی۔ چنانچہ حضرت عثمان غنیؓ کی شہادت کا واقعہ ایسے ہی شرانگیز فتنہ کا نتیجہ تھا۔

مختلف فتنوں کے بعد عبدالرحمٰن بن سرح جب عاملِ مصر بنا تو اہلِ مصر نے اس کی شکایت خلیفۃ المسلمینؓ کو لکھی۔ آپ نے عبدالرحمٰن بن ابی سرح کو تنبیہی خط لکھا۔ اس نے ذرا پروا نہ کی۔ حضرت عثمانؓ کے پاس پھر شکایات آئیں اور اس پر حضرت عثمان غنیؓ نے عبدالرحمٰن بن ابی سرح کی جگہ محمد بن ابوبکر کو عامل مصر مقرر فرمانے کا حکم نامہ لکھ دیا۔

اہالیانِ مصر اور دیگر احبابِ رسول اللہ جب محمد بن ابوبکر کے ساتھ مصر کی طرف روانہ ہوئے تو تیسری منزل پر پہنچنے پر ایک حبشی غلام بہت تیزی سے اونٹنی پر جاتا ہوا دکھائی دیا۔ بعض اصحاب نے اسے روک کر دریافتِ حال کیا۔ بڑی ردّوکد کے بعد اس کے پاس سے ایک نامہ برآمد ہوا جس کا مضمون یہ تھا۔

"جب محمد بن ابوبکرؓ اور دیگر اصحابؓ تیرے پاس آئیں تو ان کو کسی بہانے سے قتل کر دیا جائے اور نیز ان کے پاس سے جو فرمان ملے اسے غلط سمجھا جائے" (تاریخ اسلام حصہ دوم صفحہ ۴۸۲)۔[1]

یہ مضمون دیکھ کر سب کو بڑی حیرت ہوئی اور اسی جگہ سے واپس ہو گئے اور دارالخلافہ پہنچ کر اصحابِ کبارؓ کو جمع کیا اور ان کے سامنے خلیفۃ المسلمینؓ کا یہ نامہ پیش کیا، جس کو سنتے ہی سب صحابہ کرامؓ حضرت عثمانؓ سے برگشتہ ہوئے۔ حضرت علیؓ کو بلایا گیا۔ آپ نے حضرت عثمانؓ سے پوچھا کہ یہ غلام کس کا ہے اور یہ اونٹنی کس کی ہے۔ حضرت عثمانؓ نے فرمایا کہ یہ میری ہے لیکن یہ خط نہ میں نے لکھا، نہ کسی سے لکھوایا اور نہ مجھے اس کی کچھ خبر ہے۔ سوال وجواب میں یہ بات بھی ظاہر ہوئی کہ مہر حضرت عثمان غنیؓ کی تھی۔

(یہ مہر مروان کے پاس تھی جس نے یہ بہیمانہ حرکت کی تھی)۔ ظاہر ہے کہ یہ فتنہ تھا لیکن ایسے اسباب کے ساتھ جس نے معاملہ کو بہت طول دیا اور خطرناک بنا دیا۔ حضرت عثمان غنیؓ کا مکان گھیر لیا گیا۔ حضرت علیؓ نے حضرت امام حسنؑ کو ان کی حفاظت پر مامور کیا لیکن وہ کافی نہ تھا۔ حضرت عثمان غنیؓ نے یہ گوارا نہ کیا کہ فتنہ پردازوں کا مقابلہ کیا جائے اور مدینہ میں مسلمانوں کا خون بہے۔ اور بالآخر اس عاشقِ قرآن، اس جامع قرآنؓ کی شہادت عین

---

[1] تاریخِ اسلام مؤلفہ عبدالرحمٰن شوقی امرتسری (تیرھواں اڈیشن)

جمعہ کے دن اس حال میں ہوئی کہ آپؓ کے خون کا پہلا قطرہ
فَسَيَكْفِيكَهُمُ اللّٰهُ ۚ وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ۝ (سورۂ بقرہ: ۱۳۷)
(پس ان کے مقابلہ میں) تمہارا خدا کافی ہے وہ سننے والا جاننے والا ہے) پر گرا۔
حضرت عثمان غنیؓ نے جامِ شہادت نوش فرمایا۔ انہوںؓ نے شہادت گوارا فرمائی لیکن مسلمانوں کی خونریزی گوارا نہ کی۔

واضح ہو کہ

یہی وہ عثمانِ غنیؓ ہیں جنہوں نے ایک بار حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ آسمانوں اور زمین کی کنجیاں کیا ہیں، تو آپؐ نے فرمایا کہ عثمان تم سے پہلے کسی نے مجھ سے یہ نہ پوچھا۔ پھر وہ کلمات بتائے اور فرمایا کہ روز سو۱۰۰ بار ان کو پڑھتے رہنا۔ یقیناً حضرت عثمان غنیؓ کے ورد میں یہ کلمات شامل ہوں گے۔ لیکن انہوں نے ان سے خود اپنی ذات کے لئے کوئی فیض اس دنیا میں حاصل نہ کیا۔ ہاں تمام مخلوقِ خدا کے لئے ان کی کامیابی کے لئے فلاحِ دارین کے یہ وِرد چھوڑ گئے کہ اب جو جس چیز کے لئے ارادہ کرے اور اس کے لئے کوشاں ہو اس کو وہ ضرور ملے گی۔ جس نے دنیا چاہی اس کے لئے آخرت میں کچھ حصہ نہیں لیکن جس نے دنیا و آخرت دونوں چاہیں تو اس کے لئے دونوں جگہ سرفرازیاں ہیں اور جس نے حق کے لئے آخرت کو ترجیح دی، اس کے لئے شہادتِ عظمیٰ ہے۔

یہی وجہ ہے کہ حضرت عثمان غنیؓ کی خلافت کے بعد، دینِ اسلام کے اعلیٰ اصولوں کو جس نے جس حد تک اپنایا، اسی حد تک وہ کامیاب ہوا، اور حق کی راہ میں جان دینے والے زندگیٔ جاوداں سے سرفراز ہوئے۔ اور حق کا انکار کرنے والے فتنہ و فساد پھیلاتے رہے۔ خواہ کچھ دن دنیا میں عیش کی زندگی بسر کرلیں، لیکن بالآخر انہیں دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی عذابِ الٰہی

سے دو چار ہونا ہے۔

غرض اس عظیم شہادت کے ساتھ یہ مبلّغ علم وفضل، جامع القرآن، مجتہد الوقت فرض شناس، خوفِ خدا سے لرزاں اور گریاں، ادبِ رسولؐ کا شیدائی، اتباعِ سنت کا مجاہد، حیا کا نمونہ، تواضع کا مرقع، حسن سلوک کا مردِ میدان، سادگی کا پیکر، صبر و تحمّل کا مجسّمہ، جمعہ کے دن عصر کے وقت اپنے آقائے دوجہاںؐ کی بارگاہ میں حاضر ہوگیا۔ جس رات کی صبح آپؓ شہید ہوئے، آپؓ کو حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کی زیارت ہوئی۔ حضور صلّی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"اے عثمانؓ! کل تم میرے ساتھ افطار کروگے۔" چنانچہ اگلے دن آپ نے اپنے کسی ساتھی کو اپنے مخالفوں سے مقابلہ کی اجازت نہیں دی اور خود جامِ شہادت کو ترجیح دی۔ (شواھد نبوّت صفحہ ۲۷۵) دو دن تک آپ کی لاش بے گور و کفن پڑی رہی۔ باغیوں کی حکومت تھی۔ آخر چند خدا ترس اصحابؓ کی کوشش سے جنت البقیع میں مدفون ہوئے اور حرمِ رسولؐ اور بہی خواہانِ اسلام میں ایک تلاطم برپا ہوا۔

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ یُّقْتَلُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اَمْوَاتٌ ط
بَلْ اَحْیَآءٌ وَّلٰکِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ○ (البقرہ ۱۵۴)

(اور جو لوگ خدا کی راہ میں مارے جائیں ان کی نسبت یہ نہ کہنا کہ وہ مرے ہوئے ہیں۔ (وہ مردہ نہیں) بلکہ زندہ ہیں لیکن تم نہیں جانتے (تم اس کا شعور نہیں رکھتے۔ تمہارے حواس ظاہر اس کے ادراک سے قاصر ہیں))۔

حضرت عدیؓ بن حاتم طائی کا بیان ہے کہ جس دن عثمانؓ شہید ہوئے میں نے ہاتف کو یہ کہتے سنا۔ "ابن عفانؓ کو راحت و آسائش کی نوید دے دو۔ وہؓ بے غصہ و غضب شہید ہوئے۔ انہیںؓ بخشش و مغفرت اور باغِ رضوان کی بشارت دے دو۔" جب میں نے دوبارہ دیکھا تو کوئی شخص موجود

نہ تھا۔ (شواھد نبوت صفحہ ۲۷۶)

غرض

حضرت عثمانِ غنیؓ وہ ہستی ہیں جن کی شہادت کی بشارت حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلّم نے خود دی۔ حضورؐ کی اس بشارت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ حضرت عثمان غنیؓ اکثر روزے سے ہوتے تھے جس کا علم عوام کو نہ ہوتا چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم نے انہیں افطار کی دعوت دی

اور

یہ حقیقت بھی واضح ہوگئی کہ "مقامِ ارادہ" پر متمکّن خلیفۂ وقت کس حد تک ارادۂ نبویؐ کا پابند ہوتا ہے۔

عوام وخواص

دونوں کے لئے یہ "مقام ارادہ" بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ انسان صرف ارادہ کا مکلف ہے۔ نتائج تو اللہ کی مشیت کے تحت مرتّب ہوتے ہیں۔ نظر ارادہ پر رہے تو فلاح ورحمت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوٹتا یعنی اُخروی کامیابی بہرصورت حاصل ہوتی ہے۔

○

اصحاب ثلاثہؓ کی کرامتوں سے ایک کرامت یہ بھی ہے کہ حضرت ابوذر غفاریؓ حضرت عثمانؓ کا ذکرِ خیر کر رہے تھے اور کہتے تھے کہ میں حضرت عثمانِ غنی رضی اللہ عنہ کو بکلمۂ خیر ہی یاد کروں گا اور اس سلسلہ میں حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلّم کا وہ واقعہ بیان فرماتے جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سنگریزے زمین سے اُٹھا کر اُن پر تسبیح پڑھتے اور زمین پر سنگریزے رکھ کر خاموش ہو جاتے۔ آپؐ نے تین بار یکے بعد دیگرے یہ عمل فرمایا، ایک بار

صدیقِ اکبرؓ کے ہاتھ پر اور پھر سنگریزے زمین پر رکھ دیئے اور خاموش ہو گئے۔ دوسری بار عمرِ فاروقؓ کے ہاتھ پر رکھ کر اور تیسری بار عثمانِ غنیؓ کے ہاتھ پر رکھ کر تسبیح فرمائی اور خاموش ہو گئے۔ (شواھد نبوت صفحہ ۲۷۷)
کیا یہ ترتیب خود خلفائے ثلاثہؓ کی ترتیب اور ادوار پر شاھد نہیں ؟۔

دورِ سیدنا علی مرتضےٰ کرم اللہ وجہہ

(۳۵ھ تا ۴۰ھ (تین ماہ کم پانچ سال) عمر ۶۳ سال)

مقامِ قدرت (و شجاعت)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ مبارکہ نبوت و رسالت اور ولایت کا سنگم تھی۔ وہ نبوت و رسالت جو اس طرح جمکی کہ تمام انبیاءؑ کی رسالتیں اس میں ضم ہو گئیں۔ اور ولایت جو اس طرح ظاہر و جاری ہے کہ تا قیامت جو بھی اللہ کا بندہ، اللہ والا، اللہ کا ولی بن کر، اللہ کی، سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی توجہ سے، نورِ مبینؐ کی قدرتِ کاملہ کی جھلکیاں عام کرنے کا موجب ہو گا، وہ اسی نبی کریمؐ کے رفیقِ غارؓ یا سیدنا علی مرتضےٰ کرم اللہ وجہہ کے فیضان سے سرفرازی پا کر ہی یہ خدمات انجام دے سکے گا۔ یہ بات اس لئے ہے کہ رفیقؓ کو اہلِ بیتؑ کے مرتبہ میں جگہ ملے۔ اور اس لئے بھی کہ جب تک جامِ ہدایت سیدنا علی کرم اللہ وجہہ کے دستِ مبارک تک نہ پہنچے، کوئی قلبِ مضطر اس سے محروم نہ رہے صحابہ کرامؓ کا دور عمومیت کے ساتھ عرفانِ باری تعالیٰ کا دور ہے۔ اور ان بزرگ ہستیوں کا دور ہے جو براہِ راست سرچشمۂ نورِ نبوت و ولایت سے سرفرازی پائے ہوئے تھے۔ البتہ سلمان فارسی یا عمر فاروقؓ ہونا ہر ایک کا نصیبہ نہیں ہوتا۔
اللہ تعالیٰ کے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم تو اپنے رب کی صفاتِ جلال و

جمال کے مظہر تھے ہی۔ لیکن اپنے وصال کے بعد بھی آپؐ نے اپنے اہل بیتؓ اور صحابہ کرامؓ میں وہ ہستیاں چھوڑیں جو آپؐ کے فیضانِ نبوت و ولایت پر شاھد، اور آپؐ کی ہر ہر ادا کی ترجمان ہیں۔

حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کی معیت میں صدیقِ اکبرؓ نے "مقامِ حبیات مُوتُوا قَبْلَ اَنْ تَمُوتُوا" کی ترجمانی فرمائی۔ عمر فاروقؓ "علمِ تفصیلی" کا مرقع ہے جو موجب عدل بنا۔ سیدنا عثمان غنیؓ "ارادہ" کے نازک مقام کی تفسیر قرار پائے۔ اور اب وقت آگیا تھا کہ فیضانِ نبوت کا چوتھا اہم جزو،

یعنی قدرت کا

ایک مرقع کائنات کو عطا ہو۔ جس کی قدرت اپنی قدرت نہیں بلکہ اپنے رب کی عطائے خاص ہو۔ جس کے اعمال کسی کے فیضانِ نظر سے حسنِ اعمال کا نمونہ بن گئے ہوں۔ جس کی فکر کسی کی محبت و قربِ خاص کی بدولت علم و عرفان کے سانچے میں ڈھل گئی ہو۔

دراصل ہم قدرت کے تحت

صرف فتوحات دیکھنا چاہتے ہیں۔ لیکن قدرت کا سب سے اعلیٰ مظہر خود نفس کو ہر حال میں قابو میں رکھنا ہے۔ شیرِ خدا، حیدرِ کرّار وہی ہوتا ہے جو کفار کے لئے واقعی شیر ہو اور جس کی تلوار انہیں واصلِ جہنّم کرنے کے لئے کافی ہو۔ لیکن یہ صاحبِ قدرت اللہ کا بندہ، جب مقامِ ولایت پر فائز ہوتا ہے تو اس کی نظر اپنی ذات، اپنے قلب، اپنے نفس پر ہر لحہ رہتی ہے۔ اور وہؓ اسی تربیت کے لئے مامور ہوتا ہے کہ لوگوں کو ضبطِ نفس، تحمل، صبر و استقلال کی تعلیمات کے ساتھ حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کی مدنی زندگی کی طرف لے جائے جہاں یہی اجزاء شجاعت، عدالت، سخاوت، فراست بن کر چمکیں، محراب میں بھی اور میدان میں بھی۔ قدرت کا یہی انداز جو شانِ انبیاء کرامؑ لئے

ہوئے ہے، اب شانِ بوترابی رضؓ کا ترجمان ہے۔

آئیے سیدنا علی کرم اللہ وجہہ، کی

حیاتِ طیبہ پہ ایک اجمالی نظر ڈالتے ہوئے خلافت راشدہ کے اس آخری پاسبان کی ان صفات سے کچھ تازگئی ایمان حاصل کریں جو میدانِ کارزار سے لے کر گھریلو زندگی تک یکساں نمایاں رہیں، جنہوں نے کبھی کسی حال میں باطل کے کسی جزو سے مصالحت نہ کی۔ جو کامیابی اور ناکامیابی دونوں حالتوں میں ایک ہی اندازِ حق میں ظاہر ہوتی رہیں۔

اجمالی زندگی۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ، نجیب الطرفین ہاشمی، حضرت ابوطالبؑ کے فرزند اور حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کے حقیقی چچا زاد بھائی ہیں۔ ابتداً میں حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم نے اپنے ذی اثر اور بزرگ چچا کی آغوشِ محبت میں پرورش پائی تھی اور حضرت علیؓ کو حضورؐ کا قرب نصیب ہوا۔ پھر چچا کی وفات کے بعد حضرت علیؓ حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم ہی کے کاشانۂ انور میں حضورؐ ہی کے ساتھ اپنے لمحات زندگی کو منوّر بناتے رہے۔ اور حضور انورؐ کے ساتھ ہر وقت رہے اور اکثر سفر اور حضر میں بھی پہلے خاموش چھپ کر عبادتوں میں بھی، پھر مساجد میں بھی، راتوں کو تہجّد گذاری میں اور صبح کی خلوتِ خاص میں۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ، حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کی بعثت سے دس سال پہلے پیدا ہوئے۔ یعنی کم عمری سے لے کر کاشانۂ خدیجہؓ میں حضور صلّی اللہ علیہ وسلم کے لیل و نہار، لوگوں سے مناظرے، حق و باطل کی معرکہ آرائیاں دیکھنے کا موقع ملا۔

بچّوں میں سب سے پہلے مشرف بہ اسلام ہوئے۔ وقت آیا تو تبلیغی مراحل میں حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کا ساتھ دیتے رہے۔ دعوت کا انتظام اہلِ قریش کی لالعینی باتیں۔ پھر خود کو خدمت کے لئے پیش کرنے کی توفیق سے سرفراز ہوئے

ہجرت کا وقت آیا تو ۲۲ یا ۲۳ سال کی عمر میں جذبہ فدائیت سے سرشار تھے۔ پھر میدانِ جنگ میں شیرِ خدا بن کر اپنی اس فدائیت کے جوہر دکھلائے اور وقتِ آزمائش ایک رات بسترِ رسول ؐ پر خوابِ راحت میں گذاری اور صبح دشمنانِ اسلام کو متحیر چھوڑ کر امانتوں کو ادا کرتے ہوئے، قدم بوسیٔ رسول ؐ کے لئے پا پیادہ روانہ ہو گئے۔ پہلے مسجدِ قبا کی تعمیر میں حصّہ لیا پھر تعمیرِ حرم نبوی میں، اور پھر سفر و غزوات میں، بالخصوص بدر میں اپنی تیغِ باطل شکن کے جوہر دکھائے۔

اللہ کا کرم تھا اور علی کرم اللہ وجہہٗ کی خوش نصیبی

کہ حضور ؐ کی آنکھوں کی ٹھنڈک، خاتونِ جنت، حضرت فاطمہ زہرا ؓ سے عقدِ نکاح کی سعادت ملی۔ یہ وہ سعادت تھی جس کے فیوض و برکات ہمیشہ جاری رہیں گے۔

وہ معرکے جو حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں ہوئے اُن میں حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کی شجاعت کے نمونے گذشتہ اوراق میں گذر چکے ہیں۔ خندق کی لڑائی ہو یا خیبر کی۔ ایک جگہ عمر بن عبدِ وُدّ کو تو دوسرے موقع میں مرحب کو تلوار کے گھاٹ اتارا۔ غزوۂ حنین میں جہاں ہزارہا نفوس میں صرف چند ہی ثابت قدم رہ گئے تھے، ان میں حضرت علی ؓ عزم و استقلال کا پیکر بنے کھڑے رہے، اور اللہ کے کرم اور اپنی ثابت قدمی سے ہاری ہوئی بازی کو جیت لیا۔

غرض غزوات میں شجاعت، جوانمردی، عزم، ہمت، استقلال، ان کا اندازِ خصوصی تھا۔ اور اس شجاعت کے نمونے حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں دنیا نے دیکھے۔

لیکن

اب خلافت کی ذمہ داریاں سنبھالتے وقت جس قدرت کے اظہار کا وقت تھا وہ اس سے بالکل مختلف تھی جو دورِ نبوت میں تھی۔ یہاں مقابلہ کفار سے نہیں بلکہ مسلمانوں سے تھا۔ ایک موقع پر خود ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ میدان میں تشریف لے آئیں۔ یہاں کسی شجاعت یا سلطنت کے لئے تلوار چلانا نہیں بلکہ حق کے لئے شمشیر کو نیام سے باہر لانا تھا۔ اور پھر ہر موقع پر یہ خیال رکھنا تھا کہ بال برابر ان حدود سے تجاوز نہ کرے جس کی اجازت شارعؑ نے نہ دی ہو۔

قدرت کے اس مقام پر حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ

کو سمجھنے کے لئے یہ جاننا ضروری ہے کہ اس قدرت کے لوازمات کیا ہیں اور سیدنا علی مرتضےٰؓ کس عظیم حد تک ان سے مزیّن تھے۔

عناصرِ قدرت۔ ۱۔ اول علم۔ علم ہی حیات کے بعد اللہ رب العزت کی اہم صفت ہے۔ یہ ایک نور ہے جو ظاہر و باطن کو منوّر کرتا ہے۔ حقائق دکھاتا ہے۔ حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدنا علی مرتضےٰؓ کے لئے ایک موقع پر فرمایا تھا مَنْ کُنْتُ مَوْلَاہُ فَعَلِیٌّ مَوْلَاہُ۔ (ترمذی شریف)

جس کا میں مولا ہوں اس کے علیؓ مولا ہیں۔ یہ بھی واضح ہو کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے جو قرب حضرت علی مرتضےٰؓ کو حاصل تھا، اس تقرب اور اختصاص کی بنا پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے علیؓ کو خود قرآن مجید کی تعلیم دی، آیات کی تفسیر ان سے فرمائی اور جناب علیؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے زمانہ میں قرآن حفظ فرما لیا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے آپؓ کے متعلق فرمایا۔ "اَنَا مَدِیْنَۃُ الْعِلْمِ وَعَلِیٌّ بَابُھَا" میں مدینۃ العلم ہوں اور علیؓ اس کے دروازہ ہیں۔ یہ آخری خلیفہؓ ہیں۔ اب بارگاہِ نبوت میں داخلہ اسی دروازہ سے مل سکتا ہے۔ حضرت عمرؓ نے اپنے دور میں اعتراف فرمایا کہ "اگر علیؓ نہ ہوتے

توعمرؓ ہلاک ہوجاتا۔" دراصل یہ وہ اندازِ اعترافِ محبت و مودّت ہے جو اعلیٰ ظرف ہستیوں میں آج بھی رائج ہے۔

ایک موقع پر جب حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ کو یمن جانے کا حکم دیا تو آپ نے فرمایا کہ اے رسولؐ اللہ! میں ایسی قوم کی طرف بھیجا جا رہا ہوں جس میں مجھ سے زیادہ معمّر اور تجربہ کار لوگ موجود ہیں۔ ان لوگوں کے جھگڑوں کا فیصلہ کرنا میرے لئے دشوار ہوگا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے سینے پر دستِ مبارک رکھا اور دعا فرمائی۔ "اے خدا! اس کی زبان کو راست گو بنادے اور اس کے دل کو ہدایت کے نور سے منوّر کر۔" اور خود دستِ اقدس سے ان کے سر پر عمامہ باندھا۔ یہ وہ دستارِ فضیلت تھی جو علم، ہدایت، صداقت کی ضامن رہی۔

۲۔ علم کے بعد زہد و تقویٰ آتا ہے۔ یعنی نفس کی چالوں سے ہوشیار رہنا اور ثابت قدمی کے ساتھ راہِ حق پر گامزن رہنا۔ سیدنا علی کرم اللہ وجہہٗ کے زہد و تقویٰ اور محاسنِ اخلاق کا کیا بیان ہو کہ جس نے اپنے قاتل کے متعلق بھی سیدنا امام حسنؑ کو ہدایت فرمائی کہ معمولی طور پر قصاص لینا۔ دراصل سیدنا علی کرم اللہ وجہہٗ کے پیشِ نظر وہ قدریں تھیں جن کی بقا ہی فروغِ اسلام کی ضامن ہو سکتی ہے۔ اور اس کی بنیاد ایمان ہے۔ خلافت کی ذمّہ داریاں ملوکیت سے بالکل مختلف ہوتی ہیں۔ چنانچہ سیدنا علی کرم اللہ وجہہٗ کے تمام فیصلوں میں اہمیت اسی اصول کو حاصل تھی کہ ہمیشہ حق و باطل کے فرق کو ملحوظ رکھا جائے۔ اور خود نفس پر زہد و تقویٰ کی حکمرانی ہو اور دنیاوی مصلحتوں کو وجہِ فیصلہ نہ بنایا جائے۔

جس کے فقر و فاقہ کا یہ حال ہو کہ سیدۃ النساءؓ جو جہیز لے کر آئی تھیں یعنی ایک پلنگ، ایک بستر، ایک چادر، دو چکیاں، ایک مشکیزہ، وہی علی مرتضیٰؓ کے گھر کا سرمایہ رہا۔ اور اس میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے اپنی زندگی میں

کچھ اضافہ نہ فرمایا۔ یہی اندازِ فقر خلافت کے وقت قائم رہا۔

اب سیدنا علی کرم اللہ وجہہ،

کے دورِ خلافت پر نظر ڈالئے۔ انہوں نے خلافت کے بارِ گراں سے انکار کیا۔ لیکن مہاجرین اور انصار کے اصرار پر منظور کرنا پڑا اور ۱۲ ذی الحجہ ۳۶ھ دوشنبہ کے دن مسجدِ نبوی میں بیعت کی گئی۔ حالت یہ تھی کہ سیدنا عثمان غنی رضؓ کی شہادت کے باعث ہر جانب سے قاتلوں کو پکڑنے اور ان کو سزا دینے کا مطالبہ تھا۔ اصل قاتلوں کا فوراً پتہ لگانا آسان نہ تھا۔ جن لوگوں کو سیدنا عثمان غنی رضؓ نے گورنر مقرر کیا تھا، ان کی بداعمالیوں سے لوگ نالاں تھے اور ملک میں ہر طرف مخالفانہ سازشیں پھیل رہی تھیں۔ حضرت عثمان غنی رضؓ کا مقتول ہونا مفسدین کے لئے شورش اور فسادات پھیلانے میں معاون ہوا[ے]

اب سیدنا علی کرم اللہ وجہہ، کے پیشِ نظر اس کے علاوہ کوئی صورت نہ تھی کہ ان سب گورنروں کو معزول کر کے دوسرے عمال مقرر کئے جائیں۔ مصلحت کا تقاضہ تھا کہ صلح جوئی سے کام لیا جائے۔ لیکن راہِ حق میں دنیاوی مصلحتوں کو رکاوٹیں کھڑی کرنے کی اجازت آپ رضؓ کے ضمیر نے نہ دی چنانچہ آپ نے تمام عمالِ عثمانی کو معزولی کا فرمان جاری کر دیا۔

یہی وہ نازک مقام ہے جہاں مؤرخین اور سیرت نگاروں کو اختلاف کا موقع ملا۔ اور یہی وہ نازک گھڑی ہے جہاں ہر دنیاوی مصلحت سے قطع نظر

ے قصاص کی صدائیں تو بلند ہوئیں مگر کسی شرعی وارث نے عدالت میں دعوئے قصاص نہیں کیا۔ یہ ایک اہم نکتہ ہے جس کو نظرانداز کر دیا جاتا ہے۔ اور خلیفۂ راشد رضؓ اپنے اقتدار کو مضبوط بنانے کے بعد ہی قصاص کی طرف خود متوجہ ہوئے۔ (محترم کشفی صاحب)

کرکے حکمِ الٰہی کے پیشِ نظر فیصلہ کی ساعت "مقامِ قدرت" کا تقاضا تھی۔ اور اب حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو بھی ان نازک حالات سے گذرنا پڑا جس سے سیدنا عثمان غنی رضی "مقامِ ارادہ" میں گذرے تھے۔ سیدنا علی مرتضیٰ رضی کا فیصلہ صحیح تھا یا غلط، اس کا معیار اگر یہ قرار دیا جائے کہ خلافت اور سلطنت کے فرق کو نظر انداز کر دیا جائے، لوگوں کی ہمدردیاں خریدی جائیں، اقدارِ ریاستِ اسلامی کو نظر انداز کیا جائے، بیت المال سے مال کی تقسیم سیاست کے تحت ہو اور گورنروں سے باز پرس نہ ہو، تو یقیناً سیدنا علی کرم اللہ وجہہ سے اس کی امید بے کار ہے۔ وہ تو ایک ایک درہم کا حساب لینے والے، اقدارِ اسلامی کے لئے جان قربان کرنے والے تھے نہ کہ حکومت و اقتدار کے لئے ان کی پامالی برداشت کرنے والے۔

پھر فیصلہ کون کرے

زمانہ تو یہی فیصلہ دے گا کہ امیر معاویہ رضی کو اپنی حکمتِ عملی میں ہر جانب کامیابی ہوئی، یہاں تک کہ وہ ام المومنین سیدنا عائشہ صدیقہ رضی کو بھی میدانِ جنگ میں لے آئے۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ سیدنا علی کرم اللہ وجہہ کے حق میں تھا یا مخالف۔

ہمیں واقعات کے اعادہ کی ضرورت نہیں

صرف چند حقائق کا بیان ضروری ہے کہ ہمارے پیشِ نظر نورِ مبین صلی اللہ علیہ وسلم کی تجلیات کا انکشاف ہے۔ ہمیں اس

قدرتِ خفی و جلی کے مظہر

کی حقانیت کو روشن کرنا ہے جو لوگوں کو ان کی بداعمالیوں سے ڈرانے اور ہوا و ہوس پرستی سے باز رکھنے کے لئے اس آخری دورِ خلافت میں بھی پیشِ نظر رہیں۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کا قول تھا کہ
"بغاوت مثل آگ کے ہے۔ ابتداء میں جلد سرد ہو جاتی ہے لیکن زیادہ عرصہ تک رہنے سے زیادہ قوت سے جلاتی ہے۔"

○

یمن میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ کو 'جعلی' کی جگہ گورنر مقرر کیا گیا تھا۔ 'جعلی' نے اپنا علاقہ جلدی سے عبداللہ بن عباس کے حوالہ کر دیا اور کل خزانہ لے کر مکّہ آیا کہ اس سے فسادات پھیلانے میں مدد ملے۔ اور اس نے حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ کو برانگیختہ کیا اور بغاوت کی تیاریاں ہونے لگیں۔ یہ واقعہ خود اس حقیقت پر شاہد ہے کہ عمّال کے پیشِ نظر اپنا جاہ و وقار، اور اس کے لئے ہر سازش کو روا رکھنا تھا۔ "قدرت ہوتے ہوئے" "نیک نیتی" کا یہ تقاضا نہیں ہو سکتا کہ ان سے چشم پوشی کی جائے۔

سہلؓ ابن حنیف کو حضرت علیؓ نے شام کا گورنر مقرر فرمایا تھا۔ یہاں امیر معاویہ کا تسلط تھا۔ سہل تبوک کے قریب پہنچے تو امیر معاویہؓ کے سواروں نے ان کو مدینہ واپس جانے پر مجبور کر دیا۔ حضرت علیؓ نے امیر معاویہؓ کو لکھا کہ مہاجرین اور انصار نے اتفاقِ عام کے ساتھ میرے ہاتھ پر بیعت کر لی ہے اس لئے وہ بھی حضرت علیؓ کی اطاعت کریں یا جنگ کے لئے تیار ہو جائیں۔ امیر معاویہؓ نے اپنے خاص قاصد کے معرفت جواب لکھا جس خط میں صرف بسم اللہ، مکتوب الیہ کا نام اور ان کا نام تھا، جس کی غرض نہ صرف انکارِ بیعت تھا بلکہ خلیفہ کی توہین۔ ساتھ ہی قاصد نے یہ خط دے کر یہ بھی کہا کہ میں نے شام میں پچاس ہزار شیوخ کو اس حالت میں چھوڑا ہے کہ عثمانؓ کی خون آلود قمیص پر ان کی داڑھیاں آنسوؤں سے تر ہیں۔

منشاء یہ تھا کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ، کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ، کے قتل میں شریک کریں اور اس طرح ان رضؓ کو حقِ خلافت سے دُور رکھیں۔

(تذکرۃ الکرام صفحہ ۲۵۸)

ابھی امیر معاویہ رضؓ سے یہ جھگڑا چل رہا تھا کہ امّ المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضؓ کو حضرت طلحہ رضؓ اور حضرت زبیر رضؓ نے مدینہ کے حال سے آگاہ کیا اور حضرت عثمان رضؓ کے خون کا قصاص لینے کی دعوت دی۔

ادھر حضرت علی رضؓ نے ایک بڑی فوج کے ساتھ بصرہ کا رُخ کیا۔ حضرت امام حسن رضؓ کے ساتھ جو فوج کوفہ کو روانہ ہوئی تھی وہ بھی مقام "ذی قار" میں امیر المومنین رضؓ کی فوج سے مل گئی۔ اب فوج کی نئی ترتیب کے ساتھ حضرت علی رضؓ بصرہ کی طرف روانہ ہوئے۔ دراصل حضرت علی رضؓ اور حضرت عائشہ صدیقہ رضؓ دونوں کی خواہش تھی کہ جنگ نہ ہو۔ صلح کی گفتگو ہو رہی تھی اور جنگ کے احتمال دور ہونے لگے تھے کہ مفسدین نے اس صلح کو پسند نہ کیا اور وہ یہی سمجھے کہ اگر صلح ہو گئی تو ان کی خیر نہیں۔ چنانچہ انہوں نے حضرت عائشہ صدیقہ رضؓ کی فوج پر شب خون مارا اور جنگ چھڑ گئی۔ ام المومنین رضؓ اونٹ پر ایک آہنی ہودہ رکھوا کر سوار ہوئیں اور صحابہ کرام رضؓ ان کے گرد تھے۔ محمد بن طلحہ رضؓ سواروں کے افسر اور عبداللہ بن زبیر رضؓ پیادہ فوج کی سربراہی کر رہے تھے۔

یہاں صرف دو واقعات کا ذکر ضروری ہے

۱۔ ایک تو وہ جب باغی لوگ حضرت عائشہ صدیقہ رضؓ، طلحہ رضؓ، اور زبیر رضؓ کو لے کر مکّے کے دروازہ سے نکل رہے تھے۔ امّ المومنین رضؓ اونٹ پر سوار تھیں۔ چھ سو مشاہیر اونٹ پر اور چھ ہزار پیادے ساتھ تھے۔ جب یہ لوگ ایک موضع پر پہنچے تو وہاں بہت سے کتّے جمع ہو کر بھونکنے لگے۔ آپ رضؓ کو سخت تردّد ہوا اور موضع کا نام دریافت کیا۔ لوگوں نے بتایا کہ اس موضع کا نام "حوّاب" ہے۔ یہ

سن کر ام المومنینؓ بہت گھبرائیں اور فرمایا "حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ میری ایک بی بی پر "حوّاب" کے کتے بھونکیں گے جبکہ وہ بر سرِ ناحق ہو گی"۔ باغیوں نے آپؓ کو دھوکہ دیا اور یہ یقین دلایا کہ یہ جگہ "موضع حوّاب" نہیں۔

(اقتباس از تذکرۃ الکرام، تاریخ خلفاء عرب واسلام صفحہ ۲۴۳ تا ۲۴۹
(النبی والاسلام، صفحہ ۵۷۶)

۲۔ دوسرا واقعہ وہ ہے کہ جوش وخروش کے ساتھ فریقین جنگ کے لئے آمادہ تھے۔ اس اثناء میں حضرت علیؓ گھوڑا بڑھا کر میدانِ جنگ میں آ گئے اور حضرت زبیرؓ کو بلایا اور کہا۔ "ابو عبد اللہ! تمہیں وہ دن یاد ہے کہ جب رسول اللہؐ نے تم سے پوچھا تھا کہ کیا تم علیؓ کو دوست رکھتے ہو؟ تم نے عرض کیا تھا "ہاں، یا رسول اللہؐ"۔ یاد کرو اس وقت تم سے حضورؐ نے فرمایا تھا کہ ایک دن تم ان سے ناحق لڑو گے"۔ حضرت زبیرؓ نے جواب دیا۔ "ہاں۔ اب مجھے یاد آ گیا"
(خلفاء راشدین، جنگِ جمل، صفحہ ۲۴۵)

چنانچہ وہ جنگ سے اس لئے الگ ہو گئے کہ انہوں نے جان لیا کہ وہ حق پر نہیں ہیں۔

○

اس جنگ کے نتائج سے قطع نظر کر کے صرف یہ دو واقعے اس حقیقت کی وضاحت میں پیش کرنا کافی ہیں کہ خلیفۂ چہارم سیدنا علی مرتضٰیؓ کو جس "مقامِ قدرت" پر فائز فرمایا گیا تھا اس کا مقصد کیا تھا۔ یہی کہ انسان اپنے "علم اور ارادہ" کو اللہ کے لئے نتائج سے بے نیاز ہو کر صرف کرے۔ واضح ہو کہ جس طرح سیدنا عثمانؓ نے اعمالِ انسانی میں "نیت اور ارادہ" کا مقام ظاہر فرمایا تھا، اسی طرح سیدنا علی مرتضٰیؓ اب "مقامِ قدرت" کو واضح فرما رہے ہیں، اور اس

طرح کہ ام المومنین رض کی عزت و احترام میں فرق نہ آنے پائے۔

جب ام المومنین رض کا اونٹ ٹانگ زخمی ہونے سے بلبلاتا ہوا بیٹھ گیا تو حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے پہلے حضرت عائشہ صدیقہ رض کے بھائی محمد بن ابی بکر کو ام المومنین رض کی خبر گیری کے لئے روانہ فرمایا۔ پھر امیر المومنین رض نے خود حاضر خدمت ہو کر مزاج پرسی کی اور بصرہ میں چند دن آرام کے بعد ام المومنین حضرت صدیقہ رض کو محمد بن ابی بکر کے ہمراہ عزت و احترام کے ساتھ مدینہ روانہ فرمایا۔ بصرہ کی چالیس شریف معزز خواتین جلوس میں تھیں اور حضرت علی رض رخصت کرنے کے لئے چند میل تک خود ساتھ گئے۔ (خلفاء راشدین صفحہ ۲۴۷)

ام المومنین رض نے رخصت ہوتے وقت فرمایا۔

"میرے بچو! ہماری باہمی کشمکش غلط فہمی کا نتیجہ تھی۔ اور نہ مجھ سے علی رض سے پہلے سے کوئی جھگڑا تھا نہ اب ہے۔" حضرت علی رض نے موزوں الفاظ میں تصدیق کی اور فرمایا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حرم محترم ہماری مائیں ہیں۔ ان کی تعظیم و توقیر ضروری ہے۔ (خلفائے راشدین صفحہ ۲۴۷)

اس کے بعد حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے جنگ میں حصہ نہ لیا۔

○

اسی "مقام قدرت" کا ایک منظر جنگِ صفین ۳۷ھ میں ملاحظہ ہو۔ جہاں رب العزت کو انسانیت کو سمجھانا منظور ہے کہ انسان یہ نہ بھول جائے کہ اصل قدرت کا مالک وہی قادرِ مطلق ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ ہی کی قدرت و حکمت کو نمایاں فرمایا اور ان کے خلیفہ اپنے آقا سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی عملی اور اخلاقی زندگی کا نمونہ بن کر ان حقائق کا عرفان عام کریں۔ 'قدرت' کا صحیح صرف یہی ہے کہ انسان ترجمانِ حق بنے۔ اس کی عطا کردہ

قدرت کا صحیح صرف سمجھے تاکہ اللہ کی قدرت اس کی نگران حال بن جائے۔
صفین کی جنگ میں جب حضرت علیؓ کی فوج حضرت امیر معاویہؓ کے لشکر کے مقابلہ کے لئے فرات کے کنارے سرحدِ شام میں داخل ہوئی تو امیر معاویہؓ نے یہ سمجھ کر کہ مقابلہ مشکل ہوگا صفین کے میدان کو مدافعت کے لئے منتخب کیا، اور پانی کے گھاٹ پر قبضہ کر لیا اور ایک بڑی جماعت کو ابوالاعور سلمی کے زیرِ نگرانی تعین کیا کہ دریائے فرات سے علیؓ کی فوج پانی نہ لے سکے، اس کی ہر طرح مزاحمت کی جائے۔ یہ تصویر کا ایک رُخ ہے جہاں سلطنت و ذاتی اقتدار وحصول کے لئے معرکہ آرائی ہے۔ دوسری طرف جب علیؓ کے لشکر کے لوگ پانی کی طرف بڑھے تو ان پر تیروں کی بارش کی گئی۔ اس پیشقدمی کے نتیجہ میں علیؓ کی فوج نے پوری قوت سے حملہ کیا سخت جنگ ہوئی لیکن پیاسے پانی کے پاس پہنچ گئے۔ امیر معاویہؓ کی فوج کے پاؤں اکھڑ گئے اور گھاٹ سے ان کا قابو اٹھ گیا۔ اب پانی کی ضرورت امیر معاویہؓ کی فوج کو پیش آئی تو حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کی حمیتِ اسلامی نے یہ گوارا نہ کیا کہ انہیں پانی سے روکا جائے۔ چنانچہ آپ نے حضرت معاویہؓ کی فوج کو پانی سے استفادہ کا پورا پورا موقع دیا۔ اب ایک ہی دریا سے دونوں فوجیں سیراب ہو رہی ہیں۔ یہ ہے اندازِ خلافت۔ یہ ہے وہ قدرت جس کی عطا انسانیت کے لئے باعثِ ناز ہے اور اس پر کاربند رہنے کا حکم ہے۔
اس اندازِ کریمانہ کے نتیجہ میں دونوں فوجیں قریب آئیں۔ لوگوں کو موقع ملا کہ درمیان میں صلح صفائی کرا سکیں اور جنگ تین ماہ بند رہی۔ بالآخر خوں ریز لڑائیاں شروع ہوئیں۔ ہزاروں عورتیں بیوہ ہوئیں، ہزاروں بچے یتیم ہوئے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کا دل بھر آیا۔ اعوان اور انصار کے سامنے پُر جوش تقریر کی کہ آخر یہ کیوں اور کیا ہو رہا ہے۔ ایک فیصلہ کن جنگ ہوئی حیدرِ کرارؓ

کی فوج نے صفیں درہم برہم کر دیں اور امیر معاویہؓ کے خیمہ تک پہنچ گئے اور فرمایا۔ اے معاویہؓ! خلقِ خدا کا خون کیوں گرا رہے ہو۔ تم خود مقابلہ میں آجاؤ اور ہمارا تمہارا فیصلہ اللہ تعالیٰ کر دے گا۔ جو کامیاب ہو گا وہی حاکم ہو گا حضرت معاویہؓ نے ہنس کر ٹال دیا اور جنگ جاری رہی۔ حضرت علیؓ کی فوج کو برتری حاصل ہوئی۔ آخر حکومت اور اقتدار کی بقاء کے لئے شامی فوج نے ایک اور چال چلی۔

"دوسری صبح شامی فوج ایک عجیب منظر کے ساتھ میدانِ جنگ میں آئی۔ آگے آگے دمشق کے مصحفِ اعظم کو پانچ نیزوں پہ باندھا ہوا تھا۔ اس کو پانچ آدمی بلند کئے ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ جس کے پاس جو قرآن پاک کا نسخہ تھا وہ لے کر شامی فوج کے سردار یہ کہتے آگے بڑھے" اے اہلِ عراق۔ یہ کتاب اللہ ہمارے اور تمہارے درمیان فیصلہ کرے گی" غرض یہ مکاری کام آئی۔ جنگ بند ہو گئی اور دونوں طرف حکم مقرر کئے جانے کا فیصلہ ہوا۔ آخر ردّوکد کے بعد اور صلحِ حدیبیہ کے انداز سے ایک دستاویز تیار ہوئی کہ عمرو بن العاصؓ حضرت معاویہؓ کی طرف سے اور ابوموسیٰ اشعریؓ حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کی جانب سے حکم مقرر ہوئے اور طے پایا کہ قرآن و سنت کی روشنی میں ان کا فیصلہ کیا جائے۔ یہ بھی طے ہوا کہ ان دونوں حکم کے لئے نہایت ضروری ہے کہ قرآن اور سنتِ نبوی کو نصب العین بنائیں اور کسی حالت میں اس سے انحراف نہ کریں۔

عمرو بن العاص نے اپنی ذکاوت اور سیاست سے کام لیا۔ وہ جانتے تھے کہ موسیٰ بن اشعریؓ ہرگز ان کے ہم خیال نہ ہوں گے۔ چنانچہ فیصلہ اس انداز پر ہوا کہ "دونوں خلافت سے دستبردار ہو جائیں اور انتخاب کیا جائے" لیکن عمرو بن العاص نے اپنی تدبیر سے کام لیتے ہوئے ابوموسیٰ اشعریؓ کو اپنا فیصلہ سنانے پر مجبور کیا کہ آپ بزرگ ہیں، میں پیش قدمی کیسے کر سکتا ہوں۔

چنانچہ انہوںؓ نے اپنا جو فیصلہ ہوا تھا پڑھ دیا۔ اب عمرو بن العاصؓ کھڑے ہوئے اور کہا کہ میں ابوموسیٰ اشعریؓ کے اس فیصلہ سے اتفاق کرتا ہوں کہ حضرت علیؓ معزول کئے جائیں لیکن امیر معاویہؓ کو خلیفہ مقرر کرتا ہوں۔

اس پر پھر ہنگامہ کھڑا ہوا۔ ابوموسیٰ اشعریؓ کو انتہائی رنج ہوا اور عمرو بن العاصؓ کے اُس طرزِ عمل سے اِس درجہ بددل ہوئے کہ تارک الدنیا ہوگئے۔ حضرت امیر معاویہؓ کے طرزِ عمل سے بہت دُور رس نتائج مرتب ہوئے۔ اس لئے ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ اس بارہ میں اہلِ سنت کے ایک جید عالم حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ کا فیصلہ یہاں لکھ دیں تاکہ کوئی مسلمان کسی صحابی کی شان میں کسی گستاخی کا مرتکب نہ ہو اور نسبتِ صحابی کا پاس و ادب کرے۔

"حضرت معاویہ بن ابوسفیان صحابی ہیں اور آں جناب کی شان میں بعض احادیث بھی وارد ہیں۔ آں جناب کے بارہ میں علماءِ اہلِ سنت میں اختلاف ہے۔ علماءِ ماوراء النہر اور مفسرین اور فقہا کہتے ہیں کہ حضرت معاویہ کی حرکاتِ جنگ و جدل جو حضرت مرتضیٰ علی کے ساتھ ہوئیں وہ صرف خطاءِ اجتہادی کی بنا پر تھیں۔ محققین اہلِ حدیث نے بعد تتبعِ روایات دریافت کیا ہے کہ یہ حرکات شائبۂ نفسانی سے خالی نہ تھیں، اس تہمت سے خالی نہیں کہ جناب ذی النورین حضرت عثمان کے معاملہ میں جو تعصب امویہ و قریشیہ میں تھا اسی وجہ سے یہ حرکات حضرت معاویہؓ سے وقوع میں آئیں۔ جس کا غایت نتیجہ یہی ہے کہ وہ مرتکب کبیرہ اور باغی قرار دیئے جائیں ــــ وَالفَاسِقُ لَیْسَ بِاَھْلِ اللَّعْنِ یعنی فاسق قابلِ لعن نہیں۔ تو اگر مراد بُرا کہنے سے اسی قدر ہے کہ اُن کے اس فعل کو بُرا کہنا اور بُرا سمجھنا چاہیئے تو بلاشبہ اس امر کا ثبوت محققین پر واضح ہے، اور اگر بُرا کہنے سے مراد لعن و شتم ہے تو معاذاللہ کہ اہلِ سنت سے کوئی شخص اس کے گرد جائے،

اس واسطے کہ اہلِ سنت کے نزدیک یہ حکم ثابت ہے کہ فاسق اور مرتکب کبیرہ کے حق میں استغفار کرنا چاہیئے، تو لعن کرنا حرام ہے علی الخصوص حضرت معاویہ پر جو کہ صحابی ہیں، آپ کے حق میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت کی زیادہ اُمید ہے، اور یہ بھی زیادہ متوقع ہے کہ صاحبِ حق یعنی حضرت مرتضیٰ علیؓ اپنا حق معاف فرمادیں گے......" (فتاوی عزیزی کامل، صفحہ ۲۸۰)

اس سلسلہ میں

ایک طبقہ "خارجی" پیدا ہو گیا جس نے اس مسئلہ تحکیم کو پسند نہ کیا۔ اس لئے کہ صرف اللہ کا حکم کافی تھا۔ سنتِ نبوی کا ذکر کیوں آئے۔ "حکَم" کا انتخاب ہی غلط تھا۔ وہ یہ نہ سمجھے کہ جہاں قرآن میاں بی بی تک کے اختلاف پر حکم مقرر فرمائے وہاں اتنے اہم معاملہ میں حکم کے مسئلہ پر اعتراض کرنے کی گنجائش ہی کہاں رہی۔

پھر اس طبقہ نے فہم قرآن کو محض الفاظ کے ظاہری پہلو تک محدود کر دیا۔ وہ لطافتیں وہ تفسیر جو روحِ قرآن ہے اور جس کی فہم پر یہ رہتی دنیا تک ایک لازوال مینارِ ہدایت ہے، قرآن کو اس سے محروم کر دیا۔ یہی نہیں بلکہ یہ طبقہ خود اہلِ بیتؓ کے ایک حصہ یعنی علیؓ و اولادِ علیؓ کا دشمن ہو گیا اور اُنؓ کی صفوں سے نکل جانے کے باعث ہی "خارجی" کہلایا۔

ان لوگوں کا خیال تھا کہ حضرت علیؓ نے بڑی غلطی یہ کی کہ ابو موسیٰ کو اپنا حکَم بنایا، اور ثالث مقرر کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی جب کہ آپ دشمن کو ہلاک کر رہے تھے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ معاملاتِ دین میں حکَم بنانا ہی سراسر کفر ہے۔

ان لوگوں نے عبداللہ بن وہب کو اپنا سردار مقرر کیا اور نہروان میں بغداد کے قریب اپنا مرکز قائم کیا۔ ان کی تعداد بھی پچیس ہزار کے قریب ہو گئی تھی۔ حضرت علیؓ نے ان کا مقابلہ کیا اور اپنی اُسی شجاعت سے کام لیا

جوکبھی بدر و حنین میں نظر آئی تھی کیونکہ یہ اسلام پر ضرب تھی اور اس کا مقابلہ اسی شدت سے کرنا ضروری تھا۔

چنانچہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے پہلے لوگوں کو اصلاح حال کا موقع دیا۔ آپ نے ایک نیزہ گاڑ دیا اور منادی کرا دی کہ جو اس کے گرد آجائے گا اور عفو و درگذر چاہے گا، تو ہم اسے معاف کر دیں گے۔ صرف چار ہزار آدمی اس کے گرد آئے، باقی نے حضرت علیؓ کا مقابلہ کیا۔ کہتے ہیں کہ جنہوں نے اس خارجی طبقہ کی بنیاد ڈالی تھی ان میں سے صرف ۹ آدمی بچے۔ لیکن بعد میں رفتہ رفتہ یہ ایک مضبوط جماعت بن گئی۔

لڑائیوں کا سلسلہ جاری رہا لیکن ہر جگہ اسی اختلاف کے ساتھ کہ ایک طبقہ بیت المال کو اپنی جائیداد اور لوگوں کو اپنی رعایا سمجھتا تھا اور دوسرا اللہ کے حکم سے اللہ کے قوانین عام کرنے کے لئے جان کی بازی لگا رہا تھا۔

آخر واقعۂ نہروان کے بعد چند خارجیوں نے یہ طے کیا کہ جب تک حضرت علیؓ، امیر معاویہؓ اور عمرو بن العاصؓ مر نہ جائیں، یہ خانہ جنگی بند نہیں ہو سکتی۔ اس لئے ان تینوں کو بیک وقت قتل کر دیا جائے۔ تین آدمی اس کام کے لئے الگ الگ مقرر ہوئے اور طے پایا کہ ایک ہی وقت پر یہ تینوں اپنا اپنا کام کریں۔ عبدالرحمٰن بن ملجم کو سیّدنا علی کرم اللہ وجہہ کو قتل کرنے کی ذمہ داری سونپی گئی اور نزال نے امیر معاویہؓ اور عبداللہ نے عمرو بن العاص کے قتل کا بیڑا اٹھایا۔[1] ان تینوں میں صرف ابن ملجم اپنے اس ناپاک عزم میں کامیاب ہوا، باقی دو اپنے اپنے عزم میں ناکام رہے۔

چنانچہ سیّدنا علی کرم اللہ وجہہ جب رمضان المبارک کی ۱۹ تاریخ کو صبح کی

---

[1] خلفائے راشدین صفحہ ۲۷۴

نماز میں تشریف لائے تو آپ نے ابن ملجم کو جو مسجد میں سو رہا تھا، جگایا.......

"پھر نماز کے لئے کھڑے ہوئے۔ سر سجدہ میں تھا اور دل راز و نیازِ الٰہی میں مصروف تھا کہ ابنِ ملجم شقی کی تلوار سر پر پڑی۔ زخم کاری تھا۔ ابنِ ملجم گرفتار ہوا، لیکن اس وقت بھی اس شیرِ خدا کے صبر و تحمل میں فرق نہ آیا۔ حضرت امام حسنؓ کو نہایت مفید نصائح فرماتے اور ان کے قاتل سے معمولی طور پر قصاص لیا گیا۔

آخر ۲۱ رمضان المبارک ۴۰ھ جمعہ کی رات یہ فضل و کمال و رشد و ہدایت کا آفتاب ہمیشہ کے لئے غروب ہوا۔ حضرت امام حسنؑ نے نماز پڑھائی اور یہ وہ نمازِ جنازہ تھی جس میں چار کی جگہ پانچ تکبیریں کہی گئیں۔ اہلِ دل جانتے ہیں کہ یہ انداز حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ان ہستیوں کے لئے تھا جن کے مراتب بلند سے بلند ہوتے رہتے ہیں۔

امام احمدؒ نے ایک حدیث نقل کی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمرؓ سے پوچھا کہ پہلے لوگوں میں سب سے زیادہ شقی کون تھا اور ہماری امت میں سب سے زیادہ شقی کون ہوگا۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا اللہ اور اس کا رسولؐ بہتر جانتے ہیں۔ آپؐ نے جواب دیا کہ پہلی امتوں میں سب سے زیادہ بدبخت قوم ثمود کا وہ شخص ہے جس نے ناقۃ اللہ کی کوچیں کاٹ ڈالی تھیں، اور میری امت میں سب سے زیادہ بدبخت وہ ہے جو علیؓ کی پیشانی پر خنجر مار کر اس کی داڑھی کو خون سے آلود کرے گا اور انؓ کی شہادت کا موجب ہوگا۔" (النبی والاسلام $\frac{579}{351}$)

کیا یہ حدیث خود نورِ مبین صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی تصدیقِ مراتبِ اعلیٰ کا ایک بیّن ثبوت نہیں ہے؟

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی خلافت پر صداقت کی مہر اس جنگ و جدال

کے دور میں بھی ملتی ہے۔ مثلاً ایک جگہ جہاں پانی کی قلت تھی آپؓ نے ایک عیسائی عابد کو بلایا اور اس کنویں کا حال پوچھا جو قدیم زمانہ میں وہاں کسی جگہ کسی پیغمبرؑ نے کھودا تھا۔ اس نے جواب دیا کہ مجھے کنویں کا تو علم نہیں لیکن ایک پیشین گوئی اس کے متعلق ہے کہ وہ کنواں حضرت محمد صلّی اللہ علیہ وسلّم کے خلیفہ برحقؓ سے ظاہر ہوگا۔ یہ سُن کر حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ ایک جگہ گئے اور لوگوں سے کہا کہ یہاں کھودو۔ وہ کھودا گیا۔ کچھ دیر بعد ایک بڑا پتھر ظاہر ہوا۔ جب وہ اُٹھایا گیا یا توڑا گیا تو کنواں ظاہر ہو گیا جس سے لشکر کے لئے حسبِ دل خواہ پانی میسّر ہو سکا۔ وہ پرہیز گار حضرت کا معتقد ہو گیا۔

(تذکرۃ الکرام صفحہ ۲۵۸)

جنگِ صفین کے دوران حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ فرمانے لگے، ابو مسلم کہاں ہیں۔ محمد بن حنفیہ نے عرض کیا، آخری صفوں میں ہیں۔ آپ نے فرمایا، میرے بیٹے! میری مراد مسلم خولانی سے نہیں، میرا مقصد صاحبِ جیش ہے، جو مشرق کی طرف سے فوج کے علم لے کر نکلے اور اس طرح جنگ کرے کہ خداوند تعالیٰ اس کی مدد سے حق کو اپنی جگہ برقرار رکھے، کیسے اچھے ہیں وہ لوگ جو دین کی سربلندی کے لئے اس سے موافقت کر کے ظالموں کی نگوں ساری کے لئے سعی اور کوشش کریں گے۔"

(شواہدِ نبوّت۔ جامیؒ صفحہ ۲۹۳)

اس کے علاوہ

حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کا سب سے عظیم سرمایہ و اثاثہ وہ علم تھا جو انہیںؓ

ــــ تذکرۃ الکرام، تاریخ خلفائے عرب و اسلام، مؤرخ جناب مولوی سید شاہ محمد کبیر صاحب ابوالعلا دانا پوری نولکشور پریس، لکھنؤ، ۱۹۲۴ء

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطہ سے عطا ہوا جو امتِ مسلمہ کے لئے وہ چھوڑ گئے اور جس سے علم و عرفان کے سوتے پھوٹے، جو نورِ مبین صلی اللہ علیہ وسلم کے علم و عرفان کی طرف راہِ سلوک کے مسافروں کے لئے راہ نما ہوا۔ اور آپ رضی اللہ عنہ کا سب سے عظیم علمی کارنامہ وہ علوم ہیں جو قرآنِ حکیم کی تفسیر کی صورت میں عطا ہوئے۔ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا فرمانا ہے کہ:

"قرآنِ حکیم کا نزول سات حرفوں پر ہوا ہے۔ ہر حرف کا ایک ظاہر ہے اور ایک باطن۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس قرآنِ کریم کے ظاہری و باطنی (علمی اور روحانی) دونوں علوم ہیں"۔ (تذکرۃ المفسرین صفحہ ۴۳)

خلفاءِ اربعہ رض میں تفسیرِ قرآنِ حکیم حضرت علی کرم اللہ وجہہ، سے زیادہ ثابت ہے، اس لئے بھی کہ آپ رض کی تربیت بچپن ہی سے آغوشِ نبوت اور بیتِ رسالت میں ہوئی تھی، دوسرے اس لئے بھی کہ آپ رض نے دنیا میں زندگی بہ نسبت اصحابِ ثلاثہ رض کے زیادہ پائی اور آپ رض کا وصال ان تینوں رض کے بعد ہوا۔ (تذکرۃ المفسرین صفحہ ۴۳)

خلفاءِ راشدین رض یعنی سیدنا ابوبکر صدیق رض، سیدنا عمر فاروق رض، سیدنا عثمان غنی رض اور سیدنا علی رض نے تو قرآنِ حکیم کی تعلیم جنابِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم سے براہِ راست پائی اور چشمۂ معارف و حقائق بنے۔ دیگر صحابہ رض، تابعین رح اور صالحین رح نے علم و معرفت کے جو فیوض و انوار نورِ مبین صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت اور فیضانِ نبوت سے حاصل فرمائے ہم ان کا ذکر تابعین رح کی فصل میں کریں گے۔ جو "عَلَّمَ بِالْقَلَمِ" کی تفسیر بنے۔

خلافت کا دورِ آخر (وصل)

سیدنا علی کرم اللہ وجہہ کی شہادت کے بعد خلافتِ راشدہ کا چراغ گُل

ہونے کو ہے۔ قبل اس کے کہ ہم سیدنا امام حسن علیہ السلام کے مختصر دورِ خلافت کا ذکر کریں، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس مختصر لیکن نازک دور کے اس ربط پر ایک نظر ڈالیں جس کا تعلق اللہ رب العزت کی چار صفات اور کلمہ طیبہ کے سات حروف کے درمیان ہے۔ اور یہ سمجھنے کی کوشش کریں کہ اللہ رب العزت کس طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پُرنور اصحابؓ کے جانے کے بعد فیضانِ نبوّت کا کیا سلسلہ جاری کرنے جا رہا ہے۔

خلافتِ راشدہ کے یہ چار ستون جن پر اسلام کی مستحکم عمارت کی تعمیر ہوئی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چار اولوالعزم اصحابؓ ہیں۔ ہر ایک نے اپنے اپنے دورِ خلافت میں اپنے آقا و مولا حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی کسی صفتِ خاص کو اپنایا۔ حضرت صدیق اکبرؓ نے "صداقت" یعنی خلوصِ ایمان کے ستون کو مستحکم بنایا اور "حیاتِ ابدی" کی راہ دکھائی۔ حضرت سیدنا فاروق اعظمؓ نے اپنے نبیؐ کے "علم و عدل" کو اپنی پہچان بنایا اور اسی علم تفصیلی میں اپنی مثال آپ ہوئے۔ سیدنا عثمان غنیؓ ذوالنورین نے "ارادہ" کے مشکل مقام کی گتھیوں کو سلجھانے میں اپنی جان قربان کر دی۔ اور سیدنا علی کرم اللہ وجہہٗ نے ید اللٰہی کے جوہر دکھائے، میدان میں تلوار سے اور محراب و معاشرہ میں اپنے علم و عمل، اپنے عجز و انکسار کے ساتھ مشکل سے مشکل لمحات میں حق پر قائم رہتے ہیں۔

صحابہ کرامؓ

حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے ظاہر و باطن دونوں کے مظہر تھے۔ ان کا کام شریعت کو عام کرنا تھا، وہ شریعت کہ ظاہر و باطن جس کے دو رُخ ہیں۔

سیدنا علی کرم اللہ وجہہٗ کی شہادت کے بعد ظاہری شریعت تو باقی رہ سکتی تھی لیکن اندیشہ تھا کہ اس کے "باطنی انوار" سے قلبِ مومن محروم نہ ہو جائے،

وہ محمد رسول اللہ پر ایمان تو رکھے لیکن انؐ کے عرفان سے محروم رہ جائے۔ یہاں باطنی انوار سے مراد خلوص و محبت، عظمتِ رسولؐ، حق کی ہر حال میں پاسبانی، اور قلب کو معرفتِ الٰہی کے لئے مستعد رکھنا ہے۔ یہی دراصل "محمدؐ رسول اللہ" کی فہم کا ثمرہ ہے جو احسان، سلوک اور تزکیۂ نفس کا مجموعہ ہے۔

گویا

اللہ کی چار صفات۔ حیات، علم، ارادہ، قدرت، کے بعد اللہ تعالےٰ اپنی اُن صفات سے آگاہی بخش رہا ہے جو اِن چار صفات کا امتزاج ہیں۔
یعنی سمعؔ ...... ، بصرؔ ...... ، کلامؔ

ان صفات کی ظاہری حقیقت اور عرفان کی طرف مومن کی نگاہ کو، مومن کی سمع اور مومن کے کلام کو متوجہ فرماتا ہے۔ اور یہ بتانے کے لئے کہ مومن کو جو ملتا ہے وہ اِنہیں تین صفات کے صحیح عرفان سے ملتا ہے، یعنی ایمانِ مستحکم اور عملِ پیہم اِس کو مشیت ایزدی کہہ لیجئے یا عرفانِ حق۔ گویا کلمہ کی یکتائی کو ظاہر کرنے کے لئے، ظہور و بطون کے صحیح امتزاج سے آگاہی بخشنے کے لئے ضروری تھا کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کے بعد اس حقیقت کی نشان دہی سیدنا امام حسن علیہ السلام فرمائیں، جن کے متعلق حدیث شریف میں واضح طور پر فرما دیا گیا۔ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "میں اپنے بعد تم میں قرآن پاک اور اہلِ بیت چھوڑے جاتا ہوں"[1] جن کی نمائندگی حضرت امام حسنؓ یہاں فرما رہے ہیں۔ تاکہ مسلمانوں کے لئے راہِ حق واضح رہے، قولاً اور عملاً۔ ایک حدیث میں "اُسوۂ حسنہ" بھی آتا ہے۔ واضح رہے کہ اہلِ بیتؓ اور اسوۂ حسنہ میں کوئی تضاد نہیں۔ ان اہلِ بیتؓ میں سب سے پہلے ازواجِ مطہراتؓ

---

[1] ترمذی شریف

ہی آتی ہیں۔ لیکن انہوںؓ نے کوئی نرینہ اولاد نہ چھوڑی اور حضرت خدیجہ الکبریٰؓ کے واسطہ سے خاتونِ جنت سیدہ فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا اور سیدنا علی مرتضےٰ کرم اللہ وجہہ نے امت کے لئے دو نمونے چھوڑے، ایک سیدنا امام حسن علیہ السلام اور دوسرے سیدنا امام حسین علیہ السلام۔

اس طرح

سیدہ فاطمہ الزہرا رضی اللہ عنہا نے "مقامِ سمع" کی ترجمانی فرمائی، سیدنا امام حسن علیہ السلام نے "مقامِ بصیرت" کی اور سیدنا امام حسین علیہ السلام نے "مقامِ کلام" پر فائز ہو کر حق و باطل کو الگ کر دکھانا اپنا فرضِ عین سمجھا اور ترجمان الفرقان ہوئے۔

خدا نصیب کرے حدِ اعتدال کے ساتھ
ولائے پنج تن و حُبِّ چار یار مجھے

(استاد محترم حضرت احمد عبدالصمدؒ فاروقی قادری چشتی)

○

صدیقِ اکبر اور علی مرتضےٰ رضی اللہ عنہما وہ بزرگ ہستیاں ہیں جن سے ان کے بعد علم و عرفان کے وہ چشمے پھوٹے جو دنیا میں "اللہ کے ولی" کہلائے۔ وہ ہستیاں جنہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں تک پہنچنے کی راہیں دورِ ملوکیت میں دکھلائیں، جنہوں نے تاریک قلوب کو نورِ ایمان سے جلا بخشی اور ہزاراہا، لکھوکھا کفار کو حلقہ بگوشِ اسلام محض اپنی نظرِ التفات سے فرمایا، جنہوں نے مسلمانوں اور مومنوں کو ثابت قدمی سے زندگی بسر کرنے کے آداب سکھائے اور خواص کو مقامِ بندگی اور مقامِ احسان سے سرفرازی بخشی۔ ان کا ذکر آئندہ صفحات میں آئے گا۔

خاتونِ جنّتؓ قرۃ العینِ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم

ہم سیدۃ النساءؓ کے ذکر مبارکہ کی ہمت نہیں کرتے کہ آپ نے کہیں اپنا ذکر پسند نہیں فرمایا۔ ہمیشہ ہمہ تن گوش رہیں۔ جونہی کریم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا اس پر آمنّا و صدّقنا کہا۔ شادی کے بعد خاموش خدمت ان کا شعار رہا، ہاتھ پیر سے اہل و عیال کی خدمت میں مشغول، دل میں چراغِ مصطفوی روشن رہا۔ وہؓ خود حضور سرورِ کائنات صلّی اللہ علیہ وسلّم کی آنکھوں کی ٹھنڈک تھیں۔ جب حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کے وصال کا وقت قریب آیا تو آپؓ رو پڑیں۔ حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم نے پھر کان میں کچھ کہا۔ آپؓ خوش ہو گئیں۔ کسی موقع پر جب حضرت عائشہ صدیقہؓ نے اس کی وجہ دریافت کی تو آپؓ نے فرمایا کہ پہلے کان میں یہ فرمایا کہ اب میرا وقت قریب ہے۔ میں رونے لگی۔ پھر فرمایا کہ سب سے پہلے تمؓ ہی مجھ سے ملوگی۔ میں خوش ہو گئی۔ یہ خاموش محبت بھی "مقام سمع" سے متعلق تھی، سمع سے ہی متعلق رہی۔ اگر دریافت نہ کیا گیا ہوتا تو زبان پر بھی نہ آتی۔

○

ہاں

دو جگر گوشۂ رسولؐ اپنی یاد چھوڑے

ایک صفتِ "بصیرت" کا ترجمان بنا اور دوسرا صفتِ کلام، الفرقان کی تفسیر یعنی حق و باطل میں فرق فرما کر حق گوئی اور حق جوئی کی صراطِ مستقیم امتِ مسلمہ کو دکھائی۔

بنا کردند خوش رسمے بخون و خاک غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

سیدنا امام حسن علیہ السّلام

(سنہ ۴۰-۴۱ھ مدتِ خلافت چھ ماہ)

حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کی شہادت ہوئی۔ اور آپؓ کے قدرشناس اور محب اصحاب نے سیدنا امام حسن علیہ السلام کے ہاتھ پر بیعت کی کہ آپؑ نہ صرف حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کے ہم شبیہہ تھے بلکہ علم و اخلاق میں اپنی مثال آپ تھے۔ آپ حقائق کو ماضی، حال و مستقبل میں دیکھنے کی بصیرت رکھتے تھے۔ چنانچہ اپنے والدِ بزرگوار حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کی شہادت کے متعلق فرمایا کہ جس رات حضرت یوشعؑ قتل ہوئے، اسی رات میرے والدؓ بھی قتل کئے گئے، جن کے کمالِ علم میں کوئی خلیفۂ رسولؐ ان سے پہلے اس مقام پر نہیں پہنچا، نہ بعد میں پہنچ سکے گا۔ اس کا اعتراف خود صحابۂ کرامؓ اور خلفائے راشدینؓ نے کیا تھا۔

آپؑ کی دوررس نگاہیں ان حالات سے خوب آگاہ تھیں جو ملک میں فتنہ وفساد کے موجب ہوئے۔ وہ امیر معاویہؓ کی ان تمناؤں سے بھی آگاہ تھے جو ان کے قلب میں کروٹیں لیتی رہتی تھیں اور اس تمنا سے بھی جس نے انہیں حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ سے برسرِ پیکار رکھنے پر مجبور کیا۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ بنو امیّہ کے دلوں میں اب اپنے قبیلہ کی برتری کی تمنائیں اسلام کے فروغ کی تمناؤں میں غالب آچکی ہیں۔ وہ اس حقیقت سے بھی آگاہ تھے کہ ہرچند حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ نے محض اس خیال سے کہ مدینہ منورہ کی زمین پر خون نہ بہے، کوفہ کو اپنا دارالخلافت بنایا تھا لیکن انؑ کو اہلِ کوفہ وعراق کی تلوّن مزاجی اور بے اعتباری کا بھی تجربہ دورِ علیؓ میں ہوچکا تھا۔ وہؑ فطرتاً صلح پسند، امن کے طالب، جنگ وفساد سے نفرت فرمانے والے تھے۔

لیکن

بہر حال جب آپؑ نے دیکھا کہ ان کے گرد جو جانثار ہیں وہ امیر معاویہؓ کو حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کی شہادت سے یہ موقع دینا نہیں چاہتے کہ وہ خلیفۂ وقت بن جائیں۔ تو آپؑ نے قیس بن سعد کو بارہ ہزار لشکر کے ساتھ امیر معاویہؓ کے مقابلہ کے لئے روانہ کیا تاکہ انؓ کے لشکر کو کوفہ کی طرف بڑھنے سے روکیں۔

حضرت امام حسن علیہ السّلام

خود بھی وہاں پہنچے تو فطرتاً خون ریزی پر صلح و آشتی کو ترجیح دی اوران کو اس جنگ سے باز رہنے کی کوشش کی۔ بالآخر امیر معاویہؓ سے اس شرط پر صلح فرمائی کہ امام حسنؑ اُنؓ کو خلافت کی ذمّہ داری سونپ دیں، اور حضرت معاویہؓ کے بعد حضرت امام حسین علیہ السلام خلیفہ بنائے جائیں۔ اس طرح شوال ۴۱ھ میں آپؑ کی امیر معاویہؓ سے شرطِ صلح سے وہ پیشین گوئی بھی پوری ہو گئی جس میں نبیٔ کریم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا تھا کہ خلافت تیس سال رہے گی، بعد میں ملوک اور جبابرہ یعنی شاہان اور جبّار حکمران ہوں گے۔ یہ حدیث بخاری نے حضرت ابوبکرؓ سے نقل کی ہے۔

(النّبی والاسلام، بحوالہ ابوداؤد، ترمذی، احمد صفحہ ۵۸۰/۳۵۲)

خلافت حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ	۲ سال ۳ ماہ	
خلافت حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ	۱۰ سال ۶ ماہ	کُل زمانہ
خلافت حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ	۱۲ سال	خلافتِ راشدہ
خلافت حضرت علی مرتضٰی اسد اللہ رضی اللہ عنہ	۴ سال ۹ ماہ	۳۰ سال
خلافت حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ	۶ ماہ	

حضرت امام حسین علیہ السّلام کی چھ ماہ کی خلافت کے ساتھ آفتابِ خلافت

راشدہ ہمیشہ کے لئے غروب ہو گیا۔ اور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ پیشین گوئی پوری ہوئی جس میں آپؐ نے فرمایا تھا کہ "یہ میرا بیٹا سیّد ہے جس کی وساطت سے خداوندِ کریم مسلمانوں کے دو گروہوں میں صلح کرائے گا۔"

حضرت امام حسنؓ کی وفات زہر خورانی کے سبب ہوئی۔ حضرت حسنؓ کی وفات کے وقت حضرت امام حسین علیہ السلام آپ کے سرہانے بیٹھے تھے۔ انہوںؑ نے پوچھا: اے میرے بھائی! آپ کو زہر خورانی کا کس پر شبہ ہے۔ آپؓ نے فرمایا: بھائی! اس لئے پوچھتے ہو کہ تم اس کو جان سے مار ڈالو۔ حضرت امام حسینؑ نے کہا۔ ہاں۔ حضرت امام حسنؑ نے فرمایا کہ اگر وہی شخص ہے جس پر مجھ کو شبہ ہے تو اس سے بدلہ لینے کے لئے اللہ کافی ہے۔ اور اگر وہ نہیں ہے تو میں نہیں چاہتا کہ کسی بے گناہ کا خون ہو۔

ہم شبیہہِ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت حسنؓ کی شہادت ربیع الاوّل ۵۰ھ کے اوائل میں ہوئی

(شواہد نبوت صفحہ ۳۰۳)

یہاں بھی سیّدنا امام حسنؑ کی بصیرت انداز صلح جوئی پر قولِ رسولِ کریمؐ ہی شاہد ہے۔ اس کے بعد تصوّر کرنا کہ امام حسنؑ نے (نعوذ باللہ) بزدلی سے کام لیا، ناحق شناسی ہے۔

ہاں

یہ کہہ سکتے ہیں کہ اہلِ بیتؓ میں سے جس کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اندازِ بصیرت کا ترجمان بنایا گیا اس نے اس خصوصی صفت کو امتِ مسلمہ پر واضح کیا کہ "خلافت" کا مقصد ایمان کا استحکام اور اسلام کا فروغ ہے۔ اگر یہ دونوں باتیں خلافت سے حاصل نہیں ہو سکتیں تو پھر اسے جزوِ ایمان تصور کرنا غلطی ہے۔ یہ خلافت نہیں ملوکیت ہو گی یا اس کے علاوہ جو بھی نظامِ حکومت آئے

چونکہ حضرت معاویہؓ میں بحیثیت مسلمان حضرت امام حسنؓ نے کوئی وہ کمزوری نہیں پائی جو انہیں دائرۂ اسلام سے خارج کرنے والی ہو۔ پھر انہوں نے جس سیاست کو خلافت پر ترجیح دی وہ امیر معاویہؓ کی ذاتی اجتہادی غلطی تھی یا اس کی باز پرس اللہ ہی کرسکتا ہے، جو عالم الغیب والشہادہ ہے۔

یہ بڑا نازک فیصلہ تھا

جو سیدنا امام حسنؓ نے فرمایا۔ ایسا ہی نازک فیصلہ جیسا سیدنا عثمان غنیؓ نے "مقام ارادہ" پر کیا تھا۔

دراصل

دونوںؓ کو دو مقامات کی وضاحت کا فریضہ سپرد رہا، اور وہؓ اسی پر قائم رہے۔

○

خلافتِ راشدہ پر ایک اجمالی نظر

نورِ مبین صلی اللہ علیہ وسلم کے پیکرِ بشریت سے عالمِ انوار کی طرف ہجرت فرمانا نبوت کے اختتام کے لئے تھا۔ یہی مشیتِ ایزدی تھی جس کی وضاحت حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں فرمائی:

"بنی اسرائیل کی قیادت، انبیاءؑ کیا کرتے تھے۔ جب کوئی نبیؑ مر جاتا تو دوسرا نبیؑ اس کا جانشین ہوتا۔ مگر میرے بعد (حضورؐ کے بعد) کوئی نبیؑ نہ ہوگا بلکہ خلفاءؓ ہوں گے۔" (بخاری)

پھر ان خلفاءؓ میں بھی تیس سال کا دور خلفائے راشدینؓ کے لئے متعین کرنا اس امر کی واضح دلیل ہے کہ صرف یہی تیس سال کا زمانہ وہ زمانہ ہوگا جو آنے والی نسلوں کے لئے ایک لائحہ عمل کا تعین کرسکے گا اور حق و باطل کے انتخاب میں ان کا معاون ہوگا۔ پھر اس کے بعد بھی جو خلفاء یا سلاطین اپنے

اعمال، اخلاق، طرزِ حکومت، سے ان کے نقشِ قدم پر چل کر اپنا مقام بنالیں تو "مغفرۃً و اجرًا عظیمًا" سے نوازے جائیں گے۔ لیکن ان کا شمار اس فہرست میں نہ ہوگا جس کی تصدیق اللہ رب العزت کے کلامِ پاک میں اور مسجدِ نبوی کی دیوار پر کنداں آیات سے آج بھی ہوتی ہے۔ یعنی سورہ فتح کی آیت انتیس[۲۹]

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ ؕ وَالَّذِیْنَ مَعَہٗٓ اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ تَرٰھُمْ رُکَّعًا سُجَّدًا یَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰہِ وَرِضْوَانًا ز سِیْمَاھُمْ فِیْ وُجُوْھِھِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ ؕ

"محمدؐ خدا کے پیغمبر ہیں اور جو لوگ اُن کے ساتھ ہیں وہ کافروں کے حق میں تو سخت ہیں اور آپس میں رحم دل (اے دیکھنے والے) تو اُن کو دیکھتا ہے کہ (خدا کے آگے) جھکے ہوئے سر بسجود ہیں اور خدا کا فضل اور اس کی خوشنودی طلب کر رہے ہیں (کثرتِ) سجود کے اثرات سے اُن کی پیشانی پر نشان پڑے ہوئے ہیں۔

مفسرین و محققینِ کرام نے اس آیتِ مبارکہ میں خلافتِ راشدہ کی طرف نشاندہی فرمائی ہے۔ گویا آیتِ بالا میں صحابہ کرامؓ کا ذکر ہوا۔

"مَعَہٗ" سے صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ۔ "اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ" سے حضرت عمرؓ فاروق رضی اللہ عنہ۔ رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ۔ "رُکَّعًا سُجَّدًا..." سے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی طرف خصوصی اشارہ ہے۔ پھر تلاشِ فضل و رضا میں جو بھی آئے وہ مغفرت اور اجرِ عظیم کا حقدار ہوگا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس دورِ خلافت کو تفسیرِ نبوت کے طور پر اس کا تعین فرمایا تاکہ سرورِ کائناتؐ کی نبوت کے اہم نکات واضح ہو جائیں اور قول، فعل، عمل میں "ارادہ" اور "قدرت" کی اہمیت واضح ہو۔ ساتھ ہی روحِ نبوت یعنی استحکامِ ایمان اور فروغِ اسلام کا مقام نمایاں رہے۔

اور اس آیت پر سورہ ختم ہوتی ہے۔ رہتی دنیا تک مومن کے لئے فتحِ مبین کی بشارتوں کے ساتھ، بشرطیکہ نظر نورِ مبینؐ اور آپؐ کے سچے متبعین پر رہے اور نفس کا غلبہ، روح کی صوتِ سرمدی پر اثر انداز نہ ہو۔

○

آیئے! خلافتِ راشدہ کے دَور

کی چند نمایاں خصوصیات پر ایک اجمالی نظر ڈالیں۔ یہ دور نہ صرف اہلِ ایمان کے لئے ایک اہم دور ہے، بلکہ اس کی اہمیت اور افادیت پر مسلم اور غیر مسلم مفکرین اور مورخین نے بڑی شرح و بسط سے روشنی ڈالی ہے اور اسے راہِ حق کے تعین کے سلسلہ میں ایک اہم تاریخی دستاویز قرار دیا ہے۔

۱۔ نورِ مبین صلّی اللہ علیہ وسلّم کا یہ سفر از ازل تا وصال صرف اس لئے تھا کہ انسان جسے افضل المخلوقات کے لقب سے نوازا گیا ہے، اپنی انفرادی اور اجتماعی ذمہ داریوں سے آگاہ ہو۔ یہ جان لے کہ کل کائنات اور وہ خود ایک اللہ لاشریک لہٗ کی تخلیق ہے۔ یہ چاند سورج، زمین آسمان پہاڑ اور سمندر، جو بظاہر الگ الگ ہیں، ان میں بھی ایک تعلق ایک ربط اسی نورِ مبینؐ کے واسطے سے نمایاں ہے۔ اور یہ جو تمام رسالتیں الگ الگ اپنے وقت پر آئیں وہ سب اسی نورِ مبینؐ، اسی رسالت کا پیش خیمہ تھیں اور اسی میں وہ ضم ہو کر ختم ہو گئیں۔ اور اب انسان کی ہدایت کے لئے ایک ہی اللہ کا ایک ہی رسولؐ اپنی رسالتِ کاملہ کے ساتھ اس کائنات میں قیامت تک اپنے رب کی بندگی کرے گا۔ اسی توحید، ختمِ نبوت کے ساتھ قیامت اور حشر و نشر پر ایمان بھی ضروری ہے تاکہ انسان ذمہ داریوں پر مستعدی سے قائم رہے۔

۲۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات میں اللہ تعالیٰ کی صفات ایک انسانِ کامل میں ایک خاص تناسب اور تعلق سے نمایاں رہیں۔ اُس انسانِ کامل میں جو معصوم تھا، جس سے کسی خطا کا امکان نہ تھا، اس لئے اگر صرف اسی مقام تک تعلیماتِ اسلامی کو محدود کر دیا جاتا تو عام مسلمانوں کو شک و شبہ ہو سکتا تھا کہ عملی طور پر یہ نظام اسی وقت قابلِ عمل ہے جب تک اس میں رسول موجود ہو۔ اس لئے ضروری تھا کہ اس نظمِ حیات کو خود خلفاءِ رسول اللہ کے ذریعہ ایک عملی نمونہ میں پیش کیا جائے اور اس کے لئے ایک مدّت کا تعیّن ہو۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میرے بعد خلافتِ راشدہ تیس (۳۰) سال رہے گی، جس کا ذکر ہو چکا ہے۔ لیکن حضور کا قولِ محکم ہے کہ میرے بعد کوئی نبی نہ ہوگا بلکہ خلفاء ہوں گے، یہ اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ خلفاءِ راشدہؓ کا دور تو دورِ نبوت کی تفسیر ہے۔ البتہ اس کے بعد بھی جو خلیفہ حُسنِ عمل سے اپنا مقام پیدا کریں ان کے لئے بھی اجرِ عظیم کے وعدے ہیں۔ اس کا منشاء یہ بھی تھا کہ نبوت ختم ہو چکی ہے اب امّت کے علماء اور اولیاء آپ سے صرف علم و ولایت ہی کی میراث پائیں گے اور اُمّتِ مسلمہ کے لئے یہی علماءِ راسخین اور اولیاءِ کرام راہنما ہوں گے۔

۳۔ چونکہ انسانیت کی فلاح و بہبود کا راز انسان کی اجتماعی زندگی کی کامیابی میں مضمر ہے، اس لئے اس میں ایک نظامِ حکومت کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ قرآنِ حکیم اور شارعِ اسلام نے اس حکومت کے فرائض اور ذمّہ داریوں کو واضح انداز سے بیان فرمایا ہے۔ اور یوں ہدایت فرمائی کہ حکومت کی ظاہری شکل اور انتظامی ڈھانچہ کیسا ہی ہو اُس کے فرائض اور ذمہ داریوں میں کوئی فرق نہ آنا چاہیئے۔ تاکہ افراد کو جماعت کے ساتھ

اور جماعت کو افراد کے ساتھ ایک ایسا تعلق قائم رہے جو دونوں کی فلاح و بہبود کا موجب ہو۔ اور وہ اپنی زندگی کے اصل مقصد سے غافل نہ ہوں کہ انہیں اللہ کی طرف جانا ہے اور اپنے اعمال کے نتائج سے دوچار ہونا ہے۔ تاکہ وہ اس کی حقیقی زندگی کی کامیابی کو پیشِ نظر رکھیں۔

خلافتِ راشدہ کے دور میں ولایت کو کوئی خاص اہمیت حاصل نہ تھی۔ ہر خلیفہؓ اپنی جگہ علم و عمل، ایمان و ایقان کے ساتھ معرفتِ ربانی کا مینارِ نور تھا۔ اور جملہ امور میں ملت کے لئے ایک مثال تھا۔ لیکن خلافتِ راشدہ کے بعد جب ملوکیت کا دَور دورہ ہو تو اس وقت ضروری ہوا کہ علمائے راسخین اور اولیاءِ کرام اپنی ذمہ داریوں کو سمجھیں اور فرضِ منصبی میں مشغول رہیں۔

چنانچہ

ابن خلدون نے انبیائے کرامؑ اور خلفاؓ کا فرضِ منصبی کا بیان کرتے ہوئے بہت مفید امور کی طرف اشارہ کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:۔

"سیاسی احکام محض دنیاوی مصالح پر موقوف ہوتے ہیں اور لوگوں کی نگاہ ظاہری اور دنیوی زندگی سے آگے نہیں بڑھتی۔ لیکن شارعؑ کا مقصد لوگوں کی آخرت کی اصلاح بھی ہے۔ اس لئے شرعی تقاضوں کے مطابق عوام کو شرعی احکام پر ابھارنا ضروری ہے۔ خواہ اس کا تعلق دنیاوی معاملات سے ہو یا اُخروی حالات سے۔ یہ کام انبیاءؑ کا ہے یا آپؐ کے ان جانشینوں کا جن کو خلفاء کہا جاتا ہے، جو ہر حال میں نبیؐ کے متبع ہوتے ہیں۔

(ابن خلدون صفحہ ۴۷۲، مقدمہ ابن خلدون)

ابن خلدون انسان کی تین قسمیں بیان کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں:

"کمال اور غیر کمال کے اعتبار سے نفسِ انسانی کی تین قسمیں ہیں۔ ایک قسم تو مزاجاً روحانی ادراک سے قاصر ہے۔ یہ نفوس بجائے اوپر چڑھنے کے پستی کی

طرف گرتے ہیں یعنی حسّی اور خیالی مدرکات کی طرف، اُن کے خیالی علوم کا دامن محدود ہوتا ہے۔

"نفوسِ انسانیہ کی دوسری قسم علماء و اولیاء ہوتے ہیں۔ اُن کی فکری حرکت عقلِ روحانی کی طرف پیش قدمی کرتی ہے اور ان کے اِدراکات کے سلسلہ میں بدنی آلات کی ضرورت نہیں پڑتی کیونکہ اُن میں قدرتی طور پر یہ صلاحیت موجود ہے۔ اس لئے ان کے اِدراکات کا دامن وسیع ہوتا ہے اور محض ضروریات (یعنی تقاضائے جسمانی) جو پہلے قسم کے نفوس کا دامنِ علم تھا اس سے نکل کر باطنی مشاھدات کی فضا میں گھومتے ہیں اور اُن سے فائدہ اٹھاتے ہیں، جو سراپا وجدان ہیں اور اوّل سے لے کر آخر تک علماً وہ ایک بُلند مقام پر ہیں یہ درجہ علماء و اولیاء کرام کا ہے، جو علومِ دینیہ اور سعادتِ ربّانیہ کے حامل ہوتے ہیں۔ اور یہ درجہ سعادت مندوں کو برزخ میں نصیب ہوتا ہے۔"

(مقدمہ ابن خلدون صفحہ ۳۱۱)

تیسری قسم ان کی ہے جو پیدائشی طور پر مجموعی طور پر بشریت سے ہٹے ہوتے ہیں یعنی انہیں بشری جسمانیت اور روحانیت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ وہ اونچے درجہ تک یعنی فرشتوں تک، پہنچنے کی قدرتی صلاحیت رکھتے ہیں تاکہ وہ کسی وقت بالفعل صفِ ملائکہ میں جا کھڑے ہوں اور انہیں اپنے عالم ہی میں رہ کر ان کا مشاہدہ میسّر آجائے۔ اور وہ اس لمحہ میں کلامِ نفسانی اور خطابِ ربّانی سننے کی سعادت سے بہرہ اندوز ہوتے ہیں۔ یہ انبیاء علیہم الصلاۃ کی جماعت ہے۔ حالتِ وحی میں حق تعالیٰ نے انہیں بشریت کا لبادہ اتار پھینکنے کی سعادت بخشی ہے۔ یہ ان کی فطرت ہے جس پر اللہ نے انہیں پیدا کیا ہے اور یہی ان کی پیدائش ہے جو اللہ تعالیٰ نے انہیں بخشی ہے۔ اور انہیں بدن کے موانع اور جسمانی رکاوٹوں سے محفوظ فرمایا ہے جب تک وہ بشری لباس میں

ملبوس رہیں، کیونکہ ان کی طبیعتوں میں میانہ روی اور ثابت قدمی کی جڑیں مضبوط کر دی گئی ہیں، جن کے ذریعہ وہ ملاء الاعلیٰ کی جہت کی طرف براہ راست ترقی کریں۔ انہیں عبادت کا ایسا بے پناہ شوق دیا گیا ہے کہ بالائی جہت پر ان کا انکشاف ہو اور اسی کی طرف مائل ہوں۔ لہٰذا وہ فطری صلاحیت کی وجہ سے اسی طرف متوجہ رہتے ہیں۔ اور جب چاہتے ہیں، بلاکسب و مشقّت کے بشری لباس اتار کر فرشتوں میں شامل ہو جاتے ہیں۔ اور وہاں جو کچھ ملتا ہے لے کر بشری قویٰ میں اتر آتے ہیں تاکہ تبلیغ کی حکمت پوری ہو اور لوگوں تک اوپر کے احکام پہنچا دیں۔ (ابن خلدون جلد اول صفحہ ۳۱۲)

ہم نے یہ اقتباس لفظاً پیش کیا اس لئے کہ ایک مورخ و مفکّر کی نگاہ بھی انبیاءؑ کے متعلق یہاں تک پہنچ چکی ہے۔ اور حضور سرورِ کائنات صلّی اللہ علیہ وسلّم جو سید المرسلین ہیں، جو نورِ مبینؐ ہیں، فرشتگی جن کے جلو میں، بشریت جن کے قدموں پر، رحمتِ الٰہی جن پر نازاں، وہ اس سے کہیں، کہیں بلند مقام پر فائز ہیں جیسا کہ ہم گذشتہ صفحات میں دیکھتے چلے آئے ہیں۔ درحقیقت یہ مرتبہ جس کو ابنِ خلدون نے انبیاءؑ کے ساتھ مخصوص کیا ہے، آپ صلّی اللہ علیہ وسلّم کے غلاموں، آپؐ کے اولیاء کا ہے۔ جن کا تقرر آپ ہی کے حکم سے، ان کی صلاحیتوں اور مشیئتِ ربّانی کے مطابق ہوتا ہے۔

یہ ایک اہم اقتباس ہے۔ اس کا فائدہ یہ بھی ہے کہ ہمیں اس سے اولیاء کرام کے مراتب کی فہم میسّر ہوتی ہے اور نورِ مبینؐ کے اس پیکرِ بشریت سے رخصت ہونے کے بعد، اس نظام کے سمجھنے میں مدد ملتی ہے، وہ نظام جو اولیاء کرام کا ہے، جو روحانی سطح سے قدرتِ خفی سے کام لیتے ہوئے، مشیئتِ ایزدی کے تحت اپنے فرائض انجام دیتے ہیں۔ اس طرح کہ ایک طرف علماء کرام لوگوں کو حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کی بشریت کی بہاروں سے آشنا کریں اور اگر

وہ بے لگام ہو جائیں تو اس قدر مطلق العنان نہ ہونے پائیں کہ خانقاہیں اور عبادت کدے ہی ویران ہو جائیں اور لوگ منشاءِ تخلیق ہی کو درہم برہم کرنے پر اتر آئیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو بحیثیتِ مجموعی اس فریضہ سے آگاہ فرمایا کہ "تم ہی سب سے بہتر امت ہو جو لوگوں کی طرف بھیجی گئی کہ لوگوں کو معروف کی طرف بلاتی رہے اور منکرات سے بچاتی رہے" اور دعوتِ ایمان دیتی رہے، تاکہ اولادِ آدمؑ منشاءِ تخلیق یعنی توحیدِ مطلقہ سے غافل نہ ہو جائے۔

یہی وہ جماعت ہے جس کے ذریعہ نہ صرف شریعت کی بنیادیں مستحکم ہوتی ہیں بلکہ علوم عام ہوتے ہیں اور ہر علم، دین کی فہم میں معاون ہوتا ہے۔

لیکن اللہ جانتا ہے کہ انسان بڑا سرکش اور جلد باز واقع ہوا ہے۔ جو اپنے نفس کے خاطر بڑے سے بڑے فتنہ سے باز نہ رہے گا۔ اور اگر کوئی ایسی پابندی نہ لگائی جو اس کو مطلق العنان ہونے سے روکے رہے تو کارخانۂ قدرت و حکمت میں ایک کمی رہ جائے گی۔ یہ دنیا، اللہ اپنی حکمت سے چلا رہا ہے۔ آخری دنیا اس کی قدرتِ کاملہ کا کامل مظہر ہوگی۔ اس لئے اس نے ایک جماعت ایسی بھی پیدا فرما دی جو صرف اسی کے حکم پر نظر رکھے، اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع میں مشیتِ ایزدی کے تحت اور اسی کا اذن پا کر، کارخانۂ عالم کو ایک رخ دیتی رہے۔ یہ جماعت اولیاء کرام کی ہے۔ واضح رہے کہ خلافتِ راشدہ تو انوارِ نبوت و ولایت کا سنگم تھا۔ یہ سب مینارِ نور تھے، مینارِ ہدایت تھے اور احسان و سلوک کے امام تھے، یا تزکیۂ نفس اور تصفیۂ باطن کے مظاہر، لیکن اب جس دور میں امت داخل ہو رہی تھی اس کے لئے ضروری تھا کہ خلیفۂ چہارمؓ کے بعد قدرتِ خفی کے جلوے بھی آشکارا ہیں اور ایک جماعت کے سپرد اصلاحِ حال کی خدمت خصوصی طور پر سونپی جائے، انہیں علماءِ راسخین کہہ لیجئے یا اولیاء کرام۔

ہم آئندہ صفحات میں ان علماء کرام کی خدماتِ عظیم کا مختصر ذکر کریں گے، جنہوں نے بالخصوص قرآنِ حکیم اور احادیث اور علوم دینیہ کو فروغ دیا، اور ان مسلمان مفکرین کا بھی جنہوں نے دنیاوی علوم میں اپنی عظمت کے نشان چھوڑے جس پر آج دنیا نازاں ہے۔

ہم ان اولیاءِ کرام کا بھی ذکر کریں گے جو سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے اشاروں پر اپنی اپنی جگہ روحانی فیوض سے قلوب کو منور کرتے رہے۔ ان میں مختلف مقامات کی ہستیاں ہیں جو ایک سلکِ وحدت میں پروئی ہوئی اپنے اپنے فرائض انجام دے رہی ہیں۔

یہ غلط فہمی نہ ہو کہ علماءِ راسخین اور صوفیاءِ کرام کے درمیان میں کوئی خلیج ہے، ایسا نہیں ہے بلکہ اُن کے فرائض جُداگانہ ہیں۔ ایک کا کام بنیادی طور پر شریعت کے ظاہری پہلو سے ہے، مثلاً نماز، روزہ وغیرہ میں فرائض، سنن، مستحبات کی تشریح۔ اور دوسری جماعت یعنی اولیاء کرام کا تعلق بنیادی طور پر قلوب میں دینِ اسلام کی محبت کو راسخ کرنا ہے۔ گویا اولیاءِ کرام جڑوں کو پانی دیتے ہیں اور علماءِ راسخین، شجرِ اسلام کی ڈالیوں، پھولوں اور پتّوں کی دیکھ بھال کرتے ہیں۔ ایک کی توجہ "یُزَکِّیْھِمْ" پر ہے، دوسرے کی کتاب و حکمت کی تعلیم پر۔

چنانچہ حضرت امام شافعیؒ کا مشہور واقعہ ہے کہ ہزاروں طلبہ کا مجمع تھا۔ امام صاحبؒ درسِ قرآن میں منہمک تھے کہ ایک جانب سے ایک کمزور و نحیف انسان آتا نظر آیا۔ امام صاحبؒ خاموش ہو گئے اور ان کے استقبال کے لئے بڑھے۔ جیسے ہی وہ قریب آئے تو معانقہ فرمایا۔ تقریر بند کر دی اور ان کی طرف ہمہ تن متوجہ رہے۔ پھر جب وہ رخصت ہو گئے تو امام صاحبؒ نے تقریر کرنا جاری فرمایا۔

طلباء نے پوچھا حضرت یہ کوئی بہت بڑے مفسر ہیں ؟ فرمایا "نہیں" پوچھا یہ محدث ہیں ؟ فرمایا "نہیں"۔ طلباء بصورت سوال تھے کہ پھر اس قدر عزت و وقار کیوں ؟ امام صاحبؒ نے ان کے دل کی بات پالی اور فرمایا۔

"میں قرآن ان بزرگ سے زیادہ جانتا ہوں لیکن یہ صاحبؒ قرآن کو مجھ سے زیادہ جانتے ہیں۔"

درحقیقت یہی علوم ظاہر و باطن کی یکائی فروغِ اسلام کا موجب رہی۔ اور جب نظریں محدود ہونے لگیں اور تقاضائے بشریت کا نفس پر غلبہ ہوا تو ان اقدار کا انکار ہی نہیں کیا گیا بلکہ ان سے گلوخلاصی کو لوگ ایمان اور اسلام سمجھنے لگے ، اور اخوت و محبت سے قلوب ویران ہونے لگے۔

ان بزرگ اولیاءِ کرام کو یوں سمجھئے کہ وہ سائبانِ رسالتِ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے کناروں پر کھڑے ہیں اور اپنے اخلاق و اخلاص اور زبانِ خاموش سے قلوب کو اس دامنِ رحمت کے اندر آنے کی دعوت دے رہے ہیں۔

"دراصل یہ وہ آنسو ہیں جو غمِ امت میں ٹپک رہے ہیں۔ یہ وہ درویش ہیں جن کے سینے میں نورِ محمدی کی شمع روشن ہے، اور جو اسی شمعِ ہدایت کی روشنی میں، اپنے باطن سے لے کر اپنے گرد و نواح کو دیکھتے اور سمجھتے ہیں، جن کے قلوب سے محبت کے چشمے پھوٹتے ہیں، جو امت کے دُکھ درد کو اپناتے، بنجر قلوب کو حیاتِ نو بخشتے ہیں۔ جن کی زبانِ خاموش اور چشم گویا دل میں گھر کر جاتی ہے۔

یہ مرنے سے پہلے مر مٹنے والوں کی ایک جماعت ہے جن پر زہد کے لباس کی جگہ خلوت خانۂ عشق کے انوار دمکتے ہیں

صَلَّى اللّٰهُ عَلَى النَّبِيِّ الْاُمِّيِّ وَاٰلِهٖ"

(مقدمہ "درعینی" از ولی الدین)

گویا

اس مختصر جائزہ میں ہم نورِ مبینؐ کے اندازِ انوار و ہدایت کو دو حصوں میں الگ الگ بیان کریں گے۔

۱۔ ایک علماءِ کرام کی عظیم خدمات کی صورت میں جن کو عَلَّمَ بِالْقَلَمِ کی تفسیر سمجھئے۔

۲۔ دوسرے اولیاءِ عظام کے انوار کے بیان میں، جو تجلیاتِ نورِ مبینؐ ہیں۔

اور یہ دونوں ہی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ مبارکہ کے ترجمان ہیں جو ایک دوسرے سے الگ نہیں بلکہ ایک دوسرے کے معاون ہیں۔

لیکن ابھی

خلافتِ راشدہ کے غروبِ آفتاب کے بعد ملوکیت کے آغاز کے اس دور پر نظر ڈالنا ضروری ہے جو شر اور خیر کی ایک ملی جلی داستان ہے۔ جس کا دامن ایک جانب خونِ شہیداں سے داغ دار ہے، خواہ وہ میدانِ کربلا میں بہا ہو یا مدینۂ منورہ کی گلیوں میں۔ اور دوسری جانب تابعین اور تبع تابعین کی خدمات سے حیاتِ نو کا آغاز۔

باب ششم — فصل سوم

خلافت راشدہ سے شہادت حضرت امام حسینؑ تک

معرفتؒ کی بنیاد تضاد پر ہے — خیر کی پہچان شر سے ہوتی ہے۔

رات، دن سے پہچانی جاتی ہے۔ روشنی کی قدر ظلمت سے ہوتی۔ اسلام کو کفر ہی سے مقابلہ کرنا پڑا۔ اس طرح خلافت اور ملوکیت کے درمیان بھی حدِ فاصل ضروری ہے تاکہ دونوں ایک دوسرے سے جُدا نظر آئیں۔ خلافتِ راشدہ کے اختتام پر جب ملوکیت عام ہوگئی، جس کی طرف احادیث میں وضاحت تھی، تو ضروری ہوا کہ یہاں کے خیر و شر کے فرق کو الفرقان کی روشنی میں ایک فارق ہی امت کے لئے راہِ ہدایت کا تعین کرے۔ یہ مقام "کلام" سیدنا امام حسین علیہ السلام کو عطا ہوا، اور کلمۂ طیبہ کی حقانیت اور حق و باطل کے فرق کو نمایاں کرنا آپؑ کی ذمہ داری قرار پائی۔

حضرت امیر معاویہؓ

۴۱ھ میں بنو اُمیّہ کی سلطنت کے حاکم ہوئے۔ گو یہ لوگ بھی خلیفہ کہلاتے رہے لیکن خلافتِ راشدہ سے اُن کا کچھ تعلق نہ تھا۔ اب حکومت اپنے اقتدار، اپنے جاہ و حشم، اپنی تمناؤں کی برآوری کے لئے تھی۔ یوں تو امیر معاویہؓ حضرت فاروقِ اعظمؓ کے زمانہ میں بھی گورنر رہے تھے، "لیکن اس وقت مرکز کی عنان عمر فاروقؓ کے ہاتھ میں تھی جو ایک لکڑی سے سب کو سیدھا کرنا جانتے تھے۔" پھر حضرت عثمان غنیؓ کا دور آیا۔ تب بھی یہ گورنر رہے لیکن ایک خود مختار گورنر کی حیثیت سے۔ عثمان غنیؓ فطرۃً رحم دل، صلح جو، خاموش اور حلیم بزرگ تھے۔ اُن کے اس اخلاق سے فائدہ اٹھاتے ہوئے امیر معاویہؓ نے اپنی حکومت کی

بنیادوں کو لوگوں کی دلجوئی، دلیروں کی استمانت سے مضبوط کر لیا۔ پھر حضرت علیؓ کا دورِ خلافت آیا اور باز پرسی کے امکان بڑھنے لگے تو مخالفت پر آمادہ ہو گئے، خود خلافت کے دعویدار بنے، اور پھر جو بھی انداز اختیار فرمائے تاریخ کے اوراق شاھد ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ خلافتِ راشدہ تیس ۳۰ سال رہے گی اور پھر ملوک اور جباروں کا دور شروع ہو جائے گا۔ دوسری حدیث ابوداؤد میں آتی ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ حضرت علیؓ چوتھے خلیفہ ہوں گے اور اُنؓ کے وقت میں فسادات برپا ہو جائیں گے۔

خلافت نام ہے خدا پرستی، اسلامی سادگی، اخوت، انکسار اور ہمدردی کا۔ اور ملوکیت نام ہے خود پرستی، جاہ وحشم، شان وشکوہ اور خود نمائی کا، جہاں اسلامی زندگی چند رسومات تک محدود ہو جاتی ہے۔ چنانچہ امیر معاویہؓ نے بلالحاظ قابلیت، ایمانداری اور دینی خدمات کے ہر اُس شخص کی مخالفت کی جو اُن کے فیصلوں سے متفق نہ تھا۔ ان مظلوموں میں حضرت امام حسنؓ، عبدالرحمٰن بن ابی عبیدہؓ فاتح شام اور ملک الاشتریؒ بھی آ گئے۔ (النبی و الاسلام صفحہ ۵۸۱)

پرانی رقابتیں اور بغض جن کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدینؓ کی روحانی قوت وشوکت نے دبا رکھا تھا از سرِ نو زندہ ہو گئیں۔ اسلام کی ترقی میں زوال آنا شروع ہو گیا۔ اور جس قدر خدا رسیدہ اور بزرگ باریک بین حضرات تھے وہ کنارا کش ہونا شروع ہو گئے۔ (النبی و الاسلام صفحہ ۵۸۱)

یقیناً امیر معاویہؓ کے دور میں کچھ فتوحات بھی ہوئیں لیکن ہمارے پیشِ نظر کسی کی ذاتی تاریخ لکھنا نہیں بلکہ نور مبین صلی اللہ علیہ وسلم کے اُن انوار کا ذکر ہے جو اسلام کو زبوں حالی سے بچانے کے لئے مصروفِ عمل تھے، اور ان زبوں حالات میں بھی وہ انوار صراطِ مستقیم کی طرف امت کی رہنمائی کے لئے تھے۔

ہم یہاں امیر معاویہؓ کی چند اُن سیاسی تدابیر کا ذکر کریں گے جو انہوں نے اپنی سلطنت کے استحکام کے لئے ضروری سمجھیں۔

۱۔ امیر معاویہؓ نے اپنا دارالخلافہ کوفہ سے دمشق منتقل کر دیا۔

۲۔ امیر معاویہؓ کے والد ابوسفیان جس زمانہ میں وہ مسلمان نہ ہوئے تھے اور حضورؐ کی ہجرت کے زمانہ میں اُنؐ کا تعاقب کیا تھا، اور ایک یونانی لڑکی ابوسفیان سے ناجائز تعلق کی بنا پر حاملہ ہو گئی تھی اور اُس کے لڑکا پیدا ہوا۔ ابوسفیان نے اس کا نام زیاد ابن ابی سفیان رکھا لیکن اس کا نام زیاد ابن ابیہ پڑ گیا۔ یہ نہایت مکّار، ذہین اور فطین نکلا۔ اس نے امیر معاویہؓ کی اطاعت کو پسند نہ کیا۔ اُسے یہ اندیشہ ہوا کہ امیر معاویہؓ اپنے بعد کہیں حضرت امام حسین علیہ السلام ہی کو خلیفہ نہ بنائیں۔ امیر معاویہؓ نے بھی اس کی ذہانت و فراست کو دیکھ کر اس سے تعلقات بہتر بنانے کی کوشش کی، اور مغیرہ کے ذریعہ جو اُس کے محسن تھے اُس کو کوفہ لانے کی تدبیر کی۔ جب وہ دونوں کوفہ پہنچے تو امیر معاویہؓ زیاد کو "بھائی" کہہ کر اُس سے بغلگیر ہوئے کہ ہم تم بھائی ہیں، ایک باپ یعنی ابوسفیان کے بیٹے ہیں۔ اور اُس دن مجمعِ عام میں بھائی چارہ قائم ہوا۔

۳۔ امیر معاویہؓ زیاد کی تالیفِ قلب برابر کرتے رہے۔ اور اُس سے اپنی سلطنت کے استحکام کے لئے اہم کام لئے، مثلاً مصر میں امن قائم کرنا۔

۴۔ امیر معاویہؓ نے اس خیال سے کہ اپنے بیٹے یزید کو اپنا جانشین بنائیں، انہوںؓ نے اپنے بڑے بھائی سفیان کو ایک بڑے لشکر کے ساتھ روم کے دارالسلطنت قسطنطنیہ کی طرف روانہ کیا۔ یہ ایک طرح کا جہاد تھا جس کی طرف حضورؐ کی پیش گوئی تھی۔ اور یزید بن معاویہ کو اُن کے ساتھ کیا۔ قسطنطنیہ سے سات میل کے فاصلہ پر جہاز کو رُکنا پڑا لیکن مسلمان شہر میں داخل ہو گئے

اور قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔ شہر میں رومی سپاہ کا مقابلہ مسلمانوں کے لئے آسان نہ تھا پھر یونانیوں نے قلعہ سے بارود کے ذریعہ آگ برسانا شروع کی۔ آخر سفیان کی فوج کو واپس آنا پڑا۔ اور بالآخر امیر معاویہؓ نے اپنی فوج کو خطرناک حالات میں پا کر تیس سال کے لئے رومیوں سے صلح کر لی۔

غرض اس حملہ میں یزید ابن معاویہ نے کوئی کارگذاری دکھائی اور نہ کوئی شہرت پائی۔ بلکہ اس نے امیر معاویہؓ کو امام حسن علیہ السلام کے قتل کی ترغیب دی۔

۵۔ امیر معاویہؓ کو شعر و شاعری کا ذوق تھا۔ ایک ڈاکو پر قاضی نے قصاص کا حکم لگایا۔ اس نے امیر معاویہؓ کے پاس دو شعروں میں اپیل کی، اس میں اپنی فلاکت اور افلاس کا ذکر کیا۔ امیر معاویہؓ پر ان اشعار کا یہ اثر ہوا کہ انہوںؓ نے قاضی کا حکم بدل دیا، اور اس شاعر کو ایک تھیلی اشرفی بھیجی کہ اب ایسا نہ کرنا۔

(ہم نے اس دورِ ملوکیت کے اندازِ حکومت کے تین چار اجزاء کا ذکر کیا ہے، جو ملوکیت اور خلافت کے اندازِ سیاست کو واضح کرنے کے لئے کافی ہیں۔ ملوکیت کا نصب العین حکومت و بادشاہی ہے اپنے لئے، اور خلافت نام ہے اللہ و رسولؐ کے احکام کی سر بلندیوں کا۔ دونوں میں بڑا فرق ہے۔)

۶۔ امیر معاویہؓ کی تاریخ میں سب سے زیادہ افسوسناک واقعہ انؓ کے اپنے بیٹے یزید کو اپنے ہی دورِ خلافت ہی میں اپنا ولی عہد اور حاکم بنانا تھا، جس کی نا اہلی، فسق و فجور پر تاریخ ہی نہیں احادیثِ نبویؐ شاہد ہیں۔ ان کا ذکر آئندہ آئے گا۔

یہ سب کچھ تھا لیکن سیدنا امام حسین علیہ السلام خاموش تھے، اور اس وقت تک مشیتِ ایزدی کے تحت خاموش رہے جب تک یزید نے خلیفہ ہونے کا اعلان نہیں کیا۔ کیونکہ دنیا کہہ سکتی تھی کہ امام حسین علیہ السلام نے امیر معاویہؓ کی مخالفت اپنے والد کے بغض و عناد میں کی۔ یہ بھی کہہ سکتی تھی کہ امیر معاویہؓ

بہرحال مسلمان تھے، صحابی تھے، خلفائے راشدینؓ کے ابتدائی دور میں اُن کے کارنامے اُن کی ذاتی صلاحیتوں پر شاہد تھے۔ پھر امام حسنؑ نے اُنؓ کو خلافت سونپی تھی۔

غرض ابھی اتمامِ حجت کا وقت نہ آیا تھا مشیّتِ الٰہی کو یزید کے اقوال، افعال، اعمال ہی سے اُس کی شخصیت کو عریاں کر کے امتِ مسلمہ کو یہ دکھانا منظور تھا کہ اسلام ہرگز اجازت نہیں دیتا کہ ایسے شخص کی حکومت کو تسلیم کیا جائے، خواہ وہ اپنے کو خلیفہ ہی کیوں نہ کہے، بلکہ اس کا اتباع اسلام اور دینِ اسلام کی بنیادوں کی بیخ کنی کے مترادف ہے۔

○

اب یزید لعین تخت نشین ہوتا ہے (۶۰ھ)

امیر معاویہؓ کو اپنے مخالفین کی طرف سے اب کوئی خطرہ نہ تھا۔ انہوں نے اپنی سلطنت کو وسیع کر لیا تھا۔ ۶۰ھ میں جب انہیں اپنی زندگی کا پیمانہ لبریز ہوتا ہوا نظر آیا تو انہوں نے اپنے بیٹے یزید کو ولی عہد مقرر کر دیا اور تمام صوبوں میں اعلان کرا دیا کہ یزید کی بیعت کے لئے ہر حکومت کے نائبین دارالخلافہ میں حاضر ہوں۔

ہرچند اکثر مسلمان یزید کی بداخلاقی و بداطواری کی بنا پر اُسے اس قابل نہ سمجھتے تھے کہ اس کی خلافت کو بخوشی قبول کریں، لیکن امیر معاویہؓ کی قوت اور اقتدار نے اُنہیں یزید کے ہاتھ پر بیعت کرنے پر مجبور کیا۔ اس بیعت میں خوف، لالچ، دھونس، دھمکی، سب اجزاء شامل تھے۔

لیکن

جن اولوالعزم ہستیوں نے یزید کو ہرگز اس قابل نہ سمجھا کہ اُس کی بیعت کی جاتے، اُن میں چند خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔

۱۔ سیدنا امام حسین ابن علیؑ۔ ۲۔ عبداللہ ابنِ عمرؓ۔ ۳۔ عبدالرحمٰن ابن ابی بکرؓ صدیق
۴۔ عبداللہ ابن زبیرؓ۔ (النبی والاسلام صفحہ ۵۸۲)

چنانچہ

امیر معاویہؓ کی وفات کے بعد یزید آپؓ کا جانشین ہوا۔ مُنہ پر چیچک کے نشان، قلب عصیان سے سیاہ، چہرے پر وحشت، ظالم، جابر، مغرور و سرکش، ریشمی لباس کا شائق، شراب و زنا کا شیدائی۔ یزید کو امیر معاویہؓ نے وصیت کی تھی کہ جو لوگ معزز، با اقتدار ہیں اُن کو ناخوش نہ کرنا، اور ہر شخص سے بیعت لینے میں جلدی نہ کرنا[1]۔

امیر معاویہؓ کی آنکھیں بند ہوتے ہی لوگوں میں اُس کے خلاف نفرت کا جذبہ بیدار ہو گیا، اور اُس نے وہی کیا جو اس کی سرشت کا تقاضا تھا۔ امیر معاویہؓ کے دور میں اگر کوئی بیعت نہ کرتا تو وہ سختی نہ کرتے، اُس کو ہموار کرنے کی کوشش کرتے۔ یزید جیسے بدباطن کو یہ کب گوارا ہوتا کہ کوئی شخص اُس کی بیعت نہ کرے۔ وہ تو سب کو اپنی رعایا اور غلام سمجھتا تھا، خلیفۂ راشد تو نہ تھا کہ خود کو اُن کا خادم سمجھتا۔

ہم ان نازک مسائل میں جانے سے اجتناب کر رہے ہیں جن کا تعلق ہمارے موضوع سے نہیں لیکن یہ بات تو بہرحال غیر متنازعہ ہے کہ امیر معاویہؓ نے اپنی حیات ہی میں یزید کو اپنا ولی عہد بنایا، اور اس سلسلہ میں انعام و

---

[1] تاریخِ اسلام مکمل پانچ جلد، عبدالرحمٰن شوق امرتسری، صفحہ ۵۲۶

تنبیہ دونوں حربوں سے کام لیا۔

پھر جو ہوا وہ اور اُس کے بعد کے حالات

بہتر ہے کہ ہم احادیث کے تراجم پیش کریں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اُن کے رب کی طرف سے وہ تمام علم عطا ہو چکا تھا جو روزِ قیامت تک کے واقعات کو آشکارا کر دینے کے لئے کافی تھا۔ اور یہ اس لئے بھی ضروری ہے کہ ہمارے سامنے تاریخِ اسلام کی تدوین نہیں، نورِ مبینؐ کی سیرتِ پاک کی جھلکیاں پیش کرنا ہے، اور ہر دَور میں حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم جو رہتی دنیا تک کے لئے رسول اور آخری نبی بنا کر مبعوث ہوئے، اُن کے اندازِ ہدایت سے آگاہی حاصل کرنا ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو امت کے لئے

اس جادۂ حق کا تعین کرنا تھا جس پر گامزن ہو کر وہ فلاح کی راہ پا سکتی ہے، جہاں تذبذب کی جگہ تیقنِ کامل، وہم کی جگہ فہم، وسوسہ کی جگہ نورِ ایمان لیتا ہے اور ہر حال میں اللہ ربّ العزت کی کبریائی اور اُس کی قدرتِ کاملہ جادہ حیات میں مؤمن کی رہنما ہوتی ہے۔

رہی زندگی

اُس کی کامیابی اور ناکامیابی کو انسان کیا جانے۔ جس نے جان عطا کی ہے وہی جانتا ہے کہ اس جان کا صرف کہاں اور کیسے ہونا ہے۔ خوش نصیب ہے تو یہ حیاتِ مستعار، اللہ کی راہ میں کام آجائے، بدنصیب ہے کہ نفس کا غلام بن کر اسفل السافلین میں پہنچے۔

اب جس دَورِ یزیدی کا آغاز ہو رہا ہے

پہلے اُس کو احادیث کی روشنی میں دیکھیے، پھر قرآن و سیرتِ پاک کی روشنی میں ان حقائق پر نظر ڈالئے جو تجدیدِ دینِ متین کی بنیاد بنا کرتے ہیں، اور اُس

کے فروغ کے ضامن ہوتے ہیں، اور جس سے بغاوت اللہ ورسول کے دین سے بغاوت کے مترادف ہوتی ہے۔

چند احادیث از صحیح بخاری [1]

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا "میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دو ظرفِ علم یاد کئے ہیں (یعنی دو نوع کے علم)۔ ایک کی تو نشر واشاعت کی جائے اور دوسرے کی اشاعت کروں تو یہ نرخرا کاٹ دیا جائے۔

اس دوسری قسم کی احادیث کے متعلق

حضرت ولی اللہ فرماتے ہیں کہ اس سے مراد اُن فتن اور واقعات کا علم ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد وقوع پذیر ہوئے، جیسے حضرت عثمانؓ اور حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت وغیرہ سب شامل ہیں۔

(صفحہ ۳۵-۳۶)

حضرت ابوہریرہؓ

ان واقعات کے افشاء کرنے اور فتنہ پردازوں کے ناموں کے بتانے سے اس لئے ڈرتے تھے کہ کہیں بنو امیہ کی نوخیز نسل (ان کے لونڈے) انؓ سے برہم ہو کر اُنؓ کو قتل نہ کر ڈالیں۔ (صفحہ ۳۸)

چنانچہ

ابوہریرہؓ فرماتے ہیں "میں اللہ سے ۶۰ھ کے شروع ہونے اور لونڈوں (غنڈوں) کی حکومت سے پناہ مانگتا ہوں۔"

اللہ ربّ العزت نے اُنؓ کی دعا قبول فرمائی اور یزید کی تخت نشینی سے ایک سال قبل رحلت فرما گئے۔ (صفحہ ۳۸)

---

[1] اقتباسات از "یزید کی شخصیت اہلِ سنت کی نظر میں"

حافظ ابن حجرؒ نے فتح الباری میں تصریح کی ہے کہ امام بخاری نے ترجمۃ الباب میں حدیث کا حوالہ دیا ہے وہ مسندِ احمد، سننِ نسائی میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے بایں الفاظ مروی ہے: "میری امت کی تباہی قریش کے چند بے وقوف لوگوں کے ہاتھوں ہوگی" (صفحہ ۴۰)

حضرت ابوہریرہؓ سے پوچھا گیا کہ آپ فرماتے ہیں کہ "میں اللہ سے لونڈوں (غنڈوں) کی حکومت سے پناہ مانگتا ہوں"۔ اس سے کیا مراد ہے؟ فرمایا "اگر تم نے اُن کی اطاعت کی تو ہلاک ہوئے (کہ دین برباد ہوا)، اور اگر تم نے اُن کی نافرمانی کی تو وہ تمہیں ہلاک کر کے چھوڑیں گے (یعنی تمہیں جان سے مار ڈالیں گے اور تمہاری جان و مال دونوں تباہ کر کے رکھ دیں گے)"۔ (صفحہ ۴۱)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ

بازار میں جاتے ہوئے دعا کرنے لگتے، "اے اللہ مجھے ۶۰ھ کا زمانہ نہ آنے پائے اور نہ لونڈوں کی امارت کا"۔ ۶۰ھ یزید کی تخت نشینی کا سال ہے جو ۶۴ھ تک زندہ رہ کر مر گیا۔ (صفحہ ۴۳)

چنانچہ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہدایت فرمائی کہ ان لونڈوں سے دُور رہا جائے۔ واضح رہے کہ ان میں جملہ قریش نہیں بلکہ وہ لوگ ہیں جن کی زندگی، جن کے افعال، جن کے اعمال، جن کی فکر، اُن کی غنڈہ گردی پر شاہد ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ ایک حدیث میں یوں وارد ہوتے ہیں: لَوْ اَنَّ النَّاسَ اعْتَزَلُوْهُمْ کاش لوگ ان (لونڈوں) سے کنارہ کشی کریں (یعنی یہ اُن کے لئے بہتر ہوگا)۔

چنانچہ

صحابہؓ اور تابعینؒ نے اس ہدایت پر عمل کیا۔

"آپ ساری اسلامی تاریخ ایک ایک ورق پڑھ جایئے، یزید کے عہدِ نحوست میں میدانِ کربلا ہو، یا جنگ حرہ، حرمِ الٰہی کا محاصرہ ہو یا حرمِ نبوی کی چڑھائی، اِن میں سے کسی ایک مہم میں یزید کی حمایت میں کوئی صحابیؓ تو درکنار کسی قابلِ ذکر، نیک نام تابعیؒ کا نام بھی آپ کو ڈھونڈھنے سے نہ ملے گا جو یزید کی طرف سے لڑنے پر آمادہ ہوا ہو۔" (صفحہ ۴۵)

یہاں تک یہ سب اقتباسات ہم نے اس دور کی مستند ترین کتاب، حضرت مولانا عبدالرشید نعمانی مدظلہ، کی تالیف سے لئے ہیں۔ کتاب کا نام "یزید کی شخصیت، اہلِ سنّت کی نظر میں" ہے، جو مکتبۂ اہلِ سنّت والجماعت، ۳۸۶ قاسم آباد، لیاقت آباد، کراچی سے شائع ہوئی ہے۔ یہ کتاب دراصل دَورِ حاضر کے اُس فتنہ کے جواب میں ہے جو ناصبیوں نے پیدا کئے، جس کی ابتداء محمود احمد عباسی نے کی، جس کا دین سے کوئی ذہنی تعلق نہ تھا۔

یہ کتاب ایک عالمِ دین کی کاوش کا نتیجہ ہے جو مستند اسناد پر محققانہ انداز سے مرتب کی گئی ہے۔ اس کا مطالعہ اِس دَور میں جب کہ حاکمِ کوفہ کو لوگ رحمۃ اللہ علیہ لکھتے اور بزعمِ خود غلط اپنے کو عالم سمجھ کر اُس کی حمایت میں تقاریر کرتے پھرتے ہیں، ہر دین سے محبت کرنے والے اور متلاشیِ حق کے لئے ضروری ہے۔

○

چونکہ ہمارے نقطۂ نظر سے دینِ متین کی فہم اور نورِ مبینؐ کے انوار سے سرفرازی کے لئے ضروری ہے کہ ہمارے دل میں یہ بات جگہ کر لے کہ کامیابی صرف دنیا کی کامیابی نہیں، بلکہ آخرت کی کامیابی اصلی کامیابی ہے۔ اور ہم یہ بھی سمجھ لیں کہ ہر دَور میں ایسے حالات پیدا ہوں گے جب باطل کا مقابلہ حق کو کرنا ہوگا۔ وہ باطل کے پرستار بھی بظاہر مسلمان ہوں گے۔ ان کا مقابلہ اہلِ حق

ہی کو کرنا ہوگا۔ اس لئے یہ مقابلہ صرف یزید اور حسین علیہ السلام کا ہی نہیں بلکہ یزیدیت اور حسینیت کی فہم سے متعلق ہے اور دائمی ہے اور کسی مصلحت بینی کی بنا پر حق کی راہ میں سیاست کو جواز بنا کر پیش کرنا خود فریبی ہوگا، نادانی ہوگی، ہلاکت ہوگی، اسلام کی بیخ کنی ہوگی۔ اس لئے ہم اس کتاب سے چند اہم موضوع پیش کرنے کی سعادت حاصل کریں گے۔

یزید کی ناپاک زندگی اور مظالم کی داستان دہرانا مقصود نہیں، لیکن ان غلط فہمیوں کا ازالہ ضروری ہے جن سے ایمان کا خطرہ ہے۔ ان میں سب سے بڑی غلط فہمی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کی نافہمی سے پیدا ہوئی، جس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے امیر معاویہؓ نے یزید کو سفیان (اپنے بھائی) کے ساتھ قسطنطنیہ پر جہاد کے لئے آمادہ کیا۔

اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ

واضح رہے کہ اعمال کی بنیاد نیّت پر ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جب مکّہ سے ہجرت فرمائی تو ایک عورت نے بھی اپنے عاشق سے ملنے کے لئے جو مدینہ جا چکا تھا، ہجرت اختیار کی۔ حضورؐ نے فرمایا کہ اعمال کی بنیاد نیتوں پر ہے، جس نے اللہ و رسولؐ کے لئے ہجرت کی اُس کی ہجرت اللہ و رسولؐ کے لئے ہے، اور جس نے اپنے محبوب کے لئے ہجرت کی اُس کی ہجرت اُس کے شوہر یا محبوب کے لئے ہے۔

قسطنطنیہ کے غزوہ کے متعلق حضورؐ کا یہ فرمان تھا "مُغْفُوْرٌ لَّھُمْ" جس سے زیادہ سے زیادہ یہ مراد لی جا سکتی ہے کہ اگر جہاد خلوصِ نیت سے ہے تو اُن کے گناہ بخش دیئے گئے۔ کیونکہ جہاد کفارات میں سے ہے، اور کفارات کا کام یہ ہے کہ سابقہ گناہ کا اثر زائل کر دیتے ہیں۔

اور یہاں یہ حال ہے کہ ۵۰ھ میں جب امیر معاویہؓ نے جہاد کا لشکر روم

کے لئے تیار کیا اور ابوسفیان بن عوف کو اس کا امیر لشکر مقرر کیا تو اپنے بیٹے یزید کو بھی اس غزوہ میں شریک ہونے کا حکم دیا مگر یزید نے حکم کی تعمیل میں سستی کی اور معذرت کر دی۔ یہ دیکھ کر اس کے والدؓ نے اس کو رہنے دیا۔ وہاں لوگ بھوک اور شدید امراض میں مبتلا ہوئے تو یزید نے وہ اشعار پڑھے جن کا مطلب یہ تھا:

مجھے کچھ پرواہ نہیں کہ روم میں مسلمانوں کے فوجی کیمپ میں مسلم مجاہدین کے دستہ ہائے فوج کو بخار اور چیچک کا سامنا ہے، جب کہ میں دیر مران میں اونچے اونچے تکیوں کے سہارے بیٹھا ہوں اور میرے سامنے ام کلثوم ہے۔"

امیر معاویہؓ نے پھر حکم بھیجا کہ یزید کو جانا ہوگا۔ آخر بادل نخواستہ وہ روانہ ہوا۔ اور جہاں اس لشکر کے جانباز حضرت ابن عباسؓ، حضرت ابن عمرؓ، حضرت ابن زبیرؓ، حضرت ابوایوب انصاریؓ، وغیرہ نے جان کی بازی لگا دی اس جنگ میں یزید کی شرکت بادل نخواستہ تھی۔

بلکہ اس نے تو اپنی تخت نشینی کے بعد خطبہ دیا کہ میرے والد تم کو بحری جہاد کے لئے بھیجتے تھے، موسم سرما میں روم کی جانب روانہ کرتے تھے، میں یہ کبھی نہیں کروں گا۔

(از یزید کی شخصیت صفحہ ۱۸ تا ۲۰)

اسی بنا پر امام ابوبکر احمد بن علی "احکام القرآن" میں فرماتے ہیں:

"نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں اصحابؓ، خلفاء اربعہؓ کے بعد فاسق امراء کے ساتھ جہاد میں شریک ہوتے تھے۔ چنانچہ حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ نے "یزید لعین" کی معیت میں بھی جہاد فرمایا ہے۔"

جس سے جہاد کا جہاد ہونا اور یزید کا فاسق ہونا بخوبی ظاہر ہوتا ہے۔

بعض محدثین نے حدیث میں "مدینۂ قیصر" سے مراد قسطنطنیہ

نہیں بلکہ حمص[1] لیا ہے، جو اس وقت روم کا دارالسلطنت تھا جب حضورؐ کی زبانِ مبارک سے وہ الفاظ نکلے جن میں مغفرت کا وعدہ ہے تو اس کے بعد یزید کی مغفرت کا دعویٰ بے معنی ہو جاتا ہے۔

بالفرض اگر یہ مان لیا جائے کہ اس غزوہ میں یزید کی شرکت سے اس کے پہلے کے گناہ معاف ہو گئے تو اس کو کیا کہا جائے گا کہ یہ غزوہ ۵۰ھ کا ہے اور اس کے بعد یزید اور ۱۲، ۱۳ سال زندہ رہا۔ اور پھر اس نے ۶۰ھ کے بعد جو کارہائے سیاہ کیئے اُن کی آگ کے شعلوں سے مغفرت کیونکر ہو گی۔

وَمَا اَصْبَرَهُمْ عَلَى النَّارِ۔

یزید کے کرتوت اس کتاب "یزید کی شخصیت" میں امام ابن حزم ظاہری کے الفاظ میں پیش کئے گئے ہیں۔ ان کا خلاصہ ہے!

یزید اسلام میں بُرے کرتوتوں کا کرنے والا تھا۔ جس نے سلطنت کے اوائل ہی میں حضرت حسینؓ اور اُنؓ کے اہلِ بیت کو قتل کیا۔ اس نے اپنے اقتدار کے آخری دور میں حرّہ کے دن اہلِ مدینہ کو قتل کیا جو مہاجرین اور انصار باقی رہ گئے تھے، اکابر صحابہؓ اور اکابرِ تابعین، بہترین مسلمان حرّہ کی جنگ میں کھلے بندوں سفاکی سے قتل کیے گئے۔ بعض کو گرفتار کیا گیا اور پھر شہید کیا گیا۔

"یزیدی لشکر کے گھوڑے رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کی مسجد میں اپنی جولانی دکھاتے رہے، اور ریاض الجنۃ میں آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کی قبر اور آپؐ کے منبرِ مبارک کے درمیان لید کرتے پیشاب کرتے رہے۔ اُن دنوں میں مسجدِ نبوی میں کسی ایک نماز کی بھی جماعت نہ ہو سکی، اور سعید بن

---

[1] حمص میں قیصر کی رہائش تھی۔

المسیبؓ کے سوا وہاں کوئی موجود نہ تھا، جن کو لوگوں نے دیوانہ سمجھ کر چھوڑ دیا تھا۔
(ان کا ذکر ہم اس سے قبل کر چکے ہیں)۔

"اور اس حادثہ میں لوگوں کو اِس بات پر مجبور کیا گیا کہ وہ یزید بن معاویہ کی اِس شرط پر بیعت کریں کہ وہ اُس کے غلام ہیں، چاہے وہ اُن کو بیچے، چاہے اُن کو آزاد کرے۔ اور جن لوگوں نے اس کے حاکم کے سامنے یہ بات رکھی کہ ہم قرآن اور سنّتِ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کے تحت بیعت کرتے ہیں، اُن کو گرفتار کر کے فوراً قتل کر دیا گیا۔

"یزید کے حاکم یا اسلام کے مجرم (مسلم بن عقبہ) نے اسلام کی بڑی بے عزّتی کی۔ مدینہ منوّرہ میں اس سے تین دن تک لوٹ مار کا سلسلہ جاری رکھا۔ حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کے صحابہؓ کو ذلیل کیا گیا، اُن پرؓ دست درازی کی گئی، اُن کے گھروں کو لُوٹا گیا۔ پھر مدینہ منوّرہ کو تباہ و تاراج کرنے کے بعد اس کی فوج مکّہ معظّمہ کی طرف چل پڑی۔ وہاں جا کر مکّہ معظّمہ کا محاصرہ کیا اور بیت اللہ پر "منجنیق" سے سنگباری کی۔ اس واقعہ کے تین دن بعد اس مجرمِ اسلام مسلم بن عقبہ کو موت نے آ دبوچا، اور پھر اللہ تعالیٰ نے یزید کو بھی دھر پکڑا۔ وہ بھی اس واقعہ کے تقریباً تین ماہ بعد موت کا شکار ہوا اور لشکر مدینہ سے واپس ہوئے۔ اس وقت یزیدِ لعین کی عمر کچھ اوپر تیس سال تھی، اور اس کا دَورِ حکومت (یا دورِ عذاب) تین سال آٹھ ماہ اور کچھ دن رہا۔"

(اقتباس از یزید کی شخصیت صفحہ ۲۷ تا ۳۱)

غرض یہ ہے کہ اس شخص کی سیرت جس کے متعلق حافظ ابن تیمیہؒ "منہاج السّنۃ" میں رقم طراز: "ناصبیوں کی ایک جماعت اس یزید کو صحابی خیال کرتی ہے، اور بعض غالی ناصبی اس کو نبی جانتے ہیں۔"

مولانا عبدالرّشید نعمانی مؤلف کتاب تحریر فرماتے ہیں: "غنیمت ہے کہ ہمارے

دور کے ناصبی ابھی اس مقام تک نہیں پہنچے بلکہ وہ یزید کو صرف خلیفۂ راشد سمجھتے ہیں اور سیدنا کہہ کر اُس کی خدمت میں آداب بجالاتے ہیں۔" (صفحہ ۳۳)

حقیقت یہ ہے کہ

جس نے بھی یہ کہا ہے خوب کہا ہے

ضَحّٰی بَنُوْ اُمَیَّۃَ یَوْمَ کَرْبَلَاءِ بِالدِّیْنِ: کربلا کے دن بنی امیہؓ نے اپنے دین کو ذبح کر کے رکھ دیا۔ (صفحہ ۶۶، یزید کی شخصیت)

رہا یزید کا انجام

اس کے متعلق حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ کچھ اس انداز پر ہیں جس طرح آپؐ نے دجال کے داخلِ جہنم ہونے کی خبر دی۔

آپؐ نے فرمایا:

"جو شخص اہلِ مدینہ پر داؤ چلائے گا اس طرح گھل جائے گا جس طرح نمک پانی میں گھل جاتا ہے۔"

کیا یہ حقیقت نہیں کہ آج اُس کی نسل میں سے تو اللہ تعالیٰ نے ایک شخص کو بھی باقی نہ چھوڑا جو اُس کے تاریک گھر کو آباد کرے یا اس میں دیا جلائے، البتہ اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ حضورؐ کے دشمنوں میں اس کا نام درج ہے اور اللہ تعالیٰ سب سے سچا ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہؒ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ حدیث نقل فرمائی ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے چھ اشخاص پر لعنت کی ہے۔

۱۔ کتاب اللہ پر زیادتی کرنے والا۔ ۲۔ تقدیرِ الٰہی کی تکذیب کرنے والا۔

۳۔ جبر و زور سے تسلط حاصل کر کے، جس کو اللہ تعالیٰ نے ذلیل کیا ہے اُسے عزت بخشنے والا، اور جس کو اللہ تعالیٰ نے عزت دی ہے اُس کو ذلیل کرنے والا۔

۴۔ حرمِ الٰہی کی حرمت کو پامال کرنے والا۔

۵۔ میری عترت (عترتِ رسولؐ) کی جو حرمت اللہ تعالیٰ نے رکھی ہے اس کو حلال کر دینے والا۔

۶۔ میری سنّت کا تارک (مشکوٰۃ و ترمذی شریف)

یہ تو نہیں معلوم کہ یزید تقدیر کا بھی منکر تھا یا نہیں مگر باقی عیب اس میں موجود تھے۔
(یزید کی شخصیت صفحہ ۲۵)

یہ وہ تاریکیاں تھیں

وہ ظلمتیں تھیں جنہوں نے عالمِ اسلام کو گھیر لیا تھا اور اُن کو دور کرنے کے لئے ایک ایسی ہستی کی ضرورت تھی جو حق و باطل کے مقابلہ کے لئے مستعد ہو اور کسی قربانی سے دریغ نہ کرے، اور جو خود نورِ مبین صلّی اللہ علیہ وسلّم کے انوار سے فیض یاب ہو، اور آغوشِ نبوّت کی پروردہ ہو۔

اب اس ہستیٔ مبارکہؑ کا ذکر آرہا ہے۔

سیّدنا امام حسین علیہ السّلام

اَلْحُسَیْنُ مِنِّیْ وَاَنَا مِنَ الْحُسَیْنِ (نبی کریمؐ نے فرمایا حسینؑ مجھ سے ہیں اور میں حسینؑ سے)

---

[1] اس بندۂ عاجز نے سیّدنا امام حسن و حسین کو جا بجا علیہ السلام کے نذرانۂ عقیدت سے یاد کیا ہے۔ یہی میرے بزرگوں کا شیوہ رہا ہے، اور ان میں مولانا شبلی نعمانیؒ، مولانا سلیمان ندویؒ، مولانا اشرف علی تھانویؒ جیسی بزرگ ہستیاں شامل ہیں۔ (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

اس حدیث مبارکہ کے سلسلہ میں حضرت ام الفضل بنت الحارث رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی وہ روایت یاد کیے جانے کے قابل ہے جس میں آپؓ نے حضورؐ سے اپنے ایک بھیانک خواب کا ذکر فرمایا، اور کہا کہ میں نے دیکھا گویا آپؐ کے جسم اطہر کا ایک ٹکڑا کاٹ کر میری گود میں ڈال دیا گیا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "تم نے بہت اچھا خواب دیکھا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے چاہا تو فاطمہؓ کے لڑکا پیدا ہوگا اور وہ بچہ تمہاری (ام الفضلؓ کی) گود میں رہے گا۔" (چنانچہ ایسا ہی ہوا)۔ بلاشبہ اس حدیث کا پہلا ٹکڑا آپؓ کی پیدائش سے اور آخری آپؓ کی شہادت سے متعلق ہے، جس کا تعلق احیاءِ اقدارِ اسلامی سے ہے، جس کا ذکر آخر میں آئے گا۔

غرض سبطِ پیمبرؐ، جگر گوشۂ رسولؐ، داستانِ حیات کا یہ وہ باب ہے جس نے کلمۂ حق کی برتری، دینِ مبین کی بقاء کے لئے ایک ایسی قربانی پیش کی جو نہ صرف رہتی دنیا تک اپنی مثال آپ ہے بلکہ جس کی قبولیت بارگاہ ربّ العزّت میں اس انداز سے ہوئی کہ آج تک اہلِ علم وفضل اس شہادت کو

"حقا کہ بنائے لا الٰہ است حسینؓ"

سے تعبیر کرتے ہیں۔

(حاشیہ گذشتہ بقیہ) اور ہماری احادیث کی کتب تدریجی۔ جانتا ہوں کہ رضی اللہ عنہ وہ عالی مقام ہے جس سے اللہ تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کبارؓ کو سرفرازی بخشی ہے جو نفس مطمئنہ کے لئے راضیاً مرضیاً کی راہ رضا ہے۔ لیکن میرا ایمان ہے کہ جب بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں میں اللہ تعالیٰ مجھے لے جائے گا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو صحابہ عظامؓ کی محفلِ پرانوار میں دیکھوں گا، تو یہی دیکھوں گا کہ سیدنا امام حسنؑ اور امام حسین علیہ السلام صحابہ کرام کو خلوص محبت سے رضی اللہ عنہ کہہ کر اور وہ نہایت اخلاص وعقیدت سے انہیں علیہ السلام کہہ کر خطاب کر رہے ہوں گے اور سرورِ کائنات متبسم ہوں گے، انشاء اللہ۔

واقعاتِ کربلا ہر مسلمان بچہ کی نوکِ زبان پر ہیں، لیکن ہمیں چونکہ سیرتِ نورِ مبینؐ کو واضح کرنا ہے اس لئے اس نقطۂ نظر سے چند امور کی طرف توجہ مبذول کرنا ضروری ہے۔ خلافتِ راشدہ نے شہنشاہیت اور مطلق العنانیت کی شہ رگ پر ضربِ کاری لگائی۔ اس وقت یزیدیت نے اپنی ذات، اپنے نفس، اپنے عیش، اپنی خودنمائی، اپنے جاہ وحشم کے لئے جو ضروری سمجھا دہ کیا، اس حد تک کہ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم سے پاسِ قرابت[1] کی طرف جن الفاظ میں قرآنِ حکیم نے اور جن احادیث میں رسولِ مقبولؐ نے لوگوں کو آگاہی بخشی تھی، اس سے بھی قطع نظر کر لیا، اور اس بربریت کا مظاہرہ کیا کہ پھر اس یزید کے خلاف کسی کو سر اُٹھانے کی ہمت نہ ہو۔

اُدھر قدرت کو منظور ہوا کہ اس وقت تعلیماتِ اسلامی اور خلافتِ راشدہ کے زرّیں اصول، جن کی بنیاد تقویٰ، پرہیزگاری، خلقِ خدا کی خیرخواہی، ایثار ومحبت پر ہے، اس کی پاسبانی حسینیت کو سپرد ہو۔

کربلا کا یہ واقعہ حق وباطل کی اسی معرکہ آرائی کا ایک لافانی مظہر ہے، اور انسانیت کے لئے اس راہ کا تعین ہے جس پر اُس کو بہرحال قائم رہنا ہے، موت سے بے نیاز ہو کر سطوتِ جبّاری اور سیاستِ اسلامی کے فرق کو بھی اجاگر کرنا ہی حق اور ہدایت ہے، اور یہی نورِ مبین صلی اللہ علیہ وسلم کا

---

[1] قرابتِ رسولؐ سے کیا مراد ہے، اس کے بارے میں شارحینِ صحیح بخاری کی رائے حضرت مولانا نعمانی ان کے الفاظ میں بیان کرتے ہیں جن کا مطلب ہے:

"پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی قرابت" سے مراد وہ مومن حضرات ہیں جن کا سلسلۂ نسب خواجہ عبدالمطلب سے ملتا ہے جیسے حضرت علی مرتضیٰ اور ان کے صاحبزادگان رضی اللہ تعالیٰ عنہم (یزید کی شخصیت صفحہ ۶۸)

وہ انداز ہدایت ہے جسے حضرت امام حسین علیہ السلام اور اُن کے مختصر قافلہ کے ذریعہ امت پر آشکارا کیا گیا۔

سیاستِ اسلامی:۔ جب یزید نے مدینہ میں حضرت امام حسینؑ کو چین سے رہنے نہ دیا تو آپؑ مکّہ مکرمہ تشریف لے آئے۔ وہاں بھی یزید نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے نام ایک خط لکھ کر امام حسینؑ کو قتل کی دھمکی دی۔ سیّدنا امام حسینؑ نے وہی کیا جو سیدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے اپنی خلافت کے دور میں مدینہ میں کیا تھا، یعنی اپنی جان دینا گوارا کیا لیکن یہ گوارا نہ فرمایا کہ مدینہ کی سرزمین کی حرمت مسلمانوں کے خون سے پامال کی جائے۔ سیدنا امام حسینؑ نے مکّہ کو اس لئے خیر باد کیا کہ "حرمِ کعبہ میں خوں ریزی نہ ہو اور حرم کی عزّت خاک میں نہ ملے"۔ لیکن ملوکیت کی سیاست ایسے پاک تصوّرات سے محروم ہوتی ہے، خصوصاً یزید کی سیاست، جس نے مدینہ کی گلیوں کو خون آشام ہی نہیں کیا بلکہ ہر حرام کو تین دن کے لئے حلال کر دیا۔

۲۔ حضرت امام حسین علیہ السلام کوفہ کی طرف روانہ ہوئے۔ ایک وجہ تو یہ تھی کہ وہاں کے لوگ آپؑ کو دعوت دے رہے تھے۔ آپؑ اگرچہ گوشہ نشین ہو چکے تھے لیکن اہلِ کوفہ کے اصرار کے ساتھ آپؑ کو اُن کی وفاداری کا یقین تھا۔ اس لئے آپؑ نے ان حالات میں جہاد فی سبیل اللہ کو گوشہ نشینی پر ترجیح دی۔

۳۔ آپؑ نے ضروری سمجھا کہ کسی عملی اقدام سے قبل حالات کا جائزہ لیا جائے۔ آپ نے اہلِ کوفہ کی طرف اپنے چچا زاد بھائی مسلم بن عقیل رضی اللہ عنہ کو جانے کا حکم دیا۔ اُن لوگوں نے مسلمؓ کی بڑی قدر دانی کی اور آٹھ ہزار جان نثاروں نے اُنؓ کو اپنی وفاداری کا یقین دلایا، اور اُن کے ہاتھ پر بیعت کی۔ مسلم بن عقیلؓ نے جب ان لوگوں میں یہ جذبۂ ایمانی دیکھا تو امام حسینؑ کو اس کی

اطلاع دی اور کوفہ جلد آنے کی تاکید کی۔

۴۔ اُدھر یزید کو جب اہلِ کوفہ کی اِس جاں نثاری کی اطلاع ہوئی تو اُس نے فوراً ابن زیاد کو، جس کو مؤرخین نے قصائی لکھا ہے اور جو اُس وقت بصرہ کا عامل تھا، حکم دیا کہ وہ فوراً بصرہ سے کوفہ جائے اور وہاں کے حاکم نعمان کو معزول کرے، حالات کو سنبھالے۔ ابن زیاد بڑا جنگجو سنگدل واقع ہوا تھا، وہ نہایت چالاک اور ہوشیار تھا، فوراً کوفہ پہنچا۔ اور کوفہ پہنچتے ہی ظلم و تشدّد کا بازار گرم کر دیا، کہ جذبۂ محبت حق کی طرفداری سے باز آئے اور تشدد جان بچانے کی فکر میں باطل کا معاون ہو۔ اور یہی ہوا مسلمؓ کو خود جان بچانے کے لالے پڑ گئے، اور بالآخر قید ہوئے اور شہید کئے گئے۔

۵۔ امام حسین علیہ السلام کو مکّہ معظّمہ سے تھوڑے ہی فاصلہ پر اس کی اطلاع ہوئی۔ آپؑ نے اپنا سفر جاری رکھا، کہ اب واپسی جان بچانے کے لئے ہوتی جب کہ سفر حق کی بلندی کے لئے اختیار کیا گیا تھا۔ اب بھی لوگوں کی کثیر تعداد امام حسینؑ کے ساتھ تھی۔ آپ نے ایک رات خطبہ دیا اور فرمایا کہ "میرا ارادہ سلطنت قائم کرنا نہیں، نہ دوسروں کو اس سے مستفید کرنا ہے میرا مقصد تو یہ ہے کہ یزید سے حق کے متعلق گفتگو کروں، اسے سمجھاؤں ضرورت پڑے تو ہجرت کروں اور مجبوری ہو تو جہاد کروں۔ حق اور عرفانِ حق کے لئے جو طریقہ ضروری ہو وہ اختیار کروں۔" لوگ یہ تقریر اور اس قسم کے خطبات سن کر واپس ہونا شروع ہوئے، یہاں تک کہ آپؑ کے ساتھ ایک مختصر قافلہ ۷۲ افراد پر مشتمل رہ گیا جس میں خواتین اور بچے بھی تھے۔

یزید کو یہ بھی گوارا نہ ہوا اور حُر کو اُنؑ کا راستہ روکنے کے لئے مقرر کیا اور بالآخر ابن زیاد کا حکم ہوا کہ "تا وقتیکہ حسین ابن علیؑ یزید کی بیعت نہ کریں دریائے فرات کے پانی کا ایک قطرہ بھی اُنؑ کے خیمہ تک نہ جانے پائے" حضرت امام حسینؑ کا

واقعۂ کربلا اس بے آب و گیاہ ریتیلی زمین میں چند اُن نورانی ہستیوں کے ساتھ جن کا وجود کائنات کے لئے رحمت ہے آج بھی لِرَبِّكَ فَاصْبِرْ کی یادیں تازہ کر رہا ہے، اور امت کو یہ درس دے رہا ہے
"کہ یہ سر صرف اس لئے ہے کہ اللہ کے سامنے جُھکے یا اُس کی راہ میں تن سے جُدا ہو"۔

سیاستِ اسلامی کے ایک نکتہ کی وضاحت ابھی باقی تھی، یعنی "مقامِ صُلح"۔ چنانچہ حضرت امام حسین علیہ السلام نے عمرو بن سعد کے سامنے صلح کی تین شرطیں پیش فرمائیں۔

۱۔ یا تو مجھے یزید کے پاس جانے دو تاکہ اُس سے گفتگو کر سکوں۔

۲۔ مجھے واپس جانے دیا جائے۔

۳۔ یا پھر خراسان جانے دو کہ وہاں کافر ترکوں سے لڑوں۔

حضرت امام حسینؑ کی دوسری اور تیسری شرط یقیناً اتمامِ حجت کے لئے تھیں، اور یہ بھی ظاہر کرنے کے لئے کہ یہ جنگ صرف ایک فردِ واحد کے قتل کے لئے رچائی جا رہی ہے اور اس کا تعلق اسلام یا فروغِ اسلام سے دُور کا بھی نہیں۔
عمرو بن سعد نے یہ شرطیں ابن زیاد کو لکھیں، اور اُس نے شمرِ لعین کے ہاتھ عمرو بن سعد کو یہ حکم دیا کہ "اگر امام حسینؑ یزید کی بیعت پر رضامند ہوں تو اُنؑ کے ساتھ نرمی سے پیش آؤ، ورنہ اُنہیںؑ فوراً قتل کر کے اُنؑ کی لاش گھوڑوں کے سُموں سے پامال کر دو" ساتھ ہی شمرِ لعین کو یہ بھی حکم دیا کہ اگر عمرو بن سعد اس حکم کے بجالانے میں تساہل کریں تو تم کو حکم دیا جاتا ہے کہ عمرو بن سعد کا سر کاٹ کر تم اُس حکم کی تعمیل کرو۔ (تذکرۃ الکرام تاریخ خلفائے اسلام صفحہ ۲۹۱)

حضرت حسینؓ بن علیؓ نے

آخری تقریر خیمۂ مبارک میں فرمائی: "یزید کے لشکر نے ہمیں گھیر لیا ہے، و صرف

میری موت کے خواہاں ہیں۔ اِس لئے تم مجھے خدا کے سپرد کرو اور اپنی جانیں میرے ساتھ ضائع نہ کرو۔" ان ۷۲ فدائیوں میں جن میں عورت، بچے، جوان بوڑھے سب ہی شامل تھے کسی سے گوارا نہ ہوا کہ امام حسین علیہ السّلام کو تنہا چھوڑیں۔ انہوں نے بھی کہا کہ خدا ہمیں وہ دن نہ دکھائے کہ آپ کو دشمن کے نرغہ میں چھوڑ کر اپنی جانیں بچائیں۔ یہ ہے وہ محبّت جس کا تعلق صرف اور صرف سیاستِ اسلامیہ سے ہے، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ محبت اور سیاست میں وہی فرق ہے جو حسینیت و یزیدیت میں ہے۔

ان جانکاہ واقعات کا بیان ممکن نہیں لیکن نو۹ اور دس۱۰ محرم کو ظلم، سفّاکی کے جو مناظر کربلا کے میدان میں دیکھے گئے، اُن پر، سوائے فوجِ یزید کے ظالموں کے، کائنات کا کوئی ذرہ نہ تھا جو مشغولِ بکاء نہ ہوا ہو۔ زمین روئی، آسمان رویا، فرشتے روئے، اور مشیّتِ ایزدی کے تحت، جادۂ راہِ حق کا تعین خونِ حسینؑ سے کیا گیا۔ جہاں کربلا کی زمین پر آپؑ کے ایک ایک ساتھی نے سوائے حضرت زین العابدین جامِ شہادت نوش کیا، اُن میں وہ معصوم بچّہ بھی تھا جس کا حلق پیاس سے خشک تھا۔

آخر یہ کیوں ہوا۔

مشیّت کو یہ کیوں منظور ہوا۔ جب کہ خود سرورِ کائنات صلّی اللہ علیہ وسلّم کو بھی آپؐ کی حیاتِ طیبہ میں اس کی اطلاع دی جا چکی تھی۔ چنانچہ شہادتِ امام حسینؑ کے متعلق حضرت اُمّ الفضلؓ بنت الحارث رضی اللہ عنہا کا ایک اور واقعہ قابلِ ذکر ہے۔

ؓ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہا حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی اہلیہ محترمہ اور بڑی قدیم الاسلام صحابیہ تھیں۔

جن دنوں حضرت امام حسینؑ امّ الفضلؓ کی گود میں پرورش پا رہے تھے، وہؓ ایک دن کا واقعہ بیان کرتی ہیں، کہ میں امام حسینؑ کو لے کر حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلّم کے پاس حاضر ہوئی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کے آغوش میں ڈالا تو کیا دیکھتی ہوں کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی چشمان مبارک سے آنسو رواں تھے۔ میں نے (ام الفضلؓ نے) عرض کیا: یا رسول اللہؐ میرے ماں باپ آپؐ پر فدا ہوں، آپؐ کو کیا ہوگیا۔ فرمایا: "جبریل علیہ السلام میرے پاس آئے تھے۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ میری امّت عنقریب میرے اس بیٹےؑ کو قتل کر دے گی، اور مجھے انؑ کے مقتل کی سُرخ ریت بھی لا کر دی ہے۔"

(یزید کی شخصیت صفحہ ۲۰۴)

ایک دوسری حدیث میں ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ میں نے ایک روز دوپہر کے وقت خواب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کو اس حال میں دیکھا کہ بال بکھرے ہوئے ہیں، چہرۂ مبارک غبار آلود ہے، اور آپؐ کے دستِ مبارک میں ایک شیشہ کی بوتل ہے جس میں خون بھرا ہوا ہے۔ میں نے عرض کیا: میرے ماں باپ آپؐ پر فدا ہوں، یہ کیا حالت ہے، یہ بوتل کیسی ہے۔ آپؐ نے فرمایا: یہ حسینؑ اور اُن کے رفقاء کا خون ہے جو آج دن نکلنے سے سمیٹ رہا ہوں؟ ابن عباس رضی اللہ عنہ کا بیان ہے، اس وقت کا جب میں حساب لگاتا ہوں تو یہ وہی وقت تھا جس وقت اُنؑ کو شہید کیا گیا تھا۔

مولانا نعمانی رقم طراز ہیں: امّ الفضلؓ اور ابن عباس دونوں کی روایتوں کو بیہقی نے دلائلِ نبوۃ میں روایت کیا ہے، اور امام احمد نے اُسے اپنی مسند کے آخر میں نقل کیا ہے۔ (یزید کی شخصیت صفحہ ۲۰۶)

اللہ تعالیٰ کی مشیت کو کما حقّہ اُس کے رسولِ کریمؐ کے سوا کون جان سکتا ہے؟

البتہ یہ بات ضرور واضح ہوتی ہے کہ کلمۂ طیبہ کی تفہیم کی تکمیل حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد جس انداز سے اللہ جل شانہٗ نے فرمائی اس میں جوانانِ بہشت کے سردار سیدنا امام حسینؑ ہی کے سرِ اقدس کو خصوصی سربلندی حاصل ہوئی۔ اور میدانِ کربلا میں آپؓ نے "الفرقان" بن کر کلام ربانی کی حقیقت یعنی حق و باطل میں فرق کو واضح اور جادۂ راہِ بقا کا تعین فرمایا۔

جیساکہ بیان کیا جاچکا ہے کہ اُمّ الصفات سات ہیں

حیات۔علم۔ارادہ۔قدرت۔سمع۔بصر۔کلام

حضورؐ میں اِن کا امتزاج کامل حد تک تھا۔ لیکن ان کو الگ الگ سمجھانا اور ان کی اہمیت کو نمایاں کرنا ضروری تھا۔ ان کے ترجمان اصحابِ رسول رضی ایک حد تک یوں بنے؛ کہ صدیقِ اکبرؓ نے مقامِ حیات (صدق)، سیدنا عمر فاروق رضی نے مقامِ علم (عدل)، سیدنا عثمانِ غنی رضی نے مقامِ ارادہ (اور ترحم)، علی مرتضےٰ کرم اللہ وجہہ نے مقامِ قدرت (شجاعت) کو آشکارا کیا۔ پھر اہلِ بیتِ اطہار رضی میں سے مقامِ علم کو حضرت عائشہ رضی کے ذریعہ، مقامِ سمع کو حضرت فاطمہ رضی کے ذریعہ، بصر کو امام حسن رضی کی بصیرت کے ذریعہ سمجھایا گیا۔ رہا کلام، جو حق و باطل میں فرق کرنے والا ہے اسے سیدنا امام حسینؑ اور اُن کے رفقاء کے واسطے سے نمایاں کیا گیا۔

اور

ہر دورِ حیات کے لئے جادۂ حق کا تعین، اور واضح انداز سے الصراط المستقیم کی نشان دہی کر دی گئی، جو بندوں سے اللہ کی جانب جاتی ہے۔ اس کے دو کنارے ہیں، یعنی اطراف ہیں جو شریعت کے حدود کا تعین کرتے ہیں۔
گویا اس عظیم شاہراہ کے دونوں جانب شجرہائے معرفت لگے ہوتے ہیں۔
ایک جانب سرسبز ہرے بھرے درخت، سڑک کی دوسری جانب سرخ

گلنار کے درخت، گویا ایک کنارا اس راہِ حق کا وہ ہے جہاں تک انسان کو راہِ رضا میں زندگی بسر کرنے کے لئے صلح کی اجازت ہے، اور یہ ظاہر کرنا منظور ہے کہ کس حد تک جھک کر بھی صلح کی جاسکتی ہے بشرطیکہ اقدارِ شریعت کو نقصان کا اندیشہ نہ ہو۔ اور صراطِ مستقیم کی دوسری طرف وہ ہے جہاں کسی صلح کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، جہاں اللہ کے بتلائے ہوئے کلمہ کی حفاظت و شہادت انسان کا فرضِ منصبی بن جاتا ہے، جہاں اس کلمہ کی شہادت و برتری کے لئے فرد ہو یا جماعت، چھوٹی ہو یا بڑی اُسے قربانی کے لئے تیار رہنا پڑتا ہے، یہاں گراں قدر سے گراں قدر قربانی سے دریغ نہیں کیا جاتا، خواہ وہ مال کی ہو، جان کی ہو یا اہل و عیال کی۔

واضح رہے کہ اس شاہراہ کا ایک کنارا جو متعلق بہ بصیرت ہے۔

حَسَنیّت ہے

اور دوسرا کنارا جو متعلق بہ کلام ہے۔ حُسینیت ہے۔

اگر اس وقت سیدنا امام حسینؑ نے حق کے لئے ہر قربانی اور شہادت پیش نہ فرمادی ہوتی تو آج ہر مسلمان کو اپنے ذاتی اغراض کے لئے یہ کہنے کا موقع مل جاتا کہ ہم کسی ناحق بات کے خلاف اپنی جان جوکھوں میں کیوں ڈالیں۔ اگر آج کہیں بھی ناحق کے مقابلہ میں حق کے لئے کوئی "ندائے حق" بلند ہوتی ہے تو یہ خونِ حسینؑ ہی کا صدقہ ہے۔

○

اور وہ آیتِ مبارکہ جو حضورؐ پر نازل ہوئی وَلِرَبِّكَ فَاصْبِرْ۔ اس کی تعلیم خود نورِ مبینؐ اپنے ہی لختِ جگر کے ذریعہ امت کو دے رہے ہیں، جیسے اَلْحُسَيْنُ مِنِّيْ وَاَنَا مِنَ الْحُسَيْنِ کی تفسیر سمجھنا چاہیئے۔ تاکہ امت راہِ حق میں ثابت قدم رہے اور کسی مصیبت یا اندوہناک حالات میں بھی بے نہ

بھولے کہ اس کی منزل یہ دنیا نہیں بلکہ آخرت ہے، اور وہ جنّت ہے جس کے سردار سیدنا امام حسن و امام حسین علیہما السلام ہیں۔

الحمد للہ

قلم یہاں تک ترجمانِ حق ہوا تھا کہ قریب کی مسجد سے اذان کی آواز کانوں میں آئی، اور رُک گیا۔ دل نے کہا کہ انہیں شہادتوں کا صدقہ ہے کہ آج تک مساجد سے یہ ادائیں بلند ہو رہی ہیں۔

اللہ اکبر اللہ اکبر اللہ اکبر اللہ اکبر

اور آج بھی بقول محترم سید ابوالخیر کشفی صاحب

"خونِ حسینؓ ہی ہمارے قطراتِ خون میں شامل ہے

ہزار بار مجھے لے گیا ہے مقتل میں
وہ ایک قطرۂ خون جو رگِ گلو میں ہے

سید سلیمان ندوی"

و

فصل چہارم

خلافتِ راشدہ کے بعد انوارِ نورِ مبینؐ کی تجلیات

دینِ متین تکمیل پا چکا ہے، حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے سفرِ جاوداں کے بعد، اصحابِ رسولِ کریمؓ بھی ایک ایک کر کے اپنے آقا کی خدمت میں حاضر ہوتے جاتے ہیں۔ اس لئے کہ آسمانِ ہدایت پر نجوم بن کر چمکیں۔ کشتیٔ اہلِ بیتؓ بھی خون آشام اور شکستہ ہو چکی ہے۔ اس لئے کہ زمانہ کو ابھی ہزاروں کربلاؤں کا سامنا کرنا ہے، اور امت کے لئے اسی کو کشتیٔ نجات بننا ہے۔ نورِ مبین صلی اللہ علیہ وسلم رحمتِ الٰہی کا پرتو بن کر، انسانیت کے اس سفر میں جو میدانِ حشر کی جانب رواں ہے اپنی رحمت میں لے لینے کے لئے بے تاب ہے۔ اور اکثر آنسوؤں کے ساتھ اور بہت کم مسرت کے ساتھ اس حقیقت کو اللہ کے بندوں پر واضح کرنے کے لئے مشغولِ عمل ہے کہ جس نے ایمان کے ساتھ اپنی مختصر زندگی میں ان آزمائشوں کو برداشت کر لیا، جن سے انسانیت کو گذرنا ہے، تو اس کے لئے یومِ حشر ایک لمحہ کی بات ہو گی، اور وہ عرش کے سایہ میں ہو گا۔ دنیا میں بھی یہی "حکمت" نجوم بن کر اور قدرت "کشتی" بن کر اُن کی نگرانِ حال رہے گی، جو اس کشتی میں بیٹھ گیا نجات پا گیا۔

یہ سیکڑوں سال کا دَور جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کا ہے جس میں کوئی نبی نہ آئے گا، ہدایت کے انداز کیا ہوں گے، اس فصل سے متعلق ہے۔

حضور سرورِ کائناتؐ سے قبل بے شمار اور روایات کے مطابق

ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء علیہم السلام تشریف لائے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لبدکم و بیش یہی تعداد اصحابِ رسول اللہ کی ہے، جن کو نجوم سے تشبیہ دی گئی۔ اور زمین پر ایک بڑی جماعت ائمہ عظام، اولیاء کرام اور علماءِ راسخین کی لوگوں کی ہدایت کے لئے مشغولِ عمل ہوئی۔ پہلے انبیاءؑ کے پاس صحیفے تھے۔ اب امت کے پاس مکمل کتاب اللہ ہے، جس کی حفاظت کا وعدہ بھی اللہ ربّ العزّت نے فرمالیا ہے۔ انبیاءِ کرامؑ کی ذاتِ مبارکہ میں بھی نورِ مبینؐ ہی کی تجلیات کار فرما تھیں، اور اب بھی سرورِ کائنات، ہادیٔ دنیا و دیں صلی اللہ علیہ وسلم کا فیضانِ نبوّت، علم و ولایت بن کر راہ نمائے حق ہے۔

ان صدیوں کا ذکر چند صفحات میں کیسے ہو؟

ہمیں صرف اس فیضانِ نبوّت کے مختصر بیان پر اکتفا کرنا ہوگا جو نورِ مبینؐ کا پرتوِ رحمت بن کر سایہ فگن ہے، حَرِیْصٌ عَلَیْکُمْ کی شان کے ساتھ۔ (سبحان اللہ)

پہلے تابعین و تبع تابعین کا دَور ہے، جن کے پیشِ نظر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہر ہر ادا، ہر ہر قول، اور ہر ہر فعل کی حتّی الامکان حفاظت ہے، تاکہ سیرتِ پاک کے یہ نقوش جو صحابۂ کرامؓ اور ائمۂ برحقؒ کے جوارح، قلوب و ارواح میں جلوہ نما ہیں صفحۂ قرطاس پر بھی ہر زمانہ کے لئے دائم و قائم ہو جائیں، خواہ ان کا تعلق تفسیرِ قرآن سے ہو، عبادات سے ہو، خواہ عقائد سے ہو، خواہ حسنِ معاشرت سے۔ یہ خَیْرُ الْقُرُوْنِ قَرْنِیْ ثُمَّ الَّذِیْنَ یَلُوْنَھُمْ ثُمَّ الَّذِیْنَ یَلُوْنَھُمْ کا دَور ہے۔ اس کے بعد وہ دَور ہے جس سے فروغ اور زوال کی داستانیں منسلک ہیں اور پھر وہ بھی دَور ہے جب مسلمان ذہنی، فکری، علمی، عملی غلامی کی زنجیروں میں گرفتار ہوئے، اور پھر وہ بھی زمانہ آیا جب اُن کی نام نہاد آزادی ان کو حق کی طرف رجوع کرنے

کے بجائے نفس ہی کی جانب مائل کرنے کا موجب ہوئی[1] مختصر لوں کہیئے کہ صحابہ کرامؓ اور اُن کے بعد کا دَور بڑی حد تک "تعمیل" کا دَور ہے، جس میں لوگوں کی ایک بڑی جماعت کے قلوب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت و عظمت جاگزیں ہے۔ اس کو پہلے تین سو سال کہہ لیجیے۔ پھر ملوکیت کا وہ دَور ہے جس میں تعمیل کی کمی نظر آتی ہے، لیکن قلوب میں اللہ اور اُس کے رسولؐ کی عظمت و برتری میں کوئی کمی نہیں۔ ایک طرف اُن کے دربار عیش و عشرت کے مرقع پیش کر رہے ہیں تو دوسری طرف اُن کا ذوقِ کتب بینی، ان کی علماء کی عظمت، ان کا تعمیرِ مساجد اور رفاہِ عام کے کاموں کا جذبہ، اس امر پر شاہد ہے کہ گو یہ معاشرہ زوال پذیر ہے لیکن ابھی اسلام کی عظمت اور اللہ اور اس کے رسولؐ کی محبت سے اُن کے قلوب خالی نہیں۔

پھر وہ دَور آتا ہے کہ فکری اور عملی انحطاط کے ساتھ اُن کی عالمی عظمت کا آفتاب ڈھلنے لگتا ہے، حکومت کی سرحدیں مختصر ہوتی جاتی ہیں، علم کی دولت لٹتی جاتی ہے، یہاں تک کہ اسپین کی تباہی کے بعد مسلمانوں کا تمام علم و حکمت، فنون و ہنر یورپ اور مغربی ممالک کی میراث بن جاتا ہے اُدھر تاتاریوں کے حملے اُن کی تباہی و بربادی کا موجب ہوتے ہیں۔

پھر ایک دَور آتا ہے، جس میں تعمیل و عظمت کے جذبات سے، اجتماعی طور پر، مسلمانوں کے قلوب ویران ہونا شروع ہو جاتے ہیں لیکن اس گئی گذری حالت میں بھی اُن میں "ادب"، اسلامی شعار کی قدر کا ایک جذبہ

---

[1] یہ بھی اللہ کا کرم تھا کہ "عہدِ زوال و غلامی میں بھی ایسے نفوس تاریخِ اسلام کے سامنے آئے جو انوارِ نورِ مبین کے پرتو سے روشن تھے۔ آج بھی ایسے افراد اپنے کارِ منصبی ادا کر رہے ہیں، اور یہ سلسلہ یوم الدین تک جاری رہے گا" (محترم ابوالخیر کشفی صاحب)

باقی ہے۔ یہ دَور ہند و پاکستان کا وہ دَور ہے جس کی ابتداء محمود غزنوی کے حملوں سے ہوئی، اور سلطنتِ مغلیہ کے زوال اور انگریزوں کی غلامی کے دَور میں بھی یہ جذبۂ ادب ہمارا سہارا بنا رہا۔

اس طرح اسلام کے نقطۂ نگاہ سے ہم تین ادوار سے گذر چکے ہیں:
تعمیل[۱]، تعظیم[۲] و ادب[۳]۔ اور ابھی خدا معلوم قیامِ قیامت تک کس کس انحطاطی دَور سے گذرنا ہے، اور کس کس طرح یہ نورِ مبین ہمیں ظلمتوں سے نجات دیتا رہے گا۔ ہمارے لئے ممکن نہیں کہ ان ادوار میں نورِ مبین صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کے علاوہ خود ذاتِ نبی کریمؐ کے اُن سہاروں کا کوئی مختصر سے مختصر ذکر کر سکیں جو مؤمن مسلم اور عوام و خواص کے لئے سہارا بنا، اور باوجود ہر ظاہری انحطاط کے "حقائق اسلام" کو روشن سے روشن تر کرتا رہا ہے۔ ہر چند مسلمانوں کی حکومتیں بنتی اور بگڑتی رہیں، اُن کے بیشتر سلاطین خود اسلام کے حسین چہرہ کا نقاب بن گئے، عوام کی اسلام سے کنارہ کشی، خواص کی بے راہ روی سب ہی اسلامی تہذیب و معاشرہ کے انحطاط کا موجب ہوئے۔ لیکن ان حقائق کی صداقت کا انکار کسی سے ممکن نہ ہوا، یہاں تک کہ اگر کوئی مذہب، مذہب کی حیثیت سے اپنی مکمل صورت میں آج بھی باقی ہے تو وہ صرف اسلام ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا!

"اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ" اور جس کی صداقت کی گواہی مسلم محققین ہی نہیں غیر مسلم دانشور و سائنس دان بھی دے رہے ہیں۔ اسلام کی یہ برتری لوگوں کی تعداد سے نہیں، حقائق کے عرفان سے متعلق ہے۔
لوگ اسے تسلیم کریں نہ کریں یہ ان کا فعل ہے، اور اس کے نتائج کے وہ آپ ذمہ دار ہیں۔ رسولِ کریمؐ، اُمؐ کے متبعین، انؐ کے علماءِ راسخین، انؐ کے مبلغین کا کام بتانا ہے، بالجبر منوانا نہیں کہ لَآ اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ۔

آیئے تاریخ کے تسلسل سے قطعِ نظر کر کے اپنے سردار آقائے دوجہاںؐ کے اندازِ رُشد و ہدایت پر ایک اجمالی نظر ڈالیں۔ تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں۔

۱۔ ہم دیکھتے ہیں کہ صحابہ کرامؓ کے زمانہ میں رویائے صادقہ کے ذریعہ ہدایت کے انداز، کشف القلوب کے ذریعہ راہِ ہدایت کی طرف رجوع فرمانا عام رہا۔ کبھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے محض قدرتِ خفی سے، جو منجانب اللہ تعالیٰ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ایک عطا ہے، کام لے کر حالات کا رُخ بدلا۔ کبھی حالتِ بیداری میں دیدار کی لذّت سے سرفراز فرما کر براہ راست ہدایات سے سرفرازی بخشی، یہ سب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی کرم نوازیوں میں داخل رہا۔ لیکن اب جس اہم و وسیع دَور سے ہم کو دوچار ہونا ہے، اس میں ان اندازِ ہدایت کے علاوہ اس کی وسعتوں میں بے پناہ اضافہ ہو رہا ہے۔

۲۔ مصر کے مشہور صوفی بزرگ حضرت عبدالعزیز بن مسعود دبّاغؒ تو یہاں تک فرماتے ہیں کہ اہلِ کشف یہ دیکھتے ہیں کہ سیّد الوجود سے نکل کر بادۂ نور، نور کی ڈور دل کی شکل میں تمام مخلوق کی طرف جاری ہے اور (یہ نورِ قلبؐ) انبیاء اور فرشتوں تک پھیلا ہوا ہے۔

(امواج الاسماء، حضرت عبید اللہ درّانی، ص ۳۷)

شاید یہی وہ ڈوری ہے جو حضورؐ کو ہر مومن کے دُکھ درد سے باخبر رکھتی ہے۔ اگر کسی مومن کے پیر میں کانٹا چبھتا ہے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کا درد محسوس ہوتا ہے۔ اور اس کے لئے بارگاہِ ربّ العزت میں دست بدعا ہوتے ہیں۔ امّت کے غم اُٹھانے کا یہ عظیم حوصلہ نبی برحق سرورِ عالمؐ ہی کو ہو سکتا ہے۔

۳۔ یوں تو کل امّت کے متعلق حکمِ ربّی ہے کہ تم بہترین امّت ہو جو دوسروں کی جانب ہدایت کے لئے بھیجی گئی ہے، لیکن دینِ اسلام میں ایک جماعت بالخصوص دینِ متین کی تعلیمات، اُن کے ارکان کی تشریح، اُس پر عمل پیرا ہو کر

لوگوں کو راہِ حق کی طرف دعوتِ فکر و عمل دینے کے لئے مختص کی گئی ہے۔ اس میں آیاتِ قرآنی کی تفسیر، احادیثِ مبارکہ کا بیان، علم الکلام سے ان حقائق کی ذہن نشینی، دین کے امور میں فکر جس کو فقہ کہا گیا اس کو پوری توجہ دینا، سب اُس کے دائرۂ کار میں شامل ہیں۔ گویا یہ وہ جماعت ہے جو

يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ

میں مشغول ہے، اور ان اعمالِ صالح کے ذریعہ قلوب کو پاک کرنے اور رُوح کو لذّتِ دید کی دعوت دیتی رہتی ہے، جو لوگوں کو پہلے اسلام، پھر ایمان، اور پھر یقین کے درجوں پر لے جانے کے لئے کوشاں ہے۔ یہ علماء راسخین کی جماعت ہے۔ اس میں وہ ائمۂ کرامؒ شامل ہیں جن سے لاکھوں کروڑوں مسلمان فیض یاب ہوتے ہیں جنہیں ائمۂ اربعہؒ کہتے ہیں۔ ان کا ذکر آگے آئے گا۔

۴۔ ایک دوسری جماعت اولیاء کرامؒ کی ہے، جن کا ذکر ہم آگے کسی قدر تفصیل سے کریں گے۔ یہ وہ بزرگ ہستیاں ہیں جن کا تعلق سرورِ کائنات صلّی اللہ علیہ وسلّم سے براہِ راست یا تو آپؐ کے کسی عظیم صحابیؓ یا صاحبِ وقت قطب کے ذریعہ ہوتا ہے۔ یہ بھی علماء راسخین کی طرح شریعتِ محمدی کی ترویج، اس کی اتباع کے ساتھ اللہ اور اُس کے رسولِ کریمؐ سے محبت پر زور دیتے ہیں، اور اُن کا طریقۂ کار جوارح سے قلب اور رُوح کی طرف رُخ کرنا نہیں بلکہ رُوح کی سطح سے قلب اور جوارح پر اثر انداز ہونا ہے۔ اُن کا کام تزکیۂ نفس سے شروع ہوتا ہے تاکہ قلب و جوارح اتباع کے لذّت آشنا ہو سکیں۔ گویا سرورِ کائنات صلّی اللہ علیہ وسلّم کی اتباعِ خاص میں اُن کا انداز یہ ہے۔

وَيُزَكِّيْكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ

یعنی پہلے "محبت" کا بیج دل میں بونا جسے تزکیۂ نفس کا بیج کہہ لیجئے پھر اُس کی پرداخت کرنا۔

واضح رہے کہ ان دونوں، علماءِ راسخینؒ اور اولیاءِ کرامؒ، میں مقصد کے لحاظ سے کوئی فرق نہیں۔ دونوں توحیدِ باری تعالیٰ کی طرف بلاتے ہیں، رسالت کی اہمیت سے آگاہ کرتے ہیں، آخرت کی حاضری یاد دلاتے ہیں، اور شریعت کی پابندی کو لازمی قرار دیتے ہیں۔ فرق صرف اندازِ تعلیم وتربیت کا ہے۔ ایک کی درس گاہوں میں تعلیم وتربیت کتاب سے، دوسرے کی کسی کے آستانۂ فیض سے رابطہ کے بعد نگاہِ لطف وکرم سے کی جاتی ہے۔ دونوں کا منتہائے نظر یہی ہے کہ لوگ اللہ والے بنیں، شیدائیِ رسولِ خدا ہوں۔

۵۔ ایک جماعت مخلصین، ائمۂ مساجد اور خطیبوں کی ہے، جو نیک نیتی وخلوص کے ساتھ مسجدوں میں نمازوں کے ساتھ تعلیماتِ دین کا اہتمام کرتے ہیں۔ جن کا دائرۂ عمل گو نصیحت تک محدود ہوتا ہے لیکن یہ پیہم نصیحت بھی اصلاحِ حال کا موجب بن جاتی ہے۔ احادیث میں آتا ہے کہ جب انسان نیک نیتی سے کسی عمل میں لگ جاتا ہے تو سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم اس کے باطن کو بھی پاک فرماتے ہیں، اور اس طرح اس بندہ میں اللہ تعالیٰ کی عبادت کا ذوق پیدا ہو جاتا ہے۔

۶۔ ان مساجد اور مدارس کے علاوہ وہ دار العلوم بھی ہیں جہاں مخلص طالب علم اور مخلص اساتذہ کا اجتماع، قرآن، حدیث، فقہ ودیگر علوم کے لئے اللہ کے لئے ہوتا ہے۔ اور یہاں سے بھی جید علماء ومفکرین، دینِ اسلام کے لئے روشن چراغ بن کر نکلتے ہیں۔ اور بعض پاکیزہ محفلوں میں جہاں خلوصِ دل سے اللہ ورسولؐ کا ذکر ہوتا ہے وہاں سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی شرکت اور موجودگی کا احساس بعض عاشقانِ رسول کو ہو جاتا ہے۔

۷۔ یہی درس گاہیں، یہی مساجد، یہی خانقاہیں جہاں پہنچ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ گو حضور صلی اللہ علیہ وسلم بنفسِ نفیس سامنے نہیں، آپؐ کی سیرتِ مبارکہ

قرآن وحدیث کے ایک ایک حرف سے جلوہ نما ہے۔ اور جن کی آنکھیں پردۂ محبت ہیں وہ اِسی وحیٔ الٰہی اِس قرآنِ حکیم میں اپنے آقا سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے خدوخال دیکھتے ہیں۔ یہی اُن کے لئے آئینۂ خُلقِ محمدی ہے، کہ کتاب اور صاحبِ کتاب دونوں نور ہیں، نور کے جلوے نور ہی میں نظر آتے ہیں۔

اور یہی وہ پُرنور مسجدیں اور عمارتیں ہیں

کہ زمین پر ہر جانب کفر والحاد کے باوجود آسمانوں سے روشن ستاروں کی طرح چمکتی نظر آتی ہیں۔ اور جن کو دیکھ کر فرشتے حیرت سے سوال کرتے ہیں کہ زمین پر ستارے کہاں سے آگئے۔ یہ تجلّیاتِ نورانی کیسی ہیں۔ اللہ تعالیٰ جواب دیتا ہے کہ یہ اُن بزرگ ہستیوں کے گھر اور وہ مقامات ہیں جہاں یادِ الٰہی کے چراغ روشن رکھے جاتے ہیں، یہ اُن کی روشنی ہے۔

ایک حدیث میں یوں بھی آتا ہے: میری امت کے علماء بنی اسرائیل کے انبیاء کی طرح ہیں۔ منشاء یہ نہیں کہ یہ بھی نبی ہیں اور معصوم ہیں۔ بتانا یہ ہے کہ یہ بھی حضورؐ کے اتباع میں آپؐ ہی کے دینِ اسلام کے فروغ میں کوشاں ہیں اور انہوں نے اس تبلیغِ دین کو اپنے اوپر لازم کر لیا جس پر ان کا خلوص، محبت، علم وتقویٰ سب ہی شاہد ہے۔

رُشد وہدایت کے یہ انوار، رزم وبزم دونوں جگہ آپ کو یکساں نظر آئیں گے، چشمِ بینا شرط ہے۔

واضح رہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت تو اللہ رب العزت کی شانِ قدرت اور رموزِ حکمت دونوں کی ترجمان رہی لیکن آج اس کی حکمت کی ترجمانی تو ان دار العلوم، ان درس گاہوں میں ہو رہی ہے جہاں حفاظِ قرآن، قرآن کو حفظ کرتے ہیں، مفسر اس کے نکات بیان کرتے ہیں، محدث دورۂ حدیث میں فقہ وحروفِ قرآن کی فہم تک ذہن کو منتقل کرنے

ہیں مصروف ہیں۔ لیکن اگر کوئی سوال کر دیتا ہے کہ رجعتِ شمس کیسے ممکن ہے، مُردہ کیسے زندہ ہو سکتا ہے، کیسے ممکن ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک پیالہ پانی یا دودھ سے ساری جماعت پیئے اور وہ ختم نہ ہو، چند کھجوروں میں وہ برکت ہو کہ ہزارہا کی تعداد میں اُٹھائی جائیں اور ختم نہ ہوں۔ یہ بھی تو کوئی بتانے والا گروہ مسلمانوں میں ہونا چاہیئے جو کوئی جادوگر نہ ہو، نبوت کا دعویٰ دار نہ ہو، حضورؐ کی شریعت کا پابند ہو، انہیںؐ کا شیدائی ہو لیکن فیضانِ ولایت سے سرفراز ہو۔ یہ طبقہ اولیاء کرامؒ کا ہے، جس کے پیش رو ائمۂ عظامؒ اور صحابۂ کرامؓ ہیں۔ اور خود صاحبِ قلب و نظر علماء میں ایسے بزرگ پیدا ہوتے رہے جو ان نکتوں کی وضاحت کرتے رہے ہیں۔

دراصل یہ حقیقت اس نکتہ کی تشریح ہے جس کی وضاحت شاہ ولی اللہؒ یوں فرماتے ہیں:

"دینِ اسلام کی دو حیثیتیں ہیں۔ ایک ظاہری دوسری باطنی۔ جہاں تک دین کی ظاہری حیثیت کا تعلق ہے اس کا مقصود مصلحتِ عامہ کی نگہداشت اور دیکھ بھال ہے اور اس کی صورت یہ ہے کہ احکام اور معاملات جو اس مصلحتِ عامہ کے لئے بطور ذرائع اور اسباب ہیں ان کا قیام عمل میں لایا جائے اور ان کی اشاعت میں کوشش کی جائے۔ جن چیزوں سے مصلحتِ عامہ میں تحریف ہوتی ہو، ان کو سختی سے روکا جائے۔ یہ تو ہوئی ان کی ظاہری حیثیت۔ اب رہا اس کی باطنی حیثیت کا معاملہ۔ نیکی و طاعت کے کاموں سے دل پر جو اچھے اثرات مترتب ہوتے ہیں، اُن کے احوال و کوائف کی تحصیل دین کی باطنی حیثیت کا مقصود اور نصب العین ہے...... چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دین کی حفاظت کا جو وعدہ کیا گیا تھا، اس کی حفاظت کی استعداد سے جو جماعت بہرہ مند ہو گی، وہ دین کی

ظاہری حیثیت کے محافظ ہیں۔ یہ فقہاء، محدثین، نمازیوں اور قاریوں کی جماعت ہے۔ چنانچہ ہر زمانے میں اہلِ ہمت کی یہ جماعت مصروفِ عمل ہے...... دین کے محافظین کا دوسرا گروہ وہ ہے، جسے اللہ تعالیٰ نے باطنِ دین کی حفاظت کی استعداد عطا فرمائی، جس کا دوسرا نام "احسان" ہے...... چنانچہ ہر زمانہ میں اولیاء اللہ میں سے کوئی نہ کوئی ایسا بزرگ ضرور پیدا ہوتا ہے جس کو عنایتِ الٰہی سے اس امر کی استعداد ملتی ہے کہ وہ باطنِ دین کے قیام اور اشاعت کی کوشش کرے، جس کا مغز اور نچوڑ احسان ہے۔ خلقت خود اس کی طرف کھنچتی چلی آتی ہے۔ اُن کی صحبت سے جذب و تاثیر کی غیر معمولی قوت پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ بزرگ کشف و اشراف کے ذریعہ لوگوں کے دلوں کا حال معلوم کرتے ہیں۔ ان کی دعائیں بارگاہِ حق میں مقبول ہوتی ہیں اور اس قبیل کی اور کرامات ان کی ہمت اور برکت سے معرضِ وجود میں آتی ہیں......."

(ماخوذ از ارمغانِ شاہ ولی اللہ، علم تصوّف، صفحہ ۱۹۰)

صرف ایک اہم نکتہ کی وضاحت ضروری ہے۔ نہ بھولیں کہ حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کا فریضۂ نبوّت دعوتِ توحید کے ساتھ اشیاء کے حقائق کی عرفان بخشی بھی ہے، تخلیقِ کائنات۔ سے خالقِ کائنات کی طرف رجوع کرنا ہے، وہ حقائق جو قرآنِ حکیم نے واضح کئے کائنات سے اُن کی مطابقت بھی ثابت کرنا ہے۔ یہ کام بھی مسلمان مفکّرین ہی کو کرنا ہے۔ اگر مسلمان یہ کام نہ کریں تو دیگر اقوام حقائقِ اشیاء کی تحقیق میں منہمک نظر آئیں گی۔ یہ نتیجہ ہے اس تجسّس کا جو فطرتِ انسانی میں مضمر ہے۔ اِس لئے جب علم و فکر کی طرف سے مسلمان غافل ہونے لگے تو دیگر اقوام نے اس فطری جذبہ کے تحت مختلف علوم سے متعلق امور پر تحقیق کا کام جاری رکھا، جو اب

تک جاری ہے۔ اس تحقیق کے نتیجہ میں اکثر اُنہیں قرآنِ حکیم کی آیات اور آیاتِ کائنات میں ایک مطابقت نظر آئی۔ خوش نصیب ہیں جو ان سے ہدایت پاکر دینِ اسلام میں داخل ہو جاتے ہیں۔ اور وہ جو اسلام نہیں بھی قبول کرتے ہیں وہ کم سے کم ذہنی طور پر حقائقِ اسلام کے قائل ہو جاتے ہیں، ایمان لانا یا نہ لانا یہ اُن کے نصیب کی بات ہے۔ نبوّت کا کام تو بتانا، سمجھانا ہے، ہدایت دینا تو اللہ کا کام ہے۔ کارِ نبوّت کا یہ وہ عظیم پہلو ہے جو مسلم وغیر مسلم دونوں طبقوں میں یکساں جاری ہے۔ اور اسلام کے بنیادی حقائق کے فروغ کا ضامن ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم رحمۃ للعلمین ہیں، آپؐ کافۃ للناس ہیں، دیگر اقوام کی صلاحیتوں کو فیض پہنچانا بھی کارِ نبوّت میں شامل ہے۔ اس دورِ انحطاط میں بھی بہت سی صداقتوں سے مسلمانوں سے زیادہ غیر مسلم آگاہ ہیں۔ بلکہ اُنہیں ہر وقت یہ خوف لگا ہوا ہے کہ کہیں یہ حقائق غالب نہ آ جائیں، اور یہی اُن کی اسلام دشمنی کی اصل وجہ ہے۔ قربِ قیامت کی نشانیوں میں سب سے بڑی نشانی یہی ہے کہ مسلمان علم و عمل سے خالی ہو جائیں گے[1] اور دیگر اقوام اپنی علمی برتری کے باعث ان کو مغلوب سے مغلوب تر کرتی جائیں گی لیکن باطل کی قوتیں کتنی ہی مضبوط و مستحکم ہو جائیں وہ حق کو پامال نہیں کرسکتیں۔ فروغِ حق ہی فروغِ اسلام کا ضامن ہوتا ہے اور ہوگا۔

○

---

[1] حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک دعا میں ایسے دور کی نشاندہی کی گئی ہے: "مجھے ایسا زمانہ نہ ملے اور نہ دوسروں کو جس میں عالم کی پیروی نہ کی جائے اور نہ بُرد بار آدمی سے شرم کی جائے۔" (سیوطی۔ جامع الصغیر)

خاندانِ نبوتؐ

مختلف طبقات جن کا ذکر گذشتہ صفحات میں ہوا۔ ہم ان کی ابتدا اُن بزرگ ہستیوں سے کرتے ہیں جن کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے صُلبی نسبت حاصل ہے، جن کے سردار اس دَور میں سیدنا امام زین العابدین علیہ السلام ہیں، کہ آپؑ اور آپؑ کی اولاد مسلمانوں کے ہر طبقہ میں اپنے زہد، تقویٰ، بزرگی، اخلاص و محبت کی بنا پر ہر دل عزیز ہے، اور جن سے تعلق قلوب کی دنیا کو بدل دیتا ہے۔ حضرت سیدنا زین العابدینؑ ارباب علم و ولایت کے سردار ہیں۔ گویا نورِ مبین سے روشنی حاصل کر کے ضو فشانی فرما رہے ہیں یہ وہ ہستی ہیں جو اسم بامسمّیٰ ہیں۔ ان کے چہرہ پر سعادت کے انوار دمکتے ہیں۔ جب وضو فرماتے ہیں تو چہرۂ مبارک خشیتِ ایزدی کے تصوّر سے زرد ہو جاتا ہے۔ جن کی آنکھیں ہر لمحہ غمِ حسینؑ میں اشکبار ہیں، اِس حد تک کہ رُخِ انور پر اُس کے نشان پڑ گئے ہیں۔ آپ کی عظمت لوگوں کے دلوں میں اِس قدر گھر کر چکی تھی کہ جب آپ کسی ہجوم کے وقت بھی طواف کا قصد فرماتے تو لوگ راستہ دیتے۔ شانِ استغناء کا یہ عالم کہ حاکمِ وقت عبدالملک بن مروان، جو آپ کا جانی دشمن تھا، وہ بھی آپ کے توکّل علی اللہ پر دنگ رہ جاتا تھا۔

آپؑ سے بے شمار کرامتیں ظاہر ہوئیں۔ سیدنا امام زین العابدین علیہ السلام کو عبدالملک بن مروان کے حکم سے پابندِ سلاسل کیا گیا[1]۔ ہاتھوں پیروں میں

---

[1] جب مسجد مچھلی بازار کانپور کے واقعۂ انہدام (۱۹۱۳ء) کے موقع پر علمائے کرام کو قید کیا گیا تو علامہ شبلیؒ نے فرمایا:
(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

زنجیریں گردن میں طوق ڈالے گئے لیکن ان کے آزاد قلب کو یہ پابندیاں مغلوب نہ کرسکیں۔ وہ یادِ الٰہی میں اسی طرح مصروف رہے، یہاں تک کہ جب لوگ بطور ہمدردی آپ کو دیکھ کر آبدیدہ ہوتے تو آپ فرماتے: "لوگو تم سمجھتے ہو کر میں پابندِ سلاسل ہوں۔ میرا ظاہر مقید اور میرا باطن آزاد ہے، اور اس ظاہر پر بھی میری رُوح کا قبضہ ہے۔" یہ کہہ کر سلاسل سے باہر ہو گئے۔ اور پھر یہ فرما کر اُن کو پہن لیا: "ایسی مثالیں ابھی باقی رہنا چاہئیں تاکہ تم عذابِ الٰہی کو یاد رکھو اور محشر میں تم پر سائبان ہو۔"

(شواہدِ نبوّت بحوالہ امام زہری صفحہ ۳۰۹)

ان کے حالات پیش کرنا مقصود نہیں لیکن یہ ضرور بتانا ہے کہ خاندانِ نبوّت کے وہ چراغ تھے جن کو نہ بادِ مخالف کے جھونکے گُل کر سکے اور نہ کوئی ظلم و تشدّد ہی ان کے پائے استقلال ہلا سکا۔

ہم اس کتاب میں اُن کے اسماءِ گرامی پر اکتفا کریں گے جو علماءِ دین کے راہ نما اور اولیاءِ امّت کے لئے مظہرِ حق ہیں۔

حضرت امام زین العابدینؓ کے بعد امام باقرؓ آتے ہیں۔ آپؓ کا نام محمد بن علی بن حسین بن علی رضی اللہ عنہ ہے۔ اور آپؓ کا لقب باقر ہے اور ابوجعفر کنیت۔ آپؓ اپنے لقب اور کنیت سے یاد کئے جاتے ہیں۔

آپؓ کو باقر اس لئے کہتے ہیں کہ مختلف علوم و فنون میں وسعتِ نظر کے

(حاشیہ صفحہ گذشتہ) پنہائی جارہی ہیں عالمانِ دین کو زنجیریں
یہ زیور سیدِ سجّادِ عالی کی دراثت ہے

تو سجّادِ عالی (حضرت علی بن حسین زین العابدین) کا نام استعارہ بن چکا ہے۔
(محترم کشفی صاحب)

مالک تھے، اور اُن کی تشریح اور تصریح پر کمال رکھتے تھے۔ چنانچہ حضرت باقرؓ کی تفسیر کا ذکر ابن ندیم نے الفہرست میں کتاب الباقر محمد بن علی بن الحسین کے نام سے کیا ہے۔ آپؓ نے ۱۱۴ھ میں ۵۷ سال کی عمر میں وفات پائی۔ آپؓ کی عظمت کا اندازہ صرف اس سے کیجئے کہ ایک بار حضرت جابر رضی اللہ عنہ کے پاس، جو حضورؐ کے مشہور صحابی ہیں، آپؓ اس وقت تشریف لے گئے جب حضرت جابرؓ اپنی بصارت کھو چکے تھے۔ آپ نے کلام کیا حضرت جابرؓ نے نام پوچھا۔ آپ نے نام بتایا۔ حضرت جابرؓ نے پاس بُلایا، ہاتھوں کو بوسہ دیا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا سلام پہونچایا۔ امام باقرؓ نے فرمایا کہ حضور پر صلوٰۃ وسلام ہو، اللہ کی رحمت و برکت ہو، لیکن یہ کیوں کر ہوا۔ حضرت جابرؓ نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بار فرمایا تھا کہ جابر! تمہاری ملاقات شاید میرے ایک فرزند سے ہو جسے محمد بن علی بن حسین کہتے ہیں، اللہ جل شانہٗ اسے انوارِ حِکَم "عطا فرمائے گا، تم اس سے میرا سلام کہنا۔ (شواہدِ نبوّت صفحہ ۳۱۷)

ان کے بعد حضرت امام جعفر الصادقؓ ہیں۔ آپؓ کا نام حضرت امام جعفر بن محمد بن علی بن حسین بن علی بن ابی طالبؓ ہے۔ آپ کی کُنیت ابوعبداللہ اور الصّادق آپؓ کا لقب ہے۔ حضرت ابوبکرؓ صدیق سے والدہ کی طرف سے تعلّق پر آپؓ فخر فرماتے۔ آپؓ مدینہ منوّرہ میں ۸۳ھ میں دوشنبہ ہی کے دن ربیع الاوّل کے ماہ میں پیدا ہوئے اور ۱۴۸ھ میں انتقال فرمایا۔ آپؓ کو علوم میں کمال حاصل تھا۔ حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کو اُنؓ سے شرفِ تلمّذ حاصل رہا۔ آپ کے حِکمات و معارف، بے شمار صداقتوں کے واقعات، متعدّد کرامات، آپؓ کی فہم، بصیرت مقام صبر و شکر اور رضائے الٰہی سے متّصف ہونے پر شاہد ہیں۔

یہاں ہم اس خاندانِ نبوّت کے اسماءِ گرامی پر اکتفا کرنے پر مجبور ہیں،

البتہ اجمالی طور پر کچھ عرض کرنے کی سعادت حاصل کریں گے۔
خاندانِ نبوتؐ میں حضرت امام جعفر الصادق رضی اللہ عنہ کے بعد حضرت موسیٰ بن جعفرؓ ہیں، آپ کی کنیت کاظم ہے۔
اُنؓ کے بعد حضرت علی بن موسیٰ امامؓ جن کی کُنیت ابوالحسن ہے۔ آپ کا لقب رضا ہے۔
اُنؓ کے بعد حضرت محمد بن علی بن موسیٰ بن جعفر رضی اللہ عنہ۔
اُنؓ کے بعد حضرت علی بن محمد بن علی بن موسیٰ بن جعفر رضی اللہ عنہ
اُنؓ کے بعد حضرت حسین بن علی محمد بن علی رضی اللہ عنہ۔ آپؓ کی کنیت زکی اور آپؓ کے القاب میں خالص، سراج و عسکری بھی آتے ہیں۔ آپ کا سنہ وفات ۲۶۰ھ ہے۔ گویا ان آخری امام عسکری تک کا دور ابتدائی تین صدی ہے۔
اور آخر میں امام مہدی علیہ السلام، جن کا ذکر اس باب کے آخر میں قرب قیامت کے سلسلہ میں آئے گا۔

ان ائمہ اہلِ بیتؓ

کی عظمت کا اِس سے بڑھ کر کیا ثبوت ہوگا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی آل کی محبت کو جزوِ ایمان قرار دیا ہے، اور اُن سے تعاون پر نظرِ کرم کے وعدے ہیں۔ حضرت سیدنا امام حسین علیہ السلام کی شہادت کے بعد آپؐ کی عترت کو عظیم حوادث اور سخت مشکلات کا سامنا پڑا، صرف اس لئے کہ اُن کی زندگی کا مقصد رضائے الٰہی رہا۔ سلاطین کو خوش کرنا تو الگ رہا وہؓ اُن سے دُور ہی رہنا چاہتے تھے۔ اللہ رب العزت نے بھی اُنؓ کو بے شمار فضل و کرم سے نوازا، کچھ اِس لئے بھی کہ عوام و خواص پر اُنؓ کا مقام روشن رہے اور اُنؓ کے صبر و شکر کو کسی کمزوری پر محمول نہ کریں۔
انؓ کی بے شمار کرامتیں عوام کے لئے اُنؓ کی عظمت کی سند تھیں۔ اُنؓ

کے علم کی وسعتیں خواص کے لئے موجب حیرت تھیں، اُن رض کا تقوی، صبر و شکر و استغناء سلاطین کے لئے سبق آموز بنا رہا صرف اسم اعظم کی برکتوں کے واقعات درج ہوں تو دفتر ہو جائیں، کھوئی ہوئی اشیاء کا معلوم کر لینا، دریا میں گری ہوئی چیزوں کو طلب کر لینا، مُردہ جانور کو زندہ کر دینا جس سے جابر حاکم کے حواس باختہ ہو جاتے اور ظلم کی جگہ تلطّف سے پیش آتا علم کا یہ عالم کہ لوگ سوال پوچھنے جاتے سوال کرنے کی ہمت نہ ہوتی لیکن یہ جواب دیتے۔ کبھی کوئی خواہش کرتا اُس کی استدعا پوری کی جاتی۔ سلاطین اُن رض سے سوال کرتے اس لئے کہ انہیں رض زچ کریں اور خود زچ ہو جاتے۔ کوئی بیمار ہوا، اُس کی دوا کے لئے پوچھا۔ فرمایا جاتا کہ تمہاری دوا وہی ہے جو تم نے خواب میں دیکھی۔ اُسے شفا بھی ہوتی اور حیرت بھی۔ کسی سے کہہ دیا کہ اے بندۂ خدا جو چاہے اُس کی وصیّت کر اور جس چیز سے گریز نہیں اس کے لئے تیار ہو جا، ابھی تین دن نہیں گذرے کہ وہ اُس جہاں سے رخصت ہوئے۔

رض چڑیوں سے باتیں کرتے، جانور ان رض سے ہم کلام ہوتے۔ یہ سب کرامات عظیم ہستیوں کے مقام رفعت و بلندئ مراتب پر شاہد ہوتیں۔ غرض انہوں رض نے شکر میں بھی شکر کیا اور صبر کی منزل میں دوبار شکر ادا کیا کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اُس آزمائش کے لئے منتخب فرمایا جسے وہ رض مقام حسین ع سمجھتے تھے۔ کیا یہ سب کسی کی فیضانِ نظر کا اثر نہیں، کیا یہ اُس تعلق پر شاہد نہیں جو حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کی آل کو حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم سے ہے۔ یہی وجہ تھی کہ ہزارہا گم گشتہ راہ اُن رض سے ہدایت پاتے رہے اور ہزارہا پریشان قلوب دولتِ تسکین سے نوازے جاتے۔

(ملاحظہ ہو شواہدِ نبوّت صفحات ۳۰۹ تا ۳۶۹)

و

ایک اجمالی نظر

آیئے

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ان نورانی شبیہوں کے بعد ہم پہلی تین صدیوں پر ایک اجمالی نظر ڈالیں جس میں نورِ مبین کے انوارِ ثلاثہ کی ترجمانی ہر ہر انداز سے خوب ہوئی۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور اپنے کلام حکیم کو نور فرمایا احادیثِ مبارکہ میں اَوَّلُ مَا خَلَقَ اللّٰہُ نُوْرِی کے ساتھ اَوَّلُ مَا خَلَقَ اللّٰہُ الْعَقْلَ اور اَوَّلُ مَا خَلَقَ اللّٰہُ الْقَلَمَ کا ذکر آیا۔ چنانچہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین اور تبع تابعین نے اس کی تفسیریں قولاً، فعلاً اور عملاً فرمائیں۔ قرآنِ حکیم کی تفسیریں آئینۂ انوارِ محمدیؐ میں لکھی گئیں۔ احادیث کی جمع وتدوین کا کام نہایت جانفشانی، احتیاط، تحقیق اور تعلق باللہ والرسولؐ سے کیا گیا۔ یہ وہ تھے جو حدیث کے نور کو الفاظ کے آئینے میں دیکھ لیتے تھے۔ زندگی کی راہوں کو عملاً نورانی بنانے کا کام فقہائے امت نے کیا۔ اور اسی دور میں فقہ کے وہ ائمۂ اربعہ پیدا ہوئے جن کی فقہ آج بھی کروڑوں مسلمانوں کے لئے مشعلِ راہ ہے۔

ہم نہایت اختصار کے ساتھ

پہلے مفسرین پھر محدثین اور پھر فقہائے عظام کا ذکر کریں گے۔ اور اس کے بعد اس عظیم جماعت کا جو تینوں طبقوں میں شامل رہی اور خود اپنی محبت، اخلاص، علم وعرفان سے ایک نمایاں حیثیت سے جانی گئی جنہیں صوفیائے کرام کے لقب سے یاد کیا گیا، انہیں" اخلاقِ محمدیؐ کا پرتو کہہ لیجئے۔

یہاں یہ بات بھی پیشِ نظر رہے

کہ ان ابتدائی صدیوں میں طبقات کی یہ تقسیم اس قدر واضح اور نمایاں

نہیں، مفسر، محدّث بھی ہیں فقیہ بھی۔ اور محدّث، مفسر بھی ہیں۔ البتہ مختلف مزاج ہونے کے باعث کسی کا رجحانِ طبع تفسیر کی طرف زیادہ ہے کسی کا حدیث کی جانب۔ لیکن سب ہی پیکرِ خلوص اور شیدائی رسولِ کریمؐ ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ برگزیدہ ہستیاں وہی کام کر رہی ہیں جس کی ابتداء سیدنا ابوبکر صدیق رضؓ، سیدنا عمر فاروق رضؓ، حضرت عثمان رضؓ، حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ کے ہاتھوں ہو چکی تھی، اور جنہیں اسرارِ شریعت کی ترجمان ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضؓ کی رہنمائی حاصل تھی۔

○

مفسرین کرام

پہلی صدی ہجری دراصل صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی صدی ہے جن کی تعلیم و تربیت مسجدِ نبوی میں اور جن کے اخلاق و عادات کی اصلاح سفر و حضر میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نظرِ کرم و التفات سے ہوتی رہی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی جدائی کے بعد ان کا مشغلہ یادِ الٰہی اور ذکرِ رسولِ کریمؐ اور اسلام کے فروغ و اشاعت کے سوا کچھ نہ تھا۔

اس پہلی صدی ہجری میں جن مفسرین کا ذکر ہمیں پہنچا ہے ان میں دو قسم کی ہستیاں ہیں۔ ایک وہ جنہوں نے پورے قرآنِ حکیم کی تفسیر فرمائی اور دوسرے وہ جنہوں نے جزوی تفاسیر پر اکتفا کیا۔ بات یہ ہے کہ جن بزرگوں کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پورے قرآنِ حکیم کی تفسیر پڑھنے کی سعادت حاصل ہوئی تھی انہوں نے یہ امانت پوری کی پوری امتِ مسلمہ کو سونپ دی، اور جنہوں نے جزوی طور پر استفادہ کیا تھا انہوں نے اسی حد تک تفاسیر مرتب فرمائیں۔

چنانچہ ابن تیمیہؒ اپنی المدخل المنیر میں لکھتے ہیں:

"یہ جاننا ضروری ہے کہ جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کو (قرآن کے) معنی بھی اسی طرح سمجھائے جس طرح اُن تک (قرآن کا) لفظ پہونچا ہے۔ جیسا کہ ابوعبدالرحمٰن السلمی نے کہا کہ ہمیں حضرت عثمانِ غنی بن عفان رضی اللہ عنہ اور عبداللہ بن مسعودؓ اور دوسرے صحابہؓ نے بتایا کہ وہ درسِ قرآن میں دس آیات سے زیادہ بیک وقت نہیں پڑھا کرتے تھے۔ جب وہؓ دس آیات علمی اور عملی صورت میں سمجھ لیا کرتے تھے تو آگے پڑھا کرتے تھے۔ اس وجہ سے ایک ایک سورت کے سمجھنے میں کافی وقت لگ جاتا۔

(المدخل المنیر صفحہ ۳۲ تذکرۃ المفسرین صفحہ ۸)

یہ درست ہے کہ صحابہؓ اور تابعینؒ کے دَور میں قرآنِ حکیم کی تفسیر کتابی شکل میں کثرت سے نہیں ہوتی تھی، لیکن ابنِ ندیم کی فہرست سے پتہ چلتا ہے کہ پہلی دوسری صدی ہجری میں کتابتِ تفسیر ہو چکی تھی جس کو ہم اجمالاً بیان کریں گے۔

خلفاءِ راشدینؓ میں سے تفسیرِ قرآنِ حکیم حضرت علی رضی اللہ عنہ سے زیادہ ثابت ہے۔ اس کی وجہ بھی تھی۔ آپؓ کی تربیت بچپن ہی سے آغوشِ نبوّت اور بیتِ رسالت میں ہوئی تھی۔ اس لئے آپؓ کو وحیِ قرآنی سے واقف ہونے کا موقع زیادہ ملا۔

خلفاءِ راشدینؓ کی خدماتِ قرآنِ حکیم کا ذکر گذشتہ باب میں ثابت ہو چکا ہے اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے قرآن کی تفسیر کا ایک ثبوت یہ ہے کہ جب آپؓ سے اس کتاب کے متعلق پوچھا گیا جو آپؓ لکھ رہے تھے کہ یہ کیا ہے تو آپؓ نے جواب دیا:

"فہم قرآنی" یعنی تفسیرِ قرآنِ حکیم۔ چنانچہ آپؓ کے شاگردِ رشید ثابت بن دینار

(جن کی کنیت البوحمزہ الشمالی ہے) نے قرآنِ حکیم کی ایک تفسیر جمع کی تھی جو کتاب تفسیرِ ابی حمزہ کہلاتی ہے۔ ہر چند یہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے نام سے نہیں لیکن یقیناً آپؓ ہی کے فرمودات پر مبنی ضرور ہے۔

"اسی طرح مفسرین کی تحقیق ہے کہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی اکثر تفاسیر کا ماخذ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی تفسیرِ قرآنِ حکیم ہے۔"

(تذکرۃ المفسرین صفحہ ۴۴)

خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم کے سوا جن صحابہ کرامؓ سے قرآنِ حکیم کی تفاسیر ثابت ہیں ان میں اُبی بن کعبؓ م ۲۰ھ، عبداللہ بن مسعودؓ م ۳۲ھ، ابن عباسؓ م ۶۸ھ خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔

۱۔ اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ

آپؓ اُس مختصر جماعت کے رکن تھے جو چار اصحاب پر مشتمل تھی جس کا کام زمانۂ رسالت میں قرآنِ حکیم کا جمع کرنا تھا۔ آپؓ قرآنی تلاوت اور مخارج کے لحاظ سے سید القراء کے لقب سے مشہور ہوئے۔ قرآنِ حکیم سے آپؓ کے ذوقِ طبعی کا اس سے بڑھ کر کیا ثبوت ہوگا جس کو ابنِ عباسؓ سے بخاری اور مسلم نے روایت کیا:

"جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابنِ کعبؓ کے سامنے سورہ لَمْ یَکُن کی تلاوت فرمائی اور یہ بھی فرمایا کہ اس بات کا مجھے خداوندِ قدوس نے حکم فرمایا ہے۔" یہ شرف آپؓ کے سوا کسی دوسرے صحابی کو حاصل نہیں ہوا۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ آپؓ کو "سید المسلمین" کہا کرتے تھے۔ آپؓ سے قرآنی تفسیر کا ایک بڑا نسخہ روایت ہے جس کو علامہ بغوی نے اپنی تفسیرِ بغوی میں پوری سند کے ساتھ نقل کیا ہے۔

(تذکرۃ المفسرین صفحہ ۴۷)

۲۔ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ۔

آپؓ وہ سولہویں خوش بخت انسان ہیں جن کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کی سعادت حاصل ہوئی، سب سے پہلے مکہ مکرمہ میں باآوازِ بلند قرآن پڑھنے کا شرف حاصل ہوا۔ قرآنی علوم سے آپؓ کی محبت، ذوق وشوق اور والہانہ محبت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ:

(الف) جو قرآن کو اس طرح پڑھنا چاہتا ہے جس طرح وہ نازل ہوا تو وہ ابن مسعود (رضی اللہ عنہ) سے پڑھے۔

(ب) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے فرمایا کہ "تم قرآن پڑھو تاکہ میں سنوں"۔ چنانچہ آپؓ نے سورۂ نساء کی تلاوت فرمائی۔

(ج) ابن مسعود فرماتے ہیں کہ ہم دس آیاتِ قرآنی پڑھ کر اُن کے معانی سمجھتے اور اُن پر عمل کرنے کے بعد آگے پڑھا کرتے تھے۔

(تذکرہ المفسرین، صفحہ ۴۸)

۳۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ۔

آپ کا اسمِ گرامی عبداللہ تھا۔ آپؓ کے والد حضرت عباس رضی اللہ عنہ تھے۔ جناب ابنِ عباسؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچازاد بھائی تھے اور ام المومنین حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کے بھانجے تھے۔ جیسا کہ بیان ہو چکا ہے آپ شعبِ ابی طالب میں بنی ہاشم کی محصوری کے زمانہ میں پیدا ہوئے اور آپؓ کو لعابِ دہن مبارک سے سرفرازی حاصل ہوئی تھی۔ توحید، رسالت اور قرآن گویا آپؓ کی گھٹی میں پڑا تھا۔ چنانچہ ذوقِ قرآن، فہمِ قرآن کی بشارتوں سے سرفرازی کے بعد قرآنِ حکیم ہی کی خدمت کو اپنایا۔ آپؓ کے تلامذہ کی تعداد بھی کثیر تھی، ان میں سعید بن جبیر، مجاہد، عکرمہ اور طاؤس شامل تھے۔ اور

مؤرخین نے اِس بات پر اتّفاق کیا ہے کہ جو تفسیر سیّدِ دوعالمؐ کی رحلت کے فوراً بعد مرتّب ہوئی وہ حضرت ابن عبّاسؓ کی تفسیر ہے جس کا ذکر خود صحیح بخاری میں کتاب التفسیر میں ملتا ہے۔

دوسرا طبقہ مفسّرین کا وہ ہے جن سے ضمنی طور پر اور جزوی حیثیت سے تفسیرِ قرآن ثابت ہے۔ ان میں سے اہم ہستیوں میں سے چند کے اسمائے گرامی درجِ ذیل ہیں۔

(۱) ابوموسیٰ عبدالرحمٰن بن قیس اشعریؓ۔ م ۴۴ھ
(۲) حضرت زید بن ثابتؓ کاتبِ وحیِ نبی کریم صلّی اللہ علیہ وسلّم۔ م ۴۵ھ
(۳) حضرت ابوہریرہ بن عبدالرحمٰنؓ۔ م ۵۷ھ
(۴) حضرت عبداللہ بن زُبیر شہیدؓ۔ م ۷۳ھ
(۵) حضرت عبداللہ بن عمر بن الخطّاب م ۷۳ھ
(۶) حضرت جابر بن عبداللہ الانصاری م ۷۴ھ
(۷) حضرت انس بن مالک بن النضر م ۹۱ھ

ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا ذکر بالعموم محدّثین میں آتا ہے لیکن آپؓ کو قرآنِ حکیم کی تفسیر کا بھی بڑا ملکہ تھا۔ چنانچہ ابوموسیٰ اشعریؓ مفسّرِ قرآن سے روایت ہے کہ اُنھوں نے فرمایا:

"ہم کو کبھی کوئی ایسی مشکل بات پیش نہیں آئی جس کو ہم نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا ہو اور انؓ کے پاس اس کے متعلّق کچھ معلومات نہ ہوں۔" (تذکرۃ المفسّرین صفحہ ۴۴)

اسی طرح پہلی اور دوسری صدی ہجری میں اِن اجلّ صحابہ کرامؓ کے علاوہ بھی سورتوں اور آیتوں کی تفاسیر ثابت ہیں۔ پھر تابعینؒ میں مفسّرین کی ایک بڑی تعداد ملتی ہے، جن میں مُجاہد بن جبیر، سعید بن جُبیر، طاؤس بن کیسان،

عطا بن ابی رباح، علقمہ بن قیس وغیرہ جیسے جلیل القدر مفسر شامل ہیں حضرت عکرمہ حضرت ابن عباسؓ کے غلام تھے اور یہ غلامی وہ غلامی تھی جس میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے عکرمہ کو علم تفسیر سے مالا مال فرمایا۔

پھر تیسری صدی ہجری میں ایک بہت بڑی تعداد مفسرین اور محدثین کی ملتی ہے ان میں وہ بھی تھے جن کو اُن کے اُستاد قُطُومُبْ لَیْلٍ کے نام سے یاد کرتے تھے یعنی کتاب کا کیڑا جو دن رات چلتا رہتا ہے۔

ان میں جو مفسرین ہمیں ملتے ہیں وہ نہ صرف مفسر ہیں بلکہ محدث اور فقیہ بھی، اور بعض ان میں درسِ تفسیر دیتے ہیں، ان میں عثمان بن ابی شیبہ بھی ہیں جن کے علم وفضل کے متعلق صرف یہ کہنا کافی ہوگا کہ آپ حضرت امام بخاری کے استاد ہیں۔

ہمارا مقصد ان مفسرین کی تفاسیر اور اُن کے اسمائے گرامی کا ذکر نہیں، بلکہ یہ بتانا ہے کہ یہ وہ عظیم اور جلیل القدر طبقہ ہے جس نے نبوّت ورسالت کی اہم ترین امانت کی ادائیگی کا فریضہ اپنے سر لیا، اور قرآنِ حکیم کی لغوی، معنوی تفسیر لوگوں تک پہونچائی، اور وہ اس طرح فرمائی گویا یہ نورِ مبین صلّی اللہ علیہ وسلّم کی جانب سے حقائق کا عرفان ہے اور خود اُن کی تاویل یا تشریح نہیں۔

چنانچہ حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کا حضرت ابنِ مسعودؓ کے لئے یہ فرمانا کہ جس کو تفسیر پڑھنا ہو وہ ابنِ مسعودؓ سے حاصل کرے، تو یہ صرف ابنِ مسعود رضی اللہ عنہ کی تصدیق نہ تھی بلکہ لوگوں کو یہ بتانا تھا کہ قرآنِ حکیم جس طرح نازل ہوا اور جس طرح حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم نے اُس سے لوگوں کے سمع وقلوب کو منوّر فرمایا، اس کی ادائیگی اُسی صحت کے ساتھ ابن مسعودؓ کر رہے ہیں خواہ یہ تلاوت

قرآنِ حکیم ہو، خواہ تجوید کی صورت میں یا قرأت کی صورت میں، اس میں سرِ مو فرق نہیں۔ اسی طرح معانی اور مطالب جو وہ بیان کر رہے ہیں وہ سب وہی ہیں جو اُن کے حافظے نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سُن کر محفوظ کر لئے۔

اسی طرح حضرت ابنِ مسعودؓ سے یہ فرمانا کہ تم قرآن پڑھو، اور آپؐ نے سورۂ نساء کی تلاوت فرمائی۔ یہ اس لئے تھا کہ آپؐ سے ابنِ مسعود رضی اللہ عنہ کی تلاوتِ قرآن کی عملی تصدیق ہو جائے اور لوگ آپؓ کی صحتِ تلاوت پر اعتماد فرمائیں۔

اسی طرح حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہ کے لئے دعا فرمانا: یا اللہ اس کو دین کا فقیہ بنا اور قرآن کی تفسیر سکھا۔ یا دوسرے موقع پر لعابِ دہنِ مبارک سے سرفراز فرمانا اس لئے تھا کہ حفاظتِ لفظِ قرآن کے ساتھ اس کے معانی و مطالب، لغوی و معنوی خوبیاں، حل المشکلات، تشبیہات و استعارات کی فہم حضرت ابن عباسؓ کے لئے آسان ہو جائے، اور آپؓ ہی کی قرآن فہمی تمام تفاسیر کی بنیاد بنے۔

تفاسیر کی اس اہمیت میں یہ راز بھی مضمر تھا کہ قرآن اور صاحبِ قرآن دونوں ایک ہی نور کا ظہور ہیں، جس نے قرآن کے انوار پائے اس نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نورِ مبین سے سرفرازی پائی۔ بقول استادِ محترم[1] "قرآن وہ ہے جو صاحبِ قرآن سے ملاتا ہے اور صاحبِ قرآن وہ ہیں جو اللہ سے ملاتے ہیں"۔ گویا تفسیرِ قرآن یافتِ ذاتِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا وسیلہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی دنیاوی حیاتِ مبارکہ میں قرآنِ حکیم کے ایک ایک حرف کی لفظی و معنوی وسعتوں سے صحابۂ کرامؓ کو آگاہی بخشی، اور اب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پردہ فرمانے کے بعد خود

۱۔ حضرت قاضی احمد عبدالصمد فاروقیؒ۔

قرآنِ حکیم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق، عادات و اطوار، زہد، عبادات، معاملات، اندازِ کریمانہ کی ہر ہر ادا کا ترجمان ہے۔ آپؐ کے سچے متبعین اور محبین کو آپؐ کے ساتھ شامل فرما کر ہمیں یہ دعا سکھانا:

اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۝

اے اللہ تو ہمیں سیدھی راہ دکھا ان لوگوں کی راہ جن پر تیرا انعام ہوا۔

گویا قرآنِ حکیم کی پہلی ہی جامع دعا میں قرآن اپنی جانب نہیں بلکہ صاحبِ کتابؐ اور آنؐ کے متبعین کی طرف نظریں پھیر دیتا ہے، جو قبولیتِ شرف سے چلے اور سلوکِ حقہ میں رہے، جمالِ نعمتِ باطن سے سرفراز رہے۔ تاکہ ہر دور میں مومن نورِ قرآن سے نورِ مبینؐ کی تجلیات سے بہرہ مند ہو سکے اور عقل کی الجھنوں میں پڑ کر گمراہ نہ ہو جائے۔

یاد رہے کہ قرآن اور نورِ مبینؐ دونوں ایک ہی نور کا ظہور ہیں اور اس کی یافت ہی "ایمان" ہے، عرفان ہے۔

گویا

قرآن ایک علمِ نوری ہے، ایک علمِ اجمالی ہے، جس کی تفسیر اہلِ دل علمائے راسخین ہر ہر زمانہ میں کرتے رہیں گے۔ البتہ ان کے لئے ایک سہارے اور قابلِ اعتماد سہارے کی ضرورت تھی وہ خود اسوۂ رسولِ کریمؐ تھا، اس ذاتِ اقدس و مقدسؐ کے احوال تھے جو ترجمانِ ذات و صفاتِ باری تعالیٰ قرار پائی اور جملہ عالم کے لئے ہادی بن کر مبعوث ہوئی۔

○

تدوینِ حدیث

قرآن کی تفسیر کے ساتھ ساتھ اسی کاوش اور محنت بلکہ اس سے زیادہ

جدوجہد کے ساتھ[1] فرمودہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جمع کرنے کی کوشش میں ایک عظیم طبقہ نے اپنی زندگی صرف کر دی۔ انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک ایک بات، ایک ایک سنت، ایک ایک وجہِ تبسّم اور ہر ہر خوشی اور ناخوشی کے اسباب میں پوری تحقیق و کاوش سے کام لیا، اس کے لئے دُور دراز کے سفر کیے، اور تدوینِ حدیث کا کام شروع ہوا۔ اور یہ کام خود سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سے شروع ہو چکا تھا۔ جس میں احادیثِ رسولؐ کی حفاظت اور کتابت کے سلسلہ میں عہدِ رسالت سے لے کر اتباعِ تبع تابعین تک پورے تسلسل اور تواتر سے یہ کام جاری رہا، اور ڈھائی سو سال کے اس طویل عرصہ میں یہ سلسلہ کبھی نہیں ٹوٹا۔

اس کام کی اہمیت کے تحت کہ قرآنِ حکیم کی تفسیر خود ذاتِ مقدسہ[2] سے ہے آپؐ نے بعض صحابہؓ کو احادیثِ مبارکہ قلمبند کرنے کی اجازت عطا فرمائی انہیں میں اجلّ صحابہؓ کے علاوہ انس بن مالک، عبداللہ بن عمر، جابر بن عبداللہ حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص زید بن ثابتؓ ہیں۔ خود حضرت ابوہریرہؓ نے فرمایا:۔

"صحابہؓ میں مجھ سے زیادہ کسی کے پاس حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث محفوظ نہیں سوائے عبداللہ بن عمروؓ بن عاص کے کیونکہ وہ احادیث لکھتے تھے اور میں نہیں لکھتا تھا[2]"

---

[1] قرآنِ مجید کے تحریری نسخے (مکمل اور غیر مکمل) موجود تھے۔ کاتبانِ وحی اور خلفائے راشدین نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ترتیب کے مطابق تمام بلادِ اسلامیہ میں اُن کی اشاعت فرمائی۔ یوں کہ ہر نقطۂ پر امانت، تاریخ اور منصف مزاج غیر مسلموں کو اتفاق اور اعتماد ہے۔ خود حضورؐ نے اللہ تعالیٰ کے فرمان کے مطابق کتاب کو ترتیب کیا۔ (محترم ابوالخیر کشفی صاحب)

[2] محدثین عظام، مولانا تقی الدین ندوی، ص ۵۰۔ بحوالہ فتح الباری جلد اوّل ص ۱۸۲۔

حضرت ابوہریرہؓ کا حافظہ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی توجہ سے اس قدر تیز تھا کہ وہ احادیث خود تو کم لکھتے لیکن احادیث، کتب اور صحائف کا ایک بڑا ذخیرہ انؓ کے پاس موجود تھا۔ حضرت ابوہریرہؓ ابتداء میں احادیث نہیں لکھتے تھے لیکن حضورؐ کے پردہ فرمانے کے بعد آپؓ نے ان احادیث کو لکھ لیا۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ جب انؓ کے سامنے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث کا ذکر ہوا جس میں غلط بیانی پر سخت وعید ہے تو آپ (حضرت عبداللہ بن عمرؓ) نے تبسم فرمایا اور کہا: "اے بھتیجے! ہم لوگ جو کچھ بیان کرتے ہیں وہ سب ہمارے پاس لکھا ہوا محفوظ ہے۔"

قبل اس کے کہ ہم تدوینِ حدیث کے سلسلہ میں اہم شخصیتوں کا ذکر کریں ہمیں امہات المومنینؓ کی ان لازوال خدمت کا ذکر ضروری ہے جو انہوں نے قرآن اور حدیث کی تفہیم ونشر کے سلسلہ میں فرمائیں۔ یہ وہ نورانی ہستیاں ہیں جو رازدارِ شریعت ومعرفت ہیں، جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اس قدر قریب تھیں کہ انؓ کا ظاہر وباطن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تجلیات کا مرقع بن گیا تھا۔

ان میں ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ اپنی ذہانت وفراست کے باعث، علمِ حدیث اور فقہ میں ایک عظیم مقام پر فائز تھیں۔ حقیقت یہ ہے کہ خواتین کو جو علم ملا وہ بالعموم انہیں امہات المومنینؓ کے ذریعہ پہونچا، اور علوم نبوت کی اشاعت میں جو مساعی حضرت عائشہؓ نے فرمائے اور جو علمی فوائد فرزندانِ امت کو پہونچے ہیں وہ اس درجہ کے ہیں کہ وہ امہات المومنین میں سے کسی اور کو حاصل نہیں۔ جو احادیث آپؓ سے مروی ہیں ان کی تعداد ۲۲۱۰ تک ہے، اس میں صحیحین میں متفق علیہ ۱۴۷، صرف بخاری شریف میں ۵۴، صحیح مسلم میں ۶۷، اور دیگر کتب میں ۲۰۱۷ حدیثیں ملتی ہیں۔ یہ خدمات

فتاویٰ شرعیہ، حلِ مشکلاتِ علمیہ، بیانِ روایاتِ عربیہ، اور سیر و واقعاتِ تاریخیہ کے علاوہ ہیں۔ (رحمۃ للعالمین جلد دوم صفحہ ۱۵۵)

حضرت عائشہ صدیقہؓ کے علاوہ دیگر ازواجِ مطہراتؓ سے بھی احادیث ملتی ہیں لیکن چند ہی۔ مثلاً ام المومنین حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا سے ۶۰ تک، حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے ۳۷۸، اور حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا سے صرف سات۔

ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ کو یہ فخر بھی حاصل ہے کہ آپؓ تقریباً ۹ سال کی عمر ہی سے آخر وقت تک حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے قریب رہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے انوار و تجلیات کی ایک پُرنور مستند ترجمان بنیں۔

پہلی صدی ہجری احادیث کو ایک محتاط انداز سے محفوظ کرنے کی صدی تھی۔ اس میں کتابتِ حدیث بھی تھی اور حفظِ حدیث بھی۔ لیکن دوسری صدی ہجری میں تدوینِ حدیث کا باقاعدہ سلسلہ حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کے مسندِ خلافت پر فائز ہونے کے بعد شروع ہوا۔ چنانچہ حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے ۹۹ھ میں منصبِ خلافت کا بارِ گراں خلفائے راشدینؓ کے انداز سے اٹھایا۔ انہوں نے دیکھا کہ مسلمانوں میں فرقہ بندی کے آثار شروع ہو گئے ہیں، روافض، خوارج اور قدریہ گروہ سر اٹھا رہے ہیں۔ اس لئے حدیث اور سنتِ نبی کریمؐ کی باقاعدہ تدوین کو انہوں نے بڑی اہمیت دی۔ انہوں نے اپنے زمانہ کے جلیل القدر عالم قاضی ابوبکر بن حزم خزرجی (المتوفی ۱۲۰ھ) کو جو حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کے زمانہ میں خوش قسمتی سے مدینہ منورہ کے قاضی بھی تھے، حکم دیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جو حدیثیں آپؒ کو ملیں اُن کو تحریری شکل میں لے آئیں، کیونکہ اندیشہ ہے کہ یہ علم مٹ جائے گا اور علماء رخصت ہو جائیں گے۔
(محدثین عظام، مولانا تقی الدین ندوی صفحہ ۵۹ بحوالہ صحیح البخاری)

بلکہ موطا امام مالک میں حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے اس فرمان کا ذکر اس اضافہ کے ساتھ ہے کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث و سنت، نیز حضرت عمرؓ کی حدیثیں اور اس قسم کی جو روایات مل سکیں ان سب کو تلاش کر کے مجھے لکھو" [1] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے معجز نما دور میں حضرت عمر فاروقؓ اور دیگر صحابہؓ کے آثار کے جمع کرنے کا بھی کام شروع ہو گیا تھا۔

امام ابوبکرؒ کے علاوہ دوسرے جید عالم جن کے سپرد یہ خدمت ہوئی وہ امام محمد بن شہاب الزہری (المتوفی ۱۲۵ھ) ہیں۔ چنانچہ امام زہری نے تو دفتر کے دفتر لکھوا ڈالے، اور اس طرح حدیث کے پہلے مدوّن ابن شہاب زہری ہی قرار پائے۔

گو حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی خلافت کا دور دو سال سے زیادہ نہ ہوا لیکن یہ وہ دو سال ہیں جن میں دو سو سال تک جو کام ہوئے اُن کی بنیادیں مستحکم ہوئیں، اور تدوینِ حدیث کے ساتھ اور علوم نبوی بالخصوص استخراجِ مسائل انضباطِ حیاتِ مسلمہ کے لئے علمِ تفسیر و حدیث کے ساتھ مزاجِ رسالت سے آشنا وہ ہستیاں پیدا ہوئیں جنہیں ائمۂ اربعۂ فقہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے "احادیث کو جمع اور منظم کرنے کے ساتھ ساتھ حدیث کو سند کے ساتھ بیان کرنے کی ابتداء بھی ابن شہاب زہری نے کی۔" [2]

یہ بات بڑی اہمیت کی حامل ہے کہ یہ حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ، حضرت امام مالکؒ، اور حضرت امام شافعیؒ دوسری صدی ہجری کی وہ جلیل القدر ہستیاں ہیں جن کا شمار ائمۂ اربعہ میں ہے۔ البتہ امام حنبلؒ کی پیدائش ۱۶۴ھ اور وفات

---

[1] موطا باب الکتاب العلم۔

[2] تذکرۃ المحدثین، مولانا غلام رسول سعیدی، ص ۳۳

۲۴۱ھ ہے، جن کو تیسری صدی میں شامل کیا جاتا ہے۔

چنانچہ محدثین کے تذکرہ نگاروں نے ان ائمہ کرامؒ کا ذکر محدثین کے ساتھ کیا ہے، جس کے وہ ہر طرح مستحق ہیں۔ لیکن اُنؒ کے ذوقِ طبعی کا تقاضا ہے کہ اُن کو صرف محدثین کی حیثیت سے نہیں بلکہ مفسرین، محدثین اور مفکرین کی حیثیت سے دیکھا جائے تاکہ وہ علمی کارنامے جو فقہی انداز سے پیش ہوئے اُجاگر ہوں ـــــ یہ بات واضح رہے کہ یہ وہ بزرگ ہستیاں ہیں جو چار دبستانِ فکر کی مالک ہیں۔ اللہ رب العزت کا یہ بڑا فضل تھا کہ اس نے ایسی ہستیوں سے امتِ مسلمہ کو نوازا جو رُوحِ اسلام کی راز دان، علومِ تفسیر و حدیث، قواعدِ لغت کی ماہر اور بدلتے ہوئے حالات سے پوری طرح آشنا تھیں، جن کی بصیرت افروز نظروں کے سامنے صرف دوسری صدی نہیں بلکہ تا قیامِ قیامت آنے والی نسلیں تھیں۔ یہ بھی بڑی حیرت کی بات ہے کہ تیسری صدی میں احادیثِ مبارکہ کے ذخائر جمع ہو جانے کے بعد اور زمانہ کی سالہا سال کروٹیں بدلنے کے بعد بھی اُن کی فقہ اسی طرح امت کے لئے کشتیٔ نجات بنی ہوئی ہے، اور اُن کے متبعین میں جید علماء، مفسرین، محدثین، فقہا اور صوفیاء اپنے اپنے انداز سے سیرتِ نورِ مبینؐ کی ترجمانی فرما رہے ہیں۔

صحاحِ ستہ کی تدوین سے قبل ان بزرگوں کی یہ فہمِ دین، محض اللہ کا کرم اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نظرِ رحمت کا صدقہ تھی، وہی نظرِ رحمت جو کبھی فیضان بن کر علم بنتی، کبھی خوابوں میں بشارتیں دیتی اور کبھی اپنے آغوشِ محبت میں لے کر ارحم الراحمین کے دربارِ خاص میں پہونچا دیتی۔

اُن کی اس بصیرت و عظمت کا تقاضا ہے کہ اُن کا ذکر عام محدثین کرام کے بعد الگ کیا جاتے۔ ہمارے اس اندازِ بیان سے یہ دھوکہ نہ ہو کہ ہم علمِ حدیث کی قدر دانی میں خدانخواستہ کوئی کمی کر رہے ہیں، نعوذ باللہ! بلکہ شاید محدثین

کی عظمت کو اجاگر کرنے میں ہمارا یہ اندازِ ترتیب معاون ہو۔ ہم نہ بھولیں کہ یہ بزرگ ہستیاں محدّث بھی ہیں، اور اگر کوئی کتاب فقہی ترتیب سے مرتّب ہو تو موطا امام مالک ہی پہلی کتاب ہوگی جس کا شمار ائمۂ اربعہ میں بھی ہے اور محدّثین میں بھی۔

امام مالکؒ

بستان المحدّثین میں داخل ہوں تو احادیثِ مبارکہ کی خوشبو، محبتِ رسولِ کریمؐ کے انوار، امام مالکؒ اور موطّا امام مالک دونوں میں یکساں رچے بسے ہوں گے۔ ہر چند حدیثِ نبوی کے ذکر کے ساتھ جس عظیم شخصیت کا نام ذہن میں گھوم جاتا ہے وہ امام بُخاریؒ کی ہے۔ لیکن ہمیں یہاں صرف محدّثین کا ذکر منظور نہیں بلکہ نورِ مبین کی کارفرمائیاں پیش کرنا ہے۔ پھر محدّثین میں بھی تاریخی اعتبار سے امام مالکؒ کو اوّلیت حاصل ہے، حضور سرورِ کائناتؐ کی اتّباع و محبت میں اپنی مثال آپ ہیں۔ اس لئے آپؒ کے ذکر سے بسم اللہ کرنا بہتر ہے۔ اور یہ امر بھی بڑی اہمیت کا حامل ہے کہ جنّت البقیع میں آج بھی داخلہ کے وقت پہلی نظر امام مالکؒ اور اُن کے چچا امام نافع ہی کے مبارک مزاروں پر پڑتی ہے، اور پہلا سلام وہیں پیش ہوتا ہے۔

آپؒ کا نام مالک، ابوعبداللہ کنیت اور امام دارالھجرۃ لقب تھا۔ آپؒ کے والد کا نام انس تھا۔ آپؒ کے دادا مالک بن ابی عامر جلیل القدر تابعی اور صحاح کے رواۃ میں داخل ہیں۔ انہوں نے روایت و حدیث میں حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت طلحہؓ، حضرت عقیل بن ابی طالبؓ، حضرت ابوہریرہؓ اور اُمّ المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ اور دیگر صحابۂ کبارؓ سے شرفِ تلمّذ حاصل کیا تھا۔

مالک بن ابی عامر کے تین بیٹے تھے: انس جو امام مالکؒ کے پدرِ بزرگوار ہیں، ربیع، اور ابوسُہیل نافع جو خود ایک بلند پایہ محدّث ہوئے اور جن کا نام ہمیشہ امام مالکؒ

کے ساتھ ہی لیا جاتا رہا۔ اور یہ قُرب آج جنّت البقیع میں نمایاں ہے۔ حضرت امام مالکؒ کی تاریخِ پیدائش ۹۳ھ ہے۔ آپؒ امام ابوحنیفہؒ سے ۱۳ سال چھوٹے تھے۔

یہ وہ دَور تھا کہ مدینہ منوّرہ کے گھر گھر میں علم کے چرچے تھے، وہ آنکھیں روشن تھیں جو حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کے دیدار سے شرف یاب رہیں۔ مدینۃ الرّسول کی فضا حضورؐ کی خوشبو سے بسی ہوئی تھی۔ شہرِ مدینہ جو عہدِ نبوی اور اُس کے بعد ۲۵ سال تک تمام حکومتِ اسلامیہ کا مرکز رہا۔ انہیں فضاؤں میں امام مالکؒ نے آقائے دوجہاںؐ کے علم و عرفان، شریعت و طریقت، حقیقت و عرفان کی تجلیات سے سرفرازی پائی اور ایسے گرویدہ رہے کہ کبھی مدینہ منوّرہ کے باہر قدم نہ نکالا۔ اور حج کے علاوہ ایک لمحہ کے لئے بھی اس سرزمین سے جُدا نہ ہوئے جس میں انوارِ رسالت دمک رہے تھے۔ اور وہ تمام علوم جو مختلف سینوں میں پراگندہ تھے اپنے ایک سینے میں جمع کر لئے۔ اسی لئے آپ کا لقب اِمَامُ دَارِالھجرۃ ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ امام مالکؒ کا کوئی سفر طلبِ علم میں بھی نہ ہوا۔ پھر وہ خود مرکزِ علم و عرفان تھے، جن کے پاس دُور دُور سے شیوخ کھنچ کھنچ کر چلے آتے تھے۔ آپؒ کے اساتذہ کرامؒ میں صحابہ کرامؓ کے علاوہ امام زین العابدینؑ کے پوتے امام جعفر صادقؓ بھی ہیں جن کے تلامذہ میں امام ابوحنیفہ بھی شامل ہیں۔

(اقتباس از حیاتِ مالک، سیّد سلیمان ندوی)

حضرت سلیمان ندویؒ نے آپؒ کے شیوخ کے اسمائے گرامی بہ ترتیبِ ہجا دیئے ہیں ان میں مدنی اور غیر مدنی دونوں شیوخ شامل ہیں۔ ان کے علاوہ امام مالکؒ نے صالحین کی ایک بڑی جماعت کی صحبت سے فیض حاصل کیا۔ آپؒ تحدیثِ نعمت کے طور پر فرماتے تھے: "میں کبھی کسی غیر فقیہ (سفیہ) کی مجلس میں نہیں بیٹھا۔" وہ فرمایا کرتے کہ "اِس صحنِ مسجد (نبوی)، ان ستونوں کے پاس میں نے ستّر شیوخ کو پایا لیکن ان میں سے ایک کے پاس بھی نہیں بیٹھا۔ بات یہ تھی کہ

قالَ رسول اللہ، قال رسول اللہ، تو کہتے تو بعض نادانستہ جھوٹ بولتے، بعض منزِ سخن سے ناواقف تھے، بعض پورے جاہل تھے۔"

(حیات امام مالکؒ مولانا سلیمان ندوی ص ۳۴ - ۳۵)

یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ امام مالکؒ اپنی روایات میں کس درجہ محتاط تھے۔ اُنؒ کے درس کا اپنا طریقہ تھا جو شیوخ کبار میں رائج تھا۔ امام مالکؒ کے تلامذہ کی تعداد تیرہ سو سے زائد ہے۔ یہ بات بھی بڑی اہمیت کی حامل ہے کہ امام مالکؒ کے تلامذہ اور مستفیدین میں اپنی اپنی اقلیم کے مستقل سربراہ، تاجدار شامل ہیں، ان میں خلفائے اسلام اور امرائے بلاد بھی ہیں، تابعین اور شیوخ بھی، ائمہ محدثین بھی، ائمہ مجتہدین اور فقہاء بھی، زہاد اور صوفیائے کرام بھی۔ انہیں صوفیائے کرام میں ابراہیم بن ادہمؒ، ابونصر بشر بن حارث الزاہدؒ، ذوالنون مصریؒ محمد بن فضیل بن عیاضؒ بھی ہیں۔ ان کے علاوہ ادباء اور شعراء بھی حصولِ فیض کے لئے شامل درس ہوتے۔ (حیات امام مالک صفحہ ۵۲)

ہم نے کسی قدر تفصیل سے یہ حالات لکھے، صرف اس حقیقت کو واضح کرنے کے لئے کہ امام مالکؒ کی سیرتِ مبارکہ، عادات، اخلاق، لباس و گفتار کو ان نظروں سے دیکھا جائے کہ یہ تجلیاتِ نورِ مبین صلی اللہ علیہ وسلم کے کیسے ترجمان ہیں۔

مدینۃ النبی کے عشق کا یہ عالم ہے کہ خلیفۂ وقت مہدی نے سواری بھیجی کہ بارگاہِ خلافت میں سوار ہو کر آئیں۔ سواری واپس فرما دی کہ میں مدینہ میں سوار ہو کر نہیں نکلتا کہ انہیں گلیوں میں سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم چلا پھرا کرتے تھے۔ پا پیادہ ہی گئے باوجودیکہ بیمار تھے[1] بجز سفرِ حج کے مدینہ سے

---

[1] حیات امام مالک صفحہ ۴۰،

باہر نہیں نکلے۔ مہدی نے تین ہزار دینار بھیجے اور پھر کہلا بھیجا کہ بغداد کا عزم کیجیے۔ فرمایا "اشرفیاں علیٰ حالہ رکھی ہیں، جی چاہے تو لے جاؤ، مگر مالکؒ سے مدینہ نہیں چھوٹ سکتا۔" انتہائے محبت یہ ہے کہ جمہورِ اسلام کے خلاف امامؒ مکہ معظمہ پر مدینہ منورہ کو برتری دیتے ہیں۔ (حیات امام مالک صفحہ ۸۴)

درسِ حدیث کے وقت عظمتِ نبی کریمؐ اس درجہ غالب رہتی کہ ہمیشہ درس دینے سے قبل غسل فرماتے، جامہ زیبِ تن فرماتے، عمامہ باندھتے، اور نہایت وقار کے ساتھ درسِ حدیث دیتے۔ ایک بار کا واقعہ ہے کہ موزہ میں بچھو تھا، امام مالکؒ نے بے خبری میں پہن لیا اور مجلسِ درس میں آ کر بیٹھ گئے۔ بچھو نے نیش مارا اور سترہ بار اسی طرح نیش زنی کی۔ لیکن ادبِ حدیث یہ تھا کہ امام مالکؒ نے پہلو تک نہ بدلا۔ چہرہ کا رنگ بار بار متغیر ہوتا۔ اختتامِ درس پر عبداللہ بن مبارک کے استفسار پر فرمایا کہ موزے میں بچھو ہے۔ (حیات امام مالک، صفحہ ۸۵)

آپ کا مشغلہ گھر پر عبادت و تلاوت، آپؒ کی زندگی طاعتِ الٰہی، اور حُبِ رسولؐ آپ کی فطرت بن گئی تھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کا یہ عالم تھا کہ نامِ مبارک زبان پر آتے ہی چہرے کا رنگ متغیر ہو جاتا تھا۔ غرض فیاضی، مہمان نوازی، حق گوئی، خود داری، انصاف پسندی، اہلِ علم کی عزت آپؒ کا شعار تھا۔ علمِ حدیث میں وہ مقام پایا کہ امیر المومنین فی الحدیث کہلائے۔ عبدالرحمٰن بن مہدی کا قول ہے کہ روئے زمین پر امام مالکؒ سے بڑھ کر حدیثِ نبویؐ کا کوئی امانت دار نہیں۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں "جب حدیث آئے تو مالکؒ ستارہ ہیں۔" امام احمد بن حنبلؒ سے کسی نے دریافت کیا کہ کس کی حدیث زبانی یاد کرنا چاہیے، تو آپؒ نے جواب دیا کہ مالک بن انسؒ کی۔ (محدثین عظام صفحہ ۹۴)

البتہ امام صاحبؒ کی طبیعت میں صفائی اور نزہت بدرجہ غایت تھی۔ وہ خوش پوش واقع ہوئے تھے۔ بیش قیمت لباس زیبِ تن فرماتے، خوشبو کا استعمال ہمیشہ کرتے تھے۔ عُود کی انگیٹھیاں جلتی رہتی تھیں۔ کپڑے خوشبو میں بسے ہوتے۔ جس گلی سے گذرتے اُس گلی میں دیر تک خوشبو بسی رہتی۔

بس یہی وہ بات ہے جس پر بعض لوگوں نے ناسمجھی سے اعتراض کیا اور ہمارے لئے یہی امام مالکؒ کے قُربِ رسول کریمؐ کا ثبوت ہے۔ ہم کو اِس گئے گذرے دور میں ان ہستیوں کا شرفِ قدم بوسی حاصل ہوتا ہے جن کے جسم اطہر سے ہاتھ مَس ہو جائے تو خوشبو ہاتھوں میں آجاتی، جن کو خواب میں دیکھا، آنکھ کھلی تو کمرہ خوشبو سے معطّر پایا، جس کو دوسروں نے بھی محسوس کیا۔ اس حقیر کا یقین ہے کہ حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی یاد اور محبّت حضرت امام مالکؒ کے قلب و رُوح میں اس درجہ متمکّن ہو گئی تھی کہ وہ محبت خوشبو بن کر آپؒ کے جسم سے بے محابا پھیلتی رہتی اور اس پر حجاب ڈالنے کے لئے امام مالکؒ بہتر سے بہتر عطر اور خوشبو کا استعمال فرماتے تاکہ لوگ اسے عطر و عُود و عنبر کی خوشبو سمجھیں۔ اور یہی وجہ تھی کہ بہتر سے بہتر کپڑے زیب تن فرماتے۔ سنّتِ نبوی تو نفس کو لباسِ فاخرہ سے بچانا تھا۔ یہاں نفس تھا ہی کہاں۔ یہ نفسِ رسولؐ کی جامہ زیبی تھی۔ ان راتوں کے شب بیدار، مصروفِ عبادات کو اس لباس کے پہننے کی فرصت ہی کہاں۔ آپؒ کا وصال ۱۷۹ھ میں ہوا۔

اس عاجز کے نزدیک محدّثینِ کرام حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام کے بالخصوص محافظ ہیں اور حضرت امام مالکؒ پروانۂ ذاتِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور آپؐ ہی کے انوار سے انوار یافتہ۔ (سبحان اللہ)

موطّا تو بہت لکھی گئیں، جو باقی رہی وہ موطّا امام مالکؒ ہے۔ اس کا ذکر

فقہاء کے سلسلہ میں آئے گا۔ (اِن شاء اللہ)

امام بخاریؒ

دربارِ رسالت میں اعزاز و اکرام، نوازشات اور رحمتوں کی کیا کمی۔ یہاں تو ہر ایک کو اُس کے عزم و حوصلہ کے مطابق، یا اس مشیئتِ ایزدی کے مطابق نوازا جاتا ہے کہ وہ خود دلیلِ حق بن جائے، اور اُس کی ترجمانیٔ حق پر خود زمانہ شاھد رہے۔ ایسی ایک عظیم ہستی امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی تھی۔ حدیثِ مبارکہ کے ذکر کے ساتھ ہی امام بخاریؒ اور بخاری شریف کا تصوّر ذہن میں گھوم جاتا ہے، اور ان کی عظمت جاگزین ہو جاتی ہے۔

"امام ابو عبد اللہ محمد بن اسمٰعیل البخاری ۱۳ شوال نماز جمعہ کے بعد ۱۹۴ھ میں ماوراء النہر کے مشہور شہر بُخارا میں پیدا ہوئے۔ آپؒ کے والد اسمٰعیل بن ابراہیم ایک عظیم محدّث اور صالح بزرگ تھے۔ ایّامِ طفلی میں امام بخاریؒ کے والد کا انتقال ہو گیا، اور آپؒ نے آغوشِ مادر میں پرورش پائی۔ بچپن ہی میں نابینا ہو گئے۔ آپؒ کی والدہ جو ایک عابدہ و زاہدہ خاتون تھیں اُن کی تمناؤں پر اوس پڑ گئی۔ اُن کی خواہش تھی کہ اُن کا بیٹا علم و عرفان میں یکتائے روزگار ہو۔ ایک مومنہ کی حیثیت سے اللہ ربّ العزت کی بارگاہ میں لختِ جگر کے نورِ بصیرت و بصارت کی بھیک مانگی، اور کچھ اسی تڑپ سے دستِ سوال پھیلایا کہ بارگاہِ ربّ العزت سے قبولیت کی بشارت یوں ملی کہ ایک رات اُنہیں خواب میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زیارت ہوئی۔ آپؑ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہاری آہ و زاری اور دعاؤں کی کثرت کے سبب تمہارے بیٹے کی بصارت

لوٹادی ہے۔ صبح جب امام بخاریؒ بستر سے اُٹھے تو اُن کی آنکھیں روشن تھیں۔
(تذکرۃ المحدثین، مولانا غلام رسول سعیدی صفحہ ۱۷۲)

یہ پہلی ہی بشارت

درودِ ابراہیمی کی یادیں تازہ کرتی ہے، اور اس جانب اشارہ ہے کہ تکمیلِ دین کا ایک اہم ستون انہیں امام بخاریؒ کے مکرّم ہاتھوں استحکام پائے گا۔

حضرت امام بخاریؒ کے قدم اس جانب اُٹھے اور سولہ سال ہی کی عمر میں مشاہیر کی کتب احادیث کو حفظ کر لیا۔ پھر حج سے فراغت پا کر دو سال مکۂ معظمہ میں قیام کیا۔ اور پھر اٹھارہ سال کی عمر میں روضۂ مبارک میں بیٹھ کر تاریخ کبیر تصنیف فرمائی۔ آپؒ کا ارشاد ہے کہ جتنے لوگوں کے اسماء اس تاریخ میں ذکر کئے گئے ہیں مجھے ان میں سے ہر ایک کے بارے میں کوئی نہ کوئی قصہ بھی معلوم تھا لیکن میں نے اختصار کے خیال سے ان تمام قصوں کا ذکر نہیں کیا۔ تاریخ کبیر کی تصنیف کے ساتھ ہی اس کی نقل کا سلسلہ شروع ہو گیا اور امام بخاریؒ کی شہرت عام ہونے لگی۔

حضرت امام بخاریؒ نے سمعِ حدیث کے لئے دُور دراز کے سفر کئے۔ امام صاحبؒ کے سفر کا آغاز ۲۱۰ھ سے ہوا تھا۔ اس سلسلہ میں وہؒ شام، مصر، اور جزیرہ میں دو بار تشریف لے گئے اور حجازِ مقدس میں چھ سال قیام فرمایا، کوفہ و بغداد بار بار گئے کہ یہ علماء کا مرکز تھا، بصرہ بھی چار بار تشریف لے گئے اور بعض دفعہ پانچ پانچ سال تک قیام کیا، ایام حج میں مکہ مکرمہ چلے جایا کرتے۔

آپؒ کے اساتذہ اور شیوخ کی تعداد بقول خود امام صاحبؒ کے ۱۰۸۰ تک پہنچتی ہے۔ ان میں سب کے سب محدّث تھے۔ لیکن آپ کو زیادہ فیض اسحٰق بن راہویہ اور علی بن المدینی سے پہونچا۔ اسی طرح امام صاحبؒ کے تلامذہ کی تعداد بقول مولانا سلیمان ندوی نوّے ۹۰،۰۰۰ ہزار تک ہے۔ ان میں وہ

حضرات بھی ہیں جو آگے چل کر خود بڑے پایہ کے محدث ہوئے اور ان سے ہزاروں لاکھوں لوگوں کو نفع پہونچا۔ (محدثین عظام، تالیف مولانا تقی الدین ندوی، مقدمہ سید ابوالحسن علی ندوی، صفحہ ۱۴۰)

امام بخاریؒ غیر معمولی قوتِ حافظہ کے مالک تھے، استاد سے جو حدیث بھی سُنتے فوراً زبانی یاد ہو جاتی۔ بچپن ہی سے اُن کو تقریباً ستر ہزار احادیث ازبر تھیں، وہ کتاب پر نظر ڈالتے اور وہ حافظہ میں محفوظ ہو جاتی۔ امام صاحبؒ خود فرماتے تھے کہ "مجھے ایک لاکھ صحیح اور دو لاکھ غیر صحیح حدیثیں یاد تھیں (یہاں غیر صحیح سے مراد یہ ہے کہ جو امام صاحبؒ کے قائم کردہ اصولوں پر پوری نہ اُترے)۔

ایک بار آپؒ بغداد تشریف لے گئے، لوگوں نے آپ کا امتحان لینا چاہا، اور سَو احادیث کے اسناد اُلٹ پلٹ دس آدمیوں کے حوالے کئے، اور ہر شخص نے اُن کو انہیں غلط اسناد کے ساتھ امام صاحبؒ کے سامنے پیش کیا۔ لوگوں کا ایک ہجوم تھا کہ "آج غالب کے اُڑیں گے پرزے"۔ امام صاحبؒ ہر حدیث سُنتے اور ہر بار یہی فرماتے: لَا اَدْرِی (میں نہیں جانتا)۔ جب سب لوگ یہ اُلٹی پلٹی اسناد کے ساتھ اپنی احادیث سُنا چکے تو امام صاحبؒ نے ہر متن کو اس کی اصلی اسناد اور ہر سند کو اس کے اصلی متن کے ساتھ ملحق کر کے ترتیب وار سُنایا۔ لوگ ششدر رہ گئے اور علم و فضل اور حافظہ کا لوہا ان کو ماننا پڑا۔ اِس شاہدِ کلامِ نبوی نے ۶۲ سال کی عمر میں ۲۵۶ھ میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔

یہ خداداد حافظہ تو نبیٔ کریمؐ ہی کے فیضانِ نبوّت کے ثبوت ہی کے لئے، بارگاہِ ربّ العزت سے کسی کو مل سکتا تھا۔ کہ جب ایک بار کتاب پڑھ لی تو ذہن میں محفوظ ہو گئی، جب ایک بار حدیث سُن لی تو قلب پر کندہ ہو گئی۔ یہی

نہیں بلکہ جن صحابہ سے سُنی ان میں سے اکثر کی ولادت و وفات کی تاریخ اور اُن کی جائے سکونت بھی ذہن میں محفوظ رکھتے، اور اس وقت تک کوئی حدیث بیان نہ کرتے جب تک کتاب و سُنّت سے اس حدیث کی اصل پر واقف نہ ہوتے۔ یہ اندازِ حفظ پرتو رسالت کی تصدیق تھی کہ جبرئیل امینؑ سے جو قرآن سُنا وہ اُسی طرح محفوظ رہا، اور آج تک نورِ حقِ مبینؐ کا یہ فیضِ عام ہے کہ حفّاظ کے قلوب میں وہ محفوظ ہو جاتا ہے۔

ہم نہ بھولیں کہ قرآنِ حکیم تو رسولِ کریمؐ پر نازل ہوا تھا، جبرئیلِ امین کا کام تو صرف پہونچانا تھا۔ ضروری تھا کہ حضورِ انورؐ سے علمی تعلق کی جو یا ایسی ہستیاں بھی ہوں جو اُنؐ کے کلامِ مبارکہ (احادیث) کو بھی مکمل اسناد کے ساتھ پیش کر سکیں، جو آپؐ کے ایک ایک قول کی ترجمان اور نگران ہوں۔ تاکہ لوگ قرآن کو حدیث سے، حدیث کو سنّت سے، اللہ کو رسولؐ سے جُدا نہ کریں۔ دینِ محکم کی توحید کے پرستار بنیں، توہّمات کو اپنا شعار نہ بنائیں۔ اِس اہم کام کو تو ہونا ہی تھا۔

چنانچہ یہ خواہش کہ حضور سرورِ کائنات صلّی اللہ علیہ وسلّم کی احادیث کو صحت کے ساتھ یکجا جمع کیا جائے پہلے خود امام بخاریؒ کے دل میں پیدا ہوئی، اور اس کے پیدا ہونے کا واقعہ یہ ہوا: خود امام بخاریؒ یوں فرماتے ہیں کہ "ایک مرتبہ ہم اپنے استاد حضرت اسحٰق راہویہ کی خدمت میں حاضر تھے، اُنہوں نے فرمایا: "کاش! احادیث صحیحہ کے عنوان پر ایک کتاب تم جمع کر دیتے۔" امام بخاریؒ فرماتے ہیں کہ میرے دل میں یہ بات بیٹھ گئی۔

اور پھر تائیدِ غیبی یہ ہوئی
کہ حضرت امام بخاریؒ نے خواب میں دیکھا کہ وہ حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کے

سامنے کھڑے ہیں، انؒ کے ہاتھ میں ایک پنکھا ہے جس کے ذریعہ آپؐ کے اوپر سے دفع کر رہے ہیں (گویا پنکھا جھل رہے ہیں تاکہ جو کچھ حضورؐ کے جسم اطہر کی جانب آ رہا ہے وہ دُور ہو جائے دُور ہی رہے)۔ امام صاحبؒ بیدار ہوئے تو اہلِ علم سے تعبیر چاہی۔ اُنہوں نے فرمایا: "تم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث سے کذب کو دفع کرو گے۔" اس خواب نے اُنؒ کے ذوق وشوق ہمّت وعزم کو اور بلند کر دیا، اور الجامع الصحیح کی تالیف میں ہمہ تن مشغول ہو گئے۔

(ماخوذ از مولانا تقی الدین ندوی صفحہ ۱۴۹)

سوچئے، کیا اِس واقعہ سے آپ کے ذہن میں حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ الفاظ نہیں گھوم جاتے جو حضرت ابنِ مسعود رضی اللہ کے متعلق حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائے، یعنی: "جو قرآن کو اس طرح پڑھنا چاہتا ہے "جس طرح نازل ہوا" وہ ابنِ مسعودؓ سے پڑھے۔" اللہ جاب میں ہے۔ قرآن لانے والے جبرئیلِ امینؑ ہیں، پہونچانے والے سرکارِ دوعالم، اور آپؐ ابنِ مسعودؓ کے متعلق تصدیق فرما رہے ہیں۔ کیا آج یہ شرف امام بخاریؒ کو حاصل نہیں کہ وہ حضورؐ کی روایات کو اسی صدق اور تحقیق سے ہم تک پہونچا رہے ہیں، پورے اسناد کے ساتھ، تاکہ خود راہ سے ہٹ جائیں اور کلامِ نبیؐ نبیؐ کی زبان سے ہم تک پہونچے۔ اور اس پر کسی شک کا شائبہ تک نہ ہو۔

کیا یہ سب اس لئے نہیں کہ ہم بزرگ ہستیوں کو دیکھیں کہ وہ پروانۂ رسالت ہی نہیں بلکہ انوارِ رسالت ہیں، ان کے پسِ پردہ جو نور ہے وہ نورِ مبین ہی ہے ان کی سیرت کے قابلِ قدر انوار انہیں صلی اللہ علیہ وسلم کے انوار پر جمال ہیں۔ (سبحان اللہ)

اس تصنیف میں، جسے صحیح بخاری کہتے ہیں، امام صاحبؒ کے سولہ سال

صرف ہوئے اور اس کی "تنقیح و تہذیب تین بار فرمائی" ورنہ وہ یہ مقام کیسے پاتے جو عطائے ربّانی ہے، اور خود امام صاحبؒ اور اُن کی الجامع کو یہ مقبولیت کیسے نصیب ہوتی۔ دارالعلوموں میں اس کے درس ہوتے ہیں، مختلف زبانوں میں ترجمہ ہو رہا ہے، محققین کے لئے سرمایۂ علم و عرفان بنی ہوئی ہے۔ گویا وہ شمع ہے جو روشن ہے اور تجلّیاتِ "سراجاً مُنیرا" کی جانب راہ نما ہے۔

○

آیئے اب اسی نقطۂ نظر سے ذرا صحاحِ ستّہ کے دیگر مؤلفین کے دربارِ علم و عرفان میں حاضری دیں اور یہ دیکھیں کہ وہ نورِ مبینؐ کے کن کن فیوض و برکات سے بہرہ ور ہیں۔ ہم نے دو[1] کا ذکر کسی قدر تفصیل سے اس لئے کیا کہ ہمارے نقطۂ نظر کی وضاحت ہو جائے، اور دونوں جگہ یہی پایا کہ ایک نورِ مبینؐ کی خوشبو دں میں مہک رہا ہے اور دوسرا آپ صلّی اللہ علیہ وسلّم کے کلامِ معجز بیان کا شیدائی اور متوالا ہے، گویا اُنہیں صلّی اللہ علیہ وسلّم سے سُنتا اور اُنہیں کو دیکھتا ہے اور زندہ و جاوید "محسن" بنا ہوا ہے۔

یہ دربارِ رسالت ہے۔ یہاں خزانے ختم نہیں ہوتے۔ سب سمندر اگر سیاہی بن جائیں اور سب درخت قلم بن جائیں تو بھی ربِّ محمدؐ کی حمد نہ ہو سکے، تو پھر اُسؐ کی حمد کیسے ہو جس کو اللہ تعالیٰ ہی احمد، حامد اور محمدؐ کہے۔ یہ تبھی ہو جب کسی مردِ مومن، مردِ عارف کے قلب کو وہ نورِ بصیرت اُنہیںؐ کے دربار سے عطا ہو جائے جو جہت، زمان و مکان کی پابندیوں سے آزاد، اوّل آخر، ظاہر باطن سے بے نیاز ہیں تو شاید اس کے حصّہ میں بھی نورِ مبین

---

[1] امام مالکؒ و امام بخاریؒ

صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی جھلک آجائے۔

حضرت امام مسلمؒ

آسمانِ نبوت پر یہ روشنی جو چمکتی نظر آتی ہے یہ الجامع الصحیح کے مؤلف امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ کی ہے۔ امام مسلمؒ کے قلب کو بھی فقط صحیح احادیث کے جمع کرنے ہی کی لگن ہے۔ امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ دونوں ہی کا ذکر زبانوں پر ایک ساتھ آتا ہے۔ امام مسلمؒ کا سنِ پیدائش ۲۰۲، ۲۰۳ یا ۲۰۴ھ کہا جاتا ہے۔ تمام زندگی حصولِ علم میں اور تمام وقت اخلاق کی آراستگی، زہد و تقویٰ میں گذار دی۔ اور ۲۵ رجب ۲۶۱ھ کو ایک عالم گمشدگی میں نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی عطا کے انداز نرالے ہیں۔ کسی کو کتابوں سے، کسی کے قلب پر وارداتِ کے ذریعہ، کہیں کسی کے ذہن میں خیال کے ذریعہ، کہیں خوابوں میں آکر، کہیں دل میں بس کر اس طرح کہ انسان خود ہی اپنے سے باتیں کرتا رہتا ہے، وہ خود سے گویا ہوتا ہے، کوئی اس سے گویا ہوتا ہے اور یہ سب وقت و زمانہ کی ضروریات کے تحت ہوتا ہے، کسی کو صحیح بخاری کے لئے انتخاب کیا تو اس طرح کیا جیسا ذکر ہوا۔ اب بخاری کی تصدیق کا کام مسلمؒ کے سپرد ہوا کہ ایمان کی تصدیق اسلام سے ہے، قول کی عمل سے ہے۔

امام بخاریؒ کا کام احادیثِ صحیحہ مرفوعہ کی تخریج، اور فقہ، سیرت و تفسیر وغیرہ کا استنباط تھا۔ امام مسلمؒ کے سامنے صرف احادیثِ صحیحہ کا انتخاب کرنا تھا۔ وہ استنباط وغیرہ سے تعرض نہیں کرتے بلکہ ہر حدیث کے مختلف پہلوؤں کو حسنِ ترتیب سے ایک جا ہی بیان فرما دیتے ہیں جس کے اپنے فائدے ہیں۔ یہ گویا مفہومِ حدیث کو وسعت دینا تھا تاکہ ایک بات کے مختلف گوشے نمایاں ہو

جائیں، اس کا صرف محدود نہ رہے، اس کے اسناد یا اس میں کچھ اضافے کسی سند سے ملے ہوں تو وہ بھی ہو جائیں۔ بخاری بخاری رہے اور صحیح مسلم تصدیقِ بخاری بن جائے۔ یہ کام القاءِ ربانی ہی سے ہو سکتا تھا۔ "یَاهَادِیَ اَهْدِنِی" ہی اس کے لئے معاونِ حال ہو سکتا تھا۔

امام مسلمؒ احادیثِ صحیحہ کے لئے شیوخِ امت کا اجماع ضروری سمجھتے ہیں تاکہ اگر اسناد کی صداقت پر بخاریؒ گواہ ہوں تو صحتِ حدیث پر شیوخِ امت کا اجماع گواہ رہے۔ کام ایک ہی ہے۔ لیکن تدوینِ حدیث کے انداز جداگانہ ہیں اور رحمت کے انداز بھی الگ۔ صحیح مسلم کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس سے استفادہ آسان ہے کیونکہ ہر حدیث کو اس کی مناسب جگہ پر بیان کیا گیا ہے۔ (محدثین عظام صفحہ ۱۷۷)

امامؒ نے دنیا کو اپنے علوم سے بہرہ مند کیا اور صحیح مسلم کے علاوہ تقریباً ۲۱ کتب کا ذخیرہ چھوڑا، اور جس حدیث کے تصور میں کھو گئے تھے اُس نے انہیں مقامِ رضا تک پہونچا دیا ہے۔

چنانچہ ابوحاتم رازی بیان کرتے ہیں کہ امام مسلمؒ کو خواب میں دیکھا۔ اور اُن کا حال دریافت کیا، تو اُنہوں نے جواب میں کہا: "اللہ تعالیٰ نے اپنی جنت کو میرے لئے مباح کر دیا اور میں اس میں جہاں چاہتا ہوں رہتا ہوں۔"
(تذکرۃ المحدثین صفحہ ۲۲۷ بحوالہ بستان المحدثین)

امام ابوداؤدؒ

بستان المحدثین کے شجرِ عرفان امام ابوداؤدؒ ہیں، جن کی سُنن ابوداؤد صحاحِ ستہ میں شامل ہے۔ آپؒ کی ولادت ۲۰۲ھ میں ہوئی اور آپؒ نے بلادِ اسلامیہ بالخصوص مصر، شام، حجاز، عراق، خراسان اور جزیرہ وغیرہ میں کثرت سے

گشت کر کے علم حاصل کیا۔

امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ نے تو حدیث کی وسعتوں کو اپنایا۔ امام ابوداؤد نے ہم جیسے نا اہلوں کے لئے فہم دین کو کلمہ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہُ کے حروف سے ہم عدد کر کے اس درجہ مختصر کر دیا کہ حدیث پر عمل آسان ہو جائے۔ آپؒ نے اپنی سُنن کے متعلق فرمایا کہ ان میں سے عقلمند کے لئے صرف چار احادیث کافی ہیں یعنی اجمالاً یہ اربعہ احادیث اس کو راہِ ہدایت پر لانے اور رکھنے کی ضامن ہیں، ہم ان کی افادیت کے تحت نقل کرنے کی سعادت حاصل کر رہے ہیں۔

۱۔ اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ (اعمال کا دارو مدار نیتوں پر ہے)

۲۔ مِنْ حُسْنِ اِسْلَامِ الْمَرْءِ تَرْکُهٗ مَا لَا یَعْنِیْهِ (اسلام کا حُسن اس بات سے ہے کہ انسان بے فائدہ امور کو ترک کر دے۔)

۳۔ لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی یُحِبَّ لِاَخِیْهِ مَا یُحِبُّ لِنَفْسِهٖ (اس وقت تک مومن کامل نہیں ہوتا جب تک وہ اپنے بھائی کے لئے وہی چیز پسند نہ کرے جو وہ خود اپنے لئے پسند کرتا ہے)

۴۔ اَلْحَلَالُ بَیِّنٌ وَّ الْحَرَامُ بَیِّنٌ وَّ بَیْنَهُمَا مُشْتَبِهَاتٌ فَمَنِ اتَّقَی الشُّبُهَاتِ اسْتَبْرَءَ لِدِیْنِهٖ (حلال و حرام دونوں ظاہر ہیں اور ان کے درمیان مُشتبہات ہیں، پس جس شخص نے شبہات سے پرہیز کیا اُس نے اپنے دین کو محفوظ کر لیا۔) (بستان المحدثین۔ شاہ عبدالعزیز محدثؒ ص ۱۸۲)

امام خطابی کا فرمانا ہے کہ سنن ابوداؤد جیسی کتاب ابھی تک نہیں لکھی گئی۔

علامہ ابن قیم کی رائے ہے کہ امام موصوفؒ نے ایسی کتاب لکھی جو مسلمانوں کے درمیان حکم ثابت ہوئی، اور اختلافی مسائل پر فیصلہ کن بن گئی۔ بعض بزرگوں نے اپنا خواب بیان فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کو خواب میں دیکھا، آپؐ نے ارشاد فرمایا: جو سنّت پر عمل کرنا چاہتا ہے اُسے سُنن ابی داؤد

پڑھنا چاہیئے۔
(محدثین عظام مولانا تقی الدین ندوی۔ص ۱۹۶ بحوالہ تہذیب السنن)

امام ترمذیؒ

انہیں معتبر زاد لوا العزم ہستیوں میں

جو راہِ ہدایت کی راہ نما ہیں امام ترمذیؒ ہیں، جو امام بخاریؒ کے سب سے مشہور شاگرد ہیں۔ ان کے زہد، خوفِ خدا اور اندازِ فقر کے باعث صوفیاء کی جماعت انہیں اپنی جماعت میں شامل سمجھتی ہے۔ امامؒ جن اور خوبیوں اور اوصاف سے بہرہ مند ہیں اُن میں سب سے اہم قوّتِ حافظہ اور علمِ حدیث کی طلب میں بلادِ اسلامیہ کا سفر ہے۔ جامع کبیر ترمذی، انؒ کی مشہور و معتبر و مقبول تصنیف ہے۔

"علماء و محدثین کا کہنا ہے کہ ترمذی کو دیگر کتابوں پر یہ فوقیت حاصل ہے کہ اس کی ترتیب عمدہ ہے اور اس میں تکرار نہیں ہے۔ دوسرے اس میں فقہاء کا مذہب اور اس کے ساتھ ہر ایک کا استدلال بیان کیا گیا ہے۔ سوم یہ کہ اس میں حدیث کے انواع مثلاً صحیح، حسن، ضعیف، غریب، معلّل بعلل وغیرہ کو بیان کیا گیا ہے۔ اور چہارم اس وجہ سے کہ اس میں راویوں کے نام، ان کے القاب، اُن کی کُنیت کے علاوہ ان کے فوائد کو بھی بیان کیا گیا ہے جن کا علم الرّجال سے تعلق ہے۔" (بستان المحدثین، شاہ عبدالعزیزؒ۔ ص ۱۸۵)

محدثین کے نزدیک حدیث کی کسی کتاب کو جامع نہیں سمجھا جاتا جب تک آٹھ قسم کے ابواب کے مضامین کی جامع نہ ہو۔ یعنی:

(۱) سیر (۲) آداب (۳) تفسیر (۴) عقائد (۵) فتن (۶) احکام (۷) اشراط (۸) مناقب۔

ترمذی شریف ان آٹھوں کی جامع ہے۔ اس کے علاوہ امام صاحبؒ سے

کثیر تصانیف ہم تک پہونچی ہیں، اور اُن رح کے علمی ذخائر اور فکرِ صالح ہر دور میں محدّثین سے خراجِ تحسین لیتی رہی ہیں، اور ترمذی شریف صحاحِ ستہ کے اہم مجموعہ میں شامل ہے۔ آپ رح کی تاریخ پیدائش ۲۰۵ھ ہے اور تاریخِ وفات ۲۷۹ھ ہے۔ اس ستّر سال میں یہ ستارہ کچھ اس طرح چمکا کہ اس کی روشنی آج بھی صاحبانِ بصیرت پر آشکارا ہے۔

امام ابنِ ماجہ رح

ابنِ ماجہ رح تیسری صدی ہجری کی بزمِ محدّثین میں شامل ہیں۔ آپ رح کی پیدائش ۲۰۹ھ کی ہے۔ اغلب ہے کہ ۲۱ سال بعد تحصیلِ علوم کے لئے سفر کا آغاز کیا۔ یہ وہ دور تھا کہ علمِ حدیث اپنے انتہائی عروج پر تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ علمِ حدیث کے یہ درخشاں ستارے زمینِ عراق، بصرہ، کوفہ، بغداد شام، مصر، ہر ہر جگہ اُتر آئے ہیں اور اپنی ضیاء باریوں سے بلادِ اسلامیہ کو منوّر کر رکھا ہے۔ جن میں ابوبکر بن شیبہ بھی ہیں، جن سے امام صاحب رح نے زیادہ تر استفادہ کیا۔ خود قزوین جیّد علماء کا مسکن تھا۔ اس میں علی بن محمد ابوالحسن، عمرو بن رافع، اسمٰعیل بن ابی سہل، ہارون بن موسیٰ تمیمی جیسی شخصیتیں بھی شامل تھیں، جن سے امام صاحب رح نے اپنے آغازِ سفر سے قبل بھی استفادہ کیا۔ پھر طلبِ حدیث میں عراق، بصرہ، کوفہ وغیرہ کی خاک چھانی اور سمعِ حدیث کیا، اور اُس مقام پر پہونچے کہ آپ رح کی سُنن کو صحاحِ ستہ میں جگہ ملی۔

اس عاجز کا خیال ہے کہ موطّا امام مالک کا صحاحِ ستہ میں شامل نہ ہونا، امام مالک رح اور اُن رح کی کتاب موطّا کی عظمت پر دال ہے کہ یہ ایک محدّث کا مجموعہ نہیں، یہ ایک عاشقِ رسول ﷺ کی کتاب عشق و محبت ہے، ترجمانِ ذاتِ نبوی ﷺ ہے، اور محققین کے لئے سراجِ مُنیر۔ اس کے آغوش میں

احادیثِ مبارکہ کے آٹھ ابواب ہی نہیں خود نورِ مبین کی تجلّیاں اور خوشبوئیں ہیں، جن سے مدینہ منورہ کی فضائیں مانوس تھیں۔

اس عاجز کے نزدیک تو یہ آسمانِ حدیث کے سبعہ ستارے ہیں جن میں اوّلیت امام مالکؒ کو، افضلیت امام بخاریؒ کو حاصل ہے، اور تفہیم ابنِ ماجہؒ کو۔ آپؒ آخر میں آئے، اس لئے بھی کہ زمانہ کے لئے فہمِ حدیث آسان ہو جائے۔ حسنِ ترتیب اور اختصار میں اپنی مثال آپ اور احادیث کا بیان بلا تکرار ہے۔ چنانچہ ابوزرعہ رازیؒ کا یہ فرمانا دُور اندیشی پر مبنی تھا کہ: "میں سمجھتا ہوں اگر یہ کتاب (سنن ابنِ ماجہ) لوگوں کے ہاتھوں میں آگئی تو یہ (حدیث کی موجودہ) تصانیف یا ان میں سے اکثر معطّل ہو کر رہ جائیں گی"۔

(بستان المحدثین، شاہ عبدالعزیز، ص ۱۹۰)

گویا

یہ وہ سات ہستیاں ہیں کہ ان کو اگر سبعہ سنابل سے تشبیہ دیں تو بے جا نہ ہوگا، جن کے رزقِ روحانی کا فیض ہمیشہ جاری تھا۔ ان کے ہر ہر دانہ سے سات سات بالیاں اور ہر بالی سے سَو سَو دانے اُگتے رہے۔ اور ان محدثینِ عظام کے تلامذہ کے انوار سے آسمان کے ستارے ماند پڑ گئے اور اُن کی کتبِ احادیث کی خوشبو سے عالمِ رنگ و بُو مہک اُٹھا۔ گویا یہ سب نورِ مبینؐ ہی کی تجلیاں تھیں جو کہیں تاریکیوں کو دُور کرنے کے لئے رحمت بن کر شجرِ اسلام کے گرد جگنوؤں کی طرح چمکتے رہے، اور کہیں ماہتابِ نبوّت سے سرفراز نجوم بن کر بلادِ اسلامیہ کو منوّر فرماتے رہے۔ اور یہ سب فیضانِ نورِ رسالت نہیں، تو کیا ہے؟

---

[1] اس دور کے ایک عالمِ دین حضرت مولانا عبدالرشید نعمانی صاحب کو اللہ تعالیٰ نے یہ سعادت عطا فرمائی کہ انہوں نے "امام ابن ماجہؒ اور علم حدیث" کے عنوان سے ایک مستند کتاب تحریر فرمائی۔

آئیے اب ان فقہائے امت کو نذرانۂ عقیدت پیش کریں
جنہوں نے نورِ مبین صلی اللہ علیہ وسلم کے صبح شام

دن رات، سفر و حضر، معاشرہ و معاملات، اخلاق و عادات کے ہر ہر پہلو سے نکات کا استخراج کر کے ہمارے لئے صراطِ مستقیم کو آراستہ و ہموار کیا یہاں بھی افقِ آسمان پر ستارے تو بہت چمکے لیکن بالآخر خلفائے راشدین رض کی طرح چار ہی رہ گئے، جن کی فقہ عالم اسلام کے لئے ردائے رحمت اور مشعلِ راہ ہے۔
ان میں محدثین کی جماعت میں سے امام ابوحنیفہ رح، امام شافعی رح، امام حنبل رح سے قبل امام مالک رح بھی شامل ہیں۔ لیکن اس بزم میں مسند نشینی کا فخر امام اعظم حضرت امام ابوحنیفہ رح کو حاصل ہے۔ جن کا اسم گرامی نعمان اور کنیت ابوحنیفہ ہے۔

امام ابوحنیفہ رح (۸۰ھ تا ۱۵۰ھ)

امام اعظم رح کا سنہ پیدائش ۸۰ھ ہے۔ آپ رح کے دادا بچپن میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی خدمت میں حاضر رہے، اور اُن رض سے اپنے خاندان کے حق میں دعائیں حاصل کیں جو بلے اثر نہیں رہیں۔ حضرت امام صاحب رح نے اس دور میں آنکھیں کھولیں جس میں حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے جمالِ مبارک سے آنکھیں پُر نور کرنے والی اکثر ہستیاں موجود تھیں، مثلاً انس بن مالک رض، سہل بن سعد رض وغیرہ۔ اور ابھی سنتِ رسول ص کی تلاش کرنے کے لئے کتب بینی سے زیادہ صالحین کی صحبت فیض رساں تھی۔ یہ وہ صحبت تھی جس نے امام صاحب رح کو ایک عظیم تابعی بنا دیا۔ آپ رح کی فقہ کو فطری اور آسان بنایا اور زمانہ نے اسے دینِ حنیف سے متعلق کر دیا۔ ہر چند امام صاحب رح کے شیوخ کی تعداد کثیر ہے لیکن جس امام وقت کے سامنے

آپؒ نے سب سے پہلے زانوئے ادب تہہ کیا وہ امام شعبی تھے جو کوفہ کے مشہور امام تھے۔ ابو حنیفہؒ پر اُن کی نظر پڑتی ہے، لڑکے کو روک لیتے ہیں اور اس سے اس کے تحصیلِ علم کے متعلق سوال کرتے ہیں۔ امام صاحب اپنے تاجرانہ مشاغل کا ذکر کرتے ہیں۔ جوہر شناس نظروں سے علم کی جانب آپؒ کو توجہ دلائی اور فرمایا: تم علماء کی صحبت میں بیٹھا کرو، مجھے تم میں قابلیت کے جوہر نظر آتے ہیں۔ امام شعبیؒ کے ان الفاظ نے امام صاحبؒ کے دل میں حصولِ علم کی ایک تڑپ پیدا کر دی اور آپ نے رائج الوقت علوم کی تحصیل تھوڑے ہی عرصہ میں کر لی جس میں ادب، انساب، ایّام العرب، فقہ، حدیث، کلام شامل تھا۔ عرب کی سادہ زندگی میں مسائل پیچیدہ نہ تھے۔ لیکن فارس، مصر و شام تک پہونچتے پہونچتے اس کی رنگ آمیزیوں میں زیادہ نکھار آ گیا تھا اور مسائل پیچیدہ ہوتے جاتے تھے، اسی وجہ سے امام صاحبؒ کو فقہ سے خصوصی دلچسپی پیدا ہوئی، جو عمر کے ساتھ بڑھتی گئی۔ قدرت نے اس کے مواقع بھی فراہم کر دیئے۔ امام صاحبؒ نے کوفہ کے امام بزرگ اور جیّد عالم حمادؒ کے حلقۂ درس میں شرکت فرمائی۔ پھر جب ۱۲۰ھ میں امامِ وقت حماد کا انتقال ہو گیا تو آپؒ نے خود اس درس کا سلسلہ شروع فرمایا۔ صحابہؓ کرام کی ایک بڑی تعداد جو دس ہزار تک پہونچ چکی تھی، تمام بلادِ اسلامی میں پھیل گئے تھے۔ اس دور میں اُنؓ کے فیوض و برکات کے چشمے درس گاہوں کی صورت میں جاری تھے۔ امام صاحبؒ کا مسکن کوفہ تھا۔ انہوںؒ نے مختلف بلادِ اسلامی کا سفر کیا اور شام کے امام اوزاعی سے حدیث کی سند لی۔ آپؒ کی ذہانت، ذکاوت و اجتہاد کی شہرت دُور دُور پہونچ چکی تھی۔

آپؒ کی ذہانت و اجتہاد کا وہ واقعہ اکثر سیرت نگاروں نے ذکر کیا ہے، جس میں امام باقرؒ نے جو بحر العلوم تھے امام ابو حنیفہؒ سے فرمایا: "ہاں! تم ہی تو اس

کی بنا پر ہمارے دادا کی حدیثوں کی مخالفت کرتے ہو؟" امام صاحبؒ نے نہایت ادب سے فرمایا: "عیاذاً باللہ! حدیث کی کون مخالفت کرسکتا ہے۔ آپ تشریف رکھیں تو کچھ عرض کروں۔" پھر حسبِ ذیل گفتگو ہوئی۔

امام ابوحنیفہؒ: مرد ضعیف ہے یا عورت؟

امام باقرؓ: عورت۔

امام ابوحنیفہؒ: وراثت میں مرد کا حصّہ زیادہ ہے یا عورت کا؟

امام باقرؓ: مرد کا۔

امام ابوحنیفہؒ: میں قیاس کرتا تو کہتا کہ عورت کو زیادہ حصّہ دیا جائے، کیونکہ ضعیف کو ظاہر قیاس کی بنا پر زیادہ ملتا ہے۔

پھر پوچھا: نماز افضل ہے یا روزہ؟

امام باقرؓ: نماز

امام ابوحنیفہؒ: اِس اعتبار سے حائضہ عورت پر نماز کی قضا واجب ہونا چاہیئے نہ کہ روزہ کی۔ حالانکہ میں روزہ ہی کی قضا کا فتویٰ دیتا ہوں۔

امام باقرؓ اس قدر خوش ہوئے کہ اُٹھ کر امام ابوحنیفہ کی پیشانی چوم لی۔

(ائمہ اربعہ صفحہ ۴۱)

امام صاحبؒ کے اساتذہ اور شیوخ کی تعداد بہت بڑی ہے، اور اسی طرح آپؒ کے تلامذہ جن کی تعداد آٹھ سو تک بتائی جاتی ہے، جس میں امام ابویوسف و امام محمد جیسی ہستیاں شامل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آپؒ کی فقہ جملہ بلادِ اسلامی میں رائج ہوئی اور اسپین کے علاوہ اسلامی دنیا کا کوئی خطّہ نہ تھا جہاں آپؒ کی فقہ سے ایک کثیر تعداد میں لوگ مستفید نہ ہوں۔

امام صاحبؒ امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ کے اجلّ خلفاء میں سے تھے۔ اور اہلِ بیتؑ کی محبّت ان کا ایمان رہا اور انہیںؑ کی محبّت میں خلیفہ منصور

کے ہاتھوں اذیتیں اٹھائیں۔ امام صاحبؒ کو دورِ ابتلا میں قید و بند کی مشقتیں جھیلنا پڑیں، لیکن آپؒ نے حق کی پاسداری کو ہر دولت، ہر قربِ شاہی، ہر جاہ و حشم پر ترجیح دی، اور حق کی راہ پر ثابت قدمی سے قائم رہے۔ چنانچہ منصور نے امام صاحبؒ کو ۱۴۶ھ میں بغداد میں قید کیا۔ بغداد دار الخلافہ ہونے کی وجہ سے علوم و فنون کا مرکز بن چکا تھا۔ طالبانِ علم دین کا رُخ اسی شہر کی جانب ہوتا۔ امام صاحبؒ کی شہرت دُور دُور پہنچ چکی تھی، قید کی یہ حالت اُنؒ کی اس شہرت میں اضافہ کا موجب ہوئی۔ بغداد کی علمی جماعتیں امام اعظمؒ سے نہایت خلوص رکھتی تھیں۔ اس لئے گو امام صاحبؒ نظر بند تھے لیکن انؒ کے ادب و تعظیم سے قلوب منور تھے۔ قید خانہ میں بھی انؒ کا درس جاری رہا۔ چنانچہ امام محمد نے جو فقہِ حنفی کے دست و بازو ہیں اس قید کے دوران انؒ سے تعلیم حاصل کی۔ بالآخر خلیفۂ وقت منصور سے انؒ کی عظمت دیکھی نہ گئی اور اُنؒ کو زہر دلوایا۔ جب امامِ موصوف پر زہر کا اثر ہوا تو اپنے خالقِ حقیقی کے سامنے سر بسجود ہو گئے اور اسی حالت میں ۱۵۰ھ میں ربِّ جلیل کے حضور حاضر ہو گئے۔ اور خود اپنے دَور میں اپنی شہرت، قدر و منزلت امتِ مسلمہ کے دل میں دیکھ لی، اللہ تعالیٰ کے یہاں جو رتبہ پایا اس کا بیان کیسے کوئی کرے۔

(ملاحظہ ہو سیرۃ النعمان، مولانا شبلی نعمانیؒ، حصہ اوّل صفحہ ۵۰ ر ۵۱)

امام صاحبؒ ایک فقیہِ اعظم ہونے کے ساتھ ساتھ عالم، محدّث، عابد، منکسر المزاج اور متحمل المزاج بھی تھے۔ وہؒ عالمانہ تحقیق، منصفانہ مزاج، اور بے نیازانہ فطرت کے مالک تھے۔ ایک بار کوفہ کے گورنر یزید بن عمر ابن ہبیرہ نے نہایت ادب کے ساتھ امام صاحبؒ سے درخواست فرمائی کہ: قدم رنجہ فرمائیں تو احسان ہوگا۔" آپؒ نے جواب دیا: "میں تم سے مل کر کیا کروں۔ مہربانی سے پیش آؤ گے تو خوف ہے کہ تمہارے دام میں آجاؤں۔ عتاب کرو گے تو

بہری ذلّت ہوگی۔ تمہارے پاس زر و مال ہے مجھے اس کی حاجت نہیں۔ میرے پاس جو دولت ہے اُسے کوئی چھین نہیں سکتا" اور معذرت فرمائی۔
اسی طرح آپؒ کا حلم و عفو، گستاخی کے جواب میں تحمّل، ناسزا الفاظ کا مہذّب جواب، ہمدردی اور ہمسائیگی کا لحاظ، رقّتِ قلبی، حفظِ لسان، ذکر و عبادت اور نظامِ حیات جس میں بعد نمازِ عصر دوستوں سے مُلاقات، بیماروں کی عیادت، غم گُساری و تعزیت اور غریبوں کی خبر گیری بھی آج تک مثال ہے۔ دراصل امام محترم صرف فقیہ و عالم نہ تھے بلکہ ان کی زندگی خود روز و شب سرورِ کائناتؐ کی ترجمان تھی۔ اُن کی زندگی خود ایک متحرک اور زندہ جاوید کتابِ فقہ تھی، جس کا سب سے اہم عنصر محبتِ رسول و آلِ رسولؐ اور غمِ امّت تھا اور دینِ متین کی حکمتوں اور لطافتوں سے امّت کو بہرہ ور کرنا تھا۔
گو ایک محدّث کی حیثیت سے آپؒ نے کلامِ معجز نماؐ کو امّت تک پہونچایا تو ایک فقیہ کی حیثیت سے اندازِ حیاتِ رسول کریمؐ سے سرفرازی بخشی۔ اور جو خدمت امام موصوفؒ کے سپرد ہوئی تھی اُس کا پورا پورا حق ادا کیا۔ یہ وہی خدمت ہے جو ایک رویائے صادقہ کی صورت میں سپرد ہوئی تھی، اور جس کی تعبیر یہی تھی کہ آپؒ سرورِ کائناتؐ کے ہر چھوٹے سے چھوٹے عمل کو امّت تک صاف اور سُلجھے ہوئے انداز سے پہونچائیں گے تاکہ اس کی اتّباع آسان بھی ہو، حق بھی ہو اور پاسِ عزّتِ نفس کی موجب بھی، اور اس کے ثمرات کی ضامن بھی۔ چنانچہ یہ شجر آج بھی اپنے علمی اور عملی کارناموں سے عالم کو مستفید کر رہا ہے، جن میں علماء بھی ہیں، مفسّرین و محدّثین بھی اور خُلقِ محمدی سے آراستہ صالحین اور صوفیاء کرام بھی۔
جزاهُمُ اللّٰهُ خَيْرَ الْجَزَاءِ

امام مالکؒ

پرتوِ نورِ مبینؐ کے مظہر امام مالکؒ کا
ذکر محدثین میں ہو چکا ہے، جن سے مدینہ کی گلیاں ۹۳ھ سے ۱۷۹ھ تک جھکتی
اور منور رہیں۔ امام مالکؒ ارلعہ ائمہؒ میں ایک بلند مقام کے مالک ہوئے۔
مدینہ منورہ اور گرد و نواح میں آپؒ ہی کی فقہ رائج رہی۔ بقول سید رئیس احمد
جعفری: "ایک مفتی اور فقیہ کا فرض ایک محدّث سے زیادہ ہے، محدّث صرف
ایک سرمایہ دار ہے، فقیہ اس سرمایہ کو لے کر عالم کاروبار میں آتا ہے۔ کھرے
کھوٹے کی تمیز، احکام کی تفریع، عموم کی تخصیص، خصوص کی تعمیم، مطلق کی تقلید،
مقید کا اطلاق، ناسخ و منسوخ کی تفریق، امر و سنن کی ترتیب، احکام غیر
منصوصہ کا قیاس، احکام کے علل اور مصالح کی تلاش، ضروریاتِ انسانی
کے مطابق احکام شرعیہ کا اعلان، رعایا اور حکومت کے لئے قوانین کی تدوین،
یہ ایک فقیہ و مفتی کے عام فرائض ہیں جو ایک محض محدّث کے رُتبہ سے بلند تر ہیں۔"[1]
یہی وہ فرائض تھے کہ جن کی ادائیگی جس حد تک اور جس خوبی سے جس نے
کی اُس نے ایک فقیہ کے اعتبار سے ایک بلند مقام پایا، اور انفرادی اور اجتماعی
حیثیت سے دین کے ہر ہر عمل کو آسان بنا دیا۔ ان ائمہ ارلعہؒ کی بڑی خوبی
یہ ہے کہ یہ محض فقیہ نہیں، بلکہ محدّث اور فقیہ ہیں جن میں فقہ کا پلّا بھاری
ہے، سوائے امام مالکؒ کے، کہ انؒ کو ائمہؒ میں شامل تو سب ہی کرتے ہیں
لیکن دراصل انؒ سے ان کی محبت کی موجب موطا امام مالکؒ ہے اور وہ
امام صاحبؒ کی موطا میں امام مالکؒ کا اندازِ فقہ تلاش کرتے ہیں۔ امام مالکؒ کا بھی یہ
عالم ہے کہ جس مسئلہ میں انہیںؒ اسوۂ رسولؐ کی خبر نہیں ہوتی تو وہاں کہہ دیتے

---

[1] سیرت ائمہ ارلعہ۔ ص ۲۵۶

کہ انہیں یہ مسئلہ معلوم نہیں۔ دراصل یہ آپؒ کی اُس شدتِ تقویٰ و محبت کا نتیجہ تھا جو موجبِ قربِ رسولؐ بنا۔

بستان المحدثین[۱] میں امام معظمؒ کے سولہ نسخوں کا ذکر شرح و بسط سے کیا گیا ہے، بلکہ اس کی ترتیب کو فقہی ترتیب قرار دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امام مالکؒ قلبِ رسولِ کریمؐ، نگاہِ نبی کریمؐ اور اسوۂ سید المرسلین میں ڈھل کر مشعلِ راہِ ہدایت بنے رہے۔

امام شافعیؒ

اِنہیں فقہاءِ اربعہ میں یگانۂ روزگار
امام شافعیؒ ہیں جنہیں لعابِ دہنِ نبی کریمؐ سے سرفرازی ملی

آپؒ کا زمانہ ۱۵۰ھ سے ۲۰۴ھ تک ہے۔ آپؒ کا سلسلہ ہاشمی و مطلبی ہے۔ باپ کا سایہ ولادت سے پہلے ہی سر سے اُٹھ چکا تھا۔ آپؒ کی والدہ نے ایامِ رضاعت کے دو سال مکمل ہونے کے بعد نواحِ یمن کا سفر کیا اور امام صاحبؒ کے ماموں کے ساتھ آٹھ سال گذارے۔ آپؓ نے سات سال کی عمر میں قرآن حفظ کر لیا، اور دس سال کی عمر میں موطّا امام مالکؒ کو حافظہ میں محفوظ فرمایا۔

یہ وہ ہستیاں ہیں جن کی راہبری خود سرورِ کائناتؐ فرما رہے ہیں

یہی وہ ہستیاں ہیں جو امت کی کشتی کو منزلِ مراد تک لے جانے کے لئے مشیئتِ ایزدی کے تحت دربارِ رسالت سے منتخب ہو چکی تھیں۔ آپؒ فرماتے ہیں: میں نے خواب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی۔ آپؐ

---

[۱] از علامہ شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ۔

نے مجھ سے فرمایا کہ "لڑکے تو کس خاندان سے ہے؟" میں نے عرض کیا، حضورؐ کے خاندان سے۔ فرمایا "میرے قریب آ" جب میں آپؐ کے قریب پہونچا، آپؐ نے اپنا لعاب دہن میرے ہونٹوں پر اور منہ میں ڈال دیا، پھر فرمایا "جا، خدا تجھ پر برکت نازل فرمائے"۔

امام صاحبؒ فرماتے ہیں: میں نے اسی عمر میں پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خانہ کعبہ میں نماز پڑھتے دیکھا۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نماز سے فارغ ہوئے تو لوگوں کو تعلیم دیتے رہے۔ پھر آپؐ کے قریب پہونچا اور آپؐ سے عرض کیا: یا رسول اللہ! مجھے بھی کچھ سکھایئے۔ آپؐ نے اپنی آستین سے میزان (ترازو) نکال کر عطا فرمائی اور فرمایا "تیرے لئے میرا یہ عطیہ ہے"۔ امام صاحبؒ فرماتے ہیں کہ میں نے ایک مُعَبِّر سے اس کی تعبیر دریافت کی۔ انہوں نے کہا کہ تم دُنیا میں حضور علیہ السلام کی سنّتِ مطہّرہ کی نشر و اشاعت کے امام ہو گے۔

(سیرت ائمہ اربعہ صفحہ ۱۹- ۳۱۸)

چنانچہ دس سال کی عمر میں تحصیلِ علم کے لئے نکلے اور مکّہ مکرّمہ پہونچے اور وہاں مسلم بن خالد زنجی سے جو فقہ و حدیث کے امام اور مفتیٔ مکّہ تھے تین سال میں فقہ و حدیث کی تکمیل کی۔ امام شافعیؒ جب امام مسلم کی زبان سے امام مالکؒ کا نام سنتے تو اُنؒ سے شرفِ نیاز کی تڑپ قلب میں پیدا ہوتی۔ بالآخر آپؒ نے اپنے استاد امام مسلم سے مدینہ منوّرہ امام مالکؒ کی خدمت میں حاضری کے شوق کا ذکر کیا۔ اُنہوں نے ایک سفارشی خط عطا فرمایا اور لکھا:

"جس نوخیز کو خدمتِ اقدس میں بھیج رہا ہوں وہ آپؒ کے فیوض و برکات سے مستفیض ہونے کا واقعی مستحق ہے، اس میں غیر معمولی صلاحیتیں موجود ہیں"۔

شوق نے راہِ حق میں جانے کے اسباب ظاہری بھی پیدا کر دیئے۔ امام مالکؒ پہلے تو غصّہ ہوئے اور فرمایا، سبحان اللہ کیا حضور علیہ السّلام کا علم اب اس

قابل رہ گیا ہے کہ وہ وسائل و رسائل کے ذرائع سے حاصل کیا جائے۔ پھر آپ (امام شافعیؒ) کا ذوق وشوق، ادب و انکسار دیکھا تو فرمایا: مَا اسْمُكَ (تمہارا نام کیا ہے) آپؒ نے کہا محمد بن ادریس۔ فرمایا:

اِتَّقِ اللّٰهَ فَسَيَكُوْنُ لَكَ شَاْنٌ

(خدا سے ڈرتے رہنا، عنقریب تمہاری شان بڑی نمایاں ہوگی)"

(سیرت ائمہ اربعہ، ص ۳۲۰)

حضور انورؐ کی بشارت، مسلم بن خالد کی جوہر شناسی اور علم حدیث وفقہ سے مالامال فرمانا، امام مالکؒ کی دعا۔ کیا یہ سب امام شافعیؒ کے علم معتبر اور مخزنِ تجلیاتِ انورؐ پر شاہد نہیں۔ دیکھئے نورِ مبین صلی اللہ علیہ وسلم کے پرتوِ انور کس طرح تفسیر وحدیث، فقہ، علم اور ادب بن کر فضا میں پھیل رہے ہیں سب کی پرواز ایک ہی جانب ہے۔ البتہ رنگوں کا انتخاب فقہائے امت کا اپنا ہے۔ جس کو نورِ مبینؐ کی جو جھلک پسند آگئی اس نے اس کو اپنا لیا، اور پھر ان کے تلامذہ ومعتقدین اس کے دلدادہ ہو گئے۔ اور یہ جزوی اختلافات ایک طرف بڑے بڑے فیوض وبرکات کے موجب اور دوسری جانب وسعتِ نظر کے ساتھ راہِ معرفت کو طے کرنے میں معاون ہوئے۔ المختصر امام شافعیؒ کی نکتہ سنجی اور دقیقہ رسی نے انہیں اس مقامِ بلند پر پہونچایا۔ وہی امام مالکؒ جنہوں نے آپؒ کو دعاؤں کے ساتھ رخصت کیا تھا انہوں نے امام صاحبؒ کے ایک فقہی اجتہاد سے متاثر ہو کر بلایا اور فرمایا: "اب تم میں فتویٰ دینے کی صلاحیت پیدا ہوگئی ہے" اور یہی اجازت متفقہ طور پر محدثین اور فقہائے امت نے امام شافعیؒ کو عطا فرمائی۔ (سیرت ائمہ اربعہ صفحہ ۳۲۲)

امام صاحبؒ کا ذوقِ تحصیلِ علم جاری رہا، اور متعدد علوم میں تکمیل فرمانے کے بعد، جن میں فنِ ادب ولغت، فنِ تاریخ، علمِ ہیئت ونجوم، علمِ طب

شامل ہیں، آپؒ ایک خداداد فراست کے ساتھ فتاویٰ کے ذریعہ بھی مخلوق کی خدمت کرتے رہے۔ اس زمانہ میں دورِ ابتلاء سے بھی گذرنا پڑا کہ یہ بھی سنّتِ نبوی تھی، لیکن نہ حق گوئی میں فرق آیا، نہ اتباعِ سنّت اور بزرگوں کے احترام میں۔

امام صاحبؒ کی جلالتِ شان کا اعتراف اس دور کی عظیم ہستیوں نے بھی فرمایا، جن میں امام احمد بن حنبلؒ، امام اسحٰق بن راہویہ، اور امام یحییٰ بن معین بھی شامل ہیں۔ اور اکثر منکرینِ حدیث نے اپنے کو امام صاحبؒ کے حضور عاجز پایا۔ درس کے ساتھ فنِ مناظرہ اور استدلالِ قولِ رسولؐ میں یدِطولیٰ رکھتے تھے۔ لوگ کثرت سے آپؒ کے شاگرد ہوئے۔ اور امام شافعیؒ نے اس میزانِ عدل کا جو اُنہیں حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم نے عطا فرمائی تھی نہایت خوبی سے اس کا حق ادا کیا۔ ہر قول میں یہ عدل خواہ اس کا تعلّق ازدواجی زندگی سے ہو، وراثت سے ہو، یا حقوق اللہ وحقوق العباد کی ادائیگی کے کسی پہلو سے ہو، ہمیشہ ملحوظِ خاطر رکھا، امام صاحبؒ نے ظاہر کی دنیا کے ساتھ باطن کی دُنیا کو بھی منوّر کرنے اور رکھنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔ گویا یہ بھی اس تول کا ثمر تھا۔

چنانچہ

علامّہ ابن الجوزیؒ (بحوالہ ابی بیان الاصفہانی) روایت کرتے ہیں کہ میں نے حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کو خواب میں دیکھا، اور عرض کیا: "یارسولؐ اللہ! آپؐ کے چچا کی اولاد میں محمد بن ادریس شافعیؒ کا انتقال ہوگیا۔ کیا حضورِ انورؐ نے اُنؒ کے لئے سفارش فرمائی"۔ آپؐ نے فرمایا: "ہاں، میں نے خدا سے عرض کیا: "پروردگارِ عالم محمد بن ادریس شافعیؒ کو بغیر حساب کتاب کے بخش دے۔" میں نے عرض کیا: "یارسول اللہ! ایسی شفاعت کس عمل سے فرمائی گئی"۔

ارشاد فرمایا:

"شافعی مجھ پر ایسا درود پڑھا کرتا تھا جو آج تک کسی نے نہیں پڑھا"۔

میں نے عرض کیا: "یارسول اللہ! وہ درود کیا ہے۔" فرمایا:
اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ کُلَّمَا ذَکَرَہُ الذّٰاکِرُوْنَ وَصَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ کُلَّمَا غَفَلَ عَنْہُ الْغَافِلُوْنَ۔ (سیرت ائمہ اربعہ ص ۸-۳۶۷)

میرے محترم بھائیو! غور کرو کہ امام شافعیؒ کی بخشش کے لئے انؒ کی فقہ، انؒ کی مساعیٔ جمیلہ کا ذکر نہ ہوا بلکہ ایک درود پاک کا ذکر فرمایا جو موجبِ شفاعت قرار پایا۔ سبحان اللہ۔

دل سوال کرتا ہے کہ یہ تو نورِ مبین صلی اللہ علیہ وسلم کے پروانے تھے، ان کی دیگر صفات و خدمات کا ذکر کیوں نہ ہوا؟

عقلِ سلیم جواب دیتی ہے کہ تمہارے لئے شافعیؒ ہونا ممکن نہیں، نہ علماً نہ عملاً۔ لیکن تم درود پڑھ کر وہ مقام حاصل کر سکتے ہو بشرطیکہ آدابِ درود یعنی محبت، اتباع، تڑپ، ذوق و شوق کے ساتھ ہو۔

اور یہ بھی بتانے کے لئے ہے

کہ نبی الاُمّی کی امت میں جو لاکھوں کروڑوں بے پڑھے ہوں گے، اُن کو مژدہ ہو کہ ترازو یا میزان کے ایک پلّے میں ایک شخص کے جملہ علم و اعمال ہوں اور دوسرے میں صرف ایک ذوق و شوق سے بھرپور درود، تو اسی کا پلّہ بھاری ہوگا۔ لہٰذا کُلَّمَا ذَکَرَہُ الذّٰاکِرُوْنَ میں شامل رہو۔ کیا عجب ہے کہ امام شافعیؒ کے اس درود کے صدقہ میں تم بھی بے حساب و کتاب بخش دیئے جاؤ۔

○

کیا یہ تجلیاتِ نورِ مبینؐ، یہ انوارِ نورِ مبینؐ
حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے ارادے، حضورؐ ہی کی توجہ، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہِ لطف و کرم سے جاری و ساری نہیں۔

حسنہ وجمالہ صلی اللہ علیہ وسلم

(یہ ایک قلندر کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ ہیں، .... اس کی روح کو پاجاؤ کہ اس کی یافت ہی اصل یافت ہے۔)

یہ رحمتیں جو عام ہیں، جہاں جہاں ہیں سب انہیں رحمت للعلمین شفیع المذنبین کا فیضانِ رحمت ہے جو اللہ کے رسول ہیں۔

○

امام احمد بن حنبلؒ

نورِ مبین کا ذکر ہے، بات بڑھتی جارہی ہے

ختم تو ہو ہی نہیں سکتی۔ پس اب اِن فقہائے ثلاثہؒ کے بعد امام احمد بن حنبلؒ کا ذکر ضروری ہے کہ آپؒ ائمۂ اربعہ میں شامل ہیں۔ امام احمد بن حنبلؒ بغداد میں ۱۶۴ھ میں پیدا ہوئے۔ اور جب تحصیلِ علم شروع کی تو پہلے سولہ سال کی عمر میں امام یوسف (تلمیذ امام ابوحنیفہؒ) کی خدمت میں حاضر ہو کر انؒ سے حدیثیں لکھیں۔ پھر بغداد کے دیگر اکابر محدثین اور فقہاء کی خدمت میں رہ کر استفادۂ علوم کرتے رہے۔ بغداد سے نکلے تو کوفہ، بصرہ، مکہ، مدینہ، یمن، شام، جزیرہ کا سفر کیا۔ اور ہر جگہ نامور محدثین سے استفادہ کیا۔ (محدثین عظام صفحہ ۱۲۳)

امام حنبلؒ کے مجتہد اور فقیہ ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ لیکن بقول امام تیمیہ انؒ پر حدیث کا رنگ غالب تھا۔ احادیث کی تلاش میں ہمہ وقت سفر کے لئے تیار رہتے۔ اور غیر معمولی حافظہ کے باعث انؒ کو دس لاکھ حدیثیں یاد تھیں۔ اور اس وسعتِ علم و کثرتِ حفظ کے باوجود امام شافعیؒ کی شخصیت سے متأثر تھے۔ فرماتے تھے: مَا رَأَتْ عَيْنَايَ مِثْلَهُ "میری آنکھوں نے اُن جیسا نہ دیکھا" انہوں نے امام مالکؒ سے اجتہاد کے اصول سیکھے اور اس

کا ملکہ اخذ کیا۔ اور بالآخر وہ اس امت کے نامور مجتہدین میں ہوئے۔ امام شافعیؒ بھی انؒ کے علم وفراست کے معترف وقدر دان تھے۔ امام صاحبؒ نے چالیس سال کی عمر میں درسِ حدیث شروع فرمایا۔ راویوں کا بیان ہے کہ آپؒ کے درس میں سامعین کی تعداد پانچ پانچ ہزار تک ہوتی، اور یہ مجالس بڑی سنجیدہ اور باوقار ہوتیں۔

(اقتباس از محدثین عظام، مولانا تقی الدین ندوی ص ۱۲۳-۱۲۴)

زہد، تقویٰ، نیکی و پارسائی کے پاکیزہ جامۂ نورانی سے پہچانے جاتے۔ مزاج شریعتِ اسلامی میں ڈھلا ہوا تھا۔ وہی درویشانہ شان جو کثرتِ علم سے پیدا ہوتی ہے، امام حنبلؒ کی شان تھی۔ وہی شان جسے اکثر باطل کا مقابلہ کرنا پڑا ہے، اور جس کے عزم واستقلال، وقار وعظمت کے مستحکم ستون کبھی متزلزل نہیں ہوئے۔

آج جو فتنے ہمارے سامنے ہیں جن میں اعتزال، فلسفیانہ موشگافیوں کے ساتھ کم علمی کا علم سائنس بھی شامل ہے، وہ امام حنبلؒ کے دور میں بھی شروع ہو چکے تھے۔ خلفائے عباسیہ کے دور کا سب سے بڑا فتنہ اعتزال ہے، جو یونان کے علوم وفنون کا نتیجہ تھا، یعنی اپنی محدود عقل کی روشنی میں اسلامی اقدار کو جانچنا اور پھر نادانی سے اپنی فہم کو ترجیح دینا۔

انہیں فتنوں میں ایک فتنہ خلق قرآن کا تھا۔ معتزلہ علماء نے خلقِ قرآن کے مسئلہ کی تلقین کی، تلقین ہی نہیں بلکہ تبلیغ، اور اس کو عام کرنے کے لئے سختیاں شروع کیں۔ کبھی آمدنی معاش بند کرائی، کبھی ضرب وقتل کی دھمکی دی۔ لیکن ابھی وہ ہستیاں موجود تھیں جو ان بودے ہتھیاروں کے سامنے سرِ تسلیم خم نہ کرتیں، اور اپنے نبیؐ کے اس فرمان پر شاہد رہتیں کہ "ہر انسان دین کے معاملہ میں اس حد تک مبتلا کیا جاتا ہے جس قدر دین پر وہ مضبوطی سے قائم

ہے" حالانکہ وہ گنہگار نہیں ہوتا۔ چنانچہ امام صاحبؒ کو بھی اس فتنہ کا سامنا کرنا پڑا، جس کی اطلاع آپؒ کو بعض رویائے صادقہ کے ذریعہ ہو چکی تھی۔ چنانچہ بیہقی نے ربیع سے روایت کی ہے کہ امام شافعیؒ نے مصر سے ایک خط لے کر مجھے (ربیع کو) احمد بن حنبلؒ کے پاس بھیجا۔ میں نے وہ خط امام حنبلؒ کو دیا۔ آپؒ پڑھنے لگے اور آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ میں نے بہت پوچھا تو فرمایا، امام شافعیؒ لکھتے ہیں:

"میں نے (امام شافعیؒ نے) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ احمدؒ کو میرا سلام کہو اور مطلع کرو کہ عنقریب خلق قرآن کے مسئلہ میں ان کی آزمائش ہوگی۔ خبردار وہ خلق قرآن کا اقرار نہ کریں اس سلسلہ میں اللہ تعالیٰ اُن کے علم کو قیامت تک باقی رکھے گا۔"

ربیع کی اس بشارت کے صلہ میں امام حنبلؒ نے ربیع کو اپنی قمیص اتار کر دی۔ وہ یہ قمیص لے کر امام شافعی کے پاس حاضر ہوئے۔ امام صاحبؒ نے فرمایا کہ مجھے قمیص کی حاجت نہیں البتہ اُس کو پانی میں تر کر کے دو تاکہ میں اسے آنکھوں سے لگاؤں۔ (سیرت ائمہ اربعہ صفحہ ۵۳۹)

کیا یہ اشارہ اس امر کی جانب نہ تھا کہ قمیص اُتار کر ہی تو امام حنبلؒ کے دُرّے لگنے تھے۔ امام صاحبؒ کو معتصم کے سامنے پیش کیا گیا اور اُنؒ کے اس انکار و اصرار پر ۲۸ کوڑے لگائے گئے اور وہ بھی اس طرح کہ ایک تازہ دم جلاد صرف دو کوڑے لگاتا، پھر دوسرا جلاد بُلایا جاتا۔ امام صاحبؒ ہر کوڑے پر فرماتے: "میرے سامنے اللہ کی کتاب اور رسولؐ کی سنت میں سے کوئی دلیل پیش کرو۔" امامؒ کے الفاظ: "اَعْطُونِی شَیْئاً مِنْ کِتَابِ اللّٰہِ ...."

میرے سامنے اللہ کی کتاب یا اُس کے رسولؐ کی سنت میں کوئی دلیل پیش کرو تاکہ میں ان کو مان لوں۔ (محدثینِ عظام صفحہ ۱۲۷)

امام کی ثابت قدمی اور استقامت، جس نے ہمیشہ کے لئے اس مسئلہ کو ختم کر دیا،
اس کے آج بھی سب معترف ہیں۔ امام حنبلؒ نے اس سلسلہ میں قید و بند کی
جو تکلیفیں اُٹھائیں جس جس طرح بارگاہِ رب العزت میں ثابت قدمی کی
دُعائیں کیں۔ بیڑوں کی آہنی بیڑیوں کا بوجھ امام حنبلؒ پر ہوتا تو اس خدشہ
سے آپؒ کا دل بھر آتا کہ کہیں لغزش نہ ہو جائے، اور نظر اللہ کے کرم پر رہتی۔
معتصم کے حکم سے جو اذیتیں آپؒ کو قید خانہ میں دی گئیں اُن کی تفصیل کی
یہاں گنجائش نہیں، ہاں یہ ضرور یاد رکھنے کی بات ہے کہ اُن دُرّوں کی سزا
اور اس کرب و اذیت کے بعد جب امام کو اللہ تعالیٰ نے ان زخموں سے شفا
دی تو آپؒ نے سب کو معاف کر دیا، سوائے معتزلہ کے۔ کچھ لوگ آج بھی ایسے
ہی فتنے اُٹھا رہے ہیں اور امت کی کشتی بھنور میں ہے۔

ہم نہ تاریخِ اسلام لکھ رہے ہیں
نہ سیرتِ صحابہؓ و محدثین و فقہائے اعظم۔ ہم تو صرف اس نکتہ کی طرف توجہ
مبذول کرنے کے لئے ان کا مختصر ذکر کرتے ہیں کہ یہ سب سیرتِ پاک[1]
نبیؐ کریم، اللہ کے رسولؐ، اس کے حبیبؐ، اس کے آخری نبیؐ مرسلؐ کی "استقامت
بر شریعت" ہے جو زمانہ میں آشکارا ہوتی رہتی ہے صورت سے نظر ہٹا کر
ان کی تجلیات، ان کی حقیقت، ان کی معنویت اور ان کے اندازِ تبلیغ کی
وسعتوں اور رنگینیوں پر نظر ڈالیے تو کہیں آپ کو سبز پھریرے ہوا میں لہراتے
نظر آئیں گے، یہ حق کے لئے زہر دیئے جانے والوں کی یادیں ہیں، تو کہیں
دہکتے ہوئے انگاروں میں جلتی ہوئی ریت پر کشتگانِ حق کی یادیں تازہ ہوں
گی جنہوں نے جان کے نذرانے پیش کئے، کہیں شعب کی یادیں گریہ در گلو

---

[1] حضرت بندہ نواز گیسو درازؒ نے اس عنوان پر ایک گراں قدر رسالہ سپردِ قلم کیا ہے۔

کریں گی، کہیں بدر کے شہداء کے، کہیں امیر حمزہؓ کے، اور نہ جانے کتنی کربلاؤں کے جانکاہ مناظر نظروں کے سامنے گھوم جائیں گے۔ اس لئے اور صرف اس لئے کہ امت اپنے مقصدِ حیات کو سمجھے، اور قرآن حکیم کو اپنے لئے مشعلِ راہ بنائے، اور اسی کو اپنائے، اس میں تدبّر و تفکّر کرے، اور اس کا سہارا لے۔ یہ قول ایک دورِ حاضر کے ولی کا ہے جو زبانِ قلم پر خلاصۂ ہدایت بن کر آیا، اور اس آیت کی جانب رہنمائی کا موجب ہوا:

اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَیْہِمُ الْمَلٰٓئِکَۃُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّۃِ الَّتِیْ کُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ○

بے شک جن لوگوں نے اقرار کیا کہ ہمارا پروردگار اللہ ہے پھر (اس پر) قائم رہے (تو ان کو وہ کرامت حاصل ہوئی جس سے بڑھ کر کوئی کرامت نہیں یعنی توفیقِ استقامت پھر جب وہ امرِ الٰہی پر قائم ہو جاتے ہیں تو) ان پر فرشتے اترتے ہیں۔ (جو ان سے کہتے ہیں) کہ تم مت ڈرو۔ اور غم نہ کھاؤ (تم اللہ سے ڈرتے رہے، اللہ تم سے راضی ہوا) اور تم جنّت کی خوشخبری سنو جس کا تم سے وعدہ کیا گیا تھا۔

اور پھر یہ عظیم وعدہ

نَحْنُ اَوْلِیٰٓؤُکُمْ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَفِی الْاٰخِرَۃِ ج وَلَکُمْ فِیْہَا مَا تَشْتَہِیْٓ اَنْفُسُکُمْ وَلَکُمْ فِیْہَا مَا تَدَّعُوْنَ ○ ط

ہم دنیا کی زندگی میں بھی تمہارے دوست تھے اور آخرت میں بھی (تمہارے رفیق ہیں) اور وہاں جس (نعمت) کو تمہارا جی چاہے گا تم کو ملے گی اور جو چیز طلب کرو گے تمہارے لئے (موجود ہو گی)۔ (حٰمٓ السجدۃ آیات ۳۰، ۳۱)

حق یہ ہے

کہ جن کی نظر کے سامنے اللہ ہی اللہ ہے، جو اللہ کے ہو گئے، اور اللہ ہی کے ذکر میں رہے، انہیں تسکین قلب ہی نہیں بلکہ دیدارِ جمالِ محمدی صلّی اللہ علیہ وسلّم دنیا

ہی میں حاصل ہو گیا، اور مقامِ قرب و رضا دنیا ہی میں پا گئے۔ کیا صحابہ کرامؓ کی جماعت اس کی حقانیت پر شاہد نہیں۔

رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ
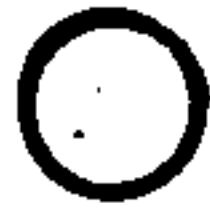
اولیاء کرامؒ

کہکشانِ راہِ ہدایت کے اِن تاروں

کے جلو میں کیا نہیں کہ جس کا ذکر الگ سے ہو۔ اگر اولیاء اللہ کی کوئی عملی تعریف ہو سکتی ہے تو صرف یہ کہ وہ اللہ کو دوست رکھتے ہیں اور اللہ تعالیٰ ان کو دوست رکھتا ہے، اور اللہ والا ہی اللہ سے ملاتا ہے۔ ان میں بعض ہستیاں وہ ہیں جن کو فیضانِ معرفت محض نوراً ملا ہے اور بعض وہ ہیں جنہیں علماً بھی اور نوراً بھی، اور اللہ تعالیٰ نے ایسی ہستیوں کو جو ظلمت سے نور کی جانب لائیں "نحن" میں شامل فرمایا۔ اس لئے اب تین صدیوں کی ان بزرگ ہستیوں کا مختصر ذکر ضروری ہے، جنہیں عرفِ عام میں اولیاء اللہ کہا جاتا ہے۔

اس سلسلہ میں ہم امام ابوبکر بن ابو اسحٰق محمد کی کتاب "تعرّف" کی جانب آپ کی توجہ مبذول کرنے کی سعادت حاصل کر رہے ہیں، جو صوفیاء کرام کے عقائد اور احوال پر قدیم ترین کتاب ہے۔ امام ابوبکر بن ابو اسحٰق چوتھی صدی کے آخر کے بزرگ ہیں، اور انہوں نے ان تین صدی کے اولیاء کرام کے متعلق نہایت منصفانہ اور عالمانہ تبصرہ کیا ہے۔

آپ فرماتے ہیں: "انبیاء علیہم السلام بلند ترین مقام سے سرفراز ہوئے اور نبوت کا خاتمہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا۔ (اور اللہ رب العزت نے ان انبیاء

علیہم السلام اور نبیٔ برحق سیدنا محمد صلّی اللہ علیہ وسلّم پر جو سید المرسلین ہیں) ایمان لانے اور اُن کی اتباع کا حکم دیا کیونکہ اُن کا دین تمام دینوں سے بہتر، اور اُن کی امت تمام امتوں سے بہتر ہے۔ (اب) نہ تو شریعت منسوخ ہوگی اور نہ اُن کی امت کے بعد کوئی اور امت آئے گی۔ اللہ نے ان میں برگزیدہ، نیک، شریف اور نکوکار پیدا کئے۔ اس سے پہلے ہی ان کے لئے نیکی لکھ رکھی ہے۔ تقویٰ کی باتیں ان کا لازمۂ کار ہیں۔ اللہ نے ان کے دلوں کو دنیا سے متنفر کر دیا ہے۔ ان کے مجاہدہ میں خلوص پایا جاتا ہے، لہٰذا وہ علومِ الہیہ کا سبق حاصل کرتے ہیں۔ ان کے مجاھدات میں ان کے معاملات خالصۃً لِلّٰہ ہوتے ہیں۔ لہٰذا اُنہیں وارثِ انبیاء کے علوم عطا کئے جاتے ہیں۔ ان کے باطن پاک و صاف ہوتے ہیں۔ انہیں سچی فراست کا انعام دیا جاتا ہے۔ ان کے قدم ثابت، ان کی فہم پاکیزہ، ان کے جھنڈے روشن ہوتے ہیں۔ اللہ کی طرف سے انہیں فہم عطا ہوتی ہے اور اللہ کی طرف جاتے ہیں، وہ ماسوائے اللہ سے اعراض کرتے ہیں، ان کے انوار تمام پردوں کو چیر کر نکل جاتے ہیں، اور اُن کے اسرار عرش کے گرد چکر لگاتے ہیں۔ عرش والے کے ہاں ان کا رتبہ بڑا ہے۔ یہ لوگ (بظاہر) اجسام ہیں، مگر روحانی ہیں۔ زمین پر ہیں مگر ہیں آسمانی۔ یہ مخلوق کے ساتھ (ہوتے ہوئے بھی) ربّانی ہیں۔ خاموش ہیں مگر (سب کچھ) دیکھتے ہیں۔ غائب ہیں (مگر بارگاہِ رب العزت میں) حاضر ہیں۔ یہ ہیں تو بادشاہ مگر گدڑیوں میں۔ یہ لوگ قبیلوں کے اصلاح کنندہ، صاحبِ فضیلت، اور دلائل کے نور ہیں، صاحبِ صفا ہیں، صوفی ہیں، نوری ہیں، برگزیدہ ہیں اور مخلوق میں اللہ کی امانت ہیں، جن کو نبی کریمؐ نے اپنے دامنِ (رحمت) میں چھپا رکھا ہے۔ یہی وہ لوگ تھے جو نبیؐ کی زندگی میں اہلِ صُفّہ تھے، اور اُنؐ کے بعد امت کے بہترین لوگ۔" (التعرف، صفحہ ۳۴ ترجمہ ڈاکٹر پیر محمد حسن)

ہم اس جماعتِ صوفیاء و اولیاء کرام کے متعلق کسی قدر تفصیل سے اگلے باب میں انشاء اللہ ذکر کریں گے۔ یہ وہ عظیم جماعت ہے جس نے اصلاحِ امت کی ذمہ داریوں کو سنبھالا اور معاشرہ میں ایک منفرد مقام پایا۔

اس دور (یعنی پہلی صدی ہجری) کے متعلق

امام ابوبکرؒ کا یہ فیصلہ بھی بڑی تحقیق و کاوش پر مبنی ہے کہ ان پہلی تین صدیوں میں اس صوفیاء کرام کی جماعت کو تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

(۱)

وہ صوفیاءِ کرام جنہوں نے علم تصوّف پر گفتگو کی اور اپنے وجد کی تشریح کی، ان کے مقامات کو لوگوں پر ظاہر کیا، اور صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے بعد قولاً اور عملاً اُن احوال کے ترجمان رہے۔

اس پہلے طبقہ میں مصنف نے جن بزرگ ہستیوں کے اسماء گرامی لکھے ہیں اُن میں ائمہ کرام میں سیدنا امام زین العابدینؓ، سیدنا امام باقرؓ، سیدنا امام جعفرؓ خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ ان کا ذکر ہم گذشتہ ابواب میں کر چکے ہیں۔

اس کے بعد اولیاء کرام میں سرِفہرست حضرت اویس قرنی رضی اللہ عنہ، خواجہ حسن بصریؒ، مالک بن دینارؒ، ابراہیم بن ادہمؒ، فضیل بن عیاضؒ، داؤد طائیؒ، سفیان بن یزیدؒ، حضرت ذوالنونؒ مصریؒ وغیرہم ہیں۔

(۲)

امام ابوبکر بن ابو اسحٰق، دوسرے طبقہ میں اُن بزرگ ہستیوں کا ذکر فرماتے ہیں، جنہوں نے کتابوں اور رسالوں کے ذریعہ علومِ اشارات پھیلائے۔

اس میں ابوالقاسم جنید، ابوالحسین احمد بن عبد الصمد نوری، ابوسعید احمد،

(انہیں لسانِ تصوّف کہا جاتا ہے)، حضرت ابو محمد رویم بن محمد، حضرت ابو العباس احمد بن عطا، حضرت ابو عبد اللہ عمر بن عثمان مکیؒ، حضرت ابو یعقوب یوسف بن حمدان سوسی، حضرت ابو محمد الحسن بن محمد جریری، حضرت ابو عبد اللہ ہیکل، حضرت ابو بکر شبلی جن کا نام ولف بن جحدر ہے، شامل ہیں۔

(۳)

تیسرے طبقہ میں ان شخصیتوں کا ذکر ہے جنہوں نے معاملات میں تصانیف کیں اور ان میں ابو عبد اللہ بن عاصمؒ، الحارث بن اسدؒ، یحییٰ بن معاذ رازیؒ ابو بکر بن عمرؒ، ابو عثمان سعید بن اسمٰعیل رازی، ابو عبد اللہ محمد بن الفضل بلخی اور دیگر بزرگ ہستیاں شامل ہیں۔

صوفیاء کرام کی یہ جماعت پہلی دو تین صدیوں میں ہونے کے باعث تابعین و تبع تابعین کی جماعت ہے اور خیر القرون میں شامل ہے۔

غرض یہ وہ ہستیاں ہیں جو حضورؐ کے قال کے ساتھ حال کی بھی ترجمان ہیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحابؓ کے اندازِ فراست کی شاہد ہیں، علوم و معارف کی گہرائیوں میں غوطہ زن ہیں، اور اس عظیم جماعت کی پیش رو ہیں جو بعد کی صدیوں میں عملی تصوّف کی پُر نور مثال بن کر اسلام کے فروغ کی ضامن ہوگی۔ ہم ان میں سے چند کا ذکر یہاں کریں گے۔ ان کے ساتھ ہم ایک بزرگ ہستی حضرت ربیع اخور لعی بن خراش رضی اللہ عنہ اور دوسرے حضرت سعید بن مسیّب رضی اللہ عنہ اور حضرت سیّدنا عمر بن عبد العزیز کا مختصر ذکر بھی کریں گے، جن کے کارنامے خلفائے راشدینؓ کی یاد تازہ کرتے ہیں۔

ہم نے حضرت ربیع اخور لعیؓ کا ذکر پہلے اس لئے کیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کو بہترین تابعی قرار دیا ہے۔

حضرت ربیع اخو رلعی بن خراش رضی اللہ عنہ

"ربیع بن خراش رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ہم چار بھائی تھے۔ مگر حضرت ربیع اخو تمام بھائیوں میں زیادہ نماز و روزہ کا اہتمام فرماتے تھے، سخت گرمی کے روزے رکھتے تھے۔ آپ کا انتقال ہوگیا، ہم نے ایک چارپائی پر لٹا دیا۔ مُنہ کپڑے سے ڈھانپ دیا، اور چارپائی کے ارد گرد بیٹھ گئے۔ ایک آدمی کفن لینے کے لئے بھیجا۔ اچانک ہم نے دیکھا کہ حضرت ربیعؓ نے کپڑے سے باہر منہ نکالا اور سارے حاضرین کو السّلام علیکم کہہ کر مخاطب ہوتے ہم نے وعلیکم السلام کہنے کے بعد دریافت کیا کہ مُردے کیسے باتیں کرتے ہیں۔ وہ فرمانے لگے: ہاں میں نے آپ لوگوں سے جُدا ہو کر اپنے اللہ کی زیارت کی۔ مجھے اللہ تعالیٰ نے نہایت مہربانی سے قبول فرمایا، میری روح کا استقبال کیا گیا حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم نے محبّت کے ساتھ فرمایا، ہم تمہارا انتظار کر رہے ہیں، تم ہمیشہ ہم پہ درود بھیجا کرتے تھے، آج تمہیں انعام سے نوازا جائے گا۔

"جب یہ خبر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہ نے سُنی تو فرمایا: میںؓ نے رسولِ خدا صلّی اللہ علیہ وسلّم سے سُنا ہے کہ میری اُمت سے جو شخص مرنے کے بعد گفتگو کرے گا وہ بہترین تابعی ہوگا۔" آپؓ نے مزید فرمایا کہ "مرنے کے بعد کوئی شخص ہنس نہیں سکتا تاوقتیکہ اُسے یہ معلوم نہ ہو جائے کہ اُس کا صحیح مقام کون سا ہے۔" کہتے ہیں کہ مرنے کے بعد انہیں غسل دیا گیا، تو غسل دینے والے نے دیکھا کہ لبوں پر مسکراہٹ ہے۔" (شواہدِ نبوت، جامیؒ، صفحہ ۳۹۱)

غور فرمائیں کہ یہ واقعہ کن کن امور کی شہادت ہے۔ شہادتِ نبوت، شہادتِ محبّتِ نبی کریمؐ، فضائل درود و عبادات، اور نورِ مبین صلّی اللہ علیہ وسلّم کے اس علمِ کامل کی جو اللہ تعالیٰ کی جانب سے عطا ہوا، اور اس مقام کی جو آپ

صلی اللہ علیہ وسلم کے آستانہ کے گداؤں کو ملا۔ (سبحان اللہ)

حضرت سعید بن مُسیّب رضی اللہ عنہ

آپؓ کے زمانہ میں اسلامی اقتدار یزید کے ہاتھ میں چلا گیا۔ آپؓ کا ایام حرّہ میں ذکر آچکا ہے۔ یزیدی لشکر مدینہ پر حملہ آور ہوا تھا۔ مدینہ میں بہت سے مہاجرینؓ وانصارؓ تہہِ تیغ ہوئے اور کوئی مسجدِ نبوی میں نہ ٹھہر سکا، لیکن آپؓ کو یزید کے لشکر نے دیوانہ سمجھ کر چھوڑ دیا تھا، اس وقت بھی آپؓ روضۂ انور سے اذان سُنا کرتے تھے۔ آپؓ اُٹھتے اور نماز بروقت ادا کر لیتے۔ شامی لوگ مسجد میں آتے تو کہتے کہ اس دیوانہ بوڑھے کو دیکھو۔ (شواہدِ نبوّت صفحہ ۳۹۶)

مسجد میں آپؓ کے قیام کا واقعہ بھی سبق آموز ہے۔

یزید کے امراء جب مدینہ پہنچے تو حضرت علی الحسین (امام زین العابدینؓ)، حضرت قاسم بن محمد جو حضرت ابو بکرؓ کے پوتے ہیں، اور حضرت سالم بن عبداللہ جو حضرت عمرؓ کے پوتے ہیں، (ان) کو طلب کیا، اور دریافت کیا کہ سعید بن مسیّب رضی اللہ عنہ کہاں ہیں۔ ان حضرات نے فرمایا کہ وُہ مسجد میں قیام فرما ہیں اور وہاں سے باہر نہیں آتے، اور امراء کی صحبت میں آنا ناپسند کرتے ہیں۔ گورنر نے کہا کہ تم لوگ علیؓ بن ابی طالب، صدیقِ اکبرؓ، اور عمرِ فاروقؓ کی اولاد ہو۔ تم ہمارے سامنے کھڑے ہو تو یہ شخص کون ہوتا ہے جو میرے پاس نہ آئے۔ اُسے بُلا کر لاؤ۔ اگر وہ حاضر نہ ہوا تو اُس کی گردن اُڑا دوں گا۔ اور یہ بات تین بار دہرائی تاکہ خوب یاد رہے اور واضح ہو جائے۔

یہ حضرات حضرت سعید بن مسیّبؓ کے پاس گئے، اور اُنہیں گورنر کی نیّت سے آگاہ فرما کر درخواست کی کہ آپؓ عمرہ کو چلے جائیں۔ آپؓ نے فرمایا کہ عمرہ کی نیّت تو میرے دل میں نہیں ہے۔ آپؓ نے فرمایا کہ اپنے کسی

رشتہ دار کے پاس چلے جائیں۔ آپؓ نے فرمایا کہ یہ اذان جو مجھے پانچ بار سنائی دیتی ہے کہاں سنوں گا۔ جب وہؓ کسی طرح راضی نہ ہوئے تو ان حضرات نے کہا، آپؓ ڈرتے نہیں۔ آپؓ نے فرمایا "آپ لوگ کیوں پوچھتے ہیں جب کہ آپؓ کو پتہ ہے کہ میں اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتا۔ لیکن آپ کہتے ہیں تو میں سب سے پہلے اللہ کی حمد وثناء کرتا ہوں، اپنے آقا پر ہزاروں درود بھیجتا ہوں، اور اللہ سے یہ دعا کرتا ہوں کہ گورنر مجھے بھول جائے۔" چنانچہ یہی ہوا۔ وہ گورنر جب تک مدینہ میں رہا تو اُسے حضرت سعیدؓ یاد نہ آئے۔ البتہ جب وہ معزول ہو کر مدینہ چھوڑ کر جا رہا تھا تو اُسے یاد آیا اور تأسف کیا کہ مجھے اپنی قسم یاد کیوں نہ آئی۔ ایک عاجز غلام نے کہا جو اللہ چاہتا ہے وہ آپ کی خوشی سے بہتر ہے۔ (اقتباس از شواہدِ نبوت صفحہ ۳۹۶)

ایسی ہزار ہا ہستیاں ہیں جنہیں نورِ مبینؐ کی تعلیمات نے انمول ہیرے بنا دیا تھا، جن کی علمی، قولی، عملی کاوشیں امت کے لئے آفتابِ رسالت کی تجلیات ثابت ہوئیں۔

حضرت عمر بن عبد العزیزؓ

ہر چند ان کا ذکر بھی ہو چکا ہے لیکن ان ناموں کے ساتھ حضرت عمر بن عبد العزیزؓ کا ذکر ضروری ہے کہ خلافت کی شان خلافتِ راشدہ کے بعد آپؓ ہی کے گراں قدر کارناموں سے عبارت ہے۔ ان کے حالاتِ زندگی، ان کی عبادت، ان کا جذبۂ خدمتِ خلق، ان کی عدل گستری سیدنا عمر فاروقؓ کی یادیں تازہ کرتی اور ان کا صدق وصفا حضرت صدیقِ اکبرؓ کی جلالتِ شان پر شاہد رہا۔ انہوں نے ویرانوں کو عدل و انصاف سے آباد کیا۔ اور جب وقتِ مرگ آیا تو اس طرح کہ:

آپ نے لوگوں سے کہا کہ مجھے بٹھا دیا جائے۔ جب آپ بیٹھ گئے تو فرمایا: "اے اللہ میں گناہ گار ہوں۔ تو نے مجھے جو حکم دیا میں اُسے کما حقہٗ بجا نہ لا سکا، تو نے جن امور سے منع کیا میں اُن سے صحیح طور پر بچ نہ سکا۔ اب میں لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کہتا ہوں اور تیری بارگاہ میں حاضر ہوں۔" یہ کہہ کر سر اُٹھایا اور تیز تیز نظروں سے دیکھنے لگے۔ حاضرین نے پوچھا، آپ کیا دیکھ رہے ہیں۔ آپ نے فرمایا، "میں ایسے لوگوں کو آسمان سے اُترتے دیکھ رہا ہوں جو نہ انسان ہیں نہ جن ہیں۔" انہیں باتوں میں (۲ رجب ۱۰۱ھ میں) واصل بحق ہو گئے۔ کہتے ہیں کہ آپ کی قبر پر مٹی ڈالی جارہی تھی کہ آسمان سے ایک کاغذ اڑتا ہوا گرا جس پر لکھا تھا۔" بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

هٰذَا اَمَانٌ مِّنَ اللّٰہِ لِعُمَرَ بْنِ عَبْدِ الْعَزِیْزِ مِنَ النَّارِ (بسم اللہ الرحمٰن الرحیم یہ اللہ کی طرف سے عمر بن عبدالعزیزؒ کے لئے دوزخ سے امان کا پروانہ ہے)۔

آپؓ کا نام خلفاءِ راشدینؓ کے اسماءِ گرامی کے ساتھ آج بھی لیا جاتا ہے۔

(شواہدِ نبوت صفحہ ۳۰۴ بحوالہ فتوحاتِ مکیہ)

ہمیں یہ پروانۂ نجات نصیب ہو یا نہ ہو، لیکن کیا ہمیں سیدنا عمر بن عبدالعزیزؓ کا طرزِ حیات و اندازِ مرگ یہ نہیں بتاتا کہ مردِ تو کیسے مرد، اور کیا الفاظ تمہاری زبان پر ہوں۔ کیوں نہ ہو، یہ سب نورِ مبین رحمۃ للعلمین ؐ کے ترجمانِ رحمت اور چراغِ ہدایت ہیں۔

حضرت اویس قرنی رضی اللہ عنہ (متوفی ۳۷ھ)

یہ وہی بزرگ ہستی ہیں جنہوں نے سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا دور پایا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دیدِ مبارک سے اپنی آنکھیں ٹھنڈی نہ کر سکے اور ماں کی خدمت میں لگے رہے، لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا دیدار چشمِ باطن

سے کرتے رہے۔ یہ وہ عظیم ہستی ہیں جن کے متعلق حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم سے سُنا ہے کہ ایسے ہی لوگوں کی شفاعت سے قیامت کے روز لوگ جنّت میں داخل ہوں گے۔
مشکوٰۃ شریف میں آتا ہے کہ حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم نے حضرت عمر فاروق رضؓ سے یہ فرمایا کہ "جب اویس سے ملنا تو اپنی مغفرت کی دعا ان سے ضرور کرانا" یہ وہی دیوانۂ محبّت ہیں جن کے بابت مشہور ہے کہ یہ سُن کر کہ اُحد کے غزوہ میں حضور نبی کریم صلّی اللہ علیہ وسلّم کا دانت شہید ہوا سب دانت شہید کر ڈالے کہ نہ جانے حبیبِ پاکؐ کا کون سا دانت شہید ہوا ہو۔

روایت ہے کہ حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم نے جب حضرت اویس قرنیؓ کا ذکر حضرت عمر فاروقؓ اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے سامنے کیا تو ان حضراتؓ کو حضرت اویس قرنیؓ سے شرفِ زیارت کی تمنّا ہوئی۔ حضورؐ کے وصال کے بعد قرن پہونچے، لوگوں سے حضرت اویس قرنیؓ کے متعلق دریافت کیا۔ لوگوں نے انہیںؓ دیوانہ کہہ کر اُنؓ کی طرف راہ نمائی کی۔ ان حضراتؓ نے پہونچ کر حضرت اویس قرنیؓ کو سلام کیا اور حضورؐ کا پیراہنِ مبارک پیش کر کے حضورؐ کی جانب سے اُمّت کے لئے مغفرت کی درخواست کی تعمیلِ امر میں آپؓ نے دعا فرمائی۔ کہتے ہیں کہ آپؓ کے طفیل قیامت کے دن بنو کلب کی بھیڑوں کے بالوں کے برابر رسول اللہؐ کے اُمّتی اللہ ربّ العزّت کی مغفرت سے سرفراز ہوں گے۔

جو لوگ کسی سلسلہ سے متعلق نہیں ہوتے، مثلاً قادریہ، چشتیہ، نقشبندیہ وغیرہ سے تو وہ حضرت اویس قرنی رضی اللہ عنہ سے اپنا رشتہ جوڑتے ہیں۔ اسے سلسلۂ اویسیہ بھی کہتے ہیں جو آج بھی جاری ہے، اور آج بھی اتباع و محبّت، شریعت و طریقت کا یہ سنگم آپؓ کی ذاتِ مبارکہ سے موج زن ہے۔

حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۱۱۰ھ)

آپؒ ایک عالم باعمل، زاہد و متقی شخصیت کے مالک تھے۔ خشیتِ الٰہی میں غرق رہتے تھے۔ آپؒ کی والدہ ام المومنین حضرت ام سلمہؓ کی کنیز تھیں۔ آپؒ کے بچپن میں جب آپؒ کی والدہ کسی کام میں مشغول ہوتیں تو حضرت حسنؒ کو حضرت ام المومنینؓ کی گود میں ڈال دیتیں۔ بعض وقت ام المومنینؓ سینہ سے لگا لیتیں اور دفورِ شوق میں ام المومنینؓ کے دودھ بھی نکل آتا۔ یہ علم دین، ایمان و عرفان جو خواجہ حسن بصریؒ کو نصیب ہوا اسی کا فیض تھا۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ بچپن میں آپؒ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پیالے سے پانی پی لیا تھا۔ اور یہ علم کا نفوذ اُسی کا فیض تھا اور ام المومنین کے کاشانۂ عرفان میں پرورش کے باعث حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعائے خیر و فلاح سے سرفرازی پائی۔ چنانچہ آپؒ یگانۂ روزگار ہوئے اور ایک سو بیس صحابہؓ سے شرفِ نیاز حاصل ہوا، اور حضرت امام حسن بن علی رضی اللہ عنہ سے شرفِ بیعت نصیب ہوا۔

آپؒ سے رُشد و ہدایت کا سلسلہ جاری ہوا۔ آپؒ کے وعظ میں کثیر تعداد میں لوگ شریک ہوتے، اس میں حضرت رابعہ بصریؒ بھی شرکت فرماتیں۔ آپؒ خوفِ آخرت سے کانپتے رہتے، اور فرمایا کرتے کہ اُس دن کو بہت نزدیک سمجھو جس میں دنیا فنا ہو جائے گی اور آخرت باقی رہے گی۔ اِسی آخرت کے حصول کی طرف لوگوں کو دعوت دیتے رہے۔ آپؒ سے بے شمار کرامتیں منقول ہیں، لیکن آپ کا سب سے بڑا کارنامہ تبلیغِ دین ہے۔ آپؒ نے ہزار ہا قلوب کو نورِ ایمان و ایقان سے منور کیا، اور آپؒ کے مریدین کی ایک بڑی جماعت آپؒ کے نقشِ قدم پر چل کر فریضۂ رشد و ہدایت ادا

کرتی رہی۔ آپؒ فرمایا کرتے کہ خوابیدہ قلوب کو بیدار کیا جا سکتا ہے لیکن مُردہ دلوں کو نہیں جگایا جا سکتا۔ آپؒ اخلاصِ نیت پر بہت زور دیتے اور اپنے رب کے حضور استغفار کی کیفیات کی ترجمانی کی خود ایک زندہ مثال تھے۔ اور اسی کا نتیجہ تھا کہ

دمِ مرگ مسکراتے ہوئے رخصت ہوئے

"وفات کی شب کسی بزرگ نے خواب میں دیکھا کہ آسمان کے دریچے کھلے ہیں اور ندا کی جا رہی ہے کہ حسن بصریؒ اپنے مولیٰ کے پاس حاضر ہو گئے اور اللہ اُن سے راضی ہے۔" (تذکرۃ الاولیاء صفحہ ۲۷)

حضرت رابعہ بصریؒ

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اِن تجلیات سے خواتین کو بھی حصہ ملا، اور خوب ملا، ظرف اور ذوق کے مطابق۔

ان میں حضرت رابعہ بصریؒ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں، جو خواجہ حسن بصریؒ کی ہم عصر اور ہم مذاق ہیں، اور آج بھی اُنؒ کا نام بڑی عزت و احترام کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ آپؒ قربِ الٰہی کی شیفتہ اور پاکیزگی میں مریم ثانی کا مقام رکھتی ہیں۔ حضرت رابعہ بصریؒ کی پیدائش اور ان کی غربت، اللہ تعالیٰ کو کتنی عزیز تھی یہ اُن کے حالاتِ زندگی ہی سے پتہ چلتا ہے۔ یہ وہ بزرگ ہستی ہیں جنہوں نے اپنے ربّ سے یوں التجاء کی کہ اے پروردگار! مجھے مکان کی حاجت نہیں مجھے تو مکین کی تلاش ہے۔ اور یہ بھی ہوا کہ جب سفرِ حج کو چلیں تو خانۂ کعبہ کو اس ضعیفہ کے استقبال کے لئے بھیجا گیا۔ اُنہوںؒ نے راہِ شوق کی اُن منزلوں کو طے کیا جن کا ہم تصور بھی نہیں کر سکتے۔ اور اپنے ربّ سے راز و نیاز میں زندگی کا ہر لمحہ گذارا۔ یقین کی دولت اُنؒ کا اثاثہ، حقیقت شناسی

اُنؒ کی جولانگاہ، معرفت اُنؒ کا مذاق، خودشناسی اور خداشناسی کی منزل سے گذر کر آزمائشوں کے بحرِ بے کراں عبور کر کے حضوریٔ قلب کی دائمی نعمت سے سرفراز ہوئیں۔ یہاں تک کہ جب وقتِ وفات آیا تو آپؒ نے مجلس میں حاضر مشائخ سے فرمایا: آپ ہٹ جائیں اور ملائکہ کے لئے جگہ چھوڑ دیں۔ چنانچہ لوگ باہر چلے گئے اور دروازہ بند کر دیا۔ اندر سے یہ صدا آنی شروع ہوئی۔

یٰۤاَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ۝ ارْجِعِیْۤ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً

(یعنی اے مطمئن نفس اپنے مولیٰ کی جانب لوٹ چل)۔ کچھ دیر بعد جب آواز بند ہوئی لوگ اندر گئے تو دیکھا کہ وہؒ اپنے ربّ کے پاس روانہ ہو چکی ہیں، اور کس انوکھی شان سے دُنیا سے رخصت ہوئیں۔ یہ بھی واضح رہے کہ آج اہلِ ایمان عوام و خواص میں ان کی عظمت و وقار، عزّت و مرتبت اسی طرح جاگزیں ہے، اور کیوں نہ ہو کہ وہ اپنے ربّ کی پیاری تھیں۔

یہاں کرامتیں ظاہر کرنا منظور نہیں، محبتیں دکھانا منظور ہے کہ نبی کریمؐ کے انوار کیسے چاندنی بن کر ہر ہر جانب چھٹکے ہیں، گھروں کے اندر بھی اور باہر بھی، آبادیوں میں بھی، ویرانوں میں بھی۔

کس کس کے نام لکھے جائیں اور کن کے نام کیوں چھوڑ دیئے جائیں، جب سب ہی شعاعِ نورِ مبینؐ ہیں۔

حضرت ابراہیم بن ادہمؒ

آیئے اس مثالِ غربت کے بعد ایک صاحبِ ثروت کی زندگی سے بھی درسِ محبّت لیں۔ یہ حضرت ابراہیم بن ادہمؒ ہیں، جنہوں نے بلخ کی سلطنت کو ٹھکرا کر فقر کو گلے لگایا، تاجِ شاہی چھوڑ کر فقیری کو اپنایا، اور اللہ کے لئے اللہ کے بندوں سے محبّت ہی کو اللہ ہی کی محبّت جانا۔ جن کو اسمِ اعظم کی تعلیم

حضرت الیاس ؑ نے دی جنہوں نے حضرت خضر ؑ کے ہاتھ پر بیعت کی، پھر ویرانوں، آبادیوں سے گذرتے ہوئے، ہزار ہا عجائبات کا مشاہدہ کرتے ہوئے خانہ کعبہ پہنچے۔ وہاں بھی اپنے کو لوگوں سے حجاب میں رکھا۔ ایک ہی بچہ، جسے چھوڑ کر سلطنت کو خیر باد کہا تھا، جب طوافِ کعبہ میں نظر آیا اور محبتِ پدری نے اپنا رنگ دکھایا۔ پھر قلب پر جو وارد ہوا اُس نے چونکا دیا حضرت ابراہیم ادہمؒ نے اپنے رب سے فریاد کی اِلٰہی اَغِثْنِی۔ یہ انؒ کے جگر کا ٹکڑا، یہ بچہ زمین پر گرا اور فوت ہو گیا۔ اور وہ خود کن پیاری پیاری دعاؤں کے ساتھ اپنی محبت کے نقوش امتِ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے چھوڑ گئے۔ آپ کی وفات ۱۶۲ھ میں ہوئی۔ آپؒ کا وہ واقعہ جس میں آپؒ نے جبرئیلِ امین کو خواب میں دیکھا اور حبیب اللہ کے دوستوں میں اپنا نام ان کے دفتر میں نہ پایا تو اپنا نام اس کے بندوں کے دوستوں میں لکھے جانے کی تمنا کی جو زبان زدِ خلائق ہے۔

آپؒ فرمایا کرتے "اے اللہ تو حلیم و خبیر ہے۔ تیری عنایت و کرم جو مجھ پر ہے اُس کے مقابلہ میں آٹھوں جنتوں کی بھی کوئی حیثیت نہیں۔ لہٰذا اے خدا رُسوائی و معصیت سے بچاتے ہوئے مجھے اطاعت کا شرف عطا فرما دے، اور جو تیری ذات سے واقف ہے اُسے کیا خبر کہ اُس شخص کی کیا کیفیت ہو گی جو تجھ سے قطعاً ناواقف ہے۔"

آپؒ فرماتے ہیں کہ تین حجابات رفع ہو جانے سے سالک کا قلب کشادہ ہوتا ہے:

اوّل یہ کہ کبھی دنیا کی سلطنت (دنیا کا عیش) قبول نہ کرے۔

دوسری یہ کہ کسی شئے کے چلے جانے پر غم نہ کرے۔

اور تیسری یہ کہ کسی کی تعریف پر خوش نہ ہو۔

(تذکرۃ الاولیاء صفحہ ۶۵)

یقیناً اِن بزرگوں کے حالاتِ زندگی پڑھنا شروع کرو تو دل چاہتا ہے کہ پڑھتا ہی چلا جائے۔ ان کا اختصار بھی ممکن نہیں، اور کیسے ہو کر یہ سب تو نورِ مبین صلی اللہ علیہ وسلم کے انوارِ ذات وصفات کی تجلیات ہیں۔ ان کے حالات تو درکنار یہ وہ نجوم ہیں جنہیں گنا بھی نہیں جا سکتا۔ البتہ یہ سب صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت دلوں میں جاگزین کرنے کا وسیلہ ضرور ہیں۔ یہ فیضانِ نورِ محمدیؐ نہیں تو کیا ہے۔ الحمدللہ

چند دیگر اہم ہستیاں

یہاں اس ابتدائی دور کی چند اور عظیم ہستیوں کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا

ان میں حضرت فضیل بن عیاضؒ ہیں (متوفی ۱۸۷ھ) جو کبھی دولت کے پرستار تھے پھر اللہ تعالیٰ نے ہدایت سے نوازا تو ولیٔ کامل ہو گئے، راہزنی سے توبہ کی، مدتوں حضرت امام ابوحنیفہؒ کی خدمت میں رہ کر علم حاصل کیا اور عبادت اور ریاضت میں معراجِ کمال کو پہونچے۔

انہیں میں بشر حافیؒ ہیں، ذوالنون مصریؒ ہیں، بایزید بسطامیؒ ہیں، سفیان ثوریؒ ہیں، ابوعلی شفیق بلخیؒ ہیں، سری سقطیؒ ہیں، معروف کرخیؒ ہیں۔

یہ وہ عظیم ہستیاں ہیں جو اپنے نبی کریمؐ کی اتباع و محبت میں اپنے آقاؐ کی امت کو راہِ ہدایت دکھانے، نارِ دوزخ سے بچانے اور پھر ان کی شفاعت کے لئے بے تاب ہیں۔ اور جن کی زندگی کا ہر ہر واقعہ سبق آموز ہے۔ ہم اس سلسلہ کو حضرت بایزید بسطامیؒ اور شیخ ابوالحسن خرقانیؒ کے مختصر ذکر پر ختم کرتے ہیں۔

حضرت خواجہ بایزید بسطامیؒ

آپؒ کا اصل نام طیفور کنیت ابویزید اور لقب سلطان العارفین ہے۔ آپؒ

حضرت جعفر صادق رضی اللہ عنہ کی روحانیت سے اویسی طریقہ پر فیض یافتہ ہیں۔ آپؒ مادر زاد ولی تھے۔ بچپن ہی میں تلاشِ حق کی جستجو پیدا ہوئی۔ چنانچہ ایک بار جب استاد سے قرآن شریف پڑھ رہے تھے اور اس آیت پر آئے اَنِ اشْکُرْ لِیْ وَلِوَالِدَیْکَ (یعنی شکر کر میرا اور اپنے ماں باپ کا) تو اپنے استاد سے اجازت لے کر گھر آئے، اور اپنی والدہ سے عرض کیا کہ میں دو گھروں کے تعلق نہیں نباہ سکتا۔ یا تو مجھے اللہ تعالیٰ سے مانگ لیں یا اللہ تعالیٰ کو سونپ دیں۔ والدہ نے انہیں خدا کے لئے چھوڑا۔ آپؒ بسطام سے باہر نکلے اور تیس سال تک شام کے جنگلوں میں ریاضت و مجاہدہ کرتے رہے، اور اس مقام پر پہنچے کہ جنید بغدادیؒ کا قول ہے کہ "راہِ توحید کے سالکوں کی انتہاء بایزیدؒ کی ابتداء کے برابر ہے"

حضرت ابوسعید ابوخیرؒ نے فرمایا کہ اٹھارہ ہزار عالم بایزیدؒ سے بھرے ہوئے دیکھتا ہوں مگر بایزیدؒ ہم میں نہیں ہیں، یعنی وہ حق میں محو ہیں۔ انؒ کی بزرگی و عظمت کا اندازہ کیا لگایا جا سکے، جن کا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم اور اُنؐ کی سنّت سے تعلق کا یہ عالم تھا کہ ساری زندگی خربوزہ نہیں کھایا، اور یہی کہا کہ مجھے نہیں معلوم کہ سرورِ کائنات صلّی اللہ علیہ وسلّم نے خربوزہ کیسے کھایا تھا۔ اور پھر اس نورِ مبینؐ کی عظمتِ شان اور انوارِ مبارکہ کا کیا تصور ہو سکے جنؐ کے غلام اس مقام پر پہونچے۔ ان کی وفات ۱۵ شعبان ۲۶۱ھ میں ہوئی۔ حضرت بایزیدؒ کا قول ہے کہ "راہِ طریقت میں سب سے بڑی دولت وہ ہے جو مادر زاد ہو (پیدائشی ولی)، اس کے بعد چشم بینا اور اُس کے بعد گوشِ ہوش۔ اگر یہ تینوں چیزیں حاصل نہ ہوں تو مرگِ ناگہاں بہتر ہے"

(تذکرۃ الاولیاء صفحہ ۸۸)

حضرت شیخ ابوالحسن خرقانیؒ

"ان کا زمانہ حضرت بایزید بسطامیؒ کے بعد کا ہے، اور بطریقِ اُویسیت بایزیدؒ سے انتساب ہے۔ لیکن منقول ہے کہ جب بایزیدؒ خرقان سے گذرتے تو ٹھہر جاتے، اور اِس طرح سانس لیتے جیسے کسی چیز کی خوشبو سونگھ رہے ہیں۔ جب دریافت کیا جاتا تو فرماتے کہ اس بستی میں ایک مردِ خُدا کی خوشبو پاتا ہوں۔ اُن کا نام علی، کنیت ابوالحسن ہے۔ اُن میں تین باتیں مجھ سے زیادہ ہیں :۔ (۱) اس پر بارِ عیال ہوگا۔ (۲) کھیتی کرے گا۔ اور (۳) درخت لگائے گا۔ واضح رہے کہ حضرت ابوالحسنؒ ڈیڑھ سو سال بعد آنے والے ہیں اور اُنؒ کی خوشبو بایزید اس وقت سُونگھتے ہیں اور اُنؒ کے حالات سے باخبر کرتے ہیں۔

حضرت بایزیدؒ فرماتے ہیں کہ "فرشتے تین موقع پر اولیاء اللہ سے ہیبت کھاتے ہیں :

(۱) کراماً کاتبین اعمال لکھتے وقت (۲) ملک الموت جان نکالتے وقت۔ اور (۳) منکر نکیر سوال کرتے وقت۔"

(اقتباس از مجدد الف ثانیؒ مؤلفہ سیّد زوار حسین صاحبؒ، صفحہ ۱۰۶ و ۱۰۷)

اللہ کے ان ولیوں کا حال کیا بیان ہو۔ اُن کے کشف، اُن کے انوار، اُن کی بصارت و بصیرت اور اُن کی دید و مشاہدہ کا تو ہم تصوّر بھی نہیں کر سکتے۔ پھر اُن کی تعلیمات اور ان کی زندگی میں وہ کون سا رُخ ہے جو حضور سرورِ کائنات صلّی اللہ علیہ وسلّم کے انوار سے معمور نہیں۔ ایسا محسوس ہوتا کہ جیسے وہ سب دامنِ رسالتؐ پکڑے ہوئے کھڑے ہیں اور ہم گناہ گاروں کو اُنؐ کے سایۂ عافیت میں بُلا رہے ہیں۔

"اے اللہ! اپنے اِن پُراسرار بندوں کے صدقہ میں ہمارے گناہ بھی معاف فرمادے، اور نورِ مبینؐ کا دامنِ رسالت و رحمت ہمارا نصیبہ فرما۔"

فصلِ پنجم

یہ فصل تیسری صدی ہجری کے بعد سے دورِ حاضر کے صوفیاء کرام اور مفکّرین علماء اسلام پر مشتمل ہے۔ ہمارا مقصد ان بزرگوں کے حالات لکھنا نہیں بلکہ یہ ظاہر کرنا ہے کہ اس دور میں نورِ مبین ﷺ کی تجلیات کے انداز کیا ہیں۔ اس میں ایک گروہ اولیاء کرام ہی کا ہے جو تزکیۂ نفس و تصفیۂ باطن کے ساتھ توحید کے انوار سے قلوب کو مزین کرنے میں مصروف ہے۔ ان میں وہ بھی ہیں جو مختلف ممالک میں پھیل کر مختلف مذاہب کے لوگوں سے ملے جلے، اپنے اخلاق، محبت و شفقت سے ان کو متاثر کیا، ساتھ ہی قدرتِ خفی سے، جو انہیں بطور ولی کے اللہ کی عطا تھی، لوگوں کے احوال سدھارنے میں مستعد رہے، اور ان مسلمانوں کی اصلاح سے غافل نہیں رہے جو ظاہری علوم تک رسائی پر قانع ہو گئے تھے اور نفس کی بے شمار برائیوں میں مبتلا تھے، انہیں بھی ہدایت کے انوار سے روشناس کیا۔

اسی طرح اس میں اکابر علماء کا بھی نہایت اختصار سے ذکر ہوگا جنہوں نے شریعت کے دامن کو ملک و ملت پر پھیلایا، اس کے ارکان اور اس کی اہمیت سے اُن کو آگاہ کیا، ان کی فکر کو فکرِ صالح بنایا، اور انہیں صالحین کی صف میں لا کھڑا کرنے کا بیڑا اٹھایا۔

○

صوفیائے کرام

اس دور میں صوفیاء کرام کی ایک جماعت دنیا کے گوشہ گوشہ میں پھیل گئی۔ اُن کے مبارک ہاتھوں میں کثیر تعداد میں لوگ مشرف بہ اسلام ہوئے۔ یہ

آسمانِ ہدایت کے وہ ستارے ہیں جن کی تعداد کا احاطہ ممکن ہی نہیں ۔ یہی نہیں بلکہ اُن میں کسی ایک کے بھی کمالات، کرامات، خدمات اور اندازِ محبت کی تشریح بھی ممکن نہیں۔ کیونکہ یہ وہ جماعت ہے جو حضور سرورِ کائنات صلّی اللہ علیہ وسلّم کے دربارِ خاص سے مسندِ فقر و ولایت پر بٹھائی گئی ہے، اور اُن کو خصوصی خدمات سپرد ہوئی ہیں۔ جن کا کام تھا ہدایت، کرم نوازی، غیروں کو اپنانا، اپنوں کو سنوارنا، اُن کے دُکھ درد میں شریک ہو کر اُن کی غم خواری کرنا، اور اکثر اللہ کے حکم سے چارہ جوئی کرنا، اور اس چراغِ مصطفوی سے ان کے قلوب اور ان کے ماحول کو پُر نور کرنا، اور توحیدِ مطلقہ کے انوار ان کو نورِ مبین ؐ ہی کی ضیاء باریوں میں دکھانا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ وہ بزرگ ہستیاں ہیں جنہیں عالمِ کشف یا عالمِ خواب یا بیداری میں حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کی دید سے بارہا سرفرازی ہوئی، اور انہیں نے طٰہٰ و یٰس صلّی اللہ علیہ وسلّم کی خوشبو سے سرفرازی پائی۔

انہیں خوشبوؤں سے مہکتے ہوئے چند نام تبرّکاً درج ذیل ہیں۔ ساتھ ہی ہم ان ہزارہا نجومِ معرفت کے حضور معذرت خواہ بھی ہیں جن کے اسماء گرامی بھی شامل کرنا ممکن نہ ہوا، جن سے فیضانِ معرفت کے چشمے جاری ہیں اور جن کے لاتعداد مریدوں اور معتقدوں سے گلستانِ عالمِ اسلامی مہک رہا ہے، اُن میں اربعہ سلاسل کے خلفاء بھی ہیں اور دورِ حاضر کے وہ صالحین بھی جو بالواسطہ یا بلاواسطہ اُن سے روشنی حاصل کر رہے ہیں۔ ان کے ذکر سے پہلوتہی منظور نہیں، قلب ان کی عظمت سے معمور ہے۔ البتہ صفحہ کا عذر ان کا ذکر ممکن نہیں۔ اللہ تعالیٰ عالم الغیب ہے، اُمید ہے کہ محض اپنے لطف و کرم سے مواخذہ نہ فرمائے گا۔

حضرت شیخ ابوبکر شبلی رح — متوفی ۳۳۸ھ

حضرت شیخ ابوسعید ابوالخیر معرّی رح	متوفی سنہ ۴۰۶ھ
حضرت ابوالحسن خرقانی رح	متوفی سنہ ۴۲۴ھ
حضرت علی ہجویری معروف بہ داتا گنج بخش رح	متوفی سنہ ۴۶۵ھ
حضرت غوث اعظم شیخ عبدالقادر جیلانی رح	متوفی سنہ ۵۶۲ھ
حضرت جار اللہ زمخشری رح صاحب تفسیر کشاف	متوفی سنہ ۵۳۳ھ
حضرت امام فخرالدین رازی رح	متوفی سنہ ۶۰۶ھ
حضرت شیخ الشیوخ شہاب الدین سہروردی رح (بغداد)	متوفی سنہ ۶۳۲ھ
حضرت خواجہ معین الدین حسن سنجری اجمیری رح	متوفی سنہ ۶۳۳ھ
حضرت شمس الدین تبریزی رح (قونیہ، ارضِ روم)	متوفی سنہ ۶۴۴ھ
حضرت بہاء الدین زکریا ملتانی رح	متوفی سنہ ۶۲۷ھ
حضرت فریدالدین گنج شکر رح (پاک پٹن شریف)	متوفی سنہ ۶۶۹ھ
حضرت مولانا جلال رومی رح (قونیہ)	متوفی سنہ ۶۷۲ھ
حضرت خواجہ نصیرالدین طوسی رح	متوفی سنہ ۶۷۲ھ
حضرت قاضی حمیدالدین ناگوری رح	متوفی سنہ ۶۹۵ھ
حضرت شیخ بوعلی قلندر رح (پانی پت)	متوفی سنہ ۷۲۴ھ
حضرت محبوبِ الٰہی نظام الدین اولیاء رح (دلی)	متوفی سنہ ۷۲۵ھ
حضرت سید علی ہمدانی رح	متوفی سنہ ۷۶۶ھ
حضرت شیخ شرف احمد یحییٰ منیری رح (بہار شریف)	متوفی سنہ ۷۸۶ھ
حضرت شاہ محمد گیسو دراز رح (گلبرگہ، دکن)	متوفی سنہ ۸۲۵ھ
حضرت مولانا عبدالرحمٰن جامی رح	متوفی سنہ ۸۲۹ھ
حضرت عبدالقدّوس گنگوہی رح	متوفی سنہ ۹۵۰ھ
حضرت خواجہ باقی باللہ رح (دلی)	متوفی سنہ ۱۰۱۴ھ
حضرت مجدد الف ثانی رح (سرہند)	متوفی ۲۸ صفر سنہ ۱۰۳۴ھ

حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی — متوفی ۱۰۵۵ھ

حضرت سید شاہ فخر الدین معروف بہ شاہ مبارک حسین رح (داناپور) — متوفی ۱۲۷۲ھ

(از حضرت مولوی شاہ محمد کبیر صاحب داناپوری۔ تذکرۃ الکرام، تاریخ خلفائے عرب و اسلام)

حضرت بابا تاج الدین اولیاء ناگوری رح — متوفی ۲۶/۲۷ محرم ۱۳۴۴ھ
۱۷ اگست ۱۹۲۵ء

حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رح — متوفی ۱۳۱۷ھ

حضرت پیر مہر علی شاہ (گولڑہ شریف) — متوفی ۱۳۵۶ھ

حضرت بابا قادر اولیاء — متوفی ۱۳۸۰ھ

حضرت مرشدی محمد عبید اللہ درانی قدس اللہ سرہ — متوفی ۱۵ ذلیقعدہ ۱۴۱۰ھ
(قادر نگر، سوات) — مطابق ۹ جون ۱۹۹۰ء

اولیاء کرام کے احوال و مقامات

یہاں ہم ان عارفانِ کامل اور واصلانِ حق کے بیان کے قبل ضروری سمجھتے ہیں کہ اس بزرگ جماعت کی کیفیات و واردات کا بیان انہیں کے ملفوظات سے ناظرینِ کرام کو پیش کریں تاکہ مجموعی حیثیت سے ہم کو اس طبقہ کی اہمیت کا اندازہ ہو سکے، خصوصاً اس تعلق کا جو ان کو نورِ مبین ؐ سے ہر لمحہ حاصل ہے۔

اللہ تعالیٰ کے ان پُراسرار بندوں کی خدمات کچھ اس قسم کی ہیں جیسے فرشتوں کی، اس فرق کے ساتھ کہ فرشتے نظر نہیں آتے اور یہ انسان ہیں اور انسانوں میں رہ کر انہیں ان امانتوں کی ذمہ داریوں سے سبکدوش ہونا ہے، جو انہیں اپنے اپنے وقت پر انسانیت کو دینا ہے، اور مشیتِ ایزدی کے تحت تغیراتِ زماں کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونا ہے، یعنی جس وقت کے لئے جو خدمت جس انداز سے اُن کے سپرد ہوتی ہے اُن کو اسی طرح بجالانا۔ گویا

ان کا بنیادی تعلق حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے بلاواسطہ یا بالواسطہ، اور آپؐ ہی کی شریعت کی پاسبانی کے ساتھ آپؐ کے احکام پر کاربند رہنا ہے۔ ان کا کوئی کام مشیتِ ایزدی اور اپنے آقا و مولیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے اشارے کے بغیر نہیں ہوتا۔ واضح رہے کہ ولایت کسی عمل سے نہیں ملتی، یہ اللہ کی دین ہے، عطا ہے، یہ ایک روحانی منصب ہے، یہ بھی حق ہے لیکن تب جب کسی کو ملے۔

ملفوظات کا مطالعہ ہمیں بتاتا ہے کہ ان اولیاء اللہ کے روحانی اجتماع بھی ہوتے ہیں جہاں اہم فیصلے کئے جاتے ہیں۔ ان میں سے بعض میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم خود شرکت فرماتے ہیں، اور اکثر میں آپؐ کا قائم مقام ہوتا ہے جسے قطب الاقطاب کہتے ہیں۔ ان کی صحیح تعداد کا تعین ملفوظات سے کرنا مشکل ہے۔ بالعموم یہ کہا جاتا ہے کہ یہ چار ہوتے ہیں، اور ان کے معاون ایک بڑی تعداد اولیاء کرام کی اور ان کے دستِ راست ابدال کی جماعت کہلاتی ہے۔ مختلف خدمات ان کے سپرد ہوتی ہیں۔ ان میں وہ ہوتے ہیں جن کا تعلق خدمتِ خلق سے ہے۔ ان میں عالم متبحر بھی ہوتے ہیں اور عابد، سالک بھی اور سالکِ عابد بھی، مجذوب بھی اور خواجہ اور صاحبِ وقت بھی۔ بقول حضرت غوثِ پاکؒ: "اولیاء کرام وہ ہستیاں ہیں جن کے نفوس پر نفخِ صور ہو چکا ہے۔ انہوں نے اپنی ہمتوں سے دُنیا سے مُنہ موڑ لیا ہے اور اپنی تصدیق کے ساتھ پُل صراط سے گذر چکے ہیں۔ وہ سیرِ جنّت کر کے بابِ جنّت پر تھم گئے ہیں۔ گویا دنیا کی طرف واپس کئے گئے ہیں۔ یہ لوگوں کو اللہ کی عبادت کی طرف بُلاتے ہیں، اور اُن کے لئے ان کا کام آسان کرتے ہیں۔"

(وعظ محبوبِ سبحانی فتح الربانی صفحہ ۱۴-۱۵)

ایک جماعت جو بطور ان کے وزیر اور کارکن کی ہے وہ ابدال کہے جاتے ہیں۔ "یہ نام ان کا اس لئے پڑا ہے کہ مشیتِ ایزدی کے خلاف اپنا ارادہ نہیں

رکھتے۔ ظاہر پر حکم اور ظاہر پر عمل کرتے ہیں، پھر ایسے عمل کرتے ہیں جو انہیں کے ساتھ خاص ہیں۔ جب انہیں اپنی منازل اور درجات میں ترقی ملتی ہے تو امر و نہی کے بجالانے میں کوشاں ہوتے ہیں یہاں تک کہ وہ ایسی منزل میں پہنچ جاتے ہیں جہاں نہ امر ہے نہ نہی، اور وہ کسی کنج تنہائی میں حق تعالیٰ کے ساتھ غائب رہتے ہیں اور امر الٰہی کے بجالانے کے وقت حاضر ہوتے ہیں تاکہ کوئی حد حدودِ شرعی میں سے خراب نہ ہونے پائے۔" (فتح الربّانی صفحہ ۶۵)

واضح رہے کہ ابدال کا اختیار سلب ہو جاتا ہے۔ یہ سب کچھ شرعی حدود کی حفاظت کے ساتھ کرتے ہیں۔ یہ اللہ میں فانی اور خلقت میں حدودِ شرعی کی حفاظت کے ساتھ غائب ہیں۔ پھر اس حالت میں وہ کبھی دریائے قدرت میں غوطہ زن ہوتے ہیں اور اس کی موجیں اُن کو کبھی اُبھارتی اور کبھی ڈبوتی ہیں اور کبھی کنارے پر لا ڈالتی ہیں۔ ان کی مثال اصحابِ کہف کی جیسی ہوتی ہے جنہیں اللہ تعالیٰ ہی کروٹ دلاتا ہے۔ ان کی اپنی عقل و تدبیر و حس نہیں رہتی۔ وہ قرب و مہربانی کے گھر میں آنکھیں بند کئے ہوتے ہیں۔

(اقتباس از وعظ سبحانی صفحہ ۱۳۶)

اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ بندے جو کچھ کرتے ہیں اللہ کی مشیّت اپنے نبی کریمؐ کے اشارہ اور امر پر۔ واضح رہے کہ اب نبوّت ختم ہو چکی ہے، اب انوارِ رسالت اور نبوّت کی ترجمان یہی ہستیاں ہیں، جو مخلوق کے ہاتھ سے نہیں اللہ کے ہاتھ سے لیتے ہیں، اور جو اللہ سے پاتے ہیں وہ مخلوق پر خرچ کرتے ہیں۔

وہ جانتے ہیں کہ "فقر" ہی اُن کے نبی کریم صلّی اللہ علیہ وسلّم کے گلے کا ہار ہے، جو آپؐ سے ایک لمحہ جُدا نہ ہوا۔ اسی کو صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ نے اپنایا۔ اور اسی کے ذریعہ حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کی کیفیاتِ محبّت کے جویا ہوئے۔ سب کچھ حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم پر نثار فرما کر ایک گدڑی پر اکتفا

کیا۔ اور ظاہر و باطن کی یکائی کے ساتھ فقر کی کیفیت کو اپنا لیا۔ اولیاء کرام اسی فقر و محبّت کے عاشق ہوتے ہیں اور ہر بلا میں مبتلا ہو کر اپنی صداقتِ فکر و ایمان کا ثبوت دیتے ہیں۔ اُنہوں نے یہ انداز صدیق اکبرؓ اور علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ سے سیکھے ہیں اور اُنہیںؓ کے سلسلہ سے آج بھی یہ پہچانے جاتے ہیں۔

حضرت غوثِ پاکؓ فرماتے ہیں کہ "اولیاء کرام پوری خاموشی اور پوری گم نامی اور کامل اُنسیت میں رہتے ہیں۔ جب یہ حالت ان پر پوری ہو جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ انہیں قوّتِ گویائی عطا فرماتا ہے، ویسے ہی جیسے قیامت میں جمادات کو قوّتِ گویائی عطا فرمائے گا۔ نہیں بولتے جب تک بُلائے نہیں جاتے۔ نہیں لیتے جب تک کہ دیئے نہیں جاتے۔ نہیں خوش ہوتے جب تک خوش کئے نہیں کئے جاتے۔ ان کے دل فرشتوں کے دلوں سے مل گئے ہیں، جن کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: لَا یَعْصُوْنَ اللّٰہَ مَآ اَمَرَھُمْ وَیَفْعَلُوْنَ مَایُؤْمَرُوْنَ (یہ امرِ الٰہی سے سرتابی نہیں کرتے اور وہی کرتے ہیں جو اللہ حکم فرماتا ہے) یہ گویا پہلے مقامِ فرشتگی میں پہونچتے ہیں پھر اپنے علم و معرفت کے باعث فرشتوں سے بھی آگے نکل جاتے ہیں۔ اُن پر آفتیں ٹوٹ پڑتی ہیں لیکن اُن کے دل سالم رہتے ہیں۔" (فتح الربّانی صفحہ ۱۶۲ - ۱۶۳)

اُن کی نظروں کے سامنے مقامِ خلّت سے لے کر اپنے آقائے دوجہاں صلّی اللہ علیہ وسلّم کی حیاتِ مبارکہ ہوتی ہے جس کے وہ پروانے ہوتے ہیں۔ ان اولیائے کرام میں جو جس قدر سرورِ کائناتؐ سے قریب ہوا اُسی قدر اس کو بلندی ملی۔ وہی خواہ قطب الاقطاب، قطب، خواہ قلندر بنے، یہ مقام پایا کہ اُن کا ربط جبرئیلِ امینؑ کے ذریعہ اُن کی طرف رجوع ہوا۔

(فتح الربّانی، وعظ محبوب سبحانی صفحہ ۳۰۶)

ان کے رموز کا حال کوئی کیا کہے۔ ہاں، اللہ کے ایک عبدِ مقبول، حضورؐ

صلی اللہ علیہ وسلم کے شیدائی، حضرت مجدد الف ثانیؒ، جنہوں نے ان مراحل سے گذر کر اصحاب کرام اور اولیاءِ عظام کا ذاتی مشاہدہ فرمایا، اور مقامِ محبوبیت میں رسائی پائی وہی کچھ بیان کر سکتے ہیں۔ آپ اپنے ایک مکتوب میں جو آپؒ نے اپنے مرشد حضرت باقی باللہؒ کو لکھا تحریر فرماتے ہیں۔ یہ عرضِ احوال تعمیلِ ارشادِ شیخ میں ہے:

"جس مقام پر پہلے آپ کو دیکھا تھا جب حضور کے ارشادِ گرامی کے مطابق پھر اسی کو ملاحظہ کیا تو خلفاءِ ثلاثہ (یعنی حضرت صدیقِ اکبر، حضرت عمر فاروق و حضرت عثمانِ غنی رضی اللہ عنہم) کا گذر اس مقام پر نظر آیا لیکن چونکہ یہ خادم اس مقام پر اقامت و قرار نہیں رکھتا تھا اس لئے پہلی دفعہ میں (یہ حضرات) نظر نہ آئے تھے جیسا کہ ائمۂ اہلِ بیت میں سے حضرت امام حسن، امام حسین، امام زین العابدین رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین کے علاوہ دوسرے ائمہ اس مقام پر قرار و ثبات نہیں رکھتے لیکن ان کا گذر اس مقام پر واقع ہوا ہے جس کو بڑی دقیق نظر سے معلوم کیا جا سکتا ہے۔ (حضرت مجدد الف ثانیؒ مکتوب ۱ صفحہ ۵۸)

(پھر) دوسری مرتبہ ملاحظہ کے وقت دوسرے مقام ایک دوسرے کے اوپر ظاہر ہوئے (جن میں سے بعض بعض کے اوپر تھے) نیازمندی اور عاجزی سے توجہ کرنے کے بعد جب اس خادم کو اس پہلے مقام میں رسائی حاصل ہوئی تو معلوم ہوا کہ یہ مقام حضرت ذوالنورین (حضرت عثمان غنیؓ) کا مقام ہے، اور دوسرے خلفاءؓ کو بھی اس مقام میں عبور واقع ہوا ہے۔ اور یہ مقام بھی تکمیل و ارشاد کا مقام ہے۔ اور اس طرح سے اس مقام کے اوپر دو مقام بھی ہیں جن کا اب ذکر کیا جاتا ہے، تکمیل و ارشاد کے مقام ہیں (یعنی) اور اس مقام کے اوپر ایک اور مقام نظر آیا، جب اس مقام میں رسائی حاصل ہوئی تو معلوم ہوا کہ وہ حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کا مقام ہے اور دوسرے خلفاءؓ کا بھی اس

مقام میں عبور واقع ہوا ہے۔ اور اس مقام کے اوپر صدیق اکبرؓ کا مقام ظاہر ہوا اور اس خادم کو بھی اس مقام میں بھی (عبور کے طور پر) رسائی حاصل ہوئی، اور اپنے مشائخ (یعنی اپنے سلسلے کے بزرگوں) میں سے حضرت خواجہ نقشبند (خواجہ بہاء الدین نقشبندی بخاری قدس اللہ سرہ) کو ہر مقام میں اپنے ہمراہ پاتا تھا..... اس مقام (یعنی حضرت صدیق اکبرؓ کے مقام) کے اوپر آنحضرت خاتم الانبیاء علیہ الصّلوٰۃ والسلام کے مقام کے علاوہ اور کوئی مقام معلوم نہیں ہوتا۔ اور حضرت صدیق اکبرؓ رضی اللہ عنہ کے مقام کے برابر ایک نہایت عمدہ نورانی مقام ظاہر ہوا جس کے مانند کبھی دیکھنے میں نہیں آیا تھا اور وہ مقام اس مقام سے اس قدر بلندی پر تھا جیسا کہ چبوترے کی سطح کو زمین سے کچھ اونچا بناتے ہیں، اور معلوم ہوا کہ یہ مقام محبوبیت کا مقام ہے، اور وہ مقام رنگین اور نقش والا تھا۔ اس خادم نے اپنے آپ کو اس مقام کے پرتو سے رنگین اور منقش محسوس کیا۔ اور اس کے بعد اس کیفیت میں اپنے آپ کو لطیف پایا اور ہوا کے مانند بادل کے ٹکڑے کی طرح چاروں طرف افق میں پھیل گیا.......“

(مکتوب ۱۱، مکتوبات شریف جلد اوّل صفحہ ۶۱)

یہ وہ بزرگ ہیں جنہیں خبر مشاہدہ کروادی جاتی ہے، آیاتِ قرآنی اُن پر کھل جاتی ہیں۔ کیا یہ مشاہدہ سورۃ الفتح آیت ۹۹ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ وَ مَعَہٗ سے آخر تک ان مدارج کا ترجمان نہیں لیکن جن پر کھلا وہ ان کی اس تربیتِ قلب و نظر کا ثمرہ ہے، جو آستانۂ نبی کریمؐ سے اللہ کے پسندیدہ بندوں کو ان سلسلے کے بزرگوں کے ذریعہ نصیب ہوتا ہے۔ اور فَضَّلْنَا بَعْضَھُمْ عَلٰی بَعْضٍ کی تفسیر ہے۔ ہم تو خاکِ پائے اولیاء ہی کہلانے کے حق دار بن سکیں تو بڑی خوش نصیبی ہو گی، اُن کے مقام کا عبور تو اللہ والوں میں سے بھی اس کی برگزیدہ ہستیاں ہی کرتی ہیں۔

ہم نے جو کچھ اولیاء عظام کے متعلق مختصراً عرض کیا اس کا مقصد صرف یہ ہے کہ فیضانِ نبوت و رسالت کی کوئی جھلک ہی ہمیں نصیب ہو جاتے۔ اور ہمیں اس حقیقت کے اعتراف میں ذرا تردد نہ ہو کہ یہ بزرگ و برگزیدہ ہستیاں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے نورِ مبین کی تنویریں ہیں، وہ روشن چراغ ہیں جو قلوب کو روشن کئے ہوئے ہیں اور انہیں برگزیدہ بزرگوں کے واسطہ سے نورِ مبین صلی اللہ علیہ وسلم کی تجلیات آج بھی ہم تک پہونچ رہی ہیں، اور آج بھی جب ہمیں ان میں سے کسی کا فیضانِ نور نصیب ہو جائے تو بلا تردد اس پر ایمان لے آئیں، اور اس کو معرفتِ الٰہی کا وسیلہ سمجھیں، اور ان کی اتباع و محبت کو ایمان جانیں ۔

خواجۂ من، قبلۂ من، دینِ من، ایمانِ من
من بقربانت شوم، اے یوسفِ کنعانِ من

حضرت محی الدین شیخ عبدالقادر جیلانی قدس اللہ سرہٗ

حضرت شیخ عبدالقادرؒ جیلانی جو غوثِ اعظم کے نام سے مشہور ہوئے، حسنی حسینی سیّد ہیں۔ آپ نے اس عالمِ رنگ و بو میں ۴۷۱ھ میں قدم رکھا۔ آپ کے والد بزرگوار کا وہ واقعہ جو ایک سیب کے کھانے سے متعلق ہے، اور آپ کے بچپن کا وہ واقعہ جو ڈاکوؤں کے ساتھ پیش آیا اور جس طرح ان ڈاکوؤں کے سردار کے لئے موجبِ ہدایت ہوا، آپ کے ایک ولیٔ کامل ہونے کی اوّلین شہادت ہے۔ آپ کے متعلق مشہور روایت ہے کہ آپ کا قدم ہر ولی کی گردن پر ہے، جو آپ کی بلندیٔ مراتب پر شاہد ہے اور اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ آپؒ حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباعِ کامل اور معرفتِ تامہ کا ایک کامل نمونہ ہیں، جس میں اتباع، علم، عرفان، محبت

غم خواریٔ امت سب شامل ہیں۔

آپ کو ایک ایسے نازک دَور میں ہدایت کی ذمہ داری سونپی گئی جب عالم اسلام کے زوال و انحطاط کا دَور شروع ہو چکا تھا۔ بظاہر اسلامی سلطنتوں کے اقتدار کا سلسلہ اندلس سے لے کر ہندوستان تک پھیل چکا تھا لیکن قوم کا باطن کرم خوردہ اور کھوکھلا ہو رہا تھا۔ فسق و فجور، سیاسی ابتری، اخلاقی انحطاط اپنی انتہا کو پہونچ چکے تھے جس کی اصلاح کی ضرورت تھی تاکہ لوگوں کو نفس پرستی سے نکالا جائے اور خدا پرستی کے ذوق سے نوازا جاتے۔ یہی کارِ رسالت تھا اور یہی کارِ ولایت ہے۔ کہ ولی اپنے آقا کا غلام ہوتا ہے، بلکہ ان کے غلاموں کا غلام۔ روحانی انحطاط کے ساتھ یہ دَور ذہنی انحطاط کا بھی شکار ہو چکا تھا۔ قرامطہ اور باطنیہ فرقے نیز اہلِ اعتزال اور علماءِ سُوء کی سازشوں نے بغداد میں ایک ادھم مچا رکھا تھا۔ ہر روز بے شمار مشائخ علماء و امرا اور دیگر سرکردہ مسلمان ان باطنیہ فرقوں کی سازشوں سے دوچار رہتے یا شہید ہوتے۔ چنانچہ سلجوقی وزیر نظام الملک طوسی اور اس کے بعد سلجوق کے فرماں روا ملک شاہ نے انہیں فتنہ پردازوں کے ہاتھوں جامِ شہادت نوش کیا۔ اور انہیں کے ہاتھوں اسلامی عقائد کی دھجیاں اُڑائی گئیں۔ خود اس دَور کے علماءِ اسلام ان سے متاثر ہو کر بتدریج دین سے دور ہو رہے تھے یا اپنے کو مجبور پاتے۔

مؤرخین کے علاوہ محققین نے بھی اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے کہ اس زمانہ کے مسلمانوں کے مختلف گروہ شیعہ، سنی، حنبلی، اشعری، مناظرات میں مصروف تھے، جن میں دشنام طرازی کی بھی نوبت آ جاتی تھی۔

شاید یہی وہ دَور تھا جس کے متعلق احادیث میں آتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: غربت و افلاس کا تمہارے متعلق مجھے خوف نہیں، بلکہ مجھے اس بات کا ڈر ہے کہ تم پر دنیا کے دروازے کھول دیئے جائیں گے اور پھر جیسے

پہلی امتوں میں مقابلہ کا بازار گرم ہوا، تم بھی اسی حالت میں مبتلا ہو جاؤ گے "
یعنی اس حالت میں اغیار نہیں بلکہ خود مسلمان مسلمان کو ختم کرنے کے درپے
ہوں گے۔ (بحوالہ مہر منیر صفحہ ۲۹)

چنانچہ اس دور میں نورِ مبین صلی اللہ علیہ وسلم کی تجلیات کو عام کرنے
کے لئے جس ولیٔ کامل کا بارگاہِ ربّ العزت سے انتخاب ہوا وہ شیخ کامل
غوثِ اعظمؒ ہی تھے۔ آپؒ کے زہد و تقویٰ، اتباعِ رسولؐ، محبت سرورِ کائناتؐ
آپؒ کی کرامات، آپؒ کا دردِ اُمت، قادر کلامی اور اثر انگیزی پر تاریخ کے
صفحات گواہ ہیں۔ زمانے کا تقاضا تھا کہ ایسا ہی ولیٔ کامل بھیجا جائے جو
حکمت کے ساتھ قدرتِ الٰہی کا ترجمان ہو، عبدہٗ کے ساتھ رسولہٗ کا نمونہ
ہو، جس سے قدم قدم پر کرامات صادر ہوں اور جس کے حرف حرف سے
باطل کے بُت ٹوٹتے جائیں۔ جو باطنیت کا "باطلی قوتوں" کا مقابلہ "حقیقی
قدرتِ خفی" سے کرے، اور امت کو راہِ حق کی جانب لے جانے کا موجب ہو
غوثِ پاکؒ نے حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی امانت کے اس
بار کو جس خوبی، جرأت، عزم اور استقلال سے اُٹھایا، اس کے نقوش آج بھی
اُن کے گروہ کے خلفاء میں باقی ہیں۔

حضرت غوثِ پاکؒ نے اس انحطاطی دور میں جہاں ولایت کے عملی
مظاہر پیش کئے وہاں اپنی مجالس میں اپنی تقریروں اور عالمانہ وسعتوں سے
اسلام کے اُن حقائق سے پردے اٹھائے جس کے لئے صرف علم کافی نہ تھا،
بلکہ جس کا سرمایہ زہد و تقویٰ کے ساتھ ذوق و شوق، وجد و حال، محبت و معرفت
ہوتا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے غوثِ پاکؒ کو ایک ایسی فطرت
سے نوازا جو اَلْمُتَوَحِّشُ عَنْ غَيْرِ اللهِ وَالْمُسْتَأْنِسُ بِاللهِ تھی
(یعنی وہ فطرت جو خدا کے سوا ہر ایک سے گریزاں اور خدا ہی کا اُنس و محبت

اختیار کرتی ہے) اور اسی فطرت کا ثمرہ تھا کہ آپؐ نے تَخَلَّقُوْا بِاَخْلَاقِ اللّٰہِ (یعنی آپ اپنے کو اللہ کے اخلاق میں ڈھال لو) کا نمونہ بن کر دکھایا اور عوام کے لئے ناسوت سے ملکوت تک کی شریعت کی حرفاً حرفاً اپنے قول و عمل میں ترجمانی کی، ہر سطحِ زندگی پر ناسوت سے لے کر ملکوت اور جبروت تک کی راہیں استوار کیں، پھر اسی کمالِ اتباع و محبت کے ساتھ مرتبۂ جبروت سے لاہوت کی یافت کے دریچے خواص کے لئے کھولے۔

ارباب ذوق کا بیان ہے کہ لاھوت وہ عالم ہے: "جس کی عزت عرش، جس کی کبریائی کرسی، جس کی قدر لوح، جس کی قضا قلم، جس کی عظمت آسمان، جس کا کیوان قہر، جس کا برجیس لطف، جس کا بہرام جلال، جس کا آفتاب جمال، جس کی آگ غضب، جس کا پانی رحمت، جس کی مٹی حکمت، جس کی بقا لایزال ولم یزل ہے۔"

(رسالہ غوث الاعظم: ترجمہ حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز، صفحہ ۱۹)

حقیقت یہ ہے کہ پرتوِ رسالت کی ان عظمتوں کی نشان دہی ہم جیسے گنہگاروں پر کرنے والے یہی بزرگ ہیں جو ان منازل کا عرفان رکھتے ہیں، ان سے گذرے ہوئے ہیں۔ ان کے ذوق و لطف اس راہ کی دشواریوں اور صعوبتوں سے آگاہ ہیں۔ یہی انوارِ رسالت، یہی تجلیات نورِ مبینؐ کی کچھ جھلک عام کرنے کے حق دار ہیں۔ خوش نصیب ہے کہ ان سلاسل سے جس کو تعلق مل جائے اور پھر اپنے ظرف کی بساط کے مطابق ان حقائق و معارف سے آگاہی پائے۔

لا الٰہ الا اللّٰہ محمد رسول اللّٰہ

---

۱ رسالہ غوثِ اعظم مترجمہ استادِ محترم حضرت قاضی احمد عبد الصمد فاروقیؒ

حضرت غوثِ پاکؒ کی مجالس کا یہ حال ہوتا کہ آپ کے وعظ میں کثیر تعداد میں لوگ شرکت کرتے اور لوگوں پر وجد کا عالم طاری ہو جاتا۔ اور ایک ہی مجلس میں ہزارہا انسان آپ کے دستِ مبارک پر توبہ کرکے شاہراہ ایمان پر آجاتے۔ ان تمام موقعوں پر آپ سے قدم قدم پر کرامات کا ظہور ہوتا جو لوگوں کے دلوں میں گھر کر جاتا۔ اور آپ کا اندازِ محبت و رحمت ان کو اپنے آقائے دو جہاںؐ کی تجلیات، اسوۂ حسنہ، اخلاقِ حمیدہ سے قریب کرنے کا موجب ہوتا۔

ہر چند

آپ کے بعد بغداد میں تاتاریوں کا حملہ ہوا اور اس ولیٔ کاملؒ کی ہدایات و کرم نوازیوں سے غفلت کا ان کو سبق ملا لیکن یہ بات بھی قابلِ حیرت ہے کہ حضرت غوثِ پاکؒ کے روحانی فیض اور مساعیٔ جمیلہ کا اثر یہ ہوا کہ لوگوں کی بے توجہی کے باوجود اسلام کا چراغ گل ہونے کے بجائے اور روشن ہو گیا اور خود تاتاریوں نے اسلام قبول کیا۔ جس کا ذکر مورخین نے کیا ہے۔

یہ واقعہ بھی دلچسپی سے خالی نہیں کہ تاتاریوں کے غلبہ کے بعد اشارۂ غیبی کے تحت، سلسلۂ قادریہ کے ایک بزرگ، ہلاکو خاں کے بیٹے تگودار خاں کے پاس پہنچے۔ وہ شکار سے واپس آیا تھا اور اپنے دروازہ پر ایک درویش کو دیکھ کر باندازِ تمسخر کہا "اے درویش! تیری داڑھی کے بال اچھے ہیں یا میرے کتے کی دم؟" آپ نے برجستہ جواب دیا "میں اپنے مالک کا کتا ہوں۔ اگر میں اپنی جاں نثاری اور وفاداری میں اسے خوش کر پاؤں تو میری داڑھی کے بال اچھے ہیں ورنہ آپ کے کتے کی دم اچھی ہے، جو آپ کی فرمانبرداری کرتا ہے۔"

تگودار خاں پر آپ کی اس انداز گفتگو کا یہ اثر ہوا کہ اس نے آپ کو اپنا مہمان رکھا اور آپ کی تعلیم و تبلیغ سے اسلام قبول کیا۔ (مہرِ منیر صفحہ ۳۳)

مختصراً

عرض یہ کرنا ہے کہ یہ صرف ایک شخص کی ہستی کی ایک جھلک ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کے غلاموں کے ایسی خدا جانے کتنی عظیم ہستیاں ہیں جو روح کی سطح سے بھٹکی ہوئی انسانیت کے لئے موجب ہدایت ہوئی ہیں۔

بعض نا سمجھی سے اعتراض کر دیتے ہیں کہ حضرت غوث پاکؒ کو اہل بیت سے قلبی تعلق میں کچھ کمی تھی۔ وہ خود حسنی و حسینی سیّد تھے۔ ہم یہاں انؒ کی نعت کے چند اشعار نقل کرتے ہیں:

کفایت است زروحِ رسولؐ اولادش ۔۔۔ ہمیشہ وردِ زبان جملۂ مہمّا تم
زغیرِ الِ نبیؐ حاجتے اگر طلبم ۔۔۔ روا مدار یکے از ہزار حاجا تم
چو ذرّہ ذرہ شود ایں تنم بہ خاکِ لحد ۔۔۔ تو بشنوی صلوات از جمیعِ ذرّا تم
کمینہ خادمِ خدّام خاندانِ تو ام ۔۔۔ زِخادمیِ تو دائم بود مبا جا تم
سلام گویم و صلوٰت بر تو ہر نفسے ۔۔۔ قبول کن بہ کرم ایں سلام و صلوا تم

اُنہیں ولایتِ عظمٰی پر سرفرازی اِنہیں حسین ابن علی جانِ اولیاء کے توسّط سے ہوئی ہے اور بقول حضرت شاہ عبدالعزیز محدّث دہلویؒ: "اہل بیت سے محبت تو فرائضِ ایمان سے ہے۔" ہمارے فرائض میں داخل ہے۔ اس کے ترک کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ (فتاویٰ عزیزی صفحہ ۳۸۰)۔

حضرت غوثِ پاکؒ کی تائیدِ غیبی، کشف و کرامات، مراتبِ عظمٰی کا مختصر سے مختصر بیان ممکن نہیں۔ ہماری غرض تو ان عظیم ہستیوں کی جانب آپ کی توجّہ مبذول کرنا ہے، جو اپنے زمانہ میں بھی پرتوِ نورِ مبینؐ رہے اور آج بھی جن کے فیوض و برکات لاکھوں قلوب کو نورِ ایمان سے منوّر کر رہے ہیں۔

آج مسلمانوں کی کثیر تعداد جو ہند و پاکستان میں ہے کسی بادشاہ کی کسی سعی کا نتیجہ نہیں۔ بلکہ نتیجہ ہے" ایک داتا گنج بخشؒ، ایک خواجہ اجمیریؒ، ایک

حضرت بہاء الدین زکریاؒ" اور اُن کے بے شمار مریدین و معتقدین کی سعیٔ پیہم کا۔

○

ہم یہاں مختصراً چند عظیم ہستیوں کے ذکر پہ اکتفا کریں گے، جن کی زندگی نورِ مبین صلّی اللہ علیہ وسلّم کا پرتوِ عرفان، جن کا ماحول فیضانِ رسالت کا ترجمان، جو بے سہاروں کا سہارا، جو غم زدوں کے غم گسار، جو سالکِ راہِ معرفت کے لئے "سراجِ مُنیر" جو ویرانِ قلوب کے لئے نورِ مبینؐ کی تجلیات کے ضامن ہیں اور یہ مختلف منازلِ عرفان سے متعلق ہیں، ہم اُن کا بیان کیا کرسکتے ہیں جو ہماری فہم سے بالاتر ہیں، البتہ یہ جانتے ہیں کہ ان کی محبت ہی عین ایمان ہے۔

حضرت خواجہ معین الدّین چشتی رحمۃ اللہ علیہ

حضرت غوث پاکؒ نے اگر منزلِ لاہوت کی سیر سے سرفرازیاں بخشیں تو حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے مقامِ دنیٰ فتدلّٰی کے راز سے آگاہ فرمایا۔ بتایا کہ محبت کسے کہتے ہیں۔ محبت کی وابستگی وارفتگی کی لذّت اس کے اسرار اور اثرات کیا ہوتے ہیں، اور اس کا مقام کیا ہوتا ہے، اس کی بادشاہت قلوب پر کیسی ہوتی ہے۔

سلطانِ عربؐ کے نُورِ نظر، سلطان الہند غریب نواز خواجہ معین الدینؒ اہلِ ہند کی زبان میں "پریم دیوتا" بن کر آئے اور مسلمانوں کے لئے اپنے اللہ کے رسولؐ کے شیدائی بن کر چمکے، جہاں لاکھوں کفار آپ کی عظمت، آپ کے اخلاق آپ کی صداقت، آپ کے اندازِ محبت سے متاثر ہو کر مشرف بہ اسلام ہوئے۔

واضح رہے کہ ان بزرگ ہستیوں کا کسی مقام کسی شہر میں قیام فرمانا، ان کی اپنی خواہش سے نہیں ہوتا۔ انہیں تو دربار رسالت پناہؐ سے جس مقام

کے لئے انتخاب فرمایا جاتا ہے، وہ وہیں پہنچ جاتے ہیں۔ اور حکم ہی نہیں ہوتا بلکہ وہاں کی ضروریات کے پیشِ نظر، انہیں ان جملہ صلاحیتوں سے نواز دیا جاتا ہے جو اس ملک اور وہاں کے معاشرہ میں مبلّغِ دین کے لئے ضروری ہیں۔ چنانچہ حضرت خواجہؒ بھی ایسے ہی حکم کے تحت آئے۔ پہلے لاہور میں حضرت داتا گنج بخشؒ کے مزارِ مبارک پر چلّہ کش رہے، پھر اجمیر کا رُخ کیا۔ اور اس ظلمت کدہ میں نورِ عرفان کی شمعیں روشن کیں۔

آپ نے اسی ملک کے رسوم و رواج کو اسلامی شریعت کا جامہ پہنایا۔ ہندوستان کفر کی بستی تھی، ہزارہا دیوتاؤں اور بتوں کی پوجا ہوتی، قوم متعدد اور مختلف توہمات کا شکار تھی۔ حضرت خواجہؒ نے اپنی بے شمار کرامتوں سے اُن کے فرضی دیوتاؤں کی عاجزی و مجبوری لوگوں پر ظاہر فرمائی اور اپنے قول و فعل سے اسلام کی برتری کا سکّہ ان کے دلوں پر بٹھایا۔ یہی نہیں بلکہ ان کے بھجن اور گانے جو اِن کو اپنا گرویدہ بنائے ہوئے تھے، ان کو شریعت کا رُخ دے کر سمع نوازی سے نوازا۔ اور یہی موسیقی جو انہیں کفر کے غار میں دھکیل رہی تھی، اب ایک نیا رُخ پا کر ظلمت سے نور کی طرف لانے کا موجب بن گئی۔ حضرت خواجہؒ نے اس راز کو آشکارا فرمایا کہ نغمہ اور صوت ہی تو سازِ فطرت ہے۔ اس کو شرک کی آلودگی سے اگر محفوظ رکھا جائے اور مزامیر کی پابندیوں سے نجات دلا دی جائے تو یہ حصولِ مقصد کا ذریعہ بن جاتا ہے، لحنِ داؤدی کی یادیں تازہ کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج بے شمار بزرگوں میں، بالخصوص چشتیہ سلسلہ میں سمع کو ایک بلند مقام حاصل ہے۔ پھر خواجہؒ نے اپنی پاک مجالس، اپنی معصوم، پاکیزہ، پُر نور زندگی، اپنے جذبۂ خدمتِ خلق اور اپنی بلا امتیاز محبت اور اپنے اخلاق، زہد، تقویٰ، ریاضت سے ایک کافرانہ معاشرے کا وہ کون سا دھارا تھا جس کو اسلام اور توحید مطلقہ کی طرف نہ موڑ دیا ہو۔ اللہ کی یاد کے طریقے،

صدق و محبت کے اصول، شغلِ محبت کا انداز، شعائر اللہ کی عظمت، مجاہدات کی تعلیم اور آیاتِ قرآنی کی تفسیر خود دین کر نہ دکھائی ہو۔ اور اپنی ان پُر نور پُر فیض مجالس میں لوگوں کو اذکار و اعمال، تسبیح و تہلیل، درود و سلام، منازلِ سلوک، مقام محبت و معرفت، تَخَلَّقُوْا بِاَخْلَاقِ اللّٰہ کا درس، صبر و توکل کا مقام، زندگی و موت کی حقیقت سے آگاہی نہ بخشی ہو۔ اور یہ سب کچھ اس طرح ہوتا کہ آپ کے ارشادات لوگوں کے قلوب موہ لیتے۔ کفار کو ظلمت سے نور میں کھینچ لاتے۔

بتانا یہ ہوتا

کہ عارف ایک آفتابِ ہدایت ہوتا ہے جو سارے جہاں کو روشن کرتا ہے اور اپنی یہ روشنی اور تجلّی اسی نورِ مبین صلی اللہ علیہ وسلم سے حاصل کرتا ہے ویسے ہی جیسے حضورؐ سے قبل کے انبیاء علیہم السلام حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے حاصل فرماتے رہے۔ سمجھانا یہ ہوتا کہ اسی نورِ مبین صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت ان اولیاء کرام کا ایمان، انؐ کی اتباع، انؐ کی شریعت، اللہ کے لئے جینا، اللہ کے لئے مرنا ان کی زندگی کا منتہائے نظر رہتا ہے۔ اور اسی نورِ محمدیؐ میں انہیں نورِ حق کی تجلیات، ذوق و شوق، وجد و حال کی کیف سامانیاں ہر لمحہ ایک نئی شگفتگی سے میسّر آتی رہتی ہیں۔ غرض

محبّت کے بندے محبّت کے ہاتھوں ؛ نہ پوچھو جو شام و سحر دیکھتے ہیں

آپؒ کے سلسلہ کی

وہ عظیم ہستیاں عالمِ امکان میں چراغِ مصطفوی بن کر آئیں اور خدا جانے کہاں کہاں ان کی نورانی شعاعیں اور کرنیں موجبِ ہدایت بن کر پہنچیں۔ ان میں حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ، حضرت بابا فرید الدینؒ گنج شکر، حضرت نصیر الدین چراغؒ، حضرت محبوبِ الٰہی نظام الدین اولیاءؒ، حضرت بابا صابر کلیریؒ، حضرت بندہ نواز گیسو درازؒ اور وہ بزرگ ہستیاں ہیں، جن کے نام نامی آج بھی

ہر مومن کے لئے راحتِ جاں ہیں۔ اور آج بھی لاکھوں مسلمان اس سلسلۂ چشتیہ سے منسلک عالم کے گوشہ گوشہ میں پھیلے ہوئے ہیں۔

یہ سب فیضانِ نورِ مبین صلّی اللہ علیہ وسلّم نہیں تو کیا ہے۔

حضرت شہاب الدین سہروردی قدس اللہ تعالیٰ روحہٗ

یہ شعلۂ پُر نور، یہ ستارۂ روشن، عراق کی سرزمین پر اس وقت ظاہر ہوا جب حضرت شیخ عبد القادر جیلانیؒ کا دورِ عروج تھا اور انہیں کے انوار و تجلیات سے سرفراز ہوا۔ یہ وہی زمانہ ہے ہند کی سرزمین جو کفر کا ظلمت کدہ بنی ہوئی تھی اور جہاں نورِ معرفت، نورِ توحید کے چراغ حضرت خواجہؒ روشن فرمانے کے لئے بھیجے گئے تھے۔ اور اس دور میں جب عراق کی بستی گو مسلمانوں سے آباد تھی لیکن ان میں اکثر کے قلوب ہنوز ویران تھے تو اس کی اصلاح کا کام حضرت سہروردی کے سپرد ہوا۔ اگر غوثِ پاکؒ کو یہ فخر حاصل تھا کہ وہ حسنی و حسینی سیّد ہیں تو حضرت سہروردیؒ کو اس نعمتِ عظمیٰ سے سرفرازی تھی کہ آپؒ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی اولاد میں سے تھے۔

غرض چھٹی صدی ہجری کے یہ نامور صوفی حضرت شیخ شہاب الدین ابوحفص عمر رحمۃ اللہ علیہ شعبان کے مہینے میں ۵۳۹ھ ہجری میں زنجان کے مضافات میں قصبہ سہرورد میں پیدا ہوئے، اور یہ گمنام مقام بھی آپؒ کی بدولت عالم میں مشہور ہوا۔ آپؒ سولہ واسطوں سے حضرت صدیقِ اکبرؓ سے متعلق ہوتے۔

(عوارف المعارف صفحہ ۱۰۳)

تمام تذکرہ نویس اور قدیم مشائخِ عظامؒ کے تذکرہ نگار اس بات پر متفق ہیں کہ حضرت شیخ الاسلام ابوالنجیب عبد القاہر سہروردی، جو آپؒ کے عمِ محترم تھے، کو حضرت غوثِ زماں سیّد عبد القادر جیلانی رضی اللہ عنہ سے ایک خاص

عقیدت تھی، اور جب بارگاہِ غوثیت میں تشریف لے جاتے تو عزیز برادر زادہ کو بھی لے جاتے۔ اس طرح وہ خود بھی حضرت غوثِ پاکؒ کے عقیدت مندوں میں سے تھے اور یہی عقیدت و محبت حضرت غوثِ پاکؒ سے ان کے بھتیجے کو پیدا ہوئی۔ چنانچہ مشہور ہے کہ ایک بار جب حضرت شہاب الدینؒ اپنے چچا کے ساتھ حضرت شیخ عبدالقادرؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ کے چچا نے حضرت شیخؒ سے فرمایا کہ اس فرزند (شہاب الدینؒ) کو علم کلام سے بڑا لگاؤ ہے۔ حضرت غوثِ اعظمؒ نے حضرت شہاب الدینؒ سے دریافت فرمایا کہ تم نے علم الکلام کی کون کون سی کتابیں مطالعہ کیں۔ یہ فرما کر اپنا دستِ مبارک شیخ الشیوخ (حضرت شہاب الدینؒ) کے سینہ پر پھیرا، تو اسی دم علم الکلام کے تمام مباحث اور کتابوں کے نام آپؒ کے ذہن سے محو ہو گئے، اور آپ جواب نہ دے سکے۔ اس وقت سیدنا غوثِ اعظم رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ہم نے تمہارے سینہ میں سے علم الکلام کو محو کر دیا اور اس کے عوض معرفتِ حق کے علم سے اس کو معمور کر دیا ہے۔ آپؒ حضرت غوثِ پاکؒ کی خدمت میں حاضر ہوتے رہے اور آپ سے بے شمار روحانی فیض حاصل فرماتے، اور حضرت غوثِ پاکؒ سے ان الفاظ میں خراجِ تحسین پایا: یَا عُمَر! اَنْتَ اٰخِرُ الْمَشْهُوْرِيْنَ بِالْعِرَاق (اے عمر تم عراق کے آخری مشہور انسان ہو)۔

حضرت غوثِ پاک کے وصال (۵۶۲ھ) کے بعد بغداد کی روحانی مسندِ رشد پر آپؒ کے چچا حضرت شیخ النجیب سہروردی فائز ہوئے، اور آپ نے سلسلۂ بیعت اپنے عم محترم سے قائم فرمایا۔ اور ابھی ایک ہی سال گذرا تھا کہ ۵۶۳ھ میں چچا نے بھی وصال فرمایا، اور یہ ستونِ اسلام جو اربعہ ستونِ معارف میں شامل ہونے کے لئے قدرت کے ہاتھوں پروان چڑھ رہا تھا مسندِ رشد و ہدایت پر جلوہ افروز ہوا۔" (اقتباس از عوارف المعارف صفحہ ۱۰۵، اور ۱۰۶)

امام یافعیؒ آپؒ کو "استادِ زمانہ، مطلع الانوار، منبع الاسرار، دلیل الطریقہ، ترجمان الحقیقت، استاد الشیوخ، قدوۃ العارفین" کے القاب سے یاد فرماتے۔
(نفحات الانس، مولانا جامیؒ، صفحہ ۵۰۱)

حضرت شیخ الشیوخؒ کے دستِ مبارک پر نہ صرف لاکھوں نے بیعت کی بلکہ آپؒ سے ایک ایسا سلسلہ وجود میں آیا جو ظاہر و باطن کا سنگم تھا۔ آپ کی ملاقات علماء و مشائخ سے بھی ہوئی اور خضر علیہ السلام سے بھی اور پھر جب کوئی اشکال پیش آتا تو طوافِ کعبہ فرماتے اور وہ دُور ہو جاتا۔

آپؒ کی مشہور کتاب عوارف المعارف جو اس وقت منظرِ عام پر آئی جب ایک طرف باطنیت سر اُٹھا رہی تھی اور دوسری طرف طوائف الملوکی کا زور تھا، اور یہ دور ایک سیاسی ابتری اور انتشار کا دور تھا۔ شیخ الشیوخ کو شاید زمانہ کو یہ بتانا تھا کہ مسلمانوں کو ہر دور میں ایسے حالات سے سامنا کرنا پڑے گا، کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ شجرِ عرفان کے ظاہر و باطن کو نظر انداز کرنے لگیں اور خود ہی اپنے کو گردابِ بلا میں مبتلا کرنے کے موجب ہوں۔ اور شاید یہ بھی ظاہر کرنا تھا کہ اگر تمہارا باطن ایک پیالے کی طرح معرفتِ الٰہی سے لبریز ہو، پھر بھی جب میدانِ کارزار میں نکلو تو گھوڑے پر بیٹھ کر بھی یہ خیال رہے کہ پیالہ چھلکنے نہ پائے۔ دیکھو! کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہارا باطن ہی ویران ہو جائے اور تم ظاہر کی غلامی کے بعد عیش پرستی میں پڑ جاؤ۔

ایک شخص نے حضرت شیخ الشیوخؒ سے دریافت کیا کہ اے میرے سردار! اگر میں عمل چھوڑتا ہوں تو فضول باتوں میں پڑ جاتا ہوں، اور اگر عمل کرتا ہوں تو غرور آ جاتا ہے۔ آپؒ نے جواب لکھا: عمل کرو اور توبہ کرو۔

لوگوں نے شیخ سعدالدین حموی سے پوچھا کہ شیخ محی الدین ابن العربیؒ کو تم نے کیسا پایا ہے۔ فرمایا بَحْرٌ مَوَّاجٌ لَانِهَايَةَ لَهٗ یعنی وہ ایک موجزن سمندر تھے جس کی انتہا نہیں۔ پھر پوچھا کہ شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کو کیسا پایا۔ فرمایا

نُوْرُ مُتَابَعَۃِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ علیہ وسلم فِیْ جَبِیْنِ سُہْرَوَرْدِیْ شَیْئًا اٰخر

"سہروردی کی پیشانی میں نبی صلّی اللہ علیہ وسلّم کی متابعت کا نور ایک اور ہی قسم کا ہے۔"

(نفحات الانس صفحہ ۵۰۲)

یہ ستارہ بھی جو فروغِ تجلیٔ ایمان وعرفان تھا ۶۳۲ھ میں نظروں سے اوجھل ہو گیا، لیکن اس کی روشنی سے فیض یاب ہونے کا ایک سلسلہ دنیا میں آج تک قائم ہے۔ اور ماشاء اللہ سلسلۂ سہروردیہ سلسلۂ نقشبندیہ کی طرح کمالِ اتباعِ شریعت کا حامی ہی نہیں بلکہ اس کا مظہر بھی ہے۔

آپ نے دیکھا کہ وہ نجوم جو دورِ رسالت کے پروردہ آسمانِ ہدایت پر چمکے، حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کے پردہ فرمانے کے بعد کس طرح مومنوں کے قلوب کو نورِ عرفان سے منوّر کرنے کے لئے بے تاب ہیں۔ وہ جو ستاروں کے مثل تھے، اور آقائے دوجہاں صلّی اللہ علیہ وسلّم کے نورِ مبین سے فیض یاب تھے۔ اور اب یہ جو زمین پر ہیں وہ قلبِ رسول کریمؐ سے متعلّق ہیں، انہیں صلّی اللہ علیہ وسلّم سے فیضانِ معرفت حاصل کر رہے ہیں۔

جس نورِ مبینؐ کا پرتو حضرت شیخ الشیوخؒ کی پیشانی پر جلوہ نما تھا، اس کے انوار عالم میں خوب خوب عام ہوئے۔ آپؒ ہی کے خلفاء میں حضرت بہاء الدین زکریا ملتانیؒ ہیں، جن کا مزارِ مبارک آج بھی مرجعِ خلائق ہے، جن کی ہستی نہ صرف ملتان کے لئے بلکہ ہند کے دور دراز خطّوں کے لئے ایک مینارِ نور بنی رہی۔ سندھ اور بلوچستان کو تو آپؒ کی روحانی سلطنت کہا جاتا تھا۔ حضرت سہروردیؒ کے خاندان کے ایک روشن چراغ آپؒ کے بھانجے شیخ فخر الدین ابراہیم المعروف بہ عراقی، جو ایک خدا رسیدہ بزرگ تھے آپؒ کے سلسلہ کے فروغ میں معاون ہوئے۔ غرض سہروردی سلسلہ میں نہ صرف علم وعرفان کے چشمے نکلے بلکہ مختلف سلاسل مثلاً جلالی، مخدومی قائم ہوئے، جو آج بھی رائج ہیں۔

حضرت مجدّد الف ثانی قدس سرہٗ

سلسلہ نقشبندیہ کے امام طریقت حضرت سید بہاء الدین نقشبندی بخاریؒ ہیں۔ آپ کا اسمِ گرامی محمدؐ، کنیت بہاؤ الدّین اور نقشبند تھا۔ آپ امام حسن عسکری کی اولاد میں سے ہیں۔ کمخواب بافی کے پیشہ کی وجہ سے یا اس لئے کہ آپ پہلی ہی صحبت میں سالک کے دل پر ماسوئ کا نقش مٹا کر اللہ تعالیٰ کا نقش دل پر جما دینے کی وجہ سے، اس لقب سے مشہور ہوئے۔ ہم ان کے ذکر کے بجائے اُن کے سلسلہ کے مجدّدِ الفِ ثانیؒ کی تعلیمات کی طرف توجہّ دلانے کی سعادت حاصل کر رہے ہیں، اس لئے کہ جس دَور سے ہم گذر سے اور گذر رہے ہیں وہ آپ کی تعلیمات وتجلّیات کی عکاسی کر رہا ہے۔

جیسا پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ اس عظیم گروہ کا تعلّق براہِ راست سرورِ کائنات صلّی اللہ علیہ وسلّم سے ہے، اور وہ آپؐ ہی کے نور وانوار کی تجلّیات کے لئے دربارِ رسالت پناہ سے ان کو منتخب کیا جاتا ہے، برگزیدگی کی سند سے نوازا جاتا ہے اور جہاں جو تغیّر لانا منظور ہوتا ہے اور جن امراض کی اصلاح ضروری سمجھی جاتی ہے اور جس طرف وہاں کی قومی زندگی کو رُخ دینا ہوتا ہے، اسی کی مناسبت سے ان پُراسرار ہستیوں کو رحمتِ عالمؐ کے فیوض وبرکات سے نوازا جاتا ہے۔ گویا یہ سب شعاعیں ہیں اسی آفتابِ رسالتؐ، اسی ماہتابِ نبوتؐ کی۔ اسی لئے جب باطن کی اصلاح اور تصورات کو فلسفیانہ کج بحثوں سے نکالنا ہوتا ہے تو کسی عبدِ قادر کو بھیجتا ہے، کہیں کفر کی ظلمتوں کو دور کرنا ہوتا ہے تو کسی نورِ نظر کو بھیجا جاتا ہے اور کہیں مجاہدہ کی لذّتوں سے سوتی ہوئی قسمتوں کو بیدار کرنا ہوتا ہے تو کسی سیلِ رواں، کسی شاہِ آب، شہاب الدین سہروردیؒ کو بھیجا جاتا ہے۔ اور جب یہ منظور ہوتا ہے کہ بھٹکی ہوئی انسانیت کو اس کے

اصل فریضے سے آشنا کیا جائے یعنی:

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ۔

اور اس عبادت میں خلوص کے انداز پیدا کئے جائیں، تو ایک ہستی کو مجدّد کی حیثیت سے بھیجا جاتا ہے، جو تجدید محبت و اخلاق شریعت کے دامن سے وابستہ رہ کر کرنا سکھائے۔ اپنے کو بالکل اپنے رب کے حوالہ کر کے، ہر تکلیف کو بخوشی برداشت کر کے، "عبدیت" کے مفہوم کو واضح کرے۔

قادرِ مطلق کو علم تھا کہ جو زمانہ آنے والا ہے اس میں انسان اپنے علم کے باعث سرکشی کی جانب مائل ہوگا۔ وہ سب کچھ اپنی عقل کے پیمانے سے جانچنا اور ناپنا چاہے گا۔ وہ خود اپنی خودی میں چوُر ہوگا۔ وہ عقل اور عقلِ کُل کے فرق سے غافل ہو جائے گا، اور اپنے نبیٔ برحق صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت کے اعتراف کے لئے اس وقت کا منتظر ہوگا جب وہ حقائق خود اس پر کُھل جائیں۔ وہ عبد اور عبدہٗ کے مفہوم سے محروم ہو جائے گا وہ انسان اور الانسان کی تفہیم میں کوتاہی کرے گا اور مبتلائے عذاب ہو جائے گا۔ اس لئے ضروری تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کے انوار کے ساتھ ہی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے عبدہٗ ہونے کی عظمتوں سے لوگوں کو آشنا کیا جائے تاکہ وہ اپنا جیسا دیکھ کر، وہی دھوکہ نہ کھانے لگیں جو کفارِ مکہ نے کھایا تھا۔

گویا

جس ہستی کو اس اہم فریضہ کے لئے بھیجا جا رہا ہے اس کے دو کام ہوں گے۔

۱۔ تصوّف کی اصلی حقیقت کو اجاگر فرمائے اور اس کے نورانی جامہ پر جو گرد جم رہی ہے اس کو صاف کرے۔ توحید کے جامہ کی گرد وہی ہے جو فہم توحیدِ مطلقہ میں مانع ہو۔

۲۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مقامِ عبدیت کو اللہ کے بندوں پر روشن فرما دے

اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بس اتباع و محبت، پیروی سنت، کی طرف ان کو بلائے۔

چنانچہ اس کے لئے

ہند میں سرہند کی زمین کا اور دورِ اکبر و جہانگیر کا زمانہ انتخاب ہوتا ہے کہ ان دونوں بادشاہوں کے دور میں الحاد اور تعیش عام ہوا۔ (اکبر کا زمانہ ۹۶۳ سے ۱۰۱۴ھ تک ہے اور جہانگیر کا دور ۱۰۱۴ سے ۱۰۳۷ھ تک) وہی اکبر جو ابتدائی دور میں صوفیہ کرام کا قدر دان اور علماء کی عزت کا دلدادہ تھا اور علماء و مشائخ کی صحبت میں رہ کر ایک راسخ العقیدہ مسلمان بن گیا تھا۔ حضرت بابا فرید الدین گنج شکرؒ، حضرت خواجہؒ کے مزار مبارک پر حاضری دیتا تھا۔ بلکہ بعض وقت حضرت خواجہؒ کے دربار پر پا پیادہ حاضر ہوتا۔ پھر جب بگڑتا ہے، ایسا بگڑتا ہے کہ کلمۂ کفر اس کی زبان پر آتا ہے اور اس کے درباری اس کو انانیت کے بحرِ ذخار میں غرق رکھنے کے لئے ہر وقت کوشاں رہتے ہیں۔ اکبر کے تذبذب سے فائدہ اٹھاتے ہوئے دربار میں مختلف مذاہب اور مسالک کے جو گمراہ کن عناصر تھے، انہوں نے اس کو بحرِ ظلمات میں لا ڈالا۔ اور ہندوؤں کی پوجا سے لے کر اس کو اس کے نعرۂ الحاد تک پہنچا دیا۔ (یعنی اللہ اکبر کے معنی ہی بدل دیئے)

اس دورِ الحاد میں ایک درویشِ باصفا، شبِ جمعہ، ۱۴ شوال ۹۷۱ھ مطابق ۱۵۶۴ء، اس عالم رنگ و بو میں تشریف لائے۔ آپ کا اسم گرامی احمد، لقب بدر الدین، کنیت ابو البرکات، اور منصب مجددِ الفِ ثانی تھا۔ آپؒ کا نام، کنیت، لقب، سب اس جامعیت کی طرف راہ نما ہے جو آپؒ کی پیدائش کا منشاء تھا۔ اور سرہند کی زمین کو آپ کی تشریف کے لئے انتخاب کیا گیا۔

حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے مناقب اور حالات پر بہت

سی کتابیں ہیں۔ ہم نے حضرت مولانا سید زوّار حسین صاحبؒ کی کتاب "حضرت مجدّد الف ثانیؒ" سے استفادہ کیا ہے۔ ان امور کی جانب راہنمائی حاصل کرنے کے لئے جس کے لئے ایک پاسبانِ شریعت کو ہند کے عظیم فتنوں سے مقابلہ کے لئے بھیجا گیا تاکہ وہ نورِ مبینؐ کے اندازِ عبدہٗ سے لوگوں کو آگاہی بخشے، اور مومن کے تصوّرِ عبدیت کو پیش کرے۔ چنانچہ اس کتاب "حضرت مجدّد الفِ ثانیؒ" نے جن دو امور کی طرف نورِ مبینؐ کے سلسلہ میں توجّہ مبذول کرنا ہے، وہ یہ ہیں:

۱۔ جب ان فتنوں کا مقابلہ ہو جو خود مسلمان حکمران اور ان کے امروں کے ہاتھوں ہو رہے ہوں تو صدق، اخلاص، عزم، جرأت اور حوصلہ سے ان کے مقابلہ کے ساتھ شریعتِ محمّدی صلّی اللہ علیہ وسلّم کا دامن تھامے رہنا چاہیئے۔

۲۔ دوسرے اس اہم حقیقت کو مسلمانوں پر ظاہر فرمانا تھا کہ تسخیر کائنات کا ذریعہ علم ہے اور تسخیرِ قلوب کے لئے سرورِ کائنات صلّی اللہ علیہ وسلّم کا خُلقِ عظیم تمہارا سرمایۂ عظیم ہے۔ تم اس سے ہرگز غافل نہ ہو۔ اور اس کے حصول کا طریقہ آپ کی اتباع کے سوا کچھ نہیں، وہ اتباع جو حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کی سچی محبّت میں ڈھلی ہوئی ہو۔

حضرت مجدّدؒ نے پہلے خود تحصیلِ علوم پر زور دیا اور پھر اخلاق کی آراستگی بزرگوں کی نظرِ التفات سے حاصل کی۔ اور ایک مردِ کامل حضرت باقی باللہؒ کے دستِ مبارک پر ۱۰۰۸ھ میں بیعت کی سعادت حاصل کر کے سلوک کے منازل طے فرمائے، جو تعلیم ذکرِ ذات سے شروع ہو کر فنا کے حقیقی اور مرتبۂ جمع الجمع اور مرتبۂ فرق بعد الجمع پر منتہی ہوئے۔

حضرت مجدّد کے اسی مقام، مرتبۂ فرق بعد الجمع، کی حقیقت اور اس کی رفعت کا بیان ایک عاجز کیا کر سکتا ہے۔ لیکن یہ عرض کرنے کی جسارت

ضرور کرے گا کہ یہی وہ مقام تھا جس کی طرف بھٹکی ہوئی انسانیت کی راہنمائی کے لئے شریعت کی عظمتوں سے آگاہی بخشنا قدرت کو منظور تھا۔ اور یہ بتانا تھا کہ شریعت ہی ابتداء ہے اور شریعت ہی انتہا۔ جو فعل امر الٰہی کے تحت نہ ہو وہ شریعت کا جزو نہیں بن سکتا۔ اور جو اس کے خلاف ہو وہ کم از کم بدعت اور آگے چل کر کفر کی سرحدوں سے مل سکتا ہے۔

حضرت باقی باللہؒ کی رہنمائی میں حضرت مجدد الف ثانی نے یہ منازل طے کرنے کے بعد ضروری سمجھا کہ اب اکبر کی اصلاح کی طرف قدم اٹھایا جائے، جس نے لوگوں کو اپنے سامنے سر جھکانے پر مجبور کر دیا تھا۔ آپ نے اپنے معتقدین کے ذریعہ بادشاہ کے پاس پیغام بھیجے لیکن اس کا اس پر اثر نہ ہوا۔ بلکہ اکبر کے حضور سجدہ نہ کرنے پر ان پر طرح طرح کے ظلم و ستم روا رکھے جانے لگے۔ آپ کی بیعت کی تاریخ ۱۰۰۸ھ ہے اور اکبر کی وفات کی تاریخ ۱۰۱۴ھ ہے۔ اکبر کی اصلاح کے لئے آپ کو بہت کم وقت ملا۔ لیکن جو کام اکبر کے دور میں شروع ہوا تھا وہ جہانگیر کے دور میں انجام پذیر ہوا۔ اکبر کے دور میں یہ ضرور ہوا کہ ہزارہا انسانوں نے حضرت مجدد الف ثانیؒ کے ہاتھوں پر بیعت کی۔ اور قدرت کی طرف سے خود اکبر کو غفلت سے بیدار کرنے کے لئے اس کی وفات سے چند سال قبل طاعون کی وبا آئی۔ اور جس سال اس کی وفات ہوئی اس کے کچھ ہی دن پہلے عین دربار کے وقت نہایت تند و تیز ہوائیں چلیں اور ایسا طوفان آیا کہ شاہی دربار کا خیمہ اکھڑ گیا، لوگوں کے سروں پر اس کی چوٹیں لگیں، بادشاہ بچ گیا تاکہ اس دنیاوی جاہ و حشم کی تجارت گری کے بعد خود اپنا انجام ملک الموت کے ہاتھوں دیکھ لے۔

اکبر کی وفات کے بعد لوگ خوش تھے کہ شاید اب اس الحاد سے نجات

ملے گی۔ لیکن جہانگیر کے طور و اطوار کچھ بہتر نہ تھے۔ ادھر حضرت مجددؒ کی خدمت میں ہزاروں کی تعداد میں لوگوں کا حاضر ہونا اس پر شاق گذرتا تھا۔ جہانگیر کے مقربین نے اسے بھڑکایا اور مجددؒ کے لئے جلاوطنی اور قتل کے مشورے ہونے لگے۔ جہانگیر آپ سے متاثر تھا لیکن اس کے متعلقین اپنی سازشوں سے غافل نہ تھے۔ ایک موقع پر بادشاہ نے ناراض ہو کر حضرت مجددؒ سے کہا کہ مجھے سجدہ کرو۔ آپ نے فرمایا کہ میں سوائے اللہ تعالیٰ کے کسی کو سجدہ نہیں کرتا۔ بعض معتقدین نے سمجھایا کہ سجدۂ تعظیمی بجالائیں۔ آپ نے انکار فرمایا۔ آخر بادشاہ نے کہا کہ ان کو کہو کہ ذرا سر جھکا دیں۔ آپ نے وہ بھی نہ کیا۔ پھر حکم دیا کہ لوگ ان کا سر خم کر دیں۔ تمام مقربین مل کر بھی آپ کے سر کو نہ جھکا سکے۔ وہ سر اللہ کی قدرت سے عزم کا ایک پہاڑ بنا رہا۔ پھر ایک چھوٹا سا دروازہ بنایا گیا کہ اس میں سے جھک کر آئیں۔ لیکن آپؒ نے اس میں داخل ہونے کے لئے بجائے سر کے پہلے پیر ڈالے۔ آخر آپ کو گوالیار کے قلعہ میں قید کر دیا گیا۔ ہر سمت پہرا تھا۔ آپ کا ایک معتقد جو صاحبِ کرامات بھی تھا، آپ کو دیکھنے کے لئے مضطرب ہوا اور باوجود ہر طرح کی روک اور پہرول کے، آپ کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ آپ نے اس سے پوچھا تم کیسے آئے۔ یہاں تو سب طرف پہرہ ہے۔ اس نے عرض کی کہ میں نے "اللہ اکبر" کہا اور داخل ہو گیا۔ آپؒ نے جواب دیا کہ کیا تم سمجھتے ہو کہ مجھے اللہ اکبر کہنا نہیں آتا۔ جاؤ۔ واپس جاؤ۔

بتانا یہ تھا کہ اللہ کی راہ میں تکلیف اٹھا کر ہی انسان عظمت کا مقام پاتا ہے، اور عام انسانوں کے لئے حق کی بانت اور رضائے الٰہی کے در کھولتا ہے، جس کی ایک مثال حضرت زین العابدینؓ کے واقعہ میں گذر چکی ہے۔

آخر جہانگیر نے ایک دن حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب

میں دیکھا کہ آپ فرما رہے ہیں "جہانگیر تم نے کتنے بڑے شخص کو قید کر رکھا ہے"۔ جہانگیر کانپ گیا اور فوراً حضرت مجددؒ کی رہائی کا حکم دیا اور وہاں سے رہائی کے بعد آپ سے چند دن اپنے ساتھ رہنے کی درخواست کی۔ حضرت مجددؒ کا بادشاہ کے ساتھ قیام اس کی تغییرِ حال کا موجب ہوا۔ وہ ظاہری اور باطنی پاکیزگی کی طرف مائل ہوا، تمام لغویات سے قطع تعلق کر کے آپ کا غلام ہو گیا۔ سجدہ تعظیمی موقوف ہوا۔ گاؤکشی کی اجازت ہوئی۔ جو مساجد منہدم کر دی گئی تھیں ان کی تعمیر پھر سے کی گئی۔ دربارِ عام کے قریب ایک خوبصورت مسجد تعمیر ہوئی۔ ہر شہر اور قصبہ میں تعلیم کے لئے مکاتب اور مدرسہ قائم ہوئے۔ شہر میں انصاف کے مفتی، محتسب اور قاضی مقرر کئے گئے۔ جو قوانین خلاف شرع تھے سب منسوخ کئے گئے اور رسوماتِ جاہلانہ کو ختم کیا گیا۔ یہی وہ تعلیم، احتساب عدل گستری اور فروغِ دین کی حدیں تھیں جن کو مسلمانوں میں عام کرنے کا بیڑا حضرت مجدد الف ثانیؒ نے اٹھایا تھا اور اسے اپنے ہی دور میں ایک ظالم و عیش پرست بادشاہ کے زمانہ ہی میں پایۂ تکمیل کو پہنچا دیا۔

یہاں دو امور کی طرف

حضرت مجددؒ کی حیاتِ مبارکہ اور طرزِ عمل دعوتِ فکر دے رہا ہے۔

۱۔ اکبر کے دور میں مجدد الف ثانیؒ کا فریضہ بیشتر طور پر عوام کی اصلاح سے منسلک رہا، اور آپ نے مقامِ عبدیت کی تشریح فرماتے ہوئے کسی بھی کرامت سے کام نہ لیا۔ بلکہ یہ بتلایا کہ جب انسان اللہ پر بھروسہ کرتا ہے تو اس کی مدد خود اس کے شاملِ حال ہو جاتی ہے۔ چنانچہ اکبر کے آخر دور میں طاعون کی وبا، اور وفات سے چند دن قبل خیموں کا اکھڑ جانا لوگوں کے سامنے آپ کی تعلیمات کے عینی شواہد تھے۔

۲۔ دوسرے جہانگیر کے دور میں خود تکلیفیں اٹھا کر یہ بھی عوام و خواص پر روشن

کر دیا کہ جب کسی ولی کو آستانۂ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی خدمت سپرد ہوتی ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نظرِ التفات، اس کے شاملِ حال رہتی ہے۔ ہر حال میں۔ کبھی قلوب کو مسخر کرنے میں، کبھی شواھدِ ظاہری سے اور کبھی رُویا کے ذریعہ۔ چنانچہ جہانگیر جیسے عیش پرست کے خواب میں حضورؐ کا تشریف لانا اور مجدّد الفِ ثانیؒ کی عظمت کا اس سے ذکر فرمانا، ایک طرف اپنے فرستادہ ولی کی صداقت کی گواہی ہے تو دوسری جانب آپ کے مشن کی تکمیل کی ضمانت بھی کہ جہانگیر نے خود ہی توبہ کی اور ایک اسلامی زندگی کا ازسرِنو آغاز ہوا۔

۳۔ یہ بھی واضح فرمانا تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت اگر قدرت اور حکمت ہے تو آپ حضورؐ کی اس حکمت کے ترجمان ہیں جو تالِ قدرت ہے۔

وَمَنْ يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا ؕ (البقرہ ۲۶۹)

اور جسے حکمت (دانش و بنیش، معاملات کی سمجھ، عقلِ معاد و معاش) سے نوازا گیا اسے خیرِ کثیر عطا ہوئی (یعنی بھلائی جس کی حد نہیں)۔

صلّوا علیہ و آلہٖ

حضرت مجدّدؒ سے جس قدر علوم و عرفان کے چشمے عام ہوئے ان کا احاطہ ممکن نہیں۔ خود آپؒ کی اولاد میں اولیاء کبار ہوئے جنہوں نے اس جہان کو روشنی بخشی، اور پھر آپؒ کے بے شمار خلفاء اور مریدین آپؒ کے سلسلہ کے فروغ میں ہنوز کوشاں ہیں۔ ہم یہاں صرف اُنؒ کے صاحب زادے خواجہ محمد معصوم قدس سرّہٗ کی حیات کی طرف آپ کی توجہ مبذول کریں گے جو ایک کتابی صورت میں "انوارِ معصومؒ" کے نام سے شائع ہوتی جن کے احوال سپردِ قلم ہوئے وہ تو عروۃ الوثقیٰ تھے ہی، لیکن جس نے ان حالات کو سپردِ قلم کیا یعنی حضرت مولانا زوّار حسین شاہؒ وہ بھی اس سلسلہ کی مستحکم کڑی ہیں، جنہوں نے اس سلسلہ کے متعلق گراں قدر خزائنِ معرفت کا اضافہ کیا ہے۔

نجمِ وحدت

حضرت قبلہ محمدؐ عبید اللہ خاں درّانی قدس اللہ سرہٗ

واضح ہو کہ جس طرح ائمہؒ کے چاروں سلسلہ ایک دوسرے سے جدا نہیں بلکہ اپنے اپنے انداز سے شریعت مطہّرہ کے ترجمان ہیں، اسی طرح تصوف کے یہ چاروں سلاسل اپنے اپنے طور سے اصلاحِ حال کے معاون ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر بزرگوں نے ان چاروں سلاسل کے منازلِ سلوک سے گذر کر، ان کے فیوض حاصل کئے، اور بعض نے کسی ایک یا دو سے اپنے کو متعلق رکھا۔ منشاء صرف یہ تھا کہ ان کے اعمال ترجمانِ حکمت یعنی شریعتِ مطہّرہ کی راہ نما، اور ان کا وجود اللہ کی قدرتِ کاملہ کی طرف نشان دہی کرے اور امّتِ مرحومہ کی اصلاحِ حال کا کام روح کی سطح پر ان اولیاءِ کرام کے ذریعہ ہو اور جوارح کی سطح پر علماءِ عظام کے ذریعہ جاری رہے۔

ان سلاسل سے متعلق اور ان سے غیر متعلق اولیاءِ عظام کی تعداد کا تعیّن کون کر سکتا ہے۔ ہر زمانہ میں اور ہر جگہ اُن کی باصفا جماعت اپنے اپنے انداز سے، مختلف خدمات کی انجام دہی پر مامور ہے۔ اور یہ سب ایک ہی نورِ مبین صلّی اللہ علیہ وسلّم سے فیض یاب ہیں اور انہیںؐ کے حکم کے تابع، بلاواسطہ یا بالواسطہ۔ ہم صرف اپنے دور کے ایک آخری "نجمِ وحدت" کے ذکر پر اکتفا کریں گے، جن کی وابستگی پاکستان بننے سے قبل سے لے کر ۱۹۹۰ء تک رہی۔ یہ دور جو پاکستان کے لئے ایک ابتلا کا دَور تھا، اس مردِ کاملؒ کا فریضہ اس "دیوارِ یتیم" کو سہارا دینا تھا۔ چنانچہ جس جس سہارے کی ضرورت پڑی، وہ اپنی جان کی بازی لگاتا رہا۔ وہ تابعِ امرِ ربیّ تھا اور شیدائی رسولؐ حضور سرورِ کائنات صلّی اللہ علیہ وسلّم کو اس سرزمینِ ہند سے جس خوشبو کی بشارت

مل چکی تھی اس کے لئے ایک انقلاب آفریں فضا چھوڑ کر اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں پہ حاضر ہو گیا۔ اس کا کام اتنا ہی تھا۔

اس کا تعلق خانقاہی زندگی سے نہ تھا بلکہ اس کی ظاہری تعلیم کالجوں اور یونیورسٹیوں میں ملک کے اندر اور باہر ہوئی تھی۔ اور اس کا باطن خدا جانے کن کن منازل سے گذرتا ہوا، حضرت بابا تاج الدینؒ ناگپوری اور حضرت بابا قادرؒ وجے نگری کے بحرِ بیکراں سے ٹکرایا۔ اور یہیں سے ان فرائض کی انجام دہی کے لئے، جن کا تعلق بنیادی طور سے پاکستان سے لیکن مجموعی حیثیت سے بلادِ اسلامی سے تھا، اپنے کو مستعد کیا۔ اور جب پاکستان وجود میں بھی نہ آیا تھا اس نے مستقبلِ قریب میں بننے والے ملک کے لئے ان سائنس والوں کی ایک عظیم جماعت تیار کر دی جو اس کے ہر شعبۂ زندگی کی تعمیر کے لئے اوّلین معاون بنے۔ اور جب پاکستان بن گیا تو اس نے اپنی ٹیکنیکی صلاحیتوں کے ساتھ اخلاق کی آراستگی، فرض شناسی، خدمتِ خلق، بالخصوص غم گساری کو اپنی راہِ عمل بنایا۔ اور محض محبّت اور خلوص کی بنیادوں پہ اپنے کام کی ابتداء فرمائی اور کن آفتوں سے اسے بچاتے ہوئے۔ ایک صبح غسل فرمایا، عطر لگایا، سفید کپڑے زیبِ تن کئے اور چادر اوڑھ کر لیٹ گیا۔ پھر کب وہ واصلِ حق ہوا، اس کا علم اللہ ہی کو ہے۔

○

اس مردِ درویش کا نام نامی اسمِ گرامی حضرت بابا محمد عبید اللہ درّانی قدس اللہ سرہٗ تھا۔ ان کو ملک کے اندر اور باہر ہزار ہا حضرات جانتے ہیں لیکن چند ہوں گے جو ان کو پہچانتے ہیں، کثیر تعداد ان کی ہو گی جو نہ جانتے ہیں نہ پہچانتے ہیں۔ ان کی زندگی کا ایک ظاہری خاکہ "دُرِّ عَیْنی" کے نام سے شائع ہوا

ہے جس کے مؤلف اُن کے ایک محب محترم ولی الدین صاحب ہیں۔ اس کتاب کے ایک مختصر تعارف سے شاید حضرت بابا درّانی صاحب کے حالاتِ زندگی کی طرف کچھ رہنمائی ہو جائے اور ان کی شخصیت، ان کی روحانی رفعتوں کا کچھ اندازہ کیا جا سکے۔ حضرت ولی الدین صاحب کتاب کے متعلق رقم طراز ہیں:

دُرِّ عینی کیا ہے؟

بظاہر یہ ایک معروف شخصیت محترم محمد عبید اللہ خاں درّانی صاحب، سابق پروفیسر انجینئرنگ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اور سابق پرنسپل انجینئرنگ کالج پشاور کی سوانح حیات ہے۔

لیکن درحقیقت

یہ وہ آنسو ہے جو غمِ امت کا ترجمان ہے اور یہ ایک درویشِ باہوش کی سرگزشت ہے جس نے زندگی کی تلخیوں سے گذر کر، اس کی حلاوتوں کو اپنایا ہے۔ جس کے سینہ میں نورِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کی شمع فروزاں ہے اور جو اسی شمعِ ہدایت کی روشنی میں اپنے باطن سے لے کر اپنے گرد و نواح اور کائنات کو دیکھتا اور سمجھتا ہے۔

اس کے لئے

کل کائنات اپنے ظاہر و باطن کے ساتھ، ایک یکائی ہے جہاں سے محبت کے چشمے پھوٹتے رہتے ہیں۔ دیدۂ بینا شرط ہے۔

اس کا حسین مشغلہ

امت کے دُکھ درد کو اپنانا، بنجر قلوب کو حیاتِ نو سے آشنا کرنا اُس کی ادائے خاص، اور تشنگانِ معرفت کی پیاس بجھانا جیسے اس کا کام تھا۔ اس کے لئے اس کے اپنے طریقے ہیں، یعنی زبانِ خاموش اور چشمِ گویا، جو دلوں میں گھر کر جاتی ہے۔

گویا

یہ ایک مرنے سے پہلے مرمٹنے والے کی داستانِ تگ و دو ہے جس پر زہد کے لباس کی جگہ خلوت خانۂ عشق کے انوار دمکتے ہیں۔

صلّی اللہ علی النبیّ الامّی و الہٖ۔

○

حضرت بابا دُرّانی صاحبؒ نے اپنے مرشد کے حکم کی بنا پر پشاور میں قیام فرمایا۔ اور اُس مقام کی تلاش میں رہے، جہاں سے اُنہیں اپنا پیغام فروغِ اسلام کے لئے، روحانی سطح سے عام کرنا تھا۔ بالآخر ایک دم توڑ پہاڑی کے اوپر، پیر بابا، بُنیر، سوات سے تقریباً پانچ میل دُور، چار سال کی مسلسل جدوجہد کے بعد وہ چٹان ملی جو بشارت میں دکھائی گئی تھی۔ یہی چٹان اس علاقہ میں پہلی مسجد بنی اور اس کے قریب وہ چشمہ ملا، جو چشمۂ فیض بنا۔ وہ فضائیں بھی ملیں جو یادِ الٰہی سے معمور تھیں۔ یہاں ان تمام سہولتوں کے ساتھ جو دورِ حاضر کے تقاضے ہیں، متعدد مکان، عمارتیں اور مسجد تعمیر کی گئیں۔ کیسے ان کے لئے سامان پہنچا، کیسے لوہے کے شہتیر پہونچے، ان کے بنانے والے معمار کیسے میسر آئے، کیسے بجلی پیدا کی گئی، کیسے اس کو منور کیا گیا، یہ کرامت سے کم نہیں۔ پھر اس کی فضاؤں کو تمثیلی رنگ میں کیسے تبدیل کیا گیا اور کتنے عظیم تغیّرات کا وہ موجب بنا ہے، یہ داستان تو لبد کا مورخ ہی لکھے گا۔ یہاں تو صرف اشارے ہیں۔

حضرت باباؒ کے آخری دَور میں اور ان کے جانے کے بعد ہی سے وہ تغیّرات ظاہر ہونا شروع ہو گئے، جن کی طرف بابا صاحب اشارہ فرما چکے تھے۔ اور اس عظیم تغیّر کا بھی، جس سے ان کے مشن کی تکمیل افغانستان کشمیر، ہند، بلادِ اسلامی اور روس میں ہونا تھی۔ اور بالآخر اسلام کے فروغ کا وعدہ،

اور عالمِ اسلام کے لئے پاکستان ہی کا مرکزِ حیات تو بننا، خواہ اسے کتنی ہی آزمائشوں سے گذرنا پڑے۔

حضرت بابا صاحب قبلہ کی زندگی کی خاموشیاں بحرِ ذخّار کی گہرائیوں سے زیادہ گہری تھیں۔ انفرادی سطح پر ان کا کام حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کی محبت کی خاموش چنگاری، قلوب کو عطا کرنا تھی۔ اور اجتماعی سطح پر اسی خاموشی کے ساتھ، ان عوامل کی کارفرمائی تھی، جو عظیم تغیّرات کی موجب بنیں، جو مشیئتِ ایزدی ہے۔ اپنی زندگی، غمِ امّت میں آنسو بن کر گذار دی، اور محض دعاؤں سے امّت کے سر سے وہ بلائیں دُور کرنے میں مصروف رہے، جو قربِ قیامت کی نشانیوں میں سے ہیں۔

یہ وہ ہیں جنہوں نے اپنے لئے اپنے رب سے کچھ نہ مانگا۔ گلی ہوئی ہڈیوں سے، ہر طرح کی ٹی بی میں مبتلا رہ کر، ایک ٹوٹے ہوئے ہاتھ سے ابتداءِ عمر سے ۸۳ برس کی عمر تک، متعدد بیماریوں کو مسکراتے ہوئے اٹھاتے رہے۔ لیکن دعائیں ہمیشہ دوسروں کے لئے اور امّت کے غمگین قلوب کے لئے کرتے رہے۔ اپنی شفقتوں سے دُکھے ہوئے دلوں کو تسلّی دیتے رہے اور خوب خوب دیتے رہے، امّت ہی کے لئے زندہ رہے امّت ہی کے غمگسار رہے، امّت ہی کے لئے حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کے قدموں سے لپٹے رہے، اور حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم ہی کے آستانہ کرم سے، حضورؐ ہی کی امّت کے لئے پاکستان کو مرکزِ فروغ بنانے کی تمناؤں کے ساتھ مصروفِ عمل رہ کر، ایک وعدہ پر ایقان کے ساتھ جان نذرِ جانِ جاناں کر دی۔ اور شنبہ ۹ جون ۱۹۹۰ء مطابق ۱۵ ذیقعدہ ۱۴۱۰ھ کو حیاتِ نو سے سرفرازی پائی۔

کشتگانِ خنجرِ تسلیم را | ہر زماں از غیب جانِ دیگر است

جب کبھی اس درویشِ باہوش پر کچھ لکھنے کے لئے قلم اُٹھایا تو روک دیا گیا

کہ نہ جانے اس قلم سے اس حجاب در حجاب مجاہد کی زندگی کا کوئی راز فاش نہ ہو جائے۔ البتہ جسے شوق ہو وہ ان کے ارشادات کا مطالعہ کرے جو بھائی ولی الدین نے خود ہی ترتیب دیئے ہیں اور اُن کے نام سے موسوم کئے ہیں۔ اگر حق کی تلاش ہو تو شاید وہ اس عاجز سے زیادہ سرفرازی پائے۔ اس میں حیاتِ قادر، کُن فیکون، WHITHER YE SADHU، خاص طور سے معاون ہو سکتی ہیں۔

○

حضرت بابا صاحبؒ نے فرمایا:

"کامل ہستی وہ ہے جس کا مقام رُوح ہیں، جس کا رابطہ غیب سے، اور جس کا تصرّف وجود پر ہو۔ یہ کامل ہستی مرکز ہے، منبعِ نور ہے۔ وہ امر باللہ ہوتا ہے۔

صلوا علیه و اٰله

مردِ حق از کس نگیرد رنگ و بُو — مردِ حق از حق بگیرد رنگ و بُو
ہر زماں اندر تنش جانے دگر — ہر زماں اُورا چو حق شانے دگر

(مولانا رومؒ)

(اقتباس از کن فیکون، ارشاد بابا دُرّانیؒ)

بات واضح ہے کہ جس ذاتِ مبارکہؐ کا ظہور عالم میں ہے، اور جس کا ظہورِ کامل ذاتِ آدم میں ہے، یہ نورِ محمدیؐ ہی ہے۔ جس قدر رُوح کا رُوح الرُّوح سے تعلق استوار ہوتا گیا، جس قدر ہم آہنگی آتی گئی، اسی قدر وہ خود نور بن گیا۔ یہی وہ ہستیاں ہیں جو مقامِ رُوح سے انسانیت کو ایک نیا رُخ باذنِ الٰہی دیتی ہیں، اور اُن کی معراج قدمِ رسولِ کریمؐ ہوتا ہے۔ مُدتوں میں کہیں کوئی ایسی ہستی پیدا ہوتی ہے۔ اس تک رسائی آستانۂ فیضؐ ہی سے ہوتی ہے، ورنہ

چلتے پھرتے تو اُسے سب ہی دیکھ سکتے ہیں۔ اور جن کی رسائی اُن تک ہوتی ہے وہ بھی اُنہیں نہیں جانتے۔ البتہ خوش نصیب ہیں جنہوں نے اُن کے فیضِ صحبت میں لیس وطٰہٰؐ کی خوشبو پائی ہے۔ اُن کا کام کرامات دکھانا نہیں، کرم فرمانا ہوتا ہے، غمِ امت اُن کا شعار ہوتا ہے، اور حجاب در حجاب رہ کر غمزدوں کی اشک شوئی کرتے رہتے ہیں اور مشیئتِ ایزدی کے تحت جمعیت کو ایک نیا رُخ دیتے رہتے ہیں۔ وہ خود اپنے آقائے دوجہاں صلی اللہ علیہ وسلم کی چشمِ مبارک کا ایک آنسو اور آپؐ کی آل کے غلام ہوتے ہیں۔ اور یہی نسبتِ محمدی اُن کا سہارا ہوتی ہے۔

مژدہ ہو کہ فرد ہوں یا جماعت، ان کے وعدے سچے ہوتے ہیں، اُن کی زندگی میں تمام تر یہی تمنا ہوتی ہے کہ خود حجاب میں رہ کر اپنے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کے انوار کو ظاہر کرتے رہیں۔ کہ جو کچھ ہیں وہیؐ ہیں، صلی اللہ علیہ وسلم۔

غرض

ان اولیاء اللہ کی جماعت میں محبوبین بھی ہوتے ہیں اور محبّین اور مخدومین بھی۔ اور انہیں میں غوث، اقطاب، اوتاد، اور ابدال جیسی ہستیاں بھی ہوتی ہیں۔ اور ان اولیاءِ کرام کی ایک بڑی جماعت ان افراد کی ہوتی ہے جن کا تعلق لوگوں کی اصلاح اور خدمتِ خلق سے ہوتا ہے۔ یہ وہ ہستیاں ہیں جن کو اسی عالم میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نظرِ التفات اور کرم نوازیاں میسّر آتی رہتی ہیں، جو ان کی ریاضت، محبت، عبادت کا ایک انعام ہوتا ہے، اور ان سے لوگوں کی عقیدت کا موجب۔ ہم ان میں سے ایک بزرگ کا مختصر حال پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہے ہیں، جو اولیاء کرام پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی کرم نوازی کے علاوہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کے ہر ہر فرد کے حال سے باخبر رہنے کا ایک جیتا جاگتا ثبوت ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم

کی رفعتِ شان پر شاھد ہے۔

○

حضرت چودھری غلام حیدر صاحب رحمۃ اللہ علیہ

حضرت چودھری غلام حیدر صاحب قبلہ ہوشیار پور (مشرقی پنجاب) میں ۱۹۰۰ء میں دنیائے فانی میں تشریف لائے اور اپنے کاموں سے فارغ ہو کر ۸ راگست ۱۹۸۸ء کو اسے خیر باد کہا اور رحیم یار خاں میں آرام فرمایا۔ آپ کا تعلق چشتی نظامی سلسلہ سے تھا۔ وہی قلبی محبت، روحانیت کی تڑپ، وہی نظم و ضبط جو اس خاندانِ چشت بہشت کا طریقہ ہے، آپ کا مزاج تھا۔ چودھری صاحب قبلہ نے اپنے شیخ محترم حضرت سائیں مراد علی شاہ چشتی نظامی رح سے شرفِ بیعت حاصل کیا اور حضرت بابا گاموں شاہ قادری سے حصولِ فیض فرمایا اور انہیں سے فیضانِ "سرِ الٰہی" نصیب ہوا۔

حضرت چودھری صاحب کا نصب العین افراد کی ہدایت تھی، جیسا کہ انہوں نے میرے ایک کرم فرما رانا سعید صاحب سے فرمایا:

"میں انشاء اللہ راہِ درویشی میں تمہاری دیکھ بھال اپنی بساط کے مطابق کرتا رہوں گا۔ مجھے نہ تو پیری مُریدی کا شوق ہے، نہ مرید بڑھانے کا۔ انشاء اللہ یہ فریضۂ درس و تدریس و تربیتِ سالکین، جس کا حکم مبارک مجھے براہِ راست نبی کریم صلّی اللہ علیہ وسلّم سے ملا ہے، میں فی سبیل اللہ کرتا رہوں گا۔ اور امتی و سالکِ عزیز کا نبی کریم صلّی اللہ علیہ وسلّم سے تعلق و رشتہ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے اور، اپنے آپ کو بیچ میں نہ لاتے ہوئے، جوڑنے کی کوشش کرتا رہوں گا۔"

محترم رانا سعید صاحب ایڈیشنل سیکرٹری حکومتِ پاکستان، سے مجھے

شرفِ نیاز کراچی میں اپنے مرحوم دوست فرید صاحب کے ساتھ حاصل ہوا تھا۔ رانا صاحب نے اپنے بزرگ محترم غلام حیدر صاحب سے اپنے تعلق کا ذکر فرمایا۔ میں نے ان سے درخواست کی کہ ان کا کوئی خاص واقعہ، جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے تعلق سے ہو، مجھے تحریر فرمائیں۔ جو ہماری کتاب نورِ مبین کی وضاحت میں معاون ہو۔ محترم رانا صاحب کی تحریر سے ایک اقتباس درجِ ذیل ہے:۔

"حضرت چودھری صاحب قبلہ بیان فرماتے ہیں۔ ایک دفعہ ذکرِ الٰہی اور درود شریف میں مشغول تھا، بہت دن گذر چکے تھے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت نصیب نہیں ہوئی تھی، دل بہت بے چین تھا۔ عشاء کے بعد کافی وقت گذر چکا تھا۔ اسی اثنا میں (عالمِ کشف میں) پرواز شروع ہوئی۔ چند ہی لمحوں میں مَیں مدینہ منورہ پہونچ گیا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تلاش کیا۔ آپؐ وہاں نہیں ملے۔ پھر مکّہ مکرمہ، عرفات، بیت المقدس اور بہت سی جگہوں کو چند ساعتوں میں عبور کر گیا، یہاں تک کہ پہاڑوں کے دامن، غار، دریاؤں کے کنارے ہری بھری وادیوں میں۔ الغرض جہاں جہاں سے مہک آتی، وہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تلاش کرتا۔ اور تھوڑے ہی عرصہ میں اس کرۂ ارض کا ایک ایک کونہ چھان ڈالا۔ اب دل نے گواہی دی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس کرۂ ارض پر جلوہ فرما نہیں۔ میں کافی تھک چکا تھا۔ اور اوراد و اذکار پر زیادہ توجہ دے رہا تھا۔ خیال آتا کہ شاید آج میری تقدیر میں یہ سعادت نہیں۔ مگر ہر آن فضا میں خوشبو اور تصرفِ مصطفوی علیہ السلام کی معطر لہریں، سرور کی کیفیات کو اجاگر کر رہی تھیں، اور طبیعت پر ہلکی ہلکی پُر کیف رقت طاری تھی میں اللہ تعالیٰ کی رحمت سے پُر امید تھا۔ اتنے میں ایک دلآویز وادی سے گذر ہوا اور میں کیا دیکھتا ہوں کہ ایک چمکدار نورانی

سیڑھی ارض سے عرش تک جاری ہے۔ بیں سیڑھی کے پاس چلا گیا۔

"سیڑھی بہت ہی خوبصورت نظر آرہی تھی۔ اس کے بازو اور ڈنڈے بہت چمک رہے تھے۔ میرا دل کہہ رہا تھا کہ یہ سیڑھی آسمان پر جارہی ہے۔ وہیں جہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم جلوہ فرما ہیں۔ میں آگے بڑھا اور سیڑھی کے ڈنڈے کو ہاتھ سے پکڑنا چاہا۔ مگر ہاتھ میں کچھ نہ آیا اور محض روشنی اور نورانی فضا کو مٹھی میں لے سکا۔ میں نے احتیاط کے ساتھ پھر ڈنڈے کو پکڑنا چاہا مگر میرا ہاتھ پھر نور ہی سے مس ہو کر واپس آیا۔ میں نے یہ کوشش تین بار کی لیکن ڈنڈے مجسم نہ ہوئے اور ہر بار ہاتھ خالی واپس آیا۔

"اتنے میں ایک بہت ہی پر وقار اور بارعب بزرگ فضا میں نمودار ہوئے اور مسکراتے ہوئے میرے سامنے تشریف لے آئے۔ مجھے سلام علیکم فرمایا اور پھر بتایا کہ "میں خواجہ خضر ہوں اور آپ کی مدد کے لئے آیا ہوں۔ بتائیے چودھری صاحب کیا پریشانی ہے۔" میں نے عرض کیا کہ میرا دل گواہی دے رہا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم آسمان پر تشریف فرما ہیں اور یہ سیڑھی اسی مقدس مقام کی طرف جارہی ہے۔ مگر میں ہاتھ ڈالتا ہوں تو یہ ڈنڈے مجسم نہیں ہوتے اور سوائے نور کے میری مٹھی میں کچھ نہیں آتا۔ خواجہ صاحب نے تبسم فرمایا اور کہا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت عرش معلیٰ پر تشریف فرما ہیں اور یہ نورانی سیڑھی وہیں جاتی ہے۔ آپ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پڑھ کر چمکدار ڈنڈوں کو پکڑیں۔ انشاء اللہ آپ کو کامیابی ہوگی۔ آپ چند ہی لمحوں میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے حضور پہنچ جائیں گے۔ میں (چودھری صاحب) نے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھ کر سیڑھی کے ڈنڈوں کی طرف ہاتھ بڑھایا اور اس بار اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے یہ ڈنڈے ٹھوس مجسم ہو گئے۔

اور پھر بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھ کر ڈنڈوں پر پیر رکھا اور ذکر اللہ، درود پاک، کلمۂ طیبہ، بسم اللہ کا ورد جاری رکھا تو چند ہی لمحوں میں آسمانوں پر سدرۃ المنتہیٰ کو عبور کرتا ہوا عرشِ کریم تک جا پہنچا۔ اور میں نے دیکھا کہ نبی کریم، رؤف رحیم، رحمتہ للعالمین، محبوب رب العالمین علیہ الصلوٰۃ والسّلام عرش کے وسط میں تشریف فرما ہیں۔ میرے دل و دماغ اور زبان سے درود جاری ہو گیا۔

الصّلوٰۃ والسّلام علیک یارسول اللہ الصّلوٰۃ والسّلام علیک یا حبیب اللہ
الصّلوٰۃ والسّلام علیک یا نبی اللہ

میں نذرانۂ درود و سلام پیش کرتا ہوا معاً عرش کے وسط میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمتِ اقدس میں پہنچ گیا۔ اور صلوٰۃ والسلام پڑھتے ہوئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں میں سر رکھ دیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے سر اور پشت پر اپنا یدِ شفقت پھیرا اور فرمایا کہ "ہم کرۂ ارض پر دیکھ رہے تھے کہ غلام حیدر زمین کے کونہ کونہ اور گوشہ گوشہ میں ہماری تلاش میں سرگرداں ہے۔ ہم نے چاہا کہ غلام حیدر کو ہمیں عرش پر بلا لیں اور خضر سے کہا کہ کرۂ ارض پر جائیں اور غلام حیدر کو یہاں لے آئیں۔ پھر تم نے سیڑھی اور "بسم اللہ" کے فیوض کا مشاہدہ کیا۔"

(چودھری صاحب فرماتے ہیں کہ) "مجھ پر سخت رقت طاری تھی۔ میں نے قدم مبارک سے سر اُٹھایا اور چہرہ انور کی طرف ایک نگاہ اٹھا کر عرض کی کہ "حضور یہ آپ کی نظرِ التفات و کرم تھا اور اسماءِ مبارکہ کا فیض کہ آپ کا ایک ادنیٰ امتی آپ کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہو سکا۔" مجھ پر گریہ طاری تھا۔ "حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا دستِ شفقت میرے سر پر پھیرا۔ میں نے چہرۂ انور پر نظر ڈالی اور عرض کی "یا رسول اللہ! میں عرش کی سیر کر لوں۔" آپ نے ارشادِ مبارک فرمایا "ہاں۔ کر لیں۔" میں اُٹھا اور اُلٹے پاؤں پیچھے

ہٹا۔ میں دیکھتا ہوں کہ میں عرش کے کنارے پر ہوں۔ میں نے اس کے کنارے کنارے گھومنا شروع کیا۔ ذکر و درود جاری تھا اور نظر وسطِ عرش پر لگی رہی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم وہاں تشریف فرما تھے۔ میں نے کافی سرعت سے عرشِ معلیٰ کے گرد چکر لگا لیا۔ معلوم ہوا کہ یہ گول نورانی وسیع آسمانی ٹکڑا، آسمان کے اوپر، سدرۃ المنتہیٰ کے بہت اوپر، ایک خاص نورانی فضا میں معلق ہے۔ وہاں نہ سردی ہے نہ گرمی، نہ بھوک نہ پیاس کا احساس تھا۔ میں نے عرشِ اعظم کے تین چکر لگائے اور پھر درود شریف پڑھتا ہوا حضور (علیک الصلوٰۃ والسلام) کے پاس آ گیا۔

"نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ غلام حیدر عرش کی سیر کر لی۔ عرض کیا۔ جی ہاں یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم)۔ خوش بختی ہے کہ یہاں بلا لیا گیا اور مجھے رحمت للعالمین، محبوب رب العالمین، صاحب قاب قوسین (صلی اللہ علیہ وسلم) کی زیارت کی سعادت نصیب ہوئی۔

"حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اب آپ کرہ ارض پر چلے جائیں۔ یا رسول اللہ ! میں نے عرض کیا۔ میں آپ کے قدموں میں رہنا چاہتا ہوں۔ مجھے آپ یہیں اپنے پاس رکھ لیں۔ آپ مجھے یہاں سے نہ بھیجیں۔ مجھ پر رقت طاری تھی۔ صاحبِ قابَ قوسین نے اس موقع پر الحمد للہ

ایک سرِ الٰہی سے حجاب اٹھایا

(جس کے بیان کرنے کی رخصت نہیں ہے۔) اس سے مجھ کو تعلیم (تسلی) نصیب ہوئی۔ (قبلہ چودھری صاحب نے فرمایا کہ) اس سرِ الٰہی کی کچھ وضاحت حسب ذیل آیات و اقوال سے ہوتی ہے۔

---

[1] یہ حدود خود سالک کے اپنے تصور اور مقام سے متعلق تھے

۱۔ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ (المومنون ۱۴)

۲۔ اَللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ وَّكِيْلٌ (الزمر ۶۲)

۳۔ وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ (ق ۱۶)

۴۔ وَفِيْٓ اَنْفُسِكُمْ ۭ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ (ذاریات ۲۱)

۵۔ وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْكُمْ وَلٰكِنْ لَّا تُبْصِرُوْنَ (الواقعہ ۸۵)

۶۔ مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهٗ ۔ (قول سیدنا علیؓ)

"میں نے پھر خواہش ظاہر کی کہ مجھے خدمتِ اقدس میں رکھ لیا جائے۔ آپ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے اس سرِّ الٰہی کی طرف اشارہ فرمایا اور فرمایا کہ عموماً یہاں کسی کو بلایا نہیں جاتا۔ پھر حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم نے تبسّم فرمایا اور ارشاد فرمایا کہ ہم کرۂ ارض پر انشاء اللہ تم سے ملاقات فرماتے رہیں گے۔ غلام حیدر اب آپ زمین پر جائیں۔ اور حضرت خواجہ خضرؑ کو بہت آہستہ سے آواز دی۔ "حضرت خضرؑ وہیں غیب سے معاً نمودار ہو گئے۔ آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) نے خواجہ خضر سے ارشاد فرمایا کہ غلام حیدر کو بحفاظت زمین پر لے جائیں۔ میں نے بڑے رقّت آمیز لہجہ اور رقّت کے ساتھ جھک جھک کر نذرانہ صلوٰۃ و سلام عرض کیا۔ حضرت خضرؑ نے دائیں ہاتھ سے مجھے کندھے سے پکڑا اور ایسے آسانی سے اُٹھایا جیسے بچّے کو اٹھایا جاتا ہے، اور دوسرے ہی لمحہ میں میرا قدم زمین پر تھا اور میں اپنے گھر کے قریب کھڑا تھا۔ میں نے حضرت خواجہؑ کا شکریہ ادا کیا اور مؤدّبانہ سلام پیش کیا۔ آپ نے سلام کا جواب دیا اور وہیں غائب ہو گئے۔"

○

اس تجربۂ روحانی کو تفصیل سے پیش کرنے کی اصلی غایت یہ ہے کہ:-

۱۔ ہم پر واضح ہوسکے کہ حضور سرورِ کائنات صلّی اللہ علیہ وسلّم اپنے ہر اُمتی کے کرب سے کس قدر باخبر ہیں اور اپنے محبوبین پر کیسے نظرِ کرم فرماتے ہیں۔

۲۔ یہ بھی واضح ہو جائے کہ ان بزرگ ہستیوں کے لئے درویشی کا عروج کیا ہے، جس کا ذکر حضرت چودھری صاحب نے رانا صاحب کے ایک ذہنی خیال سے مطلع ہو کر خود فرمایا:

"نبی کریم صلّی اللہ علیہ وسلّم کی بارگاہِ رسالت میں حاضری۔ ظاہر و باطن میں ذاتِ پاک رحمت للعالمین صلّی اللہ علیہ وسلّم سے عطائے دولتِ وصل یہی درویشی و عرفان کا ماحصل و عروج ہے۔ اور یہی فنا فی الرسول، فنا فی اللہ اور بقا باللہ کا پیش خیمہ ہے۔"

۳۔ اور اس اہم حقیقت کی طرف نشان دہی بھی واضح انداز سے ہو جائے کہ لامحدود کے پانے کا وسیلہ لامحدود ہی ہو سکتا ہے۔

۴۔ یہ بات بھی دلچسپی سے خالی نہیں کہ جب یہ واقعہ رانا صاحب نے مجھے لکھ کر بھیجا، اس کے دوسرے تیسرے دن انہوں نے خواب میں حضرت چودھری صاحب کو دیکھا۔ اور انہوں نے ان سے فرمایا کہ رانا بھائی! عرشِ کریم پر جانے کا جو واقعہ مجھے نصیب ہوا وہ اللہ تعالیٰ کے فضل اور حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کی رحمت و شفقت کے طفیل ہوا۔ اور اسے "روحانی واقعہ ہی لکھنا"۔ گویا جو کچھ لکھا جا رہا تھا چودھری صاحب قبلہ اس سے باخبر تھے اور تصحیح بھی فرما دی۔

میرے بھائیو! اگر یہ عظیم واقعات بھی سیرتِ نورِ مبین صلّی اللہ علیہ وسلّم کا جزو نہیں تو پھر سیرت کسے کہتے ہیں؟

ایک بڑا طبقہ اولیائے کرام کا وہ بھی ہے جو تمام کرۂ ارض میں پھیلا ہوا ہے، جنہیں بالعموم لوگ نہیں جانتے لیکن جب اللہ تعالیٰ کسی پر ان کو ظاہر فرما دیتا ہے تو وہ ان کو پہچان لیتا ہے۔ پھر ان سے تعلق کا قائم ہونا نہ ہونا، یہ بھی مشیتِ الٰہی

کا تابع ہے۔

○

اس کی ایک مثال جو اس عاجز کے تجربہ میں آئی بلیشِ خدمت ہے۔
یہ عاجز ۱۹۵۰ء میں لندن سے جب حج کے لئے روانہ ہوا تو گرمیوں کی چھٹیاں تھیں اور حج کے دو ماہ باقی تھے۔ اس لئے سفر ریل سے کیا اور یورپ کے مختلف مقامات کی سیر کرتے ہوئے، ڈیڑھ ماہ قبل حجازِ مقدس پہنچا۔ اس سفر میں پیرس (فرانس) کے مختصر دورانِ قیام میں وہاں کی ایک بڑی شاہراہ، شانزے لیزے، پر عصر کے بعد ہوٹل سے اتر کر پیدل جا رہا تھا۔ سڑک کی "گرم بازاری" کو دیکھ کر وہاں کی زندگی اور ماحول کے تصوّرات ذہن میں گھوم گئے۔ خیال آیا کہ "اللہ تعالیٰ۔ یہاں تیرا وہ کون بندہ ہے جو ان کے گناہوں کا بوجھ اٹھائے ہوئے ہے۔"
ابھی یہ خیال آیا ہی تھا کہ ایک شخص ایک میلے سے گرے رنگ کے کوٹ اور پتلون اور سر پر ایک معمولی سی ٹوپی پہنے ہوئے نہایت متانت و وقار سے میری جانب بڑھا اور میرے دونوں کاندھوں پر ہاتھ رکھ کر، مجھے کچھ دیر آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر گھور کر دیکھتا رہا۔ پھر دو چار منٹ بعد تیزی سے آگے بڑھ گیا۔ مجھ پر اس کی کچھ ایسی ہیبت طاری ہوئی کہ نہ تو سلام کر سکا اور نہ اس سے کچھ پوچھ ہی سکا۔ البتہ نظریں اس کے پیچھے پیچھے تھیں۔ تھوڑی دیر میں بہت تیزی سے وہ ایک "مجسمہ" (STATUE) کے پیچھے قبلہ رخ کھڑا ہوا اور اس نے نماز کی نیت باندھ لی۔
میرے دل نے گواہی دی کہ اللہ تعالیٰ نے تیری دعا سُن لی اور تجھے اس شخص کو دکھا دیا جو یہاں خدمت پر مامور ہے یا یہاں کا صاحبِ وقت ولی ہے۔ ایسے واقعات کئی بار میری زندگی میں پیش آئے۔ باہر کے ممالک

ہیں بھی، اور خود خانۂ کعبہ اور روضۂ مقدسہ پر۔ جہاں ان وجودی آنکھوں نے
ان کو کانپتے ہوئے نماز پڑھتے دیکھا۔ جن سے شرفِ نیاز بھی حاصل ہوا اور جن
کی دعا کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا کرم سمجھا۔

○

چنانچہ

اس دور کی ایک ایسی ہی بزرگ ہستی حضرتِ قبلہ برکت علی صاحب لودھیانوی
مدظلہٗ عشقِ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت اِن الفاظ میں دیتے ہیں؛

قُلْ

عِشْقُ مُحَمَّدٍ (صلی اللہ علیہ وسلم) مَذْهَبِیْ
وَحُبُّهٗ مِلَّتِیْ وَطَاعَتُهٗ مَنْزِلِیْ

یہ کہ، حضور اقدس (صلی اللہ علیہ وسلم) سے عشق میرا مذہب، محبت میری
ملّت اور اتباع میری منزل ہے۔

(احقر برکت علی لودھیانوی عفی اللہ عنہ)

حضرت صوفی صاحب اپنی کتاب "منازلِ احسان" میں ان اولیاء کرام
کے متعلق یوں فرماتے ہیں۔

"اکابر سلف کے کمالات اور شہدائے ملت کی حیاتِ جاودان کا انکار مت
کر۔ اگر تیری قسمت میں تحسین نہیں تو تذلیل تو مت کر، اور کبھی مت کر۔
اللہ تعالیٰ اپنے چُنے ہوئے بندوں کا وجود اپنی دنیا میں ہمیشہ زندہ اور قائم
رکھتے ہیں اور یہ ارادتِ ازلی کا وہ دستور ہے جو کبھی نہیں بدلتا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

حضرت ابن مسعودؓ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ

مخلوق میں تین سو بندے ایسے ہیں جن کے دل حضرت آدم علیہ السلام کے مناسب ہوتے ہیں۔ یہ حدیث ایک جگہ نقل ہوئی ہے۔ (کنز الاعمال جلد ششم صفحہ ۲۳۹)

ایک دوسری جگہ حضرت صوفی صاحب اولیاءِ کرام کے احوال اور فیوضِ باطنی کا ذکر بڑے پُرکیف انداز سے یوں بیان فرماتے ہیں۔ چنانچہ حضرت مخدوم صابر کلیری کا ذکر کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

"جوشِ عمل جب جذب کی صورت اختیار کر لیتا ہے تو راہِ سلوک کی تمام منزلیں کٹ جاتی ہیں۔ سدرۃ المنتہیٰ پرواز کی زد میں آجاتا ہے۔ سالک کون و مکان کی ہر شئے سے مستغنی و بے نیاز ہو جاتا ہے۔ ہستیٔ موہوم کی تمام رنگینیاں اور دلچسپیاں مٹ جاتی ہیں۔ استغراق و محویت طاری ہو جاتی ہے اور تمام پردے اُٹھ جاتے ہیں۔ میرے آقا و مولا مخدوم حضرت صابر کلیری پر جب یہ کیفیت طاری ہوتی تو جوشِ جذب میں حال و قال یوں ظاہر فرماتے۔

امروز شاہِ شاہاں مہماں شد است مارا
جبرئیل با ملائک درباں شد است مارا

(یعنی ہماری خوش نصیبی کا کیا کہنا کہ بادشاہوں کے بادشاہ نے ہمیں شرفِ میزبانی بخشا ہے۔ اور ہمارے یہاں قدم رنجہ فرمایا۔ اور اس وجہ سے جبرئیل امین فرشتوں کی معیّت میں ہماری چوکھٹ پر دربانی کے لئے حاضر ہیں۔ سبحان اللہ۔ پھر اس حالت میں مسلسل بارہ سال تک گولر کی شاخ تھامے ساکت کھڑے رہے۔ یہ محوِ الی اللہ کی حد ہے۔"

اسی آستانۂ فیض سے آج بھی فیصل آباد میں نور و انوار کی بارش ہوتی رہتی ہے، ابھی یہ ہستیاں باقی ہیں، دار الاحسان جائیں اور فیض یاب ہوں۔

شنیدہ کے بود مانندِ دیدہ

آپ کو خود اس حقیقت کا احساس ہو جائے گا کہ "سالک پر جب ایک

غلبہ طاری ہوتا ہے تو ایک دلنواز حکایت بن جاتی ہے جس کے اظہار کے طریقے جُداگانہ ہیں۔"

غرض

یہ کہ اللہ کے ان بندوں کا حال احوال اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ بس یہ جانتے ہیں کہ یہ نورِ مبینؐ کی تجلیات ہیں۔ اس کو تو وہی جانے جو اس نورِ جہاں آفریں کا خالق ہے،

یا وہ خود جانیں

جو متصرّف فی الکونین باذن اللہ ہیں۔ جو بے نیاز رب کے رسول برحق ہیں اور ترجمانِ اذنِ الٰہی ہیں

صلّی اللہ علیہ وسلّم

یہ اولیاء کرام تو اسی رخِ منوّرِ سرورِ کائنات صلّی اللہ علیہ وسلّم کی پُرنور تجلّیات ہیں۔ اور آپ صلّی اللہ علیہ وسلّم کی سیرتِ مبارکہ اور انوارِ مبارکہ کی پُرنور جھلکیاں۔

یہ آسمانِ ولایت

کے درخشاں تارے ہیں اور ایک ہی نجمِ وحدت سے روشنی حاصل کر رہے ہیں۔

صلّوا علیہ و آلہٖ

○

یہ بات بھی دلچسپی سے خالی نہیں

کہ اس دورِ حاضر کے بھی جن دو بزرگوں کا ذکر ہوا، دونوں مختلف اذکار اور درود کے ساتھ درودِ تاج کے شیدائی تھے۔

حضرت بابا درّانی صاحب قبلہ تو اسے لطور ذکر عطا فرماتے۔ اور حضرت چودھری غلام حیدر صاحب درودِ تاج کے متعلق یوں فرماتے تھے۔

"میں نے دیکھا ہے کہ بہت سے بزرگانِ دین اور اولیاء کرام اپنے اوقاتِ عبادات و ریاضت میں، اس درود پاک کا ورد بہت زیادہ کرتے رہے ہیں۔ یہ بہت ہی مقبول و جامع درود شریف ہے۔ اور بزرگانِ دین کا تجربہ اور مشاہدہ ہے کہ اس سے دنیاوی، دینی، ظاہری و باطنی روحانی منازل اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے بہ آسانی طے ہو جاتے ہیں۔ اس درودِ پاک کا پڑھنا، سُنا جانا بھی نبی پاک صلّی اللہ علیہ وسلّم کو بے حد پسند ہے۔ اس میں حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کے ذاتی اور صفاتی پہلوؤں اور شانوں کے علاوہ حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کے معراجِ عظمیٰ کا بھی ذکر ہے۔"

درود تاج کے متعلّق

یہ چند جملے اس لئے نقل کئے گئے ہیں کہ ہم اپنی نادانی یا کم علمی کی بنا پر اس کی عظمت کے بارے میں کسی شک کے مرتکب نہ ہوں۔

فصل ششم

اکابر مفکرین و محققین

(تیسری صدی ہجری کے بعد سے دورِ حاضر تک)

اللہ رب العزت نے اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی قدرت اور حکمت دونوں کے کمالات سے سرفرازی بخشی تھی۔ جماعتِ اولیاءِ کرام اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی قدرتِ کاملہ کی عکاسی کر رہی ہے تو اکابر علماء اور محققین آپؐ کے "نورِ قلم" اور "نورِ عقل" کے ترجمان ہیں یعنی اس حکمت کے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے ساتھ خاص تھی۔ جن کا مقصدِ حیات درسِ قرآن، اور کتاب و حکمت کی تعلیم کے ذریعہ ظاہری آراستگی کے ساتھ باطن کی اصلاح کرنا تھا۔ یہ اہم خدمات ائمہ کرام، علماءِ عظام، مفسرین، محدثین اور معلمین اپنے اپنے انداز سے اپنے اپنے وقتوں میں زمانہ کے تقاضوں کے تحت دیتے رہے اور دیتے رہیں گے۔

جس انہماک، ذوق و شوق، احتیاط اور لگن کے ساتھ یہ کام حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد خلفائے راشدین کے دَور میں اور پہلی تین صدی تک جاری رہا، اس کا ذکر اجمالاً گذر چکا ہے۔ یہاں ربطِ کلام کے لئے یہ کہنا کافی ہوگا کہ قرآنِ حکیم کی نشر و اشاعت حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے دور میں تکمیل کو پہونچی۔ اور اس کے نسخے مملکت کے ہر گوشہ تک پہنچ گئے۔ پھر قرآنِ حکیم کو تحریف سے محفوظ رکھنے کے لئے جمع حدیث و تدوینِ حدیث کا بیڑا ائمہ حدیث امام بخاری، ترمذی، مسلم وغیرہ حضرات نے اٹھایا اور حدیث کی تدوین ہوئی۔ اور حضرت ابوہریرہ، حضرت عبداللہ بن مسعود،

حضرت ابن عباس، حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہم اور ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے کثیر احادیث امت تک پہنچیں۔ جس کی روشنی میں ائمہ اربعہ کے مسالک کی صحت، لطافت، نزاکت و خوبیوں کو بخوبی سمجھا جا سکتا ہے۔ اس دور میں فقہِ اسلامی کی بھی تدوین ہو چکی تھی اور تصوف کی بنیادیں استوار ہو چکی تھیں۔

پھر جس طرح اولیاء کرام کے سلاسل تزکیۂ نفس و تزکیۂ باطن میں معاون ہوئے، اسی طرح علماء اور محققین کی کاوشوں نے اسلام کے جملہ اعتقادات اور اجزائے اسلامی کے ہر جزو کی تفصیلی کیفیات، ان کی اہمیت، ان سے استفادہ کے طریقے، ان کے فیوض سے بہرہ ور ہونے پر اپنی تمام کوششیں صرف فرما دیں۔ اگر صرف ان علماء اور محققین کے نام ہی لکھے جائیں تو دفتر کے دفتر کافی نہ ہوں گے۔

ہمارے پیشِ نظر چونکہ نورِ مبین صلی اللہ علیہ وسلم کی تجلیات کا اظہار ہے، اس کے لئے صرف قرآنِ حکیم کی جس قدر تفسیریں کی گئی ہیں اور جس کثرت سے اس کے ترجمے ہوئے ان کا ذکر بھی ممکن نہیں۔ ان کی تعداد ہزاروں سے کم نہ ہو گی۔ ہم صرف چند تفاسیر کا ذکر کرتے ہیں جن کے مؤلف بیشتر محدث اور فقیہ ہیں اور جنہوں نے اپنے زمانہ کے جید ائمہ اور علماء سے خراجِ تحسین لیا۔

اس میں چوتھی صدی ہجری کی تفسیر ابنِ جریر ہے۔ اس کے مؤلف محمد بن جریر بن یزید بن کثیر بن غالب طبری ہیں، (م شوال ۳۱۰ھ)۔ آپ ایک جلیل القدر عالم تھے۔ آپ نے سب سے پہلے قرآنِ حکیم کی جامع تفسیر تیس[۳۰] اجزاء میں مرتب فرمائی جس میں احادیث اور آثارِ صحابہؓ سے قرآن کی تفسیر کی ہے۔ ابنِ جریر کے متعلق ابن خزیمہ کا کہنا ہے کہ روئے زمین پر ابنِ جریر سے زیادہ ذی علم آدمی میں نہیں جانتا۔ امام نووی و امام تیمیہ بھی اس تفسیر کے مداح ہیں۔ (ص ۷۳)

اس میں سلیمان بن الاشعث بن اسحٰق شامل ہیں (م ۳۱۶ھ) ۔ وہ جلیل القدر محدثین میں سے ہیں، علم تفسیر، فنِ تفسیر اور عقائد کے متعلق ان کی متعدد کتب ہیں ۔ (ص ۷۶)

اس طرح الوالقاسم عبداللہ بن محمد کعبی (م ۳۱۹ھ) کی تفسیر ہے جو بارہ جلدوں میں ہے ۔ (ص ۷۶)

اس میں احمد بن جعفر المعروف بابن المنادی ہیں (م ۳۳۶ھ) علم، قرأت، تجوید، حدیث اور علوم قرآن میں آپ کا شمار ائمہ کبار میں ہوتا ہے ۔ آپ نے علوم القرآن پر چار سو سے زائد کتابیں لکھیں ۔ (ص ۷۹) اسی طرح محمد بن الحسن بن محمد المقری (م ۳۵۱ھ) ہیں ۔ (ص ۸۱)

دیگر صدی ہجری کے مفسرین میں الواسحٰق احمد بن ابراہیم نیشاپوری (م ۴۱۳ھ) ہیں ۔ (ص ۸۹)

احمد بن محمد بن ابی عبداللہ (م ۴۴۰ھ) اندلس کے جلیل القدر علماء میں سے تھے ۔ (ص ۹۱)

احمد بن الحسین جو حافظ کبیر امام بیہقی کے نام سے مشہور ہیں (م ۴۵۸ھ) ۔ ان کی تصانیف تقریباً دو لاکھ اوراق پر مشتمل ہیں، جن کے متعلق امام الحرمین نے کہا کہ "ہر شافعی المذہب کو امام شافعیؒ کا ممنون ہونا چاہیئے مگر خود امام شافعیؒ کی گردن پر امام بیہقی کا احسان ہے ۔" (ص ۹۵)

علی بن احمد بن محمد بن علی الواحدی (م ۴۶۸ھ) تفسیر قرآن شریف میں خاص شغف رکھتے تھے اور قرآنِ حکیم کی تین تفسیریں لکھی ہیں: البسیط، الوسیط، الوجیز، صحابہ کرامؓ سے جو تفسیری اقوال ثابت ہیں اُن کو جمع کر کے تفسیر کا نام تفسیر النبی

ــــ تذکرۃ المفسرین، قاضی محمد زاہد الحسینی ۔

صلی اللہ علیہ وسلم رکھا۔ (ص ۹۶-۹۷)

ابوالقاسم حسین بن محمد بن الفضل المعروف بالراغب الاصفہانی (م ۵۰۲ھ) جن کی تفسیر الراغب ہے۔ آپ کی مرتبہ مفردات القرآن سند کی حیثیت رکھتی ہے۔ آپ کو امام غزالی کے ہم پلہ تصور کیا جاتا ہے اور امام رازی آپ کو فہم قرآن و اسلامیات کی رُوح سمجھتے ہیں۔ (ص ۱۰۳)

اس میں محمد بن محمد بن محمد بن احمد ابوحامد غزالی ہیں (م ۵۰۵)، جن کا ذکر ہم نے کسی قدر تفصیل سے کیا ہے۔ امام صاحب نے بھی تفسیر لکھی ہے جس کا نام یاقوت التاویل فی تفسیر التنزیل ہے، اور وہ چالیس جلدوں میں ہے لیکن آپ مفسر سے زیادہ ایک جید عالم اور مفکر کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ (ص ۱۰۳)

اس میں شیخ الامام محی السنۃ ابومحمد حسین بن مسعود الفراء البغوی بھی ہیں (م ۵۱۶)۔ جن کو کتاب اللہ اور حدیث پر کامل عبور حاصل تھا۔ آپ کی تفسیر معالم التنزیل ہے جو تفسیر بغوی کے نام سے مشہور ہے۔ (ص ۱۰۵)

انہیں میں محمود بن عمر بن محمد بن عمر ابوالقاسم ہیں (م ۵۲۸)۔ قصبہ زمخشر میں پیدا ہوئے اور زمخشری مشہور ہوئے۔ آپ ایک جید عالم، امام وقت، محدث و مفسر تھے۔ آپ کی تفسیر کشاف آج بھی عام ہے۔ (ص ۱۰۵)

انہیں میں بغداد کے ابوالفرج عبدالرحمٰن بن علی المعروف بابن جوزی ہیں۔ (م ۵۹۷)، جن کے علم کا یہ عالم تھا کہ ایک موقع پر ایک مجمع میں مختلف آیات کی تفسیر فرمائی تو لوگوں کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور ہزاروں نے آپ کے ہاتھ پر توبہ کی۔ آپ کی تفسیر "المغنی فی التفسیر" اور فنون فی علوم القرآن

لے تذکرۃ المفسرین، قاضی محمد زاہد الحسینی۔

مشہور ہیں اور علم التاریخ میں آپ کی المنتظم مستند ہے۔ (ص ۱۱۴)
ان مشہور مفسرین میں امام فخر الدین رازی ہیں (م ۶۰۶)، جن کی مشہور تفسیر مفاتیح الغیب ہے، جو تفسیرِ کبیر کے نام سے مشہور ہے۔ شہادت کی موت نصیب ہوئی۔ (ص ۱۱۶)
انہیں میں محمد بن علی بن عربی ملقب بہ محی الدین و شیخِ اکبر ہیں (م ۶۲۸)۔ جو شریعت و روحانیت کے غوامض پر نظرِ کامل رکھتے تھے۔ آپ نے بھی قرآن کی تفسیر لکھی جو بیس[۲] جلدوں میں ہے، اس کا نام کشف الاسرار و ہتک الاستار ہے۔ (ص ۱۱۹)
انہیں میں قاضی ناصر الدین عبد اللہ بن عمر ہیں (م ۶۸۵ھ)۔ جو قصبہ بیضاء میں پیدا ہوئے اور جن کی تفسیرِ بیضاوی ایک مستند تفسیر ہے۔ اس کے علاوہ فقہِ شافعی میں آپ کی کتاب منہاج الوصول اور علم الکلام میں طوالع الانوار اور تاریخ میں نظام التواریخ ہے۔ (ص ۱۲۶)
اس کے بعد آنے والے بیشتر مفسرین نے تفاسیر پر حواشی لکھے، علمِ لغت میں اضافے کئے ان میں مجد الدین ابو طاہر محمد بن یعقوب فیروز آبادی ہیں۔ آپ نے بخاری شریف کی ایک شرح اور لغت پر ایک جامع کتاب ساٹھ جلدوں میں لکھی، اُسی کا خلاصہ قاموس آپ کی تصنیف ہے۔ آپ نے قرآن کی بھی ایک تفسیر لکھی ہے۔ (م ۸۱۷ھ)۔ (ص ۱۴۶)
اسی طرح ہندوستان میں بھی جیّد مفسر پیدا ہوئے جنہوں نے تفاسیر کے خلاصے لکھے اور علومِ ادب و لغت و احادیث کی گراں قدر خدمت انجام دی۔ ہم اس مختصر ترین ذکر کو عبد الرحمٰن بن احمد معروف بہ مولانا جامیؒ اور

ـــ تذکرۃ المفسرین، قاضی محمد زاہد الحسینی۔

علاّمہ جلال الدین سیوطی کے اسماءِ گرامی پر ختم کرتے ہیں:۔

مولانا جامیؒ علومِ اسلامیہ، صرف و نحو، ادب اور معانی میں امام سمجھے جاتے تھے۔ کافیہ کی شرح، شرحِ جامی آپ کی مشہور کتاب ہے اور ایک لاثانی اور لافانی یادگار ہے۔ قرآن کی بھی تفسیر کی تھی۔ ۸۹۸ھ میں انتقال فرمایا اور عاشقِ رسولؐ کی حیثیت سے آج بھی دلوں میں گھر کئے ہوئے ہیں۔ (ص ۱۵۷)

اس کے بعد علامہ جلال الدین سیوطی ہیں (م ۹۱۱ھ)، جنہوں نے ۸ سال کی عمر میں قرآن شریف حفظ کر لیا۔ اور سات علوم (تفسیر۔ حدیث۔ فقہ۔ نحو۔ معانی۔ بدیع۔ بیان) میں اللہ تعالیٰ نے انہیں خصوصی ملکہ عطا فرمایا تھا، لیکن آپ کی زیادہ توجہ تفسیر کی جانب تھی۔ آپ سے متعدد تفاسیر مذکور ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کی تفسیر جلالین کو وہ شرف بخشا کہ آج بھی ہر طرح مقبول ہے۔ (ص ۱۵۹)

"الاتقان فی علوم القرآن علامہ جلال الدین سیوطی کا وہ کارنامہ ہے جس کے مطالعہ سے قرآنِ حکیم کے تنوع اور وسعت کی دنیا سامنے آتی ہے اور حیرت میں ڈال دیتی ہے۔ مکی اور مدنی آیات کی شناخت کا بیان، ارضی و سماوی آیات، اسبابِ نزول، تکرارِ نزول، قرآن کے وہ حصے جو سابق انبیاء پر نازل ہوئے، وہ حصے جو صرف سید المرسلینؐ پر نازل ہوئے، قرآن اور اُس کی سورتوں کے نام، قرآن کے حفاظ اور راوی، قرآن کے غریب (نامانوس) الفاظ کی معرفت، محکم اور متشابہ، ناسخ و منسوخ، قرآن کے وجوہِ مخاطبات، استعارات و تشبیہاتِ قرآن۔ یہ الاتقان کے محض چند مقامات و عنوانات ہیں جو نمونہ کے لئے پیش کئے گئے۔" (محترم ابوالخیر کشفی صاحب)

ـــــ تذکرۃ المفسرین، قاضی محمد زاہد الحسینی۔

اس کے بعد اگر ہم صرف اُردو زبان میں تفاسیر و حدیث کی کتب کا ذکر کریں تو وہ بھی ہزاروں سے کم نہ ہوں گی۔ یہ سلسلہ شاہ رفیع الدینؒ سے لے کر اس وقت تک جاری ہے۔ اسی طرح حدیث، فقہ، لُغت، علم بیان اور دیگر علوم میں جو گراں قدر خدمات اِن صدیوں میں علماء کرام، محدّثین اور فقہاء نے انجام دیں ان کا ذکر مختصر طور پر بھی ممکن نہیں۔ پھر مختلف دارالعلوم، جامعہ، یونیورسٹیوں اور دیگر علمی اداروں میں جو تحقیقی کام جاری رہے، اور جو گراں قدر خدمات وہاں کے علماء و محققین نے انجام دیں، اور آج بھی اس گئی گذری حالت میں ہندو پاک میں دے رہے ہیں۔ کاش ہم اُنہیں خراجِ تحسین پیش کر سکتے۔ ان میں وہ بین الاقوامی شہرت کے جیّد علماء بھی شامل ہیں جن کے نام یقیناً آپ کے اذہان میں گھوم رہے ہوں گے۔ لیکن ہمارے پیشِ نظر اس حقیقت کا اظہار ہے کہ یہ سب اسی نورِ مبینؐ کے فیضان کا ثمر ہے۔

ہم صرف تبرّکاً چند اسمائے گرامی کا ذکر کرتے ہیں جو "عَلَّمَ بِالْقَلَم" کی تفسیریں ہیں۔

○

امام غزالیؒ

ان محققین اور اکابر علماء میں سرِ فہرست حجۃ الاسلام امام محمد غزالی رحمت اللہ علیہ ہیں۔ ان کی کتب، بالخصوص احیاء العلوم و کیمیائے سعادت آج بھی اس قدر مقبول ہیں جتنا شاید پہلے کبھی نہ ہوں۔ آپ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے ہم عصروں میں سے ہیں، اور آپ کا زمانہ ۴۵۰ھ سے ۵۰۵ھ تک ہے۔ وہ ایک عظیم مفکرِ اسلام تھے جنہوں نے قرآن، حدیث، فقہ، اخلاقیات و

تصوّف، قانون، علم الکلام، غرض علوم دینیہ کے ہر شعبہ میں اپنی ندرتِ فکر، محققانہ اندازِ تحریر، اور وسعتِ علمی کا ثبوت دیا۔ اور دینِ متین کے انوار، ان کی لطافتوں، نزاکتوں اور ان کے حصول کے طریقوں پر خواص اور عوام دونوں کے لئے آگاہی بخشنے کے نت نئے انداز اختیار فرمائے ہیں۔

اپنی عالمانہ صلاحیتوں کی بنا، پر ۳۴ سال کی عمر میں مدرسہ نظامیہ بغداد میں، جو اس وقت عالم اسلام کا سب سے بڑا علمی مرکز تھا، نظام الملک طوسی نے امام صاحب کو مسند درس کے لئے منتخب فرمایا۔ آپ کی عزّت و احترام عوام و خواص میں یکساں تھی۔ آپ نے اپنے بے شمار علمی کارناموں اور مواعظ کے ذریعۂ نورِ اسلام اور نورِ ایمان کو عام فرمایا۔ پھر امام صاحب کی زندگی میں ایک عظیم تغیر آیا اور تمام مناصب اور تعلقاتِ دینوی، تعلیمی و تدریسی، ترک کرکے ایک کمبلی اوڑھ کر بغداد سے نکل گئے۔ دمشق میں پہنچ کر ریاضت و عبادت میں مشغول ہو گئے اور حصولِ عرفان کی منازل طے کیں۔

اپنی اس سیاحتِ ارضی و روحانی سے دوبارہ مدرسہ نظامیہ میں تشریف لائے اور مسندِ درس پر جلوہ افروز ہوئے اور زندگی کے آخری چند سال دنیا سے کنارہ کشی، تزکیۂ نفس اور تصفیۂ باطن کے ساتھ نورِ عرفان کی منازل طے کرتے ہوئے نورٌ علیٰ نور ؐ کے قدموں میں پہنچ گئے۔

سَلٰمٌ هِیَ حَتّٰی مَطْلَعِ الْفَجْرِ۔

یہ عظیم ہستی اگر صرف "احیاء العلوم" ہی دے کر دنیا سے رخصت ہو گئی ہوتی، تب بھی امّتِ مسلمہ اس کے احسان سے سبکدوش نہ ہو سکتی۔ ان کی تحریر کا ہر لفظ تو اللہ ربّ العزّت کی بارگاہ سے اپنی قدر و منزلت پائے گا۔

اور وہ خود

رخصت ہوئے تو اس طرح کہ پانی منگوایا۔ غسل فرمایا۔ دو رکعت نماز پڑھی، پھر

خود کفن پہنا اور تختہ پر لیٹ گئے اور واصلِ حق ہو گئے۔ سبحان اللہ

○

ہمیں ان بزرگوں کی سوانحِ حیات نہیں لکھنا ہے۔ یہ بتانا ہے کہ یہ عظیم ہستیاں اس منبعِ علم و حکمت، آبشارِ معرفت کے وہ چشمے ہیں جو علم کے ذریعہ عرفان کی وادیاں طے کرتے ہوئے، بنجر قلوب کو زندگی بخشتے رہے۔ جن کے پیشِ نظر ایمان واسلام کے انوار کو عام کرنا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اُن کا رشتہ مستحکم یا مستحکم سے مستحکم تر کرنا تھا۔ مومن کو اس کی زندگی میں کلمہ طیبہ کی فہم، فیوض و برکات اور وسعتوں سے آگاہی بخشنا اور

گرویدۂ حق اور حق ہی حق بنا دینا تھا

ہم ان میں سے محض چند کا ذکر نہایت اختصار سے کریں گے، اور وہ بھی صرف اس لئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے علومِ دینیہ کے ساتھ آپؐ کے اس رُخ کی ترجمانی بھی ہو جائے جس کا تعلق ذہنِ رسا اور فکرِ رسا سے ہے اور جو علوم کی وسعتوں کا موجب ہوتی ہے، اور جن میں اکثر کی ابتداء کا سہرا مسلمان محققین و مفکرین کے سر پر ہے۔

○

ابنِ عربیؒ

انہیں میں شیخِ اکبر محی الدین ابنِ عربیؒ ہیں۔ آپ کا زمانہ ۵۶۰ھ سے لے کر ۶۳۹ھ ہے۔ ان کے کتب کی تعداد بروکل مین (Brockelmann) نے ۲۳۹ لکھی ہے۔ انہوں نے خصوصیت کے ساتھ مسئلہ وحدت الوجود پر بڑی

بصیرت آموز روشنی ڈالی ہے۔ ان کی کتاب فصوص الحکم اس موضوع پر ان کی عظیم ترین کتاب ہے جس کے سمجھنے والے بھی اس دور میں کم ہی ہیں۔ اس آخری دَور میں حضرت پیر مہر علی شاہ گولڑہ شریف وہ بزرگ ہستی تھے جو اس کا درس دیتے اور جس میں لوگ دور دور سے پیدل سفر کر کے شرکت فرماتے۔ یہ خود ایک عظیم ہستی تھے۔ اور اس آخری دَور میں علم اور عرفان کا سنگم تھے۔ علم حروف جو بہت کم لوگوں کی قسمت میں ہوتا ہے، آپ کو حاصل تھا۔ کس کس کا ذکر کیا جائے۔

اس مسئلہ وحدت الوجود کے متعلق اس دَور کے ایک بزرگ حضرت صوفی برکت علی صاحب لدھیانوی، نے بڑی پیاری بات فرمائی کہ وحدت الوجود ایک مقام ہے جو شاذونادر کسی پر حقیقۃً کھلتا ہے۔ حضرت ابنِ عربی ان چند ہستیوں میں سے ہیں جن کو اس سے سرفرازی ملی۔

ابنِ تیمیہ رح

ابنِ عربیؒ کے ایک صدی بعد ایک اور مفکر و عالم دین کا ظہور ہوتا ہے۔ ان کا زمانہ ۶۶۱ھ تا ۷۲۸ھ ہے۔ ان کا انداز ابنِ عربیؒ سے بالکل مختلف ہے۔ ان کا انداز علوم شریعت کو ایک نئے انداز سے اس طرح پیش کرنا ہے کہ لوگ قدامت پسندی کو عیب نہ جانیں۔ اس کی حقیقت تک پہونچنے کی کوشش کریں۔ یہ بات صرف ایمان و عمل سے کھلتی ہے۔ ابن تیمیہ، حضرت امام حنبلؒ کی فقہ کے پیرو تھے، اور شریعت کے حدود میں رہ کر ہر مسئلہ کو حل کرنے کی کوشش کرتے۔ بعض جگہ منقول کو معقول کی حد میں لانے میں لغزشوں کا بھی سامنا کرنا پڑا۔ ہمیں ان کی نیک نیتی پر شبہ نہ کرنا چاہیئے۔

ابنِ خلدون

اس دور کی ایک عظیم شخصیت مشہور مورّخ اور بانیٔ عمرانیات ابنِ خلدون ہیں۔ ان کا زمانہ ۷۳۲ھ سے ۸۰۸ھ تک ہے۔ اور جو اکابر مفکّرین کی صفِ اوّل میں جلوہ افروز ہیں اور ایک عظیم مورّخ کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ دراصل ابنِ خلدون کی عظمت کا راز ان کی وسیع النّظری، وسیع العلمی اور حقیقت شناسی میں مضمر ہے۔ انہوں نے فنِ تاریخ نویسی کو ایک نیا رُخ دیا اور اس کو نہ صرف معاشرت و معیشت کا آئینہ بنایا بلکہ ہر دور کی فکرِ انسانی اور اس کی خوبیوں اور کوتاہیوں سے آگاہی بخشنا فنِ تاریخ کا جزو قرار دیا۔ یہی نہیں بلکہ اس فکر کی اصلاح کی طرف رہنمائی کو بھی مورّخ کے فرائض میں شامل کیا۔ یہ بات ان کے مقدمہ سے بظاہر واضح ہوتی ہے۔ اس طرح انہوں نے فنِ تاریخ کی راہوں کو کشادہ کیا اور واقعہ نگاری سے نکال کر اسے ایک فن کی حیثیت عطا فرمائی۔ ابنِ خلدون کی قدر دانی مسلمانوں سے زیادہ غیر مسلم مفکّروں میں ہوئی۔ اس خراجِ تحسین کی بڑی وجہ مغربی مفکّرین میں یہ ہے کہ ابنِ خلدون کی نظر ہمیشہ ان عوامل پر پڑتی ہے جو قوموں کے عروج و زوال کا باعث بنے۔ ابن خلدون قوموں کے افکار، ان کے کلچر، ان کی زبان، ان کے جذبات کو پیشِ نظر رکھ کر قلم اٹھاتے ہیں، اور ان کو محض حکومتوں کے عروج و زوال تک محدود نہیں ہونے دیتے۔ اگر حکومتوں کا ذکر آتا ہے تو ان کی خوبیاں اور کمزوریاں، جو ان کے دور میں علمی فضاؤں کو سازگار یا ناسازگار بنانے میں معاون ہوئیں، ان کا ذکر بڑی بصیرت سے کرتے ہیں۔ ان کی شگفتہ فکر، تحقیقی انداز، حقائق کی تہہ تک پہنچنا، پھر ان کو اس طرح پیش کرنا کہ دوسروں پر ان کی صداقت واضح ہو جائے، ان کی بڑی خصوصیت ہے۔ دراصل ابنِ خلدون فنِ تاریخ

نولیسی کے امام ہیں، مشرق میں بھی اور مغرب میں بھی۔

اس کے علاوہ مختلف علوم پر ان کو پورا عبور تھا۔ اس میں معاملات، اقتصادیات، فلسفہ، علوم نظری اور علوم عقلی سب شامل ہیں، اور ان فنون پر بھی ان کی مستند کتابیں ہیں۔ لیکن فنِ تاریخ میں جو مقام ابنِ خلدون کو حاصل ہوا اس کے باعث دوسرے علوم گویا گہن میں آگئے۔

○

حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں میں علوم نظری وعقلی، فلسفہ، سائنس، عمرانیات، اقتصادیات، نجوم، رمل، جغرافیہ، طب، حکمت، ریاضی وغیرہ کا آغاز بھی دوسری صدی ہجری سے ہو چکا تھا اور جو اپنے بامِ عروج پر اسپین میں پہنچا اور اس کی تباہی کے ساتھ یہ علمی اثاثہ اہلِ مغرب کے ہاتھ آیا، جس نے آج ہمیں آزادی کے باوجود غلامی میں جکڑ رکھا ہے۔

○

مسلمانوں میں علم کی اس برتری کا راز اسلامی تعلیمات میں مضمر ہے۔ اسلام نے نہ صرف تحصیلِ علم کو فرائض میں شامل فرمایا بلکہ علم کی سرحدوں کو محدود نہ ہونے دیا۔ بلکہ اس کا تو یہ دعویٰ ہے کہ تم کوئی علم بھی حاصل کر لو اگر تم میں فکرِ صحیح کی صلاحیت ہے تو اسی سے تم پر توحید کا مسئلہ اور ربّ العزت کی صفاتِ کاملہ کا انکشاف ہوگا۔ پھر اگر تم کو اپنے رب کی معرفت کا احساس پیدا ہو جائے گا تو یقیناً تم پر رسالت اور آخرت کی اہمیت واضح ہو جائے گی۔ تم مسلمان ہو جاؤ گے۔ یہی علم ہے، یہی عرفان۔

یوں مسلمانوں میں سلاطین کی تاریخ، ان کے عروج وزوال کی داستان

ہے۔ لیکن ہر دور میں اگر ہم حکمرانوں سے نظر اٹھا کر، اُن محققین کے کاموں کو دیکھیں جو دورِ امیہ اور بالخصوص عباسیہ میں بھی بیش بہا علمی خدمات انجام دیتے رہے، تو ہم دیکھیں گے کہ شاید ہی علم کا کوئی شعبہ یا گوشہ ایسا ہو جس میں انہوں نے اپنی فکر و ندرت کے جوہر نہ دکھائے ہوں۔ یہ وہ ہستیاں تھیں جنہوں نے حکومت و سیاست سے الگ رہ کر، صرف علم کو اپنایا اور اسی کے ہو گئے۔

الکندی

ان میں چوتھی ہجری کے ابتدائی دور کا پہلا عظیم مفکر الکندی ہے۔ اس کا نام ابو یوسف یعقوب بن اسحٰق الکندی تھا۔ اس کو مسلمانوں میں پہلا بڑا فلسفی کہا جاتا ہے۔ اس کی پیدائش کوفہ میں ہوئی، اپنے قبیلہ کندا کے باعث کندی کہلایا۔ اس کے علوم کا مرکز بغداد بنا۔ اس نے علوم نظری اور عملی دونوں میں، عرب فکر کو ایک نیا رُخ دینے کی کوشش کی۔ اس نے علوم عقلیہ پر زیادہ زور دیا۔ اگرچہ ان کے زمانہ میں فقہِ اسلامی کے چاروں اسکول وجود میں آ چکے تھے لیکن اس کا انداز معتزلی تھا۔ وہ افلاطون کے تصورات سے متاثر تھا اور فلسفہ اور حقیقت میں کسی فرق کو جائز نہ رکھتا تھا۔ اور عقلی علوم پر اس کی دسترس اس حد تک پہنچ چکی تھی کہ اس نے تقریباً دو سو کتب مختلف مضامین پر لکھی ہیں، جس میں ریاضی، اقلیدس، فلسفہ، موسمیات، آنکھوں سے متعلق علوم، ادویات، اور حکمت سب ہی شامل ہیں۔ لیکن وہ ایک فلسفی کی حیثیت سے زیادہ مشہور ہوا۔

(تاریخ، امیر علی، صفحہ ۴۶۷)

الفارابی

اس دور کا ایک مسلمان مفکر الفارابی ہے جس کا انتقال ۹۵۰ء (۳۳۹ھ) میں ہوا جس کو ارسطو ثانی کہتے ہیں، اس نے اس عظیم حقیقت کی طرف نشان دہی کی ہے کہ فلسفہ کا دور ختم ہو چکا ہے کہ وہ دراصل اب اسلام میں ضم ہو چکا ہے یعنی اسلام کے حقائق کے بعد کسی فلسفیانہ تحقیق کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی۔ اس نے اسلامی علوم میں علم الکلام کا اضافہ کیا۔ فقہ پر مستند کتب لکھیں اور شعر و ادب پر گراں قدر اضافے کئے۔

(انسائیکلوپیڈیا آف اسلام، جلد نمبر ۲، صفحہ ۷۷۹)

○

اسی زمانہ میں بے شمار مفکرین پیدا ہوئے جس میں موسیٰ بن شاکر ایک مشہور انجینئر تھا۔ ابوالحسن نے ٹیلسکوپ کی ایجاد کی۔ ان میں ایک بڑی تعداد علم نجوم کی پردہ کشائی میں مصروف رہی، جنہوں نے ستاروں کی رفتار اور ان کے اثرات سے لوگوں کو آگاہی بخشی۔

○

ابن سینا

اسی زمانہ میں ابن سینا، مسلمانوں میں وہ عظیم ہستی گذری ہے جس کا نام آج بھی حکمت کی دنیا میں بڑی عزت و احترام سے لیا جاتا ہے۔ ہم صرف ابن سینا کے مختصر حال پر اکتفا کرتے ہیں جس سے مسلمان سائنس دانوں اور مفکرین کے مزاجِ علم دوستی و تحقیق کا اندازہ ہوتا ہے۔

ابنِ سینا کا اصل نام ابو علی الحسین بن عبد اللہ تھا۔ وہ ۳۷۰ھ مطابق ۹۸۰ء میں پیدا ہوا۔ اور ۱۸ سال کی عمر میں جملہ علوم عقلیہ پر عبور حاصل کر لیا۔ اور بہت جلد اپنی ذہانت، لوگوں سے تعلق، مزید تحقیق کے باعث ایک مشہور حکیم کی حیثیت سے مانا گیا۔ اس کے حافظہ اور قابلیت کا یہ عالم تھا کہ وہ گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھ کر یا قید کی زندگی میں بھی، محض اپنی یادداشت کی بناء پر، مستند کتابیں لکھنے پر قادر تھا اس نے اپنے مشاہدہ اور تجربات پر بھروسہ کیا۔ ۲۱ سال کی عمر میں قلم اٹھایا اور ۴۵ (بعض کے نزدیک ۹۹) گراں قدر تصانیف اپنی یادگار چھوڑیں۔ ان میں علوم طب و کیمیا، فلسفہ، ریاضی، اقتصادیات و اخلاقیات سے لے کر سیاست و موسیقی تک سب شامل ہیں۔ ابنِ سینا کی مشہور کتب میں کتاب الشفاء ہے جو ۱۸ جلدوں میں اور عیون الحکمت دس جلدوں میں، جو فلسفہ کی بلند مرتبت تصنیف ہے۔ وہ بلند پایہ مصنفین البیرونی اور فردوسی کا ہم عصر تھا۔

ایک مفکرِ اسلام کی حیثیت سے تفسیر، حدیث، اور تصوف پر بھی اسی تحقیقی انداز سے قلم اٹھایا۔ وہ توحیدِ باری تعالیٰ کے ساتھ روحانی ارتقاء کا قائل تھا اور اپنے اخلاق کی بلندی کے ساتھ ساتھ شعر و شاعری، فلسفیانہ خیالات کو شاعرانہ اور "متصوفانہ" انداز میں پیش کرنے میں بھی اسی انہماک سے دلچسپی لیتا تھا۔ (انسائیکلو پیڈیا آف اسلام، جلد نمبر ۳، صفحہ ۹۴۱)

ابنِ رُشد

یہ وہ دور تھا کہ ہزارہا جید مفکرین نے اس دور میں اپنی زندگی اسی طرح تحقیقی کاموں میں صرف کی ـــــ کس کس کا نام لیا جائے۔ انہیں میں ابنِ رشد تھا، جس کا تعلق اسپین سے تھا۔ اس کا زمانہ ۵۲۰ سے ۵۹۵ تک کا

ہے۔ یہ اپنے زمانے کا ایک بڑا نقاد تھا جو ارسطو کے تصورات سے متأثر تھا اور علوم عقلیہ و نفسیہ پر سیر حاصل بحث کرتا۔ اس نے فلسفہ میں گراں قدر اضافے کئے۔ (انسائیکلوپیڈیا آف اسلام، جلد نمبر ۳، صفحہ نمبر ۹۱۳)

○

مختصر یہ کہ

مسلمان مفکرین نے نہ صرف اپنی برتری کا ثبوت، اپنی صلاحیت و قوتِ ایمانی سے، میدانِ جنگ میں دیا، بلکہ علم اور فکر کی دنیا میں بھی اپنی ذہانت، ایجادات اور تحقیقاتِ علمی کا ثبوت اسی شان سے ہر ہر شعبۂ علمی میں دیا، اس حد تک کہ دورِ حاضر میں بھی بے شمار علوم میں ان کی اوّلیت کا اعتراف مغرب کے مفکرین کو بھی کرنا پڑا۔ اور ماننا پڑا کہ اسلام میں تصورِ علم کو صرف قرآن، حدیث و فقہ سے متعلق سمجھنا نادانی ہوگا۔ امیہ اور بالخصوص عباسیہ دور میں علم کو جو فروغ حاصل ہوا، اس کے بعد تو اس قسم کے کسی شک کی گنجائش ہی نہیں رہ جاتی۔ مغرب کے مؤرخ کو اس حقیقت کا بھی اعتراف کرنا پڑا کہ نہ صرف علم و ادب بلکہ تحقیق اور تجربات و گراں قدر ایجادات سے مسلمانوں نے اپنی برتری ہر طرح اپنے اسپین کے دورِ حکومت تک، ہر شعبہ میں قائم رکھی، خواہ وہ علومِ نقلیہ ہوں یا علومِ عقلیہ، وہ ہر فن کے ماہر اور ہر علم کے امام تھے۔ (ملاحظہ ہو تاریخ امیر علی صفحہ ۷۶۲)

○

افسوس یہ ہے کہ

اسپین کے زوال کے بعد علم کے یہ سرچشمہ اہلِ مغرب کے قبضہ میں آگئے۔

اور اب بڑی بڑی درس گاہیں روس، فرانس، اٹلی، جرمنی اور انگلستان میں
قائم ہیں اور ہم ان کے دست نگر ہو کر رہ گئے۔

البتہ آخری چند صدیوں میں مسلمانانِ ہند انگریزوں کے دورِ حکومت
میں اپنے علمی سرمائے کی حفاظت اور اس کے فروغ کو باقی رکھنے کے لئے
کسی قدر کوشاں رہے، اور پورے عزم و ہمت سے کام لے کر، اس میں
گراں قدر اضافے بھی کئے اور اپنی اقدار و اخلاقیات کا پرچم جان کر قربانیاں دے
کر بلند کرنے کی کوشش میں مستعد رہے۔ لیکن تقسیم ہند کے ساتھ یہ دینی سرمایہ
بھی سیاسی کش مکش کا شکار ہوا، اور مسلمانوں کو ایک عظیم خسارہ کا سامنا کرنا پڑا۔

مغربی علوم کے ساتھ سائنس کی ابتدائی تعلیم جاری رہی اور ہماری تحقیق،
مغرب کے افکار سے متعلق رہی۔ ہمارے بڑے سے بڑے سائنس کے
کارنامے، مغربی علوم کو مشرق تک لانے ہی میں صرف ہوتے رہے، اور
ہم بدستور ذہنی غلامی میں مبتلا رہے، اور کچھ اس انداز سے رہے کہ اس سے
نجات کی راہیں بظاہر مسدود ہو گئیں۔

خدا کا شکر ہے اس دورِ حاضر میں کچھ تغیر کے آثار نظر آ رہے ہیں۔
ہمارے سائنس والوں میں ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی اور دیگر سائنس داں
اگر ایک محدود حد تک اس تجدید کے علمبردار ہیں تو ہمارے نوجوان مفکر و
سائنس داں، ڈاکٹر عبدالقدیر خاں سے قوم و ملت کی امیدیں وابستہ ہیں،
وہ اس غلامی کی زنجیروں کو توڑ کر تحقیق کی نئی راہیں نکالنے میں مصروف
ہیں۔ اور قوم کو دعوتِ فکر و عمل، عملاً دے رہے ہیں۔

عرض یہ کرنا ہے کہ

اس دورِ حاضر میں بھی مسلمانوں کے عروج کا راز "ایمان اور علم" ہی میں مضمر
ہے۔ زمانہ کے نشیب و فراز کے باعث ہماری بنیادی غلطی یہ ہوئی کہ ہم نے

ایمان کو علم کے تابع کر دیا اور علم کو ایمان سے الگ سمجھ کر، ہر علم سے متاثر ہو کر اس میں اپنی برتری کی راہیں تلاش کیں۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ برتری کا راز علم کو ایمان کے تابع رکھنے میں ہے۔ یہی نہیں کہ تلاشِ حق، اور صفاتِ اشیائ کی جستجو میں کسی کسل سے کام لیا جائے۔ بلکہ یہ سمجھا جائے کہ اس سے کاوش کے جو در کھلتے ہیں، جن امور کا انکشاف ہوتا ہے، وہ بدل بھی سکتے ہیں، بند بھی ہو سکتے ہیں لیکن ایمان ایک اٹل حقیقت کا نام ہے جس میں تبدیلی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ہے۔ جب تک اس راز کو مسلمانوں نے اپنایا وہ ترقی کی ہر منزل میں آگے رہے، جب اس کو پسِ پشت ڈال دیا تو خود ہی سب سے پیچھے رہ گئے۔

نورِ مبین صلی اللہ علیہ وسلم

کی سیرت مبارکہ آج بھی اسی طرف رہنمائی کر رہی ہے۔

یہ غلط فہمی نہ ہو

کہ اسلام کا دور ختم ہو گیا۔ نہیں، ہر گز نہیں۔ اس کا فروغ جاری ہے۔ یہ کہیے کہ مسلمان جو اپنے کو اسلام کا علمبردار کہتے ہیں، انہوں نے ہتھیار ڈال دیئے، وہ خود حجاب بن گئے۔

آج بھی

اسلام توحید کی دعوت دے رہا ہے اور علی الاعلان اس حقیقت کو آشکارا کر رہا ہے کہ اس معبودِ حقیقی، اور اس کی کائنات اور اس کے اجزاء کا جس جس طرح چاہو تجربہ کر لو، تم آیاتِ الٰہی میں تضاد نہ پاؤ گے یہی نہیں بلکہ کتاب اللہ اور کائنات میں سرِ مو فرق نہ نکال سکو گے۔ منکرینِ اسلام برابر اس تضاد کی تلاش میں لگے رہے لیکن انہیں ناکامی ہی کا سامنا کرنا پڑتا ہے، اور ہر زمانہ میں ان کی حیرت میں اضافہ ہی ہوتا رہتا ہے، کمزوریاں نکالنا تو الگ رہا

ہم صرف ایک مثال پیش کرتے ہیں

دورِ حاضر کا ایک امریکی مفکر جو صرف نفسیات اور ذہن پر کام کرتا ہے، اس کا کہنا ہے کہ یہ بات موجب حیرت ہے کہ صرف دماغ میں پندرہ ارب خلیے (CELLS) ہیں اور ہر خلیہ میں ایک ہزار سے پانچ لاکھ تک (TENTACLES) باریک باریک روئیں ہیں اور اُن میں ہر TENTACLE اپنے میں ایک بات کی یا ایک شئے کی حفاظت کی صلاحیت رکھتا ہے۔ پھر ان کے کاموں کا انداز اس سے زیادہ حیرت انگیز ہے۔ ایک خیال کے آنے کے ساتھ ہی ان کے اجزاء میں بیک وقت تحرّک، ٹوٹ پھوٹ اور نئے سرے سے تشکیل ہوتی ہے۔ ہر CELL کے اردگرد ENERGY کا دائرہ ہے جو ان TENTACLES کو توانائی بخشتا ہے۔ یہ سمجھو کہ اگر اس ایک CELL کو ایک کاغذ سمجھا جائے اور انہیں اوپر نیچے رکھا جائے تو وہ کرۂ ارض کے برابر ہوگا۔ اور یہ CELL، اور اسی CELL کا ہر ہر TENTACLE الگ الگ سوچ کا مالک ہے، اور اس کے رموز و اسرار کبھی کائنات کے اختتام تک ظاہر نہیں ہو سکتے، اور یہ کہہ اٹھتا ہے:

There is no difference between Science and Religion. The difference is only of Ignorance ! (Dr Herbert Benson : Your Maxiınum Mind)

یہ کون کہلوا رہا ہے۔ کیا یہ جملہ بھی خود اس کے کسی CELL یا اس کے کسی TENTACLE کی آواز نہیں؟ کیا اس کے وجود میں نورِ وجودِ باری تعالیٰ کا احساس مضمر نہیں، جسے "نورِ علم"، "نورِ قلم" تحقیق کی آنکھوں سے اُسے دکھلا رہا ہے۔ اب ENERGY تک تو مان لینا اور خالقِ ENERGY کا انکار، یا ماننا تو اس طرح ماننا کہ اُسے مجبور قوّت کی حیثیت سے تسلیم کرنا، تو محرومی بنا

کے سوا کچھ نہیں۔

کائنات کی اس یکائی کو مسلمان توحیدِ الٰہی کی ایک جلوہ گری سمجھتا ہے، جو زمین و آسمان کی تخلیق سے لے کر اس کے عوامل میں کارفرما ہے۔ اور اس درجہ اکملیت کے ساتھ کہ کروروں سیاروں کی گردش اور لاکھوں نظامہائے شمسی کے قیام سے لے کر یہ یکائی اور یکتائی اور اس کی جلوہ گری ہر شئے اور ہر ذرّہ میں موجود ہے۔ یہی نہیں بلکہ اُن کی رفتار، اُن کی سطح میں سرِ مو فرق نہیں آتا۔
قرآنِ حکیم اِس صفت کی طرف توجّہ دلاتا ہے۔ زمین و آسمان، سورج اور ستاروں سے لے کر نفوسِ انسانی تک میں خالقِ کائنات کے وجود کا ثبوت پیش کرتا ہے، جسے محقّقین جانتے ہیں، جانتے ہیں لیکن ایمان بمشکل لاتے ہیں۔ اگر قرآن نے کہا کہ انسان مٹّی سے بنا ہے تو اس کا انکار ہوتا رہا۔ لیکن جب ایک مغرب کے سرجن نے انسان کے ہاتھوں کا تجربہ اپنے آپریشن اور ترکیبِ اجزاء کی بناء پر کرنا شروع کیا تو چلّا اٹھا "I am made of mud." میں مٹّی کا بنا ہوں۔

جب آئن سٹائن نے اپنے تجربات کی روشنی میں اس حقیقت کو پایا کہ شئے فنا ہوتی لیکن حقیقتِ اشیأ فنا نہیں ہوتی صرف صورت بدلتے ہیں، تو چلّا اُٹھا:۔ "I am immortal." میں غیر فانی ہوں۔

سائنٹسٹ جو ایسے سینکڑوں حقائق ہیں، جن کی نشاندہی قرآنِ حکیم نے کائنات سے لے کر نفوسِ انسانی تک میں کی، اور جن کی طرف رسولِ مقبول صلّی اللہ علیہ وسلّم نے چودہ سو سال پہلے توجّہ دلائی، آج وہ انہیں دیکھ رہے ہیں۔ لیکن ان کی نظریں صفات سے ذات کی طرف نہیں اُٹھتیں۔ گو اس یکتائیتِ کائنات کو تسلیم کرتے ہیں لیکن اس "احد" صمد پہ ایمان نہیں لاتے جس کی قدرت و حکمت کا یہ سب ظہور ہے۔

یہاں ایک چھوٹی سی مثال کا بیان دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ ہمارے لندن کے دورانِ قیام میں میرے ایک دوست ایٹمی توانائی پر ایک روسی پروفیسر کے زیرِ نگرانی، ایک زمین دوز تجربہ گاہ میں کام کر رہے تھے۔ میرے دوست کا کہنا تھا کہ لندن یونیورسٹی میں صرف ایک روسی پروفیسر، جو اپنے کمیونسٹ خیالات کے باوجود، یونیورسٹی کے حلقوں میں بڑی عزت سے دیکھا جاتا تھا، اس نے اپنے اس طالب علم کے سپرد ایک دن یہ کام کیا کہ ایک باریک ذرّہ کا فوٹو سوئی کی نوک پر رکھ کر لیا جائے۔ اس کی تصویر، جو پورے ۴۸ گھنٹہ میں بند کمرے میں لینا تھا، انہوں نے یہ کام بڑی توجہ اور محنت سے کیا، اور جب تصویر کو لے کر پروفیسر کے پاس گئے تو انہوں نے فرمایا کہ یہ غلط ہے، پھر کوشش کرو۔ ان کی سمجھ میں نہ آیا کہ ایک نظر میں انہوں نے کیا غلطی پائی۔ دوسری بار بھی تجربہ کیا اور اس بار وہ مطمئن ہوئے۔ انہوں نے دونوں تصاویر کا فرق ان سے دریافت کیا تو انہوں نے فرمایا۔ تم دیکھتے ہو کہ اس ذرّہ کا ایک PATTERN ہے۔ ایک نقشہ۔ اور اس نقشہ میں کبھی فرق نہیں آسکتا۔ یہی یکائی کائنات ہر شئے میں جدا جدا ہے جو اس کو دوسرے سے منفرد کرتی ہے۔ انہوں نے جب غور کیا تو اپنی اس غلطی کو پا لیا۔

لیکن سمجھنے کی بات یہ ہے کہ اس پروفیسر نے ذرہ کی یکائی کو تو پا لیا لیکن اس کی کائنات کی یکائی کو نہ پا سکا۔ یہی فرق اسلامی اور غیر اسلامی مفکرین ہے۔ یہ بات نہیں کہ وہ یہ نہیں جانتا بلکہ اس کا علمِ سائنس جو مشاہدہ پر مبنی ہے جب تک کسی شئے کی تحقیق اس کے مشاہدے سے نہ ہو وہ اس کو ماننے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔

○

دورِ آخر اور آثارِ قیامت

آج جب مہلک ہتھیار، کیمیائی ہتھیاروں کی فراوانی اور ارضی تغیرات سب اس امر کی طرف نشان دہی کر رہے ہیں کہ یہ دنیا ختم ہو جائے گی۔ قیامت آئے گی، لیکن جس قیامت کو سائنس دان اپنے علم مشاہدہ پر مبنی سمجھتا ہے، اصل قیامت اس سے کہیں زیادہ مختلف ہو گی۔ البتہ زمین کے تغیرات کے تحت ان کے قلوب میں کسی عظیم انقلاب کا احساس کروٹیں بدل رہا ہے، اور انہوں نے یہ کوشش شروع کر دی ہے کہ اس زمین کو چھوڑ کر کسی دوسرے سیارہ پر قیام کے طریقہ نکالے جائیں۔ لیکن وہ قیامت، جس کا ذکر اسلام کرتا ہے، ان اسباب کا تابع نہیں۔ وہ امرِ الٰہی سے آئے گی اور ایک خاص وقت پر آئے گی جس کی نشان دہی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی احادیث میں فرمائی ہے۔

یہ قیامت اس وقت آئے گی جب حضرت امام مہدی علیہ السلام ظاہر ہو چکے ہوں گے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام آسمان سے فرشتوں کے جلو میں اللہ کے حکم سے اُتریں گے۔ اس دن آفتاب مغرب سے طلوع ہو گا۔ فتنۂ دجال اپنے شباب پر ہو گا۔ دجال کی حکومت ہو گی۔ اللہ کا ماننے والا کوئی نہ ہو گا۔ وہ دجال جس کے پاس پانی آگ ہو گا اور آگ ٹھنڈا پانی یعنی حق باطل ہو گا اور باطل حق۔

یہ ایمان تو کتبِ آسمانی اور انبیاء علیہم السلام کے فرمودات پر ایمان لا کر ہی آسکتا ہے۔ تحقیق سے تو صرف قیامت کے دن قیامت قائم ہونے کے بعد اس کی حقانیت معلوم ہو گی۔ اس وقت اس پر ایمان لانا کیا کام آئے گا بہرحال سائنسی تجربات کی گرم بازاری ہے، افادیت سے زیادہ ہلاکت کی

طرف اس کے قدم تیزی سے بڑھ رہے ہیں۔ غرض جسم انسانی سے لے کر
زراعت، انڈسٹری، تعلیم حصولِ معاش کے فروغ کے لئے جن زرّیں اصولوں
پر انسانیت کو گامزن ہونا ہے، اسلام اس کی جانب رہبری فرماتا ہے۔
اس کو آج کا طالب علم مجھ سے کہیں بہتر جانتا ہے۔

اسلام کے ان اصولوں کو ماننا نہ ماننا

ہمارا کام ہے۔ نورِ مبین صلی اللہ علیہ وسلم کے ذمہ تو صرف اسلامی حقائق کو
بتانا، سمجھانا، منوا لینا ہے۔ پھر کسی کا ایمان لانا یہ حضورؐ کا کام نہیں۔ ہدایت
اللہ ہی دیتا ہے۔ اگر مسلمانوں نے علم میں برتری کی ذمہ داری کو دوسروں
کے حوالے کر دیا ہے تو اس کا خمیازہ انہیں ہی برداشت کرنا پڑ رہا ہے اسلام
کو نقصان نہ پہنچ سکتا ہے اور نہ پہونچے گا۔ اللہ ربّ العزّت کی صفاتِ کاملہ
اور اس کے حقائق کی ترجمانی اللہ کے نام کے ساتھ نہ سہی لیکن بہر حال ہو رہی
ہے۔ جس کی جلوہ گری عزتِ نفس کی حد تک ہے اور ایک دن ان کو خود
اپنے نفس کے تقاضوں کے خلاف، اس حقیقت کا اعتراف جبراً، طوعاً
کرہاً کرنا پڑے گا۔

اس وقت

حقائق نظروں کے سامنے ہوں گے۔ اور پھر اعتراض کی گنجائش نہ ہو گی جس
کا ذکر اگلے باب میں آئے گا۔

چند احادیثِ مبارکہ پر اس باب کو ختم کیا جاتا ہے

○

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
قیامت ہرگز قائم نہ ہو گی جب تک اس سے پہلے دس نشانیاں ظاہر نہ ہوں

① دھواں۔ ② دجّال۔ ③ دابۃ الارض۔ ④ سورج کا مغرب سے طلوع ہونا۔ ⑤ عیسیٰ ابن مریمؑ کا ظہور۔ ⑥ یاجوج ماجوج۔ اور تین بڑے خسوف۔ ⑦ مغرب میں زمین میں دھنس جانا۔ ⑧ مشرق میں زمین کا دھنس جانا۔ اور ⑨ جزیرۂ عرب میں زمین کا دھنس جانا۔ اور آخر میں ⑩ ایک آگ جو یمن سے اُٹھے گی اور لوگوں کو ہانکتی ہوئی محشر کی طرف لے جائے گی۔ (مسلم، کتاب الفتن صفحہ ۳۳۶)

ان کا ذکر قرآنِ حکیم میں الگ الگ ملتا ہے۔

○

مستند حدیث پر مبنی قیامت کی چند نشانیاں حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی نے مختصراً یوں بیان فرمائی ہیں: "لوگ خدائی مال کو اپنی مِلک سمجھنے لگیں گے اور زکوٰۃ کو ڈانڈ کی طرح بھاری سمجھیں گے، امانت کو اپنا مال سمجھیں گے۔ مرد بیوی کی تابعداری کرے، ماں کی نافرمانی کرے اور باپ کو غیر سمجھیں اور دوست کو اپنا سمجھیں اور دین کا علم دنیا کمانے کے لئے حاصل کریں۔ سرداری اور حکومت ایسوں کو ملے جو سب میں نکمّے ہوں یعنی بدذات اور لالچی اور بدخلق اور جو جس کام کے لائق نہ ہو وہ کام اس کے سپرد ہو۔ اور لوگ ظالموں کی تعظیم اور خاطر اس خوف سے کریں کہ یہ ہم کو تکلیف نہ پہنچائیں۔ "پچھلے لوگ امت کے پہلے لوگوں کو بُرا سمجھیں۔ ایسے وقت میں ایسے ایسے عذاب کے منتظر رہو...... ایسے وقت میں ظلم و قتل عام ہوگا، باہمی جنگیں ہوں گی۔ اور (مدینہ کے قریب ایک جگہ ہے) خیبر تک نصاریٰ کی حکومت ہوگی۔ اس وقت مسلمانوں کو فکر ہوگی کہ حضرت امام مہدی علیہ السّلام کو تلاش کرنا چاہیئے تاکہ ان مصیبتوں سے جان چھوٹے۔ اس وقت حضرت مہدی علیہ السّلام

مدینہ میں ہوں گے، اور اس ڈر سے کہ کہیں حکومت کے لئے نہ کہیں (لوگ)
حکومت کے لئے میرے سر نہ ہوں، مدینہ منورہ سے مکّہ معظمہ چلے جائیں گے
اور اس زمانہ میں ولی جو ابدال کا درجہ رکھتے ہیں سب امام علیہ السلام کی تلاش
میں ہوں گے۔ غرض امام خانۂ کعبہ کا طواف کرتے ہوں گے اور حجرِ اسود اور
مقامِ ابراہیم کے درمیان ہوں گے اور بعض نیک لوگ ان کو پہچان لیں گے
اور ان کو زبردستی گھبر گھار کر ان سے حاکم بنانے کی بیعت کر لیں گے۔ اور اس
بیعت میں ایک آواز آسمان سے آئے گی جس کو سب لوگ جتنے وہاں ہوں
گے سُنیں گے، وہ آواز یہ ہوگی: "اللہ تعالیٰ کے خلیفہ یعنی حاکم بنائے ہوئے امام
مہدی ہیں اور حضرت امام کے ظہور سے بڑی نشانیاں قیامت کی شروع
ہوتی ہیں۔" (از بہشتی زیور صفحہ ۵۱-۵۲، مولانا تھانوی رحؒ)

اس کے بعد وہ نشانیاں ظاہر ہوں گی جن کا ذکر حدیثِ بالا میں آچکا ہے۔
یہی حالات کسی قدر تفصیل سے حضرت مولانا رفیع الدین محدّث دہلوی رحؒ نے
علاماتِ قیامت میں اور حضرت مولانا بدرِعالم صاحبؒ نے اپنی کتاب ترجمانُ
السُنّۃ میں کئے ہیں۔ ہمیں ان کی ترتیب میں ممکن ہے کہ کچھ فرق نظر آئے لیکن
اس سے اصل واقعہ کے ثبوت میں فرق نہیں آتا، یعنی فتنۂ دجّال اور ظہورِ
امام مہدی علیہ السلام۔

حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا: فتنہ نجد سے اُٹھے گا۔ وہاں زلزلے آئیں گے،
وہاں سے شیطان کا سینگ طلوع ہوگا۔

(بخاری شریف جلد سوم صفحہ ۲۴۷ کتاب الفتن)

کیا یہ فتنہ شروع نہیں ہوچکا ہے؟ دجّال کے متعلق صرف چند احادیث پر
اکتفا کیا جاتا ہے۔

اسماء بنت یزیدؓ بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم میرے گھر تشریف فرما

تھے۔ آپؐ نے دجال کا ذکر فرمایا اور فرمایا کہ اس کے ظہور سے پہلے تین قحط پڑیں گے۔ ایک سال آسمان کی ایک تہائی بارش رُک جائے گی اور زمین کی پیداوار بھی ایک تہائی کم ہو جائے گی۔ دوسرے سال آسمان کی دو حصے بارش رُک جائے گی اور زمین کی پیداوار دو حصے کم ہو جائے گی اور تیسرے سال آسمان سے بارش نہ برسے گی اور زمین کی پیداوار بھی کچھ نہ ہو گی حتیٰ کہ جتنے حیوانات ہیں خواہ وہ کھُر والے ہوں یا ڈاڑھ سے کھانے والے سب ہلاک ہو جائیں گے اور ان کا سب سے بڑا فتنہ یہ ہو گا کہ وہ ایک گنوار آدمی کے پاس آکر کہے گا اگر میں تیرے اونٹ زندہ کر دوں تو کیا اس کے بعد بھی تجھ کو یقین نہ آئے گا کہ میں تیرا رب ہوں؟ کہے گا ضرور، اس کے بعد شیطان اسی کے اونٹ کی سی شکل بن کر اس کے سامنے آئے گا جیسے اچھے تھن اور بڑے کوہان والے اونٹ ہوا کرتے ہیں۔ اسی طرح ایک اور شخص کے پاس آئے گا جس کا باپ اور سگا بھائی گزر چکا ہو گا اور اس سے آکر کہے گا بتلا اگر میں تیرے باپ بھائی کو زندہ کر دوں تو کیا تجھے پھر بھی یقین نہ آئے گا کہ میں تیرا رب ہوں؟ وہ کہے گا کیوں نہیں؟ بس اس کے بعد شیطان اس کے باپ بھائی کی صورت بن کر آجائے گا۔ حضرت اسماءؓ کہتی ہیں کہ یہ بیان فرما کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ضرورت سے باہر تشریف لے گئے اس کے بعد لوٹ کر دیکھا تو آپؐ کے اس بیان کے بعد سے بڑے فکر و غم میں پڑے ہوئے تھے۔ اسماء کہتی ہیں کہ آپؐ نے دروازہ کے دونوں کواڑ پکڑ کر فرمایا۔ اسماء کہو کیا حال ہے؟ میں نے عرض کی یا رسول اللہ! دجّال کا ذکر سن کر ہمارے دل تو سینے سے نکلے پڑتے ہیں اس پر آپؐ نے فرمایا اگر وہ میری زندگی میں ظاہر ہوا تو میں اس سے نمٹ لوں گا ورنہ میرے بعد پھر ہر مومن کا نگہبان میرا رب ہے۔ میں نے عرض کی یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! ہمارا حال جب آج یہ ہے کہ ہم آٹا گوندھنا چاہتے ہیں مگر غم کے مارے اس کو اچھی طرح گوندھ بھی نہیں سکتے چہ جائیکہ روٹی پکا سکیں

بھوکے ہی رہتے ہیں تو بھلا اُس دن مومنوں کا کیا حال ہوگا جب یہ فتنہ آنکھوں کے سامنے آجائے گا۔ آپؐ نے فرمایا اس دن ان کو وہ غذا کافی ہوگی جو آسمان کے فرشتوں کی ہے یعنی اللہ تعالیٰ کی تسبیح و تقدیس۔ (احمد)

(بحوالہ ترجمان السنّہ ص ۴۱۷ - ۴۱۸)

اس کے علاوہ بھی دجّال کا بیان تفصیل سے احادیث میں آتا ہے، جن پر ایمان ہی سے رہنمائی ملتی ہے۔ یہ بھی حدیث شریف میں آتا ہے کہ اس کی پیشانی پر ک۔ ف۔ ر لکھا ہوگا، جسے ہر مومن خواہ عالم ہو یا جاہل پڑھ لے گا۔ اس کی جنت و دوزخ بھی ہوں گی۔ مگر حدیث کے مطالعہ سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ "یہ سب کچھ بازی گر کے تماشہ سے زیادہ نہ ہوگا۔" چنانچہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام تشریف لا کر اُسے قتل کر دیں گے۔ جس طرح دجّال کا فتنہ شیطانی قوتوں کا مظہر بنے گا اس طرح حضرت مہدی علیہ السلام کی تشریف آوری ملکوتی قوتوں کا مظہر ہوگی۔ یعنی اللہ رب العزت کی تائیدِ غیبی اور کرم اور یہ بھی فیضانِ نبوّت ہوگا۔ چنانچہ حضرت امام مہدی علیہ السلام کے متعلق احادیث میں آتا ہے۔

عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دنیا کا اس وقت تک خاتمہ نہ ہوگا جب تک میرے ہی اہل بیت میں سے ایک شخص عرب پر حاکم نہ ہو جو میرے ہم نام ہوگا۔

(ترمذی شریف) [1]

سعید بن المسیبؒ بیان فرماتے ہیں کہ ہم اُم المومنین اُمّ سلمہؓ کے پاس حاضر تھے، ہم نے امام مہدیؑ کا ذکر کیا۔ انہوںؓ نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ

---

[1] ترجمان السنۃ صفحہ ۳۸۴۔

صلی اللہ علیہ وسلم سے خود سنا ہے کہ امام مہدیؑ حضرت فاطمہ کی اولاد ہوں گے۔
(ابن ماجہ) ؎۱

ثوبان جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ غلام تھے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب تم دیکھو کہ سیاہ جھنڈے خراسان کی جانب سے آ رہے ہیں تو ان میں شامل ہو جانا۔ اگرچہ برف کے اوپر گھٹنوں کے بل چلنا ہی کیوں نہ پڑے کیونکہ ان میں اللہ تعالیٰ کا خلیفہ مہدیؑ ہوگا۔ (احمد و بیہقی) ؎۲

حضرت عبد اللہ بن عمرو کہتے ہیں کہ عیسیٰ ابن مریمؑ، امام مہدیؑ کے بعد نازل ہوں گے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام ان کے پیچھے (ایک) نماز ادا کریں گے۔ ؎۳

- حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میری امت میں ایک طائفہ حق کے لئے ہمیشہ مقابلہ کرتا رہے گا یہاں تک کہ عیسیٰ ابن مریمؑ امام مہدیؑ کی موجودگی میں بیت المقدس میں طلوعِ فجر کے وقت اتریں گے۔ ان ؑ سے عرض کیا جائے گا یا نبی اللہ آگے تشریف لائیے اور ہم کو نماز پڑھا دیجئے۔ وہ فرمائیں گے یہ امت خود ایک دوسرے کے لئے امیر ہے (اس لئے اس وقت تو یہی پڑھائیں)۔ یہ روایت صحیح مسلم میں بھی ہے مگر اس میں "مہدی" کی جگہ اَمِیرُھُم کا لفظ ہے۔ اس کے بعد عیسیٰ علیہ السلام کا جواب مذکور ہے۔ ؎۴

گویا

اہلِ بیت کا فیض "تا قیامت" جاری رہے گا کہ اس نورِ مبین کا ظہور ہی اس لئے ہے کہ اللہ کے بندوں کو اللہ سے ملانے والے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے

؎۱ ترجمان السنۃ صفحہ ۳۸۵۔ ؎۲ ترجمان السنۃ صفحہ ۳۹۰

؎۳ ترجمان السنۃ صفحہ ۳۹۵ ؎۴ ترجمان السنۃ صفحہ ۳۹۹۔

آلؓ و اصحابؓ آسمان پر ستارے اور زمین پر کشتی بن کر اُن کے مداوِن حال ہوں۔

اس آخری دور میں

انہیں آلِ رسولؐ اور صحابہ کرامؓ کی محترم اولاد ولایتِ عظمیٰ پر فائز ہو کر امت کی ہدایت کے لئے مامور ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

کہ میں تمہارے درمیان دو چیزیں چھوڑے جاتا ہوں۔ (۱) قرآنِ حکیم (۲) اسوۂ رسولؐ۔ دوسری حدیث میں ہے (۱) قرآنِ حکیم (۲) میرے اہل بیتؓ [۱]۔

یہی نہیں

بلکہ خاتونِ جنت رضی اللہ عنہا، اہلِ جنت میں خواتین کی سردار ہوں گی۔

اور

سیدنا امام حسنؓ و حسینؓ، نوجوانانِ جنت کے سردار ہوں گے)

اور

پھر قرآن و حدیث میں ان بزرگ ہستیوں کے لئے مغفرتِ الٰہی، رضائے الٰہی اور اجرِ عظیم کے وعدے ہیں۔ انہیں میں عشرہ مبشرہ، خلفائے راشدین، صحابہ کرام، سب اہلِ بیتِ رسولؐ، ازواجِ مطہرات، سیدنا حمزہ، حضرت جعفر صادق، رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین اور مسلمانوں کی ایک کثیر جماعت جن میں کثرت سے سابقون الاولون اور صالحین میں سے ہوں گے، اور گنہگار بھی محروم

---

[۱] مشکوٰۃ شریف جلد سوم، باب مناقب اہلِ بیت النبی صلی اللہ علیہ وسلم، فصلِ دوم، عن جابر رضی اللہ عنہ "اگر تم اس کو مضبوط پکڑے ہو تو کبھی گمراہ نہ ہو گے

اور وہ چیز ایک تو خدا کی کتاب ہے! اور دوسرے میرے اہلِ بیت میں سے میری عترت (یعنی جدی اولاد) ترمذی شریف)۔

شفاعت نہ ہوں گے۔ جو اِن کا بڑا سہارا ہے۔

○

آخر میں دعا ہے کہ

اللہ رب العزت ہمیں اس آگ سے بچائے جو لوگوں کو ہانکتی ہوئی محشر کی طرف لے جائے گی۔ اور

محض اپنے لطف وکرم سے ہمیں

ایمان پر ثابت قدم رکھے کہ دامنِ رحمت ہمارے ہاتھ سے نہ چھوٹے۔ ہمارا حشر اُنہیں مبارک صلی اللہ علیہ وسلّم کے قدموں میں ہو۔

اَللّٰھُمَّ

یَاحَیُّ یَاقَیُّوْمُ ثَبِّتْنِیْ عَلَی الْاِیْمَانِ

وَصَلَّی اللّٰہُ عَلَی النَّبِیِّ الْاُمِّیِّ وَاٰلِہٖ

و

باب ہفتم

نورِ مُبینؐ

قیامِ قیامت سے مقامِ محمود تک

(مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَہٗٓ اِلَّا بِاِذْنِہٖ)

مقامِ اِذن پہ فائز نبیؐ
کا دورِ شفاعت اور مقامِ محمود پر حضورؐ کا قیام

○

مستغرقِ گناہیم ہر چند عذر خواہیم
پژمردہ چوں گیاہیم، بارانِ ما محمدؐ
(خواجہ معین الدین چشتیؒ)

○

سُنا ہے حشر میں شانِ کرم بے تاب نکلے گی
لگا رکھا ہے سینہ سے متاعِ ذوقِ عصیاں کو
(اصغر گونڈویؒ)

○

باب ہفتم

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ وَهُمْ فِيْ غَفْلَةٍ مُّعْرِضُوْنَ ○

لوگوں کے حساب (اعمال کا وقت) نزدیک آ پہنچا ہے اور وہ غفلت میں (پڑے اس سے) منہ پھیر رہے ہیں۔

قرآن حکیم کی ابتدا بائے بِسْمِ اللّٰهِ سے ہے، اور کائنات کی ابتدا نورِ محمدی صلّی اللہ علیہ وسلّم سے۔ نورِ محمدی گویا کائنات کی بِسْمِ اللّٰهِ ہے اور یہ کائنات اسمِ اللہ کے جلووں سے عبارت ہے جہاں بِسْمِ اللّٰهِ کے الف کو حجاب میں رکھ کر بائے بِسْمِ اللّٰهِ سے بدایت (ابتدا) ہوئی۔ گویا اللہ ربّ العزت نے اپنے کو حجاب میں رکھ کر نورِ محمدیؐ کو آشکارا کیا۔ نورِ مبین صلّی اللہ علیہ وسلّم نے اپنے رب کی ذات وصفات کے نغموں سے کائنات کو معمور فرمادیا۔ آخر وہ وقت آگیا کہ اللہ ربّ محمدؐ، اپنے حبیب صادق الامینؐ کے ہر قول وفعل کی صداقت وحکمت کو ظاہر کرے، اور انؐ پر اور انؐ کے قبل آنے والے مرسلینؑ پر ایمان لانے والوں کی میزبانی فرمائے، ایسی میزبانی جو ربّ العزت ہی کی شایانِ شان ہے۔ اور آپؐ کا اور جملہ انبیاء کرام کا انکار کرنے والوں کو ان کے تکبّر کا مزا چکھلائے ایسا عذاب جو اللہ تعالیٰ ہی دے سکتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ جو مرا اس کی قیامت قائم ہوگئی

سرورِ کائنات صلّی اللہ علیہ وسلّم کی زبانِ مبارک سے ربّ العزت نے قیامت کی ایک ایک بات کی خبر دی۔ جو قرآن نے کہا اور جو تشریح حضورؐ کے لئے چھوڑ دی، حضور سرورِ عالمؐ نے سب ہی بیان فرمائیں۔ ساتھ ہی حضورؐ نے

امّت کو ضروری احتیاطیں بتائیں سمجھائیں، اور اُن کی بخشش کے لئے دُعاگو رہے، تاکہ جس دن ندا دی جائے گی لِمَنِ الْمُلْکُ الْیَوْمَ اور جواب دیا جائے۔ لِلّٰہِ الْوَاحِدِ الْقَھَّارِ، وہ اس دن کے قہر و غضب سے محفوظ رہیں۔

تعلیم یہی دی کہ دیکھو اللہ سے ڈرو اور ہرگز نہ مرو مگر مسلمان ہونے کی حالت میں۔ یعنی موت کے وقت ایمان کی دولت سے سرفراز رہو۔

پھر

حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم نے اپنے وصال سے تین دن پہلے، ایک نسخۂ کیمیا امّتِ مرحومہ کو مرحمت فرمایا، جس کی خبر حضرت جابرؓ نے دی کہ حضورؐ نے فرمایا "دیکھو تم میں سے کوئی اس وقت تک نہ مرے جب تک وہ اللہ سے حُسنِ ظن نہ رکھتا ہو" (مسلم شریف)

(یعنی اس بات پر یقین رکھتا ہو کہ مسلمان ہوں مسلمان مر رہا ہوں، میں گنہگار سہی لیکن میرا رب غفورٌ رحیم ہے۔ مجھے بھی اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلّم کے صدقہ میں ضرور بخش دے۔ یاکریم! یاکریم! یاکریم!) یہ حسنِ ظن بھی کام آجائے گا۔ یہ ہے "حَرِیْصٌ عَلَیْکُمْ" کی شان جو اپنے گنہگار امتیوں کو بخشوانے کے لئے بے تاب ہے۔

ابھی قیامت سے قبل برزخ ہے، یعنی قبر

قبر گویا مرنے والے کے لئے آخرت کا پیش خیمہ ہے۔ حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم نے خبر دی کہ قبر یا تو عذاب کا گڑھا ہے یا جنت کی ایک کھڑکی۔ (یعنی جو کافر کے لئے دائمی عذاب کی اور مومن کے لئے جنت کی راحتوں اور بشارتوں کی موجب ہے۔)

چنانچہ حضرت عثمانؓ ایک قبر پر کھڑے ہو کر اس قدر روئے کہ آپؓ کی داڑھی تر ہو گئی، پوچھا گیا کہ جب آپؓ کے سامنے جنت دوزخ کا ذکر

ہوتا ہے اُس وقت تو آپؓ نہیں روتے اور قبر کو دیکھ کر روتے ہیں۔ انہوںؓ نے فرمایا کہ نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے ارشاد فرمایا کہ قبر آخرت کی پہلی منزل ہے۔ جس نے اِس سے نجات پائی اس کے لئے آئندہ بھی آسانی ہوگی، اور جس نے اس منزل میں آسانی نہ پائی تو آئندہ اُس کے لئے سختی ہی سختی ہے۔

حضرت عثمانؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے ارشاد فرمایا، میں نے قبر سے زیادہ ہولناک چیز کوئی نہیں دیکھی ہے (سنن ابن ماجہ شریف، قبر کا بیان)

حضورؐ نے فرمایا کہ جب تم میں سے کوئی مرتا ہے۔ تو قبر میں اسے صبح و شام اس کا ٹھکانا دکھایا جاتا ہے۔ اگر وہ جنّتی ہے تو جنت کا ٹھکانہ اور اگر دوزخی ہے تو دوزخ کا ٹھکانا، اور کہا جاتا ہے کہ یہ تیرا مقام ہے۔ الغرض قیامت تک اسی طرح ہوتا رہے گا (رواہُ ابنِ عمر۔ ابنِ ماجہ شریف)

اس وقت بھی کلمہ گو کا سہارا رحمتؐ للعالمینؐ ہیں۔

مرنے والے کے عزیز و اقارب، دوست آتے ہیں اور سپردِ خاک کر کے چلے جاتے ہیں۔ مرنے والا اُن کے پیروں کی آہٹ سُنتا رہتا ہے۔ اس کی خواہش ہوتی ہے کہ کاش وہ ٹھہرے رہیں، لیکن وہ اپنے گھروں کا رُخ کرتے ہیں۔ البتہ

"وَاللّٰہُ یَخْتَصُّ بِرَحْمَتِہٖ مَنْ یَّشَآءُ"

اللہ رب العزت نے رحمت کو اپنے اوپر لازم فرمالیا ہے اور جسے چاہتا ہے اپنی رحمتِ خاص سے سرفراز فرماتا ہے۔ لیکن جس ذاتِ مقدسہ کو اپنی رحمت کا وسیلہ، اپنی محبت کا مرقع، اپنے نور کا پیکر بنایا وہ رحمتؐ للعالمینؐ ہیں۔ جس نے آپؐ کی رحمت سے دنیا میں فائدہ اٹھایا۔ سرخرو ہوا۔ جس نے آپؐ کا انکار کیا موجبِ عذاب بنا۔ حضورؐ تو لوگوں کو حشر و نشر کی کیفیات سے آگاہ فرماتے رہے اور بالآخر جب انسان مرا تو اُس نے اپنا حشر خود بھی دیکھ لیا۔

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریمؐ نے ارشاد فرمایا "جب آدمی قبر میں داخل کر دیا جاتا ہے اور جب وہ قبر میں اٹھا کر بٹھایا جاتا ہے تو اسے خوف اور گھبراہٹ نہیں ہوتی۔ پھر اس سے پوچھا جاتا ہے کہ تو کس دین پر تھا۔ وہ جواب دیتا ہے کہ میں دینِ اسلام پر تھا۔ اس سے پوچھا جاتا ہے کہ اس شخص سے متعلق تیرا کیا خیال ہے۔ وہ جواب دیتا ہے کہ آپ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، جو خدا کے پاس سے ہماری جانب واضح دلائل لے کر آئے اور ہم نے انؐ کی تصدیق کی۔ پھر دریافت کیا جاتا ہے کہ تو نے اللہ کو دیکھا ہے۔ وہ جواب دیتا ہے کہ کوئی اللہ کو نہیں دیکھ سکتا۔ اس کے لئے دوزخ کا دریچہ کھول دیا جاتا ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ آگ، آگ کو کھا رہی ہے۔ اس سے کہا جائے گا، دیکھ! یہی وہ مقام تھا کہ جس سے اللہ نے تجھ کو بچا لیا۔ پھر ایک دریچہ جنت کی طرف کھول دیا جائے گا وہ اس کی ترو تازگی اور خوبصورتی کو دیکھے گا۔ اور اس سے کہا جائے گا یہ تیرا ٹھکانہ ہے، تو دنیا میں یقین اور ایمان پر تھا اور اسی پر تیری موت واقع ہوئی۔ تو انشاءاللہ قیامت کے دن اٹھایا جائے گا۔ (اور) بُرے آدمی کو جب قبر میں اٹھا کر بٹھایا جائے گا تو وہ ڈرتا اور گھبراتا ہوگا۔ اس سے دریافت کیا جائے گا، تو دنیا میں کس مذہب پر تھا۔ وہ کہے گا افسوس میں نہیں جانتا۔ اس سے دریافت کیا جائے گا کہ اس شخص کے بارے میں کیا رائے ہے۔ وہ کہے گا میں نے لوگوں کو اس کے بارے میں کچھ کہتے سنا تھا۔ جو وہ کہتے تھے میں بھی کہتا تھا۔ اس کے لئے جنت کی جانب ایک کھڑکی کھول دی جائے گی دیکھ! تیرا یہ مقام تھا لیکن اللہ نے تجھے اس سے محروم کر دیا (یعنی اپنے ایمان و اعمال کے باعث تو اس سے محروم کر دیا گیا) پھر دوزخ کی کھڑکی کھول دی جائے گی جہاں آگ آگ کو کھا رہی ہوگی۔ اس سے کہا جائے گا، یہ تیرا ٹھکانا ہے۔

تو تمام زندگی شک کی حالت میں رہا اور شک کی حالت میں مرا اور انشاء اللہ تعالیٰ تیرا حشر بھی اسی حالت میں ہوگا۔" (مشکوٰۃ شریف، نسائی، ابوداؤد، ابن ماجہ)

جن کے دل ایمان سے معمور ہیں یعنی جن کے دل حضورؐ رحمتہؐ للعالمینؐ کی محبت سے زندگی پاتے ہیں۔ اور اُنؐ کا کہا ماننے میں لذت محسوس کرتے ہیں اُن کے لئے قبر ہی جنت کا پیش خیمہ بن جاتی ہے۔

ایک بار کسی شخص نے اپنے مرشد سے پوچھا کہ ہم گنہگاروں کا کیا حال ہوگا۔ انہوں نے جواب دیا "پگلے! مومن گنہگار جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھے گا تو قدموں سے لپٹ جائے گا، پھر کہاں کا حشر اور کہاں کا نشر۔ صلّوا علیہ و آلہٖ۔ وہ خوش نصیب ہوگا جو اُنؐ کے قدموں سے ہم آغوش ہوجائے۔" یہ محبت کی بات ہے۔ لیکن نورِ ایمان و عمل سے جگمگاتے ہوئے اسلام کے درخشندہ نجوم کی بات کچھ اور ہی ہوگی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک قبر کی حالت بیان کرتے ہوئے سیدنا حضرت عمرؓ سے فرمایا:

"اے عمرؓ جب تجھے لوگ دفن کرکے واپس لوٹیں گے، تو تیرے پاس قبر کے دو جانچنے والے منکر نکیر آئیں گے جن کی آواز سخت رعد کی سی اور آنکھیں اُچکنے والی بجلی کی سی ہوں گی، بال اُن کے گھسٹے ہوں گے اور تیری قبر کو اپنی کچلیوں سے اُدھیڑ کر تجھے جھڑک جھڑک کر ہلا ڈالیں گے۔ اُس وقت اے عمرؓ تیرا کیا حال ہوگا۔" حضرت عمرؓ نے عرض کیا کہ حضورؐ! میری عقل بھی اس وقت میرے پاس ہوگی جیسے اب ہے۔ آپؐ نے فرمایا، ہاں۔ حضرت عمرؓ نے عرض کیا کہ کچھ فکر نہ فرمایئے میں اُن کو کافی ہوں۔

"حضرت امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث صحیح ہے کہ مرنے کے بعد عقل نہیں بدلتی، صرف اعضاء بدل جاتے ہیں۔ اور مُردہ عاقل اور مدرک درد و راحت کا رہتا ہے جیسا کہ زندگی میں تھا۔" (احیاء العلوم۔ جلد چہارم)

وہ نبی کریم، وہ رحمۃ للعالمین، جو اپنی امت کے گناہوں سے بھی آگاہ تھے، اور اللہ کے کرم اور غفر کی وسعتوں سے بھی، جنہوں نے غم امت ہی کو اپنا غم بنایا اُن کی یہ بھی کرم نوازیاں ہیں کہ تمام مسلم مومن مردوں اور عورتوں کو ہدایت فرما گئے کہ جب بھی مغفرت کی دعا کرو تو صرف اپنے لئے نہیں، بلکہ اپنے ساتھ اپنے والدین اور تمام مسلمانوں کے لئے بھی کرو۔ اور جب خیر کی تمنا کرو تو اپنے سب بھائیوں کے لئے بھی۔ اور جب کوئی تمہارا عزیز اللہ کو پیارا ہو جائے تو اس کے لئے ایصالِ ثواب سے غافل نہ ہو۔ قرآنِ حکیم کی تلاوت، غربا کو کھانا کھلانا، یتیم کی نگہداشت اور جو کارِ خیر کسی مسلمان کے لئے کروگے وہ اس کو تمہاری طرف سے تحفہ ہوگا، جو اس عذاب کو اُس سے ہلکا کرنے یا اس کا مقام بلند کرنے کا ضامن ہوگا اور تم کو بھی تمہاری امیدوں سے زیادہ اس کے ثواب سے سرفرازی ملے گی۔ (ترتیب شریف[1])

یہ سب اسی لئے تو ہے کہ ہر کلمہ گو کو مرنے کے بعد جلد سے جلد ہر عذاب سے گلوخلاصی حاصل ہو جائے۔ یہ محبت کی انتہا نہیں تو کیا ہے۔ ہمارے لئے اللہ رب العزت کی بارگاہ میں راتوں کو رونا، مغفرت کی دعائیں کرنا، آن صلی اللہ علیہ وسلم کی فطرتِ مبارکہ تھی۔ اور آپؐ آج بھی یہ کام امت کے دردمندوں کو سونپ کے خود ان کے نگرانِ حال بنے ہوئے ہیں سبحان اللہ اِن کرم نوازیوں کا کیا ٹھکانا!

عذابِ قبر کے بھیانک نقشے جو قرآن و حدیث میں کفار کے لئے مذکور ہیں۔ دراصل اِس میں وہ سب بھی شامل ہیں جو اپنے فرائض سے غافل

---

[1] اقتباس از کتاب العمل بالسنۃ المعروف بہ ترتیب شریف الحزب الواہب للحسنات۔ مولفہ حضرت برکت علی مدظلہٗ لودھیانوی

رہے، اور اُن کبائر میں مبتلا ہو گئے جو ان کی تباہی کا باعث بنے۔ جن کی چیخیں اور نالے انسان وجن کے علاوہ چرند پرند سب سُنتے ہیں اور یہ عذاب کفار کے لئے تاقیامت جاری رہے گا۔ اور گنہگاروں کی اصلاحِ حال تک۔ یہاں تک کہ

"نفخ فی الصور"

ہوگا۔ پہلی بار صور پھونکا جائے گا جس کا ذکر قرآنِ کریم میں تفصیل سے آیا ہے۔ حضور سرورِ کائنات صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا کہ جو چاہتا ہے کہ روزِ قیامت کو اس طرح دیکھ لے گویا وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے۔ تو وہ

اِذَا السَّمَآءُ انْفَطَرَتْ اور اِذَا السَّمَآءُ انْشَقَّتْ

کو پڑھے۔ (سورۃ انفطار وسورۃ انشقاق) (احمد وترمذی) (مشکوٰۃ شریف)

آخرت کی اہمیت کے پیشِ نظر قرآنِ حکیم میں بار بار قیامت کی حقیقت، ضرورت، احوال، کیفیات کا نہایت پُراثر انداز سے ذکر آتا ہے، خصوصاً قرآنِ حکیم کے آخری پاروں میں ان میں جو مکّی سورتیں ہیں اُن میں قیامت کے ہولناک حقائق کا بیان ہے الحاقۃ، المعارج، القیٰمۃ، الدّھر، المرسلٰت، النّبا، تکویر، انفطار، انشقاق، وغیرہ

ہر سورہ میں ایک نئے انداز سے اُس کی حقیقت، اس کی اہمیت، اُس کے خوفناک مناظر کا ذکر کیا گیا ہے۔ مثلاً سورہ نبا میں مضمون یوں ہے کہ کفار تو ہر بات پر شک وشبہ ہی میں پڑے ہیں، توحید و رسالت اور اس سے زیادہ آخرت ان کی لایعنی بحث کا موضوع بن گئی ہے، وہ حیرت سے بطور تمسخر ایک دوسرے سے قیامت کے متعلق سوال کرتے ہیں۔

سورہ الحاقّہ میں قیامت کے آنے اور آخرت کے برپا ہونے کا بیان ہے۔ یہ بتایا گیا ہے کہ جن قوموں نے اس کا انکار کیا وہ کس طرح عذاب کی

مستحق ہوئیں۔ پھر قیامت کا ہولناک نقشہ پیش کرنے کے بعد کارِ خیر میں مشغول رہنے کی ہدایت فرمائی گئی تاکہ جنت ہی ہر مومن کا نصیبہ بنے۔

سورۂ قیامت میں قیامت کے متعلق ہر ہر شبہ کا ازالہ کیا جاتا ہے اور قیامت کے برحق ہونے کو ذہن نشین کیا جاتا ہے، ثبوت اور وضاحت کے ساتھ اور خواہشاتِ نفسانی کو انسان کے انکار کی وجہ بتایا جاتا ہے۔ اس کو اپنے نامۂ اعمال کی طرف متوجہ کیا جاتا ہے، جس میں اُس کا ہر فعل مرقوم ہوگا، اور اُس وقت جب کوئی عذر یا بہانہ کام نہ آسکے گا۔

اِس طرح المرسلٰت میں بتایا جاتا ہے کہ قرآن آخرت کی جو خبر دے رہا ہے، وہ یقیناً حق ہے۔ جس قادرِ مطلق نے اِس نظامِ کائنات کو قائم کیا۔ اور اس کو حسنِ تدبیر سے آراستہ کرنے کے ساتھ اُس میں تبدیلیاں فرماتا رہا۔ اس کے لئے اس کو درہم برہم کر دینا کیا مشکل ہے۔ اور اس کے لئے اِس کائنات کو دوسرے نظام پر منتقل کرنا کیا دشوار ہے۔ قادرِ مطلق کا کوئی فعل بے مقصد نہیں اور نہ وہ دن جسے قیامت کہتے ہیں بلکہ وہ دن تو اس جہان کا ایک لازمی جزو ہے جہاں اعمال کی پرسش ہو اور میزانِ عدل قائم ہو۔ مکذبین جو رسولؐ اور آخرت کا انکار کرتے رہے، انہیں اُن کے انکار کی سزا ملے، اور اہلِ ایمان کو انعام سے نوازا جائے۔ جن دو صورتوں کا ذکر قرآن و احادیثِ شریفہ میں خصوصیت سے آیا ہے (یعنی وعدے اور وعید)، ہم اس کی چند آیات نقل کرتے ہیں۔ تاکہ وہ نقشہ جو اہلِ ایمان کے قلوب میں ہے ایک بار ان کے سامنے آجائے اور وہ سمجھ لیں کہ جو عقیدۂ آخرت ابتدائی سورتوں میں ذہن نشین کیا گیا تھا اس کا ایک مجملاً مرقع کیا ہے۔

سورۂ انفطار (۸۱) سے قبل سورہ التکویر ہے جس کا خلاصہ تھا: عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّآ اَحْضَرَتْ (ہر شخص روزِ قیامت جان لے گا کہ وہ کیا لے کر آیا

ہے) (آیت ۱۴)

اب سورۃ انفطار میں بتایا جا رہا ہے

(۱) کہ جب آسمان پھٹ جائے گا۔ (۲) اور جب تارے جھڑ جائیں گے۔ (۳) اور جب سمندر (بہہ کر) مل جائیں گے (یعنی ان کا پانی گرم لاوے کی طرح زمین پر بہہ نکلے گا (۴) اور جب قبریں اکھاڑ دی جائیں گی (یعنی قبروں سے مردے اٹھائے جائیں گے۔) (۵) عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ وَاَخَّرَتْ۔ اِس دن ہر شخص جان لے گا جو (اعمال) اُس نے آگے بھیجے تھے۔ اور جو اثرات اس نے دنیا میں) پیچھے چھوڑے تھے۔ پھر بتایا گیا ہے کہ یاد رکھو، کراماً کاتبین تم پر نگہبان مقرر کیے گئے ہیں، اور وہ حرف حرف صحیح لکھتے ہیں۔ بلاشبہ نیک لوگ بہشت میں اور بدکار دوزخ میں ہوں گے۔ (یہی وہ روزِ جزا ہے جس کے متعلق قرآن میں پڑھا کرتے تھے) یَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَيْـًٔا وَّالْاَمْرُ يَوْمَئِذٍ لِّلّٰهِ (۸۲ : ۱۹)

(ترجمہ) آیت (۱۹) جس دن کوئی شخص کسی کے کام نہ آئے گا (نفسا نفسی پڑی ہو گی سب رشتے ناطے ٹوٹ جائیں گے) اور اُس دن حکم صرف اللہ کا ہو گا۔ (اس کے آگے دم مارنے کی مجال نہ ہو گی سوائے اُس کے) جسے اللہ اجازت دے اور جس کی سفارش کا حکم دے اور دنیا میں جو تھوڑے بہت اختیارات لوگوں کو ملے ہوئے تھے وہ سب سلب ہو جائیں گے، اور ہر حکم اس دن صرف اللہ ہی کا ہو گا۔

اِس طرح سورہ الانشقاق (۸۴) جس کا ذکر حدیث شریف میں آیا ہے، اس میں آخرت کا بیان یوں آتا ہے (۱) جس دن آسمان پھٹ جائے گا (۲) اور اپنے پروردگار کا حکم بجا لائے گا (حکم ماننے میں ذرا دیر نہ ہو گی)، اور اس کے لئے لازم بھی یہی ہے (۳) اور جب زمین (کھینچ کر) پھیلا دی

جائے گی (۴) اور اپنے اندر کے خزانے باہر پھینک دے گی اور خالی ہو جائے گی (۵) اور وہ اپنے رب کا حکم بجالائے گی۔ اور اُس کے لئے لازم بھی یہی ہے۔

(جب یہ آسمان وزمین اللہ کے حکم کے یوں تابع ہیں کہ تعمیلِ امر میں ذرا دیر نہیں کرتے تو اے انسان! کیا تجھے بھی یہی سزاوار نہیں کہ تو اس کے حکم کا تابع رہے)

پھر سورت میں تعمیلِ امر کرنے والوں کی جزا اور ان بدنصیبوں کی سزا کا ذکر ہے، جن کا نامۂ اعمال بائیں ہاتھ میں دیا جائے گا، اور دردناک عذاب ان کا نصیبہ ہوگا۔

مختلف احادیث مبارک میں ان حالات کا بیان الگ الگ تفصیل سے آتا ہے، جس کے اشارے قرآنِ حکیم میں مختلف سورتوں میں ملتے ہیں۔

نفخِ صور

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ حضورؐ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دونوں نفخوں کے درمیان چالیس کا فاصلہ ہوگا۔ لوگوں نے پوچھا، کیا چالیس دن کا۔ سرورِ کائناتؐ نے فرمایا کہ میں نہیں کہہ سکتا۔ پھر لوگوں نے دریافت کیا، چالیس ماہ کا؟ آپؐ نے کہا کہ میں نہیں کہہ سکتا۔ پھر حاضرین نے کہا چالیس سال کا، آپؐ نے وہی جواب دیا۔ اس کے بعد آسمان سے پانی برسے گا جس سے لوگ اس طرح اُگیں گے جیسے سبزہ اُگتا ہے۔ انسان کے بدن میں ایک ہڈی کے علاوہ ہر چیز گل جاتی ہے، وہ ہڈی ریڑھ کی ہڈی ہے، اِس سے لوگ قیامت کے دن پیدا ہوں گے (واضح رہے کہ انبیاء کرامؑ اِس سے مستثنیٰ ہیں کہ ان کے اجسام زمین پر حرام کر دیئے گئے ہیں۔) (مسلم)

غرض جب پہلے نفخِ صور پر ہر شئے نیست و نابود ہو جائے گی، ہر جاندار شئے خوف کی شدّت سے مر جائے گی۔ آسمان پھٹ جائیں گے، پہاڑ روئی کے گالوں کی طرح اڑیں گے، اور صرف چار فرشتے حضرت جبرئیلؑ، میکائیلؑ، حضرت اسرافیلؑ اور عزرائیلؑ رہ جائیں گے۔ پھر ملک الموت کو حکمِ الٰہی ہوگا کہ اوّل جبرئیلؑ کی روح نکالیں، پھر حضرت میکائیلؑ کی پھر حضرت اسرافیلؑ کی پھر ملک الموت کو حکم ہوگا کہ وہ خود مر جائیں اور چالیس سال تک خلقِ اوّل صور پھونکے جانے کے بعد عالمِ برزخ میں رہے گی۔

وَ نُفِخَ فِی الصُّوْرِ

پھر اللہ تعالیٰ حضرت اسرافیل کو زندہ فرما کر حکم دے گا کہ دوسری دفعہ نرسنگھے میں پھونک ماریں۔ "نفخ فی الصور جس کا ذکر یٰسٓ شریف میں آیا ہے تو اس وقت سب لوگ زندہ ہو جائیں گے، اور قبر سے اُٹھ کر اپنے رب کی طرف بھاگیں گے، اور کہیں گے کہ یہی ہے وہ جس کا وعدہ خدائے رحمٰن نے کیا تھا اور رسولوں نے سچ کہا تھا۔ وہ ایک چنگھاڑ ہوگی پھر سب کے سب اس وقت ہمارے (اپنے رب کے) سامنے حاضر کر دیئے جائیں گے۔"

سوچو! کہ اس سراسیمگی میں لوگوں کا کیا حال ہوگا۔ یہ میدانِ حشر ہوگا ایک نرم ہموار زمین، رنگ سفید، لق و دق جس پر نہ کوئی شجر نہ ٹیلہ، نہ پہاڑ نہ کوئی گڑھا جس میں انسان چھپ جائے۔ اور بتایا جاتا ہے کہ تو اس کو دنیا کی زمین کی طرح نہ سمجھ۔ بلکہ وہ دنیا کی زمین سے صرف نام میں شریک ہوگی۔ یہ وہ زمین ہے جس پر کہیں کوئی گناہ نہ ہوا ہوگا۔ کوئی خونِ ناحق نہ بہا ہوگا، کوئی خوں ریزی نہ ہوئی ہوگی، اور اس زمین پر آدمی بکھرے ہوئے پتنگوں کی طرح پھیلے ہوں گے، برہنہ پا، برہنہ بدن، بے ختنہ کئے ہوئے۔ گرمی سے

پسینہ اُن کے منہ تک اور کانوں کی لو تک پہونچے گا، گویا پسینہ میں شرابور ہوں گے۔ بعض احادیث میں آتا ہے کہ یہ پسینہ ان کے جسم سے بہہ بہہ کر ستر گز تک پھیل جائے گا۔ آہ! وہ کیسا دن ہو گا جب ساری برہنگیاں ان پر عیاں ہوں گی اور کسی کو کسی کا ہوش نہ ہو گا۔ اور کیوں نہ ہو، کہ بعض تو پیٹ کے بل اور بعض سر کے بل چل رہے ہوں گے۔ یہ اللہ کی قدرت ہو گی جس کو جس طرح چاہے گا اپنے حضور طلب فرمائے۔ حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا کہ قیامت کے دن لوگ تین قسم کے ہو کر اُٹھیں گے سوار، پیادہ، اور سر کے بل۔ ننگے، تھکے ماندے، ذلیل حسرت زدہ، ہکا بکا سوچ رہے ہوں گے کہ دیکھیں اب کیا ہوتا ہے۔

سوچو جہاں ازدحام کا یہ عالم ہو کہ کھڑے ہونے کی بھی جگہ نہ ہو ساتوں آسمان ساتوں زمین کے لوگ یعنی فرشتے، جن و انس و شیطان درندے اور پرندے سب جمع کر دیئے جائیں گے۔ سروں پر کوئی سایہ نہ ہو گا، سوائے سایۂ رب ذوالجلال کے۔ اور اس سایہ کے نزدیک اللہ کے برگزیدہ بندے ہوں گے۔ باقی سب کے سب آفتاب کی گرمی و تمازت کے ساتھ خود اپنی سانسوں کی حرارت، دلوں کی سوزش اور خوف سے پریشان حال ہوں گے۔ پھر قیامت کا دن بھی کوئی ۱۲ گھنٹہ کا دن نہیں۔ بلکہ وہاں کا ایک دن ہمارے ایک ہزار سال کی طرح ہو گا، یا اس سے بھی زیادہ۔ یہ وہ مقام ہو گا جہاں کوئی کسی سے کلام نہ کر سکے گا۔ تین سو سال تک کھڑے رہیں گے۔ نہ کھانے کا لقمہ نہ پانی کا گھونٹ، نہ ہوا کا جھونکا۔ ایک حدیث میں ہے کہ خدائے تعالیٰ تم کو اس طرح جمع کرے گا جیسے ترکش میں تیر کھچا کھچ بھر جاتے ہیں۔ پھر پچاس ہزار برس تک تمہاری طرف نظر نہ فرمائے گا۔ جب یہ گرمی، یہ تپش، یہ حال، انتہا کو پہنچ جائے گا۔ تو آخر اسی دامنِ رحمت

کی تلاش ہوگی، وہ دامنِ رحمت جو رحمتِ مجسم بن کر آیا، بن کر رہا، وہ دامنِ رحمتؐ جو اس دن، ان ہولناک مناظر میں بھی کشادہ ہی رہے گا۔

یہ دامن حضرت محمد مصطفٰےؐ، نورِ مبین، حبیبِؐ رب العٰلمین کا ہے۔

ہمارے پیشِ نظر قیامت کے حالات کا بیان نہیں۔ بلکہ رحمتؐ للعٰلمینؐ کی فطرتِ رحمت اور مقامِ حُب کو پیش کرنا ہے۔ ان واقعات کا ذکر تو مختصراً یوں ضروری ہوا کہ ہم جانتے بوجھتے ہوئے بھی آج اس دن کے بھولے ہوئے ہیں۔ کیا عجب کہ اِس کا بیان ہمارے دلوں میں حضور سرورِ کائنات صلّی اللہ علیہ وسلّم کی محبت، اور تڑپ موجِ زن ہو جائے۔ اور ہم اس دن سے غافل نہ رہیں، جو پہلا ہی دن ہوگا۔ تو یہ معمولی پیشی کا دن ہوگا جس کا ذکر ہوا۔

دراصل قیامت کی حقیقت پر تو خود اُس کے نام شاہد ہیں۔ کہیں اسے روزِ قیامت، کہیں اُسے روزِ حسرت، کہیں اسے روزِ ندامت، کہیں روزِ حساب، کہیں جھگڑے کا دن، کہیں اُلٹ دینے کا دن، کہیں کڑک کا دن، کہیں روزِ واقعہ، کہیں روزِ انتشار، کہیں روزِ انشقاق، کہیں روزِ خروج، کہیں روزِ دخول، کہیں روزِ موعود، کہیں روزِ مشہود کہا گیا ہے تاکہ اس ہولناک دن کی ہر حالت مومن کے پیشِ نظر رہے۔

(اقتباس از احیاء العلوم امام غزالیؒ)

ہمیں تو آج اس نورِ مبینؐ سرورِ کائنات صلّی اللہ علیہ وسلّم کی اُس فطرتِ محبت و رحمت کا ذکر کرنا ہے جس کی رحمت کے لئے یہ قیامت صرف ایک پس منظر ہوگی۔ اسے پس منظر یوں کہا کہ جو چیز غالب آجائے حق وہی ہے۔ باقی تجلّیاتِ حق ہیں، خواہ وہ جلالی ہوں یا جمالی۔ قیامت جو مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ کا دن ہوگا، دراصل یہی رحمۃٌ للعٰلمین کے ظہورِ رحمت کا دن اور شافعِ محشرؐ کی شفاعت کا دن ہوگا، اور حضور سرورِ کائنات صلّی اللہ علیہ وسلّم کے مقامِ محمود

پر فائز ہونے کا بھی دن ہوگا۔

تجلّیاتِ رحمت

آیئے ہر ہر گام پر اس رحمتِ عالم ﷺ کی تجلّیات سے رُوح کے لئے رُوح کی فراہمی کریں — واضح رہے کہ جہاں جہاں انسانوں کو اِس رحمتِ عالم ﷺ کی رحمت کی ضرورت ہوگی وہیں وہیں رحمت خود مائل بکرم ہوگی۔ چنانچہ جب حضور انور صلّی اللہ علیہ وسلّم سے صحابہ کرامؓ نے سوال کیا کہ ہم آپ ﷺ کو قیامت کے دن کہاں تلاش کریں۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ تم مجھے، میزان پر، صراط پر، حوضِ کوثر پر پاؤ گے۔

دراصل یہ مقامِ شفاعت پانچ ہیں۔

(۱) پہلا مقام:۔ میدانِ حشر جہاں لوگ جمع کیے جائیں گے۔ (جن کا ذکر گذشتہ صفحات میں ہوا)

(۲) دوسرا مقام:۔ بے حساب جنت میں داخل ہونے والوں کا، اور ان کا بھی جن سے سوال ہوگا۔

(۳) تیسرا مقام:۔ ان لوگوں کے لئے جن کا حساب ہوگا، اور مستحقِ عذاب پائے جائیں گے، اُنہیں عذاب سے نجات دلانے کے لئے۔

(۴) چوتھا مقام:۔ ان لوگوں کے لئے جو جہنم میں داخل ہو چکے ہوں پھر وہاں سے نکالا جائے گا۔ اور

(۵) پانچواں مقام:۔ اُن لوگوں کے درجات بلند کرنے کے لئے جو جنت میں داخل ہو چکے ہیں۔

مختصراً یوں کہہ لیجیے

کہ ہمارے آقائے دوجہاں سرورِ کائنات صلّی اللہ علیہ وسلّم تمام مقامات اور آخرت

کی تمام جگہوں میں موجود ہوں گے، اور ان کی اعانت و شفاعت فرمائیں گے۔
اور ہر خطرے اور ہر شدت سے ہماری گلوخلاصی کے لئے بیتاب ہوں گے۔
(اقتباس از مدارج نبوت جلد اوّل صفحہ ۴۹۱)

آیئے ذرا تفصیل سے ان شفاعتوں، اِن نعمتوں پر اللہ رب العزت کا
شکر ادا کریں، کہ قبول کرتا وہی ہے۔ البتہ وجہِ قبولیت، محبت ہے۔ اور ایک
بار دل سے درود پڑھیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی نبی الرحمۃ ہیں۔
اَللّٰھُمَّ صَلِّ وَسَلِّمْ عَلٰی سَیِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدِنِ النَّبِیِّ الرَّحْمَۃِ اَوَّلًا وَّاٰخِرًا ظَاھِرًا وَّبَاطِنًا
وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ اِلٰی یَوْمِ الدِّیْنِ

جلوۂ اوّل:۔ مظہرِ لطف و کرم سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم، وہی جو دنیا میں
رحمت بن کر آئے، قیامت میں بھی وہی اپنے دامنِ رحمت کو تمام زمانے کے
لئے کشادہ کئے ہوتے پہلے اپنی قبرِ اطہر سے باہر تشریف لائیں گے۔ اُس
روضۂ مبارک سے جس کا ستر ہزار فرشتے صبح سے شام تک اور ستر ہزار
فرشتے شام سے صبح تک طواف کرتے ہیں۔ پھر جس دن زمین شق ہو گی،
اور آپؐ باہر تشریف لائیں گے، ستر ہزار فرشتے آپؐ کو گھیرے ہوں گے۔
اور آپؐ کو بڑی شان، اعجاز، وقار و عظمت کے ساتھ بارگاہِ رب العزت
میں لے جائیں گے۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو حلۂ بہشتی زیب تن
کرایا جائے گا۔

احادیث سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ جب لوگ قبر سے برہنہ نکلیں
گے، تو حضورؐ قبر انور سے اپنے لباس میں جلوہ نما ہوں گے۔ اور مزید تعظیم و
تکریم کے سبب ان برہنہ لوگوں کے مقابلہ میں جو قبر سے نکلیں گے، آپؐ کو حلۂ
بہشتی پہنایا جائے گا۔ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حلۂ بہشتی پہلے پہنایا
جانا اس لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام قبر سے برہنہ نکلیں گے۔ اور حضور

صلی اللہ علیہ وسلم کو کرسی پر بٹھایا جائے گا، تاکہ آپؐ کی عظمت و وقار یہاں بھی نمایاں رہے۔

دوسری طرف

پھر قیامت میں لامتناہی جانداروں کا، انسانوں کا، حیوانوں کا، چرند وپرند کا زندہ کیا جانا ہے تصور کیجئے اور سوچئے، کہ اس قیامت کے ہولناک دن میں اُن کا کیا حال ہوگا، جب سورج سوا نیزے پر ہوگا، اور حشر کی زمین کھچا کھچ انسانوں سے بھری ہوگی، لوگ پسینہ میں شرابور ہوں گے، اور کسی کو کسی کا ہوش نہ ہوگا۔

بالآخر

جب یہ حالت حد سے گذر جائے گی، تو ان پر کرم ہوگا کہ انہیں خیال آئے گا کہ چلو کسی کو ڈھونڈیں، اور اللہ ربّ العزّت کے حضور اُسے اپنا شفاعت کرنے والا بنائیں۔ وہ ہر نبیؑ کے پاس یکے بعد دیگرے جائیں گے اور بالآخر اس دامنِ مصطفےٰ؎ دامنِ رحمتؐ میں امید کی کرن نظر آئے گی۔ ان کی اس مشکل سے نکلنے، ان کے حساب کتاب میں جلدی کئے جانے کی آپؐ ہی شفاعت فرمائیں گے۔

احادیثِ مبارکہ میں آتا ہے کہ "نبیؑ کی ایک دعا قبول ہوتی ہے، تو میں نے چاہا کہ اپنی اس دعا کو قیامت کے لئے اٹھا رکھوں، تاکہ امت کی شفاعت کے کام آئے۔" چنانچہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ حضورؐ نے فرمایا کہ انبیاءؑ کے لئے سونے کے منبر بچھائے جائیں گے اور وہؑ اُن پر بیٹھ جائیں گے مگر میرا منبر خالی رہے گا۔ میں اس پر نہیں بیٹھوں گا اور اپنے پروردگار کے سامنے کھڑا رہوں گا۔ اس خوف سے کہ مبادا میں جنت میں بھیج دیا جاؤں اور میری امت پیچھے رہ جائے۔ پس میں عرض کروں گا: یا ربّ "اُمّتی اُمّتی"۔

اللہ فرمائے گا کہ اے محمدؐ تو کیا چاہتا ہے، جو میں تیری امت کے ساتھ کروں۔ میں عرض کروں گا، الٰہی اِن کا حساب جلد ہو جائے پس میں سفارش کروں گا اور شفاعت قبول ہو گی۔"
(احیاء العلوم جلد چہارم صفحہ ۷۴۲)

قیامت بھی قائم ہے اور شفاعت بھی جاری ہے۔

پیشی کا پہلا دن ہوتا ہے۔ مخلوقِ خُدا قیامت کی سختی، اور بلا کی گرمی، پیاس کی شدّت سے بدحواسی ہو گی، کہ یکایک آسمانوں کے کناروں سے بڑے ڈیل ڈول کے اور نہایت موٹے اور تند خو فرشتے اُتریں گے۔ اور حکم ہو گا کہ گنہگاروں کو ماتھے کے بل پکڑ کر جبّار کے سامنے پیش کرنے کی جگہ پر حاضر کریں۔ اُن کے اُترنے کے وقت جس قدر نبیؑ اور صدیق اور صالحینؒ ہوں گے سجدہ میں گر جائیں گے، اور شدّتِ ہیبت سے پوچھ بیٹھیں گے کہ ہمارا پروردگار تمہیں میں ہے؟ وہ کانپ جائیں گے اور کہیں گے، ہم ہی نہیں، اللہ تو پاک اور بڑی شان والا ہے۔

پوچھ گچھ انبیاءؑ سے شروع ہو گی۔ جس کا ذکر قرآنِ حکیم میں جا بجا آتا ہے۔ اور سب ہی اپنے اپنے حال کے مطابق ہیبتِ خداوندی سے کانپ رہے ہوں گے اور یہ ان کے عجز کے باعث ہو گا۔ چنانچہ حضرت نوحؑ سے لے کر حضرت عیسیٰؑ تک انبیاء علیہ السلام سے سوال ہو گا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنے رب کے حضور، اس کی احدیتِ ذات کا اقرار فرماتے ہوئے امت کی نافرمانیوں سے مضطرب ہو کر، صرف اتنا عرض کریں گے، کہ اے اللہ اگر تو ان کو عذاب فرمائے تو وہ اس کے مستحق ہیں۔ اور اگر تو معاف فرما دے تو بڑا غالب اور حکمت والا ہے۔ لوگوں سے سوال ہوں گے۔ اللہ ربّ العزت اپنے بندوں سے بالمشافہ سوال فرمائے گا۔ پوچھے گا "میں نے تجھ کو جوانی کی نعمت

دی تھی، بتا کس چیز میں اُس کو کھویا۔ اور (کیا میں نے) تجھ کو زندگی سے مہلت نہیں دی تھی، اس کو کون سی چیزوں میں ڈبویا۔ مال جو میں نے تجھ کو دیا، اُس کو تو نے کہاں سے حاصل کیا اور کس چیز میں خرچ کیا۔ علم کی دولت جو تجھ کو دی تھی، تو اس علم سے تُو نے کیا عمل کیا" اسی طرح وہ اپنے انعامات اور احسان کا ذکر فرمائے گا۔ اِس وقت سب ہی شرم وحیا اور ندامت میں ڈوبے ہوں گے۔ خود انسان کے اعضاء اس کے اعمال پر گواہ ہوں گے، اور ہر ہر عضو سوال کا جواب دے گا۔ سوچئے! کہ جس وقت اللہ رب العزت ان کے گناہ یاد دلائے گا، پہلے چھوٹے چھوٹے پھر بڑے، اور اب اقرار کے سوا ان کے پاس کوئی چارہ نہ ہوگا۔ اس وقت ہر ایک کی بس یہی تمنا ہوگی، بلا کسی حساب کتاب کے مجھے دوزخ میں ڈال دیا جائے۔ تاکہ دوسروں کے سامنے رسوائی سے بچوں۔ (اقتباس از احیاء العلوم صفحہ ۷۳۲)

رحمتُ للعالمین کا اندازِ شفاعت

آخر میزانِ عدل قائم ہوگی۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ جنت عرش کے داہنی جانب اور جہنم اس کے بائیں جانب رکھی جائے گی۔ اور اس کے بعد میزان لائی جائے گی۔ اور نیکی کے پلڑوں کو جنت کے مقابل اور بدیوں کے پلڑے کو جہنم کے مقابل رکھ دیا جائے۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم جب چاہیں گے کہ لوگوں کے درمیان فیصلہ کیا جائے، تو پہلے امتِ محمدیہ کو ندا دی جائے گی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس وقت میں (حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کھڑا ہوں گا اور امت میری پیروی کرے گی۔ اُن کے اعضاء وضو سے چمکتے دمکتے ہوں گے۔ دوسری امت کے لوگ امت نبیٔ کریمؐ سے الگ کئے جائیں گے۔ اس وقت حضورؐ کی رفعتِ شان اور برتری ظاہر ہو جائے گی،

اور لوگوں کو یہ خیال آئے گا کہ شاید یہ نورانی چہرے والی ہستیاں سب کی سب نبیؑ ہی ہوں۔

حضور سرورِ کائنات صلّی اللہ علیہ وسلّم نے اپنی تعلیمات میں سب سے زیادہ زور اللہ وحدہٗ لاشریک کی وحدانیت، اور بالخصوص نماز کو دیا تھا۔ اور امّت کو خونِ ناحق سے سختی سے منع فرمایا تھا۔ آج یہی دو سوال سب سے پہلے امّت سے ہوں گے، ایک نماز، دوسری پرسشِ خون۔ آہ! جن سے آج ہم غافل ہیں۔ چنانچہ احادیث مبارکہ میں آتا ہے کہ جن امور کے متعلق سوال و جواب ہوگا ان میں چار اہم ہیں:

(۱) بندے تو نے اپنی عمر کس کام میں صرف کی (۲) تو نے اپنے علم پہ کتنا عمل کیا (۳) تو نے مال کیسے حاصل کیا۔ کیسے خرچ کیا (۴) جسم سے کیا گناہ کیے (ترمذی شریف)

یہ بھی احادیث میں آتا ہے کہ اس وقت نامۂ اعمال سب کے ہاتھوں میں اُڑتے ہوئے آجائیں گے۔ خوش نصیب ہوا وہ جس کا نامۂ اعمال اُس کے داہنے ہاتھ میں آیا۔ اور اس کی ناک خاک آلود ہوئی جس کا نامۂ اعمال بائیں ہاتھ میں آیا۔

احادیث میں یوں بھی آتا ہے کہ روزِ قیامت آدمی کے تین دفتر و دیوان لائے جائیں گے۔ ایک دفتر میں اس کا عمل لکھا ہوگا، دوسرے میں اُس کے گناہ، اور تیسرے میں وہ نعمتیں جو حق تعالیٰ نے اس پر انعام فرمائیں۔ امّت کے لوگوں کی بڑی تعداد کا میزانِ عدل پر پورا اُترنا ممکن نہ ہوگا۔ سب ہی کانپ رہے ہوں گے، سب ہی کو ندامت ہوگی کہ اخلاص کے ساتھ کلمہ طیبہ کیوں نہ پڑھا، کیوں دل میں وسوسوں کو جگہ دی، کیوں نماز سے غفلت یا سُستی برتی، کیوں ارکانِ اسلام بالخصوص زکوٰۃ و حج سے غافل رہے۔ افسوس! کیوں طہارت کو نہ اپنایا، حقوق العباد کو اہمیّت نہ دی۔ نظریں بہرحال رحمتِ

باری تعالیٰ پر ہوں گی۔ اس وقت ان پر حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کی ان باتوں کی، جن کو ہم نے معمولی اور چھوٹا سمجھا تھا، افادیت کھلے گی۔ اور وہ خدا کا شکر ادا کریں گے کہ کم از کم زندگی میں وہ ایمان کی دولت سے محروم نہ رہے۔

اس وقت بہت سے جلوے ان پر عجیب عجیب طرح سے ظاہر ہوں گے۔ مثلاً (۱) کسی کی نیکیوں اور بدیوں کا پلڑا برابر ہوگا۔ وہ دیکھے گا کہ یکایک تھیلی نیکیوں کے پلڑے میں آکر گری اور وہ بھاری ہو گیا، پھر اس نے اس تھیلی کو کھولا تو اس میں ایک مٹھی خاک نکلی یہ وہ مٹھی بھر خاک تھی جو اس نے ایک مسلمان بھائی کی قبر پر ڈالی تھی۔ یہ چھوٹی سی نیکی ایک عظیم نیکی بن گئی۔

(۲) حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، "قیامت کے دن ان کے ساتھ پہاڑ کے برابر نیکیاں ہوں گی، وہ کہیں گے (اے اللہ) دنیا میں تو ہم نے اس قدر نیکیاں کبھی نہیں کی تھیں، اس قدر ثواب کہاں سے آیا۔ ندا آئے گی کہ تیرے لڑکے نے تیرے لئے استغفار کیا تھا، یہ وہ نیکیاں ہیں۔" (نور الصدور فی شرح القبور)

(۳) یہ بھی کہا گیا ہے کہ میزان پر جب تول ہو رہی ہو گی، ایک شخص پہاڑ جیسی نیکیاں اپنی طرف آتا دیکھے گا۔ وہ دریافت کرے گا، یہ کیا ہے۔ اس قدر نیکیاں کہاں سے آگئیں۔ جواب ملے گا، یہ تیرا صدقۂ جاریہ ہے۔ یہ وہ تفاسیر، کتبِ حدیث اور دینی کام ہیں جو تُو نے دُنیا میں کئے تھے، یہ اُن کا اجر ہے جو جاری وساری تھا۔

(۴) اسی طرح حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "میری امت اُمتِ مرحومہ ہے۔ وہ قبر میں گنہگار داخل ہوگی اور قبروں سے بغیر گناہ کے اُٹھے گی، اُن کے لئے مومنوں کے بخشش مانگنے کی وجہ

سے۔" (طبرانی فی الاوسط)

(۵) اسی طرح درود شریف کے ورد کرنے والوں کے حال ہیں۔ ان کے بے شمار انعامات کا ذکر آتا ہے۔ یہاں تک کہ فرائض میں جو کوتاہیاں بندے سے رہ جاتی ہیں درود شریف ان کا کفارہ بن جاتا ہے، اور صدقہ کا قائم مقام ہو جاتا ہے، بلکہ اس سے افضل و اعلیٰ اور اس کی برکتیں میزانِ عدل پر کھلتی ہیں اور پُل صراط پر۔ (مدارجِ نبوت ۔ ۵۷۶)

(۶) حضرت مولانا عبدالحق محدث دہلویؒ فضائلِ درود میں تحریر فرماتے ہیں: درود بھیجنے کے فوائد میں یہ بھی ہے، کہ روزِ قیامت درود پڑھنے والا عرش کے سایہ کے نیچے ہوگا، اور درود نیک اعمال کے پلڑے کو وزنی کر دے گا، اور پیاس سے محفوظ کر دے گا۔ (مدارجِ نبوت ۵۷۷)

(۷) حضرت جنیدؒ بیان فرماتے ہیں کہ میں نے خواب میں دیکھا کہ وعظ سُن رہا ہوں۔ اتنے میں ایک فرشتے نے میرے پاس آکر پوچھا کہ جن چیزوں سے خدائے تعالےٰ کا تقرّب حاصل کرنے کے لئے طلبِ تقرّب کیا کرتے ہیں، ان میں اللہ کے نزدیک تر کیا چیز ہے۔ میں نے جواب دیا، پوشیدہ عمل جو ترازو میں پورا ہو۔

چنانچہ کتبِ سیر میں متعدد احادیث شفاعت میں آتی ہیں، اور مختلف واقعات بیان کئے گئے ہیں۔ ان ہی میں سے مواہب لدنیہ میں یوں ہے کہ ایک بندے کے دونوں پلڑے برابر ہوں گے۔ تو اس سے کہا جائے گا کہ نہ جنت کا تو مستحق ہے نہ جہنم کا۔ پھر ایک فرشتہ ایک کاغذ کا ٹکڑا لائے گا جس پر اُف یعنی اُس کی اپنے باپ سے نافرمانی لکھی ہوگی، وہ اس کو پلڑے میں رکھ دے گا تو اس کی نیکیوں پر اس کی بدیوں کا پلڑا بھاری ہو جائے گا۔

دوسرا واقعہ یوں آتا ہے کہ ایک شخص کے دونوں پلڑے برابر ہوں گے۔ حق تعالیٰ اس سے فرمائے گا کہ لوگوں کے پاس جاؤ اور کسی سے ایک نیکی مانگ لاؤ تاکہ جنت میں داخل کروں۔ تو وہ جس سے بھی اس نیکی کے لئے درخواست کرے گا تو وہ یہی کہے گا کہ میں تجھ سے زیادہ محتاج ہوں۔ پھر ایک بندہ ملے گا وہ اس سے بھی یہی کہے گا اور وہ جواب دے گا کہ میرے نامۂ اعمال میں صرف ایک نیکی ہے۔ مجھے یقین نہیں کہ یہ نیکی کچھ فائدہ دے سکے۔ وہ نیکی تجھے ہبہ کرتا ہوں۔ وہ حق تعالیٰ کے حضور یہ نیکی پیش کرے گا۔ اس پر حق تعالےٰ اس بندے کو جس نے نیکی ہبہ کی تھی، بُلائے گا اور فرمائے گا، اے بندے میرا کرم اور بخشش بہت وسیع ہے۔ تُو اپنے بھائی کا ہاتھ پکڑ لے اور دونوں جنت میں داخل ہو جاؤ۔ جس نیکی کو وہ بے فائدہ سمجھا تھا وہی اس کی مغفرت کا باعث بن گئی۔ سبحان اللہ

المختصر، اللہ رب العزت کے فضل اور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلّم کی رحمتوں کے یہ نظارے عام ہوں گے۔ اور یہ سب کچھ سرورِ کائنات ﷺ کی اس محبت کے باعث ہوگا جو انہیں ﷺ اپنی امّت سے ہے۔ اور اس بندگی کے باعث ہوگا جو انہوں نے اپنے رب کی کی اور عبدہٗ کہلائے، اور اس محبّت کے باعث ہوگا جو اللہ جلّ شانہٗ کو اپنے حبیب پاک صلی اللہ علیہ وسلّم سے ہے۔

چنانچہ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ قیامت میں صاحبِ میزان جبرئیل علیہ السلام ہوں گے اور وہی اس دن اعمال کا وزن کریں گے[1] میزان اور حساب وسوال حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کے سامنے ہوگا، اور خلاصی اور رہائی سب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کی شفاعت اور اعانت سے ہوگی۔

---

[1] رواہ جریر فی تفسیرہٖ

نبی کریمؐ کی شفاعت کا سلسلہ جاری ہوگا۔ یہ وہ رحمت ہوگی کہ ملائکہ آپؐ کی عظمتِ شان اور ربِ جلیل کی قدرت و حکمت پر محوِ حیرت ہوں گے، اور ہر گنہگار کی نظر آقائے دو جہاںؐ کے لطف و کرم پر لگی ہوگی۔ حسرت و ندامت ہوگی ان کو جنہوں نے اس رحمتؐ کا دامن زندگی میں نہ تھاما، اور خوش بخت ہوں گے وہ جو اپنی کوتاہیوں کے باوجود اس دامنِ رحمت سے وابستہ رہے۔ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میری شفاعت صرف نیکوں کے لئے نہیں بلکہ بدکار گنہگاروں کے لئے بھی ہوگی۔

رَبَّنَا اغْفِرْلِیْ وَلِوَالِدَیَّ وَلِلْمُؤْمِنِیْنَ یَوْمَ یَقُوْمُ الْحِسَابُ

اَللّٰھُمَّ صَلِّ وَسَلِّمْ عَلٰی سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِہٖ

وَعَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ وَالْمُسْلِمِیْنَ وَالْمُسْلِمَاتِ

پُلِ صراط اور جلوۂ رحمت

سوال و جواب کی منزل سے گذرنے کے بعد دوسری اہم منزل صراط ہوگی۔ اس پر وہی خیر سے گذر سکے گا جو اپنے رب کو راضی کرے اور رب کے راضی ہونے کا دارومدار بیشتر حقوق العباد پر ہوگا۔ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، جہنم کی پشت پر صراط بچھائی جائے گی، اور اس پر گذرنے والوں میں سب سے پہلے میری اُمت ہوگی، اس وقت جملہ انبیاءؑ کی زبان پر ہوگا۔ اَللّٰھُمَّ سَلِّمْ اَللّٰھُمَّ سَلِّمْ اَللّٰھُمَّ سَلِّمْ

(اے میرے رب سلامت رکھ، سلامت رکھ، سلامت رکھ)

اور دوسری حدیث میں یوں آتا ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ تمہارا نبیؐ کہہ رہا ہوگا

رَبِّ سَلِّمْ سَلِّمْ

حضور کی دعا امت کی سلامتی کے لئے ہوگی۔ یہ بھی حدیث میں آتا ہے کہ

صراط کے دونوں طرف فرشتے بھی یہی دُعا ربِّ سَلِّمْ سَلِّمْ (حضورؐ کی اتباع میں) مانگ رہے ہوں گے کہ وہ ہمیشہ مومنین اور مسلمانوں کے لئے اللہ تعالیٰ کے حضور طالبِ مغفرت رہے۔ (اقتباس از مدارج نبوت صفحہ ۴۹۳)

یہی وہ پُل صراط ہے

جس کے متعلق قرآنِ حکیم میں آتا ہے کہ جب پرہیز گار بطور مہمان اللہ رب العزت کے پاس بلائے جائیں گے، اور گناہگار دوزخ کی طرف پیاسے ہانکے جا رہے ہوں گے، اور اُن کو دوزخ کی راہ پر ڈالنے کا حکم ہوگا۔ پھر حکم ہوگا کہ انہیں ٹھہرائے رکھو کہ ان سے کچھ پوچھ کی جائے گی۔ (طٰفٰت آیات ۲۳، ۲۴)

یعنی اس کے بعد لوگ پُل صراط کی جانب ہانکے جائیں گے، وہ پُل صراط جو ایک پُل ہے دوزخ کے اوپر، تلوار سے زیادہ تیز اور بال سے زیادہ باریک، جس کے نیچے دوزخ کی آگ کے شعلے بُلند ہو رہے ہوں گے۔ اور وہاں ایک سیاہی کے علاوہ کچھ نظر نہ آتا ہوگا۔ گنہگاروں کی پیٹھ پر ان کے گناہوں کا وہ بوجھ ہوگا جس کو لے کر وہ زمین پر بھی نہ چل سکتے پل صراط پر چلنا تو الگ رہا۔ اور اُن کو اس پر سے گذرنے کا حکم ہوگا۔ لوگ پھسل پھسل کر دوزخ میں گر رہے ہوں گے۔ دوزخ کے فرشتے انہیں کانٹوں اور انکڑیوں سے اٹھائے ہوں گے، اور وہ سر کے نیچے اور پاؤں کے اوپر آگ میں چلے جاتے ہوں گے۔ اللہ اکبر کیسا پُر ہیبت منظر ہوگا۔

سوچو! اللہ کے پیارے نبیؐ، ہمارے آقاؐ

حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت امت کے لئے کس درجے مضطرب ہوں گے، اور اُنؐ کی دعاؤں کے سوا ہمارے لئے کوئی اور سہارا نہ ہوگا۔

حضرت مولانا محدّث دہلویؒ فرماتے ہیں، کہ بعض علماء کہتے ہیں کہ آخرت کے ترازو کے پلڑے کا وزنی ہونا دنیا کے ترازو کے برعکس ہے۔ (مدارجِ نبوت ۴۹۵)

اور یہ بات پُل صراط پر واضح ہوتی ہے کہ جن کی پیٹھ پر گناہوں کا بوجھ ہے، وہ انہیں اسفل ہی کی طرف لے جائے گا اور جن کی نیکیاں زیادہ ہیں وہ گویا ہلکے پھلکے ہوں گے، اُن کی جسمانیت بھی نورانیت کے انداز لئے ہوئے ہوگی۔ اُن کو بال سے باریک دھار بھی کیا نقصان پہونچا سکتی ہے۔ ان کے لئے تو یہ پُل صراط گویا ایک کشادہ سڑک کی طرح ہوگا۔ جہاں اُن کی نیکیاں اُن کو اللہ ربّ العزّت کی طرف کھینچ رہی ہوں گی۔ اور دنیا میں جس طرح اُن کی نیکیاں اوپر جاتی رہیں، آخرت میں یہ خود بخود اسی طرح اپنے رب کی جانب بڑھ رہی ہوں گی۔ حضور اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کی دعائیں بھی اُن کے ساتھ ہوں گی، جو دنیا میں اُن کا سہارا بنیں، اور آخرت میں بھی ہر منزل پر اُن کے لئے باعثِ تسکین ہوں گی۔ دراصل یہ محبّت کی وہ ڈوری ہوگی، جس کو ہمیشہ اپنے قلب میں محسوس کرتے رہے اور جو، اب شاہراہِ کرم بن گئی ہے۔

اِس سلسلہ میں ایک واقعہ یاد آیا جو گذشتہ عمرے کے موقع پر لوگوں نے بیان کیا۔ ایک شخص کا انتقال ہوا اور عام مسلمانوں کی طرح اس کی میّت کو بھی نمازِ جنازہ کے لئے خانۂ کعبہ میں لے جانا چاہا، لیکن وہ میّت اتنی بھاری ہو گئی کہ لوگوں سے اُٹھائی نہ جاسکی۔ مجبوراً بہت بڑی تعداد میں لوگ اُسے اُٹھاکر باب عبدالعزیز کی طرف لائے کہ زیادہ لوگ اس کی میّت کو سہارا دے کر اندر لے جائیں۔ وہاں بھی دروازے کے پاس نعش اس قدر وزنی ہو گئی کہ کسی سے کسی طرح نہ اُٹھی۔ بالآخر اس کی نماز باہر ہوئی اور مدفون کر دیا گیا۔ جب لوگوں نے تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ وہ واحد شخص ہے جس نے مکہ معظمہ میں رہتے ہوئے بھی خانہ کعبہ کا کبھی طواف نہ کیا تھا نہ اس کے اندر گیا تھا۔ خانۂ کعبہ نے بھی آج اس کی میّت کو اپنے پاس آنے کی اجازت نہ دی۔

یہ بات گناہوں کے بوجھ کو خوب واضح کرتی ہے۔ جس کے گناہوں کے

بوجھ سب مل کر بھی نہ اُٹھا سکیں، پُل صراط پر اُنہیں اٹھا کر چلنا فرشتوں کی زنجیروں اور کڑیوں کی طاقت سے ہی ہو سکتا ہے۔ برخلاف اِس کے آپ نے اکثر سُنا ہو گا کہ کسی خاص موقع پر، یا کسی وقت طواف کرتے ہوئے، اُن کا جسم اتنا ہلکا ہو گیا گویا وہ ہے ہی نہیں۔ بلکہ طواف کے بعد اُن کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ محسوس کرتے ہیں، کہ جسم ایک پھول سی کوئی چیز ہے اور قلب پر ایک سرور کا عالم ہے۔

میں نے اپنے استادِ محترم، حضرت احمد عبد الصمد صاحب قبلہؒ (جن سے قرآنِ حکیم پڑھنے کی مجھ کو سعادت نصیب ہوئی) کی میّتِ مبارکہ اُٹھانے کی سعادت پائی۔ وہ ایک سبز کشادہ لان پر رکھی ہوئی تھی اور نہایت حسین معلوم ہو رہی تھی۔ میں نے جب اسے ذرا رُخ ٹھیک کرنے کے لئے تنہا ایک جانب سے سرکایا، تو مجھے وہ پھول سی ہلکی معلوم ہوئی۔ پھر وہ ویسے ہی اٹھائی گئی، اور ایک عام میّت کی طرح تھی۔ بے شک اللہ اپنے برگزیدہ بندوں کی نیکیاں اور خیر و کرم کے نقشے دنیا میں بھی دکھا دیتا ہے۔ یہ بات ہلکے اور بھاری کے سلسلے میں تحریر میں آئی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جن پر گناہوں کا بوجھ ہوتا ہے، ان کے گناہوں کا وزن انہیں اسفل ہی کی طرف لے جاتا ہے۔ جن پر نیکیوں کا وزن ہوتا ہے تو وہ وزن بھی بدل جاتا ہے اور پارہ کی طرح محبّت میں اوپر چڑھتا ہے۔ اور اللہ ربّ العزّت کی رضا جن لوگوں کا مقصدِ حیات رہی، ان کو نورانی کڑیوں سے اوپر کھینچ لیا جاتا ہے۔ اور یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ کافر تو زنجیروں، انکڑیوں سے چلائے جاتے ہیں اور ایک مومن پر کشا پرندہ کی طرح پُل صراط پر سے اُڑتے ہوئے نکل جاتا ہے۔ جہاں ربِّ کریم کا کرم اور حضور صلّی اللہ علیہ وسلم کی دُعا شاملِ حال ہو وہاں اسباب کا ذکر کیا؟ یہ تو صرف ذہن کی تشفّی کے لئے لکھا گیا ہے۔ جو قدم قدم پہ اسباب کا سہارا ڈھونڈتا ہے۔

ایک حدیث شریف میں یوں بھی آیا ہے کہ پُل صراط بعضوں کے لئے تلوار سے تیز اور بال سے باریک ہوگا اور بعض کے لئے (یعنی نیکوکاروں کے لئے) ہموار کشادہ میدان کی مانند۔ اور اِس طرح یہ بات بھی واضح ہوجاتی ہے کہ بعض کے لئے تو یہ پُل صراط گویا محشر کے پچاس سال کے برابر ہوگا اور بعض کے لئے یہ محض نماز کی دو رکعتوں کے برابر ہے۔ یہ فرق اعمال اور ایمان کی بنا پر ہے۔

(مدارجِ نبوت ۴۹۲)

"یارسول اللہ" کا وِرد کرنے والو!

مژدہ ہو کہ حدیثِ پاک میں آتا ہے کہ "جب میرے اُمتی صراط پر گزرنے لگیں گے اور تھک کر رہ جائیں گے، تو فریاد کریں گے "وَامُحَمَّدَاہُ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ مدد فرمایئے"۔" اس وقت حضورؐ نہایت شفقت میں بُلند آواز سے پکاریں گے، اور بارگاہِ الٰہی میں عرض کریں گے، "رَبِّ اُمَّتِیْ اُمَّتِیْ" "اے میرے رب میری اُمّت کو بچا، میری اُمّت کو بچا۔ آج کے دن نہ اپنے لئے کچھ مانگتا ہوں اور نہ فاطمہؓ کے لئے۔"

(مدارج نبوت صفحہ ۴۹۲ جلد اوّل)

صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْکَ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ وَسَلَّمَ عَلَیْکَ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ

کیسا کرم ہے۔ سبحان اللہ۔ مبارک ہے وہ قلب، جو اپنے عمل پر نازاں نہیں، بلکہ حتی الامکان عمل کے ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کی محبت، اُنؐ کی حضوری، اُنؐ کی شفقت و بندہ پروری کی امیدوں کو اپنا سب سے بڑا سہارا سمجھتا ہے۔ اور وقت پڑنے پر وہی زبان پر آتا ہے۔

اللہ کے بندے، اللہ کو گھروں میں بھی اور مساجد میں بھی یاد کرتے رہتے ہیں، اور غریبوں کی ہمدردی اور اُن کے دُکھ درد سے غافل نہیں ہوتے ایسے لوگوں کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلّم نے بشارت دی کہ یہ لوگ پُل صراط پر رحمت و کرم سے گذارے جائیں گے۔

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰی سَیِّدِنَا وَنَبِیِّنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِهٖ وَاَحْسِنْ عَاقِبَتَنَا وَارْزُقْنَا شَفَاعَتَهٗ

حوضِ کوثر

اللہ رب العزت نے قرآنِ حکیم کی ایک مختصر ترین سورت میں نہ صرف اپنے نبی پاکؐ کے جمال کا مرقع عطا فرمایا ہے بلکہ آپؐ کی فطرتِ کریمانہ، آپؐ کے اندازِ عبادت، آپؐ کی قربانیاں، آپ کے دشمنوں کے حشر کے ساتھ تعلیماتِ محمدیؐ کا نچوڑ اہلِ فہم کے لئے ایک ایسے انداز میں بیان فرمایا کہ خود کفار یہ کہنے پر مجبور ہوگئے کہ یہ بشر کا کلام نہیں ہو سکتا۔ سبحان اللہ۔

قیامت کا ہولناک منظر ہے

تمام تکلیفوں سے زیادہ جاں فرسا اور ہوش و حواس کھو دینے والی تکلیف پیاس ہے، جو میدانِ حشر میں اس وقت سے شروع ہو جائے گی جب لوگ اپنے رب کی طرف ہانکے جائیں گے۔ اور شافعِ محشرؐ اس وقت سے ہر ہر قدم پر بہ تقاضائے رحمت و فطرت لوگوں کی گلوخلاصی میں مصروف ہوں گے۔

وہ کوثر جس کا ذکر قرآن حکیم میں آتا ہے

مفسرین نے اس سے مُراد جنت کی نہر لی ہے۔ اور بیشک نیکوکاروں کی بہترین مہمان نوازی یہی مشروب ہوگا، اور میزانِ عدل اور پل صراط سے گزرنے کے بعد اس کا لطیف پانی میسّر آئے گا۔ جس کا ذکر ہم آگے کریں گے۔ لیکن بعض محدثین نے لکھا ہے، کہ حضورؐ کا ایک حوض حشر کے میدان میں بھی ہوگا۔ جہاں وہؐ لوگوں کو اس سے سرفرازی بخشیں گے، جب وہ مضطرب اُن کے سامنے حاضر ہوں گے۔ اور جو امتی اس حوض کا پانی پی لے گا پھر اُس کو کسی عذاب سے بھی پیاس نہ لگے گی۔ اس حوضِ محشر کی تصدیق کرنے میں بعض حضرات نے تردّد کیا ہے۔ اِس عاجز، فقیر کی سمجھ میں یہ بات یوں آتی ہے کہ

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت کا ذکر مختلف احادیث میں مختلف مقامات پر آتا ہے، جن کا بیان گذشتہ اوراق میں کیا گیا۔ لہٰذا اگر ہم "کوثر" سے خیرِ کثیر سمجھیں، جیسا کہ مستند احادیث میں آتا ہے، تو اِس کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کوثر کے معنی خیرِ کثیر کے لیتے ہیں۔ اور کوثر جنت میں ایک نہر کا نام بھی ہے، یہ بھی ایک قسم کی خیرِ کثیر ہی ہے۔ معنی یہ ہوں گے کہ (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) ہم نے آپؐ کو دونوں جہانوں کی اتنی بھلائیاں عطا فرمائی ہیں کہ اُن کی کثرت کی کوئی حد نہیں[1]۔ اور ہر جگہ، ہر مقام پر آپؐ کے اندازِ خیر و رحمت نمایاں ہیں۔

جب یہ معلوم ہو گیا کہ کوثر سے خیرِ کثیر مراد ہے، اور دونوں جہاں کے لئے ہے، تو یہ ایک سلسلہ ہے، غیر منقطع، جاری و ساری ہے۔ اور شفاعت کی احادیث سے بھی ہر ہر منزلِ شفاعت کی کوئی نہ کوئی صورت خیر سامنے آتی ہے، جو اِس حال کے مطابق ہے۔ البتہ وہ مخصوص شفاعت جو جنت میں داخل ہونے سے قبل ہو گی، اور وہ مخصوص نہرِ کوثر جس سے اہلِ ایمان کے مقامات بلند ہوں گے، وہاں کوثر، نہر بھی ہو گی، اور اِس خیرِ کثیر کا ایک دلکش منظر بھی۔ اور اِس طرح وہ شفاعت جس کا ذکر قرآنِ حکیم میں بڑے اہتمام سے آتا ہے، جو دوزخ کے لوگوں کو نکالنے کے باب میں ہے، وہ گویا ایک ہی رحمت اور شانِ رحمت کا اظہار ہے۔ اہلِ جنت کے لئے کوثر کی بشارت اور اہلِ دوزخ کے لئے شفاعت کی اُمید۔

ہاں جنت میں داخلہ سے پہلے بھی ایک مقام دید ہے۔ حضورؐ اپنی امت کا استقبال پُل صراط کے ایک جانب فرما رہے ہوں گے۔ جس خوش نصیب

---

[1] مدارج نبوت تفسیر سورہ کوثر صفحہ ۱۴۶

نے اِسی دُنیا میں آنکھوں سے اِس نورِ مُبینؐ، اِس خیرِ کثیرؐ، اِس رحمتِ عالمؐ کی دید کا ایک جام پی لیا، اُسے جنت میں داخلہ کا پروانہ مل گیا، بلکہ جنت میں داخلے سے قبل جنت مل گئی۔ ہاں ایک پیاس اب بھی باقی ہو گی۔ وہ مقامِ محمود پر حضورؐ کی دید کی ہو گی، نہ کہ یہ پیاس جس میں زبان خشک ہوتی ہے۔ کیا عجب ہے کہ اہلِ جنت کو جنت میں داخل ہونے سے قبل ہی اپنے آقاؐ کی دید اس نہر کے قریب نصیب ہو، جسے حوضِ محشر سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اور وہ اِس سے اسی طرح مستفید ہوں جیسے دنیا میں چشموں سے۔ چنانچہ حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ میرے حوض کے چار کنارے ہیں ایک کنارا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے سپرد ہو گا، دوسرا حضرت فاروق عمر بن خطابؓ کے اور تیسرا حضرت عثمان ذوالنورینؓ کے اور چوتھا حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے سپرد ہو گا۔ لہٰذا جو حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمرؓ سے بغض رکھتا ہے، وہ اُسے پانی نہیں پلائیں گے۔ اور جو حضرت علیؓ اور حضرت عثمانؓ سے بغض رکھتا ہے، ایسے حضرات کو صدیقِ اکبر اور عمر فاروق رضی اللہ عنہما پانی نہیں پلائیں گے۔ مشہور ہے کہ ساقیٔ کوثر علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ ہوں گے۔ اور حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ جو ابوبکرؓ سے دشمنی رکھے گا میں اُسے ہرگز پانی نہیں پلاؤں گا۔ ظاہر ہے کہ محبت کے جام میں تلخی کا کیا سوال۔ اور یہ چار ہستیاں، صدیق و عمر، عثمان و علی رضی اللہ تعالیٰ عنہم تو حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے صدق، عدل، حلم و شجاعت کے آئینے ہیں۔ یا یوں کہہ لو کہ اللہ رب العزت ہی کی صفتِ حیات، علم و ارادہ و قدرت کے مرقع ہیں۔ یہاں تو ایک دوسرے کی جدائی ممکن نہیں۔ یہ تو اِس توحید کے آئینہ دار ہیں جس کی حقیقت مقامِ محمود میں کھلے گی۔ اور اس طرح اِس محشرِ قیامت ہی میں اُن کی پیاس ختم ہو جائے گی۔

حضرت مولانا عبدالحق محدثؒ فرماتے ہیں کہ اس سے ظاہر ہے کہ جس کو

اس حوضِ کا جام نصیب ہوا) اسے آگ کا عذاب نہ دیا جائے گا۔ اس لئے کہ آگ کے عذاب میں تشنگی، حرارت و حرقت، دخولِ نار کے ساتھ ضروری ہے۔ اور یہ بھی احتمال ہے کہ اس پر اتنا عذاب کیا جائے گا کہ پیاس نہ لگے۔ اور اس طرح امت کم از کم میزانِ عدل و صراط پر پیاس سے محفوظ رہے۔ گویا یہ حدیث شریف تخفیفِ عذاب کی صورت میں ہے، جس سے حضور سرورِ کائنات ؐ کی رحمت کا اندازہ ہو سکے اور یہ حقیقت واضح رہے کہ دُنیا میں رحمت انہیں ؐ کے دم قدم سے تھی، اور آخرت میں رحمت انہیں کا فیضانِ کرم ہے۔ اور پھر انہیں جنت میں داخل ہونے کے بعد اسی حوضِ کوثر کے جام ملیں گے، جس کا ذکر احادیث میں آتا ہے۔ لیکن قبل اس کے ان احادیث کا بیان ہو جن میں اللہ رب العزت نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو حوضِ کوثر سے خصوصی فضیلت بخشی ہے، سورہ الکوثر کو آئندہ صفحات میں حضرت محدث ؒ کے ترجمہ کے ساتھ پیش کرنے کی سعادت حاصل کی جا رہی ہے، جس کے پڑھنے سے اس کے انوار قلوب پر ہر بار ایک نئے انداز سے منکشف ہوتے ہیں۔ اور روح کو ایک نیا سرور محسوس ہوتا ہے۔

یہاں یہ بات بھی بڑی اہمیت کی حامل ہے کہ جس طرح قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ کی چار آیات کلمہ "لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ" کے کلمات سے ہم عدد ہیں اسی طرح سورۂ کوثر کی تین آیات کلمہ کا جزو "مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ" کے تین کلمات سے ہم عدد ہیں۔ اس طرح سورۂ اخلاص میں "قُلْ" پہلے آیا اور پھر هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ .... کا ذکر ہوا۔ قرآنِ حکیم کی ترتیلی ترکیب میں بھی سورۂ کوثر کو قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ سے تین سورت قبل جگہ دی گئی تاکہ رازدارِ سرِّ الٰہی کی حقیقت و مقام یہاں بھی مومن پر آشکارا ہے، اور حوضِ کوثر و مقامِ محمود پر بھی۔ اور لوگوں کو اس حقیقت پر ایمان لانے میں ذرا تردد نہ ہو کہ آپ ؐ ہی اللہ کے رسول ہیں آپ ؐ ہی شافعِ محشر ہیں، آپ ؐ ہی صاحبِ کوثر ہیں، اور آپ ؐ ہی پر درود و سلام

اُس خیرِ کثیر کے دامنِ رحمت سے وابستگی کا ذریعہ اور رضائے الٰہی کا موجب ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اِنَّآ اَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ ۝١ فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ ۝٢
اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ ۝٣

(۱) اِنَّآ اَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ ۝ اے محبوبؐ! بے شک ہم ہی نے تمہیں بے شمار خوبیاں عطا فرمائیں۔ (کیونکہ الکوثر سے مراد دنیا اور آخرت میں خیر کثیر ہے۔ اور یہ کلمہ اپنے اس اختصار و ایجاز کے باوجود اس راز کے اظہار و بیان کو شامل ہے۔ اور اگر جہان بھر کے حکماء و عرفا اس کلمہ کی شرح کریں تو اس کلمہ کا حق ادا نہیں کر سکتے)

(۲-۳) فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ ۝ اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ ۝: تو تم بھی اپنے رب کی نماز پڑھو اور قربانی کرو۔ بے شک جو تمہارا دشمن ہے وہ خیر سے محروم ہے۔ (یعنی ایک عبادت بدنی اور دوسری عبادت مالی۔ نماز عبادتِ بدنی کی طرف اور قربانی عبادتِ مالی کی طرف اشارہ ہے۔ اور "اِنَّآ اَعْطَيْنٰكَ" (بے شک ہم نے آپؐ کو عطا فرمایا) کو لفظِ ماضی کے ساتھ ذکر فرمایا[۱]۔ اور "سَنُعْطِيْكَ" (عنقریب آپ کو عطا فرمائیں گے) نہ فرمایا۔ تاکہ اس پر دلالت کرے کہ تمام عطائیں قبل از وجودِ عنصری آپؐ کو حاصل ہو چکی ہیں۔ (سبحان اللہ)
(از مدارج نبوت صفحہ ۱۴۴، ۱۴۵)

---

[۱] "جو چیز ربّ العزت اپنے کسی رسول، بالخصوص امام الرسلؐ کو عطا کرتا ہے، دائمی طور پر عطا کرتا ہے۔ پھر عطا اور احسان جس درجہ کا ہو، اُس کا شکر بھی اسی کے مطابق ہونا چاہیئے اسی سے صلوٰۃ اور قربانی کی عظمت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔" محترم کشفی صاحب۔

کوثر سے مراد جنت کی نہر بھی ہے، جس کے متعلق احادیث میں آتا ہے۔
حوضِ کوثر کی چوڑائی اس کے طول کے مانند ہے اور اس کی گہرائی ستر ہزار فرسخ ہے۔
جو بھی اس کا پانی پئے گا پھر کبھی نہ پیاسا ہو گا، اس کلام کا ظاہری پہلو یہ ہے کہ یہ پانی بعد از حساب ہو گا اور ان ہی کی قسمت میں ہو گا جو پُل صراط سے خیر کے ساتھ گزر آئے۔

حضرت ابنِ عمر رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میرے حوض کی لمبائی ایک ماہ کی مسافت ہے۔ اور اتنی ہی اس کی چوڑائی ہے، اور اس کا پانی شہد سے زیادہ شیریں ہے اور موتی اور یاقوت پر بہتا ہے، اور دودھ سے زیادہ سفید ہے اور بعض روایتوں میں ہے کہ برف سے زیادہ سفید ہے، اس کی خوشبو مُشکِ نافہ سے زیادہ تیز ہے، اور اس کے بلبلے آسمان کے ستاروں کے مانند ہیں اور گرداگرد موتیوں کے قبے ہیں۔ (مدارجِ نبوت صفحہ ۴۸۳)

اور اس حوض پر حضورِ پُرنور صلی اللہ علیہ وسلم، اُن کے آل رض اور اصحاب رض، اور صالحین رح اور اولیاءِ کرام رح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کو پانی پلانے میں مشغول ہوں گے۔ تاکہ امتِ محمدیہ کے صدیقین رض اور صالحین رح کی عظمت جملہ انبیاء ع کی اُمتیں بھی دیکھ لیں۔ یہ بھی امکان ہے کہ اسی حوضِ کوثر سے چھوٹے چھوٹے حوضوں میں بھی پانی جا رہا ہو گا، جو دوسرے انبیاء کی امتوں کے صالحین کے لئے مخصوص ہو گا۔ دنیا میں بھی فیضانِ رحمت ساقیٔ کوثر ص کے باعث تھا اور آخرت میں بھی رحمت کا فیضان انہیں ص کے توسّل سے ہو گا۔

اللہ رب العزت کی بارگاہ میں دستِ بدعا ہوں کہ وہ اپنے حبیب رحمۃ للعالمین شفیع المذنبین، راحت العاشقین ص کے طفیل، اپنی اِس پُرنور جماعت کے جھرمٹ میں ہم گنہگاروں کو بھی شامل فرما لے اور ہمارا خاتمہ بھی

بالخیر ہو۔ عالمِ برزخ بھی دامنِ خیر کے سایہ میں گذرے، حشر میں بھی دامنِ خیر ہاتھ سے نہ چھوٹے اور بالآخر خیر الغافرین، خیر الحاکمین، ارحم الراحمین کے کرم سے اُس کے حبیب کے قدموں میں ٹھکانا مِل جائے کہ لمحہ بھر بھی حضورِ انور سے جُدائی نہ ہو۔ آمین۔

الحمد للّٰہ ربّ العٰلمین

کہ ایک عاجز، عاصی کو نورِ مبین صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم کی جھلکیاں دکھاتا ہوا اس مقام پر لایا

کہ اب لواء الحمد

تصوّر کی نگاہوں کے سامنے ہے .... سبحان اللّٰہ

وہ مقام

جہاں حمد، اور الحمد کے معنی کُھلتے ہیں، جس سے قرآن شروع ہوا تھا۔ اب بائے بسم اللّٰہ کا عرفان نصیب ہوتا ہے جو رحمٰن و رحیم پر ختم ہوتی ہے۔ اِس رحمانیت اور رحیمیت کے فہم کی حقیقت کُھلتی ہے جو حمد کا تاج بنا تھا۔ جسے کبھی تصوّر نے دیکھا تھا اب نظروں کے سامنے ہے۔

سبحان اللّٰہ وبحمدہٖ سبحان اللّٰہ العظیم

اے بے مایہ، عاجز، بے نوا

پہلے اس کرم کا شکر ادا کر کہ جو اس درِ رحمت تک لایا

اور وہ دُعا زبان پر لا جو روضۂ نبوی کی جانب بڑھتے ہوئے پڑھا کرتا تھا۔ پھر رجوع کر۔

کیا عجب ہے کہ اس مقام کا کچھ عرفان نصیب ہو

اَللّٰھُمَّ

اِفْتَحْ لِیْ اَبْوَابَ رَحْمَتِكَ وَارْزُقْنِیْ مِنْ زِیَارَۃِ رَسُوْلِكَ مَا رَزَقْتَ اَوْلِیَاءَكَ

وَاَھْلَ طَاعَتِكَ وَاغْفِرْلِیْ وَارْحَمْنِیْ یَاخَیْرَ مَسْئُوْلٍ

پھر عرض کر.........اَللّٰھُمَّ
اَرِنِیْ وَجْہَ حَبِیْبِکَ بِوَجْہِ حَبِیْبِکَ مُحَمَّدٍ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ
وَارْزُقْنَا جَمَالَہٗ وَاَنْوَارَہٗ
یَا اَرْحَمَ الرَّاحِمِیْنَ۔ آمِیْن آمِیْن آمِیْن۔ بحرمت رحمۃ للعلمین سید المرسلین

لواء الحمد

واضح رہے کہ لواء الحمد سے مراد "حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حمد اور مقامِ محمود میں انفرادیت اور شہرت ہے" (مدارج نبوت جلد اوّل صفحہ ۴۸۱)

لواء الحمد کا ذکر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت کے ضمن میں دو مقامات پر آتا ہے۔ اوّل اس وقت جب مخلوقِ خدا روزِ حشر گرمی، دھوپ، پیاس کی شدّت سے بے تاب ہو گی، اور ہر طرف سے نا امید ہو کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو گی۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم عذاب میں تخفیف اور حساب میں تعجیل کی درخواست اللہ ربّ العزت کی بارگاہ میں فرمائیں گے، اور لوگوں کی زبانوں پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حمد و نعت ہو گی۔

یہ بھی ممکن ہے کہ یہ وہ جھنڈا ہو جہاں کلمۂ توحید و رسالت کی یکائی فضاؤں میں ایک جھنڈے کی صورت میں لہرا رہی ہو اور اس قرب پر شاہد ہو جس کے متعلق خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"میں ہی وہ شخص ہوں جو روزِ قیامت خطبہ دے گا۔ تو میں عرش کے داہنی جانب اس کے سایہ میں کھڑا ہوں گا، اور مجھے جنّتی حلّہ پہنایا جائے گا۔ آگاہ اور خبر دار ہو کہ میری امّت سب سے پہلی امّت ہو گی جس کا روزِ قیامت حساب ہو گا۔ مجھے ایک جھنڈا سپرد کیا جائے گا، جس کا نام لواء الحمد ہے۔ آدمؑ اور تمام خلق کسی سایہ کی متلاشی ہو گی، وہاں میرے جھنڈے کا سایہ ہو گا۔"

پھر اس کی ساخت کا ذکر آتا ہے۔ (تاکہ اس کے سایہ میں جملہ مخلوق آسکے)
(۲) لیکن جس لواء الحمد کی تفسیر یہاں مُراد ہے اُسے مفسّرین اور محدّثین نے اُس سایۂ رحمت کو مقامِ محمود ہی سے متعلق کیا ہے۔

مقامِ محمود : (آیاتِ قرآنی کی روشنی میں)

یہ وہی مقامِ شفاعت ہے جس کے متعلق قرآنِ حکیم میں ان الفاظ میں وعدہ فرمایا گیا ہے :

عَسٰٓی اَنْ یَّبْعَثَکَ رَبُّکَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا ○ (بنی اسرائیل ۷۹)

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس عظیم ترین مقام کے ذکر سے قبل اُن دو۲ گروہوں کا ایک اجمالی نقشہ پیش کیا جائے جن کا ذکر سورۂ زمر میں آتا ہے۔ اور اس کے ساتھ اسی سورہ سے اُن آیات کی طرف توجہ مبذول کی جائے، جن میں اِس حقیقت کو واضح کیا گیا ہے کہ بالآخر ان دو۲ گروہوں کی تقسیم کس بنیاد پر ہوگی، تاکہ دُنیا ہی میں اللہ کے بندے یہ فیصلہ کرلیں کہ قیامت کے دن کس گروہ میں شامل ہونا چاہیں گے۔

واضح ہو کہ سورۂ زمر وہ سورہ ہے جو قرآنِ حکیم میں سورہ "ص" کے بعد آیا ہے، جس میں تصدیقِ کلمہ کے ذکر میں توحید، رسالت اور آخرت کا بیان ہے۔ انسان کی تخلیق کی غایت، وحدتِ فکر و عمل، جذبۂ شکر گزاری، اور صبر کی تعلیمات سے مومن کا سینہ اسلام کے لئے کشادہ کیا گیا ہے تاکہ اس کا قلب نورِ معرفت سے معمور ہو اور وہ سراپا نور بن جائے۔ اور جو ان حقائق کے منکر ہوئے وہ ظاہر ہے کہ تباہی کی طرف چلے گئے۔ سورہ کے آخر میں ان دو گروہوں کا ذکر آتا ہے، ایک نافرمان دوسرا فرمانبردار۔ ایک محرومِ ہدایت ایک سرفرازِ ہدایت۔ اور ایسا کیوں ہوا اس کا ذکر قرآنِ حکیم میں صراحت کے ساتھ بار بار آتا ہے۔

اور اسی سورہ زمر کی آیات ۶۴ تا ۷۰ میں اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ کے بیان کے بعد اس حقیقت کو ذہن نشین کیا گیا ہے کہ مومن دنیا میں اللہ اور رسولؐ کو مانتا، آخرت پر ایمان رکھتا تھا، اس ایمان اور فرمانبرداری کے باعث وہ قیامت کو امن میں ہوگا۔ اور کافر دنیا میں منکرِ حق رہا، شرک و کفر کو اپنایا، آخرت میں حقائق کے ظاہر ہو جانے کے بعد اس کا ایمان کوئی کام نہ آئے گا، اور موجبِ عذاب بنے گا۔

اب احوالِ قیامت کی طرف آئیے

جب صور پھونکا جائے گا، تو آسمانوں میں اور زمین میں جو بھی ہیں سب بے ہوش ہو جائیں گے، بجز اس کے جس کو اللہ چاہے۔ پھر دوسری بار صور پھونکا جائے گا، تو فوراً سب کھڑے ہو جائیں گے۔ (اور حیرت زدہ ہو کر ہر طرف) دیکھنے لگیں گے (کہ وہ کہاں ہیں) (زمر ۶۸)۔

(اس کے بعد ایک تجلیٔ خصوصی ہوگی)

اور (محشر کی) زمین اپنے رب کے نور سے چمک اٹھے گی، اور نامۂ اعمال سامنے رکھ دیئے جائیں گے، اور پیغمبرؑ اور گواہ (اللہ کے روبرو) حاضر کئے جائیں گے، اور لوگوں میں (ہر شخص کے نامۂ اعمال کے مطابق) انصاف کے ساتھ (ٹھیک ٹھیک) فیصلہ ہوگا، اور ان (میں کسی) پر (قطعی کوئی) ظلم نہ ہوگا۔ (آیت ۶۹)

اور ہر شخص کو اس کے اعمال کا پورا پورا بدلہ ملے گا۔ اور اللہ تعالیٰ کو خوب معلوم ہے کہ جو کچھ یہ کیا کرتے ہیں۔ (یہ گواہی لوگوں کو ان کے اعمال بتانے کے لئے ہے ورنہ درحقیقت اللہ کو سب علم ہے۔ اور ہر ایک کا حال اس پر عیاں ہے)

(اس کے بعد سورہ زمر کا آخر رکوع شروع ہوتا ہے)

زمر کے معنی ہیں گروہ کے — دنیا میں جو لوگ اختلاف کرتے رہے، آخرت

ہیں اُن کے تمام اختلافات کا فیصلہ کر دیا جائے گا۔ نافرمان کافر دوزخ کی طرف لے جائے جائیں گے۔ اہلِ ایمان و فرماں بردار کا خیر مقدم فرشتے جنت میں کریں گے۔ اب قرآنِ کریم میں اِنہیں دو گروہوں کا ذکر یوں آتا ہے۔ (ترجمہ)

(۱) پہلے نافرمانوں کا جو اصلِ جہنم ہوں گے۔

(۲) دوسرا مومنوں کا جن کا عروج ہوتا رہے گا۔

۷۱-۷۲۔ وَسِيقَ الَّذِينَ كَفَرُوٓا۟ إِلَىٰ جَهَنَّمَ زُمَرًا .... الْمُتَكَبِّرِينَ ○

اور کافروں کو گروہ در گروہ جہنم کی طرف ہانکا جائے گا۔ یہاں تک کہ جب وہ اس کے پاس پہونچ جائیں گے تو اس کے دروازے کھول دیئے جائیں گے۔ اور ان سے (دوزخ کے) محافظ فرشتے کہیں گے کیا تمہارے پاس تم ہی میں سے رسولؐ نہیں آئے تھے، جو تم کو تمہارے پروردگار کی آیتیں پڑھ کر سُنایا کرتے تھے، اور تم کو اِس دن کے پیش آنے سے ڈرایا کرتے تھے؟ وہ (ندامت سے) کہیں گے، ہاں۔ اور (وہ دیکھ لیں گے کہ بالآخر) کافروں پر عذاب کا وعدہ پورا ہو کر رہا ہے۔

۷۲۔ حکم ہو گا کہ دوزخ کے دروازوں میں داخل ہو جاؤ۔ اور اسی میں ہمیشہ رہا کرو۔ پس تکبّر کرنے والوں کا کیا بُرا ٹھکانا ہے۔ (تم نے شیخی اور غرور میں اللہ کی نافرمانی کی اب اس کا مزہ چکھو) یہاں بھی اللہ ربّ العزت کفّار کی توجہ اپنے رسولوںؑ ہی کی طرف مبذول فرماتا ہے جنؑ کے انکار نے اُنہیں یہ دن دکھایا، اور جہنم میں ڈالے گئے، جس کے ہولناک مناظر سے انہیں انبیاءؑ ڈراتے رہے۔

اب بڑے شان و وقار سے مومنوں کا ذکر آتا ہے۔

(۷۳ تا ۷۵) وَسِيقَ الَّذِينَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ إِلَى الْجَنَّةِ زُمَرًا ..... رَبِّ الْعَالَمِينَ ○

اور جو لوگ اللہ سے ڈرتے رہے، وہی جنت کی طرف (ذوق و شوق، بڑے عزّت و وقار) کے ساتھ گروہ در گروہ لے جائے جائیں گے۔ یہاں تک کہ جب

وہ اس کے پاس پہونچیں گے، اور اس کے دروازے کھول دیئے جائیں گے (یوں ان کا خیر مقدم کیا جائے گا) اور اس کے محافظ (فرشتے) کہیں گے تم پر سلام ہو۔ تم پاکیزہ لوگ ہو پس اس میں ہمیشہ رہنے کے لئے داخل ہو جاؤ۔

(۷۴) اور وہ کہیں گے کہ اللہ کا شکر ہے جس نے ہم سے اپنا وعدہ سچا کیا، اور ہم کو اس زمین کا وارث بنایا، کہ ہم جنت میں جہاں چاہیں رہیں۔ (جنت میں بھی خاکساری ہی پیشِ نظر رہی کہ ارض کا ذکر کیا) پس (دنیا میں نیک) عمل کرنے والوں کا کیا خوب بدلہ ہے۔

(۷۵) اور (یہی نہیں بلکہ) آپؐ فرشتوں کو دیکھیں گے، کہ عرش کے گرد حلقہ باندھے ہوتے اپنے پروردگار کی حمد و ثنا کے ساتھ پاکی بیان کرتے ہوں گے، اور (اس دن) لوگوں کے درمیان انصاف کے ساتھ فیصلہ کر دیا جائے گا اور (ہر طرف سے یہی صدا آئے گی، یہی) کہا جائے گا کہ تمام تعریف اللہ ہی کے لئے ہے جو سارے جہانوں کا پروردگار ہے۔

دیکھو! کافروں سے اللہ کے رسولؐ کی بات کی گئی، اور رسولؐ سے محبت کرنے والوں سے ربِّ محمدؐ کے انعامات کا ذکر ہوا جملہ انعامات انہیںؐ کے فرمان پر یقین کا نتیجہ ہیں۔

غرض دونوں گروہ، دوزخ اور جنت کے مختلف دروازوں سے داخل کئے جائیں گے لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم جن کی فطرت ہی رحمت ہے، وہؐ اب بھی اپنی امت کے لوگوں کے لئے جس میں دوسرے انبیاءؑ کے اہلِ ایمان شامل ہوں گے ان سب کی شفاعت کے لئے مضطرب ہوں گے۔ تاکہ اللہ کا نام لینے والا کوئی بھی دوزخ میں نہ رہ جائے۔ صلوا علیہ والہ

آئیے! جس طرح قرآنِ حکیم سے قیامت اور دخولِ جنت و دوزخ کا ایک مختصر لیکن جامع نقشہ آپ نے ملاحظہ فرمایا، اب وہ حدیثِ مبارکہ بھی جو

شفاعت کی ہر منزل پر مشتمل ہے اس سے ایمان کو تازہ کریں، اور جس کے جستہ جستہ حصے گذشتہ اوراق میں پیش کئے گئے۔ تاکہ نورِ مبینؐ کا پرتوِ رحمت اور خیر الراحمین کی رحمت "رَحْمَتِیْ وَسِعَتْ کُلَّ شَیْءٍ" کو قیامت پر بھی غالب دیکھ لیں۔

سرورِ کائناتؐ کے نورِ مبارک کا سفر اپنی منزل کی طرف رواں دواں ہے۔ ابتدائے آفرینش سے اس آخری منزل تک، اور اب اس کا وہ مقام آتا ہے جسے مقامِ محمود کہا جاتا ہے۔ وہی نقطۂ نوری جو ابتدا میں نقطۂ بائے بسم اللہ بنا تھا اپنے انوارِ رحمت، کہکشاں کی طرح اللہ کی مخلوق کے لئے بکھیرتا ہوا خود اپنے لئے نہیں بلکہ جملہ مخلوق کے لئے نقطۂ عرفان بن کر آشکارا ہونے کو ہے۔

لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی فہمِ توحید، فہمِ رسالت، فہمِ قرآن، فہمِ حدیث، فہمِ اسلام، فہمِ ایمان کی جس قدر بھی داد و ستائش کی جائے کم ہے۔ جس طرح قرآن و حدیث کے انوار تا قیامِ قیامت کھلتے رہیں گے اسی طرح امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے انوارِ قلب کی زیارت بھی ہر زمانہ میں نئے انداز سے ہوتی رہے گی۔

سوچئے۔ جب بھی ہم اسلام کا تصور تک کرتے ہیں تو سب سے پہلے توحید کا بیان ضروری سمجھتے ہیں۔ امام صاحب سے زیادہ توحید کی حقیقت و اہمیت سے کون واقف ہوگا۔ آپؒ جانتے تھے کہ اسلام کی رُوح، توحید کی طرف لانا ہے، نہ کہ صرف بیان کرنا۔ رسالت کا مقصد جسم، قلب و رُوح کو توحید سے عملاً اور نوراً معمور کرنا ہے۔ اِس لئے آپ نے لفظِ توحید سے نہیں بلکہ انوارِ توحید سے احادیث کی ترتیب بخاری شریف میں فرمائی۔ پہلے اِس نقطۂ توحید کو "دل" میں

ہوا یعنی نیّت کی اہمیّت اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ)۔ اور اِسی کو نقطۂ نوری کا اصل فیضان بنا کر جملہ عقائد، ارکان، اسلام اور اُس کے جملہ حقائق کا بیان ایک خاص ترتیب سے کرتے ہوئے بابِ توحید کتاب کے آخر میں قائم کیا کہ کلمہ کی حقیقت ایمان و عمل کے بعد ہی کھلتی ہے۔

دیکھئے! امام صاحبؒ نے حدیثِ شفاعت قیامت کے بیان میں پیش کرنے کے بجائے اُسے کتاب التوحید میں پوری کی پوری پیش فرمائی ہے۔ گو اس کے اہم اجزا کا ذکر قیامت کے سلسلے میں اسی انداز سے آیا ہے جو اس کی اہمیت کا تقاضا تھا۔ لیکن کتاب التوحید میں اس کا مکمل بیان کرنا اُنؒ کی فہم حدیث و فہم توحید و فہم رسالت کی ایک عظیم شہادت ہے۔

یہ مقامِ محمود تو وہ ہوگا کہ کلمہ کی توحید نظروں کے سامنے ہوگی جس کلمہ کے پڑھنے کے بعد مقامِ دید کھلتا ہے۔ دنیوی آنکھوں سے پانا تو نصیب کی بات ہے، لیکن اُخروی آنکھوں سے تو ہر اہلِ جنّت کا نصیب بن جاتا ہے۔

ہم یہاں اِسی فہم بخاریؒ کے تحت اِس حدیث کو بخاری شریف کی کتابِ توحید سے پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہے ہیں جس کے بعد حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم نے آیت تلاوت فرمائی۔

عَسٰٓى اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا

یہ ایک جامع حدیث شریف ہے جس کی ابتداء روزِ حشر کی سراسیمگی اور تلاشِ شافعِ محشر کے لئے مخلوق کی بے چینی، اور جس کا آخر شفاعتِ عظمیٰ و مقامِ محمود کے لئے خاص ہے۔

(از بخاری شریف کتاب التوحید، باب ۱۲۵ صفحہ ۸۷۶ جلد سوم اردو ترجمہ)

"حجاج بن منہال نے بواسطہ ہمام بن یحییٰ قتادہ، حضرت انسؓ سے نقل کیا ہے کہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا کہ قیامت کے دن مومن روکے جائیں گے،

یہاں تک کہ وہ اس سے غمگین ہوں گے، اور کہیں گے کہ ہم اپنے پروردگار کی سفارش کرائیں، تاکہ ہمیں اس جگہ سے نجات ملے۔ چنانچہ یہ لوگ حضرت آدم علیہ السلام کے پاس آئیں گے، اور کہیں گے، آپ آدمؑ آدمیوں کے باپ ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپؑ کو اپنے ہاتھ سے پیدا کیا، اور آپؑ کو جنت میں جگہ دی اور فرشتوں نے آپؑ کے سامنے سجدہ کیا۔ اور آپؑ کو تمام چیزوں کے نام بتائے گئے۔ لہٰذا اپنے رب کے پاس ہماری سفارش کریں، کہ ہمیں اس جگہ سے نجات ملے۔ حضرت آدمؑ جواب دیں گے کہ میں اس لائق نہیں ہوں، اور اُس غلطی کو یاد کریں گے جو انہوں نے کی تھی، یعنی اُس درخت سے کھانا جس سے اُن کو منع کیا گیا تھا۔ اور کہیں گے تم نوحؑ کے پاس جاؤ، وہ پہلے نبی ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے زمین والوں کی طرف بھیجا۔ چنانچہ یہ لوگ حضرت نوحؑ کے پاس آئیں گے اور وہ (حضرت نوحؑ) اپنی غلطی کو یاد کریں گے، جو انہوںؑ نے کی تھی، یعنی اپنے رب سے بغیر علم کے سوال کرنا۔ پھر کہیں گے تم لوگ حضرت ابراہیمؑ کے پاس جاؤ۔ وہ لوگ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کے پاس جائیں گے۔ تو وہؑ جواب دیں گے کہ میں اس لائق نہیں ہوں، اور اپنی تین باتیں یاد کریں گے جو انہوں نے کی تھیں۔ لیکن (فرمائیں گے کہ) تم حضرت موسیٰؑ کے پاس جاؤ، وہ ایسے بندے ہیں جن کو اللہ نے تورات دی، اور انؑ سے ہمکلام ہوا، اور اُنؑ کو نزدیک کر کے سرگوشی کی۔ حضرت موسیٰؑ جواب دیں گے کہ میں آج اس قابل نہیں، اور قتلِ نفس کی غلطی کو یاد کریں گے۔ تم حضرت عیسیٰؑ کے پاس جاؤ، جو اس کے بندے، اور اس کے رسول ہیں، اور اللہ کی روح، اس کا کلمہ ہیں۔ لوگ حضرت عیسیٰؑ کے پاس آئیں گے۔ اور وہؑ جواب دیں گے، کہ میں آج اس قابل نہیں، مگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جاؤ، وہ ایسے بندے ہیں کہ اللہ نے اُنؐ کے اگلے پچھلے گناہ بخش دیئے ہیں۔

(آپ صلّی اللہ علیہ وسلّم فرماتے ہیں) کہ لوگ میرے پاس آئیں گے اور میں رب سے اس کے (اللہ کے) گھر میں داخل ہونے کی اجازت چاہوں گا۔ اور جب میں اسے دیکھوں گا تو سجدے میں گر پڑوں گا۔ جس قدر اللہ کو منظور ہوگا مجھے اِس حالت میں رہنے دے گا۔ پھر فرمائے گا "محمدؐ سر اٹھاؤ، اور کہو، سُنا جائے گا، شفاعت کرو، اور قبول ہوگی اور مانگو، دیا جائے گا۔" آپؐ نے فرمایا میں اپنا سر اٹھاؤں گا، اور اپنے رب کی حمد وثنا کروں گا، جو اللہ مجھے سکھائے گا۔ پھر میرے لئے حد مقرر کر دی جائے گی۔ پھر میں اُن لوگوں کو جا کر جنّت میں داخل کروں گا۔

اور قتادہ نے کہا، میں نے انسؓ کو یہ کہتے سُنا، کہ میں جا کر انہیں دوزخ سے نکالوں گا۔ اور بہشت میں داخل کروں گا پھر لوٹ کر آؤں گا اور اللہ کے گھر میں داخلہ کی اجازت چاہوں گا۔ مجھے اجازت ملے گی، اور میں اُسے دیکھوں گا تو میں سجدے میں گر پڑوں گا، جتنی دیر تک اللہ کو منظور ہوگا، پھر مجھے اسی حالت میں چھوڑ دے گا۔ پھر فرمائے گا کہ "اے محمدؐ اپنا سر اٹھاؤ، کہو، سُنا جائے گا، شفاعت کرو، قبول ہوگی۔ مانگو، دیا جائے گا۔" آپؐ نے فرمایا کہ میں اپنا سر اٹھاؤں گا، اور اپنے رب کی حمد وثنا کروں گا، جو وہ مجھے سکھائے گا۔ آپؐ نے فرمایا کہ پھر میں شفاعت کروں گا، اور میرے لئے حد مقرر کر دی جائے گی، تو میں جا کر اُن کو جنّت میں داخل کروں گا۔ قتادہ نے کہا کہ میں نے انسؓ کو یہ کہتے سُنا کہ میں جا کر اُن کو دوزخ سے نکالوں گا، اور بہشت میں داخل کروں گا۔ اور پھر تیسری بار لوٹ کر آؤں گا۔ اور اپنے رب سے اُس کے گھر میں داخل ہونے کی اجازت مانگوں گا، اور مجھے اجازت ملے گی۔ جب میں اُس کو دیکھوں گا تو سجدہ میں گر پڑوں گا، اور جب تک خدا کو منظور ہوگا مجھے اِس حالت میں رہنے دے گا۔ پھر فرمائے گا "اے محمدؐ سر اٹھاؤ۔ کہو، سُنا جائے گا۔

سفارش کرو، قبول ہو گی۔ مانگو، دیا جائے گا۔ آپؐ نے فرمایا کہ میں سر اٹھاؤں گا اور اپنے رب کی حمد و ثنا کروں گا، جو مجھے سکھائے گا۔ آپ نے فرمایا پھر میں شفاعت کروں گا، تو میرے لئے ایک حد مقرر کر دی جائے گی، میں جاکر انہیں جنت میں داخل کروں گا۔ قتادہ نے کہا کہ میں نے حضرت انسؓ سے سنا کہ انہیں دوزخ سے نکال کر جنت میں داخل کروں گا، یہاں تک کہ دوزخ میں کوئی بھی باقی نہ رہ جائے گا، بجز اُن کے جن کو قرآن نے روک رکھا ہوگا، یعنی (قرآن کی رُو سے) جن پر دوزخ میں ہمیشہ رہنا واجب ہے۔ انسؓ کا بیان ہے کہ پھر آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی۔

عَسٰٓى اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا

جس کا تمہارے نبی صلّی اللہ علیہ وسلّم سے وعدہ کیا گیا ہے۔"

یہی مقامِ محمود ہے۔

یہاں یہ بات بڑی اہمیت کی حامل ہے

کہ بخاری شریف میں حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کی دعائے تہجّد کو اس حدیث کے بعد جگہ دی گئی ہے

تاکہ مخفی نہ رہے

کہ اللہ تعالیٰ کا جو وعدہ قرآنِ حکیم میں ہے، اس کے لئے یہ دعا امّت کے لئے موجبِ فضل و کرم بنے۔

اللہ تعالیٰ نے سورۂ بنی اسرائیل میں فرمایا:

وَمِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ ۖ عَسٰٓى اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا ﴿۷۹﴾

اور (اے حبیبؐ) رات کے کچھ حصّے میں (نمازِ) تہجّد پڑھا کیجئے۔ یہ (حکم) آپؐ کے ساتھ ہے (کیونکہ آپؐ کے مرتبے بہت بلند ہیں)، قریب ہے کہ آپؐ کا رب آپؐ کو مقامِ محمود عطا فرمائے (آپؐ سب کی شفاعت فرمائیں اور اللہ اور اس

کی جملہ مخلوق آپؐ کی تعریف کر رہی ہو۔ سوچو! کہ وہ مقام کیا ہوگا کہ جب شانِ محمدیت کا پورا پورا ظہور ہوگا، اور جہاں جملہ اشیاء اور خود خالقِ کائنات ثنائے محمد صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہا ہوگا۔)

اَللّٰھُمَّ ارْزُقْنَا شَفَاعَتَہٗ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ

یہی شفاعتِ عظمیٰ کا مقام ہے، جہاں زبانیں بند ہوں گی، جملہ پیغمبرؑ بھی خاموش ہوں گے، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم چار بار رب العزت میں خلق کو تکلیف سے نکالنے کے لئے سربسجود ہوں گے۔ اور یہ شفاعت بھی کچھ اِس درجہ عجز و انکسار اخلاص اور گریہ وزاری سے بارگاہِ ربِ کریم میں ہوگی کہ اللہ رب العزت بھی اپنے حبیبؐ کا ثناخواں ہوگا۔ شاید اِس مقام کی اِس رفعتِ شان کی وجہ سے مقامِ محمود کہا گیا۔

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا اِس حدیثِ شفاعت کے فوراً بعد آپؐ کی وہ دُعا بابِ توحید میں شامل فرمانا محض انؒ کی فہم قرآن و حدیث ہی پر شاہد نہیں بلکہ حضورؐ کی اُمت سے خصوصی محبت پر بھی دال ہے کہ امت اس نعمتِ عظمیٰ سے اپنی تہجد کی نماز میں استفادہ سے محروم نہ رہے۔ کیا عجب ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں میں اس اُمتی کو بھی جگہ مل جائے کہ یہی اس کی معراج ہوگی۔ چنانچہ اکثر بزرگ اِس مکرم و منور دعا پر پابندی کی تاکید فرماتے ہیں۔ جو اِس حدیثِ مبارکہ میں آتی ہے۔ حدیث شریف یہ ہے۔

حَدَّثَنِیْ ثَابِتُ بْنُ مُحَمَّدٍ حَدَّثَنَا سُفْیٰنُ عَنِ ابْنِ جُرَیْجٍ عَنْ سُلَیْمَانَ الْاَحْوَلِ عَنْ طَاؤُسٍ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ کَانَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِذَا تَھَجَّدَ مِنَ الَّیْلِ قَالَ اللّٰھُمَّ رَبَّنَا لَکَ الْحَمْدُ اَنْتَ قَیِّمُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلَکَ الْحَمْدُ

اَنْتَ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَنْ فِيْهِنَّ اَنْتَ الْحَقُّ وَقَوْلُكَ الْحَقُّ وَوَعْدُكَ الْحَقُّ وَلِقَاءُكَ حَقٌّ وَالْجَنَّةُ حَقٌّ وَالنَّارُ حَقٌّ وَالسَّاعَةُ حَقٌّ اَللّٰهُمَّ لَكَ اَسْلَمْتُ وَبِكَ اٰمَنْتُ وَعَلَيْكَ تَوَكَّلْتُ وَاِلَيْكَ خَاصَمْتُ وَاِلَيْكَ حَاكَمْتُ فَاغْفِرْلِيْ مَاقَدَّمْتُ وَمَا اَخَّرْتُ وَاَسْرَرْتُ وَاَعْلَنْتُ وَمَا اَنْتَ اَعْلَمُ بِهٖ مِنِّيْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ۔ (جلد سوم صحیح بخاری باب التوحید حدیث ۲۲۹۰)

اور ترتیب شریف مرتبہ برکت علی صوفی مدظلہ، بروایت ابن عباسؓ از مسلم شریف اس حدیث میں اَلْجَنَّۃُ حَقٌّ وَالنَّارُ حَقٌّ کے بعد وَالنَّبِیُّوْنَ حَقٌّ وَمُحَمَّدٌ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ حَقٌّ لکھا ہے۔ اور اس کے بعد وَالسَّاعَۃُ حَقٌّ.....الآخر

(روایت ابن عباس، بخاری مسلم مشکوٰۃ شریف)

ترجمہ:۔ ثابت بن محمد، سفیان، ابن جریج، سلیمان احوال، طاؤس، حضرت ابن عباسؓ سے روایت کرتے ہیں۔ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب رات کو تہجد کو نماز پڑھتے تو فرماتے، اے اللہ اے ہمارے رب سب تعریف تیرے ہی لئے ہے، تو ہی آسمانوں اور زمین کو قائم رکھنے والا ہے، (سب) تعریف تیرے ہی لئے ہے، تو ہی آسمانوں اور زمین میں اور جو کچھ ان میں ہے سب کا رب ہے۔ (سب) تیرے ہی لئے ہے، تو ہی نور ہے۔

آسمانوں اور زمین کا اور جو کچھ ان میں ہے (سب کا)۔ تو حق ہے۔ تیری بات حق ہے۔ تیرا وعدہ حق ہے۔ اور تیری ملاقات حق ہے۔ جنت حق ہے۔ دوزخ حق ہے، قیامت حق ہے۔ اے اللہ میں تیرے لئے اسلام لایا، اور تیرے ساتھ اسلام لایا، اور تجھ پر توکل کیا۔ تیرے ہی پاس اپنا جھگڑا لاتا ہوں، اور تجھ ہی سے فیصلہ چاہتا ہوں۔ تو میرے اگلے پچھلے پوشیدہ ظاہر گناہ اور وہ

(گناہ) تو مجھ سے زیادہ جانتا ہے (سب) بخش دے۔ تیرے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔
اِس کے ساتھ اِس دعائے نور کا ذکر ضروری ہے، جس کا ذکر احادیث کی متعدّد کتب میں آتا ہے۔ اور جو حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کی زبانِ مبارک پر تہجد کے وقت ہوتی۔ (از کتاب العمل بالسنّۃ المعروف بہ ترتیب شریف حضرت برکت علی شاہ لودھیانوی حصّہ اوّل صفحہ ۲۴۶)۔

اَللّٰھُمَّ اجْعَلْ لِّیْ نُوْرًا فِیْ قَلْبِیْ وَنُوْرًا فِیْ قَبْرِیْ وَنُوْرًا بَیْنَ یَدَیَّ وَنُوْرًا مِّنْ خَلْفِیْ وَنُوْرًا عَنْ یَمِیْنِیْ وَنُوْرًا عَنْ شِمَالِیْ وَنُوْرًا مِنْ فَوْقِیْ وَنُوْرًا مِّنْ تَحْتِیْ وَنُوْرًا فِیْ سَمْعِیْ وَنُوْرًا فِیْ بَصَرِیْ وَ نُوْرًا فِیْ شَعْرِیْ وَنُوْرًا فِیْ بَشَرِیْ وَنُوْرًا فِیْ لَحْمِیْ وَنُوْرًا فِیْ دَمِیْ وَنُوْرًا فِیْ عِظَامِیْ، اَللّٰھُمَّ اَعْظِمْ لِیْ نُوْرًا وَاَعْطِنِیْ نُوْرًا وَاجْعَلْ لِیْ نُوْرًا ۔

ترجمہ:۔ اے اللہ کر دے میرے لئے نور میرے دل میں، نور میری قبر میں، نور میرے آگے، نور میرے پیچھے، اور نور میرے دائیں، اور نور میرے بائیں، اور نور میرے اوپر، اور نور میرے نیچے، اور نور میرے کان میں، اور نور میری آنکھ میں، اور نور میرے بالوں میں، اور نور میری جلد میں، اور نور میرے گوشت میں، اور نور میرے خون میں، اور نور میری ہڈیوں میں۔ اے اللہ، پُر عظمت کر دے میرے لئے نور کو، اور عطا کر مجھے نور، اور بنا دے میرے لئے نور ہی نور (ترتیب شریف) یعنی میں نور ہی نور ہو جاؤں۔ نور بن کر نور کو دیکھ لوں، پا لوں۔
حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم تو نور ہیں۔ تعلیم دی جا رہی ہے کہ تم یوں دعا کرو کہ نور کا قرب تمہارا نصیب ہو۔

اَللّٰھُمَّ اَتْمِمْ لَنَا نُوْرَنَا وَاغْفِرْ لَنَا وَاِنَّکَ اَنْتَ خَیْرُ الْغَافِرِیْنَ وَارْحَمْنَا وَاِنَّکَ اَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِیْنَ ۔

اے ہمارے پروردگار ہمارے لئے نور کو مکمل فرما دے، اور ہم کو بخش دے، اور بے شک تو بڑا اور بہترین بخشنے والا ہے۔ اور ہم پر رحم فرما کہ بلاشبہ تو تو بہترین رحم فرمانے والا ہے۔ (زادِ راہ صفحہ ۱۴۳)

مقامِ دید

مومن جنت میں داخل ہوں گے۔ ان کی مہمان نوازی ہو رہی ہو گی۔ وہ بھی ہوں گے جو سب سے پہلے بلاحساب داخل ہوئے جن کے چہرے اُس وقت بھی چودھویں کے چاند کی طرح چمک رہے تھے، اور وہ بھی ہوں گے جن کو اللہ کے حبیب صلّی اللہ علیہ وسلّم کی نظرِ کرم دوزخ سے نکال کر لائی ہو گی۔ اِس جنّتِ سماوی میں وہ سب ہو گا، جن کی کوئی خواہش کر سکتا ہے۔ جس کی نعمتوں کا ذکر قرآنِ حکیم میں بار بار آتا ہے۔ کہیں اللہ ربّ العزّت کے انعامات کے ساتھ، کہیں مومن کے مقامات کے ساتھ، کہیں جنّت کی کیفیات کے ساتھ۔ جس میں کہیں باغات، کہیں نہریں، نہریں بھی پانی شہد اور دودھ کی کہیں بالاخانوں کی تجلّیات، جہاں اہلِ جنّت کے لئے اللہ اور اُس کے فرشتوں کا سلام، یعنی ہر طرح کی اُن کو سلامتی حاصل ہو گی، نہ عمر کم ہو گی نہ بڑھے گی، نہ کسی شئے کے جانے کا غم ہو گا نہ کسی خوف کا سامنا۔ ایک عمرِ لازوال، ایک حیاتِ ابدی، ایک قلبِ مطمئنّہ، ایک سرورِ ابدی۔ وہ اللہ سے راضی ہوں گے اور اللہ ان سے راضی ہو گا، گویا وہ اللہ والے بن گئے۔ اور کامیابی اُن کا نصیبہ ہو گی گویا ہر سمت رحمت و رضائے الٰہی ان کا احاطہ کئے ہو گی۔

یقیناً وہاں بھی اس کو قرآنِ حکیم کی یہ آیاتِ مبارکہ یاد آتی ہوں گی۔

اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ

بے شک جن لوگوں نے اقرار کیا کہ ہمارا پروردگار اللہ ہے اور اس پر قائم رہے تو ان پر فرشتے اترتے ہیں (جو

اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِیْ کُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ﴿۳۰﴾

اُن سے کہتے ہیں) تم مت ڈرو اور غم مت کرو (تم اللہ سے ڈرتے رہے اور اللہ تم سے راضی ہوا) اور تم جنّت کی خوش خبری سنو جس کا تم سے وعدہ کیا گیا تھا۔

نَحْنُ اَوْلِیٰٓؤُکُمْ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَفِی الْاٰخِرَةِ ۚ وَلَکُمْ فِیْهَا مَا تَشْتَهِیْٓ اَنْفُسُکُمْ وَلَکُمْ فِیْهَا مَا تَدَّعُوْنَ ﴿۳۱﴾

(اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اور اُس کے فرشتے کہتے ہیں) ہم تمہارے دنیا میں رفیق ہیں اور رہیں گے اور تمہارے لئے وہاں وہ سب موجود ہوگا جو تمہارا جی چاہے اور تمہارے لئے وہ سب بھی جو مانگو موجود ہوگا۔

نُزُلًا مِّنْ غَفُوْرٍ رَّحِیْمٍ ﴿۳۲﴾

(حٰمٓ السجدة)

(یہ) بخشنے والے مہربان کی طرف سے مہمانی ہے۔

اور بے شک وہ کہتے ہوں گے کہ میرے رب کا وعدہ سچا ہے۔ اور ان کا بال بال رواں رواں اللہ کے اِس وعدہ کی صداقت پر شاہد ہوگا، اور ان کی زبان پر ہوگا اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ جاری ہوگا۔

یہ سب ہوگا لیکن

وہ خلش وتمنّا ضرور باقی ہوگی جو اللہ کے مخصوص بندے دلوں میں لئے بیٹھے رہے، یہ برگزیدہ ہستیاں بھی اور حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم سے قبل کے انبیاء علیہم السلام بھی،

یعنی دیدارِ الٰہی

اللہ تعالیٰ جانتا تھا کہ یہ سب اُس کے ضرور منتظر ہوں گے۔ اس یقین کے ساتھ کہ بے شک وہ نصیب ہوگا، اپنے وقت پر۔ ایک بار تو اِس بات کا ذکر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زبان پر آ بھی گیا تھا۔ اور یہی تمنا جب مومنین کے دل میں پیدا ہوئی تو نہایت معصومیت سے اپنے رسول کریمؐ سے دریافت کیا، کہ کیا ہم

اللہ کو دیکھ سکتے ہیں؟

چنانچہ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے، کہ لوگوں نے کہا، یارسولؐ اللہ! کیا ہم اپنے پروردگار کو قیامت میں دیکھیں گے؟ آپؐ نے فرمایا تم کو کوئی مشکل ہوتی ہے دوپہر کو سورج کو دیکھنے میں، جب ابر نہ ہو۔ لوگوں نے کہا "نہیں"۔ آپؐ نے فرمایا کیا تم کو مشکل ہوتی ہے چودھویں رات کے چاند کو دیکھنے میں جب ابر نہ ہو۔ لوگوں نے کہا "نہیں"۔ آپؐ نے فرمایا قسم ہے اُس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، تم کو اللہ جلّ جلالہٗ کے دیکھنے میں کوئی بھی مشکل نہ ہوگی، مگر جتنی کہ چاند یا سورج کے دیکھنے میں ہوتی ہے۔ (یعنی کہ تم بلا کسی روک ٹوک کے اپنے رب کو خوب خوب دیکھو گے)۔

(سنن ابوداؤد باب ۴۰۶ دیدار کا بیان)

ایک دوسری حدیث میں ابورزین سے روایت ہے کہ میں نے کہا، یارسولؐ اللہ کیا ہم میں سے ہر شخص الگ الگ، اپنے رب کو دیکھے گا، (یعنی بغیر زحمت و کشمکش قیامت کے روز) اگر دیکھے گا تو دنیا میں اس کی مثال کیا ہے۔ آپؐ نے فرمایا، اے ابا رزین کیا تم میں سے ہر شخص چاند کو دیکھتا ہے۔ رات کو بلا دقت اور کشمکش کے۔ میں نے کہا کیوں نہیں۔ آپؐ نے فرمایا اللہ کی تو بڑی شان ہے، چاند تو اللہ کی بنائی ہوئی چیز ہے۔

(یعنی اگر اپنی بنائی ہوئی چیز تم کو دکھا سکتا ہے، تو وہ خود تو بڑی قدرت والا ہے، خود اپنے جمالِ مبارک کو ہر ایک کو آسانی سے دکھا دینا اس کے لئے کیا بڑی بات ہے۔ (ابوداؤد جلد سوم دیدار الٰہی حدیث ۱۳۰۵)

چنانچہ قرآنِ حکیم میں بھی اس کے متعلق آیات آتی ہیں۔

وُجُوْہٌ یَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَۃٌ ۝ اِلٰی رَبِّھَا نَاظِرَۃٌ ۝ القیٰمۃ آیات ۲۲،۲۳

اور اس دن کچھ چہرے تروتازہ ہوں گے اور اپنے رب کی طرف دیکھ رہے ہوں گے۔

(اپنے پروردگار کے دیدار میں محو ہوں گے)

ان مبارک برگزیدہ ہستیوں کو جو حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کا مُنہ ہی دیکھتے رہتے تھے، انہیں جس کی خواہش جنت میں لے گئی، وہ نہ شرابِ طہور تھی نہ عیشِ جاوداں نہ باغات، نہ محلات، بلکہ یہ تڑپ کہ اپنے آقا سرورِ کائنات ؐ کا روئے زیبا سامنے ہوگا، اور اُن کے قدموں میں یہ دِن گذر رہے ہوں گے۔ اُنہیں وہاں ربِّ محمدؐ کا دیدار نصیب ہوگا جس کے وعدے قرآن وحدیث میں آئے ہیں۔ وہ تو اِس وعدے کے منتظر ہوں گے، جس کا بخاری شریف میں یوں ذکر آتا ہے

"اِنَّکُمْ سَتَرَوْنَ رَبَّکُمْ عَیَانًا (بیشک تم اپنے رب کو اعلانیہ ظاہر دیکھو گے (بخاری)

یا جس کا ذکر قرآنِ حکیم کی سورہ یونس میں آتا ہے لِلَّذِیْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰی وَزِیَادَۃٌ یعنی جن لوگوں نے عمل کئے ان کے لئے اچھا اجر ہے، اور اس سے کچھ زیادہ بھی۔

چنانچہ مسلم و ترمذی میں آتا ہے

حضرت صہیبؓ کی روایت ہے، کہ حضورؐ نے فرمایا کہ جب اہلِ جنّت جنّت میں داخل ہو جائیں گے تو اللہ تعالےٰ اُن سے دریافت فرمائے گا، کیا تم چاہتے ہو کہ میں تم کو مزید کچھ دوں۔ وہ (بطور شکر گذاری) عرض کریں گے، ربّ العزت کیا تو نے ہمارے چہرے روشن نہیں فرما دیئے؟ کیا تو نے ہمیں جنّت میں داخل نہیں فرمایا؟ اور جہنم سے بچا نہیں لیا؟ اللہ جلّ شانہٗ اس وقت (اپنی ذاتِ منزّہ سے) پردہ اُٹھا دے گا۔" اور لوگ شرفِ دیدار سے مشرّف ہوں گے۔ اُن لوگوں کو جو کچھ بھی انعامات ملے تھے، ان میں سے کوئی بھی ان کے لئے اِس سے زیادہ محبوب نہ ہوگا، یعنی دیدارِ الٰہی۔

ابنِ ماجہ میں حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ

اللہ تعالیٰ ان کی طرف دیکھے گا اور وہ اللہ کی طرف دیکھیں گے۔ پھر جب تک اللہ پردہ نہ فرمائے گا، اس وقت تک وہ جنّت کی کسی نعمت کی طرف متوجہ نہیں

ہوں گے۔

احادیثِ مبارکہ میں یوں بھی آتا ہے :

جنّت کے زیادہ نصیب والے لوگ اپنے رب کو ہر روز دو مرتبہ دیکھیں گے۔ اور حضورؐ نے اس کے بعد یہ آیت پڑھی، کہ اس روز کچھ چہرے تروتازہ ہوں گے اور اپنے رب کی طرف دیکھ رہے ہوں گے۔ یہ انعامات ونوازشات تو عام مومنوں کے ساتھ ہوں گی۔ لیکن اللہ کے وہ پیارے بندے، جن کی زندگی حضور سرورِ کائناتؐ کے رُوئے زیبا کو تکتے گذرتی رہی، جنہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کے سامنے کسی قربانی سے دریغ نہ کیا، ان کا انعام تو اس سے کچھ زیادہ ہی ہونا چاہیئے۔ اللہ رب العزت سے زیادہ ان کی اس محبت کا قدر دان کون ہوسکتا ہے؟ چنانچہ حضرت شیخ شرف الحق والدین احمد یحیٰی منیری قدس اللہ سرہ کے ایک مکتوب میں جہاں جنّت کی بے شمار نعمتوں کا ذکر ہے وہاں اس دید کا ذکر کیا گیا ہے۔

پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ بندوں کو خداوند کا دیدار کب کب ہوگا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْظُرُ اِلٰى رَبِّهٖ فِى الشَّهْرِ مَرَّةً وَّمِنْهُمْ مَنْ يَّنْظُرُ اِلٰى رَبِّهٖ فِى الْجُمُعَةِ مَرَّةً وَمِنْهُمْ مَنْ يَّنْظُرُ اِلٰى رَبِّهٖ بُكْرَةً وَّعَشِيًّا

(ان میں کوئی ایسا ہوگا جو ایک مہینہ میں ایک مرتبہ اپنے پروردگار کو دیکھے گا۔ کوئی ایسا ہوگا جو جمعہ کے دن ایک مرتبہ دیکھے گا۔ اور کوئی ایسا ہوگا جو صبح وشام اپنے پروردگار کو دیکھتا ہوگا۔ یہ انعامات فرقِ مراتب کی بنا پر ہوں گے) (یہ پورا خط بہشت کی نعمتوں کا ایک مرقع ہے۔ جو اس عظیم انعام پر ختم ہوتا ہے، جس کا ذکر اوپر ہوا۔) "مکتوباتِ صدی" حضرت شیخ شرف الدین یحیٰی منیری، ستواں مکتوب)

واضح رہے کہ جو شفاعتِ کبریٰ پر فائز ہیں، اہلِ جنت میں مومنوں کی ترقی

مدارج کے لئے اپنے رب کے حضور دست بدعا اور صورتِ دعا ہیں، اور اللہ کی جملہ مخلوق سے بھی غافل نہیں، کہ آپ کافّۃً لِلنَّاس ہیں۔ شافعِ محشر کے اندازِ شفاعت کے قربان کہ جب مومن جنت میں آجائیں گے، تو "اس وقت حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم اللہ ربّ العزّت کے حضور پھر سر بسجود ہو کر فرمائیں گے، کہ ربّ کریم اب اجازت دیجئے کہ ہر شخص کو جس نے لا الٰہ الّا اللہ کہا اسے دوزخ سے نکال لوں۔" حق تعالےٰ فرمائے گا، یہ کام آپؐ کا نہیں، یہ کام میرا ہی ہے۔ قسم ہے مجھے اپنے عزت وجلال وکبریائی کی، کہ میں ہر اس شخص کو جہنم سے نکالوں گا، جس نے لا الٰہ الّا اللہ کہا۔ اور اس کے بعد جہنم میں وہی لوگ رہ جائیں گے، جن کو قرآن نے روک دیا ہے، جن کے لئے دائمی جہنم ہے۔" یہاں یہ بات بھی بڑی اہمیت اور دلچسپی کی حامل ہے کہ حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کا لا الٰہ الّا اللہ کہنے والوں کے لئے اجازت طلب فرمانا دراصل شفاعت ہی تھا، جس کی مقبولیت اللہ جلّ جلالہٗ کی شانِ کبریائی کے ساتھ ظہور میں آئی۔ یہ ذات وصفات کے جلوے تھے جو محشر میں عام ہوئے۔

ہم نے اس حصّے کو حدیثِ شفاعت سے الگ کر کے آخر میں لکھا ہے۔ اس لئے کہ حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کی شفاعت، محشر میں لوگوں کے وقوف سے لے کر داخلۂ نار تک دفعِ عذاب کے لئے، اور بعد از داخلۂ جنّت رفعِ درجات کے لئے بھی شامل وواقع ہے۔ اور اس لئے بھی یہ بخوبی واضح ہو جائے کہ کلمہ کے صرف ایک جزو لا الٰہ الّا اللہ پر اکتفا کرنا اور دوسرے سے کنارہ کش ہونا، کتنے طویل عذاب کے بعد نجات کی ایک صورت ہے، جس کو لاکھوں کروڑوں برس بھی کہا جائے تو کم ہے۔ یہ تغافل وہی کرے گا جسے نار پر صبر کر لینے کی یہ ہمّت ہو۔ جس کو اللہ نے فرمایا "فَمَآ اَصْبَرَهُمْ عَلَى النَّارِ[1]" اور یہ حقیقت بھی واضح

---

[1] البقرہ آیت ۱۷۵

ہو جائے کہ جس محشر میں کوئی پیغمبرؑ بھی شفاعت کی ہمت نہ کر سکا، وہاں سیدالمرسلین شفیعُ المذنبین کی رفعتِ شان کا کیا عالم ہے۔ کہ پہلے جنت میں بے حساب جانے والے بھی انہیں کے اُمّتی ہیں۔ اور آخر میں وہ گنہگار ہیں جن کو نارِ دوزخ سے منتقل کیا گیا، اُنہیںؐ کی امت کے لوگ ہیں جو شفاعتِ کبریٰ کے مستحق ہوئے۔ یہ بھی واضح ہو جائے کہ سرورِ کائنات صلّی اللہ علیہ وسلّم کے دامنِ رحمت سے وابستگی کیسی عظیم خوش نصیبی ہے۔ وَصَلَّى اللّٰهُ عَلَى النَّبِيِّ الْاُمِّيِّ وَارْزُقْنَا شَفَاعَتَهٗ

مقامِ شافعِ محشر مقامِ محمود مقامِ محمد صلّی اللہ علیہ وسلّم

مقامِ محمود جس کا ذکر گذشتہ اوراق میں کیا گیا وہ شفاعتِ کبریٰ سے متعلق تھا، جو عرش کے ساتھ ہے، جہاں حضور صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کا اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑے ہو کر امت کے لئے شفاعت کرنا تھا۔ جس کا تعلق مخلوقِ خدا کے لئے اللہ ربّ العزت سے خیر اور کرم کی استدعا تھی۔ وہ مقام کہ جہاں کائنات کی ہر شئے سے لے کر ملائکۃ المقربین اور خود باری تعالیٰ اپنے حبیبؐ کی حمد و ثنا فرماتا ہے۔ اوّلین و آخرین اس پر رشک کرتے ہیں۔

مقامِ محمود کا ایک دوسرا رُخ

اب اس دوسرے رُخ کی طرف توجہ مبذول کرانے کی سعادت حاصل ہو رہی ہے، جہاں اللہ کے سب ہی نام لیوا جنّت میں جا چکے ہیں جہاں پہنچ کر صدیقِ اکبرؓ کے درود شریف کے معنی حرفاً حرفاً کھلتے ہیں، کہ صدیقِ اکبرؓ کا درود حضورؐ کے لئے جنت الصّفات کی مے نہیں، جنّت الذّات کی دُعا تھا۔ اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّاٰلِهٖ حَتّٰى لَا يَبْقٰى مِنْ صَلٰوتِكَ شَيْءٌ

وَارْحَمْ عَلٰی سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّ اٰلِہٖ حَتّٰی لَا یَبْقٰی مِنْ رَحْمَتِكَ شَیْءٌ وَّ بَارِكْ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّ اٰلِہٖ حَتّٰی لَا یَبْقٰی مِنْ بَرَکَاتِكَ شَیْءٌ وَّ سَلِّمْ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّ اٰلِہٖ حَتّٰی لَا یَبْقٰی مِنْ سَلَامِكَ شَیْءٌ۔

یعنی حضورؐ اور آپؐ کی آل پر ایسا درود، ایسی رحمتیں، ایسی برکتیں، ایسا سلام عطا فرما کہ تیری رحمتوں میں سے، تیری برکتوں میں سے، تیرے سلام میں کوئی شئے باقی نہ رہے۔

اب یہی وہ مقام ہے جہاں درود و سلام، رحمتیں اور برکتیں جو ذاتِ مقدسہؐ ہی کے لئے ہیں اس کا فیضان ہر مومن کے لئے اس کے مقام کے مطابق عطا ہو چکا۔ اور ذاتِ مقدسہؐ کی حمد کا وہ رُخ جس کا تعلق صفاتِ باری تعالیٰ کی بجاآوری سے تھا، وہ تکمیل پا چکا ہے۔ تو پھر اللہ رب العزت صفات کے پردے اٹھا کر، ردائے کبریائی کا حجاب بھی دفع فرما رہا ہے اور اپنے حبیب سرورِ کائنات شفیع المذنبینؐ کو اُنؐ کے اس مقام سے سرفرازی بخشتا ہے جو صرف ایک ہی شخص کے لئے مخصوص ہے اور جس کے لئے ہمیں ہر اذان کے بعد ایک دعا کی تعلیم دی گئی، تاکہ اُمت حضورؐ کے اِس فیض سے بھی محروم نہ رہے جس کا ایک اہم ٹکڑا یہ ہے۔

(اَللّٰھُمَّ) اٰتِ مُحَمَّدَنِ الْوَسِیْلَةَ وَ الْفَضِیْلَةَ وَالدَّرَجَةَ الرَّفِیْعَةَ وَابْعَثْهُ مَقَامًا مَّحْمُوْدَنِ الَّذِیْ وَعَدْتَّهٗ وَارْزُقْنَا شَفَاعَتَهٗ اِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِیْعَادَ

مخفی نہ رہے کہ مقامِ محمود سے قبل وسیلہ، فضیلہ اور درجۂ رفیعہ کا ذکر ایک عظیم حقیقت کی نشان دہی کر رہا ہے۔

کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ

اللہ تعالیٰ سے میرے لئے "وسیلہ" کو مانگو کیونکہ جنت میں یہ وہ مقام ہے جہاں کوئی نہیں پہنچ سکتا۔ اور نہ کسی کو زیب دیتا ہے خدا کے بندوں میں سے بجز ایک

بندے کے۔ اور میں اُمید رکھتا ہوں کہ وہ بندہ میں ہوں۔ تمام بندوں کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اسمِ گرامی وسیلہ ہے۔ اور حضورؐ کے لئے وسیلہ خود ذاتِ باری تعالیٰ کا فضل ہے۔ یہی وہ مقام ہوگا جہاں مومن کی نگاہیں نذرانہ درود و سلام پیش کر رہی ہوں گی اور ان کے دل اب سرورِ سرمدی سے فیض یاب ہو رہے ہوں گے۔

○

اہلِ بصیرت نے قرآن و احادیث کی روشنی میں جنت کے آٹھ طبق قرار دیئے ہیں۔

چنانچہ حضرت سیّد عبدالکریم بن ابراہیم جیلانی اپنی کتاب الانسانِ کامل میں تحریر فرماتے ہیں "جاننا چاہیئے کہ جنت کے آٹھ طبق ہیں۔ ہر جنت کے درجے ہیں جن کا کوئی حصر و شمار نہیں۔" (الانسانِ کامل صفحہ ۳۰۹، اُردو ترجمہ)

اِن کا ذکر انتہائی اختصار کے ساتھ درجِ ذیل ہے۔

پہلا طبقہ: جنتُ السّلام۔ اللہ تعالیٰ نے اِس جنت کا دروازہ اعمالِ صالحہ سے پیدا فرمایا۔ جس میں کوئی شخص بجز اعمالِ صالح کے داخل نہ ہوگا۔ اسے جنت المجازات بھی کہتے ہیں کہ قرآنِ حکیم میں نیک اعمال کی جزا ہے۔ اِس جنت کا نام یُسریٰ بھی ہے۔ اس کا داخلہ کا سبب تھوڑے سے اعمالِ مقبولہ ہوں گے۔ یہ بھی اللہ تعالےٰ کا کرم ہو گا کہ اللہ تعالےٰ اس کو اُن لوگوں کے لئے آسان فرما دے گا، اسے بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کی رحمت کا ایک رُخ سمجھو۔

دوسرا طبقہ: جنتِ خلد کا ہے۔ یہ پہلے طبقے سے اعلیٰ ہے۔ یہ جنت المکاسب ہے۔ پہلی جنت بقدر اعمال کے ہے، اور جنت المکاسب محض نفع ہے۔ کیونکہ وہ نتیجہ ہے بندے کے اُن اچھے عقائد اور اچھے گمانوں کا، جو بندہ خدا کے ساتھ

رکھتا تھا" اس میں کوئی چیز بطور مجازات کے بدن کے کاموں سے نہیں" اللہ تعالیٰ نے اس جنّت والوں پر اپنے اسم بدیع کے ساتھ تجلّی فرمائی ہے۔

تیسرا طبقہ: جنّت المواہب ہے۔ یہ پہلے دونوں سے اعلیٰ ہے۔ یہ جنّت عطیاتِ الٰہی میں سے ہے، جس میں عمل و عقیدہ کو دخل نہیں۔ یہ محض اللہ کی بخشش ہے۔ اور اللہ صاحبِ اختیار و اقتدار ہے۔ یہی وہ جنّت ہے جس کے متعلق آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا، کہ اس (جنّت) میں کوئی شخص اپنے عمل سے داخل نہیں ہوگا۔ صحابہؓ نے عرض کی: یا رسول اللہ کیا آپؐ بھی؟ آپؐ نے فرمایا "ہاں" میں بھی نہیں مگر یہ کہ جب خدا اپنی رحمت سے مجھے ڈھانپ لے۔ یہ جنّت سب جنّتوں سے بڑھ کر ہے۔ اور یہ خدائے تعالیٰ کے اس قول کا سِر ہے "وَرَحْمَتِیْ وَسِعَتْ کُلَّ شَیْءٍ"

چوتھا طبقہ: جنّت الاستحقاق ہے۔ اسے جنّتِ فطرت بھی کہا گیا ہے۔ یہ ان لوگوں کے لئے ہے جو اپنی فطرت پر قائم رہے اور جن کی عمر دنیا میں گذری، لیکن وہ اپنی فطرت سے جُدا نہ ہو سکے۔ ان میں دیوانہ، مجنون، اطفال شامل ہیں۔ اور بعض وہ ہیں جنہوں نے اعمالِ صالحہ، مجاہدہ، ریاضت اور خدا کے ساتھ اچھا معاملہ کیا اور اگر اُن سے کوئی غلطی ہوگئی تو وہ اپنی اصل فطرتِ صالحہ پر لوٹ آئے اور قائم رہے۔ اور یہ لوگ ابرار کے نام سے موسوم ہیں۔ اس کو جنّتِ نعیم کہا گیا ہے اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِیْ نَعِیْمٍ۔ اور جنّتِ استحقاق بھی کہا گیا ہے۔ اس کا راز یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس پر اپنے اسمِ حق سے تجلّی فرمائی۔ یہ اسی فطرت پر قائم رہے جس پر اللہ تعالےٰ نے انسان کو پیدا کیا، یعنی اس فطرت پر جو خود اللہ تعالیٰ کی فطرت ہے۔ یہ بلند مقام ہے۔

پانچواں طبقہ: جنتِ فردوس ہے۔ اسے جنّتِ معارف بھی کہا گیا ہے۔ یہ جنت عرش کے دروازہ پر ہے۔ اور اس کی چھت عرش کے دروازہ کی چھت ہے۔

اس جنّت والے ہمیشہ مشاہدہ میں رہتے ہیں، اور وہ شہداء ہیں، یعنی جمال وحسنِ الٰہی کا مشاہدہ کرنے والے، جو شمشیرِ فنا سے اپنے نفسوں سے اللہ کی محبت میں قتل کئے گئے ہیں، جس سے وہ اپنے محبوب کے مشاہدہ میں رہیں گے اس جنّت کا نام معارف عارف کے لئے اپنے معروف کی طرف کہ ذاتِ حق ہے وسیلہ ہوتے ہیں۔ اس جنت کے رہنے والے دوسری جنتوں کے رہنے والوں کی نسبت تعداد میں نہایت قلیل ہیں، اس جنّت میں جوں جوں اوپر جائیں یہی حال ہے۔

چھٹا طبقہ:۔ اس کا نام فضیلہ ہے۔ اس کے رہنے والے صدّیق ہیں۔ جن کی صفت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا، کہ عِنۡدَ مَلِيۡكٍ مُّقۡتَدِرٍ۔ (کہ وہ نزدیک بادشاہِ توانا ہیں) یہ جنّت جنّت الاسماء ہے۔ اور وہ عرش کے درجوں پر پھیلی ہوئی ہے۔ اس طبقہ کے رہنے والوں میں سے ہر طائفہ عرش کے درجوں میں سے ایک درجہ پر رہتا ہے۔ ان کی تعداد اور بھی کم ہے۔

ساتواں طبقہ:۔ اس کا نام الدرجۃ الرفیعہ ہے۔ اور یہ من حیث الاسم جنّت صفات، اور من حیث الرسم جنتِ ذات ہے۔ یعنی اس کا ظاہر جنّت الصفات اور اس کا باطن جنّت الذات ہے۔ اس کی زمین عرش کا باطن ہے۔ اور اس طبقے کے رہنے والے اہل التحقیق بالحقائق الالٰہیۃ ہیں۔ یعنی حقائق الٰہیہ سے متحقق ہونے والے۔ اور اس طبقے کے رہنے والے مقرّب اور خلافتِ الٰہیہ کے مالک ہیں۔ یہ تحقیقِ الٰہی میں صاحبِ عزم و صاحبِ تمکین ہیں۔ مصنّفِ "انسانِ کامل" حضرت سید عبد الکریم بن ابراہیم جیلانیؒ فرماتے ہیں، کہ میں نے حضرت ابراہیم علیہ السّلام کو اس محل کے داہنی جانب میں کھڑے ہوئے اور اس کے بیچ میں دیکھتے ہوئے پایا، کہ ادبیاءؑ اور رسولوںؑ کا ایک گروہ ان کے بائیں جانب میں اس محل کے وسط کی طرف ٹکٹکی باندھے مقامِ محمود کی طلب میں کھڑے تھے؛ جس کا اللہ تعالےٰ نے ان سے وعدہ کیا ہوا ہے۔

آٹھواں طبقہ :- مقامِ محمود ہے ۔ اور جنّت الذات ہے ۔ اس کی زمین عرش کی چھت ہے ۔ کوئی اس طرف جا نہیں سکتا ۔ اور سب جنّت الصّفات والے اس میں پہنچنا چاہتے ہیں ۔ اور ہر ایک یہ گمان کرتا ہے کہ میرے سوا دوسرے اس کے لئے نامزد نہیں ۔ اور ہر ایک اس کو اپنا حق خیال کرتا ہے، لیکن وہ صرف محمد صلّی اللہ علیہ وسلّم کے لئے ہی ہے، جیسا کہ آپ نے ارشاد فرمایا کہ مقامِ محمود جنّت میں ایک اعلیٰ مکان ہے اور وہ صرف ایک ہی شخص کے لئے ہوگا ۔ میں امید کرتا ہوں کہ میں ہی وہ آدمی ہوں گا ۔ پھر خبر دی کہ اللہ تعالےٰ نے آپؐ سے اس کا وعدہ فرمایا ہے ۔ ہمیں چاہیئے کہ جو کچھ آپ نے فرمایا اس پر ایمان لائیں اور اس کی تصدیق کریں کیونکہ آپ کا ارشاد ہوائے نفسانی سے نہیں بلکہ وہ وحیٔ الٰہی ہے ۔
(اقتباس از انسانِ کامل مصنفہ حضرت عبدالکریم بن ابراہیم جیلانیؒ)
(ترجمہ مولوی فضل میراں صاحب صفحہ ۳۰۸ تا ۳۱۳)

اس مختصر اقتباس سے مقامِ محمود کا یہ دوسرا رُخ، جو صرف حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کے لئے دنیا میں بھی تھا اور آخرت میں ہے خوب واضح ہو جاتا ہے ۔ یہ وہ مکاشفات ہیں جن سے اللہ ربّ العزّت پاک و نیک طینت بزرگ ہستیوں کی روحوں کو اسی دنیا میں سرفراز فرماتے رہتے ہیں ۔

واضح ہو

کہ انبیاء علیہم السلام سے لے کر اولیاء عظامؒ اور اولیاء کرامؒ سبھی کسی نہ کسی انداز سے ایک محدود حد تک محوِ دیدار رہے، لیکن حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کے لئے تو اسی عالم میں وہ مقامِ مشاہدہ عطا ہوا جسے معراج کہا گیا یعنی ایسا مقام کہ تمام انبیاءؑ آسمانوں پر رہ گئے، پھر ایسا عظیم مقام کہ جبریلِ امین نے ایک بال برابر بھی آگے بڑھنے کی جسارت نہ فرمائی اور سطحِ نورانی پر نور السمٰوٰت والارض کا رسولؐ ایک نورانی سواری پر جسے رفرف سے خطاب کیا گیا بارگاہ ربّ العزّت میں حاضر ہوا ۔ وہاں سے اُسے بھی

مراجعت فرمانا تھی کہ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ کا فریضہ حضورؐ ادا فرمائیں۔ لیکن اب وہ مقام ہے کہ جملہ فرائض ادا ہو چکے ہیں۔ جملہ صفات، جملہ اخلاق جنہیں اخلاقُ اللہ سے نسبت دی گئی، سب کی بجاآوری ہو چکی تو اب یہاں بھی وہی جنت الذات جو معراج کی رات گویا مؤخر کر دی گئی تھی حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کی منتظر ہو گی۔

احادیث میں آتا ہے کہ صحابۂ کرامؓ نے جو پروانۂ نورِ مبینؐ و نورِ رسالت تھے اس جنت کا حال حضورؐ سے سُنا تو خوش بھی ہوئے اور بے چین بھی۔ خوش تو مقامِ محمود کی عطائے خاص پر اور بے چین اُس بات پر کہ حضورؐ کے قدموں میں زندگی بسر کرنے والے، اِس آئینۂ حق میں حق کا جلوہ دیکھنے والے پھر اس نورِ مبینؐ کو کہاں پائیں گے۔ رحمتہؐ للعٰلمین، محبوب الفقراء والمساکینؐ، یوں اِنؓ کی تشفی فرماتے ہیں

"تم میرے پاس نہ آسکو لیکن میں تو تمہارے پاس آسکوں گا۔"

شاید منشاء یہ تھا کہ یہ جلوۂ صفات جو تمہاری آنکھوں کے ساتھ رہا تب بھی تمہارے ساتھ ہو گا، اور جلوۂ ذات جو ذاتِ رسولؐ اللہ کا باطن ہے جو دنیا میں بھی ساتھ رہا کہ لِیْ مَعَ اللّٰہِ وَقْتٌ وہ اب اللہ جلّ شانہ کے روبرو ہو گا۔ اب یہاں فصل کہاں یہ فصل قابَ قوسین اَو اَدنیٰ کے لئے تھا کہ کام باقی تھا اور اب تو دائرۂ توحید مطلقہ ہو چکا ہے، نور ہی نور ہے۔ اور نورٌ علیٰ نور کا ایک عالم تنہائی۔

رَبَّنَآ اَتْمِمْ لَنَا نُوْرَنَا وَاغْفِرْ لَنَا ج

اِنَّکَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ○ ۶۶/۸

○

سبحان اللہ بحمدہٖ وسبحان اللہ العظیم

آپ اسے جس نام سے چاہیں تعبیر فرمائیں۔ ہمارا قلم ساکت ہماری زبان خاموش ہے۔

یہ تکمیلِ کلمہ ہے

لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کا مقام ہے۔ اولاً آخراً ظاہراً و باطناً

جسے مقامِ محمود بھی کہا گیا

یہ ظہورِ نورِ مبینؐ

جو تعینِ حُبی سے شروع ہوا تھا اُسی مقامِ حُب میں پہونچ چکا ہے جہاں نہ زماں ہے نہ مکاں، جو جملہ تعینات سے وراء الوریٰ ہے۔ جس کو نہ تجلی سے تعبیر کیا جاسکتا ہے نہ ظہور سے، نہ ظاہر سے نہ باطن سے نہ اوّل سے نہ آخر سے

ہم اپنے اطمینان کے لئے اللہ ھو کہ لیں

یا

سبحان اللہ و بحمدہٖ سبحان اللہِ العظیم

یا

یوں کہیں کہ جو پہلے اللہ کے اسم سے متعلق ہوا اب اس کی

تکمیلِ حمد کا آئینہ دار اور بحمدہٖ سے متعلق

ہوکر اللہ ربّ العزت کی شانِ کبریائی اور تقدّس کی یافت میں گم ہے

نورِ مبینؐ کا

یہ سفر تو ختم نہیں ہوا۔ البتہ یہ ہماری معرفتِ الٰہی کی آخری سرحد ہے

پھر کیا ہوگا

وہی جانے جو عالم الغیب وَ الشہادۃ ہے۔ ہم تو یہ کہہ سکتے ہیں کہ تب بھی اللہ ہوگا، اور اس کی رحمت۔ جس کا اشارہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم میں فرما دیا گیا تھا۔ کہ اللہ کے اسمِ "باقی" کا برزخ "رحمۃ" ہی ہے۔

سبحان اللہ

اے

قلم سربسجود ہو کر سُبْحَانَ رَبِّیَ الْاَعْلٰی لکھ، اور اے جبینِ نیاز سرِ تسلیم خم کر کے سُبْحَانَ رَبِّیَ الْاَعْلٰی کا حق ادا کر۔ اور اس انعام پر نازاں ہو کہ تجھ جیسے گنہگار سے اس پاک مقدّس و مطہر نُورٌ عَلٰی نُور ہستی کی ایک جھلک سپردِ قلم کرانے کی اللہ تعالیٰ نے تجھے سعادت بخشی۔

اے اللہ۔ اے ربّ کریم۔ اے ارحم الرّحمین

تُو اپنے حبیب صلّی اللہ علیہ وسلّم کے صدقہ، اُن ؐ کے طفیل میں اس عاجزانہ سعی کو قبول فرما، اور ہمارے شیخِ محترم و معظم حضرت بابا محمد عبید اللہ درّانی صاحب قبلہؒ جن کے قلم سے اس پر بسم اللہ تُو نے لکھوائی، اُنؒ کے مدارج بلند سے بلند تر فرماتا جا، اور امّتِ مرحومہ کے لئے انؒ کی دعاؤں کو قبول فرما کہ اُن کا ہر لمحۂ حیات، امّت کی خیر خواہی، اور اُنؒ کے آنسو غمِ امّت کے ترجمان، اور اُنؒ کی دعائیں سرفرازیٔ امّت کے لئے تھیں۔ اے رب کریم اپنے حبیبؐ پاک کے انوار کے صدقہ میں اپنے حبیبؐ کی امّت کے لئے خیر و کرم۔ فیوض و برکات، نورِ عرفان۔ نورِ ایمان اور ان اخلاقی اقدار کے دریچہ ان کے قلب و نظر، فکر و عمل میں کھول دے جو کبھی قوم کا نصیبہ تھے۔ اور حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کے لطف و کرم کے طفیل اس عاجز فقیر عاصی کو بھی ہمارے بابا کی دعاؤں میں شامل فرما کر حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کے قدموں میں جگہ دے، یہاں دنیا میں بھی، برزخ میں بھی اور آخرت میں بھی۔ اور یہ جانِ حزیں کچھ اس طرح نکلے کہ جان، جان آفرین کے سپرد ہو اور نظریں جانِ ایمان (صلّی اللہ علیہ وسلّم) پر لگی ہوں اور ایک لمحہ بھی اس سے جُدا نہ ہوں۔ آمین۔ آمین یا ربّ العٰلمین۔ بحرمت

آقائی و مولائی سیّدی محمد صلّی اللہ علیہ وسلّم

جب یہ اوراق ختم کئے جا رہے ہیں تو ظہر کا وقت ہے اور پاس کی مسجد

سے اذان کی آواز آرہی ہے: اَللّٰہُ اَکْبَرُ..... اَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰہ..
حَیَّ عَلَی الصَّلٰوۃ..... اور اذان لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ پر ختم ہو رہی ہے، اور اب یہی
دعا زبان پر آرہی ہے:

اَللّٰھُمَّ رَبَّ ھٰذِہِ الدَّعْوَۃِ التَّآمَّۃِ وَالصَّلٰوۃِ الْقَآئِمَۃِ
اٰتِ مُحَمَّدَنِ الْوَسِیْلَۃَ وَالْفَضِیْلَۃَ وَالدَّرَجَۃَ الرَّفِیْعَۃَ
وَابْعَثْہُ مَقَامًا مَّحْمُوْدَنِ الَّذِیْ وَعَدْتَّہٗ وَارْزُقْنَا شَفَاعَتَہٗ اِنَّکَ لَا تُخْلِفُ
الْمِیْعَادَ۔ وَصَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلٰی خَیْرِ خَلْقِہٖ مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِہٖ
وَاَزْوَاجِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَاَوْلِیَآءِ اُمَّتِہٖ اَجْمَعِیْنَ۔
وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ عَلٰی اِحْسَانِہٖ

○

آیئے

اب انہیں شافعِ محشر صلّی اللہ علیہ وسلّم کے حضور اس ہدیۂ اخلاص کو عاجزانہ
صلوٰۃ و سلام پر ختم کریں جو ہر مومن کے قلب کی آواز ہو، اور ہر بُنِ مُو سے
ادا ہو جو موجبِ شفاعت بھی ہو، اور موجبِ قربتِ رسولؐ بھی۔
صلّی اللہ علیہ وسلّم
...... یعنی ....

يَا شَفِيْعَ الْوَرٰی سَلَامٌ عَلَيْكَ　　يَا نَبِيَّ الْهُدٰی سَلَامٌ عَلَيْكَ
خَاتَمَ الْاَنْبِيَآءِ سَلَامٌ عَلَيْكَ　　سَيِّدَ الْاَصْفِيَآءِ سَلَامٌ عَلَيْكَ
اَحْمَدُ لَيْسَ مِثْلُكَ اَحَدٌ　　مُجْتَبٰی مُصْطَفٰی سَلَامٌ عَلَيْكَ
وَاجِبٌ حُبُّكَ عَلَی الْمَخْلُوْقِ　　يَا حَبِيْبَ الْعُلٰی سَلَامٌ عَلَيْكَ
اَعْظَمَ الْخَلْقِ اَشْرَفَ الشُّرَفَآءِ　　اَفْضَلَ الْاَزْكِيَآءِ سَلَامٌ عَلَيْكَ
كُشِفَتْ مِنْكَ ظُلْمَةُ الظُّلَمَآءِ　　اَنْتَ بَدْرُ الدُّجٰی سَلَامٌ عَلَيْكَ
طَلَعَتْ مِنْكَ كَوْكَبُ الْعِرْفَانِ　　اَنْتَ شَمْسُ الضُّحٰی سَلَامٌ عَلَيْكَ
مَهْبَطَ الْوَحْيِ مَنْزِلَ الْقُرْاٰنِ　　اَنْتَ نُوْرُ الْهُدٰی سَلَامٌ عَلَيْكَ
اِنَّكَ مَقْصَدِیْ وَ مَلْجَآئِیْ　　اِنَّكَ الْمُدَّعٰی سَلَامٌ عَلَيْكَ
مَطْلَبِیْ يَا حَبِيْبِیْ لَيْسَ سِوَاكَ　　اَنْتَ مَطْلُوْبُنَا سَلَامٌ عَلَيْكَ
مَقْصَدِیْ يَا حَبِيْبِیْ لَيْسَ سِوَاكَ　　اَنْتَ مَقْصُوْدُنَا سَلَامٌ عَلَيْكَ
سَيِّدِیْ يَا حَبِيْبِیْ مَوْلَایَ　　لَكَ رُوْحِیْ فِدَا سَلَامٌ عَلَيْكَ
سَيِّدِیْ يَا حَبِيْبِیْ مَوْلَایَ　　لَكَ اَهْلِیْ فِدَا سَلَامٌ عَلَيْكَ
اِشْفَعْ لِیْ يَا حَبِيْبِیْ يَوْمَ الْجَزَآءِ　　اَنْتَ شَافِعُنَا سَلَامٌ عَلَيْكَ
وَصَلٰوةُ اللّٰهِ عَلَی الْمُصْطَفٰی　　اَفْضَلَ الْاَنْبِيَآءِ سَلَامٌ عَلَيْكَ
هٰذَا قَوْلُ غُلَامِكَ عِشْقِیْ　　مِنْهُ يَا مُصْطَفٰی سَلَامٌ عَلَيْكَ

و

نورِ مبین

(صلی اللہ علیہ وسلم)

کے انوار

ابتدائے آفرینش سے مقامِ محمود تک

(سات ابواب میں)

مرتبہ

احقر العباد (ڈاکٹر) حامد حسن بلگرامی

(مؤلف فیوض القرآن)

فیروز سنز لمیٹڈ

لاہور ——— راولپنڈی ——— کراچی